قواعد رسالۂ "نگار"

۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ - رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ - خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے - جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دئے جاتے ہیں

۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ - مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامۂ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دینگے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو ہفتے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار - ۱	جولائی سنہ ۱۹۳۰ء	جلد - ۱۸

ملاحظات

" ہر نشیب کے لئے ایک فراز، ہر ہبوط کے لئے ایک صعود اور ہر انحطاط کے لئے ایک عروج ہے" یہ نظریہ ہر چند اپنی عمومیت کے لحاظ سے اسقدر صحیح و درست نہین، جیسا اسکا "عکس" کہ "ہر کمالے را زوالے"۔ ایک حقیقت مسلمہ سمجھی جاتی ہے، لیکن بعض اوقات اسکی مثالین بھی اسقدر عجیب و غریب نظر آجاتی ہین کہ چار و ناچار فطرت کی "فیاضیون" اور "بیداریون" کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

مثلاً کون کہہ سکتا تھا کہ "اسلام" جو حالی ہی کے وقت تک "غریب الغربا" ہوگیا تھا، سنہ ۱۹۳۰ء مین جبکہ اس کی حالت "افقر الفقراء" سے بھی گر کر "اعلم العلماء" تک پہونچ جائیگی، کوئی "مردِ غیب" سرزمین "فرنگی محل" سے نمودار ہوگا اور اس کے "عظام رمیم" مین تازہ روح پھونک کر فرنگیون کے خدا "مسیح" کی یاد کو زندہ کر دینے والا ثابت ہوگا۔ سچ ہے حبیب "خدا کے لئے یہ محال نہین ہے کہ وہ ایک ہی ذات کے اندر سارے عالم کو جمع کر دے" تو وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ "سارے عالم" مین ایک ہی ذات کو پھیلا کر "کائنات" بنا دے اور وہ انسان صرف فرنگی محل کا ہو۔

ہر چہ در جا نتوان دید بہر جا بینند!

آپ کو معلوم ہے کہ یہ مقدس ہستی کون ہے اور وہ کس معجزہ کو پیش کر کے "احیاء موتیٰ" کا یقین دلانا چاہتی ہے؟ ——— یہ ممتاز و متبرک وجود افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، خضر راہ طریقت، مشعل جادۂ حقیقت، حجت الاولین،

سلالۃ الآخرین، سرخیل اسلام، امام الہمام مولانا و مرشد نا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب قبلہ مدظلہ کا ب اور دہ معجزہ محیر و نسکت، ایک ماہوار صحیفہ "قیام الدین" کی صورت مین رونما ہوا ہے، جو آپ ہی کے والد محترم کے نام نامی یا خطاب گرامی پر گزشتہ شوال سے جاری کیا گیا ہے۔

اس سے زیادہ بدقسمتی میری اور کیا ہو سکتی ہے کہ شوال سے محرم تک جبکہ پورے چار مہینے اس مقدس صحیفہ کی اشاعت پر گزر چکے ہین، مین اس کے جلوے سے بالکل بے خبر رہا اور فرنگی محل کے اس "ید بیضا" کی روشنی سے محروم رکھا گیا۔ مین نہین کہہ سکتا کہ یہ دور محرومی کب تک جاری رہتا۔ اگر پرسون اتفاق سے مجھے ایک صاحب اس کی اولین اشاعت کی زیارت سے مشرف نہ فرماتے۔

کسی رسالہ کا پہلا نمبر یا تو اصولاً پورے اہتمام سے نکالا جاتا ہے تاکہ لوگ جلد اسکی طرف مائل ہون یا مجبوراً نامی نظم کی وجہ سے پست شائع ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسا ہوتا ہے تو ہمیشہ یہ معذرت بھی ساتھ ہی ساتھ پیش کر دیجاتی ہے کہ "نئے انتظام کے وجہ سے رسالہ حسب خواہش نہین نکل سکا، آیندہ نمبرون مین انشاء اللہ اسکی پوری تلافی کیجائے گی۔"

چنانچہ یہ معذرت اس مین بھی موجود ہے کہ بوجہ رمضان مبارک کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ گویا رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس مین قیام الدین ایسے کام کو بھی کامیابی سے نہین کر سکتے۔ یہ ہے پہلا درس مذہبیت و جوش ایمان اس رسالہ کا جو اس دعوائے بلند بانگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے[۱]۔ اچھا اب آگے چلئے اور ہندوستان کے خانوادہ علم و عمل، مرکز عقل و حکمت، اور مدار شریعت و روحانیت (فرنگی محل) کے اس کارنامہ فرید، اور راس انقلاب انگیز اقدام علم و ادب پر بھی ایک نگاہ ڈال لین، قبل اس کے کہ وہ زلزلہ پیدا کر کے زمین و آسمان کی بنیادین منہدم کر دے، اور خدا کو بھلا دینے والی موجودہ مخلوق کو فنا کر کے، اس کی جگہ صرف حق سرہ کہنے والیان ہستیان در و دیوار پر بٹھا دے۔

کسی رسالہ یا کتاب پر ہمیشہ دو مختلف زاویون سے نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ ایک وہ جو صوری محاسن سے متعلق ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو جمال معنوی سے بحث کرتا ہے۔ مین اول الذکر حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا نہین چاہتا۔ کیونکہ جو رسالہ معمولی تقطیع کے صرف ۴۰ صفحات پر مشتمل ہو اور جسکی تکمیل مین ارزان ترین اہتمام طباعت و کتابت حاصل کیا گیا ہو، وہ خود بھی حسن ظاہری کا مدعی نہین ہو سکتا۔ اور پھر یون بھی ایک اسلامی رسالہ کو حسن و تزئین سے کیا واسطہ جبکہ علمائے کرام نے ہمیشہ فنون لطیفہ کی ترقی کو انحطاط ذہن و انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ (گو انکی اندرونی زندگی یکسر "شیفتگان جمال" کی طرح بسر ہوتی ہو) البتہ اسکے

---

[۱] اسی رسالہ مین ایک عنایت نامہ مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محل کا درج ہوا ہے جس مین اونھون نے بھی مضمون نہ لکھنے کا سبب یہ ظاہر کیا ہے کہ رمضان مین ان کی فطری کاہلی اور نسیان دونون بڑھ جاتے ہین۔ مگر ممکن ہے کہ اسی کے ساتھ ان کی روحانیت بڑھ جاتی ہو۔ جو غالباً کاہلی و نسیان کا دوسرا اصطلاحی نام ہے۔

معنوی محاسن پر ضرور تبصرہ کرنا چاہتا ہون جو میرا معاصرانہ فرض ہے۔

سب سے پہلے جس وقت مینے فہرست پر نگاہ ڈالی اور بیک وقت سات "مولاناؤن" کے نام نظر آئے، جن مین سے ایک مرحوم اور چھ غیر مرحوم ہین، تو مین حیران رہگیا کہ دیکھئے آثار بر وقت اجتماع کیا انقلاب پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہین کہ نوح کا طوفان اسوقت آیا تھا جب چار سیارے برج آبی مین جمع ہو گئے تھے۔ یہان برج فرنگی مین سات "آسمان" کا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے آنیوالے وقت کا اندازہ کرنے کے لئے عقل حیران ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس "اقرانِ اعظم" اس "اجتماع فرید" کے عہد مین کتنا پانی سر سے گزر جانے والا ہے۔

مین نے اطمینان فرصت مین شروع سے اخیر تک اس رسالہ کا مطالعہ کیا اور کوشش کی کہ سرورق سے لیکر صفحہ آخرین کی اُس سطر تک "جو قیام الدین بک ڈپو فرنگی محل لکھنؤ" کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے، کوئی ایک جملہ، کوئی ایک سطر، کوئی ایک لفظ ایسا مل سکتا، جسے فرنگی محل کی شہرت کے ساتھ (خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز) نسبت دیجا سکتی، لیکن مین اس مین کامیاب نہین ہوا اور گھنٹون سوچتا رہا کہ کیا واقعی ہمارے "علماء کرام" کی ذہنیت اسقدر پست ہو گئی ہے۔ کیا ان کے یہان اظہار علم و فضل کا طریقہ اب یہی رہ گیا ہے کہ بچون کی طرح چند نامربوط سطحی مضامین لکھکر اس پر فخر کرین، کیا خدمت علم و دین ایسے ہی حقیر و نحیف رسائل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کیا اسی کارنامۂ فضل و کمال پر فرنگی محل کے "دار العلوم و العمل" ہونے کا دعوے کیا جاتا ہے (در آنحالیکہ قیام فرنگی محل سے لیکر اسوقت تک کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہین ملتا جس کی بناء پر ہم صحیح معنے مین اسے "دار العلم" کہہ سکین چہ جائیکہ دار العمل جس کا خواب بھی ان غریبون نے کبھی نہین دیکھا۔)

خویش را صورت پرستان ہرزہ رسوا کردہ اند
جلوہ می نامند و در معنی نقابے بیش نیست

اس رسالہ کے اڈیٹر نے عنوان "شکریہ" کے تحت مین جو تحریر درج کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مذہب کی اشاعت علوم کی خدمت، اتحاد و اتفاق کی تعلیم، ادبیات کی چاشنی اور نادر کتب خانون کے قابل قدر اقتباسات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنا" اُس رسالہ کا مقصد ہے۔ لیکن اسی رسالہ مین ایک مضمون یاد بخیر ہمارے محترم دوست مولانا عبد الماجد دریابادی کا بھی ہے جنھون نے فرنگی محل کی قدیم علمی روایات کو سراہتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"آج نوجوان فرنگی محل کو جس اصلی حریف سے صف آرا ہونا ہے خوب جان لینا چاہیئے۔ وہ معتزلہ نہین، خوارج نہین (روافض کا ذکر نہین کیا گیا کیونکہ لکھنؤ مین رہنے کے بعد اسکی ہمت نہ تھی) علی گڈھ کے نیچری بھی نہین، وہ کوئی اسلامی فرقہ نہین، بلکہ وہ اشد شدید دشمن ہے جو نفس اسلام کا دشمن ہے، محض فرنگی محل، اکابر فرنگی محل، شیوخ فرنگی محل، عقائد فرنگی محل کا دشمن نہین۔ وہ دشمن ہے شریعت اسلام کا وہ دشمن ہے رسول اسلام کا وہ دشمن ہے خدائے اسلام کا، اُس سے مصالحت کی کوئی صورت نہین، اُس کے ساتھ راضی نامہ ہو جانے کا

کوئی امکان نہیں .... وہ دور ہذا کی یاجوجی روح ہے جو قیام الدین ہی کی دشمن قاطع ہے۔ اور یہ قیام الدین اسی کو مغلوب کرنیکے لئے نکلا ہے":

"اس جہاد میں فرنگی محل سب کا شریک اور سب فرنگی محل کے شریک ہیں۔ آج نہ کوئی دیوبندی ہے نہ فرنگی محلی، نہ لکھنوی، نہ بریلوی، .... سب کے سب اسلام کے سپاہی، سب کے سب اللہ کے لشکر کے سرفروش پیادے، سب کے سب ناموس رسول کے جانباز فدائی ہیں۔

یاجوج، آج اپنے خفیہ وعلانیہ تیر چلاتے ہوئے یہ بالکل نہیں دیکھ رہا ہے کہ شتر اور دہ بتر فرقوں میں سے کس کے سینے اسکے تیروں سے چھد رہے ہیں، اُسے تو عداوت یا بغض جو کچھ ہے وہ اللہ کی توحید اور رسول کی رسالت سے ہے وہ (خاکم بدہن) اسی کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لئے اُٹھا ہے۔ آج ہم بھی اس یاجوج کی عداوت و بغض میں سب کی طرف سے اندھے ہوگئے ہیں .... اور ہمارے حملوں کی زد بھی انشاء اللہ اسی ایک حریف پر رہے گی":

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسالہ کا مقصد وحید، یاجوجی روح کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر ہم غلط نہیں سمجھتے تو اس سے مراد ان کی غالباً وہ عقل پسند (Rationalist) (اور ان کے نزدیک وہ احمق) طبقہ ہے جو کسی مذہب کی حقیقت وحقانیت کو بغیر سمجھے ہوئے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اگر اس سے مراد اُن کی کچھ اور ہے تو افسوس ہے کہ میں اسکو سمجھ نہیں سکا۔ کاش وہ اس استعارہ کی خود ہی صراحت فرماتے تاکہ اس یاجوجی تاویل کی ضرورت نہ ہوتی۔

ایک اور بزرگ ہیں جن کا نام سید محمد اشفاق حسین رضوی ہے۔ ان کا بھی ایک مبتدیانہ مضمون "قیام الدین اور اتحاد" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کی ابتدا ہی یوں ہوتی ہے کہ "اگر آپ لوگ متفق ہو کر اس رسالہ کی خریداری پر بجان و دل تیار و آمادہ ہو جائیں تو یقیناً لا مذہبیت کا خاتمہ ہو جائے":

اگر اس کو ہم مولانا عبد الماجد دریابادی کی تحریر کا تتمہ خیال کریں تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد یاجوجی قوت یا لا مذہبیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ خیر اس کے متعلق تو میں تفصیل کے ساتھ آئندہ صفحات میں (یا اگر گنجائش نہ ہوئی تو آئندہ ماہ کے ملاحظات میں) عرض کرونگا کہ جس چیز کو وہ لا مذہبیت کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے اور جس کا نام مذہب رکھ لیا گیا ہے وہ فی الاصل کیا چیز ہے؟ پہلے ایک سرسری جائزہ اس "دین قائم کرنیوالے" رسالہ کے مقالات عالیہ کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شکریہ کے بعد سب سے پہلا مضمون مولانا قیام الدین عبد الباری مرحوم کا نظر آتا ہے جن کے نام کے جزء اول یا لقب سے اس رسالہ کا نام استعارہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون مولانا موصوف کی تفسیر الطاف الرحمن کا ایک جزو ہے اور تیسرے پارہ کی پہلی آیت سے متعلق ہے جو تلک الرسل سے شروع ہو کر فضل ما یرید پر ختم ہوتی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ مولانا

نے فرمایا ہے وہ بالکل وہی ہے جبکی فرنگی محل کے کسی عالم سے توقع کیجا سکتی ہے اور اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ملا نظام الدین، عبدالحکیم بحر العلوم اور ابو الحسنات عبدالحی کے وقت سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے اور جسکا عنصر واحد کورانہ تقلید، مغالطۂ منطقی اور قدامت پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مولانا عبدالباری مرحوم اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرے پر فضیلت انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھ جاتے ہیں کہ "خدا نے فرمایا تم بھی رسولوں میں سے ہو بلکہ افضل ترین رسل سے ہو" اسی میں لفظ "افضل ترین" کی صحت و عدم صحت سے بحث نہ کرتے ہوئے، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس آیت سے محمدؐ کی افضلیت تمام رسولوں پر کیسے ثابت ہوتی ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں عیسیٰؑ کی افضلیت کا بیان ہے جسے "اٰتینا عیسیٰ ابن مریم البینات وایدناہ بروح القدس" سے ثابت کیا گیا ہے۔ محمدؐ کی افضلیت کا ذکر کسی جگہ نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق سے متبادر ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا عبدالباری نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "رسول وہ نبیؑ ہے جس پر کتاب نازل ہوئی ہو اور اُس کی شریعت خاص ہو وہ ۳۶۰ ہیں" میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا نے ۳۶۰ کی تحدید و تخصیص کس تحقیق کی بنا پر کی ہے اور کیوں نہ میں اس کو ۳۶۵ کردوں تاکہ سال کے پورے دنوں کا حساب ہو جائے۔

اس کے بعد ایک صفحہ فتاوائے قیام الدین کے لئے وقف ہے جس میں چند نہایت ہی معمولی مسائل مسواک اور نماز جمعہ وغیرہ کے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو فقہ کی ابتدائی کتابوں میں بھی ملجاتے ہیں۔

صفحہ ۷ سے ایک مسلسل مضمون مولانا عبدالباری مفتی اجمیری کا "حیات طیبہ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے مقصود مولانا عبدالباری مرحوم کے حالات سے بحث کرنا ہے۔

ابتدائی دو صفحات میں مولانا عبدالباری کی ولادت کا ذکر بالکل اسی لہجہ و انداز میں کیا گیا ہے جو عام طور سے ذکر میلاد کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور باقی دو صفحات میں فرنگی محل کی تعریف کا راگ گایا ہے۔ جناب مفتی مولانا بھی ہیں اور اجمیری بھی اور اُنکی یہ دونوں نسبتیں بدرجۂ اتم اس مضمون کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہیں۔

اس کے بعد مولانا عبدالماجد بدایونی نے ایک صفحہ میں مرحبا کے عنوان سے قیام الدین کے اجرا پر اظہار مسرت کیا ہے اور دعا فرمائی ہے کہ "یہ رسالہ علمی دنیا کے لئے ایک یادگار چیز ہو" اس دعا کی سادگی اور تمنا کی معصومیت پر عرض ہوا غالب اظہار خیال کر گیا ہے کہ "حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز" کاش مولانا کوئی التجا کرتے تو اس نوع کی کہ "دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز" اسکے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا وہ مضمون ہے جسکا اقتباس ہم پہلے دے چکے ہیں اور پھر مولانا شاہ حسین میاں پھلواروی کا وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جسمیں اُنھوں نے مولانا عبدالباری مرحوم کے جوش جہاد و مذہبیت کا ذکر لیدرانہ واعظانہ رنگ میں کیا ہے اور جسکا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

> "جناب مولانا ہمیشہ جہاد کے لئے طیار رہتے تھے۔ ایک بار منت مانی کہ جب دانت ٹوٹیں گے تو جہاد کرونگا، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانہ میں کسی خاص موقعہ پر جب آپ جہاد کے لئے طیار ہو گئے تھے تو یہ سوچکر کہ منت پوری کرنا ضروری ہے آپ فوراً اسپتال تشریف لیگئے اور سامنے کے چار دانت تڑوا دئے"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ فاضل مضمون نگار نے اس واقعہ کے اظہار سے مولانا مرحوم کی کس خصوصیت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مولانا مرحوم میں جوشِ جہاد زیادہ قوی تھا یا منت پوری کرنے کا خیال۔ جہاد تو خیر انھوں نے کیا یا نہیں لیکن دانت توڑوا دینا تو سامنے کا واقعہ ہے اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ منت پورا کرنے کا خیال ان میں سب زیادہ قوی تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ لکھنو کی فضا میں پرورش پانے کے بعد اسی قسم کے انسانی و رسمی جذبات زیادہ نشوونما پا سکتے ہیں۔

اس کے بعد "قیام الدین اور اتحاد" کے عنوان سے اشفاق حسین صاحب رضوی کا مضمون ہے اور پھر مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا عنایت نامہ جن کا اجمالی ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ صفحہ ۴۲ سے زکوٰۃ پر جناب مولانا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب کی تحقیق فرید شروع ہوتی ہے جس میں انھیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو ایک واعظ کی طرف سے "ہر محراب و منبر" پر بیان کئے جاتے ہیں۔ مسئلہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ضروری و اہم چیز ان اقتصادی مسائل و اصول سرمایہ داری کی بحث ہے، جن پر آجکل تمدن کی ترقی کا انحصار ہے اور جو صحیح معنے میں نوع انسانی کو جمہوریت و آزادی کی طرف لیجاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ مسائل زکوٰۃ میں وقت و زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی ضرورت پر اظہار خیال ضروری ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ باتیں مولانا کے "نظامی" دسترس سے باہر ہیں۔ اور وہ سوائے اُسی ایک ارغنون کی آواز کے جو فرنگی محل کے معلم اول نے ساز کیا تھا، کوئی اور نغمہ پیدا کر ہی نہیں سکتے۔

اس کے بعد ایک مضمون سلسلِ تصوف پر بشیر احمد صاحب علوی کا ہے اور دوسرا "ہندوستان قبل اسلام" کے عنوان سے جناب اڈیٹر کا۔ ان دونوں کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ آخر الذکر مضمون کے لئے جو چار صفحات ضائع کئے گئے ہیں وہ اول الذکر مضمون ہی کو ملنا چاہیئے تھے۔

اس رسالہ کے مقاصد میں چونکہ "ادبیات کی چاشنی" بھی شامل ہے، اس لئے اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمالیجیے اور تھوڑی دیر کے لئے اس حقیقت کو بھلا دیجیے کہ یہ اشعار اس رسالہ میں پائے جاتے ہیں جو قیام مذہبیت، تحسین اخلاق، نشر علم و حکمت ایسے سنجیدہ اور اہم مباحث کے لئے اس مقام سے نکلا ہے جسے "دار العلم والعمل" کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا۔
شاہ حسین میاں کے اس مضمون کے بعد ہی جس میں مولانا عبد الباری مرحوم کے جوش جہاد اور "دندان شہید" کا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب وحید کی ایک غزل درج ہوتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

بے مزہ اسواسطے آوازِ نے ہونے لگی ؛ ریش قاضی پنبۂ مینائے مے ہونے لگی ؛

دونوں مصرعے خواہ کتنے ہی بے ربط ہوں اور یہ شعر اپنی جگہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو، لیکن اڈیٹر رسالہ کے حسن انتخاب کی داد دینا ضرور ہے کہ شاہ حسین میاں کے اس مضمون کے بعد اس سے بہتر "تنقید تعریضی" اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

کیون نہ وہ طوفان اُٹھائے کیون نہ مجھکو فریب تیری ہی جانب سے جب دشمن کو شے ہونے لگی

"شے ہونے لگی" کی داد صرف خواجہ عبدالرؤف عشرت دے سکتے ہین جو لکھنؤ کی زباندانی کے سب سے بڑے علمبردار ہین

تیسرا بے پناہ شعر بھی سُن لیجئے:-

ہو گئے بدکیف دشمن تنگ ظرفی کے سبب اس قدر پی لی کہ آخر سب کو قے ہونے لگی

لطف یہ ہے کہ اس غزل کے بعد ہی "فیوض حضرت بالسنہ" کا اشتہار درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۷ پر جناب شیدا لکھنوی کی ایک غزل درج ہے آپ کے الہامات شعری بھی ملاحظہ ہون۔

تم جو اٹھلا کے چلو حشر ہی برپا ہو جائے اغضین قدمون کی قسم کیا سے ابھی کیا ہو جائے

دست نازک سے بھلا سر کا قلم ہو نا کیسا ہاتھ بدتے ہین اگر کھینچے سیدھا ہو جائے

تیر دزدیدہ نظر دل کا تجسس نہ کرے سینہ تک آکے ذرا پاؤن پہ ترچھا ہو جائے

الغرض یہ ہین وہ "ادبیات عالیہ" اور یہ ہین وہ "مذہبیات و حکمیات فائقہ" جن کے ذریعہ سے "قیام الدین" دنیا مین ذہنی و علمی، اخلاقی و مذہبی زندگی پیدا کرنے کے لئے رونما ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان عدیم النظیر تحقیقات حکمیہ اور ادبی شاہکارون کو دیکھکر کوئی کافر ہی ہوگا جو اس دعوے کی صحت پر ایمان نہ لے آئے۔

ماہ آیندہ کے ملاحظات مین، ہمارا خطاب صرف مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہوگا اور ہم بتائین گے کہ یاجوجی قوت کا حقیقی سرچشمہ کہان ہے اور یہ کہ صحیح معنے مین اس کے عساکر کا اجتماع کہان پایا جاتا ہے۔ جہان "قیام دین" کی ضرورت بتائی جاتی ہے، وہان، یا اس جگہ جہان سے "قیام دین" کی آواز بلند کیجاتی ہے۔

آگاہ نہ تپ درون را ، نشتر چہ زنی رگ جنون را

اس ماہ کی اشاعت مین ہمارے فاضل دوست مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "بحث سنت" پر غور سے پڑھنے کے قابل ہے یہ ماہ آیندہ مین ختم ہو جائے گا۔ اگر مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔اے جنکے جواب مین یہ مقالہ تحریر ہوا ہے، اس پر کوئی ایراد پیش کرینگے تو وہ بھی درج کیا جائے گا۔ اور پھر مین اپنی حقیر رائے اس نزاع پر پیش کرونگا۔ قرآن کے لطائف ادبیہ اور آصفی نظامی دونون مضمون سلسلہ کے ہین۔

ہمارے عزیز دوست مولوی علی اختر صاحب اختر نے جس تکمیل کے ساتھ اس مشکل مسئلہ پر بحث کی ہے وہ حقیقتاً شاعری کی دنیا مین کوئی معمولی چیز نہین۔

نیاز

سلہ محاورہ تو "ناک بدنا" ہے۔

خاقانی ہند قاآنی عصر علامہ آصفی نظامی ؒ

(مسلسل)

۳۔ عرفی کی کائناتِ بہار ختم ہو چکی لیکن آصفی کی حقیقت ابھی تک بے نقاب نہیں ہوئی ہے۔ عرفی معیار بہار نہیں تھا لیکن معیار ہر قاآنی ہے۔ اسلئے اب ہم آصفی کو وہمیات کے بجائے، وجدان اور فطرت میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں یہی اسکا کمال ہے۔ اور اسی جگہ سے اس کے حدود، ایران اور ہندوستان کے تمام شعرا سے الگ ہوتے ہیں۔

درحقیقت آصفی، قاآنی کے پیرو ہیں۔ جو نیچر کا سب سے بڑا غماز ہے اس کے قصائد پر قصائد پڑھتے چلے جاؤ فطرت اور اس کے رموز و اسرار کا بیان ختم ہی نہیں ہوتا۔ ابر و باد، بہار و خزاں گلبن و بوستان، وغیرہ سے متعلق۔ سیکڑوں تشبیہیں لکھی ہیں۔ اور کچھ ایسی بامزہ لکھی ہیں کہ "لا عین رأت ولا اذن سمعت" دنیا مردہ پرست ہے۔ بڑے بڑے نام آور ادیب، زندگی میں ایک نگاہ التفات کے لئے ترس کر مر گئے لیکن دنیا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہی ہستیاں مرنے کے بعد علم ادب کی مسجود قرار پائیں، اور ہر شخص نے عقیدت کے دو چار پھول ضرور چڑھائے۔

کمال کی ناقدری کسی خاص زمانہ اور خاص ملک میں شیوۂ عوام و خواص نہیں رہا ہے ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانہ میں یہی شکایت نظر آتی ہے۔ ابن رشیق قیروانی صاحب العمدۃ فی صناعۃ الشعر نے ایک قطعہ لکھا ہے۔ صاحب معجم الادبا اسکی شانِ نزول یہ لکھتا ہے۔ کہ ایک ادیب نے طبقات الشعرا لکھنا شروع کی۔ اور تبصرہ میں تقدم و تاخر کو وجہ فضیلت قرار دیا۔ بات بہت کمزور تھی۔ کوئی ضروری نہیں۔ کہ زمانہ کا تقدم، علم و فضل، اور سعادت و فطانت میں بھی پیش پیش رکھے۔ ابن رشیق ان تمام شعرا سے کم سن تھے۔ جنکا کتاب میں ذکر تھا۔ اسلئے یہ سب سے کم رتبہ قرار دیئے گئے تھے، انھیں خبر ہوئی تو یہ قطعہ لکھ بھیجا

دفقاً ابا اسحاق بالعالم حصلت فی اضیق من خاتم
لوکان فضل السبق ممدوحۃ فضل ابلیس علی آدم

ابو اسحق دنیا سے بہ نرمی و ملائمت پیش آؤ۔ تم انگوٹھی سے تنگ تر حلقہ میں پھنس گئے۔
اگر سابق کی فضیلت میں وسعت ہوتی۔ تو شیطان آدم علیہ السلام سے بزرگ تر تھا۔

جب یہ قطعہ ابو اسحق تک پہنچا۔ تو انھوں نے مجوزہ اسلوب بدل دیا۔ اسی مفہوم کو ابن شرف قیروانی نے دو قطعوں میں ادا کیا ہے

قل لمن لا یری المعاصر حقا ویری للاوائل التقدیما
ان ذاک القدیم کان جدیدا وسیغدو ھذا الجدید قدیما

اس شخص سے کہدو۔ جو اپنے معاصرین کا حق شناس نہیں بجز سلف اور گذشتہ آدمیون کو افضل جانتا ہی،
کہ یہ کہنہ بھی کبھی نیا تھا۔ اور عنقریب یہ نیا بھی قدیم ہو جائیگا
دوسرے قطعہ مین اس کی وجہ بھی بیان کرتا ہے۔

يغري الناس بامتداح القديم		ويذم الحديث غير الذميم
ليس الا لانهم حسدوا الحي		ورقوا على العظام الرميم

مطلب یہ ہے۔ کہ لوگ پورانے لوگون کی تعریف اور نئے آدمیون کی برائی صرف اسلئے کرتے ہین۔ کہ انکو دیکھ نہین سکتے۔ حسد کے مارے اور کچھ نہین تو مذمت ہی شروع کر دیتے ہین۔

مولانا آصفی نے بھی متعدد مرتبہ یہی سبق دھرایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انھین بجا شکایت ہے۔ جو ذات متقدمین، متوسطین، متاخرین ہر طبقہ کی حریف ہو وہ یون محروم التفات رہجائے ہزار و صد ہزار حیف ہے۔

آمدم برسر مطلب۔

۱۔ قاآنی نے ایک تشبیب مین، بادل کا سمان نظم کیا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہے۔ کہ۔

"بخارات اُٹھ اُٹھکر جو سما مین سیاہ چادر سی بنجاتے ہین۔ ہوا چلتی ہے۔ اور اس سیاہ چادر کو عالم پر تان دیتی ہے۔ بدلیان آتی ہین۔ گرجتی ہین۔ اور برستی ہین۔ بجلیان پیدا ہوتی ہین۔ کڑکتی ہین۔ اور چمکتی ہین۔"

میر محبوب علی خان والئ دکن کی مدح مین، مولانا نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب مین، یہی سمان بیان کیا ہے۔ ہم دونون تشبیبین دوش بدوش نقل کرتے ہین۔ انصاف پسند دماغ دیکھین۔ کس طرح ایک ہندی، ایرانی شہسوار سے گوئے سبقت لیجانا چاہتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ان کی جانب سے ابن شیوق اور ابن شرف کا جواب دہرایا جائے

قاآنی		آصفی
بگردون تیرہ ابرے، بامدادان بر شد از دریا		چہ دود است این کہ پوشیدہ است روئے نیلگون دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا		زدریا سر برآوردہ، چو دیوے شد ہوا پیما
چو چشم اہرمن خیرہ، چو روئ زنگیان تیرہ		رود آشفتہ از جیحون، دود شوریدہ در ہامون
شدہ لگفتی اہرچیرہ بغرش علت سودا		پریشان صورت مجنون، ورم چون طرۂ لیلی
شبہ گون چون شب عاشق، گرفتہ چون دل عاشق		شب تار از شہ زنگی، سیہ چون چہرۂ زنگی
باشک دیدۂ وامق، برنگ طرۂ عذرا		عیان آثار دلتنگی، نہان جمعیت دلہا
تنش با قیر آلودہ، دلش از شیر آمودہ		چو شام عاشقان تیرہ، چو مغز کافران خیرہ
برون پُر سرمہ سودہ، درون پر لولوئ لالا		بدشت و کوہ شد چیرہ، بگردون کردہ استیلا

قاآنی	آصفی
بدل گلشن بہ تن زندان، گہے گریان گہے خندان	بود چون کوہ گردندہ، بسوئے چرخ پوئندہ
چو در بزم طرب، رندان ز شور نشاءِ صہبا	ز کانِ خویش ریزندہ، بدریا جوہر والا
چو دودے بر ہوا رفتہ، چو دیوے مست آشفتہ	نہنگے بر ہوا رفتہ، در آغوشش فلک خفتہ
زرہ ابس در نا سفتہ، ز مستی خیرہ در خارا	بکامِ خویش بگرفتہ، چو ماہی، یونس بیضا
شدہ خورشید نور افشان، بنازی حریم او پنہان	چو پیلے بحر را نوشد، چو شیر مست بخروشد
چو شاہ مصر در زندان، چو ماہ و چرخ در ظلما	چو بیضہ، چرخ را پوشد، کشاید شہپر عنقا
و یا در پردہ چہ بیژن، نہفتہ چہرۂ روشن	ہوا تازندہ گل گونش، برد جولان بہ گردونش
دیار روشن گہر بہمن، شدہ در کام اژدرہا	ز دشت و کوہ دہامونش، محابا نیست نے پروا
ز بیمش مرغ جان پرد، ز ہمش زہرہا درد	بگردون میکشد آوا، ز سودا می کند غوغا
چو او چون اژدرہا غرد، دو چون دد کشد آوا	تنش را علتِ سودا، دلش را علتِ صفرا
خرد شد ہر دم از گردون، کہ پوشد بر تنِ ہامون	چو عفریت ست روئے او، فرشتہ وار خوئے او
ز سنبل کسوتِ اکسون، ز ژالہ خلعتِ دیبا	ز خشک و تر لبوئے او، بود چشم امل ایما
فشاند بر چمن ژالہ، دماند از دمن لالہ	بہ بر نیلی قبا دارد، ز جیب اختر فرو بارد
چنان از دل کشد نالہ، کہ سعد از فرقتِ اسما	بکوہ و دشت گل کارد، بنورش گرچہ از ظلما

یہاں سے قاآنی نے چمن کی طرف گریز کی ہے۔ ابر کی کوئی نئی تشبیہ نہیں لکھی۔ آصفی کی ندرتِ تشبیہ پر پہلے بھی متعدد دلائل گذر چکے ہیں۔ یہ قصیدہ مہر ہے۔ جو فطرت نے ختم شعور پر ثبت کر دی ہے۔ امثال و نظائر کا دریا امنڈ پڑا ہے۔ دیکھو کس خوبی کے ساتھ قاآنی کی کمی کو ایک ہندی داغ نے پورا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جہان از گریہ اش خندان، ز جیبش لؤلؤ و مرجان ۔۔۔ بجیبِ گلشن و بستان، بکوہ و دامنِ صحرا

درونش مشرقِ بیضا، برونش ہمچو شب یلدا ۔۔۔ درون چون طلعتِ عذرا، برون چون طرۂ لیلیٰ

گہے چون پیل غرندہ، گہے چون نیل جوشندہ ۔۔۔ گہے چون سیل ریزندہ، بسوئے پستی از بالا

گہے رقصیدہ مستانہ، گہے پوشیدہ دیوانہ ۔۔۔ بآرد بو ویرانہ، ستان رہ بردہ گہ در وا

بود گرئیدہ چون عاشق، پریشان چون دلِ وامق ۔۔۔ بہ پہنائے شبِ غاسق، ز دردِ فرقتِ عذرا

فشاند شعلۂ آذر، کشد دم صورتِ اژدر ۔۔۔ بغرد ہمچو شیرِ نر، کند چون دیو استیلا

جہد از مغزِ او آذر، چکد از چشم او گوہر ۔۔۔ چہ گوہر، یکسرہ اختر، چہ اختر، اخترِ رخشا

فلک در زیر آید، زمین پر شیر بنماید ۔۔۔ دہانِ غنچہ بکشاید، پے آن شیر طفل آسا

گہے گوہر چکد از دے، گہے صورے دمد از دے گہے سنبل شود از وے، اسیر علت سودا
سراسر چشمۂ قطرک، شود از دامنش ریزان بود در قطرہ اش پنہان، بہار عشرت دلہا

۲- شاہزادۂ شجاع السلطنتہ کی مدح مین قاآنی کا ایک قصیدہ ہے سہ زد بدلم اے نسیم آتش ہجران یار تشبیب کی ابتدا وصف شراب سے کی ہے۔ مگر ثانی مطلع سے بہار کی طرف گریز ہے۔ آصفی نے میرزا عبدالرحیم معتمد صرف خاص کی ستائش مین جو قصیدہ لکھا ہے۔ وہ اسی بحر مین ہے۔ اور بہار یہ ہے۔

اللہ اللہ۔ قاآنی کے سامنے زبان کھولنا۔ اور پھر وہ بھی حریف بنکر سہ

کارے ست کہ ہیچ کس نکردہ ست ہنوز

قاآنی مژدہ کہ شد در چمن رایت گل آشکار برد سوئے کوہسار، کوکبہ ابر بہار آصفی
مژدہ کہ سرزد سمن از دمن و مرغزار بہمن و دی گشت زار، از غم آن گیر و دار

ابر بہار، اپنے جرار لشکری لیکر، خزان کو پامال کرنے کے لئے نکلا ہے پکڑ دھکڑ کے خوف سے بہمن و دے (خزان کے دو ماہ) کے لشکر مین وہ ہلچل پڑی ہے۔ کہ خدا محفوظ رکھے۔

قاآنی وجد کنان شاخ گل از اثر باد صبح سوری رومی عذار، قلب گرفت استوار آصفی
رقص کنان سرو ناز، برطرف جوئبار لالہ قزلباش وار، صف زدہ در ہر کنار

سوری، ایک قسم کا سرخ رنگ پھول ہے۔ وہ قلب فوج کا کماندار ہے۔ ادھر دونون بازو ون میمنہ اور میسرہ پر گل لالہ ترکون کی طرح، ڈٹے کھڑے ہین۔

قاآنی لالہ بکف جام مے، گشتہ مہیائے عیش تاخت بہر باغ و کشت، لشکر اردی بہشت آصفی
گرچہ ز نقصان عمر ہست بدل داغدار دشت ازان شد بہشت، داغ شدہ مرغزار

اردی بہشت (بہار کا ایک مہینہ) کا لشکر چارون طرف، کھیتون اور باغون مین جا پہنچا۔ اور خزان کا عمل اُٹھ گیا اب چٹیل میدان، چمن، اور بن سبزہ زار نظر آرہے ہین۔

قاآنی گوش فرادادہ گل تا بچمن بشنود گیسوئی نرگس بکف نیزہ دود ہر طرف آصفی
از دہن عندلیب شرح غم بیشمار خیل خزان صف بصف، شد بستا نش فگار

نرگس نے نیزہ ہاتھ مین لیکر خزان کی صفون کی صفین الٹ دین ہین۔ جدہر دیکھئے۔ زخمی اور مقتولون کے انبار لگے ہین

قاآنی زان بزبان فصیح کردہ روایات شوق سوسن زنگی سرشت، ہمرہ اردی بہشت آصفی
قصہ ز ہجران گل، شکوہ ز بیداد خار کرد تبر در بین وخشت، حملہ یمین و یسار

اردی بہشت کے ہمراہ سوسن بھی، چھوٹے چھوٹے برچھے لیکر داہنے اور بائین حملہ آور ہے۔

قاآنی — آصفی

وقتِ سحر گشت باز دیدۂ نرگس ز خواب — خنجر سوسن کشاد ، یکسرہ خونِ فساد
تا کہ صبوحی زند از پئے دفعِ خمار — سینۂ گلزار داد ، خونِ خزان آشکار

سوسن نے خزان کے سینہ مین خنجر مار کر، سارا فاسد خون نکالدیا یہ لالہ کاریان، اسی خون کی ہین، جو چمن مین نظر آرہی ہین

قاآنی — آصفی

غنچہ کشاید دہن، تا کہ ز پستانِ ابر — خشک و ہمہ تر گرفت . بحر و ہمہ بر گرفت
از قطراتِ مطر، شیر خورد طفلِ دار — دشت و چمن در گرفت، موکبِ فصلِ بہار

غرضکہ لشکر بہار نے خشکی اور تری سب پر قبضہ کر لیا ۔ اب دشت و چمن، بحر و بر سب اس کے زیر نگین ہے ۔

قاآنی — آصفی

باد بر خسارِ باغ غالیہ سائی کند — چغد و چہ زاغ و زغن با ہمہ رنج و محن
زینتِ سمن را دہد، نفحۂ مشکِ تتار — رفت بدشت و دمن ، از چمن و مرغزار

منحوس ویرانہ پسند پرندے ، الو، کوے، اور چیلین سب چمن اور سبزہ زارون کو چھوڑ کر جنگلون مین پناہ گزین ہوگئے ہین ۔ اب ان کے لئے یہان جائے امن نہین ۔

قاآنی — آصفی

چہرۂ یاسمین رود در عرق از آفتاب — فاختہ دہم ہزار ، در چمن و مرغزار
مژدہ زان رود دہد، باد بدستِ چنار — کبک و کلنگان و سار ، بر طرفِ جویبار
لالہ بسانِ صدف ابر در د چون گہر — زمزمۂ بلبلان ، ہمہمۂ صلصلان
شاخ شود بارور ، باد شود مشکبار — خندۂ عیشِ گلان ، بردہ ز دلہا قرار

اب چمن مین اور نہر کے کنارے ، فاختہ ، بلبل ، کبک ، کلنگ اور سارس براج رہے ہین ۔ اور خوشنوا پرندون کی نغمہ آفرینی، اور پھولون کے خندہ سے دل بے تاب ہوا جاتا ہے ۔

قاآنی — آصفی

سوسن ازان رو شدست شہرہ بآزادگی — رقص کنان شاخِ گل، دست فشان سنبلے
کز دل و جان میکند مدحِ شہِ کامگار — این بصدائے دہل ، وان نوای ہزار

قاآنی نے مدح کی طرف گریز کر لی ۔ لیکن آصفی کی مواج طبیعت ابھی طوفانی ہے ۔ ہوا سے پھولون کی ڈالیان ناچ رہی ہین ۔ بلبلین گانے مین مصروف ہین ۔ لوگ شراب پی پی کر، دہل کی آواز پر کود رہے ہین

سرو شد آراستہ ، چون بتِ نوخاستہ — شد ہمہ دل خواستہ سازِ نشاطِ بہار
نامیہ از ساحری ، ساختہ صنعت گری — بتکدۂ آذری ، گشتہ چمن از نگار

قوتِ نشو و نما نے جادو سا کیا ہے کہ نقش و نگار سے ، چمن ، آذر کا بتکدہ نظر آتا ہے ۔ رنگ برنگ پھول اس خوبصورتی سے بنائے ہین ۔ کہ عقل حیرت کرتی ہے ۔

ساغرِ یاقوت رنگ ، پر ز شرابِ فرنگ — یا کہ دمیدہ ز سنگ ، لالۂ احمر عذار

گل لالہ، پہاڑون مین کھلا ہوا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یاقوت رنگ پیالہ ہے۔ جس مین یورپ کی سرخ سرخ شراب بھری ہے

غنچہ صراحی بدست، لالہ بود می پرست　　گل ز طرب نیم مست، نرگس از آن در خمار

غنچہ کے ہاتھ مین صراحی ہے۔ لالہ اس مین سے لیکر پی رہا ہے۔ پھول سرخوش ہین۔ اور نرگس پر خمار

ز آتش می بلبلہ۔ سوخت چنان مشعلہ　　شد ہمہ را مشغلہ، بر صفت شغلہ زار

چونکہ شراب کا رنگ سرخ ہوتا ہے، اسلئے۔ بیک نظر یہ خیال گزرتا ہے۔ کہ شعلے ہین۔ جو گلاس مین بھر دیئے ہین۔ جب شراب گلاس مین انڈیلی جاتی ہے۔ تو تیزی اور جوش کی وجہ سے جھاگ پیدا کر دیتی ہے۔ جو بالآخر ہوا سے مر جاتے ہین۔ شاعر یہ منظر دیکھ کر خیال کرتا ہے۔ کہ یہ جھاگ نہین ہین۔ مشعلین ہین۔ جو آتش مے سے روشن کر دی گئی ہین۔

بادہ میان قدح، جوہر جان قدح　　دادہ نشان قدح، لمعۂ آن ہر کنار

لالہ بود مست می، قطرۂ شبنم چو خوی　　ریختہ بر روی وی، ہمچو در شاہوار

نامیہ چون سر زدہ، بادیہ خرم شدہ　　گشت ہمہ گلکدہ، دشت و دمن، کوہسار

سبزۂ لیلی نسب، زد بہوائے طرب　　خیمہ برسم عرب، در چمن و مرغزار

ژالہ بصحراء و راغ، چون گہر شب چراغ　　قطرہ بر اطراف باغ، کوکب شبہائے تار

غالیہ سا گشت باد، طرۂ سنبل کشاد　　ہم گل مشکیچہ داد، نکہت مشک تتار

گشت بفیض نسیم، زندہ عظام رمیم　　عیسئ گل را شمیم، شد نفس روح بار

دیدۂ نرگس بخواب، طرۂ سنبل بتاب　　عارض ہر گل بآب، بلکہ بود شعلہ بار

ایک طرف قاآنی کا قصیدہ پڑھو۔ دوسرے پہلو مین آصفی کی گلکاریان دیکھو حق یہ ہے۔ کہ ہندوستان کا قاآنی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا قلم بھی دریائے مواج کی مانند، غم بلند و پست سے بے نیاز ہے۔ الفاظ کی ہم آہنگی، بحر کی موسیقیت بندش کی چستی، تراکیب کا ترنم، زبان کی چاشنی، وہ کون سی صفت ہے، جو قاآنی مین ہے اور آصفی مین نہین پھر تخیل کا ہلکا ہلکا رنگ اس پر مستزاد ہے۔

۳ - قاآنی نے حاجی آقاسی مرزا کی مدح مین بہاریہ لکھا ہے۔ مطلع ہے۔

عطسۂ مشکین زند ہر دم نسیم مشکبار　　باد، گوئی، آہوے چین ست کارد مشک بار

آصفی نے بھی اس بحر مین قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب کی ابتدا صنع باری سے کی ہے۔ قطرت کی چمن آرائیان، قدرت کی نیرنگیان، اور عالم خاک و باد پر حکمت باری کی گل کاریان بیان کرتے کرتے، بہار کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ فرماتے ہین۔

عالم امثال، اگر خواہی، کہ بینی آشکار　　عینک گلہا بنہ بر دیدہ ہائے اعتبار

دیدۂ اعمی زراز خاک، بر گیر د سراغ　　پردۂ چشمش شود گل برگ در شبہائے تار

ہر کجا بینند، ریزد کیسۂ گل زرِ ناب — خاک باشد بوتۂ زر، کیمیاگر تو بہار
سبزۂ پیروزہ گون و لالۂ لعل رنگ — لاجورد و نیلے آمیزد بہ نقشِ روزگار
کارگاہِ باغ را بینی پر از چینی حریر — دشت را یابی نگارستانے از رومی نگار
دامنِ باغ ست، از لالہ، چو باغِ کاشمر — جیبِ باغ ست از گلِ مشکیچہ چون پشتِ تتار

کیسا سادہ لطیف، اور پر کیف طرز ادا ہے، ہر ہر شعر بہار در دامن نظر آتا ہے۔ ذیل کے اشعار مین تخیل کی رنگ آمیزی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تاج محل کی پچی کاری ہے۔

عکسِ موجِ لالہ و گل گر بآبِ جو فتد — رنگ چون قوسِ قزح بالد بموجِ جوئبار

نہر کے کنارے لالہ اور گلاب لہلہا رہا ہے۔ جب ہوا سے درخت اور پودے جھومتے مین یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ رنگ کے دریا مین موجین اُٹھ رہی ہین۔ جب اس منظر کا عکس نہر مین دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ نیلے پانی پر دھنک ہے، جو ہوا سے لہرا رہی ہے کیسی خوبصورت مرکب تشبیہ ہے۔

گر صبا از کوہسار آن جانبِ صحرا رود — دامنِ صحرا شود از گردِ راہش لالہ زار

پہاڑ کے دامن سے ہوا گذرتی ہے۔ تو اسقدر رنگ بدامن ہو جاتی ہے۔ کہ جس جنگل مین سے گذر جاتی۔ سارا کا سارا گلِ لالہ کا تختہ معلوم ہوتا ہے۔ سبحان اللہ رنگ کا طوفان امنڈ آیا ہے۔ گرد و غبار تک سرخ ہو گیا۔ برسات مین سارا جنگل چمن بنجاتا ہے جس طرف دیکھئے۔ پھول ہی پھول کھلے ہوتے ہین۔ شاعر اسکی وجہ یہ قرار دیتا ہے۔ کہ دامنِ کوہ سے ہوا اپنے ہمراہ جو غبار اڑا لیگئی تھی وہ اس طرح رنگ رنگ کے پھولون کی شکل مین نمایان ہوا ہے۔

شد چمن از سبزۂ خرم چو طوطی سبز پوش — بالِ طوطی میدہد جائے گیا در سبزہ زار

ہری ہری گھاس کا جنگل مین دور دورہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحرا طوطا ہے۔ اور گھانس اسکے پر ہین۔

صورتِ سبزک شود، بالِ حواصل سیز رنگ — پر فشاند زاہتزازِ باد اگر در مرغزار

سبزک، ایک قسم کا رنگین پرندہ۔ غالبًا نیل کنٹھ۔ حواصل دریائی پرندہ۔ غالبًا بگلا۔ اگر مرغزار مین سفید رنگ پرندہ پر پھڑ پھڑائے۔ تو نیل کنٹھ کی طرح رنگین ہو جائے۔

از ہوا، جامِ زمرد گون شود جامِ بلور — غورہ گردد قطرۂ شبنم ز عکسِ سبزہ زار
از نمو چون کاکلِ سنبل شود دودِ چراغ — غنچۂ گل از ہوا گردد چہ شعلہ چہ شرار
باد در گوشِ صدف گوید اگر حرفِ بہار — غنچۂ رنگین شود در بحر، درِ شاہوار

سبحان اللہ، حسنِ تخیل، اور جدتِ ادا نے کیسی سحر کاری کی ہے اگر سیپ کے کان مین ہوا موسم بہار کی کوئی بات کہدے، تو موتی جو سیپ کے اندر ہوتا ہے۔ اپنی ہیئت تبدیل کرکے اس بات کے اثر سے کلی بنجائے

گل بجو و بالد ز عشرت درمیانِ شاخسار | سر دمی جنبد برعنائی کنارِ لالہ زار
بلبل از سازِ طرب بر شاخِ گلبن در نشید | بر گہا دستک زن از سازِ نشاط روزگار
از فروغِ حسنِ نسرین و جمالِ نسترن | ماہِ تابندہ شود ہر کوکبِ شبہائے تار
دشت را از لالہ و گل، گلشنِ رضوان نجیب | گلستان را از گل و ریحان بہشتے در کنار

آصفی کی تشبیب کا بڑا حصہ بہاریہ ہے۔ تنگیٔ وقت اجازت دیتی۔ تو یارانِ نکتہ دان کے لئے صلائے عام دیتا۔ حسرت خاص ہی سہی۔

بسکہ آب و لِ خاک چنان سیر ابست | کہ بود ذرہ چو گرداب ہمہ طوفان کار
قطرہ از جوشِ روانی ہمہ سیلاب شود | سیل از موج کشائی ست چو بحرِ ذخار
تیغِ خورشید اگر سبز شود نیست عجب | خیزد از خرمیٔ سبزہ ز بس جوشِ بخار
عجبے نیست کہ روید بصدف غنچۂ گل | بسکہ از رنگِ بہار ابر بود در یا بار
عجبے نیست کہ در کاغذِ بادی ہوا | گوہرین سلک شود رشتہ باینا رِ قطار
عجبے نیست اگر ابر ز مستانہ روی | جانبِ دشت کند راہ غلط از گلزار
عجبے نیست کہ چون سبزہ ببالد بر خویش | آبِ آئینہ دہد نشو و نما از زنگار
لالہ زار یست ز ہر داغ بہ پہلوی پلنگ | جوش زد رنگ بکہسار ز یاقوت شرار
تازہ جانے رسد از نکہت گلہا بمشام | تازہ روحے بقوالب دمد از بوئی بہار
ہر کجا شوق رود، لالہ بہ بیند خرمن | ہر کجا ذوق رسد گل ہمہ یابد اینار
عجبے نیست کہ از تربیت نشو و نما | نالۂ عشقِ دل سوختہ بالد چو چنار
عجبے نیست کہ داغِ جگر سوختہ | بنسیم سحری طرح کشد از گلزار
کور اگر چشم تماشا بگلے بکشاید | میدمد ہمچو رگِ گل ز نگاہش صد تار
پرتو روے گل و لالہ فتد گر بزمین | از زمین رنگِ شفق جوش زند در شب تار
تودہ تودہ زریا حین بگلستان و دمن | پشتہ پشتہ ز گل و لالہ بدشت و کہسار
برگ برگِ چمن از شورِ جلاجل لبریز | شاخ شاخ ہمہ گلزار صدا خیز چو تار

خوش بود ساقی درین دوران بگلشن می زدن | لالہ جام و غنچہ مینائے بہاران آمدہ ست
خندۂ گل در چمن افگندہ گلدام نشاط | نو بہار از بہرِ صیدِ عندلیبان آمدہ ست

سبحان اللہ - خندۂ گل، کو گلدام نشاط قرار دینا، اور بلبل کی وارفتگی کی علت اُسکی گرفتاری بتانا کس درجہ پیارا مفہوم ہے۔ بیچاری معذور ہے۔ کس صورت سے چمن سے باہر قدم رکھے۔ جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ جب تک جال نہ ٹوٹ جائے۔ ہل نہیں سکتی۔

در شکر خوابست طفلِ غنچہ در آغوشِ شاخ — باد نوروزی زہر سو مہد جنبان آمدہ ست
سبزۂ نورستہ ہر جا چیدہ فرشِ مخملین — خسرو گل تا پئے سیر گلستان آمدہ ست
ہست گردِ دشت و صحرا آنچنان نکہت فروش — دامن ہر گرد بادے عنبر افشان آمدہ ست
گاہ سیر گلشن، از فیضِ بہارِ عکسِ گل — یک گلستانے بحسن سادہ رویان آمدہ ست
صورتِ نقش گر دد مصور ہر چہ آید در خیال — نامیہ نقاش از او ہام امکان آمدہ ست

سبحان اللہ - ایک ایک شعر پر وجد طاری ہوتا ہے۔ کہاں ہیں۔ ایران پرست دماغ - ان اشعار کا جواب لائیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

بسکہ از جوشِ بہاران، جہان نشوونماست — باغ در راغ و دمن و کوہ بہ مینو ماناست
نقشِ ہر راز کہ در طبع زمین بود نہان — عکسش از آئینۂ لالۂ گلہا پیداست
تا کجا بار نہد، قافلۂ لالہ و گل — شہر و گلزار و ہمہ دشت و درہ تنگ فضاست
راہ گلزار و بیابان بچپ و راست نہفت — لالہ و گل کہ بسوئے نمود از چپ و راست
شد زمین سبز و ہوا سبز و فلک شد سرسبز — سبز در سبز نوا بر لبِ مرغانِ ہواست

غالبؔ نے بہار کی وسعتِ دستگاہ کو ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

شعر خوب ہے۔ اور اسی لئے تقریباً ہر ادیب سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ مولانا نے بہار کی سرسبزی اور ہمہ گیری کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اب نہ صرف روئے آب سرسبز ہے۔ بلکہ بر روئے ہوا چرند پرند کے پیچھے بھی سبز اور تر و تازہ ہیں۔

ز آتشِ لالہ چنان شمع برافروخت بدشت — کز رگِ شعلۂ آن، مد نگاہِ اعمی ست

جنگل میں لالہ کی شمع روشن ہے۔ لیکن وہ معمولی روشنی پیدا نہیں کرتی۔ اس کی روشنی اس درجہ لطیف اور ساری ہے۔ کہ نابینا کی آنکھ کے پردوں سے گذر جاتی ہے۔ جب انسان کسی چیز پر نظر ڈالتا ہے۔ اسکی آنکھ اور اس شے کے درمیان ایک مستقیم خط فرض کیا جاتا ہے۔ جو گویا نظر کی کشش ہے۔ شاعر شعلوں میں جو خطوط متوہم ہوتے ہیں۔

اعین نابینا کی مدنگاہ قرار دیتا ہے یا بالفاظ دیگر شمع کی روشنی از سر تا پا بینائی ہے - لالہ کی سرخی کی دوسری تاویل سنیے۔

زآتش نالہ شرارے کہ جہد در کہسار صفت کرمک شب تاب، پرافشان بہوا ست

موسم بہار میں، رات کو درختوں پر جگنوؤں کا ہجوم ہوتا ہے ادہر ادہر فضا میں شرارے سے اڑتے نظر آتے ہیں۔ اور درخت سر دچراغاں بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ سرخ سرخ گل لالہ سے جنگل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ شاعر ان جگنوؤں کو اس سرد آگ کی سرد چنگاریاں قرار دیتا ہے۔

سیم محلول زند جوش ز آب انہار شورش چشمۂ سیماب زموجش پیداست

میرے مخلص دوست مولوی وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی ایم۔ اے نے ایک نظم لکھی تھی۔ "دریائی منظر" موضوع تھا۔ بہتے پانی کے متعلق ایک تشبیہ بہت نادر تھی۔ ہمارا سب کا خیال تھا۔ کہ غالباً نئی ہے۔ صرف وہ مصرع یاد ہے ؎ پگھلا کے چاندی، گویا بہادی لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ آصفی نے اسی مفہوم کو، بانداز آج سے تقریباً ۲۵ سال بیشتر نظم کر دیا ہے "سیم محلول" اور "شورش چشمۂ سیماب" کسقدر مکمل تشبیہیں ہیں۔ اب صرف "برقی رو" کہنا باقی رہ گیا ہے۔ تلمذ معلیٰ میں، الشرا کے کی آمد پر بجلی کا یہ تماشا نظر سے تو گذر چکا ہے۔ لیکن بقید نظم دیکھنے میں نہیں آیا۔

نکند میل صبوحی بسحر نرگس مست نشۂ بادۂ دوشینہ بہ چشمش برخاست

برلب گل بزن انگشت، وشنو نغمۂ راز گر دل تو، چو صبا، راز بہاران شنو است

جس وقت ہوا، پھولوں کی کیاریوں میں سے گذرتی ہے۔ ایک نہایت ہی سُریلی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے شاعر کا خیال ہے۔ کہ یہ پھول کی آواز ہے جہاں ہوا نے ساز گل چھیڑا۔ اور اس نے سارا بہار کا چھپا ڈھکا حال کہنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ صبا کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اگر تم بھی، نغمۂ راز سننا چاہتے ہو۔ تو ذرا پھول کی پتی پر انگلی مار دو۔ پھر دیکھو۔ کیا ہوتا ہے ؎ " اک ذرا چھیڑیئے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے"

عہد خزان، بعہد بہاران برابرست کہسار و دشتہا، بگلستان برابرست

باآن کہ ابر دی، بچمن قطرہ ریخت لبریز جام ولالۂ نعمان برابرست

دہقان باز، گرچہ عرق ریزی نکرد یا سبزہ کشت، دشت و بیابان برابرست

از لطف و نرمئے کہ بود در رگ سمن یا شئے زبان خار مغیلان برابرست

از تازگی، بشاخ نہال ثمر فشان در دشت و کوہ۔ شاخ غزالان برابرست

برآب و تاب ذرۂ صحرا مژہ کشا باآب و تاب گوہر غلطان برابرست

از جوش رنگ لالۂ نعمان دار غوان گلشن بکان لعل بدخشان برابرست

هر قدر دانه که در کِشت درین فصل فشاند　　　خرمنِ گل بکفِ حاصلِ دهقان آمد

بہار کا موسم تھا۔ نامیہ کو گل کی پرورش اور غور پرداخت مقصود تھی۔ بیچارے کسان نے جسقدر اناج بویا تھا سب پھول ان کی شکل میں زمین سے برآمد ہوا۔

خاک از عکسِ گل و لاله بدخشان گردید　　　هر کجا بود چمن، کانِ بدخشان آمد

رخ برافروختهٔ گل، مغبچه را ماند　　　که بکفش مجمرِ زرین ز بهر نیران آمد

گلاب کے پھول کی نئی تشبیہ ہے پھول کی کٹوری آگ، کو سونے کی انگیٹھی، اور زرِ گل کو آگ قرار دینا جدتِ ادا اور نزاکتِ تشبیہ کی نادر مثال ہے۔

تا عصائی نکند، شاخ نخیزد از جا　　　در چمن باد زمین گیر چو مستان آمد

غمزهٔ شوخ نگاهان فتنه از چشم بوس　　　تا بجا دو نظری نرگسِ فتان آمد

قدح از لاله ستانید، و صبوحی بزنید　　　شب غم، مرغِ سحر گفت، بپایان آمد

ساغر و جامِ بلورین بسرِ سنگ زنند　　　جامِ یاقوتیِ گل در کفِ مستان آمد

کہنا یہ تھا کہ پھول کی بھینی بھینی خوشبو، موسمِ بہار میں شراب سے زیادہ بدمست کر دیتی ہے۔ انسان سونگھتا ہے اور جھومتا ہے۔ مگر شاعر یوں کہتا ہے۔ کہ اب بلور کے پیالوں اور گلاسوں کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ مستوں کو ان کے عوض، گلاب کے پھول کا یاقوت رنگ پیالہ مل گیا ہے۔

سحرگاهان که از فیضِ بهارِ گلشنِ خاور　　　شفق گون شد، گلِ خورشید تابان چون گلِ احمر

صبح کا منظر ان الفاظ سے حسین تر لفظوں میں ممکن نہیں طلوع کے وقت سورج کو دیکھو۔ بلا مبالغہ سرخ سرخ گلاب کا سا پھول معلوم ہوتا ہے شاعر اس کو گلشنِ مشرق کی بہار کا فیض قرار دیتا ہے۔ شفق پھولی تم نے بارہا دیکھی ہوگی کیسی گہری سرخ ہوتی ہے شعر میں سورج کو براہِ راست، اور گلاب کے پھول کو بواسطہ شفق رنگ کہا ہے۔

سمن جوشید از ریحان، گلِ نسرین شده خندان　　　بهارش رنگ زد چندان، زمین شد سیمگون یکسر

چنبیلی اور جوہی کے پھولوں کا یہ عالم ہے۔ کہ ساری زمین چاندی کی طرح سفید ہوگئی ہے

چو ریحان یاسمین گشته ز زردی رنگِ چین گشته　　　همه روی زمین گشته سمن زار و سمن پرور

سمن زار اور سمن پرور، روئے زمین کی سفیدی کے کفیل ہیں۔ لیکن ہر جگہ سفید ہی پھول نہیں کھلتے، سرخ اور سنہری بھی نظر آتے ہیں، اس منظر کو یوں ادا کیا ہے

فلک زرین، هوا زرین، زمین زرین نگه گوئی　　　جهان شد کانِ زر از پرتوِ بال و پرش یکسر

زمان آراسته با فرش، زرین از صحنِ گیتی　　　در آورده دمها از شفق بر سوی جام زر

زمین رنگین، زبان رنگین، ہوا رنگین جہان رنگین چمن رنگین، دمن رنگین ز گل و ز لالۂ احمر

سبحان اللہ! گل گلاب و گل لالہ کی کیا رنگ فروشی ہے۔ سارا عالم رنگین نظر آتا ہے۔ مولانا کی اعجاز بیانی حد ثنا سے بالاتر نکلی

نوائے مستی بلبل، ترنگ شیشہ از قلقل تبسم ریزی ہر گل، ربودہ ہوش عقل از سر

مولانا کی دستگاہ بہار انجام آشنا نہوئی۔ مگر ہم اکتا گئے۔ پردۂ فطرت ہونیکے باعث یہ مضمون وسیع تر ہے۔ اور ہزار دن طرز ادا رکھتا ہے کہانتک کوئی لکھے۔ اور کس طرح خاموشی سے کوئی سنتا رہے ہم چاہتے ہین اسکو بھی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھین

باش تا فصل گل بیاید باز نیست این وقت ہائے وہو را

(باقی) خان امتیاز علی عرشی

پھر بحث سُنت

بے بنیاد دعویٰ اور غلط الزامات

رسالہ نگار میں ایک سال سے "فلسفہ مذہب" کے عنوان سے ڈپٹی سید مقبول احمد صاحب کے متعدد مضامین شائع ہوئے جن میں خود ساختہ اصول، اور ذاتی اجتہادات کے ساتھ ساتھ مفسرین، محدثین، فقہا، علمائے امت اور عام مولویون پر اس بیباکی سے الزامات قائم کئے گئے، اور اُنکی تحقیر و توہین کی گئی کہ بہتون کے دل مجروح ہوگئے، تہذیب و اخلاقی شرافت کے معیار کو الگ کیجئے، نفس اصلاح اور تبلیغ کے لئے یہ طریقہ سودمند نہین کہ

اور ضد بڑھتی ہے ناصح ترے سمجھانے سے

اگر وہ اپنی انہین تحقیقات و اجتہادات کو نرمی، لینت، متانت اور سنجیدگی کیساتھ ظاہر کرتے تو شاید وہ نافہم مولوی بھی انکو پڑھکر سمجھنے کی کوشش کرتے، اور ڈپٹی صاحب کے خیالات سے فائدہ اُٹھاتے۔

اسی سلسلہ مین صاحب مضمون نے حدیث و سنت کی بیقدری، نا اعتباری، عدم استناد اور ناقابلِ قبول اور شریعت اسلامیہ کے قانونی حصے کے بیکار اور خارج از قرآن ہونے پر بحثین کین، مین نے مناظرانہ آویزش سے بچنے کے لئے رسالہ اور صاحبِ مضمون کا نام لئے بغیر نفس اُنکے خیالات و تحقیقات کی تردید کی، اور "سنت" اور "شریعت کا قانونی حصہ" کے عنوان سے اگست اور ستمبر ۲۹ء کے معارف مین دو مضمون لکھے، اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دونون مضمون دلچسپی سے پڑھے گئے اور لوگون کو ان سے فائدہ ہوا۔

اب چھ سات مہینون کے بعد صاحب مضمون نے میرے پہلے مضمون سنت کا جواب اپریل ۳۰ء کے نگار مین دیا ہے، جسمین حسبِ عادت نہ صرف عام علماء، فقہاء، محدثین کو بلکہ خاص طور سے میرا نام لیکر بہت کچھ کہا ہے۔ مین دل سے پسند کرتا ہون کہ علمی مباحث مین ذاتی طعن و طنز اور نازیبا تعریض سے احتراز کیا جائے، لیکن افسوس ہے کہ مخاطب نے میرے اس اصول کو ناپسند کیا، اور ایسے لب و لہجہ اور طرز و انداز مین گفتگو کی، جو علمی شان سے بہت فروتر ہے، اور اس پر لطف یہ کیا ہے کہ ذاتیات کو اپنی علمی تحقیقات کے ساتھ اس طرح آمیز کر دیا ہے، کہ ان دونون کو علیحدہ کرنا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا ہے۔

مولوی تو اپنے زعم باطل کے لئے بدنام ہین، مگر ہمارے گریجویٹ دوست بھی کچھ کم نہین ہین۔ اُنکی کلاہ افرنگی مین

وہی طرۂ غرور و نخوت ہے جو مولوی کی دستارِ فضیلت میں، اُسکے کوٹ و پتلون میں وہی کبر و ناز چین و شکن ہیں، جو مولوی کے جبہ و سروال نصف ساق میں، اور جو لفظ لفظ میں گو علماء کی جہالت و نادانی کا مرثیہ پڑھتا ہے، مگر خود اسکے اس مرثیہ سے رجز خود ستائی کی شان نمایاں ہوتی ہے۔

کم کن بکبر و ناز کہ دیدہ است روزگار چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

"آمدم بر سر مطلب" وہ فرماتے ہیں:۔

"جس تبحر کے ساتھ انھوں نے (سید سلیمان نے) میرے اس قول کا تخلیہ اڑایا ہے کہ یہود کا شنا اور مسلمانوں کا سنت ہم معنی و مرادف لفظ ہے اسکا تقاضا تو یہ تھا کہ میں مولانا کی خدمت میں عرض کردوں کہ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است، آپکی عربی دانی مسلم، مگر معاف کیجئے، صرف عربی دانی ہی علامہ اور فاضل اجل ہونے کے لئے کافی نہیں، ورنہ میرا بغدادی ملازم حسن یقیناً اتنا ہی اپنی فضیلت پر ناز کر سکتا ہے جتنا ہندوستان کا بڑے سے بڑا عالم"

میرا مضمون دوست دشمن سب نے پڑھا ہوگا، اس میں مضحکہ تو کجا، میرا تبسم بھی نمایاں ہو تو میں اخلاقی مجرم، ہاں اگر میرے دلائل کی سخت گرفت سے انکو تکلیف محسوس ہوئی ہو تو معذوری ہے با این ہمہ عرض ہے کہ تنہا انگریزی دانی ہی علامہ اور فاضل اجل ہونے کے لئے کافی نہیں ورنہ ہر انگریزی ہوٹل کا خانساماں اور ویٹر یقیناً اتنا ہی فضیلت پر ناز کر سکتا ہے جتنا ہندوستان کا بڑے سے بڑا گریجوایٹ اور ڈپٹی کلکٹر!

فرماتے ہیں:۔

"کاش مولانا انگریزی کے صرف اسقدر عالم ہوتے کہ وہ اور نہیں تو محض انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضامین کو بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تو میں ان سے عرض کرتا کہ مشنا کا مضمون پڑھ لیجئے تاکہ خود آپکو اپنی تحقیق پر ناز نہ ہے اور آپ ایسی جرأت نہ کریں"

اظہار واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ میں بحمد اللہ ڈپٹی صاحب کی آرزو کے مطابق اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلوپیڈیا کے تاریخی اور مذہبی مضامین انگریزی میں پڑھ اور سمجھ لیتا ہوں، میں نے اول تو انسائیکلوپیڈیا میں جسکا گیارہواں ایڈیشن ہمارے سامنے ہے، کوئی مستقل مضمون مشنا پر نہیں پایا، اور عبرانی (ہبرو) کے تحت میں جو ضمنی مضمون اسپر مجکو ملا، اس میں انکی اس "تحقیق انیق" کا پتہ نہ پایا، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، کاش موصوف اپنی تحقیق کی طرح انسائیکلوپیڈیا کا حوالہ دیتے وقت ایڈیشن، جلد، صفحہ، یا آرٹیکل کو متعین کر دیتے،

فرماتے ہیں:۔

"لیکن شاید اس وقت مولانا سید سلیمان کا منشا تھا، یعنی جتنا عربی نصاب تعلیم کا ہے مولوی کی فضیلت ہے"

" وہ لوگ مرعوب ہون، جنھون نے اس راہ کی بادیہ پیمائی نہین کی "

مین بھی جانتا ہون کہ اصول اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات کے اظہار مین ڈپٹی صاحب کا اتنا قصور نہین جتنا انگریزی نصاب تعلیم کا اور ان نامسلم استادون اور مصنفون کی صحبت کا ہے، جنکے حلقۂ فیض مین ہمارے دوست اس فضیلت کے رتبہ تک پہنچے ہین، ان محققین کی تحقیقات سے وہی مرعوب ہونگے جو اس کوچہ سے نابلد ہین،

فرماتے ہین:-

" مذہب اسلام کے سمجھنے کے لئے فلسفۂ مذہب، تاریخ مذاہب، اقوام سامیہ کا لٹریچر تاریخ انقلاب علم انساب کی ضرورت ہے جو قوم ندوہ کی دسترس سے باہر ہے "

عرض ہے کہ مذہب اسلام کے سمجھنے کے لئے ان کے سوا، قرآن پاک، قرآن پاک کی تفاسیر، احادیث صحیحہ، احکام قرآن، ادب عربی اور لغات عربی پر کامل عبور کی ضرورت ہے، جو انگریزی یونیورسٹیون کی دسترس سے باہر ہے اسکے بعد پھلے سے گذارش ہے کیا یہ تعریض ارض القرآن کے مصنف پر ہے جسکی نہ صرف تعریف و توصیف آپ نے کی ہے، بلکہ اپنے والا نامہ موسومہ راقم مورخہ ۷ فروری ۱۹۳۲ء مین آپ نے یہ شریفانہ اعتراف بھی کیا ہے۔

" اور آپ مجھے معاف کرینگے اگر مین یہ کہون کہ اسکے (ارض القرآن) بعض مضامین مین نے اپنے اکثر مضمونون مین سرقہ کئے ہین "

ناظرین باور کرین کہ اس سرقہ کا اعتراف خاکساری کی راہ سے نہین، بلکہ واقعتًا کیا ہے، کیونکہ انھون نے اپنے مضمون مین جو شائع ہو چکے ہین، اصل کتاب و مصنف کے نام کا حوالہ تک نہین دیا ہے، تاکہ حریفون کے سامنے آنکھ نیچی نہو، اور ایک فاضل گریجوایٹ کو ایک " جاہل مولوی " کی خوشہ چینی کی ذلت علی الاعلان گوارا نہ کرنی پڑے،

اللہ اکبر! جلوت و خلوت کا اتنا عظیم فرق! بہرحال مین نہایت کشادہ دلی کے ساتھ موصوف کی درخواست کے مطابق انکے اس جرم کو معاف کرتا ہون، لیکن ڈر ہے کہ ملک کے دوسرے جرائم پیشہ ایک ڈپٹی صاحب کے اس جرم سرقہ کے ارتکاب کی خبر سنکر دلیر نہ ہو جائین،

موصوف اپنے مضمون " فلسفۂ مذہب " کے بعض ٹکرون کو جو معارف مین چھپنے کو بھیجے گئے تھے، معارف مین نہ قبول کئے جانے کے ذکر مین فرماتے ہین کہ:-

" شاید دنیا اس راز کو نہین جانتی کہ وہ کیون موزون نہین سمجھے گئے میرے پاس وہ خط اب بھی پڑا ہوگا جس مین سید سلیمان نے میرے حصہ مضمون مذہب اور خوست (شاید قومیت ہو) کو شرف قبولیت بخشا تھا، مگر اسکے بعد ایک گستاخی کے صلہ مین وہ مضمون واپس کر دیا گیا، گستاخی کا واقعہ یہ ہے کہ دادی کے سچے جھوٹے ہونے کے متعلق سید سلیمان کے ایک مضمون کا ترجمہ اسلامک ریویو کے کئی نمبرون مین

" دیا تھا، جس میں جسب سنت علماء بڑی بڑی کتابون کا حوالہ دیا گیا تھا، جب عیسائیون کی حالت ہماری طرح تھی تو وہ بھی اس قسم کے مضمونون پر کتابین لکھ ڈالتے تھے، مثلاً عشار ربانی مین، روح فطری ہو یا خمیری، مین نے سید صاحب کی خدمت مین عرض کیا کہ واقدی کے متعلق آخراس دیدہ ریزی اور اسکے جھوٹ ثابت کرنے کے لئے اتنی بڑی ضخیم کتابون کے حوالہ کی ضرورت ہی کیا تھی، ہمارے عالمون کا ایک زمانہ مین یہ ہنر ہوا کرتا تھا کہ دریا کو کوزہ مین بند کرتے تھے، اب ہمارے عالمون کا بڑا ہنر یہ ہے کہ کوزہ کو دریا (شاید دریا ہو) کردین، اگر یہی چیز عربی مین علت کہلاتی ہے، تو گستاخی معاف انگریزی مین اسکو بند منٹری کہتے ہین، اس معروضہ کے تیسرے روز عتاب نامہ مع مضمون واپس آیا، اور اس دن سے نہ مولانا نے مجھے مخاطب کیا اور نہ میرے کسی خط کا جواب دیا"

افسوس ہے کہ سید مقبول احمد کی یہ پوری تحریر صداقت سے حرف حرف خالی ہے، مین انکو چیلنج دیتا ہون کہ وہ میرے تمام خطوط پبلک مین شائع کردین تاکہ دنیا مین یہ "راز" مخفی نہ رہے کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھکر سچ اور جھوٹ کے پرکھنے والے اپنی غیر سرکاری زندگی مین کس طرح حق و باطل کا التباس کرتے ہین، سید مقبول احمد کو علم ہوگا کہ یہ مضمون ایک مشہور مستشرق عیسائی، اور انگلستان کی ایک بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر کے جواب مین، ایک مشہور مسلمان گریجوایٹ خواجہ کمال الدین صاحب کی فرمایش سے لکھا گیا اور انکی پسندیدگی سے اسلامک ریویو مین چھپا تھا، یہ تنہا ایک مولوی کا گناہ نہ تھا، بلکہ انکے جیسے بی، اے اور ان سے بہتر گریجوایٹ بھی اس گناہ مین شریک تھے

سید صاحب کا مضمون تقریباً ۴ مہینے میرے پاس پڑا رہا، اور ان کی طلب پر واپس کیا گیا، مین نے ان کو لکھا کہ آپ کے خیالات جس منزل مین ہین، ان کی اصلاح خط و کتابت سے نہین، بلکہ زبانی گفتگو اور ملاقات سے ہوسکتی ہے انہون نے معذرت کی، پھر طرفین سے خاموشی رہی، اس کے بعد مضمون "سنت" چھپنے کے بعد ان کے چند خط آئے اور مین نے جوابات دیے، شاید اسی دسمبر ۲۹ء اور ۳۰ء کے چند خط ان کے پاس ہون گے، اور ان کے میرے پاس پھر یہ کہنا کہان تک صحیح ہے کہ

اوسی دن سے نہ مولانا نے مجھے مخاطب کیا، نہ میرے کسی خط کا جواب دیا

مین نہین جانتا کہ یہ "مولویانہ اخلاق" ان مین کہان سے پیدا ہوا، درانحالیکہ شاید کسی عربی مدرسہ مین ایک دن جانے کی بھی ذلت انھون نے گوارا نہین کی

آمدم برسر مطلب۔

مضمون زیر بحث مین دو قسم کی بحثین ہین۔ ایک لفظی اور دوسری معنوی اور دونون بحثون کو علیحدہ کر دینا ہے، تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے،

لفظی بحث

مناة اور سنت | لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعوی ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو "مناة" اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو سنت کہتے ہیں، مسلمانوں کا یہ عربی لفظ "سنت" یہودیوں کے عبرانی لفظ "مناة" سے ماخوذ ہے، دونوں بالکل ایک لفظ ہیں، اور ہم معنی ہیں

مین نے اگست سنہ ۱۹۲۹ء کے معارف مین تاجی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا، اور ثابت کیا کہ وہ عبرانی لفظ "مناة" نہیں، بلکہ مشنہ ہے، یعنی مشناة، اور دوم اسکے معنی عبرانی مین دوہرے، دوہرانے، اور اعادہ وتکرار کے ہین، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اسکا اطلاق موسیٰ کی پانچوین کتاب پر ہوتا ہے، جسکو یونانی مین ڈیٹرونومی کہتے ہین جسکے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہین، اور عبرانی مین اسکو مشنا کہا جاتا ہے اور عربی مین مثنی کہتے ہین، اور آجکل تثنیۃ الاشتراع و دوبارہ قانون سازی کہتے ہین اور ان سب کا ماخذ عبرانی مین "شنا" اور عربی مین "ثنی" اور ان دونون کے معنون مین دونون زبانون مین دو، دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے، اور "سنت" خالص عربی لفظ ہے جسکے لغوی معنی راستہ، اور طریق کے ہین اور اصطلاح مین اسکے معنی وہ طریق ہے جسپر محمد رسول اللہ صلعم تمام عمر قائم رہے اسکے معنی زبانی روایات کے معنوی ہین نہ اصطلاحی اسلیے عبرانی مشناہ اور عربی سنت مین کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہین، اور نہ عربی سنت عبرانی مشناہ سے ماخوذ ہے۔

ہمارے مخاطب اول نے اس مضمون کو پڑھکر ۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو مجھے خط لکھا کہ تمھاری تحقیق غلط ہے ڈیوٹرونومی کے لئے مناد س لفظ ہے، اور مشنا بالکل جداگانہ لفظ ہے، مین اسکی ایک سنہ زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کر چکا ہون، اور اسکی تائید انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے بھی مل سکے گی،

"اگر اسکے معنی آپ سنت سے علیحدہ دکھا دین تو مین ہار تا ہون"

مین نے اسکے جواب مین اونکو جو لکھا اوسکا مطلب یہ تھا کہ مشنا تورات کی پانچوین کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا ہے اور تالمود کے ایک جسم کا نام بھی ہے یہ کوئی اہم نقطہ اختلاف نہین ہے، بلکہ اصل چیز "مشنا" کے معنی ہین، ساتھ ہی مین نے اطلاع دی کہ مشنا کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہین، انھون نے اسکے ماننے سے بھی انکار کیا، اور لکھا کہ تمکو تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے جسکے معنی واقعتاً تعلیم اور سکھانے کے ہین اب اس تازہ مضمون مین ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر و ناز کے ساتھ دہرایا ہے، مگر صرف دہرایا ہی ہے، کوئی دلیل یا حوالہ نہین درج فرمایا ہے۔

اب نقطۂ اختلاف دو ہین۔

۱- کیا توراۃ کی پانچوین کتاب کو بھی عبرانی مین مشنا بولتے ہین؟

۲- کیا سنت اور مسنا ایک ہین

مشنا توراۃ

توراۃ کی پانچوین کتاب کو میرے "مشنا" کہنے پر مدعی نے میرا مضحکہ اڑایا ہے، اور فرمایا ہے کہ "ایک یہودی بچہ بھی اسکو سنکر ہنس دیگا"، مگر مین اونھین یقین دلاتا ہون کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے براحل دور ہے

توراۃ کی پانچوین کتاب کا نام "قانون ثانی" اسلئے رکھا گیا ہے کہ قانونِ اوّل کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسی نے اوسکو دوبارہ بیان کیا جیسا کہ اس کتاب کے آغاز مین تحریر ہے، اسکا عبرانی نام "الوہی دبران" بھی ہے مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمۂ سبعینی کے وقت سے اسکا نام "مشنا توراۃ" مشہور ہو گیا جسکے معنی "قانونِ دوم" کے ہین، اسی لئے یونانی اور اوس سے یورپ کی زبانون مین اوسکا نام ڈیوٹرونومی، یعنی دوسرا قانون پڑا، اور اسی لئے پرانی عربی مین مثناۃ اور نئی عربی مین اوسکا نام تثنیۃ الاشتراع ہے، یعنی "دوبارہ قانون بنانا" بہر حال ان سب کے معنون مین دو، دوم اور دوہراتے کا مفہوم داخل ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس مشنا کا لفظ بولا جاتا ہے وہ شن سے ہے، س یا ث سے نہین، جیسا کہ مدعی کا دعوی ہے کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادہ ہے وہ شنا" ہے۔

حوالون کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبۂ جمیس ہیسٹنگز وغیرہ) جلد اول صفحہ ۵۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۱ء ملاحظہ فرمایئے، جس مین لکھا ہے کہ "اسکا نام ڈیوٹرونومی عبرانی الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی نسخۂ ثانیہ کے ہین" اسکے بعد انگریزی کی مشہور مستند ڈکشنری ولبسٹر انٹرنیشنل مین لفظ ڈیوٹرونومی Deuteronomy دیکھئے، اوس مین ہے۔

"ڈیوٹرونومی اسکو اسلئے کہتے ہین کہ یہ موسی کے قانون کا دُہراؤ (یا اعادہ) ہے"

اب عبرانی لغت مین دیکھ لیجئے، کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کے لئے لفظ مشنا ہے، مسنا یا مثنیٰ یا متنہ نہین ہے، جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہمکو باور کرانا چاہتے ہین، جیسا کہ آگے بتفصیل معلوم ہوگا،

میرے مضمون سنت کی اشاعت کے بعد موصوف نے ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کو جو خط مجھے لکھا تھا، اوس مین ارقام فرماتے ہین۔

"متنہ جسکے معنی آپ نے اپنے ڈیوٹرونومی کے صحیح لئے ہین وہ مشنا سے بالکل جدا لفظ ہے، اور اسکا تلفظ مسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون مین ڈیوٹرونومی کے لئے ہمکو لفظ مثنیٰ دیتے ہین

کہ کیسے یہ علم رہے کہ وہ ارشاد رہے،

آپکے کہنے سے اگر توراۃ پنجم کے لئے مسنا صحیح مانا جائے، تو تالمود کے لئے بھی تو آپ نے مسنا اور مسناۃ ہی ... پہلے مضمون مین لکھا ہے اب یہ التباس کیونکر دور ہوگا۔

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ پنجم اور حصۂ تالمود دونون کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا متنہ یا مثنی لکھکر

لاکھ پیدا کیجئے، سب محکمۂ تحقیق کے سامنے رد ہو جائیگا، دونوں لفظ ترشت وانی ش منقوطہ سے ہیں، س غیر منقوطہ یا ث سے ان میں کوئی لفظ نہیں، اور ث کا حرف تو عبرانی میں سرے سے موجود نہیں، اسلئے مثنہ یا مثنی تو عبرانی میں ہو ہی نہیں سکتا اب ہمارے دوست غور فرمائیں کہ کس کی تحقیق پر "ایک یہودی بچہ بھی ہنس دیگا؟" کیا یہ پڑھ کر

درسفالین کاسۂ رندان بخواری منگرید این حریفان خدمت جام جہان بین کردہ اند

مشنا مناۃ اور سنّت

بہرحال یہ مسئلہ کہ مشنا تالمود مراد ہے، یا مناۃ دیوتا، ایک ضمنی بحث تھی، اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مناہ" اور عربی سنت ایک چیز ہے۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں، اصل عبرانی لفظ مشنا (ش منقوطہ) ہے، جیساکہ میرے ٹوکنے پر آپ اس دوسرے مضمون میں ادنھوں نے استعمال کیا ہے، مگر پہلے مضمون میں اوسکا عبرانی تلفظ "مناۃ" بتایا تھا، اور یہ اس غرض سے تاکہ سنت اور مناۃ میں س ن اور ۃ کا اشتراک ہو جائے اور یہ دعوی بہ آسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور مناۃ ایک ہیں اور اب جب اونھیں معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شا ش اوسکے سوا کوئی اور بھی ہے تو مجبوراً اوسکے لئے دوسرے مضمون میں شنا وش منقوطہ سے بولے، یا للعجب!

میں نے سنت والے مضمون میں دکھایا تھا اور پھر باعلان دعوی کرتا ہوں کہ سنّت اور مشنا میں کوئی لفظی معنوی مناسبت نہیں ہے، مشنا کے معنی اگر بقول اونکے زبانی روایات کے ہیں تو سنّت کے معنی عربی میں طریق روش اور راستے کے ہیں، قرآن میں سنّت کا لفظ انہیں معنوں میں بار بار آیا ہے، احادیث میں انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور لغت اور اشعار عرب میں بھی انھیں معنوں میں یہ لفظ بولا گیا ہے، قرآن پاک میں ہے، "ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ تم خدا کی" زبانی روایتوں "میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤگے، یا یہ معنی ہیں کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے؟ احادیث میں ہے، من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا، کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اچھی "زبانی روایت" کریگا تو اوسکو اوس قسم کی نیکیاں ملینگی۔ یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اوسکو بھی اوسکی نیکیاں ملتی رہینگی مشہور حدیث ہے النکاح من سنتی کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ نکاح میری زبانی روایت ہے، یا یہ معنی ہیں کہ نکاح میرا طریقہ ہے، اشعار عرب میں ہے۔

وان الالی بالطف من ال ہاشم تاسو فسنوا الکرام التاسیا

آل ہاشم میں وہ جو طف میں ہے، اونھوں نے باہم غمخواری کی، تو غمخواری کو شریفوں کا طریقہ بنا دیا،

سنّوا کے معنی یہاں عملی طریق و روش و طرز عمل کے ہیں، یا زبانی روایت کے، زبانی روایت کے معنی ہو بھی سکتے ہیں بن بھی سکتے ہیں؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی، اب آئے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی لی جائے، کہ آیا "مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے

ہیں؟ اس بارہ میں مین نے پہلے جو کچھ لکھا تھا اوسکو دوہراتا ہون کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی مین ثنی، تثنیہ، ثنیٰ وغیرہ کی صورت مین ہے اور اسکے معنی "زبانی روایات" کے ہین، مین سوا اسکے اور کیا کہون حیا و نہ دلار چخر مکن، چیزیکہ نخواندۂ۔ تو

حیادنہ دلار توبخیر مکن　　چیزیکہ نخواندۂ توتفسیر مکن

اونکی تشفی کے لئے اونکے حسب مشورہ مین سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہون اسپر اونکا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفون سے زیادہ ہو، انسائیکلوپیڈیا (طبع یازدہم) کے مضمون تالمود کے شروع میں (جلد ۲۶ صفحہ ۳۰) مین ہے۔

تالمود (عبرانی معنی سیکھنا سکھانا) مشتق ہے، مشناہ (عبرانی معنی) (زبانی) دوہرانا۔ Repetition

پھر اسی کتاب کے اسی اڈیشن (یازدہم) کی جلد ۱۳ صفحہ ۱۷۰ مضمون ہیرو (عبرانی) کے ضمن مین ہے

مشنا کا نام عبرانی لفظ "شنا" سے مشتق ہے جو آرامی لفظ "تنا" سے مطابق ہے، اور اسی لئے یہ تنائک کتاب کے لئے موزون ہے جسکے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سیکھانے کے ہین"

ان دونون اقتباسون سے ظاہر ہے کہ اسکے اصلی معنی دہرانے یا سیکھانے کے ہین، لفظ زبانی، یا زبانی قانون کا اضافہ اگر کسی نے کر دیا ہے تو وہ لغت کی حیثیت سے نہین بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نام اسکا کیون پڑا، اسکی تائید کے لئے مین لغات عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہون۔

شنا و شنتہ　　بدل جانا، جدا ہوا، دوبارہ کرنا، دوہرانا

شنیم　　دو،

شنتیم　　دوبارہ

مشنتہ　　دوسرا درجہ، دوسرے درجہ کا، دوچند

شنا　　دوسرا

(لغات عبرانی مصنفہ پادری ولیم ہوپر، پرنسپل ڈوتی کالج شائع کردہ پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، الہ آباد ۱۸۸۸ء (صفحہ ۲۴۴) پتہ کے معنی بھی عبرانی مین دوبارہ کرنا، دوسرا اور دوہرانے ہیں، یہی لفظ عربی مین، اثنین، ثنتین، ثنتہ، تثنیہ، مثنی، اور ثنی ہے، پہلے تمام الفاظ کے معنی دو اور دوسرے کے ہین اور آخر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہین

شنا اور اسکے مصدر شنا کے بھی تمام معنی عبرانی انگریزی ڈکشنری شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) صفحہ ۲۷۲ و ۲۷۳ مین ہین تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے، انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹر انٹرنیشنل ڈکشنری ہے، اوسمین "مشنا" mishna کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے:-

مشنا عبرانی مشناہ، معنی تعلیم (زبانی قانون) عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے، جسکے معنی دہرانے (ری پیٹ) کے ہین، قدیم بائیبلکل عبرانی مین اسکے معنی، سیکھنے، سکھانے کے ہین، یہ یہودیون کے روایتی تعلیمات کو

"کہتے ہیں، جو یہودیوں کے زیرِ نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئی تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے، جیمیرا اوسکی بنیاد ہے"

صاف ظاہر ہے کہ زبانی روایات کے اپنے خوبی معنی نہیں اسکے لغوی معنی دہرانے اور اعادہ کرنے (ورد دوبارہ کرنے کے یا دوسرے درجہ کے ہیں، اسکا اطلاق یہود اپنی زبانی روایات کی کتاب پر سلئے کرتے ہیں کہ وہ گذشتہ قانون کا اعادہ ہے۔ یا پہلے قانون پر نظر ثانی ہے، یا توراۃ کے مکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایات کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے یا قدیم عبرانی کے مطابق انکے معنی سیکھنے یا سکھانے کے لیکر اسکی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بنائی جائے۔

مثناۃ اب میرا کہنا وہی ہے، جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ جسکو عبرانی میں مشنا یا مشناہ کہتے ہیں، وہی عربی تلفظ میں مثناۃ ہے جسکے معنی دو بار دہرانے کے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشناہ زبانی قانونی کتاب کے معنی میں ہے۔ اسکے لئے بھی عربی لفظ مثناۃ ہے، اور اسکی جمع "مثانی" ہے؛ اور خود قرآن پاک نے اسکا کئی مقام پر اسکے اوپر اطلاق کیا ہے۔

۱۔ ولقد آتیناک سبعا من المثانی　　اور ہم نے اے پیغمبر تمکو "مثانی" میں سے سات دئے اور

۲۔ نزّل احسن الحدیث کتابا متشابہا مثانی　　خدا نے ہمارا بہترین کلام ایک کتاب جو باہم موافق اور "مثانی"۔

مثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں نیز مشنا تالمود کے لئے وہی لفظ عربی میں مستعمل ہے، لسان العرب لفظ "مثنی" کے تحت میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے۔

قیل وما المثناۃ قال ما استکتب من غیر کتاب اللہ کانہ جعل ما استکتب من کتاب اللہ مبدأ وھذا مثنیٰ، قال ابو عبید فسألت رجلا من اھل العلم بالکتاب الاوّل قد عرفھا وقرأھا عن المثناۃ فقال ان الاحبار والرھبان من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ وضعوا کتابا فیما بینھم علی ما ارادوا من غیر کتاب اللہ فھو المثناۃ،

پوچھا گیا کہ مثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی کتاب کے سوا لکھا گیا، گویا خدا کی جو کتاب لکھی گئی وہ پہلی تھی، اور یہ دوسری ہے، ابو عبید نے کہا کہ میں نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ سے واقف تھا اور اوسکو پڑھ چکا تھا پوچھا کہ مثناۃ کیا ہے؟ اوسنے جواب دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب بنائی تھی، وہی مثناۃ ہے،

کیا عبرانی مشنا بعینہ یہی عربی مثناۃ نہیں ہے؟ اب بھی شک کی گنجائش ہے؟

خاتمہ بہرحال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے یا تالمود کی کتاب، دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ مشنا اور مشنہ ہے، جسکے معنی، بدلنے، دہرانے یا دوسرا ہونے۔ یا دوبارہ ہونے کے ہیں، یا سیکھنے کے ہیں اور سوا لے اخیر معنی کے الفاظ

شنہ ثنیٰ تثنیہ اور ثنی اسکے مرادف ہین اور عربی لفظ "سنّت" کو جسکے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اسلامی معنی طریق محمدی کے ہین، اوس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہین، سنت کا مادہ س ن ن یعنی سُنَنُ ہے اور شنا یا شناۃ کا عبرانی مین ش، ن ہ یا الف، اور عربی مین ث ن ی ہے، اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرماکر، علم اور اسلام دو نون کو اپنا ممنون احسان بنائینگے، ورنہ ادنکی اس تحقیق کو ادنکے ایک یہودی بچہ بھی سنکر ہنس دیگا،

آخر ایک اور بات عرض کردون کہ شنا "زبانی روایات" کو بھی نہین کہتے، بلکہ اوس کتاب کا نام ہے، جس مین یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے اگر گلستان اخلاقی قصص و حکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اسکے یہ معنی نہین کہ گلستان کے معنی اخلاقی قصص و حکایات کے ہین۔

دوران تحقیق مین فرماتے ہین کہ۔

"مولانا کی یہ دلیل اور بھی پر لطف ہے کہ سنت کا لفظ قرآن مین ہے اسلئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہین"

مین نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط لیکن ع سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست مین نے خدمت والا مین یہ عرض کیا تھا کہ:۔

"سنت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اسلئے لفظی معنی راستہ کے ہین لیکن بول چال مین اُسکے معنی طریقۂ عمل کے ہین جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے، قرآن پاک مین یہ لفظ اسی معنی مین مستعمل ہے"

ہر صاحب بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے کہ عبرانی لفظ شناۃ (ش) عربی مین ثناۃ (ث) ہے، اور جسکے معنی دونون زبانون مین، دوسرے یا دہرانے یا اعادہ کے ہین، اور اوس سے الگ سنت کا لفظ ہے، جسکے معنی راستہ اور طریق کار کے ہین، اور عربی مین یہ دونون لفظ الگ الگ مستقل صورتون مین وارد ہین اور خود قرآن پاک مین ہین

وآتیناک سبعا من المثانی — ہم نے تمکو "مثانی" مین سے سات دین

مثانی جمع ہے، واحد کی صورت وہی ثناۃ ہے، اور سنت الگ ہے،

سنۃ الاولین — پہلون کا راستہ یا طریقہ یا سنت

اگر شناہ اور سنت ایک لفظ ہوتے، تو عربی مین ثناۃ اور سنت دو لفظ موجود نہ ہوتے، اور قرآن انکو دو لفظ دو تلفظون کے ساتھ، دو معنون مین استعمال نہ کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ ثناۃ اور سنت دو الگ الگ مستقل، اور مختلف المعنی لفظ ہین، یہ ہے میرا استدلال جسکی آپ نے غلط تعبیر کی میرے گذشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہو سکتی ہے۔

(باقی۔ باقی)

سید سلیمان ندوی

محبّت کی قربانی

سلسلۂ کوہسار کے دھندلے دامن میں جہاں برساتی نالوں نے چند پُر پیچ وادیاں بنا رکھی ہیں۔ میں ایک گاؤں کے سرخ گھر کچے مکان نظر آرہے ہیں۔ اُن سے کچھ آگے ایک چھوٹی سی بلندی پر ۱۶۰۰ سال پہلے کا ایک گرجا سوگوار حالت میں نظر آرہا ہے، پاس ہی آٹا پیسنے کی ایک چکی اپنی مسلسل صداؤں سے کوہسار کی ہیبت ناک خموشیوں میں برہمی پیدا کئے ہوئے ہے آج سے سو سال پہلے تین کم سن بچے باہم ملکر دریا کے کنارے کشتی کی بوسیدہ رسیوں اُلجھے ہوئے بادبانوں اور خس وخاشاک اور زنگ خوردہ زنجیروں سے کھیلا کرتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی تھی۔ اور دو لڑکے۔ لڑکی کا نام اینی تھا۔ جس کا معصوم حسن بندرگاہ کے تمام رہنے والوں کے لئے سرمایۂ انبساط تھا۔ لڑکوں میں سے ایک کا نام فلپ تھا جس کا باپ آٹے کی مشین کا مالک تھا۔ دوسرے کا نام آرڈن تھا۔ جو ایک مشقت کش ملاح کا نورِ نگاہ تھا۔

یہ تینوں دریا کے کنارے ریت کے قلعے صرف اس لئے تعمیر کرتے کہ دریا کی کوئی موج انہیں بہالے جائے اور وہ چند قدم [پیچھے ہٹ کر] اس موج کا تالیاں بجاتے اچھلتے کودتے ہوئے تعاقب کریں، اور پھر اپنی جگہ آکر دوسری موج کا انتظار کرنے لگ جائیں [یہ] دن بھر اسی شغل میں لگے رہتے اور جب شام کو واپس آتے تو انکے بے شمار ننھے ننھے نقوشِ قدم ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر [ب]اقی رہ جاتے۔ وہ یہاں دن بھر چھوٹے چھوٹے گھر بناتے۔ اور انہیں میاں بیوی بن کر آباد کرتے ایک دن آرڈن میاں بنتا اور دوسرے دن فلپ لیکن کبھی کبھی آرڈن ہفتہ بھر اس چھوٹی سی بیوی پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھتا۔ اور مایوس فلپ کے سامنے فخریہ انداز میں کہتا۔ "یہ میرا گھر ہے اور اینی میری بیوی ہے"

فلپ رقیبانہ نگاہوں سے آرڈن کی طرف دیکھتا۔ اور دبی آواز سے لیکن صفائی کے ساتھ کہہ دیتا "میری بھی ہے"

[یہ] دونوں کبھی ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ مگر دو حزین فلپ کی نیلی آنکھیں رحم طلب آنسوؤں سے بھیگ جاتیں اور وہ بلک بلک کر اتنا کہہ کے رہ جاتا "آرڈن، مجھے تم سے نفرت ہے"

نازک دل اینی یہ منظر دیکھ کر رو پڑتی۔ ہاتھ جوڑ کر دونوں کے پاس آتی۔ اپنا واسطہ دیکر مناتی۔ اور وہ عموماً پھر [خو]ش ہو کر گلے مل جاتے

(۲)

رفتہ رفتہ معصومیت وطفلی کا بہترین دور ختم ہو گیا اور عشق ومحبت کا آفتاب افق شباب سے طلوع ہوا۔ اینی [آ]پ دار آرڈن کے رقیبانہ تگ ودو کی جولانگہ بن گئی۔ آرڈن نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ لیکن فلپ خاموش رہا اینی [آ]پ کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتی تھی لیکن دراصل اُسے آرڈن سے ایک نوع کی خاص محبت تھی۔ اور یقیناً اینی

انکار کرد بتی۔ اگر اُس سے دریافت کیا جاتا۔

اب آرڈن کے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی کمائی سے کچھ بچا کر اپنی کشتی خریدے اور اپنی لئے ایک خوبصورت گھر تیار کرے۔ قسمت نے یاوری کی۔ تھوڑے عرصہ مین اُس نے کشتی خرید لی۔ اور وہ اُس موجزن ساحل پر جرأت و محنت شعاری، رحمدلی و ہمدردی مین جلد مشہور ہو گیا۔ اُسنے تین دفعہ ڈوبتے ہو ون کو دہشت انگیز لہرون سے نکالا۔ اسی لئے ساکنانِ ساحل کے ہان عزت کی نگاہون سے دیکھا جاتا۔ اور عین عنفوان شباب مین اُس نے پہاڑ کی ایک چٹان پر اپنی کے لئے ایک مختصر سا آشیانہ نما گھر بنا لیا۔

گرما کی ایک شام کو جبکہ لوگ تہوار منانے کے لئے سبزہ وادیون مین جمع ہو رہے تھے۔ ان تینون نے بھی تیاری کی لیکن فلپ کو گھنٹہ بھر اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے دیر ہو گئی جب فلپ وہان پہنچا تو آرڈن اور اپنی ایک سبزہ زار پر ہاتھ مین ہاتھ ڈالے آفتاب کی آخری کرنون کا رقص دیکھ رہے تھے۔ اُس نے آرڈن کے مسرور چہرہ اور اپنی کی لبریز محبت نگاہون سے اپنا مایوس انجام بھانپ لیا۔ جب اپنی نے اپنے لب آرڈن کے لبون پر رکھدئے۔ تو فلپ کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی۔ اور وہ یوددن کے ایک بے ترتیب جھنڈ مین کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا۔ لوگ ہنسے۔ کھیلنے کودنے کے بعد پھولون کی ٹوکریان لے کر گھر آئے۔ اور فلپ سینہ مین چند داغ لے کر لوٹا۔

آرڈن اور اپنی کی شادی ہو گئی اور پورے راحت و سکون کے ساتھ سات سال گذر گئے۔ اس عرصہ مین ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کی عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ اُس کی خواہش یہ تھی۔ کہ وہ اس لڑکی کو بہتر تعلیم و تربیت دینے کے لئے کچھ دولت جمع کرے۔ یہ خواہش استوار تر ہو گئی جب ایک خوبصورت بچہ نے اس مسرت مین اور اضافہ کیا۔

(۳)

واقعات کا رُخ دفعتہً تبدیل ہو گیا۔ حالات بدل گئے۔ تقدیر پلٹ گئی۔ ایک دن آرڈن بندرگاہ مین ایک بانس پر چڑھ رہا تھا کہ پاؤن پھسل گیا۔ زمین پر آپڑا۔ اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ایام علالت مین اُس کے ہان ایک لاغر و کمزور سازرد رنگ کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی تجارت پر بھی ایک ملاح نے قبضہ جما لیا۔ گو آرڈن بہادر، محنت شعار اور سنجیدہ آدمی تھا لیکن اِن حوادث سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے بچے کئی غذا سے زرد پڑ گئے۔ اپنی کے چہرہ پر حزن و ملال کے آثار نمودار ہو گئے۔ اور آرڈن کی زندگی اِن روز افزون مشکلات سے تاریک تر ہوتی گئی۔

ایک دن بستر علالت پر لیٹے ہوئے وہ اِن تاریک واقعات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اُس کا تصور تیرہ و تار مستقبل مین کھو گیا وہ ایک جھٹکے سے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ دعا نکلی۔

"او کائنات کے مالک، میرے بچون کے تمام مصائب میری حیات پر تقسیم کردے اور انھین اس سیاہ مستقبل سے محفوظ رکھ"

اس اثنا میں ایک چینی سوداگر آرڈن کے پاس آیا اور بولا:۔

"میرا جہاز چین جانے کے لئے ساحل پر تیار کھڑا ہے۔ کیا تم کپتان کی حیثیت سے میرے ہمراہ جا سکو گے؟

لیکن آپ کا جہاز کب روانہ ہوگا؟"

"کم از کم تین ہفتے کے بعد"

آرڈن۔ (یہ سمجھ کر کہ اُس کی دعا زود اثر نکلی) "بہت اچھا میں اُس وقت تک یقیناً مکمل صحت پا چکوں گا۔ اور میں جناب کی اس تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں

اس غیر متوقع مژدہ کو سُن کر آرڈن سمجھا کہ اس کی چند روزہ سیاہ بختی اُس بادل کے پریشان ٹکڑوں کی طرح تھی جو آفتاب کی ضیا پاشیوں کو چند لمحوں کے لئے روک دے۔ لیکن میری غیر حاضری میں بچوں کا محافظ کون ہوگا۔ اور یہ کیونکر اس غربت میں زندگی بسر کر سکیں گے"

(کافی دیر تک سوچنے کے بعد) "میں اپنی کشتی بیچ کر اپنی بیوی کے لئے ایک چھوٹی سی دکان چھوڑ جاؤں گا۔ جب ساحل کے ملاح دریا کی طوفانی موجوں میں کشتیاں ڈالے مختلف ممالک جا رہے ہونگے تو ان کی بیویاں اینی سے ضروری سامان خورد نوش خریدیں گی۔ اور اس طرح وہ اپنی زندگی زیادہ سہولت سے بسر کرے گی۔"

اس سوال کو حل کرنے کے بعد آرڈن اینی کے کمرہ میں گیا۔ اینی نوزائیدہ وناتوان بچہ کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ وہ آرڈن کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک آکر دفعتہً یوں گم ہوگئی گویا وہ بجلی کی ایک شعاع تھی۔ جو بادل کا دامن چیر کر نکلی۔ اور فضا کی سیاہیوں میں غائب ہوگئی۔ اینی نے بچہ کو اُٹھا کر آرڈن کی گود میں ڈال دیا۔ آرڈن کا سینہ پدرانہ شفقتوں سے اچھلنے لگا۔ بچے کو پیار کیا۔ اور پھر اینی کی گود میں دیدیا۔

اینی کو ابھی تک آرڈن کے نئے ارادوں کا علم نہ تھا۔ دوسرے دن صبح آرڈن نے نئے سفر کی اُسے خبر دی۔ اُس کا دل سنتے ہی دہل گیا۔ اور سختی سے اس ارادہ کی مخالفت کی! اینی کی افسردہ نگاہیں پژمردہ رخسار۔ رحم طلب آنسو۔ ...... آرڈن کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکے اُس نے کشتی بیچ ڈالی روانہ ہونے سے ایک دن پہلے اُس نے مکان کے ایک حصہ کو مرمت کر کے تمام سامانِ تجارت سجا دیا۔ آرڈن دن بھر کی تکلیف سے تھک کر رات کو جی بھر کے سویا لیکن جب صبح ہوئی تو اینی گھبرائی ہوئی تھی۔ کیونکہ آرڈن اس سے جدا ہونے والا تھا۔ آرڈن غسل سے فارغ ہوا۔ کپڑے پہنے اور اینی سے یوں مخاطب ہوا۔

"میری عزیز اینی۔ میرا یہ سفر بے انتہا خوش اقبالیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ تو ان بچوں کا خیال رکھنا انہیں اچھے کپڑے پہنانا روزانہ نہلانا۔ انکے بالوں کو ہر صبح سنوارنا۔ میں جب واپس آؤنگا تو یہ ننھا کمزور بچہ صحت پاکر بڑا ہو چکے گا۔ میں جب چوکھٹ پر پہنچوں گا۔ تو یہ دوڑ کر دروازہ پر میرا استقبال

"بچہ میری ٹانگوں سے لپٹ جائیگا۔ میں اسے اٹھاؤنگا۔ اور رات کو آتشدان کے پاس بیٹھ کر اپنے لمبے سفر کی سرگزشت سناؤں گا۔"

"اینی آزردہ ملول نہ ہو۔ میرا سفر اللہ کے فضل سے بہت مبارک ثابت ہوگا"

اینی "پیارے آرڈن، تم بڑے عقلمند ہو۔ اور آنے والے واقعات کا اندازہ کر سکتے ہو۔ لیکن مجھے قطعًا امید نہیں۔ کہ میری نگاہیں تمہارے پیارے چہرہ کو پھر دیکھ سکیں گی"

آرڈن "میری نگاہیں تو تمہارے چہرہ کو دیکھ سکیں گی۔ دیکھو اینی! ہمارا جہاز اتوار کو دس بجے لنگر اٹھائے گا۔ تم چھت پر چڑھ کر دوربین سے مجھے دیکھنا۔ تمھیں اُس وقت معلوم ہوگا۔ کہ تمہارے خطرات کتنے ناپائدار ہیں"۔ اینی کے افسردہ لمحات پلک جھپک گذر گئے۔ اور آخری ساعت آ گئی۔

آرڈن۔ اینی۔ گھبراؤ مت۔ اطمینان رکھو۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ گھر کی ہر چیز کی حفاظت کرنا۔ اور میرے متعلق قطعًا کوئی تشویش نہ کرنا۔ اللہ پر اعتماد کرو۔ مشرق بعید کے دور دراز حصص میں بھی وہی خدا ہے۔ سمندر اُس کا ہے ہوا اسکی ہے۔ جس خدا نے یہاں مجھ پر ہر طرح کی مہربانیاں کیں۔ وہی خدا مجھے وہاں بھی خطرات سے بچائیگا"

یہ کہہ کر آرڈن اٹھا۔ اپنی غمزدہ وملول بیوی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اپنے حیران بچوں کی آنکھوں کو چوما سب سے چھوٹا بچہ رات بھر بیمار رہنے کی وجہ سے سویا ہوا تھا۔ اینی اُسے بیدار کرنے لگی۔ لیکن آرڈن نے یہ کہہ کر روک دیا۔ کہ یہ معصوم ہے واقعات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ آرڈن نے بستر ہی پر بچہ کا مُنہ چوما۔ سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ اینی نے اس بچہ کی پیشانی سے بالوں کا گچھا کاٹ کر بطور یادگار آرڈن کو دیا۔ اِسکے بعد آرڈن جلدی سے اٹھا۔ اسباب اُٹھایا اور نکل گیا۔ مگر دور تک مُڑ مُڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔

(۴)

اینی دوربین کہیں سے مانگ لائی تھی، چھت پر چڑھ گئی۔ جہاز نے لنگر اُٹھا دیا۔ خدا جانے نظر کمزور تھی۔ یا دوربین سے دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ بہرحال آرڈن دیر تک تختۂ جہاز پر کھڑے ہو کر رومال ہلاتا رہا۔ لیکن اینی اُسے نہ دیکھ سکی۔ یہانتک کہ آرڈن اُن پر اضطراب لمحوں کو ساتھ لیکر دور نکل گیا۔ اینی چھت سے روتی ہوئی اُتری، اور مجبورًا مشاغل زندگی میں مصروف ہو گئی۔ بدقسمتی سے تجارت میں اُسے سخت نقصان ہوا۔ چیزیں اصل سے بھی کم قیمت پر فروخت کر کے بمشکل وقت کاٹنا شروع کیا۔ وہ یہ خیال کر کے کہ آرڈن اِسے نااہل سمجھے گا۔ اور زیادہ ملول تھی۔ وہ صبح شام آرڈن کے متعلق ہر نو وارد سے دریافت کرتی۔ لیکن کوئی خبر نہ ملی۔ یہانتک کہ اُس کے ذرائع معاش بہت محدود ہو گئے۔ اور اُس کی زندگی سخت تشویش میں بسر ہونے لگی۔ چھوٹا بچہ کمی غذا کی وجہ سے زیادہ کمزور ہوتا گیا۔ اُس کی علالت طویل ہو گئی۔ گو اینی نے اُس کی تیمارداری میں پوری کوشش کی لیکن اُس منحوس طائر کی طرح جو مالک کو غافل پا کر اچانک پرواز کر جائے۔ اُس بچہ کی روح جسم سے

نکل گئی اور اینی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

فلپ نے گو تقریباً ۱۵ سال سے اینی کے ہاں آنا جانا ترک کر رکھا تھا لیکن آرڈن کے جانے کے بعد اُسے کئی دفعہ خیال آیا کہ اینی کی خبرگیری کے لئے اُسے جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اینی کے گھر پہنچا۔ ڈیوڑھی میں چند لمحوں کے لئے ٹھہرا۔ کئی دفعہ دستک دی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ تو مجبوراً اندر چلا گیا۔ اینی بچہ کی تدفین سے ابھی ابھی فارغ ہو کر رو رہی تھی اور انتہائی قلق میں اُسے انسان کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ تھی کہ اُس نے فلپ کو دیکھا۔ اس کا دل اور زیادہ بھر آیا۔

فلپ۔ (لڑکھڑائی زبان سے) میں تم سے ایک عنایت کا طلبگار ہوں۔

اینی۔ عنایت! اور مجھ جیسی تباہ روزگار و پریشان حال سے؟

فلپ۔ ہاں تم سے اور تمہیں سے!

اینی۔ وہ کیا؟

فلپ۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب ہم تینوں بچپن میں مل کر کھیلتے تھے۔ اور وہ دن بھی نہیں بھولا جب تمہاری نظر انتخاب آرڈن پر پڑی کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ عالی ہمت اور زیادہ بلند ارادہ کا انسان تھا۔ میں تمہارے اس انتخاب پر بہت خوش ہوں۔ اس وقت اس نے یہ طویل سفر تفریحاً اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تہذیب کے لئے یہ تکلیف گوارا کی ہے۔ بچوں کی عمر ضائع ہو رہی ہے۔ اور آرڈن کے آنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں۔ اگر آرڈن کسی زمانے میں آ گیا۔ تو اُسے یہ دیکھ کر بے حد رنج ہوگا۔ کہ اُس کے بچے بلا تعلیم رہگئے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم بچے تعلیم کے لئے میرے حوالہ کر دو

اینی۔ میں اس وقت حد درجہ شکستہ حال ہوں اور غم کا پہاڑ مجھے دبائے ہوا ہے۔ تو کیا تم ایک اور بھاری احسان کے نیچے مجھے دبانا چاہتے ہو۔؟

فلپ۔ لیکن جب آرڈن سے میں تمام مصارف لینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ تو پھر احسان کی کیا بات ہے

اینی۔ یہ درست ہے۔ کہ آرڈن تمہارے مصارف ادا کر سکے گا۔ لیکن تمہاری اتنی بڑی نوازش کو کیونکر ادا کرے گا۔

فلپ۔ اینی یہ کوئی نوازش نہیں۔ اگر ہے۔ تو اس کی تلافی تم بہتر صورت میں کر سکتی ہو۔

اینی۔ وہ کیونکر

فلپ۔ وہ یوں۔ کہ مجھے بچوں کو سکول میں بٹھانے کی اجازت دو۔

اینی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اشک آلود آنکھوں سے فلپ کی طرف دیکھا۔ اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت سے دبایا اور یہ کہتی ہوئی پائیں باغ میں چلی گئی۔

"اچھا فلب۔ لیکن تمہارا حق عنایت مجھ جیسی بے بس عورت کیسے ادا کرے گی"

دوسرے روز فلپ نے دونون بچون کو اسکول مین داخل کرادیا۔ انہین ضروری کتابین خرید دین۔۔۔۔۔۔ اور اپنے حقیقی بیٹون کی طرح انکی پرورش شروع کر دی۔ فلپ کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ وہ دن مین کم از کم ایک بار اینی کو دیکھ آئے۔ لیکن اس آرزو کو زبانِ خلق سے ڈر کر بہت کم پورا کرتا۔ ہان تحفتہً اپنے باغ کے میوے۔ پھول اور کبھی مشین کا آٹا بھیج دیتا۔ گو اینی فلپ کے احسانات کے نیچے دب رہی تھی۔ لیکن آرڈن کا تصور اُس کے دل و دماغ پر اتنا محیط تھا۔ کہ وہ اِن جذبات کا اظہار شکریہ کے نامکمل لفظات سے بھی بمشکل کر سکتی۔ بہرحال فلپ اب بچون کی معصوم توجہات کا مرکز تھا۔ وہ فلپ کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آتے۔ اور ٹانگون سے لپٹ کر بہت خوش ہوتے۔ وہ اپنی شکایات اُس کے سامنے بیان کرتے۔ اور اُسے ابا فلپ کہہ کر پکارتے۔ یہی بچے اب فلپ کی مشین کے ننھے مالک تھے۔ اب آرڈن کا تصور بچون کے دماغ مین خواب کی طرح دھندلا ہو چکا تھا۔ آرڈن کی یاد آہستہ آہستہ یون مٹ رہی تھی۔ جس طرح کہ شام کی سیاہیون مین نقوش کوہسار آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے ہین۔

(۵)

شام کا وقت ہے۔ آفتاب کی شعاعین گھنے پتون سے چھن چھن کر رنگین وادیون مین بکھر رہی ہین دور دور تک سکون پھیلا ہوا ہے۔ سیاہیان بڑھ رہی ہین اور پھولون کے ایک خیابان مین اینی فلپ کے ساتھ سر جھکائے سوگوار بیٹھی ہے بچے جھاڑیون مین کھیل رہے ہین۔ فلپ کو دفعتہً وہ شام یاد آ گئی۔ جب اُس نے پہلی دفعہ یہین اینی کو آرڈن کے مسرور پہلو مین دیکھا تھا۔ فلپ کئی روز سے تنہائی کی تلاش مین تھا تاکہ وہ اینی کے سامنے اپنے جذبات دل ظاہر کر سکے۔ اس وقت بہتر موقعہ سمجھ کر بولا۔

"پیاری اینی پورے دس سال آرڈن کے انتظار مین کٹ گئے۔ تیری جوانی ختم ہو گئی۔ تیری زندگی مسلسل سوگ ہو چکی، یہ حالت آخر تابکے۔ یقین کر۔ کہ آرڈن کا جہاز تباہ ہو چکا ہے۔ اور وہ واپس آنے کا نہین۔ مین اس آرزو کو کب تک نہان رکھون۔ کہ مجھے تجھ سے انتہائی محبت ہے۔ مین تیرے موجودہ غربت و افلاس کو نہین برداشت کر سکتا۔ میرا کوئی رشتہ دار نہین۔ اپنے خاندان مین تنہا رہ گیا ہون۔ مجھے کسی اور کی فکر نہین۔ تو مجھے شروع سے جانتی ہے۔ اس لئے اگر تو مجھ سے شادی کرے۔ تو مجھے تیرے بچون کی تعلیم و تربیت اور تیری دلداری مین بے انتہا مسرت ہوگی۔"

اینی۔ پیارے فلپ۔ تو میرے برباد اور ویران غمکدہ مین فرشتہ مسرت بن کر نازل ہوا ہے۔ لیکن تجھے مجھ سے زیادہ اچھی بیوی کی ضرورت ہے۔ مین ملول ہون۔ اور دلھن بننے کی اہلیت نہین رکھتی۔ علاوہ ازین یہ ممکن نہین۔ کہ ایک دل مین دو صورتین گھر کر سکین۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ آرڈن کے بعد تمام دنیا میرے لئے اُجاڑ ہو چکی ہے۔ اور مجھے کائنات کی کسی چیز سے قطعًا کوئی دلچسپی باقی نہین۔

فلپ۔ محبت کے لئے نہ سہی، کیا تو مجھے اپنی خدمت کے لئے بھی منظور نہین کر سکتی

اینی ۔ اچھا تو کچھ مدت اور ٹھہرو۔ شاید کہ مشرق بعید کا کوئی جھونکا سمندر کی کوئی موج۔ یا افق مشرق کا ۔۔۔۔ کوئی سیاح بادل آرڈن کی خبر لے آئے ۔ یا وہ خود آجائے ۔

فلپ ۔ اینی بے سود انتظار نہ کرو۔ کہ آرڈن مدت سے سمندر کی تاریک گہرائیوں مین سو رہا ہے ۔

اینی ۔ فلپ صرف ایک سال اور ٹھہرو۔ گو میرے لئے ایک سال کا عرصہ بہت طویل ہے لیکن تمھارے لئے بہت طویل نہین ۔ مین وعدہ کرتی ہون کہ اس میعاد کے بعد تمھاری ہو جاؤن گی ۔ اگر آرڈن نہ آیا۔ میرا دل کہتا ہے ۔ کہ وہ ضرور آئیگا ۔

دونون کچھ لمحہ کے لئے خاموش ہوگئے ۔ پہاڑون کی بلند ترین چوٹیون سے روشنیان رخصت ہوگئین ۔ دھندلی تاریکیان پھیلنے لگین ۔ فضا سرد ہوگئی ۔ مجبوراً اینی اور فلپ پھولون سے لدے ہوئے بچون کو لیکر رخصت ہوئے ۔ چوکھٹ پر پہنچ کر اینی نے ہاتھ ملایا ۔ اور اندر چلی گئی

(۶)

"آہ آرڈن تیری یاد مین زندگی تاریک ہوگئی ۔ مسرتین بھول گئین ۔ میری حیات کا ہر لمحہ فسانۂ درد بن گیا ۔ کیا تو واقعی ڈوب کر مر گیا ۔ آہ ادل باور نہین کرتا ۔ تو آئے گا ۔ اور ضرور آئیگا" یہ تھے وہ الفاظ ۔ جو ایک صبح اینی کے منہ سے نکل رہے تھے کہ فلپ نمودار ہوا ۔ اور بولا ۔

فلپ ۔ سال ختم ہوگیا ہے ۔ مین تم سے تکمیلِ وعدہ کی درخواست کرتا ہون ۔

اینی ۔ ہین؟ سال؟ اتنی جلدی؟ وہ کیسے؟

فلپ ۔ ہان ۔ یقیناً وہ سامنے دیکھو ۔ کوہسار کے خشک دامنون سے چشمے اُبل رہے ہین ۔ سرسبز وادیان پھر پھولون سے بسر ہوگئین ۔ ببولون کے زرد پھولون پر بھونرے پھر اُڑنے لگے شہد کی مکھیون نے پھر چھتے بنانا شروع کئے ۔

اینی ۔ مگر فلپ ایک ماہ اور انتظار کرو ۔ ایک ماہ کوئی زیادہ عرصہ نہین ۔ شاید کہ آرڈن آجائے ۔ آہ آرڈن!!

فلپ ۔ اینی مجھے عذر نہین ۔ لیکن پورا ایک ماہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ پورا ایک ماہ ۔۔۔۔۔۔۔۔

اینی ۔ مین تمھاری خاموش اور پائدار محبت کی بے حد قدر کرتی ہون ۔ لیکن اتنے بڑے تغیر کے لئے صرف ایک ماہ مہلت چاہتی ہون

فلپ (آبدیدہ ہوکر) تمھاری خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہون ۔

چند دن گذر گئے ۔ ایک رات اللہ کے حضور مین اینی نے رو رو کر آرڈن کی حیات و موت کے متعلق کسی فیصلہ کن نشان کے متعلق دعائین کین ۔ آدھی رات گذر گئی ۔ اور وہ روتی رہی ۔ آخر اُٹھی انجیل مقدس کو چوما ۔ کھولا ۔ اور آنکھین بند کرکے ایک آیت پر اُنگلی رکھدی ۔

اس آیت کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"وہ ایک کھجور کے درخت کے سایہ مین ہے۔ اور اُسپر آفتاب چمک رہا ہے"

اینی اسے اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ سوچتے سوچتے سوگئی۔ خواب مین دیکھا۔ کہ ایک بلندی پر کھجورون کے نیچے آرڈن بیٹھا ہوا گا رہا ہے۔ اُسے جاگتے ہی یقین ہوگیا۔ کہ آرڈن مرچکا ہے۔ اور اُس کی روح فردوس کی فضا مین مسرور و خرم ہے فوراً فلپ کو پیغام بھیجا۔ اور رسم نکاح ادا ہوگئی۔ ہر چند اب اُن کی زندگی کا نیا دور تھا۔ لیکن اینی کے تصور مین صرف آرڈن بس رہا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نامحسوس چیز کے انتظار مین رہتی۔ اُسکے کان کسی نامسموع آواز کی طرف لگے تھے۔ وہ جب کہین باہر سے گھر لوٹتی۔ تو دروازہ کی کنڈی پکڑ کر گھنٹون کھڑی رہتی۔ وہ بدستور اُداس رہتی۔ تقریباً ایک سال کے بعد اُس کے ہان ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اینی کے مادرانہ جذبات مین پھر زندگی آگئی۔ فلپ کے ساتھ بھی اُسے دلبستگی پیدا ہوگئی اور آرڈن کی تصویر رفتہ رفتہ اینی کے دماغ سے محو ہوگئی

(۷)

آرڈن چینی جہاز پر سوار ہوکر بعافیت تمام چین پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ وہین رہا۔ واپسی پر بچون کے لئے کھلونے اور اپنی پیاری بیوی کے لئے ہار خریدا۔ جہاز لنگر اُٹھاکر چلدیا۔ چند دن اطمینان سے گذرے۔ لیکن ایک صبح اپنے دامن مین سینکڑون طوفان لئے نمودار ہوئی۔ سمندر کی سطح پر ہزارون کوہ پیکر موجین لوٹ رہی تھین۔ گویا سمندر اُبل رہا تھا۔ آندھی اس زور سے چل رہی تھی کہ جہاز کو سنبھلنا دشوار ہوگیا اور راہ سے بھٹک گیا آخرکار آدھی رات کے قریب جہاز ایک چٹان سے ٹکرایا اور پاش پاش ہوگیا۔ آرڈن اور چند مسافر تختون سے لپٹ گئے۔ رات بھر طوفان کے ہچکولے کھاتے رہے۔ صبح کے قریب وہ تختے ایک تنہا دور افتادہ جزیرہ پر جالگے اِن تینون نے پہاڑ کے ایک غار کو کھجور کے پتون سے ڈھانک کر گھر بنایا اور جنگلی میوون پر بسر کرنے لگے۔ پانچ سال کے بعد ان مین سے ایک ساتھی مرگیا اور صرف دو آدمی باقی رہگئے انھون نے ایک بڑے درخت کا تنہ کہین سے ڈھونڈھ لیا اُس تنہ کے اندرونی حصہ کو تیز پتھرون سے کاٹ کر اور چقماق کے شعلون سے جلاکر کشتی بنانے کی کوشش شروع کردی۔ کہ آرڈن کا ساتھی بیمار ہوگیا۔ اور ہفتہ کے اندر وہ بھی مرگیا۔ اب آرڈن تنہائی مین بہت گھبرایا۔ ہر چہار سو سفید سمندر۔ لہرون کی خوفناک آوازین۔ دور تک کوہسار کا بلند سلسلہ۔ ویرانی۔ بربادی۔ خاموشی اداسی۔ سرسبز پہاڑون کی برفانی چوٹیون پر کہر کے بادل چھائے رہتے۔ درختون کی جھکی ہوئی چوٹیون کو نسیم وصبا کے آوارہ جھونکے چھیڑتے۔ خوشرنگ وادیون کے رنگ برنگ پھولون پر سنہری تیتریان دن بھر اُڑتین۔ تنون اور شاخون پر لپٹی ہوئی بیلون مین زرد و سفید پھول حسین منظر پیش کرتے۔ کھجورون کے جھنڈ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب مناظر آرڈن کے سامنے تھے۔ لیکن آ[illegible] کی آنکھین انسانی چہرہ کو ترس رہی تھین دریائی پرندون کی دلفریب صدائین صبح وشام آتی تھین۔ سمندر کی مسلسل موجین چٹانون سے ٹکراکر ساحل پر نغمے بکھیرتی تھین۔ پتون کے ساز سے ہوا نغمے اچھالتی تھی

پہاڑوں کی پیشانی سے پھوٹنے والی ندیاں نغمے گاتے ہوئے نکل جاتی تھیں۔ یہ سب کچھ تھا لیکن آرڈن کے کان صرف انسانی آواز کے لئے مضطرب تھے۔ وہ اپنے جھونپڑے میں بیٹھ کر پانی کی نیلی سطح پر ٹکٹکی جمائے رکھتا۔ وہ ساحل پر بیتابانہ ٹہلتا۔ اور سمندر کو ہمیشہ دیکھتا رہتا کہ شاید کوئی جہاز آتا ہوا دکھائی دے۔ برسوں گذر گئے مگر جہاز نہ آنا تھا نہ آیا۔

ہر صبح آفتاب کی اچھوتی کرنیں ساحل پر نہانے آتیں۔ ہر شام نیلے پانی میں شفق کا ارغوانی عکس عجیب کیفیتیں پیش کرتا اسی طرح دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے اور کوئی صورت نجات کی اس کو نظر نہ آئی وہ پہروں ایک جگہ یوں جم کر بیٹھ جاتا گویا وہ مرچکا ہے۔ آنکھوں میں گھر کا نقشہ آنکھوں میں جما رہتا۔ اسے وہ دن یاد آتے جب اینی سے مل کر وہ پھولوں کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ بچوں کی گفتگو۔ وہ بات بات پر شرما جاتیں۔ وہ اُنکے ہلکے ہلکے قہقہے۔ وہ اُن کا ماں کی آغوش میں خوش ہو ہو کر لیٹنا۔ یاد آتا۔ قلب کی مشینیں اُس کی پیاری آواز۔ وہ کشتی۔ وہ ساحل وہ کچے گھر۔ وہ نومبر کی سرد ہوا۔ وہ گرد آلود صبحیں۔ اور وہ دھندلی فضائیں۔ آرڈن کو رہ رہ کر ستاتیں۔ وہ گو جوان تھا۔ لیکن مسلسل مصائب نے بوڑھا کر دیا تھا۔ کمر جھک گئی تھی۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ اور نجات سے اسقدر مایوس ہو گیا تھا۔ کہ نجات کی خواہش بھی رفتہ رفتہ مٹ چلی تھی۔

(۸)

"جہاز کہیں سے کہیں آگیا۔ کمپاس خراب ہو چکے ہیں۔ رہبر نادارد۔ افسوس کہ اب ہمارا صحیح سالم گھر پہنچنا بہت مشکل ہے"

یہ تھے۔ وہ الفاظ جو ایک گہر آلود صبح کو صدائے غیر مانوس بن کر دس سال کے بعد دفعتہً آرڈن کے کانوں تک پہنچے۔ وہ اُٹھا ساحل پر آکر دیکھا۔ تو ایک جہاز لنگر ڈالے ہوئے ہے۔ ملاح اس عجیب الہیئت، انسان کو دیکھکر گھبرائے۔ آرڈن نے اشاروں سے (دس سال میں گفتگو کرنا بھول چکا تھا)...... انہیں اطمینان دلایا۔ انکی باتیں سننے کے بعد آرڈن میں بولنے کی طاقت عود کر آئی۔ اپنی تمام رام کہانی سنائی۔ نیز اُنہیں یقین دلایا۔ کہ وہ خود بہتر ملاح اور راہ و رسم منزل سے باخبر ہے۔ اس لئے انہیں گھبرانا نہیں چاہئے۔ اہل جہاز نے آرڈن کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر ساتھ بٹھالیا۔ اور چل دئے۔

آرڈن کی حالت میں تغیر پیدا ہونا شروع ہوا۔ اُسکی افسردگیاں دور ہونے لگیں۔ اُس کے چہرے پر دس سال کے بعد مسرت کی جھلک سی نظر آنے لگی۔ وہ ملاحوں سے اپنے گھر کے متعلق بار بار پوچھتا۔ لیکن وہ نہ بتا سکتے۔

دن گذرتے گئے۔ آخر پورے دو ماہ کے بعد آرڈن کا وطن نمودار ہوا۔ اُسے دور سے قلب کی مشینیں نظر پڑیں پھر آہستہ آہستہ وہ کچے مکانات۔ وہ ساحل پر ٹوٹی ہوئی کشتیاں نظر آئیں۔ اس کا دل لامحدود مسرتوں سے اچھلنے لگا ملاحوں نے از راہ ہمدردی کچھ رقم چندہ کرکے آرڈن کو دی۔ جہاز ٹھہرا۔ تو آرڈن فوراً اترا۔ اور گھر کو چلدیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مغرب کی پہاڑیاں سیاہ بادلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاہیاں چھا گئیں۔ آندھی چل پڑی

کچھ بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ لیکن آرڈن نہایت تیزی کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ گاؤن مین داخل ہوا۔ چند تاریک گلیون سے گذرنے کے بعد وہ اپنے چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر زور زور سے دستک دینے کو تھا۔ کہ دروازے پر ایک سفید کاغذ نے اُس کی توجہ کھینچ لی۔ بجلی چمکی تو جلی قلم سے لکھے ہوئے یہ الفاظ اُسے نظر پڑے :۔

"یہ مکان فروخت ہوگا" کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دل بیٹھنے لگا اور بدن پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ آہستہ آہستہ حواس قائم ہوئے۔ تو اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اینی مر گئی ہے۔ اور بچے یتیم ہو کر خدا جانے کہان کی خاک چھان رہے ہونگے وہ سال کی طرف لوٹا۔ اور ایک ایسی سرائے مین چلا گیا جس کی مالک ایک بڑھیا تھی۔ جسے آرڈن اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ یہان وہ آغازِ شباب مین دن کا بیشتہ حصہ بسر کیا کرتا تھا۔ گو بڑھیا بھی آرڈن سے اچھی طرح واقف تھی۔ لیکن اب قطعًا نہ پہچان سکی۔ آرڈن اُس سرائے مین چند دن رہا۔ لیکن رازِ دل کسی سے نہ کہہ سکا۔ باتون باتون مین اُسے بڑھیا سے معلوم ہو گیا کہ اینی نے دس سال کے طویل انتظار کے بعد فلپ سے شادی کر لی۔ اور اب اُس کے ہان بچہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ بڑھیا نے اینی کی دردناک داستان کو ان الفاظ پر ختم کیا۔ "آہ آرڈن تباہ ہو گیا"

آرڈن نے اک خاموش آہ کی۔ اور یہ سوچ کر (کہ اینی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی) بڑھیا کے الفاظ نہایت ہی دردناک لہجہ مین دوہرائے "آہ واقعی آرڈن تباہ ہو گیا"

آرڈن عمومًا سرسبز وادیون مین ان مقامات پر پہرون بیٹھا رہتا جہان اُس نے کوئی شام اینی کی معیت مین بسر کی تھی۔ وہ پہاڑ کے دامن سے اپنے پُرانے مکان کو دیر تک دیکھتا رہتا۔ اُس کے دماغ مین ماضی کے تمام فسانے ایک ایک کر کے آتے۔ وہ بسا اوقات ہاتھون سے منہ کو ڈھانک لیتا۔ اور اپنی سیاہ بختی پر پہرون روتا۔

"اُسنے ایک دن سوچا کہ کسی نہ کسی طرح اینی کو دیکھنا چاہئے۔ اگر وہ خوش ہو۔ تو مین اپنی سوگوار تنہائیون کو یقینًا گوارا کر یون گا"

اینی کو دیکھنے کا تصور آرڈن کے دِل و دماغ پر اتنا مستولی ہوا۔ کہ وہ ایک تاریک شام سرائے سے چل نکلا۔ اور پوچھتے پوچھتے فلپ کے نئے گھر تک جا پہنچا۔ چراغ جل چکے تھے۔ فلپ کا گھر روشنیون سے جگمگا رہا تھا۔ دروازون اور کھڑکیون کی باریک جالی سے لیمپ کی سبز و سفید شعاعین چھن چھن کر بائین باغ کے گھنے درختون تک پہونچ رہی تھین آرڈن چپکے سے پائین باغ مین داخل ہوا۔ اور دبے پاؤن سامنے کھڑکی تک جا پہنچا۔ ہاتھ اُٹھا کر آنکھون کے سامنے کر لئے اور کھڑکی کی آہنی جالی سے اندر جھانکا اُس نے ہشاش بشاش بچے دیکھے۔ فلپ کو دیکھا۔ اینی دیکھی۔ الغرض ایک ایسا گھرانہ دیکھا جسکی مسرتون مین آرڈن کا قطعًا کوئی حصہ نہ تھا۔ سامنے کی صاف میز پر چاندی کے برتن چمک رہے تھے الماریون مین چائے کے سٹ رکھے تھے۔ چارپائیون پر بستر لگے ہوئے تھے۔ وسط مین انگیٹھی دھک رہی تھی۔ جسکے گرد فلپ بچون سمیت بیٹھا تھا۔ فلپ کی دائین طرف اینی تھی۔ بائین طرف اینی کے شکل و صورت کی ایک نوجوان حسین لڑکی نوزائیدہ

بچہ سے کھیل رہی تھی۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں ایک رنگدار فیتہ تھا جسے وہ بچے کے ننھے ننھے ہاتھوں تک لے آتی اور جونہی بچہ اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ تو وہ فیتہ کو اوپر کھینچ لیتی۔ بچہ کی اس ناکام کوشش کو فلپ دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ اپنے بڑے بیٹے سے گفتگو کر رہی تھی۔ اور کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی۔

آرڈن نے یہ تمام منظر دیکھا۔ اُسنے اپنی پیاری بیوی۔ خوبصورت اور جوان بچوں کو دیکھا جو امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

آرڈن سخت بے چین و بے قرار ہوگیا۔ قریب تھا کہ اُس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل کر تمام گھر کی مسرتوں کو درہم برہم کردے کہ آرڈن نے بدقت تمام اپنے آپ کو روکا۔ وہاں سے اُلٹا پیچھے ہٹا۔ اور باغ سے باہر آگیا

اس کے بعد آرڈن نے سوچا کہ اپنے بچوں سے بھی ملے۔ یا نہ ملے لیکن اپنے صبر و ضبط پر اعتماد نہ کرتے ہوئے بچوں سے ملنے کا خیال بھی قطعًا ترک کر دیا۔

آرڈن سرائے میں واپس آگیا۔ اب اس کا شبانہ روز کا مشغلہ صرف عبادت تھی جس میں اُسے مکمل سکون ملتا ایک دن یونہی باتوں باتوں میں آرڈن نے سرائے کی مالکہ سے دریافت کیا۔

آرڈن۔ "کیا فلپ کی بیوی کو یہ خطرہ نہیں۔ کہ اس کا پہلا شوہر زندہ ہو۔ اور آجائے"

مالکہ۔ "ہاں اُسے رات دن یہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اگر تم یا کوئی اور اُسکے پہلے شوہر کی نسبت کوئی اطلاع دے سکے تو وہ بے حد ممنون ہو"

آرڈن خاموش ہوگیا۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اُسے ضرور ہمراز بنائے گا۔ اسی حالت میں پورا سال گذر گیا۔ آرڈن کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ مختلف بیماریاں ہجوم کر آئیں۔ اور اُسے موت کا یقین ہوگیا۔ اسی حالت میں اسنے مالکہ کو طلب کرکے کہا کہ

"مقدس بائبل کی قسم کھا کر کہو۔ کہ جو راز میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔ اُس کا افشا نہیں کرو گی"

مالکہ۔ (کچھ سوچنے کے بعد)۔ بہت اچھا میں انجیل کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمھارا راز ظاہر نہیں ہوگا

آرڈن۔ کیا تو آرڈن کو جانتی تھی؟

مالکہ۔ یقینًا۔ اُس کی جوانی اُس کی اُٹھی ہوئی گردن۔ اُس کا ابھرا ہوا سینہ دور سے پہچانا جاتا تھا۔

آرڈن۔ لیکن اُس کی جوانیاں خواب و خیال ہو چکی ہیں۔ اُسکی بلند گردن ابر سُوں ہو گئے کہ اوپر نہیں اُٹھی اور وہ مصائب کا شکار اس وقت تمھارے سامنے ہے

مالکہ۔ (چونک کر) ہیں! کیا آرڈن تم ہو۔؟ واقعی؟ نہیں کبھی نہیں۔ وہ تم سے فٹ بھر اونچا تھا

آرڈن۔ ہاں یہ درست ہے۔ لیکن یقین کرو۔ کہ آرڈن میں ہی ہوں۔ اپنی سے میری ہی شادی ہوئی تھی۔

فلان گھر مین نے ہی آباد کیا تھا۔ اور اس تمام ساحل پر میری ہی محنت، مشقت اور جوانمردی کے ترانے گائے جاتے تھے۔
مالک کے آنسو نکل پڑے اور وہ بے اختیار ہوگئی کہ اپنی سے سارا حال کہہ سنائے لیکن آرڈن نے کہا کہ ٹھیرو مین اپنے
عہد کو کسی طرح توڑ نہین سکتا اور اس زندگی مین اس سے کسی طرح نہین ملسکتا۔ مگر میری موت قریب آگئی ہے۔ اور مین
سامنے دوسری دنیا کے افق پر چمکیلے بادل چھائے ہوئے دیکھ رہا ہون۔ مین تم سے مرنے کے بعد اپنی تک ایک پیغام لے جانے
کی درخواست کرتا ہون اس سے کہنا۔ کہ آرڈن واپس آیا۔ اور اُس نے تمھین ایک رات بچون مین خوش وخرم دیکھا۔ اُسے
یقین دلانا۔ کہ مرتے دم تک میری محبت مین فرق نہین آیا۔ مین جب تک زندہ رہا...... بہبودی کے لئے مصروف دعا
رہا۔ اور مرتے وقت لبون پر تیرا نام تھا۔ مین جب مر جاؤن۔ تو بچون کو میری میت پر بھیجدینا، انھین اجازت دینا کہ وہ
اپنے مصیبت زدہ اور مسافر باپ کی نعش پر چند معصوم آنسو ٹپکائین۔ لیکن انکی میری میت پر نہ آئے۔ مبادا میرے بے جان
چہرہ کی یاد اُنکی زندگی کو تلخ کردے۔
یہ بالون کا گچھا اُسے دینا۔ اور کہنا۔ کہ مین اس گچھے کو دوسری دنیا تک لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن چونکہ میرا
وہ بچہ مجھسے پہلے چلا گیا ہے۔ اس لئے اس کی یادگار تمھارے لئے چھوڑ چلا ہون۔ اور خود اس سے جاکر ملا جاتا ہون۔
مالک اُٹھ کر کاروبار مین مصروف ہوگئی۔ آرڈن دیر تک گفتگو کرنے کی وجہ سے تھک کر سو گیا۔ چند ہی لمحے گذرے
تھے کہ آرڈن جھٹکے سے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔
"وہ جہاز آیا۔ جہاز۔ مین بچ گیا۔ مین بچ گیا"
اور ہمیشہ کے لئے خاموش
کہتے ہین کہ اس قصبہ کے باشندون نے کبھی اتنا شاندار جنازہ اُٹھتے نہین دیکھا۔ اور آج تک ساحل کے
پہلو مین ایسا "ہیرو" کبھی دفن نہین ہوا۔

برق بی اے

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

عربی معاشرت مین شاعر کا درجہ

"شاعری اور الہام" کا عقیدہ طبقات انسانی مین مشترک ہے، بالخصوص مشرق کی جن اقوام کی تاریخ شاعری موجود ہے، انکے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے، کہ ہر قوم قدیم زمانہ مین شعرا کے ساتھ الہامی خصوصیات کو بھی ضروری سمجھتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان، عرب، فارس مین ہر جگہ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا میکڈونلڈ نے پروفیسر گولڈزیہر کے حوالہ سے اس مسئلہ پر ایک جامع بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"حقیقت شاعری اور شعرا کی شخصیت کے متعلق قدیم عربون کا رجحان اور عقیدہ کیا تھا؟ اسکا جواب پروفیسر گولڈزیہر کی عالمانہ تحقیقات سے دیا جا سکتا ہے، جو اسکی تصنیف "لسان عربیہ" (Abhandlungen zur arabischen Philologie) مین شایع ہو چکی ہین، اس سوال کا جو جواب کتب عربیہ سے مستفاد ہوتا ہے وہ وہی ہے جو قدیم اقوام مین پایا جاتا ہے کہ شاعری ایک ساحرانہ بیان ہے، عالم باطن کا ایک الہام ہے، اور شاعر ایک ہی وقت مین ایک پیشینگو بھی ہے اور مصلح بھی ناصح بھی ہے، اور اعداء کے مقابلہ مین اعمال سحر کا ماہر بھی زبان عربی مین (Poet) کے لئے عام اور قدیم اصطلاح "شاعر" ہے جسکے معنی ہین "وقوف رکھنے والے" کے معنی کے لحاظ سے یہ عبرانی لفظ "ایدیولی" سے ملتا ہوا ہے، لیکن عبرانی اصطلاح ساحرانہ خیالات، اور الہیاتی دائرہ سے نکلکر "شاعرانہ بیانات" کے معنی مین استعمال نہین ہوئی، عبرانی مین ایک اور لفظ "موشیل" ہے جسکے معنی ہین ایک خاص قسم کا شاعر جسکے بیان مین ہجو وغیرہ پایا جائے، اور جسکے الفاظ برے نتایج پیدا کرین بنی اسرائیل کی تاریخ مین "موشیل" کے علاوہ ایک اور لفظ بلعم نظر آتا ہے جس کا مفہوم وہی ہے جو کسی وقت عرب مین شاعر کا تھا اسلئے سامی دنیا مین شاعر وہ تھا جس مین کلادنت اور نبی کی خصوصیات ایک مرکز پر جمع ہو جائین "بلعم" کے متعلق بظاہر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسے عالم غیب سے کوئی علاقہ ہے، اور علاقہ بھی وہ جو "مابعد الطبیعیات" سے واسطہ رکھتا ہے۔

اہل عرب کا یقین تھا کہ انکا شاعر "جنات" کی دنیا سے رسم و راہ رکھتا ہے، قدیم عربون مین جنات کی مذہبی حیثیت بھی، جو علم الاصنام مین دیو پری وغیرہ کی حیثیات کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ وہ وہمی قسم کے ہوتا ہین اور انہین اسلام نے بھی ایک جداگانہ مخلوق تسلیم کیا ہے، چنانچہ اسلامی عقیدہ کی بنا پر جنات مین بعض مسلمان ہین بعض کافر اور بعض ارباب شر و فتنہ،

"ایک عربی شاعر کو جنات کے ساتھ کیا تعلق تھا، اسکی ایک نظیر حسان ابن ثابت کی زندگی مین پائی جاتی ہے جو رسول اللہ کے ایک باریاب صحابی، اور مدح سرا شاعر تھے، رسول اللہ عموماً شاعری کے مخالف تھے اور اکثر شعرا آپکے خلاف تھے، لیکن حسان ابن ثابت نے ایک خاص قسم کی شاعری سے آپکی حمایت کی، اور خصوصیت کے ساتھ شعرائے کفار کی ہجویہ شاعری اور لعن طعن کا جواب دیا۔ ان کے شاعر بننے کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعثت اسلام سے قبل جبکہ وہ ابھی بچہ تھے اور ہنوز کوئی شعر نہ کہا تھا، ایک جنیہ کی بدولت شعر وسخن کا میلان ہو گیا، وہ ان سے مدینہ کی گلی مین ملی اور لپٹ کر انہین دبایا اور مجبور کیا کہ وہ تین اشعار کہین، اسکے بعد سے وہ شاعر ہو گئے، اور دوسرے عربی شعرا کی طرح "جن" کی بدولت انہین اشعار کا الہام ہونے لگا وہ خود فرماتے ہین کہ کس طرح "جنات" انکی انشا کے لئے الفاظ فراہم کرتے ہین اور وہ خود معترف ہین کہ شب کیوقت کیسے وزنی الفاظ انپر نازل ہوئے، یہان ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ اصطلاحات جو انہون نے استعمال کئے ہین وہی ہین جو نزول وحی کے متعلق استعمال ہوتے ہین روایات سے یہی پتہ چلتا ہے، کہ رسول اللہ مسجد مین انکے لئے ایک ممبر قایم کرتے تھے اور اظہار انبساط کیطور پر آپ نزدیک کھڑے رہتے، اور حسان یہین سے اعدائے اسلام کے خلاف اشعار پڑھا کرتے یہ ان چند مواقع مین سے ایک موقع تھا جبکہ رسول اللہ شاعری کے موافق نظر آتے ہین چنانچہ آپکی مشہور حدیث ہے کہ "اللہ تعالی روح القدس سے حسان کی مدد کرتا ہے، جب تک وہ پیغمبر خدا کی حمایت اور مدح کا فخر رکھتے ہین" لیکن یہان "روح القدس" سے مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث کا جزو ثالث مراد نہین

حسان کی ابتدائی شاعری اور رسول اللہ کے آغاز نبوت کے متعلق جو واقعات بیان کئے جاتے ہین ان مین ایک ہی اصطلاحات موجود ہین، اور یہ دوسرا غور طلب نظریہ ہے، جس طرح حسان کو ایک نسوانی روح نے دبوچا اور ان سے اشعار کہلائے، اسی طرح ابتداء وحی مین پہلے پہل جبرئیل نے آن حضرت سے آیتین پڑھوائین اس کے علاوہ جس طرح جبرئیل آن حضرتؐ کے "قرین" کہلاتے ہین اسی طرح ایک جن ایک شاعر کا قرین ہوتا ہے، اور وہی لفظ "نفث" دونون کے لئے استعمال ہوا ہے یہ محمدؐ کے ابتدائی زمانہ کا کابوس تھا اور اسوقت آپکا رجحان بالکل شعر وشاعری کی طرف تھا، یقیناً آپ قدیم عربی طرز کے ایک شاعر تھے، جنھین ہرچند نظم نگاری کے قواعد واصول کا علم نہ تھا لیکن شاعری کے کاہنانہ طریق سے خاص شغف رکھتے تھے

مجھے یہان ان تفصیلات سے بحث نہین جو شعرا اور انکے سروش غیبی کی ملاقات کے متعلق بیان کیجاتی ہین کہ "کس طرح ایک شاعر جبتک سکا ہاتف غیبی مکان کے ایک گوشہ سے آکر اسے نہ پکارے بے یار و مددگار پڑا رہتا ہے" "کس طرح شاعر حالت یاس مین اپنے اونٹ پر ریگستان کا رستہ لیتا ہے، اور ایک مقام پر آکر پکارتا ہے "آؤ اپنے بھائی کی مدد کرو، اپنے بھائی کی مدد کرو" اور کس طرح جلد تر مدد پہونچتی ہے۔ "شاعر کس طرح زمین پر

لیٹ جاتا ہے، اور جبتک ایک سو سترہ اشعار نہیں کہہ لیتا اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا" اس قسم کی اور بھی بہت سی حکایات ہیں جو بطور تفریح بیان کیجاتی ہیں۔

عرب کے شعرا اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کے درمیان جو مشترک خصایص پائے جاتے ہیں انکا مطالعہ کرنیکے بعد نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ عربوں کے معاشرتی اور سیاسی معاملات میں شاعر کا درجہ کیا تھا؟ کس طرح بنی اسرائیل موسیٰ کی وساطت سے یہوی کے حکم کے مطابق اپنا خیمہ قایم کرتے اور پھر اکھاڑ لیتے تھے، اور کیسے حضرت موسیٰ کی وساطت سے کس طرح ان کی خانہ بدوش زندگی کے قیام و سفر کے صحیح اوقات اور مقامات کے لئے یہوی کی رہنمائی ہوتی، قدیم قبائل عرب میں شعرا کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ زہیر ابن جناب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے:-

"جب زہیر کہتا ہے، اے اہل قبیلہ سفر کرو، تو وہ سفر کرتے ہیں اور جب کہتا ہے، کہ قیام کرو تو وہ قیام کرتے ہیں"

ایک شاعر کس طرح مذہبی رنگ میں اپنے قبیلہ کی رہنمائی کرتا مفصلہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔

آغانی (جلد ۹) کے حوالہ سے میکڈونلڈ نے اہل عرب کے ایک قاید کے وہ معاشرانہ اصول نقل کئے ہیں، جو وہ اپنے قبیلہ کے مختلف طبقات کے لئے پیش کرتا تھا، بنی ازد کا ایک قاید کھڑا ہوتا ہے، اور کہتا ہے۔

جسکے پاس دودھ اور پانی کی مشکیں مضبوط ہوں، اسے مویشی گاہ سے نکلکر "الشامن من" چلا جانا چاہئے اور یہاں صنعا کے بنی ازد آباد ہیں، جو غربت و افلاس میں مبتلا ہو اسے بطن مر میں چلا جانا چاہئے، جہاں بنی خزاعہ رہتے ہیں، اور تم میں جو شراب و کباب، حکومت و سلطنت، حریر و پرنیان چاہتے ہیں انہیں بصرہ اور الحفیر میں چلا جانا چاہئے، جو سرزمین شام میں ہے اور جو وہاں آباد ہیں، آل غسان کہلاتے ہیں، اور تم میں جنکے مقاصد بعید ہوں، اور انکے پاس مضبوط اونٹ اور اچھا سامان ہو، انہیں عمان کے "قصر جدید" میں چلا جانا چاہئے، اور جو وہاں آباد ہیں، بنی ازد عمان کہلاتے ہیں، اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ چیزیں مٹی اور غبار سے پیدا ہوں، انہیں یثرب میں جانا چاہئے، جو کھجور کے درختوں سے مالامال ہے، اور جو یہاں رہتے ہیں "اوس" اور "خزرج" کہلاتے ہیں"

یہ تمام معاشرانہ نظریات مسجع عبارت میں ہیں جو کاہنوں کے مکالمہ کے لئے مخصوص تھی

اسی لہجہ میں سودا بنت زہرہ کے وہ مقالات پائے جاتے ہیں جو اسنے اپنے قبیلہ کے آیندہ ڈرانیوالے کے متعلق کہے تھے یہ قبیلہ قریش کی ایک کاہنہ تھی، اسنے اپنے قبیلہ سے کہا، کہ تم اپنی لڑکیاں لاؤ، انمیں ایک ڈرانیوالی عورت ہوگی، اور اس سے ایک "ڈرانیوالا مرد" پیدا ہوگا، جب وہ لڑکیاں کاہنہ کے پاس لائی گئیں تو اسنے ہر ایک کے بارہ میں کچھ نہ کچھ بیان کیا، جب بی بی آمنہ (آنحضرت کی والدہ) کی باری آئی تو کاہنہ نے بتایا کہ یہ وہی ڈرانیوالی

عورت ہے"، (ضمیری)

ایک شاعر جو اس قسم کی باتین کہتا ہے، اپنے قبیلہ کا "قاید" کہلاتا ہے،

اسکے بعد میکڈونلڈ ایک عربی شاعر کا کلام دیکر، اسے زنی کرتا ہے، کہ اسکا لہجہ کہانت کے لہجہ سے ملتا ہوا ہے،

"بنو عامر کے مقابلہ مین مت جاؤ، مین انہین خوب جانتا ہون، مین ان سے لڑا ہون اور وہ مجھ سے لڑے ہین، مین ان پر غالب آیا ہون اور وہ مجھ پر غالب آئے ہین، مینے بنو عامر کی طرح کسی قبیلہ کو منزل مین زیادہ بیچین نہین دیکھا، اللہ کی قسم مجھے انکے اندر سراپا شجاعت کی خوبی نظر آتی ہے، وہ اپنے مقام پر مضطرب ہونے کے لئے پڑے نہین رہین گے، بلکہ تم پر ضرور آئینگے، اللہ کی قسم اگر تم آجکی رات سوئے تو تمھین یہ پتہ نہین چلے گا کہ کب انہون نے حملہ کیا"،

ڈاکٹر گولڈزیہر نے جاہلیت عرب کی تاریخ سے کوئی ایسی نظیر نہین پیش کی جس مین ایک شاعر "اشموئیل" کی طرح بحیثیت قاضی نظر آتا ہو لیکن یہ یقیناً ہمارے نقص ماخذ کا نتیجہ ہے، یہ ایک پر معنی بات ہے، کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ مین اخطل ایک شاعر ہونیکے باوجود اپنے قبیلہ کی مسجد مین ایک قاضی کی حیثیت سے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ قبل از اسلام قدیم رواج کی یادگار ہوگی، جس مین شاعر کو ایک مذہبی اختیار اور شکوہ حاصل تھا، اسلئے ہم لوگ یہ خیال نہین کر سکتے کہ محاسن افکار، بدیعہ اشعار قدرت کلام یا قبیلہ کی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات کے متعلق گہرے مطالعہ اور تدبر حکمت کے صلہ مین شعرا کو یہ مخصوص منزلت حاصل تھی، بلکہ اس کی کاوش فکر کو الہام سے تعبیر کیا جاتا جب وہ جنگ یا حملہ کے موقعہ پر اپنے قبیلہ کے سامنے اشعار پڑھتا تو اسکی نوعیت ایسی ہوتی، جیسے کوئی روح اسکے اندر حلول کر گئی ہے، جب وہ مجلس شوریٰ مین بیٹھتا، اور اچانک اٹھکر اپنے پر جوش الفاظ، اور رنگین لہجہ مین اپنا فیصلہ سناتا تو لوگ اسے ایک دیوتا کا بیان تصور کرتے وقتاً فوقتاً ریگستان کی صامت فضا مین اس پر وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور جب وہ جوش مین آتا تو اسکے منہ سے عجیب و غریب الفاظ نکلتے، الغرض ریگستان کے خموش، اور سنسان مقامات مین اور پہاڑون کی تیرہ و تار رہگزر مین اگر کوئی ذات "جن" کو دیکھتی، یا اسکی باتین سنتی، تو وہ شاعر کی ذات تھی۔ ان واقعات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچگئی کہ عرب قوم یقین رکھتی تھی کہ اسکے شعرا عالم غیب سے مستفیض ہوتے ہین اور وہ انکو کاہن دینی کی طرح سمجھتے تھے

عرب مصنفین بیشک شاعر کاہن اور اعراف مین امتیاز کرتے ہین۔ اعراف بھی کاہنون کی ایک قسم ہے، لیکن شاعر اور کاہن سے اسکا درجہ بہت کم ہے تینون جماعتون کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ عالم بالا سے رہنمائی حاصل کرتے ہین اعراف بھی کاہن ہی کی طرح اشیائے مسروقہ اور گم شدہ مویشیون کا پتہ بتاتے تھے اور لوگ اس سے ایک طبیب کی طرح بھی مشورہ بھی کرتے۔ کاہن کا کام یہ تھا کہ وہ مستقبل کی پیشینگوئی کرے، اور اشیائے مخفیہ کا پتہ بتلائے،

اکثر وہ ایک خاص معبد مین مقیم رہتا، لفظ "کاہن" ٹھیک عبرانی لفظ (Kohen) کی طرح ہے، جسکے معنی "مذہبی عالم" کے ہین، اور وہین لوگ اس سے مشورہ کرتے "شاعر" ان قیود سے آزاد تھا، وہ اپنی قوم کا مشیر ہوتا تھا، اور اسکا مشورہ جنات کی وساطت سے ہوتا تھا، وہ ایک انسان تھا، ایک آزاد مجاہد تھا اور اسکے لئے کسی خاص معبد یا خانقاہ کی گوشہ نشینی لازم نہ تھی، اسکا الہام صرف روح عقل، اور لطافت ادراک ہی تک محدود نہ ہوتا، بلکہ اس کی آتش بیانی بھی الہامی چیز سمجھی جاتی تھی یہ اعتقاد بعثت اسلام کے بعد بھی بہت دنون تک قایم رہا ایک مشرقی شاعر اب بھی اس تخیل سے آزاد نہین ہو سکتا، کہ اسکا کلام بالکل ملہمانہ ہوتا ہے جیسے کسی طرح کا دش ذہن، اور جدت خیال کا نتیجہ نہین کہہ سکتے، اگر وہ ایک مذہبی آدمی ہے تو اسے سروش غیب اور ہاتف کی صدائین سنائی دیتی ہین، یا حضرت "خضر" سے ملاقات ہوتی ہے جو مسلمانون کے علم الادیان والاصنام کے ایک نہایت ہی عجیب وغریب ہستی ہین[1] جنھین موت نہین آتی اور جنکا کام یہ ہے کہ کرہ ارض پر پھر پھر کر مخلوق کی مدد کرین، انھین راہ دکھائین، اور مشورہ دین، ساتوین صدی ہجری مین ...... ایک حنبلی عالم کا یہ خیال تھا کہ قرآن غیر مخلوق ہے، اور وہ اسکے ثبوت مین یہ دلیل پیش کرتا تھا، کہ اگر ایسا عقیدہ نہ رکھا جائے تو اس مین اور ایک شاعر کے الہام شعر وسخن مین ما بہ الامتیاز کیا رہجاتا ہے

اسلام مین جن اور شیاطین کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہین پایا جاتا، ہم لوگ یقینی طور پر نہین کہہ سکتے کہ لفظ جن سے ایک عرب مصنف کا مقصد صرف کسی ذات کے "خبیث روحانی" کا اظہار ہوتا ہے، (جو مسیحیت اور یہودیت سے لیا گیا ہے) یا طبقہ جن کا ایک شریر فرد مراد ہوتا ہے۔

قدیم زمانہ مین عربون کا دستور تھا کہ جنگ و جدل کے دن قبیلہ کا ایک شاعر آگے بڑھکر مخالفین کے سامنے ہجو و طعن آمیز اشعار پڑھتا، اس سے صرف اپنے قبیلہ کی ہمت افزائی اور اعدا کو مضطرب اور شرمگین کرنا مقصود نہ تھا بلکہ اس اعتقاد کی بناپر تھا کہ شاعر کے الفاظ مین ایک جادو ہوتا ہے، اور اس معمولی لعن طعن کے نمونے ہمین بڑے بڑے شعرائے عرب کے دوادین مین نظر آتے ہین

اسی طرح یہودیون کے درمیان مین گو لیتھ کا نام پایا جاتا ہے، جو بنی اسرائیل کے لشکر سے "تمسخر اور تضحیک کیا" یا اس کی بنیاد صرف اس عقیدہ پر ہے، کہ شعرا کے جسم مین روح حلول کر جاتی ہے، اور انکی تمام شاعرانہ نکتہ آفرینیان ہی کے ہنگامۂ عمل کا نتیجہ ہے یعنی شاعر صرف ایک واسطہ ہے جسکے ذریعہ سے "عالم غیب" اپنی کرشمہ آرائیان دکھاتا

عربی شاعری کے متعلق میکڈونلڈ کے خیالات پر تنقیدی نظر

میکڈونلڈ نے قدیم عربونکی اس ذہنیت پر بحث کرتے ہوئے کہ "شاعری جن کا الہام ہے" عالمانہ تحقیق کا

[1] چنانچہ تاریخ فرشتہ مین حضرت خسرو دہلوی کے بیان مین یہ واقعہ پایا جاتا ہے کہ انھون نے بھی حضرت خضر سے ملاقات کی اور ان سے لعاب دہن مانگا تاکہ شاعری کا فیضان ہو "صحبت خواجہ خضر دریافتہ التماس لعاب دہان نمود حضرت خواجہ خضر گفت این دولت نصیب شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی گشتہ" ع ـ م

کافی ثبوت دیا ہے اور اس مین کلام نہین کہ عربون کا یہ قدیم عقیدہ انکی زبان اور محاورہ کا ایک ضرب المثل بن گیا ہے، چنانچہ عہد اسلام کا ایک شاعر موسی بن جابر کہتا ہے

علامہ فیض الحسن سہارنپوری "شرح فیضی" مین لکھتے ہین

العرب تزعم ان لکل شاعر جنا یلقی الیہ شعرہ وعلیہ قولہ تعالی وما تنزلت بہ الشیاطین وانہ لقول رسول کریم معناہ ان ھذا القول القاہ جبرئیل علیہ السلام الی الرسول وما تنزلت بہ الشیاطین کما تنزلت شعراً فما کان یعجز احدھم عن الشعر لقولون "نفرت منہ جنتہ" ثم شاع استعمالہ فی کل من ضعف طاقتہ،

عربون کا گمان تھا کہ ہر شاعر کیساتھ ایک "جن" ہوتا ہے جو شعر کا الہام کرتا ہے، اسی پر قرآن مجید کے اندر خدا تعالی (سورہ شعراء مین) فرماتا ہے "وما تنزلت بہ الشیاطین وانہ لقول رسول کریم" مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بیان فرماتے ہین اسکے لانیوالے جبرئیل ہین، شیاطین نہین جو شعر کا الہام کرتے ہین اور جب کوئی شخص شعر کہنے سے عاجز ہوجاتا، تو کہتے کہ اسکا "جن" اس سے پھر گیا اسکے بعد اسکا استعمال ہر اس شخص پر ہونے لگا جس کی طاقت گھٹ جائے

الغرض "نفرت جنی" کے عربی محاورہ سے قدیم عربون کے تخیل پر ایک گہری روشنی پڑتی ہے جس پر میکڈونالڈ نے اپنے محققانہ مضمون مین ایک مبسوط بحث کی ہے۔ اس مین شک نہین کہ عہد اسلام کا ایک شاعر (موسی بن جابر) کبھی ...... یہ فقرہ استعمال کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اسنے قدیم معنی مین استعمال نہین کیا ہے، بلکہ اس عام معنی (ضعف و بیچارگی) مین جسمین متاخرین عرب استعمال کرنے لگے تھے، یہ عقیدہ کہ شاعری نتیجہ ہے، جنات کے القا و الہام کا عہد نبوت مین رد کر دیا گیا، اور اسکی بجائے حضرت حسان کے لئے نبی صلعم نے "اللہم ایدہ بروح القدس" کہکر دعا کی، اسکے بعد تمام شعرائے اسلام اپنی شاعری کو القائے جن کی بجائے الہام اور تائید روح القدس سے تعبیر کرنے لگے،

میکڈونلڈ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حسان ابن ثابت قدیم شعرائے عرب کے لہجہ مین اپنے افکار شاعرانہ کو "وحی" سے تعبیر کرتے ہین، اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کو "وحی" اور منزل من اللہ بتاتے ہین، توگویا اس صورت مین آن حضرت قدیم عربی طرز کے ایک شاعر ہین یہان البتہ مجھے مستشرق موصوف کی محدود علمی واقفیت پر افسوس آتا ہے، تعجب ہے کہ انہون نے لفظ "وحی" کے مختلف معانی پر غور نہین کیا، حالانکہ خود قرآن مجید مین "وحی" مختلف معانی مین استعمال ہوا ہے، سورۂ نحل مین شہد کی مکھی کیساتھ اسکی نسبت دیگئی ہے "فاوحی ربک الی النحل" سورۃ طہ مین حضرت موسیؑ کی والدہ کے متعلق "اذ اوحینا الی امک ما یوحی" کہا گیا ہے، حالانکہ شہد کی مکھی اور "ام موسی" کو تو اسمیں نبوت سے کوئی سروکار نہین، اس سے بھی بڑھکر سورہ انعام مین ہے۔

یہان تو شیطانی اغوا، اور طینت خبیثہ کے لئے لفظ "وحی" آیا ہے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اسی معنی مین ہے، جو انبیا کے لئے مخصوص ہے، شاعر، ادیب، صناع، مغنی اپنے کمالات انفرادی کے باعث ملہم کہے جا سکتے ہین، لیکن اس معنی مین انہین حامل وحی نہین کہا جا سکتا، جس معنی مین سرور کائنات کو کہا جاتا ہے، اور خود "الہام" اور "وحی" کا یہ امتیاز علامہ موصوف نے لکھا ہے، جسکے متعلق "تصوف اسلام" مین ایک ضمنی بحث کر چکا ہون، اس سلسلہ مین علامہ موصوف نے اس حدیث سے بھی غلط طور پر استدلال کیا ہے، جس مین آنحضرت نے حضرت حسان کے متعلق "ایدہ بروح القدس" کہا ہے، یہان میکڈونلڈ کو غلط فہمی ہوئی، یہ تو ایک ضعیف استدلال ہے، شاید انکی نظر اس حدیث تک نہین پہونچی جس مین خواب کو "جزء من تسع و اربعین جزء من النبوۃ" کہا گیا ہے، اس مین عام لوگون کی طرف بھی نبوت کا تعلق پیدا کر دیا گیا ہے، حالانکہ "نبوت" اور "مدارج نبوت" کا امتیاز انہون نے نہین سمجھا، تائید روح القدس، رویائے صالحہ، کشف و الہام "مدارج نبوت" ہین "کمال نبوت" نہین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان کے لئے نفس قدسیہ کے ایک بلند نشیمن پر پہونچنے کی دعا کی، نہ یہان نبوت کا کوئی سوال ہے، اور نہ مماثلت نبوت قایم کرنیکی کوئی وجہ[۵۱]

جنات اور شیاطین کے متعلق اسلام کا معیار بہت صاف ہے، قرآن مجید مین نفس کے خبیث اثرات کو بھی شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک ذات[۵۲] خاص بھی متعین کی گئی ہے، جو نفس کے اندر خبث و شر پیدا کر دیتی ہے، چنانچہ آیت "لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ شیطان انسان کے نفس مین حلول کرکے فتنہ و شر پیدا کر دیتا ہے[۵۳]، یہ خیال اس حدیث سے اور راسخ ہو جاتا ہے، جس مین یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت نے بی بی صفیہ سے تاریکی شب مین مسجد نبوی کے نزدیک باتین کرتے وقت دو صحابیون کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ "ہی صفیۃ" انہون نے کہا یا رسول اللہ خدا نخواستہ ہم لوگ آپکے متعلق کسی بدگمانی کا ارتکاب کر سکتے ہین؟ آپنے فرمایا کہ شیطان خون کی طرح رگون مین دوڑتا ہے،

جنات، شیاطین، غول، وغیرہ کے متعلق مرا ایک بسیط مضمون رسالۂ "جن" مین شایع ہونے والا ہے،

---

[۵۱] آپ علی الرغم مکڈانلڈ "الہامات شعری" اور "الہامات نبوت" مین امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہین، لیکن آپ اس کے لئے کوئی دلیل پیش نہین کرتے۔ قطع نظر اس سے کہ مکڈانلڈ کا استنباط صحیح ہے یا غلط، یہ مسئلہ بجائے خود بحث طلب رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ کو ایک کامیاب شاعر سے (جہانتک صرف قرآن کا تعلق ہے) کیونکر علحدہ کر سکتے ہین۔ ممکن ہے آپ آیندہ اس مسئلہ کو صاف کرین (نگار)۔

[۵۲] قرآن سے کہین یہ ثابت نہین ہوتا کہ شیطان کوئی مخصوص ہستی ہے جو انسان کے اندر حلول کر جاتی ہے۔ (نگار)

[۵۳] اس آیت سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر نبی کے دشمن ہو جاتے ہین جو متمدن و غیر متمدن دونون طبقون سے متعلق ہوتے ہین حلول کا مفہوم کس لفظ سے پیدا کیا گیا (نگار)

جس میں علمائے مغرب کے اسانید، صنمیات کی روایتوں، اور مشرقی فلاسفہ و محققین کے نظریات سے اس مسئلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسلئے یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں،

عربی شاعری کی خصوصیات اور فارسی شاعری سے موازنہ

بعثت اسلام سے قبل عربوں کی سیاسیات کسی ایک نظام کے ماتحت نہ تھی، بلکہ تمام آبادی مختلف قبایل میں منقسم تھی، اور ان میں ایک قومی اور ملکی ہم آہنگی کے بجائے صرف ایک تنگ نظرانہ ہمدردی ایک قبایلی عصبیت اور قبایلی تفاخر و مباہات پائی جاتی تھی، اسلئے عہد جہالت کی شاعری میں یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، البتہ جب اخلاق قرآنی نے تمدن عرب پر اثر ڈالنا شروع کیا تو یہ رکیک جذبات مٹتے گئے۔ چنانچہ شعرائے مخضرمی و اسلامی کے کلام سے یہ تدریجی تغیر ظاہر ہوتا ہے۔

شعرائے عرب کی دوسری خصوصیت انکی سادگی بیان، اور بیساختگی بیان ہے، وہ واقعات روزمرہ کو نہایت خوبی سے ادا کرتے ہیں نہ اس میں فارسیوں کی طرح غلو پایا جاتا ہے، نہ صرف خیالات کا غلو، اسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ قدرت نے انہیں ایسے ملک و احول میں پیدا کیا تھا کہ انہیں تصور کی دور ازکار جدت طرازیوں، اور تخئیل کی بیجا تاویلات کا موقعہ ہی نہ تھا، انکے سامنے وسیع ریگزار تھا، پہاڑ اور ٹیلے تھے، دو منہ الجندل، غزال، وغیرہ قدرتی طور پر اس خطہ ارضی کے خاص پیداوار تھے سیدھے سادے فطری مناظر پر انہیں غور کرنے کا موقعہ ملا، انکی شاعرانہ تشبیہات، اور عشقیہ استعارے جیساکہ جیمس کا نفسیاتی نظریہ ہے، ماحول سے اثر پذیر ہوئے۔ اسکے برخلاف فارسی شعراکو سیاسیات اور طبعی ماحول کے اعتبار سے فکر و احساس میں ترقی دینے کے بہت زیادہ مواقع حاصل تھے، انکے سامنے اکاسرہ اور قیاصرہ کا جاہ و جلال تھا، انکے نظام تمدن میں وسعت تھی، انہیں غیر قوموں سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ تھا انکے سامنے قدرتی مناظر زیادہ دلکش تھے، اسلئے فارسی اور عربی تخئیل میں بُعد عظیم ہونا چاہیے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ نظریہ کے مطابق فارسیوں کے علمی اور تمدنی ترقی کیساتھ ظاہر اور باطن کا تضاد ایک لازمی امر تھا، اسکے برخلاف عربوں کے اندر جذبات و احساسات کو مخفی رکھکر منافقانہ طرز عمل پیدا کرنا ناممکن تھا، انکی عشقیہ شاعری والہانہ تھی اور تصور کی آورد، اور تخئیل کی آلایش سے پاک تھی، انکی محبت عفیف کا تقاضا تھا کہ وہ صرف حق و صداقت کے کلمات کہیں۔

عشقیہ شاعری

ابو تمام نے حماسہ کے اندر شعرائے اسلام کے بھی کلام درج کئے ہیں، لیکن معلقات سبعہ تمام و کمال عرب کے دور جہالت کی یادگار ہے، اسمیں شک نہیں عرب کی عشقیہ شاعری کے اعتبار سے حماسہ ایک نامکمل چیز ہے اور معلقات سبعہ سے قدیم عربوں کے افسانہائے عشق و محبت پر ایک ایسی روشنی پڑتی ہے، جسکا اندازہ صرف حماسہ کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتا یہ صحیح ہے، کہ معلقات کے اندر بھی وہی روح شاعری کارفرما ہے جسکی نظریں ابوتمام نے

شرح و بسط کے ساتھ حماسہ میں جمع کر دی ہیں،

ڈاکٹر تسڈل نے "ماخذ قرآن" میں معلقات سبعہ کی تدوین کے متعلق ابوجعفر محمد بن اسمعیل النحاس کی مفصلہ ذیل روایت نقل کی ہے،

واختلفوا في جامع هذه القصائد السبع
وقيل ان العرب كان اكثرها يجتمع بعكاظ
ويتناشدون الشعر فاذا استحسن الملك قصيدة
قال علقوها واثبتوها في خزائني فاما قول من
قال علقت في الكعبة فلا يعرفه احد من الرواة
واصح ما قيل في هذا ان حماد الراوية لما
رأى زهد الناس في الشعر جمع
هذه السبع وحضهم عليها و
قال لهم هذه هي المشهورات
فسميت القصائد المشهورات

ان قصائد سبعہ کے جمع و تدوین کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے ایک قول تو یہ ہے کہ اکثر اہل عرب عکاظ (ایک مقام کا نام ہے، جہاں عرب ایام جاہلیت میں [illegible] Olympian کی طرح میلہ لگایا کرتے تھے، آں حضرت کے زمانہ میں بھی یہ میلہ لگتا تھا، اور بخاری میں سلسلہ واقعہ مروی ہے کہ آں حضرت وہاں تشریف لیگئے) میں مشاعرہ کرتے تھے اور جب بادشاہ کو کوئی قصیدہ پسند آتا تو وہ اسے [illegible] کرنے کا حکم دیتا اور اپنے خزانہ میں رکھ دیتا، دوسری یہ روایت کہ یہ خانہ کعبہ میں آویزاں ہوتے تھے [illegible] راوی سے نہیں سنی اور سب سے صحیح قول یہ ہے کہ حماد الراویہ نے جب لوگوں میں شعر و شاعری کا شغف دیکھا تو [illegible] یہ سات قصائد مرتب کئے اور [illegible] سے پھر اسکا نام قصائد مشہورہ پڑ گیا

معلقات کے اندر سات قصائد ہیں جنکے مصنفین علی الترتیب حسب ذیل ہیں:
امرؤ القیس، عمرو بن عبد، ملقب بہ طرفہ، زہیر بن ابی سلمی، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن [illegible] حارث بن حلزہ۔

انمیں بہ استثنائے لبید ابن ربیعہ، تمام "شعرائے جاہلی" کے نام سے موسوم ہیں، کیونکہ ان لوگوں نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، لبید نے ایکسو ستاون سال کی عمر پائی، اسلئے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور [illegible] ہجری میں وفات کی، بخاری اور مسلم نے لبید کے اس مصرعہ الا كل شيء ماخلا الله باطل کے متعلق حدیثیں روایت کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصدق كلمة قالها شاعر كلمة لبيد، یعنی کسی شاعر کا سچا سے سچا کلام ہو سکتا ہے، تو وہ [illegible] مصرعہ ہے: معلقات کے تمام مصنفین نے اپنے قصیدہ میں اپنی لذت عشقیہ کا اظہار کیا ہے، اور جیسا کہ ڈاکٹر [illegible] نفسیات" میں "قانون تجدید" Sublimation (؟) [illegible] اور فاسٹر اسکا ثبات "شعور جنسی" میں یہ [illegible] بخشیں کی ہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد جاہلیت کے یہ قصائد سبعہ ذوق عشقیہ کی پیداوار ہیں، چنانچہ امرؤ القیس کی

معشوقہ عنیزہ تھی، اور کچھ اس درجہ لبریز جذبات ہو کر امرؤالقیس نے اسکا تذکرہ کیا ہے کہ بے اختیارانہ شاعر کے جوش فکر کی داد دینی پڑتی ہے، اس مین شک نہین اسکی عاشقانہ زندگی رندانہ حیثیت رکھتی ہے، جس مین محبت عفیفہ کی تلاش بالکل فضول چیز ہے، وہ ایک "رند شاہد باز" تھا، وہ عہد شباب کو معصیت کوشیون کی نذر کر چکا تھا، وہ حسن نسائی کا دلدادہ تھا، اور اسکی عشق مزاجی کے لئے کوئی خاص مرکز نہ تھا، وہ عنیزہ کو مخاطب کر کے صاف صاف الفاظ مین اُسکے وصل کا طالب ہوتا ہے، اور اپنی دوسری محبوب عورتون (ام باب اور ام حویرث) کا تذکرہ کرتا ہے، وہ بہ یک وقت "دار جلجل" کی نہایت شہوت پرستانہ ساعت کی بھی یاد کرتا ہے[۵۱]، اور دوسرے وقت "مصوت لقودی راسها فتمایلت" (یعنے اسکا گیسو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ مایل ہو گئی) بھی کہہ بیٹھتا ہے۔ ابونواس (اسلامی شاعر) عرب مین امرؤالقیس کا مقابل قرار دیا جاتا ہے میرے خیال مین رندانہ عشق بازی کے لئے فارسی شعرا مین حافظ کو امرؤالقیس سے ایک خاص مماثلت ہے اگو وہ تاویل کریئے، "می نوشی" کی طرح حافظ صاحب کی "شاہد پرستی" پر بھی مجاز کا پردہ ڈال دینا پسند کرتی ہے۔ امرؤالقیس کی عشقیہ جادوبیانی انشاء اور تخئیل کے اعتبار سے تو یقیناً معلقات کے بقیہ مصنفین سے بڑھی ہوئی ہے لیکن جہانتک محبت عفیف، اور صفائے باطن کا تعلق ہے، وہ سراپا فسق و فجور ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ جس انداز مین طرفہ نے خولہ، زہیر نے ام اوفی، لبید نے نوار، عمروبن کلثوم نے ام عمرو، عنترہ نے عبلہ، اور حارث نے اسماء کیلئے عشقیہ جذبات کا اظہار کیا ہے ان سے امرؤالقیس کا کلام بالکل معرا ہے، امرؤالقیس کے شوق طلب مین شہوت پرستی کارفرما نظر آتی ہے، اور بقیہ شعرا کے شکوۂ ہجران مین ایک خاص کیف افزا گداز ہے

معلقات مین شروع سے آخر تک ایک ہی روح شاعری، ایک ہی خیال، اور ایک ہی اسلوب بیان پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ بقیہ چھ قصاید پہلے قصیدہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہین، تمام قصاید کے اندر شاعر نے تشبیب سے ابتدا کی ہے اور اسکے بعد وحوش صحرائی کے محاسن جسمی اور خصوصیات شمایل کا نقشہ کھینچا ہے، سب نے (باستثنائے طرفہ) دیار محبوب کے ٹوٹے پھوٹے مساکن، اور حسرت و درد پیدا کرنے والے مناظر پر کچھ اس والہانہ انداز مین روشنی ڈالی ہے کہ پڑھکر جی بے چین ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، کہ نفس کی تمام کثافتین دور ہو گئی ہین اور انسان ایک معصومانہ محبت پر نہایت سکون

---

[۵۱] "دار جلجل" ایک مقام کا نام ہے۔ امرؤالقیس عنیزہ کا شیفتہ تھا، لیکن اسکی نگاہ شوق ہمیشہ وصل محبوب کو ترستی رہتی تھی، ایکدن عنیزہ کا قبیلہ اس مقام سے کوچ کر رہا تھا جہان عارضی طور پر سکونت اختیار کر لی گئی تھی، عنیزہ اپنی سہیلیون کے ساتھ دار جلجل مین گئی امرؤالقیس کو خبر ہوئی وہ پہلے ہی سے وہان آکر چھپ گیا، عورتین آئین اور اپنے کپڑے اتار کر غسل کرنے لگین امرؤالقیس کمینگاہ سے باہر آیا اور انکے کپڑے لے لئے، عرب کے رسم قدیم کے مطابق عورتین عریان نہا رہی تھین اب وہ پانی سے نکلین تو کیسے نکلین، ادہر امرؤالقیس نے کہا تم لوگ برہنہ جسم ہی آکر مجھ سے کپڑے لے لو، چنانچہ سبھون نے ایسا ہی کیا اور وہ اپنی معصیت کوش آنکھین اس شرمناک منظر سے آسودہ کرتا رہا، عنیزہ سطح آب سے نہین نکلتی تھی، ناچار اسے بھی برہنہ آنا پڑا، اور امرؤالقیس نے اسے پس و پیش سے برہنہ دیکھکر اسکا کپڑا دیدیا، (شرح معلقات اربعہ فارسی مرتبہ محمد اسحاق اسلام آبادی) ع۔م

کے ساتھ قربان ہونے کیلئے تیار ہے۔ خاقانی نے اپنے اس مشہور قصیدہ مین جو "ایوان مداین" کی تباہی کے متعلق ہے، تمامتر معلقات کے اسلوب بیان سے استفادہ کیا ہے، اور جیسا کہ مفصل ذیل موازنہ سے ثابت ہوگا، خاقانی کے بہت سے اشعار جو (ایوان مداین کے مرثیہ مین ہین) لبید ابن ربیعہ کے خیالات، اسلوب بیان اور بعض جگہ پورے پورے مضامین سے ماخوذ ہین،

امرؤ القیس کہتا ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل

"اے میرے دوستو، ٹھہرو، تاکہ ہم اپنی محبوبہ اور اسکے مسکن کو یاد کرکے جو تودۂ ریگ کے کنارہ، اور موضع دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے، گریہ وبکا کرلین،"

اسکے بعد چند اشعار مین دیار محبوب کی ویرانی کا نقشہ کھینچکر کہتا ہے کہ "اب نہ محبوبہ ہے، نہ اسکے قبیلہ کی چہل پہل بلکہ وہ مسکن اب ویران ہے جس مین اب صرف ہرنیان رہتی ہین"

زہیر ابن سلمی کہتا ہے،

بہا العین والآرام یمشین خلفۃ   واطلاؤہا ینہضن من کل مجثم

زہیر ام اوفی پر عاشق تھا، جب وادی عرب کے اس مقام سے جہان ام اوفی کا قبیلہ خیمہ زن تھا، دوسرے مقام پر چلا گیا، تو زہیر اس مسکن ویران مین پہونچتا ہے، اور یہ دیکھکر اسکے گداز عشق مین ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے کہ خانۂ محبوب مین اب نیل گائے اور ہرن چل پھر رہے ہین، اور انکے بچے ادہر ادہر کھڑے ہین یعنی مسکن محبوبہ اب وحوش کی جائے قیام بن گیا ہے

اسی طرح عنترہ، اور حارث بن حلزہ نے بھی دیار محبوبہ کی ویرانی کا ماتم کیا ہے، چنانچہ عنترہ اپنی محبوبہ عبلہ کا نام لیکر کہتا ہے۔

یا دار عبلۃ بالجواء تکلمی   وعمی صباحا دار عبلۃ واسلمی

لیکن لبید ابن ربیعہ (مصنف معلقہ رابعہ) نے کچھ اس اسلوب سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، کہ اسکے مطالعہ سے اہتزازی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

عفت الدیار محلہا فمقامہا   بمنیً تأبد غولہا فرجامہا

"دیار محبوبہ، اور اسکی اقامتگاہ جو منی مین تھی ناپدید ہوگئی، دیار غول اور دیار رجام مین اب وحشت برستی ہے"

فمدافع الریان عری رسمہا   خلقا کما ضمن الوحی سلامہا

"کوہ ریان کے دامن مین جو نالے ہین اس مقام کے ساکنون کے کوچ کرنیکے باعث وحشتناک معلوم ہوتے ہین، اور اس دیار کہنہ کے نشانات اسی طور پر ظاہر ہین جس طرح پتھر پر نقوش"

فروع الایہقان واطفلت   بالجلہتین ظباؤہا ونعامہا

"یعنی بارش کے سبب وہاں سبزہ نکل آیا ہے، اور ہرنیوں اور وحوش نے اس میں بچے دینا شروع کر دیے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

وجلا السیول عن الطلول کانها | زبر تجد متونها اقلامها

"یعنی خانۂ محبوبہ کے گرد وغبار کو سیلاب نے دھو کر صاف کر دیا، اور گھر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک خط ہے جسکے سطور از سرنو درست کر دیے گئے ہیں"

فوقفت اسالها وکیف سوالها | صما خوالد ما یبین کلامها

"پس میں کھڑا ہو کر دیارِ محبوبہ کے آثار باقیہ سے اسکے رہنے والوں کا حال دریافت کرتا ہوں، اور میرا سوال بھی عجیب ہے، پتھر سے بھی کہیں جواب ملتا ہے"

اسکے مقابلہ میں خاقانی کے مفصلۂ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں۔

ہان اے دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان | ایوان مداین را آئینۂ عبرت دان
از نوحہ چغد الحق مائیم بہ دردسر | از دیدہ گلابی کن دردسر ما بنشان
آرے چہ عجب داری کاندر چمن گیتی | چغد است پے بلبل نوحہ است پے الحان
گہ گہ بہ زبان اشک آوازدہ ایوان را | تا بو کہ بگوش دل پاسخ شنوی ز ایوان
دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو | پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان
این ہست ہمان درگہ کو را ز شہان بودے | ...
این ہست ہمان در گہ کز نقش رخ مردم | خاک در او بودے دیوار نگارستان
پندار ہمان عہد است از دیدۂ فکرت بین | در سلسلۂ درگہ در کوکبۂ میدان

خاقانی کے اس مرثیہ میں ۴۲ ابیات ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اسنے اس جوش و خروش سے کہے ہیں کہ قلب سامع میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور بعض مضامین بھی ایسے نادر ہیں کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے خیال کی رفعت، جذبات کی اثیریت، قدرت کلام، نیچرل ادا، تمام باتیں کیف آفرین ہیں، اور غالباً خاقانی کا یہ قصیدہ ان چند قصاید میں سے ہے جن میں سہل عبارت اور مانوس الفاظ مستعمل ہیں، ورنہ غیر مانوس اور ادق الفاظ میں گہرے معانی، لطیف اشارے، اور رمزیات و کنایات، خاقانی کے کلام کی خصوصیت ہے، اور یہی وجہ ہے کہ صاحب گلشن ابراہیم نے لکھا ہے کہ فیضی کو خاقانی کا کلام پسند نہ تھا۔

بایں ہمہ بادنی تامل ہر انسان کہہ سکتا ہے کہ خاقانی نے مذکورۂ بالا اشعار میں معلقات، (اور بالخصوص لبید) سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، اس مرثیہ کے بقیہ ابیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مثنوی "زہر عشق" میں "ایوان مدائن" کے نقوش سے کافی مدد لیگئی ہے، خاقانی کہتے ہیں،

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک | زیشان شکم خاک است آبستن جاویدان
خون دل شیرین است آن می کہ دہد رزبن | ز آب گل پرویز است آن خم کہ دہد دہقان
چندین تن جباران این خاک فرو خوردہ است | این گرسنہ چشم آخر ہم سیر نشد زیشان

خاقانی کے ان ابیات کے سامنے مضمون کی رباعیات خیام ہیچ معلوم ہوتی ہیں، مثنوی زہر عشق میں نواب مرزا نے جہان تنبیہ، نصیحت، پیام کے دلاویز نقوش پیش کئے ہین وہان صاف خاقانی کے خیالات کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

(باقی) عبدالمالک آروی

شاہزادۂ خرم اور ابابیل

شہر کے سب سے بلند حصہ مین ایک بلند مینار پر شہزادۂ خرم کا بت نصب تھا۔ اس مجسمہ پر سر سے پانون تک سونے کے
پتر ہائے گئے تھے آنکھون کے حلقون مین درخشان نیلم جڑے تھے اور ایک بڑا لعل اسکے تلوار کے قبضہ پر چمک رہا تھا۔ اسمین
نہین کہ لوگ اس بت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایوان بلدیہ کے ایک رکن نے جس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ اس کے ذوق سلیم
ودین ایک روز اس بت کو دیکھ کر کہا کہ :۔ "یہ بت ایسا خوبصورت ہے جیسے مرغ بادنما"۔ پھر اس اندیشہ سے کہ کہین لوگ
نہ لین کہ وہ غیر عملی آدمی ہے حالانکہ درحقیقت وہ ایسا نہ تھا اس نے اپنے ایرادمین اسقدر اضافہ اور کر دیا کہ "فرق صرف
ہے کہ وہ کار آمد چیز ہے اور یہ بیکار"

اسی طرح ایک روز ایک چھوٹے بچہ سے جبکہ وہ چاند کے لئے بیقرار تھا اس کی مان نے کہا کہ "تم ایسے کیون نہین
تے جیسا شہزادہ خرم ہے، دیکھو اسکے دل مین کسی چیز کے لئے ضد کرنے اور رونے کا خیال تک نہین آتا

اسی طرح ایک روز کوئی دلشکستہ اور مایوس آدمی اس حیرت انگیز بت کی طرف دیکھ رہا تھا تو اسکی زبان سے نکلا "مین
ت دیکھ کر خوش ہوا کہ دنیا مین کوئی تو ایسا ہے جو واقعی مسرور و شادکام ہے"

ایک روز خیرات خانے کے بچے صاف ستھرے سفید کرتے اور سرخ کوٹ پہنے گرجا سے نکلے تو انھون نے بھی شہزادہ کے
کو دیکھ کر کہا کہ "شہزادہ تو بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے"

ریاضی کے استاد نے دریافت کیا کہ :۔ "جب تم لوگون نے کوئی فرشتہ دیکھا ہی نہین تو پھر تمہین کیا معلوم کہ فرشتہ
ا ہوتا ہے" اسکا جواب بچون نے یہ دیا کہ :۔ "دیکھا کیون نہین ہم نے بارہا خواب مین دیکھا ہے"

ماہر ریاضیات برہم ہوکر بچون کو گھورنے لگا کیونکہ وہ اسے پسند نہین کرتا تھا کہ بچے خواب دیکھا کرین۔

ایک رات کو شہر کے اوپر ہی اوپر ایک ننھی سی ابابیل اڑی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھی سب کے سب چھ ہفتہ
ترمصر جا چکے تھے اور یہ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ اسے ایک نہایت خوبصورت نے از سل ہسے محبت ہوگئی تھی سب سے پہلے ابابیل نے
حسین "نے" کو اسوقت دیکھا تھا جب ایک زرد رنگ کی تیتری کے تعاقب مین دریا پر اڑی جا رہی تھی خوبصورت
کی پتلی کمر اس ابابیل کو کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ وہ اس سے باتین کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔

ابابیل نے جو بہت جلد "آمدم برسر مطلب" کہنے کی عادی تھی نے سے پوچھا کہ کیا مین آپ سے محبت کرون؟" اور
نے بھی ادا کیساتھ خم ہوکر اپنا رضامندی کیا۔ پس ابابیل، عاشق زار ابابیل!! اس کا طواف کرنے لگی۔ وہ اڑتی سطح
یا کو اپنے پرون سے مس کرتی اور چھوٹی چھوٹی نقرئی لہرین ڈالتی رہتی۔ یہ گویا اس کا اظہار محبت تھا۔ جو گرمیون بھر

اسی طرح جاری رہا۔

یہ دیکھ کر اور ابابیلیں آپس میں کہنے لگیں "یہ عجیب مضحکہ انگیز عشق ہے۔ اس کے پاس دولت بھی نہیں اور رشتہ دار بھی اسکے بہت ہیں" اور واقعی دریا نرسلوں سے بھرا ہوا تھا۔ الغرض جب فصل خزاں آئی تو تمام ابابیلیں چلدیں۔ انکے چلے جانیکے بعد وہ عاشق مزاج ابابیل تنہائی سے بہت گھبرائی اور اپنے محبوب سے بھی اکتا گئی وہ اپنے دل میں کہتی کہ وہ بات چیت تو کرتا ہی نہیں اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ عشوہ باز اور کرشمہ ساز بھی ہے کیونکہ ہمیشہ ہوا سے اسکی چھیڑ چھاڑ جاری ہوتی ہے" یہ واقعہ ہے کہ جب ہوا چلتی تو نئے نہایت خوبصورتی اور لچک کے ساتھ اس کے سامنے جھک جھک جاتا پھر ابابیل کہنے لگی میں جانتی ہوں کہ وہ گھر میں رہنا پسند کرتا ہے اور میں ٹھیری سیر و سیاحت کی دلدادہ اس لئے میرا اُس کا کیا ساتھ۔ بالآخر ایک دن ابابیل نے اپنے محبوب نے سے پوچھا:۔ "کیا تمھارا میرا ساتھ ہو سکتا ہے"

لیکن نے نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ فقط سر ہلا دیا۔ اسے اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ یہ دیکھ کر ابابیل نے کہا:۔

"اچھا تو معلوم ہوا تم اب تک مجھے چکا یوں ہی میں اڑاتے رہے۔ بہتر ہے میں بھی اب اہرام مصری کی طرف چلی"

ابابیل بیچاری دن بھر ماری ماری پھری اور شام کے وقت شہر میں پہونچی۔ رات ہو گئی تھی۔ سوچنے لگی "کہاں ٹھہروں"

اس وقت اس کی نظر شہزادہ خرم کے بت پر پڑی جو بلند مینار پر نصب تھا۔ بت کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگی "بس میں یہیں ٹھہرونگی جگہ بھی اچھی ہے اور تازہ ہوا بھی یہاں کافی ہے" اسلئے اڑکر شہزادہ خرم کے دونوں پاؤں کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

اس نے ادہر اُدہر دیکھا اور دیکھ کر دل میں کہنے لگی "میں بھی کسقدر خوش نصیب ہوں۔ آرام کی جگہ بھی مجھے بالکل زرنگار ملی" اسکے بعد وہ سونے کی تیاری کرنے لگی لیکن جوں ہی وہ اپنا سر پروں میں چھپانے لگی تو اس پر پانی کا ایک بڑا قطرہ ٹپکا۔ وہ گھبرا کر چونک اٹھی اور کہنے لگی "یہ تو عجیب بات ہے۔ آسمان صاف ہے۔ بادل کا پتہ نہیں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ لیکن بارش پھر بھی ہو رہی ہے۔ واقعی شمالی یوروپ کی آب و ہوا نہایت سخت ہے"

اس کے بعد دوسرا قطرہ ٹپکا۔ ابابیل نے کہا:۔

"یہاں سے چلنا چاہئے اور کسی مکان کا اچھا سا روشندان ڈھونڈھنا چاہئے ایسے بت سے کیا فائدہ جو پانی بھی نہ روک سکے"

یہ کہہ کر ابابیل وہاں سے اڑنے کو تیار ہوئی اور جوں ہی وہ اڑنے کے لئے پر تول رہی تھی کہ تیسرا قطرہ ٹپکا۔ اب جو ابابیل نے گھبرا کر اوپر کی طرف سر اٹھایا تو دیکھا کہ شہزادہ خرم کی آنکھیں اشک آلود ہیں اور اسکے سنہرے رخسار پر آنسو کے قطرے بہ رہے ہیں۔ شہزادہ کا چہرہ چاندنی میں اسقدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا کہ اس ابابیل کا دل بھی ہمدردی سے بھر آیا۔ اس نے بت سے دریافت کیا۔

"...... آپ کون ہیں؟

بت:۔ مین شہزادہ خرم ہون

ابابیل:۔ پھر آپ روکیون رہے ہین، آپ نے تو مجھے بالکل تر بتر کردیا"

بت:۔ جب مین زندہ تھا اور میرے پہلو مین انسانی دل تھا، تو مین یہ بھی نہین جانتا تھا کہ آنسو کس چیز کا نام ہے۔ کیونکہ مین قصر "سان شوتی" مین رہا کرتا تھا جہان رنج و غم کا پتہ نہ تھا۔ دن بھر مین باغ کے اندر اپنے احباب کے ساتھ کھیلتا تھا اور رات کو بڑے ایوان مین بزم رقص و سرود برپا کرتا تھا باغ کے گرد بڑی اونچی دیوار تھی، لیکن مجھے کبھی تمنا نہ ہوئی کہ کسی سے دریافت کرون، باہر کیا ہے۔ میرے گرد و پیش ہر چیز دلکش اور خوبصورت تھی میرے مصاحب اور درباری مجھے شہزادہ خرم کہا کرتے تھے۔ اور درحقیقت مین تھا بھی ایسا ہی۔ بشرطیکہ عیش و طرب کے معنی خرمی کے ہون۔ الغرض میری تمام زندگی یون ہی گذری اور اس حال مین مرگیا اب مرنے کے بعد لوگون نے میرا بت یہان اسقدر بلند نصب کردیا کہ مین اپنے شہر کی تمام برائیان اور تمام آلام و مصائب خود اپنی آنکھون سے دیکھتا ہون اور ہرچند میرا دل سیسہ کا بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی آنسو بہائے بغیر نہین رہ سکتا۔

ابابیل:۔ (دل مین) ہائین! کیا یہ بت ٹھوس سونے کا نہین ہے؟

یہ بات ابابیل نے دل مین اسلئے کہی کہ وہ نہایت مہذب اور با اخلاق چڑیا تھی۔ وہ ہرگز پسند نہین کرتی تھی کہ زور سے کہہ کر کسی کی ذاتیات پر حملہ کرے

بت نے نرم لہجہ مین کہا:۔

"یہان سے دور تنگ کوچہ مین ایک گھر ہے، اسکی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور مین ایک عورت کو میز کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا ہون۔ اسکا چہرہ لاغر اور زرد ہے اس کے ہاتھ سوئیون کی نوکین چبھنے سے سرخ اور کھُردرے ہوگئے ہین کیونکہ وہ سلائی کا کام کرتی ہے، اس وقت وہ ملکہ کی ایک جمیل سہیلی کے لئے ساٹن کے گون پر خوبصورت پھول کاڑھ رہی ہے۔ جسے وہ آیندہ بزم رقص مین زیب تن کریگی۔ کمرہ کے ایک گوشہ مین پلنگ پر اس کا چھوٹا سا بچہ بیمار پڑا ہے۔ بچہ بخار مین مبتلا ہے اور سنترون کے لئے ضد کر رہا ہے۔ مان بیچاری کے پاس دریا کے پانی کے سوا کیا دھرا ہے جو اپنے پیارے بچے کو دے اسی لئے بچہ رو رہا ہے۔ ابابیل! اے میری ننھی ابابیل!! کیا تم ایسا نہین کرسکتین کہ میری تلوار کے قبضہ مین، جو لعل جڑا ہوا ہے وہ نکالکر اس غریب عورت کو دے آؤ۔ میرے پاؤن تو اس کرسی مین جڑے ہوئے ہین اور مین حرکت نہین کرسکتا۔

ابابیل۔ میرا تو مصر مین انتظار ہو رہا ہوگا، میرے دوست دریائے نیل کے اوپر خوش خوش اُڑ رہے ہونگے اور کنول کے نیلوفر سے باتین ہو رہی ہونگی وہ رات کو فرعون کے مقبرہ مین جا سوئینگے۔ جو اپنے رنگین اور منقش تابوت مین پڑا سو رہا ہے۔ بادشاہ کی لاش زرد کتان مین ملفوف ہے اور مسالون مین بسی ہوئی پڑی ہے۔ اس کے گلے مین ہلکے سبز رنگ کے بیش قیمت جواہرات کا ہار ہے۔ اور اس کے ہاتھ ایسے خشک ہین جیسے برگہائے خزان دیدہ۔

بُت :- کیا واقعی تم میرے پاس رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی اور میرا یہ کام نہ کرو گی؟ دیکھو پیاس کے مارے بچہ کی زبان منھ سے باہر نکلی پڑتی ہے اور اسکی ماں کسقدر ملول ہے"

ابابیل :- معاف کیجئے مین لڑکون کو ہرگز پسند نہین کرتی پارسال گرمی مین جب مین دریا پر ٹھہری ہوئی تھی تو دو بیہودہ لڑکے جو چکی والے کے لڑکے تھے ہمیشہ میری طرف ڈھیلے اور پتھر پھینکا کرتے تھے۔ کوئی ڈھیلا یا پتھر میرے لگا تو نہین کیونکہ ہم ابابیل بہت تیز پر ہوتے ہین۔ علاوہ ازین مین اس خاندان کی فرد ہون جو اپنی تیز پروازی مین ہمیشہ مشہور رہا ہے، لیکن اس طرح ڈھیلے پھینکنا توہین تو ہے"

یہ سنکر شہزادہ خرم بہت رنجیدہ ہوا۔ اسقدر رنجیدہ کہ ابابیل بھی بہت متاثر ہوئی اور آخر کار اسے کہنا پڑا کہ "اچھا مین ایک رات آپ کے پاس قیام کرونگی"

بت :- شکریہ!

پس ابابیل نے شہزادہ کی تلوار کے قبضہ سے وہ لعل نکالا اور چونچ مین لیکر مکانون کی چھتون پر اڑتا ہوا روانہ ہو گیا۔ وہ گرجا کے مینار کے پاس ہو کر گذرا جہان فرشتون کے مجسمے سفید سنگ مرمر کے رکھے ہوئے تھے وہ قصر شاہی کے پاس ہو کر گذرا اور رقص و سرود کی آوازین سنین۔ ایک جمیل لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ نکلکر بالاخانہ پر آئی۔ اور وہ ستارون بھری رات کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"یہ ستارے کسقدر دلکش ہین۔ اور عشق و محبت کی طاقت بھی کسقدر زبردست ہوتی ہے"

لڑکی :- "امید ہے کہ بزم رقص و سرود منعقد ہونے تک میری پوشاک بھی تیار ہو جائیگی۔ مین نے حکم دیا ہے کہ اس پر خوبصورت پھول کاڑھے جائین لیکن یہ سینے والیان بھی کسقدر کاہل اور سست ہوتی ہین"

ابابیل اڑتی ہوئی دریا پر سے گذری۔ اور جہازون کے مستولون پر لٹکی ہوئی لالٹینین دیکھین۔ وہ یہودیون کے محلہ سے ہو کر گذری۔ اور بڈھے بڈھے یہودیون کو ایک دوسرے سے سودا کرتے اور تانبہ کی ترازوؤن مین روپیہ تولتے دیکھا۔ بالآخر وہ اڑتی اڑتی اس گھر تک پہونچی۔ اور اندر جھانکا۔ لڑکا بخار مین مبتلا چارپائی پر تڑپ رہا تھا۔ اور ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بیچاری کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ابابیل کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور اپنے بازوؤن سے لڑکے کی پیشانی کو ہوا دی۔ اور وہ لعل میز پر انگشتانہ کے قریب رکھ دیا۔ اسکے بعد اس نے پلنگ کے گرد آہستہ آہستہ اڑ کر بچہ کو ہوا دی وہ بولا۔ "اس وقت کیسی خوشگوار خنکی ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری طبیعت اب اچھی ہوتی جاتی ہے" یہ کہا اور لڑکا پھر سو گیا

ابابیل پھر اڑتی ہوئی شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور سارا حال بیان کر کے بولی۔

"یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ سردی پڑ رہی ہے لیکن مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے"

بُت :- اسلئے کہ تم ایک نیک کام کر کے آئی ہو۔

اسکے بعد ابابیل مختلف قسم کے خیالات مین الجھ گئی اور سوچتے سوچتے سوگئی۔ کیونکہ سوچنے اور فکر کرنے سے ہمیشہ نیند آجاتی ہے صبح کو جب دن نکلا تو وہ دریا کی طرف اڑ گئی نہانے لگی۔ اس وقت اتفاق سے خصوصیات طیور کے ایک پروفیسر پل پر سے گذر رہے تھے۔ ان کی نظر جو ابابیل پر پڑی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگے:۔ "ہائین اجاڑ دن مین ابابیل!" اسکے بعد پروفیسر نے ایک بڑا طویل مراسلہ مقامی اخبارون مین شائع کردیا اور ہر اخبار نے اس خط کو شائع کیا

ابابیل نے کہا کہ آج رات کو مین مصر چلی جاؤنگی اور واقعی مصر کے پرلطف مناظر کا خیال کرکے اس وقت وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بعد وہ اڑی اور شہر کے تمام مشہور مقامات کو دوبارہ جاکر دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گرجا کی چوٹی پر بیٹھی رہی جہان جہان ابابیل جاتی اسے دیکھ کر چڑیان چہچہاتین اور آپس مین کہتین "یہ اجنبی کسقدر شاندار اور دلکش چیز ہے"۔ الغرض ابابیل نے خوب سیر کی

جب چاند نکلا تو وہ پھر اڑکر شہزادہ خرم کے پاس گئی اور بولی:۔ "کیا صاحب عالم کا کوئی کام مصر مین بھی ہے کیونکہ اب مین روانہ ہورہی ہون"

بت:۔ "کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہین ٹھہر سکتین"

ابابیل:۔ نہین مصر مین میرا انتظار ہورہا ہوگا۔ کل میرے تمام احباب دوسری آبشار کی طرف چلے جائینگے۔ وہان لمبی لمبی گھانس پانی مین لہرین لیا کرتی ہے اور سنگ خارا کے ایک تخت پر خداوند ممنون (mem non) متمکن ہے رات بھر اسکی آنکھین آسمان کے ستارون کو تکتی رہتی ہین اور جب صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک نعرۂ مسرت لگاتا ہے۔ اور پھر خاموش ہوجاتا ہے۔ دوپہر کو بھورے اور زرد رنگ کے شیر ببر پانی پینے لب جو آتے ہین۔ جن کی آنکھین ہلکے رنگ کے فیروزون کی طرح چمکتی ہین۔ اور جن کی گرج آبشارون کے شور سے زیادہ بلند ہوتی ہے

بت:۔ مین ایک نوجوان کو کوٹھے پر بیٹھا دیکھتا ہون۔ وہ ایک میز پر جھکا ہوا ہے جس پر بہت سے کاغذات رکھے ہوئے ہین۔ اسکے برابر ایک گلاس رکھا ہوا ہے جس مین بنفشہ کے افسردہ پھول ہین۔ اسکے بال بھورے اور سخت ہین اسکے لب انار کی طرح سرخ ہین۔ اسکی آنکھین بڑی بڑی اور خمار آلود ہین۔ وہ چاہتا ہے کہ تھیٹر کے ڈائرکٹر کے لئے ایک ڈرامہ جلد ختم کردے لیکن اسکے ہاتھ جاڑے کی شدت سے اکڑے ہوئے ہین اور وہ لکھ نہین سکتا۔ آتشدان مین آگ نہین ہے اور بھوک کے مارے وہ بیہوش ہوا جاتا ہے"

یہ سنکر ابابیل نے جو بہت نیکدل چڑیا تھی کہا:۔ "اچھا مین آپ کے پاس ایک شب اور قیام کرونگی۔ کیا مین اس نوجوان کے پاس کوئی دوسرا لعل لے جاؤن؟

بت:۔ افسوس ہے کہ اب میرے پاس اور کوئی لعل نہین۔ صرف میری آنکھین باقی رہگئی ہین۔ یہ نہایت نفیس نیلم کی بنی ہوئی ہین جو تقریباً ایک ہزار سال گذرے ہندوستان سے لائے گئے تھے۔ پس تم میری ایک آنکھ نکال لو

اور اس نوجوان کے پاس لے جاؤ۔ وہ یہ نیلم کسی جوہری کے ہاتھ فروخت کر دیگا۔ اور اس کی قیمت سے وہ کھانا اور لکڑی خرید لے گا۔ اور ڈرامہ ختم کر دیگا۔

یہ سنکر ابابیل کی آنکھوں مین آنسو بھر آئے اور وہ رو کر کہنے لگی: "جناب یہ تو مجھ سے نہین ہو سکے گا"

بت:۔ "کوئی حرج نہین، تم وہی کرو جو مین کہتا ہون"

مجبور ہو کر ابابیل نے شہزادہ کی ایک آنکھ سے نیلم نکالا اور اسے لیکر نوجوان کے مکان کی طرف اڑ گئی۔ چونکہ چھت مین ایک سوراخ تھا اسلئے اندر داخل ہونا بہت آسان تھا۔ نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا اسلئے وہ ابابیل کے پرون کی آواز نہ سن سکا۔ اور جب اس نے نگاہ اُٹھا کر اوپر دیکھا تو اُسنے کھلائے ہوئے گلدستہ مین ایک خوبصورت اور آبدار نیلم دیکھا دیکھتے ہی خوش ہو گیا اور دل مین کہنے لگا۔ "شاید کسی عظیم الشان ہستی نے میری کوششون کو بنظر استحسان دیکھا ہے اور یہ تحفہ بھی اسی نے بھیجا ہے۔ بس اب مین اپنا کھیل ختم کر سکونگا"

دوسرے روز ابابیل اڑ کر بندرگاہ کی طرف گئی اور ایک بڑے جہاز کے مستول پر بیٹھی اور ملاحون کو دیکھنے لگی جو نیچے کے گودام سے رسون مین باندھ کر بڑے بڑے وزنی صندوق نکال رہے تھے۔ جب کوئی صندوق اوپر آجاتا تھا تو وہ نعرہ لگاتے تھے "شاباش میرے بھائی"۔ یہ سنکر ابابیل کو بھی کچھ امنگ سی آئی اور چلا کر کہنے لگی "مین بھی اب مصر کو چلی" الغرض شام کو جب چاند نکلا تو وہ اڑ کر پھر شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور بولی

"...... اب مین جناب سے رخصت ہونے آئی ہون"

بت:۔ کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہ ٹھہرو گی؟

ابابیل:۔ اب جاڑون کا زمانہ ہے اور یہان بہت جلد برف پڑنے لگے گی۔ لیکن مصر مین ابھی ہرے ہرے نخلستانون پر آفتاب چمک رہا ہے، دریا سے نہنگ نکل کر ساحل کی ریت پر لوٹتے ہین اور مضمحل نگاہون سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہین۔ میرے ساتھی بعل کے مندر مین آشیانہ بنا رہے ہین۔ سفید قمریان اور گلابی فاختہ ان ابابیلون کو دیکھ کر کوکو کر رہی ہین اب مجھے آپ رخصت کیجئے۔ مین آپ کی یاد ہمیشہ دل مین رکھونگی اور آیندہ فصل بہار مین ان جواہرات کے بجائے جو آپ کی دریا دلی نے لوگون کو عطا فرما دیئے ہین۔ مین آپ کے لئے دو بہت خوبصورت اور نفیس جواہر لاؤن گی۔ میرا لعل رنگ اور آب و تاب مین سرخ گلاب سے بھی زیادہ بہتر اور میرا نیلم سمندر کے نیلگون پانی سے بھی زیادہ خوش آب ہوگا

بت:۔ نیچے دیکھو چوک مین ایک چھوٹی سی دیا سلائی فروش لڑکی کھڑی ہے۔ اس نے نابدان مین ڈالکر اپنی تمام دیا سلائیان خراب کر دی ہین۔ اب وہ کھڑی رو رہی ہے کیونکہ اگر وہ دیا سلائی بیچکر گھر پیسے نہ لیگئی تو اسکا باپ اسے بہت ماریگا۔ اس لڑکی کے پاؤن مین نہ جوتیان ہین نہ موزے۔ اوس کا ننھا سا سر بھی ننگا ہے۔ اب تم میری دوسری آنکھ بھی نکال لو اور لیجا کر اس لڑکی کو دے آؤ۔ تاکہ یہ مصیبت سے بچ جائے

ابابیل:- میں آپ کے پاس ایک رات اور ٹھہر سکتی ہوں۔ لیکن آنکھ نہیں نکال سکتی۔ کیونکہ آپ جب دونوں آنکھوں سے محروم ہو جائنگے تو کیا کرینگے۔"

بت:- "نہیں جو میں حکم دیتا ہوں وہی کرو"

ابابیل نے شہزادہ کی دوسری آنکھ بھی نکال لی۔ اور لیکر نیچے کی طرف اڑی وہ اس لڑکی کے پاس سے منڈلاتی ہوئی گذری اور اس کی ہتیلی پر وہ نیلم آہستہ سے رکھدیا۔ نیلم کو دیکھ کر لڑکی خوش ہوگئی اور کہنے لگی:- "کیا پیارا شیشے کا ٹکڑا ہے" وہ ہنستی ہوئی نیلم لیکر گھر کی طرف دوڑ گئی۔ اسکے بعد۔ ابابیل پھر شہزادہ کے پاس آیا اور بولا۔

......."چونکہ آپ کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے اسلئے میں ہمیشہ آپ ہی کی خدمت میں رہا کرونگی

بت:- نہیں میری پیاری ابابیل! اب تم مصر کی طرف جاؤ"

ابابیل:- نہیں اب تو میں یہیں رہونگی"

اسکے بعد ابابیل پروں میں سر چھپا کر شہزادہ کے پیروں کے درمیان سو گئی۔ وہ دوسرے روز بھی تمام دن شہزادہ کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ اور ممالک غیر میں جو جو باتیں اس نے دیکھی تھیں ان کا حال بیان کرتی رہی اس نے مصر کی ان سرخ رنگ مقدس چڑیوں کا حال بیان کیا جو دریائے نیل کے کنارے لمبی لمبی قطاریں باندھے بیٹھی رہتی ہیں اور اپنی چونچ سے سنہری مچھلیاں پکڑتی ہیں۔ اس نے ابوالہول کا ذکر کیا جو اتنا ہی قدیم ہے جتنی دنیا۔ جو ریگستان میں رہتا ہے اور ہر چیز کا حال جانتا ہے۔ اس نے ان تاجروں کا حال بیان کیا جو قافلہ میں آہستہ آہستہ اونٹوں کے ساتھ چلتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں کہربا کی تسبیحیں ہوتی ہیں۔ اس نے جبال القمر کے بادشاہ کا قصہ سنایا جو آبنوس کی طرح سیاہ ہے اور ایک بڑے بلور کی پوجا کرتا ہے۔ اس نے اس بڑے سبز رنگ سانپ کا حال سنایا۔ جو ایک کھجور کے درخت میں رہتا ہے۔ اور بیس بچاری اسے دودھ پلاتے ہیں۔ اس نے ان بالشتیوں کا حال سنایا جو ایک "جھیل میں" بڑے پتوں کی کشتیاں چلاتے ہیں اور تیتریوں کے ساتھ ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔

بت:- اے ابابیل! تم نے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں لیکن ان سب سے زیادہ حیرت انگیز انسان کے آلام و مصائب ہیں۔ دنیا کا کوئی راز اسقدر زبردست نہیں جتنا رنج و ملال اب تم میرے شہر کی فضا میں پرواز کرو اور جو کچھ تم دیکھو اسے بیان کرو

پس وہ ابابیل اس عظیم الشان شہر کی فضا میں اڑا۔ اور امیروں کو دیکھا کہ اپنے خوبصورت محلوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور غربا دروازوں پر بیٹھے ہیں وہ تنگ و تاریک کوچوں میں گیا اور زرد رو بچوں کو دیکھا جو فاقے کر رہے ہیں اس نے ایک پل کے درمیں محراب کے نیچے دو چھوٹے لڑکوں کو دیکھا جو ایک دوسرے سے لپٹے پڑے ہوئے ہیں تاکہ اسی طرح وہ کسی قدر گرم ہو جائیں اور سردی سے محفوظ رہیں، لیکن ایک چوکیدار آتا ہے اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے کہ "خبردار یہاں نہ لیٹنا"

اور وہ دو نون بیچارے پل کے نیچے سے بارش مین نکل جاتے ہین۔ یہ تمام باتین دیکھ کر وہ ابابیل اڑتی ہوئی پھر شہزادہ کے پاس واپس آئی اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

بت :۔ دیکھو مجھ پر زر خالص کے پتر چڑھے ہین۔ تم انھین نوچ نوچ کر لے جاؤ اور غربا و مساکین کو دو۔

الغرض ابابیل نے سونے کے تمام پتر نوچ لئے حتی کہ شہزادہ خرم بالکل بھدا اور سیسہ کے رنگ کا دکھائی دینے لگا یکے بعد دیگرے وہ سونے کے تمام پتر غربا و مساکین کو لاکر دیدیئے گئے۔ اب بچون کے چہرے سرخ و سفید نظر آنے لگے۔ وہ آپس مین ہنستے اور گلیون مین کھیلتے پھرتے تھے۔ اور با آواز بلند کہتے تھے کہ ہان اب ہم کو روٹی ملتی ہے

اسکے بعد برف پڑنے لگی اور برف کے بعد پالا پڑنا شروع ہوا۔ سڑکین ایسی معلوم ہوتی تھین گویا چاندی کی بنی ہوئی ہین برف کی لمبی لمبی قلمین مکانات کی اولتیون پر ایسی لٹکتی تھین گویا بلوری خنجر لٹک رہے ہین۔ جو شخص باہر نکلتا تھا سمور پہنکر نکلتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے سرخ بانات کی ٹوپیان پہنے برف پر پھسل پھسل کر کھیلتے تھے،

غریب ابابیل روز بروز ٹھٹھری جاتی تھی۔ لیکن فرط محبت سے شہزادہ کو نہین چھوڑتی تھی۔ وہ نانبائی کی دکان کے سامنے سے اسکی غیر حاضری مین روٹی کے ریزے چن چنکر کھاتی اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لئے پر پھٹ پھٹاتی۔ آخر کار اسے محسوس ہونے لگا کہ موت کے دن قریب آ گئے ہین اب اس مین اتنی طاقت بھی نہین تھی کہ وہ اڑ کر پھر شہزادہ کے شانہ پر آ کر بیٹھ جاتی۔ اُس نے کہا کہ "صاحب عالم! خدا حافظ! کیا آپ مجھے اپنا ہات چومنے کی اجازت دینگے"

بت :۔ مین خوش ہون کہ اب آخر کار تم مصر جارہی ہو۔ تم یہان بہت زیادہ عرصہ تک ٹھہری رہین لیکن چونکہ مین تم سے محبت کرتا ہون اسلئے ہاتھون کے بجائے تم میرے لب کو بوسہ دو

ابابیل :۔ نہین مین مصر نہین جارہی ہون بلکہ دنیا سے جارہی ہون"

یہ کہہ کر ابابیل نے شہزادہ کے لبون پر بوسہ دیا۔ اور مر کر اسکے قدمون مین گر پڑی

عین اُسی وقت کسی چیز کے شق ہونے کی عجیب آواز بت کے اندر سے آئی۔ گویا کوئی چیز ٹوٹی ہے شہزادہ کا دل جو سیسہ کا بنا ہوا تھا پھٹکر بالکل دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پالا نہایت سخت پڑ رہا تھا۔

دوسرے روز صبح کو امیر بلدیہ مع اپنے ارکان کے نیچے چوک مین پھر رہا تھا۔ جس وقت یہ لوگ مینار کے پاس سے گذرے تو انھون نے بت کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی امیر بلدہ بولا۔ "یہ شہزادہ کا بت کسقدر بھدا نظر آتا ہے"

"بیشک بھدا ہو گیا ہے" ارکان بلدیہ نے ہان مین ہان ملائی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ "ہان مین ہان" ملانے کے اصول پر عمل کرتے تھے اور امیر بلدہ کے خلاف کچھ نہین کہتے تھے۔

امیر بلدہ :۔ تلوار کے قبضہ سے لعل گر چکا ہے۔ آنکھون سے نیلم نکلکر گر پڑے ہین۔ اور سونے کے پتر بھی نہین ہے اب تو شہزادہ فقیر سا نظر آتا ہے۔

ارکان بلدیہ :- درست فرمایا۔ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا ہے

امیر بلدہ :- اور یہ تو دیکھئے شہزادہ کے قدمون مین ایک چڑیا پڑی ہے۔ اب واقعی ایک فرمان جاری کرنا پڑیگا کہ آیندہ کسی پرند کو یہان آکر مرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

منشی نے فوراً امیر بلدہ کی بات نوٹ کرلی۔ پس ان لوگون نے شہزادہ کے مجسمہ کو توڑ ڈالا۔ اور یونیورسٹی کے ماہرین فنون لطیفہ نے تو یہانتک کہدیا کہ :- "چونکہ یہ بت خوبصورت نہین رہا لہذا مفید بھی نہین رہا"

شہزادہ کا بت ایک بھٹی مین پگھلایا گیا۔ اور امیر بلدہ نے ارکان بلدیہ کا ایک ضروری جلسہ طلب کیا تاکہ یہ فیصلہ لیا جائے کہ بت کی دہات کس کام مین لائی جائے۔ خود امیر بلدہ نے فرمایا کہ "یقیناً ہمین ایک دوسرا بُت بنوانا پڑیگا۔ اور وہ بُت میرا ہوگا" اس پر ہر رُکن نے "میرا۔ میرا۔ میرا" کا راگ الاپنا شروع کردیا۔ اور آپس مین خوب جنگ ہوئی

کارخانہ فلزات کے مہتمم نے کاریگرون سے کہا :- "یہ عجیب بات ہے کہ اس بُت کا دل بھٹی مین پگھلتا ہی نہین پھر کیا کیا جائے۔ اچھا اسے پھینکدو"

الغرض انھون نے شہزادہ کے دل کو مزبلہ پر پھینکدیا جہان ابابیل کی لاش پہلے سے پڑی ہوئی تھی

خدا نے اپنے فرشتون مین سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ اس شہر مین جو سب سے بیش قیمت دو چیزین ہون وہ میرے پاس لاؤ۔ فرشتہ آیا اور "سیسہ کا دل اور ابابیل کی لاش" اٹھائے گیا۔ خدا نے فرمایا :-

"بیشک تم نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ میری فردوس مین یہ پرندہ ہمیشہ چہچہاتا رہیگا۔ اور میرے شہر زرنگار مین شہزادہ خرم ہمیشہ میری حمد و ثنا مین مصروف رہے گا۔ (آسکر وائلڈ)

مادّہ کی رسائی خدا تک

انسانی قواء کی غیر محدود وسعت

گو جسم انسانی محدود ہے لیکن اس کی قوتیں نا محدود ہیں یعنی انسان میں جتنی قوتیں فطرت نے عطا کی ہیں وہ غیر محدود طور پر وسیع ہو سکتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ معمولاً انسان میں یہ قوتیں محدود صورتوں میں پائی جاتی ہیں لیکن یہ حد بندی صرف اسلئے قائم کی گئی ہے کہ انسان ان قوتوں کو خود ترقی دے اور اس طرح وہ خدا سے متحد ہو جائے۔ یہی انسانی زندگی کا مقصود ہے اور یہی ہمارا راز حیات ہے۔ ـــــ جس کے معلوم کرنے کے لئے عبادات سے بطور آلہ و ذریعہ کام لیا جاتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ ترقی کیونکر حاصل ہو؟ کیا صرف تزکیۂ روحانی اسکا واحد ذریعہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ درست نہیں ہے اور ہزارہا سال تک دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی ہے کہ محض روحانی ترقی سے خدا مل سکتا ہے یورپ مادی ترقی میں ہمہ تن منہمک ہے لیکن اوسنے اسی ترقی ہی کو اصل مقصود قرار دے رکھا ہے، مادی ترقی ہو خواہ روحانی، یہ دونوں کسی مخصوص مقصود کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں، اگر کوئی شخص خود ان ذرائع کو مقصود بنالے تو یہ اوسکی غلطی ہوگی۔ میں یہ نظریہ پیش کرتا ہوں کہ

"مادی ترقی سے بھی خدا مل سکتا ہے"

میں کسی مافوق الفطرت فعل کا سرزد ہونا پیغمبری یا کرامت کی تنہا دلیل نہیں سمجھتا۔ شیر پر سوار ہو کر سانپ کا کوڑا ہاتھ میں لیکر چلنا کبھی تقدس روحانی کی علامت نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان میں معجزہ وکرامت کو اہل تصوف نے مخصوص نسوانی مرض سے موسوم کیا ہے۔ معجزہ وکرامت تو صرف وہ ارادی یا غیر ارادی فعل ہے جو عام انسانی قوت سے بالاتر سمجھا جائے اور جو تقدس کی ادنی دلیل ہے اور جو صرف منکرین کو قایل کرنے کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ میں ہرگز اسلئے مسلمان نہیں ہوں کہ رسول عربی نے چاند کے دو ٹکڑے کردیئے تھے یا جسمانی معراج حاصل کی تھی۔ میں اونپر صرف اسلئے ایمان لایا ہوں کہ اونکی زندگی ایسی عملی مثال پیش کرتی ہے جو ہماری زندگی کی تمام راہوں میں مشعل کا کام دے سکتی ہے

بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ معجزہ صاحب معجزہ کی ذات سے متعلق نہیں ہوتا۔ موسی اور جادوگروں کی جنگ یہ بتا رہی ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ نے اوسوقت ایسی فضاء قائم کردی تھی کہ جو بھی اپنا عصا زمین پر پھینکتا وہی سانپ ہوجاتا۔ اسکے علاوہ معجزہ وقتی حیثیت رکھتا ہے، جسوقت وہ سرزد ہوتا ہے اوسوقت وہ اعلی انسانی قوت کی دلیل ہوتا ہے، لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ مافوق الفطرت رہے آگے آنے والے نقشہ سے آپ پر شاید یہ واضح ہوجائے کہ جو

واقعات ایک زمانہ میں پیغمبرون سے سرزد ہوکر معجزہ کہلائے ہین وہ آج مادی ترقی سے بھی ممکن ہین۔

پیغمبر کی اعلی روحانیت مافوق الفطرت واقعات کی معین ہوتی ہے اور آج ایک عامل کی اعلی مشق سے بھی وہی واقعات سرزد ہوتے ہین۔

اب رہا یہ سوال (جو میرا نفس مبحث ہے) کہ کیا مادی وروحانی دونون ترقیان دو مختلف ذرائع ہین۔ایک ہی مقصد کے حصول کے! سو یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے اور غور وخوض کا محتاج ہے۔

بقول سر آرتھر کینین ڈائل " سائینس وحکمت کی گوناگون ترقیان خدا کی قدرت کاملہ اور اوسکے وجود سے انکار کا باعث نہین ہین بلکہ اون سے اوسکی قدرت کاملہ بدرجۂ اتم ظاہر ہوتی ہے"۔ موجودہ مادی ترقیان بجائے اسکے کہ ہماری عقیدتمندیون کو خدا کی طرف سے منحرف کرین اور بھی راسخ کرتی جاتی ہین " ڈاکٹر میکائل پوپن" پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کا خیال ہے کہ " ہماری مادی ترقیان خدا کو ہمسے قریب کررہی ہین"۔ مسٹر چارلس ہنری پروفیسر سار باتی یونیورسٹی نے انسانی روح کی قدامت کو علم ہندسہ سے ثابت کیا ہے جیساکہ بقول بعض حضرات کے خدا کی وحدانیت اقلیدس کی ساتوین شکل سے ثابت ہو سکتی ہے۔تجربہ نے ثابت کردیا ہے کہ ہم مرنے والون کی روحون سے گفتگو کرسکتے ہین۔ڈاکٹر لیوناب ڈر سنا ... پروفیسر واشنگٹن یونیورسٹی نے غدود کی تبدیلی سے جو نتائج اخذ کئے ہین اوس سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی زندگی مادی ذرائع سے وسیع ہوسکتی ہے

مغربی اطبا کا ایک مخصوص گروہ مادۂ تولید کی تحلیل مین مصروف ہے۔مصنوعی مادہ سے چوپایون پر جو تجربہ کیا گیا ہے وہ نہایت امید افزا ہے کیا یہ ترقیان انسان کی عظمت پر دال نہین ہین؟

اس مین شبہ نہین کہ مادیت کا ایک پہلو کسی قدر تاریک ہے۔لیکن اول تو یہ مادیت کا لازمی نتیجہ نہین ہے۔دوسرے یہ کہ جو لوگ واقعی مادی ترقی مین مصروف ہین۔اونکی زندگی کا اخلاقی پہلو کم تاریک ہوتا ہے۔اسکے علاوہ صحیح مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اعداد وشمار بتارہے ہین کہ بد اخلاقی مین نمایان کمی ہے۔آج مغرب کے وہ مخصوص افراد جو علوم وفنون کی تحقیق ودریافت مین مصروف ہین۔اونکی زندگی کا اخلاقی پہلو نہایت پاک وصاف ہے

اسوقت مادی ترقیاں دو حصون مین تقسیم کی جاسکتی ہین۔ایک وہ جو ظاہری ذرائع مثلاً علم کیمیا وعلم البرق وغیرہ سے تعلق ہین۔یہ قطعی مادی ہین۔لیکن دوسری ترقی انسانی حسیات کی ہے۔جسے قطعی طور پر تو مادی نہین کہا جاسکتا لیکن چونکہ ان ترقیون کے ذرائع مادی ہین اسلئے اونکو بھی مادی کہنا پڑتا ہے۔میرے خیال مین اول الذکر سے زیادہ موخر الذکر کی ترقی ہمکو خدا سے قریب تر کررہی ہے۔

اسوقت تک مشرقی ومغربی علما کا اسپر اتفاق تھا کہ انسان کے حواس ظاہری پانچ ہین۔اور ہر حس کے مختلف ذرائع خدا نے قائم کر رکھے ہین،ہاتھ چھونے کے لئے،زبان مزے کے لئے،ناک سونگھنے کیلئے،آنکھ دیکھنے کے لئے اور کان سننے کیواسطے

لیکن موجودہ تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان پانچ کے علاوہ ایک چھٹی حس اور بھی ہے اور اس کا تعلق دماغ سے ہے اسکے ذریعہ سے ایک انسان اپنے خیالات کو دوسرے انسان تک پہونچا سکتا ہے

ابتک انسان نے اپنے ان حواس کا صحیح استعمال کامل طور پر دریافت نہین کیا ہے تجربات یہ بتا رہے ہین کہ اگر ان حواس کو معقول وسعت نصیب ہوئی تو نہ صرف انسان اپنی تکمیل کی جانب سرعت سے گامزن ہو جائیگا بلکہ دیگر تمامی علوم ظاہری کی ضرورت باقی نہ رہے گی - مسٹر ہلڈین (Haldane) پروفیسر اکسفورڈ یونیورسٹی کا خیال ہے کہ تمام ظاہری علوم کا اختراع و ایجاد کا سبب محض ہماری قوائے حسیہ سے ناواقفیت ہے

قوی احسیہ اور ان کے میدان عمل کی وسعت

حواس کی ترقی کے صحیح واقعات پر غور کرنے سے میرے ان خیالات کی کماحقہ تائید ہوتی ہے - اول تو آپ یہ ملاحظہ فرمائینگے کہ ایک معمولی شخص سے مشق کے بعد وہ واقعات و حرکات رونما ہوتے ہین جو کسی زمانہ مین معجزہ و کرامت سمجھے جاتے تھے - دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ گو یہ ذرائع اک گونہ مادی ہین لیکن ان کے ذریعہ سے انسان روز بروز صفات خداوندی سے زیادہ متصف ہو کر اوس سے قریب تر ہوتا جاتا ہے کیونکہ قربت الٰہی کے کوئی معنے سوائے اس کے نہین کہ اس کے صفات مین اشتراک پیدا ہو جائے خواہ وہ کیسا ہی کمزور کیون نہ ہو - پھر جسوقت انسان تمام صفات عالیہ سے متصف ہو جائیگا اوس وقت وہ ذات خداوندی سے قریب تر ہو جائے گا -

قوت شامہ

قوت شامہ کو اگر ترقی دیجائے تو اکثر وہ کام جو آنکھ، ہاتھ اور زبان سے ہو سکتے ہین. وہ صرف سونگھ کر پورے ہو سکتے ہین میرا عینی مشاہدہ ہے کہ جونپور مین ایک شخص نابینا حافظ منگلی نامی تھے یہ بزرگ محض سونگھ کر کپڑون کا رنگ بتا دیتے تھے

یہ دوسرا واقعہ میرا دیکھا ہوا نہین ہے لیکن ایک ثقہ شخص نے مجھے بتایا کہ وہ ناک سے کام لیکر یہ بھی بتا دیتے تھے کہ قرآن کا کونسا پارہ ہے - میرے خیال مین حضرت یعقوب کو یہ قوت بدرجۂ اتم حاصل تھی - بعض کا خیال ہے کہ قوت بینائی کے زوال کے بعد قوت شامہ ترقی کر جاتی ہے، میری رائے مین یہ تجھس نا مناسب ہے، یہ ضرور ہے کہ کسی ایک قوت کے کمزور پڑ جانے کے بعد دوسری قوت ترقی کر جاتی ہے، لیکن قوت شامہ کی ترقی کے لئے اندھا ہونا ضروری نہین - اگر قوت شامہ کو ترقی دیجائے تو مجھے یقین ہے کہ جرائم کی تحقیقات مین بہت سی سہولتین پیدا ہو جائینگی - چوپایون مین قوت شامہ بیحد قوی ہوتی ہے - روس مین کتے مقتول کا خون سونگھ کر قاتل کا پتہ لگا لیتے ہین - گھوڑون مین بھی یہ حس بہت قوی ہوتی ہے جین لوگون کو شکار سے دلچسپی ہے اونکو معلوم ہوگا کہ درندون کی موجودگی کا علم شکاری سے پہلے گھوڑون کو ہو جاتا ہے - محققین کا خیال ہے کہ چوپایون مین بلی اور پتنگون مین شہد کی مکھی کی قوت شامہ بیحد قوی ہوتی ہے پروفیسر مرے نے (جو خیالی تموج" کے بہت بڑے ناشر ہین) دوران تجربہ مین دو بار قوت شامہ

مدد سے بعض واقعات بتا دیئے۔

قوت لامسہ

گو ابتک مغربی محققین نے اس مخصوص قوت کی جانب سے بے اعتنائی برتی ہے، لیکن پھر بھی جو ترقی ابتک ہوئی ہے وہ قابل تحسین ہے جن حافظ منگلی کا ذکر مین کر چکا ہون وہ کپڑون کو چھوکر اونکا رنگ بتا دیا کرتے تھے۔ نابینائی تعلیم کے لئے مغرب مین جو مدارس قائم کئے گئے ہین اون مین اس جانب خاص توجہ کیجاتی ہے۔ گو ابھی ابتدائی حالت ہے لیکن اب بھی لڑکے کاغذ کو چھوکر اوسکا رنگ بتا دیتے ہین۔ ابھی تک تو کتابین ابھرے ہوے حروف سے لکھی جاتی ہین، جنکو لڑکے آسانی سے پڑھ لیتے ہین، لیکن برلن کے مدرسہ کے مدرس اعلی مسٹر کلرٹ کا خیال ہے کہ "چند دنون کے بعد اس مخصوص طرز کتابت کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور وہی کتابین جو آنکھ والے پڑھتے ہین اندھون کے لئے بھی کافی ہونگی کیونکہ اوسوقت تک اونکی قوت لامسہ کو قوی بنانے کی کوشش کامیاب ہو جائیگی۔ ابھی چند دنون کی بات ہے کہ ایک شخص مسٹر ڈیوک نامی ہندوستان مین دورہ کر رہے تھے۔ وہ لکھنؤ مین بھی آئے تھے ہزار اہلِ آدمیون کے ساتھ اونھون نے اپنی قوت لامسہ کے کرشمے دکھائے اونکے آنکھون پر پٹیان باندھ دیگئی تھین اور اسکا بخوبی اطمینان کرلیا گیا تھا کہ وہ دیکھتے نہین۔ اسحالت مین جو تحریر اونکے سامنے رکھدی گئی اوسے چھوکر انھون نے اسی طرح تیزی کے ساتھ پڑھا جس طرح ہم آپ دیکھکر پڑھتے ہین۔ انگلستان کے بعض محققین اس قوت کو (TELEPATLY) کے نام سے موسوم کرتے ہین۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان کی وسط پیشانی سے ایک شعاع نکلتی ہے جسے اگر ترقی دیجائے تو وہ لبصارت کا کام دیتی ہے۔ کہین خود عامل موصوف نے ایک اخبار کے نمایندہ سے دوران ملاقات مین بتایا کہ یہ قوت لامسہ کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ یورپین محققین کی رائے اسلئے اور بھی قابل قبول نہین معلوم ہوتی کہ دونون صورتون مین لمس کی ضرورت نہین ہے مگر ڈیوک موصوف بغیر انگلیون کی مدد کے کبھی نہین پڑھ سکتے تھے۔

قوت ذائقہ

یہ انسان کی کثیف ترین قوت ہے۔ لیکن اگر اسے ترقی دیجائے تو اسکے لئے بھی میدان عمل بیحد وسیع ہے میرا خیال ہے کہ یہ قوت قوت لامسہ سے بہت کچھ ملتی ہے اسلئے کہ ان دونون قوتون کا استعمال اعضاء جسمانی کے لگاؤ سے ہوتا ہے۔ آپکو متعدد ایسے لوگ معلوم ہونگے جو زبان سے چکھ کر کپڑون کا رنگ بتا دیتے ہین گو اونکی آنکھیں بند ہوتی ہین۔ مین نے ایک شخص کے متعلق سنا ہے (گو مجھے ذاتی واقفیت نہین) کہ وہ بغیر چھوئے صرف زبان کے مس سے یہ بتا دیا کرتے تھے کہ کون ہاتھ کس کا ہے۔

قوت باصرہ

حضرت عمر کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے ایک بار خطبۂ جمعہ کے دوران مین حضرت ابو عبیدہ کو جو صدہا میل کے فاصلہ پر تھے غنیم کے خفیہ حملون سے متنبہ کیا یہ روحانی قوت کا کرشمہ ہے جسے کل تک ہم کرامت کہتے تھے لیکن آج تجربہ نے بتا دیا کہ یہ معمولی فعل ہے جو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص کر سکتا ہے۔

ابھی کل کا واقعہ ہے کہ گسٹن اورین (Gaston Aurien) نامی ایک شخص نے لندن مین اپنی مشق کے کرشمے

دکھائے۔اوسکی آنکھون پر پہلے تو کاغذ چپکا دیا، اوسکے بعد ایک سیاہ پٹی باندھ دیگئی اور اس امر کا کافی اطمینان کر لیا گیا کہ حاضرین مین سے کوئی شخص اوسکا شریک کار نہین ہے۔ اسکے بعد گشتین نے تماشے شروع کئے پہلے تو جو عبارت اُسکے سامنے لکھکر رکھدی گئی اوسنے اوسے پڑھ دیا۔ اوسکے بعد مختلف رنگ کے پھولون مین سے ہر رنگ کے پھول علیحدہ کر دیئے اور بتا دیا کہ کون پھول کس رنگ کا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز تماشا یہ تھا کہ اوسنے اپنی آنکھون پر پٹی باندھکر نہایت تیزی سے موٹر چلائی اور گو اوسکی آنکھین بند تھین لیکن وہ پولس کانسٹبل کی تمامی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ اوسکا بیان ہے کہ خواہ اوسکی آنکھ بند رہے یا کھلی رہے اوسکے لئے دونون یکسان ہین۔

پروفیسر مرے (Mr. Murray) کا خیال ہے کہ کسی قسم کا فاصلہ یا پردہ اس قوت کے استعمال کے لئے مانع نہین ہے۔ اطالیہ کے ایک حکیم نے ایک آلہ کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کی آنکھون سے ایک مخصوص قسم کی شعاع نکلتی ہے اور یہ شعاع خیالات وجذبات کی ہے۔

قوت سامعہ | پروفیسر فرڈیننڈ (Ferdinand) معلم فلسفہ میلان یونیورسٹی (اطالیہ) نے متعدد تجربات کے بعد یہ بیان دیا ہے کہ وہ نہ صرف دور کی آواز سن سکتا ہے بلکہ خیالات کو بھی سن سکتا ہے لاسلکی کی موجودہ ترقیان اس دعوی کا کافی ثبوت ہین۔

حکیم بوعلی سینا نے صدہا سال قبل یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ آواز سے مریض کا مرض معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اوسکے ایک شاگرد نے اسکی کافی مشق بہم پہونچائی۔ اوسنے ایک بند کمرہ بنایا اور اوس مین ایک چھوٹا سوراخ رکھا مریض کو حکم تھا کہ وہ اس سوراخ سے صرف اپنا نام بتائے اور وہ نسخہ لکھکر پھینکدیا کرتا

فرڈیننڈ مذکور کا حسب ذیل تجربہ قابل غور ہے۔ اوسنے اپنے معمول کو پہلے تو ایک ایسے بکس مین بند کیا کہ لاسلکی کی موجون سے اوسکا دماغ محفوظ رہے، اوسکے بعد اوسنے معمول کے سر کے قریب ایک خود ساختہ آلہ رکھا اور اس آلہ سے اوسنے ایک لاسلکی ٹیلیفون کا تار نکالکر اپنے کانون مین لگایا۔ اسکے نتائج تعجب خیز تھے۔ الفاظ تو خیر نہین سنائی دیئے (اسلئے کہ کوئی گفتگو تو کرتا نہ تھا) مگر معمول کے دماغی حرکات کی سریلی باریک آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ پروفیسر موصوف کا یقین ہے کہ دماغ انسانی ایک برقی آلہ ہے اور اوسکے حرکات برقی مقناطیسی شعاعین ڈالتے ہین۔ آیندہ تجربات یہ بتائینگے کہ ان حرکات کی شعاعین فاصلہ پر کیون کر منتقل کیجا سکتی ہین

ڈاکٹر فرینک کیننگ ہیڈاک (Frank Channing Haddock) نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "قوت ارادی" مین تمام قوا انسانی کو ترقی دینے کی مشقین لکھی ہین۔ قوت سامعہ کی ترقی دینے کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

"ہمارے اردگرد ہزارہا آوازین پیدا ہوتی رہتی ہین۔ ان آوازون کا تصادم کمزور آواز کو دباکر قوی آواز کو ہمارے کانون تک پہونچاتا ہے شاید یہ بات آپکے تجربہ مین آئی ہو کہ اکثر شور وغل مین آپ کسی باریک آواز کو

نہیں سن سکتے لیکن جب دوسری آوازوں کی طرف سے غیر متوجہ ہوکر کسی مخصوص باریک آواز کو سننا چاہتے ہیں تو وہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس طرح کسی آواز کو سننے کے لئے آپکو دو باتیں کرنی ہوتی ہیں۔

(۱) مخصوص آواز کی جانب ہمہ تن توجہ (۲) دوسری آوازوں کی جانب عدم توجہ۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اگر قوت ارادی سے کام لیکر ان دونوں باتوں کی مشق کی جائے تو انسان کوسوں کی آواز سن سکتا ہے۔

آوازمیں لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ لہریں ہر سمت دوڑتی ہیں، اگر کوئی دوسری آواز انسے متصادم نہو تو یہ ہزارہا کوس تک جا سکتی ہیں"

ڈاکٹر موصوف نے اس کی چھ مشقیں بتائی ہیں جنکا بالاختصار ذکر خالی از فائدہ نہوگا۔ ہر مشق دس روز تک کم سے کم کرتی چاہیے، گھڑی کی آواز بہترین آواز مشق کے لئے ہے

"(مشق نمبر ۱) سب سے پہلے یہ غور کیجئے کہ آپکے کانوں تک کتنی آوازیں پہونچ رہی ہیں۔ اون کو شمار کیجئے۔ سلئے اور ہر آواز میں امتیاز پیدا کیجئے پھر یہ دیکھئے کہ اون آوازوں کا رخ کس جانب ہے، اونکے اسباب کیا ہیں ان کے لہجے کیسے ہیں اونکی طاقت میں کیا فرق ہے، یہ سب معلوم کرنے کے بعد اونکو مختلف نوعیتوں میں تقسیم کیجئے۔

(مشق نمبر ۲) مختلف آوازوں میں کسی ایک آواز کو منتخب کر لیجئے اور اوسکے ہر زیر و بم پر غور کیجئے۔

(مشق نمبر ۳) ہر آواز میں مختلف و متعدد چھوٹی چھوٹی آوازیں شامل ہوتی ہیں۔ منتخب شدہ آواز میں سے باریک ترین آواز کو علیحدہ کیجئے ایسا کرنے میں ایسی باریک آواز کا انتخاب بہتر ہوتا ہے جو دوسری آوازوں سے ممتاز ہو۔

(مشق نمبر ۴) منتخب شدہ باریک آواز پر غور کیجئے اور دوسری آوازوں کو نظر انداز کیجئے۔

(مشق نمبر ۵) اس باریک آواز میں ایک نغمہ ہوگا۔ اس نغمہ کے ساتھ دلچسپی پیدا کیجئے اور لطف سے سنئے

(مشق نمبر ۶) رفتہ رفتہ فاصلہ کو بعید کرتے جائیے

ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ دو ماہ کی مشق کے بعد ایک شخص نہایت آسانی کے ساتھ کوسوں کی آواز سن سکتا ہے، موجودہ تحقیقات نے اس قوت انسانی کا پتہ چلایا ہے۔ یہ قوت تمام قوائے انسانی سے زیادہ سریع اور قوی ہے اور اسکے لئے ترقی کی بیحد گنجائش ہے ابتک انسانی دماغ کی کامل اور قابل اطمینان تشریح نہیں ہو سکی ہے لیکن جسقدر بھی ہو سکی ہے اوس سے ہم نہایت مفید نتائج پر پہونچ سکے ہیں۔ کھوپڑی کے نیچے ایک بھورے رنگ کا مادہ ہوتا ہے اور اوسکے نیچے ایک سپید شے ہوتی ہے۔ اول الذکر دراصل متعدد چھوٹے چھوٹے شریانی نظام پر مشتمل ہے اور موخر الذکر کی بھی حالت وہی ہے صرف اسکے خانے پیچیدہ ہیں بھورے رنگ کا مادہ تمام محسوسات انسانی کا مخزن و منبع ہے اگر یہ موجود نہو تو دماغ بیکار رہے، سپید مادہ کی حیثیت محکوم کی ہے بقول ڈاکٹر فریزر ہیرس (Fraser Harris) اگر سپید مادہ نہو تو دماغ کی بالکل وہی حالت ہو گی

جس طرح ٹیلیفون کی بغیر تارون کے ہوتی ہے - اور اگر بھورے رنگ کا مادہ نہو تو دماغ کی حالت اوس ریلوے کی ہو گی جو نہ کسی اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے اور نہ کہیں ختم ہوتی ہے -

دماغی محسوسات دو طرح کے ہوتے ہین ایک ظاہری اور ایک باطنی - قوی محسوسات کا اثر ظاہری ہوتا ہے اور ضعیف کا باطنی - اول الذکر کا احساس ہر عامی کو ہوتا ہے اور موخر الذکر کا احساس مخصوص لوگون مین ہوتا ہے - عام طور موخر الذکر کو ہم بوقت احساس محسوس بھی نہین کرتے لیکن اوسکا اثر دماغ پر قائم رہتا ہے جو کسی وقت ظاہر ہوتا ہے - یہی موخر الذکر قوت ہے جو ہمارے موجودہ بحث کا موضوع ہے -

مسٹر جے - اس - ہیلڈین (J. S. Haldane) پروفیسر اکسفورڈ یونیورسٹی نے اخبار ویسٹ منسٹر گزٹ (Westminster Gazette) کے نمایندہ سے دوران ملاقات مین بیان کیا کہ انسان اپنے خیالات دوسرے شخص کے دماغ مین بآسانی منتقل کرسکتا ہے اور اسکا ذریعہ وہ آواز کی لہرین ہین جو باطنی محسوسات سے برآمد ہوتی ہین - پروفیسر موصوف اس قوت کو قوت سامعہ مین شامل کرتے ہین - لیکن مسٹر مرے (Murray) جنکا ذکر گزشتہ صفحات مین ہوچکا ہے اسکو علحدہ قوت انسانی سمجھتے ہین - سر ولیم بیرٹ (Sir William Barrett) اف - ار - سی - اس - صدر انجمن روحانیات اس قوت کو روحانی قوت بتاتے ہین - موصوف کا خیال ہے کہ اسکا تعلق دماغ سے نہین ہے بلکہ یہ تو "روحون کی گفتگو ہے"

بہر نوع اسکی جو صورت بھی ہو یہ امر مسلم ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے خیالات معلوم کرسکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی دور کیون نہو - پروفیسر مرے (Murray) نے لندن مین اپنی اس قوت کے مشاہدات صدہا لوگون کے سامنے پیش کیے - ڈمینٹ شکیزا ملی جنکا ذکر گذشتہ صفحات مین ہوچکا ہے وہ اسکو "موج دماغی" پر محمول کرتے ہین - لوئی کھن ( ) ایک جرمن عالم نے اپنی قوت کے اظہار سے ایک عالم کو متحیر کر رکھا ہے - لوئی موصوف مسٹر مرے کا ہم خیال ہے - ایک مجمع کے سامنے جس مین مسٹر بالفور ( ) سابق وزیر اعظم و وزیر خارجیہ موجود تھے لوئی نے ایک عورت کے خیالات من وعن بیان کردیے -

مسٹر جمس ڈگلس اس غیر معمولی واقعہ کے ناقل ہین کہ عین اوسوقت جب ایک شخص ڈیور (Dewar) موٹر کے تصادم سے زخمی ہوا اوسوقت اوسکی مان نے اپنے شوہر سے کہا کہ "میرا دل بیٹھا جارہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شے مجھسے چھین لی گئی" تصادم ۵ بجکر ۵۰ منٹ پر ہوا تھا اور اوسوقت مان سو رہی تھی - یک بیک وہ نیند سے چونک اوٹھی اور اوسکے شوہر نے اوسکو تسلی دینے کی بیحد کوشش کی لیکن وہ برابر یہی کہتی رہی کہ اوسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوسکا لڑکا کسی مصیبت مین مبتلا ہے -

اب آپ غور کرین تو اس واقعہ سے نہایت ہی مفید نتائج برآمد ہوتے ہین - ابتک صرف واقعات حاضرہ کا علم جو اس کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایک وقت آئیگا جب آیندہ واقعات کا بھی اس سے پتہ چل جایا

کریگا اور ممکن ہے کہ حضرت یوسف مین یہ قوت رہی ہو دراصل خواب کی حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ صدہا آیندہ واقعات کو خواب مین دیکھتے ہین اور وہی واقعات من وعن چند دنون کے بعد پیش آتے ہین ۔ یہ ایسا واقعہ ہے کہ کسی تفصیل کا محتاج نہین محققین خواب کا خیال ہے کہ خواب بھی اسی قوت حسیہ کا نتیجہ ہے ۔ اسوقت تک خواب کی صحیح ماہیت دریافت نہین ہوسکی ہے ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جسوقت ہمنے اسکی کُنہ کو دریافت کرلیا اوسوقت ہم بیداری مین بھی اس واقعات کو معلوم کرسکینگے ۔

خاتمہ اسقدر عرض کرنے کے بعد غالباً آپ مجھسے متفق ہونگے کہ انسان کے قوا غیر محدود وسعت حاصل کرسکتے ہین ۔ اور وہ زمانہ دور نہین جب انسان کی مکمل مادی ترقیان اوسے خدا سے قریب کردینگی ۔ ایک ہندوستانی بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ نماز مین مشغول تھے تو ٹرین رُک گئی ۔ آج اسٹریلیا کا ایک مسمریزمی عامل چلتے ہوئے انجن کو روک کر بھی یہی تماشہ دکھا سکتا ہے

ذیل کے نقشہ سے مضمون بالا کی تشریح و تفصیل مقصود ہے

نمبر	معجزہ یا کرامت ۔ بحوالہ صاحب معجزہ و کرامت (روحانی ترقی)	موجودہ مادی ترقیان بحوالہ واقعات و دلائل
۱	حضرت سلیمان کا ہوائی تخت	ہوائی جہاز اور جرمنی نے جو راکٹ ایجاد کیا ہے اوسکا مستقبل اور زیادہ شاندار ہے
۲	حضرت یونس کا مچھلی کے پیٹ مین گھنٹون رہنا اگر واقعہ ہو	ابھی چند دن ہوئے کہ جنوبی ہند کے ایک عامل نے یہ تماشا دکھایا کہ وہ گھنٹون زمین مین مدفون رہا ۔ یہ حبس دم سے بآسانی ممکن ہے ۔
۳	حضرت داؤد کا نغمہ	نغمہ اور موسیقی کے اثرات ظاہر ہین ۔ ماہرین فن کا یہ ادنی کرشمہ ہے کہ وہ راگ سے چراغ روشن کردین ، پانی برساوین اور لوگون کو بیہوش کردین ۔ چنانچہ فارابی کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اوسنے اپنے راگ سے ساری محفل کو محو خواب کردیا تھا ۔ آواز کے اثر کی مختصر سی تفصیل عرض کرچکا ہون ۔ ہر آواز مین لہرین پیدا ہوتی ہین جو فضا مین دور تک جاتی ہین ۔ اور جذبات کے لحاظ سے ان موجون مین اختلاف پیدا ہوجاتا ہے ۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ جذبات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ موجون کے رنگ بدلتے رہتے ہین ۔

۴	حضرت یعقوب نے باوجود فاصلہ "پیراہن یوسفی" کی بو محسوس کر لی تھی ۔	یہ صرف قوت شامہ کی ذکاوت پر منحصر ہے جسکی مثالین مین گذشتہ صفحات مین دے چکا ہون ۔ قوت سامعہ کی ترقی کے لئے جو مشق دی گئی ہے وہی مشق اسکے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے
۵	حضرت یوسف نے خواب فرعون کی صحیح تعبیر بتائی ۔	جو لوگ تعبیر خواب کے اصول سے واقف ہین وہ اس واقعہ کو تعجب خیز نہین سمجھ سکتے ۔ چونکہ .... حضرت یوسف کی قوت متخیلہ بیحد قوی تھی اسلئے انکے دماغ کی موجین آیندہ واقعات کو محسوس کرتی تھین ۔ انگریزی مین ایک ضرب المثل ہے کہ "آیندہ واقعات اپنا عکس سامنے ڈالتے ہین" یہی وہ عکس ہے جسکا احساس حضرت کو تھا اور یہ صرف احساس کی ذکاوت پر منحصر ہے جو مشق سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ دوسرا نہایت باریک نکتہ (جسے مین بخوف غلط فہمی کہنا نہین چاہتا تھا) یہ ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے خود تین حصہ ہین ۔ گذشتہ موجودہ ۔ آیندہ ۔ اور ہم ہر وقت بہ لحاظ ضرورت فطرت تینون زمانون مین رہتے ہین ۔ آپکا مستقبل ہمارا ماضی ہے اور ہمارا ماضی آپکا حال ہے ۔ فرانسیسی منجم کیمیل فلیمیران Camille Flammarion کا خیال ہے کہ وقت و زمانہ کوئی واقعی حیثیت نہین رکھتے ۔ وہ قحط جو فرعون کے لئے مستقبل تھا وہ حضرت یوسف کی نظرون مین حال تھا ۔
۶	حضرت ابراہیم کا آگ مین نہ جلنا	اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے مین آتے ہین ۔ ابھی حال کا واقعہ کہ ایک شخص نے یہی تماشہ جنوبی ہند مین دکھایا تھا ۔ اسٹیٹسمین مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۲۹ء مین بھی اس قسم کا ایک واقعہ شائع ہوا ہے ۔ آگ پر چلنے والون کی ایک جماعت نے اسٹریلیا مین یہ تماشہ دکھایا تھا جسکی صدارت پروفیسر سائیس (Sayce) نے کی تھی ۔ اس جماعت کے ایک عامل نے یہ بیان دیا ہے کہ یہ مشق صرف حسن اعتقاد پر مبنی ہے ۔ شراب و گوشت سے پرہیز لازم ہے اور خیال و عمل کی پاکی اسکے لئے

ضروری ہے۔

۷ حضرت عیسیٰ کی مسیحائی

آج قوت ارادی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مرض کی تکلیف تمام تر محسوسات انسانی کی ذکاوت پر منحصر ہے اجب تکلیف کا احساس نہیں تو مرض نہیں ۱۹۲۷ء میں ایک مصری عامل نے لندن میں اپنی قوت ارادی کے صدہا اس قسم کے تماشے دکھائے وہ مریض کو ہپناٹزم کے ذریعہ سے بیہوش کر دیتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد مریض تندرست ہو جاتا۔ ایک لندن کے اخبار کے نمایندے سے دوران ملاقات میں اس نے بیان کیا کہ یہ بات مافوق الفطرت نہیں ہے اور ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے یہ مشق اس طرح کی کہ پہلے تو میں نے اپنے جسم کو آفتاب کی تمازت میں خوب جلایا۔ زبان کو اپنے حلق کے سوراخ میں ڈالدیا کرتا تاکہ پیاس نہ معلوم ہو۔ اس مشق کو اسوقت تک میں نے جاری رکھا جب تک کہ میں خود کو اپنی مرضی سے بیہوش نہ کر لیتا۔ اس نے بڑے مجمع میں خود کو ایک بکس کے اندر بند کر کے زمین میں دفن کرا دیا اور پانچ روز تک دفن رہا۔

مارگزیدہ کے علاج کی تحقیقات کے دوران میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ اکثر وہ لوگ جو مردہ سمجھے جاتے ہیں وہ واقعی مردہ نہیں ہوتے۔ دماغ کے اندرونی درمیانی حصہ میں ایک خانہ ہوتا ہے جس سے جان بہت دیر میں نکلتی ہے، اکثر مریض پانچ روز تک اس حالت میں رہے ہیں۔ جنرل سر جیمس ولکاکس نے اپنا ذاتی مشاہدہ اخبار ایوننگ نیوز (Evening news) میں بیان کیا ہے کہ ایک بچہ جسکو اسکی ماں نے مردہ سمجھکر چھوڑ دیا تھا اوسکو ایک ہمایہ کے فقیر نے اچھا کر دیا۔

۸ معجزہ سنگریزہ و ابوجہل

گزشتہ صفحات میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ایک قوی الدماغ شخص دوسرے کمزور دماغ والے شخص کے خیالات پر کیونکر اثر قائم کر سکتا ہے ڈاکٹر بوس نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ نباتات میں جان ہے اور وہ بھی بیرونی اثرات محسوس کرتے ہیں۔ تو دنیا کو حیرت ہوئی لیکن آج یہ امر پایہ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ پودے گاتے ہیں۔ حال کا نظریہ ایک

		امریکن ڈاکٹر نے پیش کیا ہے کہ پتھر بھی جاندار ہوتے ہیں - چنانچہ "نغمۂ ریگستان" ایک بدیہی حقیقت ہے۔
۱۰	حضرت عمرؓ کا ممبر سے ابوعبیدہ کو جو صدہا میل پر واقع تھے دشمن کے خفیہ حملہ سے متنبہ کرنا	گزشتہ صفحات میں اسکے متعلق مفصل بحث ہو چکی ہے
۱۱	حضرت علیؓ کی کرامت در خیبر	روحانی حس و ارادی طاقت کی طرح انسان کی جسمانی طاقت بھی غیر محدود ہے۔ یورپین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان صدہا من کے وزن بھی اٹھا سکتا ہے۔ ایک قوی الجثہ شخص اگر مسمریزم کی مشق ... رکھتا ہے تو وہ انجن کو روک سکتا ہے۔ آسٹریلیا کے ایک عامل نے انجن کو رول کر دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ عامل معروف انسان کے لئے شہوانی تعلقات کو بہت مضر بتاتا ہے۔
۱۲	سعدی نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ شیر پر سوار ہو کر اور ہاتھ میں سانپ کا کوڑا لیکر چلتے تھے، جنھوں نے اپنی اس قوت کی توجیہ یوں کی تھی۔ تو ہم گردن از حکم داور مپیچ کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ	جن لوگوں نے سرکس کے تماشے دیکھے ہیں وہ اس کی حقیقت سے خوب واقف ہیں آج مغرب میں شیر و دیگر درندوں کا پالنا ایک عام مشغلہ ہے۔ متعدد عورتیں سانپ پالتی ہیں میں نے خود ایک شخص کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنی گردن میں سانپ ڈالے رہتا اور لطف یہ کہ اُن کے زہریلے دانت بدستور قائم تھے۔

آزاد

مطبوعات موصولہ

افادات سلیم مجموعہ ہے مولوی وحید الدین سلیم (مرحوم) کے چند مقالات کا جسے محمد سردار علی صاحب اڈیٹر تجلی حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ مولوی سلیم نے حیدرآباد میں بہ حیثیت پروفیسر اردو ہونے کے اور اس سے قبل بہ حیثیت ایک کامیاب صحافی و ادیب ہونے کے جو خدمت اردو زبان کی انجام دی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے اب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں، ہمارا فرض یہی ہونا چاہئے کہ ان کے خیالات و افادات ملک کے سامنے پیش کریں۔ بنابریں ملک کو محمد سردار علی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کی ابتدا کردی ہے اور پہلی قسط میں وہ مضامین یکجا کردیئے ہیں جو صحیح معنی میں "خدمت ادب" کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اس مجموعہ میں اس مضامین پائے جاتے ہیں اور سب اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن تلمیحات پر جو افادات سلیم مرحوم نے پیش کئے ہیں یا "ہندوستان کی عام زبان" پر جن خیالات و تدابیر کو ظاہر کیا ہے، وہ ایسے ہیں کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آنا چاہئے۔ قیمت ۱۲ ہے حجم کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد ہے

عرب کی شاعری یہ بھی مولانا سلیم مرحوم کا ایک مضمون ہے جو علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں عرب کے ایام جاہلیت کی شاعری کے ساتھ ساتھ عہد بنی امیہ کی شاعری کو بھی شامل کرلیا ہے اور عمومی تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عربوں کی شاعری، نہ صرف بہ لحاظ شعر بلکہ بہ اعتبار اخلاق و اطوار کیا چیز تھی۔ یہ مضمون شروع سے اخیر تک اسقدر دلچسپ، اسقدر مفید اور پُر از معلومات ہے کہ نہ اس کا مطالعہ دل پر بار ہوتا ہے اور نہ اس کے ختم کرنے کے بعد ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اسنے کوئی فایدہ اس سے نہیں اٹھایا۔ یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ صفحات کو محیط ہے اور ۱۲ میں کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد سے ملسکتا ہے

دیوان تاباں میر عبدالحئی رضوی تاباں، اس دور کے شاعر تھے جسنے دہلی کی شاعری کو حقیقی معنی میں شاعری کی حیثیت سے پیش کیا۔ میر و سودا کے ہمعصر تھے اور انھیں کی طرح ذوق سلیم کے مالک تھے، لیکن وہ دونوں عمر طبیعی کو پہونچے اور یہ عنفوان شباب ہی میں چل بسے۔ یہ وہی تاباں ہیں جن کے حسن و جمال کا ذکر مؤلف آبحیات نے اپنی عادت کے مطابق نہایت غیر محتاط طریقہ سے کیا ہے۔ یہ میرزا مظہر جانجاناں کے نہایت محبوب مریدوں میں سے تھے، لیکن میخواری کے اسقدر عادی تھے کہ آخرکار یہی مشغلہ ان کی جوانمرگی کا باعث ہوا۔ استاد حکمت میر حاتم کے شاگرد تھے اور تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی خوش فکری کی تعریف کی ہے۔ یہانتک کہ میر ایسا بد دماغ شخص بھی ان کی رنگین بیانی کا قایل ہے۔

ان کا دیوان کمیاب کیا نایاب تھا، لیکن اب سید بادشاہ حسن صاحب نے حیدر آباد کے متعدد قلمی نسخوں کو فراہم کرکے اسے شایع کیا ہے اور شروع میں ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ جذبات کے لحاظ سے تاباں کا جو رنگ ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

عجب احوال ہے تاباں کا تیرے　　　کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

ملک کو جناب سید بادشاہ حسن صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایسی بے بہا چیز کو پبلک کے لیے وقف کر دیا۔ میں اس کو وقف ہی کہونگا جبکہ اس کی قیمت انھوں نے صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔ اس کا نسخہ بزم ادب نظام کالج حیدر آباد سے ملسکتا ہے

دلگداز افسانے مولوی سید علی کوثر چاند پوری ملک کے نوجوان لکھنے والوں میں سے ہیں اور علاوہ فن طب کے جس کے وہ ماہر ہیں ادبیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ آپ ہی کے چند افسانوں کا ہے جسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ افسانوں کی زبان صاف، پلاٹ ناقابل اعتراض اور سیرت نگاری مستحق ستائش ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی جناب کوثر نے لکھا ہے جس میں فن افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کی قیمت عمر کچھ زاید ہے۔

معانی و بیان مولوی محمد رفیع جو فاضل دیوبند بھی ہیں اور جدید مشرقی امتحانات بھی پاس کر چکے ہیں یہ رسالہ مرتب کیا ہے موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ معانی و بیان، بدیع و عروض کے ضروری مسایل صاف و سہل زبان میں بیان کئے جائیں اور مثالوں سے بھی ان کو سمجھایا جائے۔ اس قسم کی کتابیں ہر چند دلچسپ نہیں ہوتیں، کیونکہ انکا تعلق قواعد سے ہوتا ہے جو عموماً خشک ہوتے ہیں، لیکن علمی حیثیت سے انکا مطالعہ ناگزیر بھی ہے۔ اس لئے ہم اس کتاب کو ہر حیثیت سے مفید کہنے پر مجبور ہیں۔ یہ رسالہ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ الہ آباد سے عمر میں ملسکتا ہے۔

تذکرہ ریختی جناب سید تمکین کاظمی حیدر آبادی نے ریختی گو شعرا کا تذکرہ اس نام سے مرتب کیا ہے جس میں ۱۴ شعراء کا حال مع انتخاب کلام درج کیا گیا ہے۔ ابتدا میں حسب دستور جدید ایک مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جناب تمکین کی یہ سعی قابل قدر ہے۔ یہ تذکرہ ایک روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے ملسکتا ہے

مآثر دکن یہ کتاب بلدۂ حیدر آباد و مضافات بلدہ کے آثار پر مولوی سید علی اصغر بلگرامی نے تحریر فرمائی ہے جو اس سے قبل وہاں آثار قدیمہ کے ناظم تھے۔ سرزمین دکن جس طرح تاریخی حیثیت سے نوادر کی مالک ہے، اسی طرح آثاری لحاظ سے بھی وہ گنج شائگان کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہاں کی تاریخ پر تو خیر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن آثار کے متعلق کوئی ایسی جامع، مستند، مکمل و مصور کتاب شایع نہیں ہوئی تھی، جیسے ہمارے فاضل دوست مولوی اصغر بلگرامی نے

شایع کی ہے۔ معلوم نہین اس کا کریڈٹ جناب اصغر کو دیا جائے یا اُس خطۂ پاک بلگرام کو جس سے انھین نسبت حاصل ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین مین قابل مولف نے جس تحقیق و تفتیش، جس کاوش و سعی سے کام لیا ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ ایک "ناظم آثار قدیمہ" ہی کی طرف سے ظاہر ہو سکتی تھی اور وہی شخص اس کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دے سکتا تھا، جو جناب اصغر کا سا صاف سلجھا ہوا دماغ اور صحیح مورخانہ ذوق رکھتا ہو۔ اس کتاب مین بہت تصاویر بھی شامل ہین جنھون نے اس کی اہمیت و افادیت کو بہت زیادہ وزنی بنا دیا ہے۔ وہ حضرات جو تاریخ دکن سے دلچسپی رکھتے ہین، یا جو دکن کی سیاحت کرنا چاہتے ہین ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ تاریخی کتابون کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ضروری ہے: جتنا آج کل موسم گرما مین طعام لذیذ کے ساتھ آب خنک۔ اس کی قیمت چار روپیہ ہے اور دفتر مکتبۂ ابراہیمیہ چیچہ بازار حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب کا ایک انگریزی اڈیشن بھی "Land marks of the Deccan" کے نام سے آپ نے شایع کیا ہے اور اس کی قیمت پانچ روپیہ ہے۔

معاشیات | مولوی حبیب الرحمان صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی، مددگار پروفیسر معاشیات کلیہ جامعۂ عثمانیہ نے فن معاشیات (Economics) پر یہ قابل قدر کتاب اُردو زبان مین تحریر فرمائی ہے۔ یہ فن نہایت ہی خشک فن سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے مفید و کار آمد ہونے سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔

ہرچند اس فن پر اُردو مین یہ کوئی نئی کتاب نہین ہے، لیکن اختصار و جامعیت کے لحاظ سے یہ تالیف غالباً اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

معاشیات کے جتنے اہم مباحث ہو سکتے ہین وہ سب بلا استثنا، مبادیانہ و غیر مبادیانہ حیثیت سے اس مین پائے جاتے ہین اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ ہر شخص ادنی غور و تامل کے بعد ان کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور ... مین مولف سے مل سکتی ہے۔

تاریخ ملت حصۂ ہفتم | مولانا اسلم جیراجپوری نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، یہ جلد اس کا ساتوان حصہ ہے جس مین ترکی سلاطین کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ جو اسلوب بیان، انداز جمع و التقاط اس سے قبل کے حصون مین پایا جاتا ہے اس مین بھی قایم رکھا گیا ہے۔ اور ۱۲۰ صفحات مین سرسری طور پر وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے جو قیام سلطنت ترکی سے لیکر اس کے زوال و انحلال تک بیان کیا جا سکتا ہے۔

یہ کتاب ایک روپیہ مین جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

فارسی بلگرام | مولوی سید علی اصغر بلگرامی مددگار معتمد عدالت دکوتوالی نے حیدرآباد کے شعبۂ جامعۂ معارف مین ایک لکچر فارسی زبان مین دیا تھا، جس کا موضوع قصبۂ بلگرام کے اکابر و فضلا کے علمی کارنامون پر روشنی ڈالنا تھا

اس مقالہ میں تقریباً ۲۴۳ اکابر بلگرام کے علمی و ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اپنے منتخب و پاکیزہ الفاظ میں جو ایک بلگرامی ہی کو میسر آسکتے تھے۔ اس کی قیمت ۲ روپے ہے اور فاضل مولف سے مل سکتا ہے

گلشن گفتار | اردو شاعروں کے تذکرہ میں نکات الشعراء اور تذکرہ فتح علی گردیزی بہت قدیم تذکرے سمجھے جاتے ہیں اور علاوہ ان کے اس عہد کا کوئی اور تذکرہ دستیاب نہ ہوا تھا لیکن اب ایک اور تذکرہ اسی عہد کا لکھا ہوا ملا ہے جس کا نام گلشن گفتار ہے اور جو ۱۱۶۵ھ میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا مولف خواجہ خان حمید اورنگ آبادی تھا جو عارف الدین خان عاجز کا شاگرد تھا۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور علاوہ قدیم دکنی شعراء کے شمالی ہند کے معاصر شعراء کا بھی ذکر اس میں کیا گیا ہے

جناب مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے نے اس کو مرتب کیا ہے اور ان کی تحقیقات میں یہ شعراء اردو کا اولین تذکرہ ہے۔ فاضل مرتب نے ساتھ ہی ساتھ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ دوسرے قدیم تذکروں کے بیانات بھی شائع کر دیئے ہیں جس سے یہ کتاب اور زیادہ مفید و دلچسپ ہوگئی ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ روپے ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

ہمارے رسول | اس مختصر رسالہ میں نبی آخر الزمان کے حالات اور ان کی سیرت پر متبدیانہ تبصرہ کیا گیا ہے تاکہ معمولی پڑھے لکھے اور بچے آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ عبارت بہت سادہ و سلیس ہے اور طباعت و کتابت پسندیدہ صحت روایات کا بھی کافی لحاظ کیا گیا ہے۔ قیمت ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

دیوان مجذوب | حیدرآباد کے ایک صاحب حکیم میرنادر علی صاحب رعد ہیں جن کے کتب خانہ سے ایک دیوان فارسی "دیوان مجذوب" کے نام سے ۱۱۶۲ھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا تھا اور اب اس کو بعد طباعت شائع کیا گیا ہے میرے پاس جو حصہ دیوان کا ریویو کے لئے آیا ہے وہ ردیف دال کا ہے۔ اس سے قبل کے حصے میں نے نہیں دیکھے اور نہ یہ معلوم ہے کہ مجذوب کے متعلق کیا معلومات پہلے حصہ میں درج کی گئی ہیں۔ مجذوب تبریز کے رہنے والے تھے اور میرنادر علی صاحب رعد کا خیال ہے کہ خواجہ حافظ شیرازی کے رنگ میں بے مثل کہتے تھے۔ میں نے ردیف دال کی غزلوں کو جستہ جستہ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجذوب نے یقیناً حافظ کا تتبع کیا ہے اور کافی کیفیت و رنگینی کے ساتھ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

نسبت شعر من و حافظ بگویم با تو چیست　　ہست انگشتے کہ کار سبحۂ صد دانہ کرد

لیکن یہ ہی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے مقصود انکا کیا ہے۔

تذکرہ نویس چونکہ مجذوب کے حالات سے ساکت ہیں، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حزین سے کتنے زمانہ قبل پائے جاتے تھے اور کن حالات میں کہاں زندگی بسر کی — بہرحال چونکہ یہ دیوان نایاب تھا اس لئے ملک کو

ممنون ہونا چاہئے جناب رعد کا کہ انھون نے اس کو شایع کرکے پبلک عام کردیا۔ اس کے ابتدائی اجزا اگر موصول ہوئے تو مکرر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ سکونگا۔ اس باب مین جو صاحب خط وکتابت کرنا چاہین حکیم صاحب موصوف سے واڑی جنکشن کے پتہ پر کرسکتے ہین۔

جواہر اللغات ایک جیبی لغت ہے فارسی اُردو کا جسے منشی لشمبھو دیال صاحب نے اس نام سے مرتب کیا ہے۔ اس لغت کی تقطیع تقریبًا وہی ہے جو انگریزی مین "Pocket" ڈکشنری کی ہے اور حجم ۷۵۰ صفحات کا ہے۔ ہر صفحہ مین کم وبیش ۴۰ الفاظ درج ہین اس لئے یہ لغت تقریبًا ۲۰ ہزار الفاظ کا ہے جس مین قدیم وجدید دونون الفاظ شامل ہین۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لغات مین تحقیق کا کوئی سوال نہین ہوتا بلکہ صرف اختصار کا ہوتا ہے اس لئے غلطیون کا امکان ضرور ہے۔ لیکن اس کے مفید وکارآمد ہونے سے انکار نہین ہوسکتا۔ جو حضرات فارسی زبان کا مختصر مگر جامع لغت رکھنا چاہتے ہین ان کے لئے اس کی خریداری ضروری ہے خصوصیت کے ساتھ طلبہ کہ ان کو اس سے استفادہ کرنے مین بڑی سہولت ہوسکتی ہے۔ یہ کتاب ۱۲ر مین رام نراین لال کتب فروش الہ آباد سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

زنگاری بیگم لیڈی ازلیور فرانسیسی زبان کا مزاحیہ ڈراما ہے جسے ڈاکٹر اس۔ اس نہرو پی ایچ ڈی نے انگریزی زبان مین منتقل کیا تھا اور انگریزی سے اُردو مین ہمارے فاضل شاعر جناب اثر لکھنوی نے زنگاری بیگم کے نام سے نظم مین منتقل کیا ہے،

جناب اثر ایسے کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہین کہ جس حد تک نظم کرنے کا تعلق ہے ان کی اس سعی کے متعلق کسی کو گفتگو کی گنجایش ہو ہی نہین سکتی، لیکن مجھے حیرت اسپر ہے کہ باوجود اپنے عدالتی مشاغل کی کثرت کے کیونکر انھون نے اتنا وقت نکال لیا۔ یہ ڈراما مجلد شایع ہوا ہے اور ۱۲ر مین سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے ملسکتا ہے۔

نقش ونگار جناب جلیل احمد قدوائی کی نظمون اور غزلون کا مجموعہ ہے جو ایک روپیہ مین مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ سے ملسکتا ہے۔ جناب جلیل غزل مین حسرت موہانی کا تتبع کرتے ہین اور نظمون مین اپنی غزل سرائی کا اس لئے غزلین اور نظمین دونون خوب کہتے ہیں۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(بلقیس رعنا۔ ۸۰ا۔ پھول گلی۔ بمبئی)

نیاز بے نیاز

مسٹر لکھنا آپ کی توہین ہے اور مولانا کہنا آپ کی چڑھ اس لئے صرف نیاز پر اکتفا مناسب تھا......

...... مگر بے نیاز کے اضافہ نے تھوڑی سی شاعری بھی صرف کرادی گئی معلوم نہیں آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔

میں عرصہ سے اُن تمام انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہوں جو تدریجاً آپ کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور نہیں کہہ سکتی کہ ان کا سلسلہ کب اور کس طرح ختم ہوگا۔ لیکن اگر میں قیاس سے کام لوں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت جلد خدا اور خدا کی آخری الہامی کتاب سے بھی انکار کرنے والے نظر آتے ہیں جس کا ثبوت ماہ جون کے استفسار کے جواب میں بہ آسانی مل سکتا ہے۔

میں آپ کی آزادانہ تنقید کو یقیناً پسند کرتی ہوں، لیکن مجھے ابھی تک اس جذبہ کی حقیقت کا علم نہیں ہوا جو اصل باعث آپ کے موجودہ مذہبی لٹریچر کا ہے۔ کیا آپ اس پر کوئی روشنی ڈالکر، مجھے "ظن و گمان" کی معصیت سے بچا لیں گے؟

بہرحال، میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ اگر آپ کے تمام مقالات حقیقتاً خلوص نیت پر مبنی ہیں تو میں خدا سے انکار کرنے کی حد تک بھی آپ کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہوں، اور اگر آپ کسی مصلحت سے فی الحال اُس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتے جو چند ماہ یا چند سال بعد آپ پیش کرنے والے ہیں تو میں آپکو مشورہ دونگی کہ اس پردہ مصلحت کو فوراً چاک کر دیجئے اور جو اصل مقصود ہے اسے ابھی ظاہر کر دیجئے، کیونکہ میں آپ میں اخلاق کی اتنی کمزوری بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی

(نگار) آپ نے اپنے تو خیر مسٹر اور مولانا کا قصہ پیدا کرکے بے نیازانہ انداز میں کچھ شاعری سے کام لے بھی لیا، لیکن میں کیا کروں جبکہ مجھے یہی علم نہیں کہ آپ مسز ہیں یا مس، ماسٹر ہیں یا مسٹر۔

بقول اکبر الہ آبادی یقیناً نہ میں مسٹر ہوں نہ مولانا اور اس لیے میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اس نیازمند کو...... صرف نیاز کے لفظ سے یاد کرتیں لیکن آپ نے بے نیاز کے اضافہ سے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کو عطیہ جان کر قبول کر لوں، یا طعن سمجھ کر اس کے واپس لینے کی استدعا آپ کے حضور میں پیش کروں۔ میں اس وقت شاعری سے کام نہیں لے رہا، اس لئے یہ

"رد و قبول" کا قصہ بھی پیش آیا، ورنہ "تسمیہ و خطاب" کے متعلق ایک عربی شاعر مجد الدین طوسی عجیب و غریب دلنشین نکتہ بتا گیا ہے کہ۔

اسمع اذا نودیت باسمی و انہ — اذا قیل لی یا عبدھا لسمیع
لا تدعنی الا "بیا عبدھا" — فانہ اشرف اسمائی سلد

چہ جائیکہ آپ خود کوئی نام تجویز کریں اور میں اسے گردن جھکا کر قبول نہ کرلوں۔ "تا نیم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ" میری طرف سے "پسندیدگی و عدم پسندیدگی" کی خلش میں آپ کے دشمن مبتلا ہوں۔ جب تک "خونِ دو عالم" اپنی گردن پر لینے کے دنیا میں موجود ہیں آپ کیوں اپنی "عشق" کی ناکامی کے خیال سے فکرمند ہوں۔

جلوہ بر خود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

۴۔ "آپ عرصہ سے میرے ذہنی انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہیں"! اس سے زیادہ خوش بختی میری اور کیا ہو سکتی ہے "خستگان را دلِ بہ پرسشہائے پنہان بردہ" لیکن معاف فرمائے اگر میں عرض کروں کہ آپ نے میرے "انقلاباتِ ذہنی" کے انجام پر صحیح رائے زنی نہیں فرمائی اور آپ بھی وہی کہنے لگیں جو دنیا کہہ رہی ہے۔

لو اوتا بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

اگر آپ باور کریں تو کہوں کہ میں دنیا میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ آفتاب کے طلوع و غروب کا بھی انکار کر سکتا ہوں جو کائنات کا روشن ترین مشاہدہ ہے، لیکن خدا کا انکار مجھ سے ممکن نہیں، کیونکہ اس کی عظمت و جلال اس کی وسعت و پہنائی، اسکی ابدیت و لانہایت کا علم مجھے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے اور میں اسکو اس درجہ عزیز رکھتا ہوں کہ شاید ہی اپنی جان کو بھی کافی معاوضہ اس "لطف و اکرام" کا قرار دوں جو "فطرتِ صحیحہ" نے اس اعتقاد راسخ کی صورت میں مجھے ارزانی فرمایا ہے۔ حیرت ہے مجھے لوگوں کی بے بصری اور کوتاہ فکری پر کہ وہ خدا، کو خدا کہتے ہیں اور پھر بھی "سطحیاتِ مذہب" پر جان دیتے ہیں۔

خدا نام ہے "خالق کُل" کا لیکن مذہب والوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کا نام علیحدہ علیحدہ "خدا" رکھ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خدا نام ہے "محبت" کا اور "محبت" ہی سے کائنات کو معمور ہونا چاہئے کہ یہی ہے اصل مفہوم خدا کے "محیط" ہونے کا، مگر مسجد و مندر کی پوجا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدا ایک آتشیں حربہ والا دیوتا ہے جس کے منہ سے چنگاریاں اور ہاتھوں سے شعلے نکل نکل کر سوائے ایک مخصوص طبقہ کے دنیا کو خاک سیاہ کر رہے ہیں۔ بہرحال خدا کا جو مفہوم میں نے قرار دیا ہے وہ صرف اس صورت سے پورا ہو سکتا ہے کہ ایک مذہب کا مفہوم صرف اخوتِ عامہ قرار دیا جائے

۱ جس وقت لوگ میرا نام لیکر پکارتے ہیں تو میں بہرا ہو جاتا ہوں اور جب "اے فلاں کے غلام" کہکر پکارتے ہیں تو میں سن لیتا ہوں۔ اسلئے اے لوگو مجھے تم "اس کا غلام" ہی کہکر پکارا کرو کہ میرا یہی نام سب سے زیادہ بہتر ہے۔ —

اور کلام مجید کے مطالعہ سے مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس نے اسی مقصد کی تعلیم دی ہے اور اسلام کا صحیح درس یہی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ کن اسباب کی بنا پر آپ کو میری نیت کے خلوص کی طرف سے ریب و شک پیدا ہوا، کیونکہ وہ شخص جو تمام افراد نوعِ انسانی کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، اس کے حق میں تو غرض و مصلحت کے سوال کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ ہاں، البتہ اگر آپ کو میرے مقصود کی طرف سے کوئی شبہ پیدا ہوتا ہو، تو بیشک آپ کا یہ فرمانا ایک حد تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

۳- میں گزشتہ ماہ کے استفسار کا جواب دینے کے بعد سمجھتا تھا کہ بعض حضرات اُس سے وہی نتیجہ نکالیں گے جو آپ نے فرمایا، لیکن میں اس کا جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں، جبتک اس مسئلہ میں منھ کھول کر کوئی بات نہ کہی جائے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے اسرائیلی قصص کو "واقعات تاریخی" کی حیثیت سے ثابت کرنے کا مدعی ہے تو اس کو چاہیئے کہ پہلے ان باتوں کا جواب دے، جنھیں میں نے بائبل کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد میں ظاہر کرونگا کہ قرآن مجید میں ان قصص کو کس انداز سے اور کس مقصود کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

۴- آپ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر میں یہ سب کچھ خلوص نیت کے ساتھ کہتا ہوں تو آپ منکر خدا کی حیثیت سے بھی میرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ اس کے متعلق سوائے اسکے کیا عرض کروں کہ میں تو اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہتا ہوں وہ خلوص نیت ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آپ میرا ساتھ نہ دیں تو یہ میری بدقسمتی ہے۔ لیکن اگر آپکی معیت کی تنہا شرط خدا کا انکار ہے، تو آئیے یہ بھی کر دیکھیں۔

من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

باب الاستفسار

زحمت و تکلیف کا محل استعمال

(جناب عاصی ۔ ناگپور)

"سارا ہندوستان جس مقام پر لفظ تکلیف استعمال کرتا ہے وہاں اہل لکھنؤ کی جدت طرازی نے لفظ زحمت کو اختیار کر لیا ہے ۔ صرف اہل لکھنؤ ہی اگر اسے استعمال کئے جاتے تو چنداں مضائقہ کی بات نہ تھی کیونکہ اُنکی دنیا ہی گومتی کے کنارے پر الگ آباد ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس اختراع کو لکھنؤ کے غیر لکھنوی شعراء بھی قبول کر چکے ہیں اور کبھی کبھی آپ خود بھی اسکے مرتکب ہو جاتے ہیں ۔ اسلئے ہمیں بغرض تحقیق آپ کے باب الاستفسار کھٹکھٹانا پڑا ۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے اسکی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ لفظ تکلیف اور زحمت اگرچہ دونوں قریب المعنے ہیں لیکن ابتک استعمال میں فرق رہا ہے ۔ لفظ تکلیف تکلف کے معنے میں بھی استعمال ہوتا تھا ۔ یعنے تکلیف اختیاری اور غیر اختیاری دونوں جگہ اسکا استعمال تھا ۔ لیکن لفظ زحمت کا استعمال ہمیشہ مجبوری اور پریشانی ہی کے لئے تھا ۔ مثلاً زحمت سفر ۔ زحمت مرض ۔

"زحمت بہ یک نقطہ زحمت شود"

اب جو یہ لفظ ذرا سی تکلف کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ہے تو میرے خیال کے مطابق اس لفظ کی خصوصیت جاتی رہی ۔ اور اگر کسی شخص کو تکلیف کا مرتبہ بڑھا کر بتانے کی ضرورت ہو تو وہ کسی لفظ مفرد میں نہیں بتا سکتا اسطرح وسعت لسانی بھی زحمت میں پڑ گئی ۔

لکھنؤ کے ایک غیر لکھنوی شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہے ۔

شعر :- آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ۔۔۔ اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

مجھے اس کے متعلق یہ کہنا ہے کہ زحمت بھی اور ذرا کچھ سمجھ میں آنیوالی بات نہیں ۔ بولتے تو یوں ہیں کہ ذرا تکلیف کیجئے یا بڑی زحمت ہوئی ۔ "اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی"

یہ کیا بات ہوئی ۔ اس لئے التماس ہے کہ از راہ عنایت تھوڑی سی تکلیف فرما کر یا بڑی زحمت گوارا کر کے آپ ان دونوں الفاظ پر روشنی ڈالئے ۔ اور بتائیے کہ ان دونوں الفاظ میں نسبت تطابق ہے یا تبائن ۔ عام خاص من وجہ

یا عام خاص مطلق۔ اور جس تعمیم کے ساتھ تکلیف کے تکلف کو اُٹھا کر اہل لکھنؤ زحمت آرائی فرما رہے ہین اسکے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

(نگار) مجھے اس کا علم نہین کہ اہل لکھنؤ لفظ تکلیف زیادہ استعمال کرتے ہین یا لفظ زحمت، لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ مین ہمیشہ زحمت ہی استعمال کرتا ہون اور جس محل پر اُردو مین لفظ تکلیف بولا جاتا ہے، اسے غلط سمجھتا ہون۔

یہ دونون لفظ عربی کے ہین، اس لئے اصولاً سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس زبان مین انکا محل استعمال کیا ہے۔ عربی مین زحمت، زحام، اور ازدحام سب کے معنے انبوہ یا بھیڑ کے ہوتے ہین۔ اور تکلیف کہتے ہین کسی ایسے کام کا حکم دینے کو جس کا انجام دینا بہت شاق ہو۔ یہان تک کہ ٹیکس عائد کرنے کے لئے بھی وہان لفظ تکلیف ہی استعمال ہوتا ہے۔ تکلف کہتے ہین کسی محنت شاقہ کے برداشت کرنے کو۔

اس لئے یہ بات ظاہر ہے کہ زحمت اور تکلیف دونون لفظ اُردو مین اپنے حقیقی معنے سے ہٹ کر استعمال ہوتے ہین فارسی مین لفظ تکلیف تقریباً اپنے حقیقی معنے مین استعمال ہوتا ہے۔ سوائے اسکے کہ وہ لوگ صرف حکم کرنے کے مفہوم مین بھی بولتے اور لکھتے ہین مرزا صائب لکھتا ہے:-

تکلیف توبہ ہر کہ در ایام گل کند ✲ خونش بخاک ریز کہ از اہل بدعت ست

درویش والہ ہروی کا شعر ہے:-

ہشدار کہ مقتضائے پیری ✲ تکلیف کند بہ گوشہ گیری

دونون جگہ تکلیف بہ معنی امر کردن (حکم دینا) استعمال ہوا ہے۔

فارسی مین لفظ زحمت کا استعمال البتہ مجازی صورت سے بہ معنی رنج و مشقت آتا ہے۔

نظیری لکھتا ہے:-

حسن تو زیور تو بس ست این قدر چرا ✲ بر گوش و سینہ زحمت زیور نہادہ

اُردو مین ان دونون لفظون کا استعمال فارسی سے آیا ہے، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ جس موقعہ پر اُردو مین لفظ تکلیف استعمال ہوتا ہے، وہ فارسی کے بالکل مخالف ہے، البتہ زحمت کا استعمال فارسی کے مطابق ہوتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے بجائے تکلیف کے لفظ تکلف استعمال ہوتا ہوگا۔ (جو بالکل صحیح ہے) لیکن بعد کو غلطی سے ان دونون کو ہم معنے سمجھ کر تکلیف کا استعمال بجائے تکلف کے ہونے لگا۔

اس لئے اگر گفتگو ہو سکتی ہے تو تکلف و زحمت کے درمیان نہ کہ تکلیف و زحمت کے باب مین۔ کیونکہ تکلیف بالکل غلط معنے مین استعمال ہوتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ تکلف اور زحمت میں محنت شاقہ کس لفظ سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو لغوی تحقیق اس کی موید ہے کہ تکلف زیادہ محنت کو ظاہر کرتا ہے اور زحمت میں نسبتاً اس کی کمی ہے۔ کیونکہ تکلف تکلیف کا نتیجہ ہے جس کے معنے ہیں ناقابل برداشت کام کا حکم دینا" اور زحمت مجازی معنی میں صرف اس قسم کی ہلکی الجھن یا کشاکش کو ظاہر کرتا ہے جو ایک بھیڑ یا ہجوم میں ہوا کرتی ہے۔

آپ نے جو شعر درج فرمایا ہے، اس میں کوئی معنوی خرابی نہیں پائی جاتی۔ لفظ زحمت یوں بھی ادنےٰ قسم کی محنت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اک ذرا کا اضافہ کرنے سے اس میں اور تخفیف پیدا ہو گئی۔ اور یہی مدعا شاعر کا ہے "اک ذرا"، لکھنؤ کا خاص محاورہ ہے اور بجائے لفظ تکلیف کے زحمت کا لفظ استعمال کرنے میں یہ لوگ بالکل حق بجانب ہیں۔ اور محض اس لئے کہ وہ گومتی کے کنارے رہتے ہیں۔ (جو آپ کے نزدیک شاید کوئی بڑی معیوب بات ہے) ان کے "صحیح" کو "سقیم" نہیں کہہ سکتے

اور اگر لفظ "تکلیف" متعدی معنے کے ساتھ ہی اردو میں استعمال کیا جائے اور کھینچ تان کر اس کا مفہوم محنت مشقت کا پیدا کیا جائے، تو بھی ظاہر ہے کہ بہ نسبت زحمت کے اس میں پریشانی و مجبوری کا مفہوم زیادہ قوی پایا جاتا ہے جو آپکے دعوے کے بالکل خلاف ہے۔

جنوری سنہ ۳۱ء کے رسالہ کے متعلق ایک تجویز

گزشتہ تین سال سے نگار کا جنوری نمبر تقریباً دو چند ضخامت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے سنہ ۲۸ء کا پہلا پرچہ مومن کیلئے مخصوص تھا سنہ ۲۹ء کے جنوری نمبر میں سنہ ۲۲ء کی جلد کا اقتباس تھا۔ اور سنہ ۳۰ء کا جنوری نمبر ظفر کے لئے وقف کیا گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سنہ ۳۱ء کا جنوری نمبر کیا ہو؟ پہلے میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اسکو مصحفی کیلئے مخصوص کر دیا جائے۔ لیکن اب یہ خیال مضمحل ہو گیا ہے اسلئے کہ اول تو مصحفی پر ایک طویل مضمون نگار میں نکل چکا ہے، دوسرے یہ کہ مجھے اسکا یقین نہیں کہ لکھنے والے اسطرف توجہ کرینگے اور تیسرے یہ کہ ناظرین نگار، شاعری کے حصہ کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتے۔ پھر اب کیا ہونا چاہئیے؟ میری دو تجویزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جنوری سنہ ۳۱ء کا پورا پرچہ میرے ہی مضامین سے پُر ہو اور دوسرے یہ کہ اسوقت تک کو باب الاستفسار کو تین حصہ کر کے ایک حصہ جنوری سنہ ۳۱ء میں شائع کر دیا جائے گویا اسطرح تین سال کے اندر استفسارات کا پورا مجموعہ لوگوں کے پاس پہونچ جائیگا۔ ہر چند اس میں میرا تجارتی خسارہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن میں اس خسارہ کو برداشت کروں گا۔ کیونکہ اسطرح میں آسانی سے اور جلد، پبلک کی ایک بڑی خواہش کو پورا کر سکوں گا۔

بہرحال میں آپ حضرات سے رائے طلب کرتا ہوں کہ میں کس تجویز پر عمل کیا جائے۔

نیاز

منکرانِ خدا سے خطاب

گذر چکا ہے وہ دور مجھ پر بھی جسمین اب تم گھرے ہوئے ہو — خدا سے غافل، خودی کے بندے، حقیقتوں سے بچھڑے ہوئے ہو
تمھین خبر ہے، کہ مین سمجھتا ہون کیا، ان ترقیاتِ زندگی کو — وہ خود پرستی کے تلخ لمحے کہ زہر ہین نفسِ آدمی کو

وہ میرے دل کی تجلیون کو غبارِ ظلمت بنا رہے تھے
وہ میرے اجزائے زندگانی پہ موت کی طرح چھا رہے تھے

چمن کے سینہ مین گرچہ روحِ تبسمِ فصلِ گل رواں تھی — مگر میری شب پرستیون پر ضیائے حسنِ سحر گران تھی
ہزار عرش اپنے بازوؤن پر، اگرچہ فطرت اٹھا رہی تھی — تلاشِ ناکام مجھکو لیکر عمیق غارون مین جا رہی تھی

مری نگاہون مین بے حقیقت نشاطِ جاوید کے خزانے
مری سماعت پر اک نوائے گران نشین سرمدی ترانے

گر وہ حالت بدل چکی ہے، وہ اب زمانہ گذر چکا ہے — تاثراتِ خودی سے لبریز تھا جو نشہ اتر چکا ہے
اب ان حقائق سے تم سبق لو، یہ راز میری نظر سے پوچھو — جو آبِ حیوان کی جستجو ہو تو بھید اس کا خضر سے پوچھو

کہ مدتون مین رہا ہون سرشار تشنۂ بادۂ خودی مین
بظاہر آزادہ کار لیکن خدائے باطل کی بندگی مین

اگرچہ اک واقعہ ہے لیکن بہت گران ہے بیان اسکا — وہ وقت اب جبکہ یاد کرنے سے کانپ جاتا ہے قلب میرا
جو تیرگی رہ گئی ہو باقی حریمِ دل مین وہ دور کر دے — کریم! اپنے کرم کا صدقہ معاف میرا قصور کر دے

یہ مین نے مانا کہ ایک مدت سے کر رہی ہے تلاش دنیا
مگر یہ "خلقت" ہے راز ایسا جسے کوئی آجتک نہ سمجھا

اگرچہ انساں بہت ہوئے ہیں، پیامِ فطرت سنانے والے — رہِ حقیقت دکھانے والے، خرد کی شمعیں جلانے والے
مگر ابھی تک کسی نے کھولا نہ قلبِ ہستی پہ راز اسکا — رہا ہے انسان کی دسترس سے بعید تر امتیاز اسکا

نہ صرف تخلیق ہی وہ عقدہ دماغ جس میں اُلجھ رہا ہے
طلسم ہے اک طلسم دنیا کہ ہر نفس دانش آزما ہے

کبھی کوئی شئے لباسِ حق میں حیات کا درس دے رہی ہے — کہیں حقیقت کو دیکھتے ہیں کہ آخری سانس لے رہی ہے
بہت شیاطینِ انس جنکا ہر اک نفس زہر اُگل رہا ہے — بہت ہیں ایسے نفوسِ قدسی جنھیں زمانہ نگل رہا ہے

ہوا کہیں کشتگانِ حسرت کی شمعِ محفل بجھا رہی ہے
اجل کسی نوجوانِ صالح کا نقشِ ہستی مٹا رہی ہے

وہی کلی، زینتِ گلستاں جو شب کے دامن میں کھل چکی تھی — اُسی کو دیکھا کہ صبح ہونے سے قبل مٹی میں مل چکی تھی
ابھی جہاں بارشِ طرب تھی جہاں غنچے چٹک رہے تھے — پلک جھپکتے! اُسی چمن میں خزاں کے شعلے لپک رہے تھے

جسے زمانہ کی سادہ لوحی، پیامِ عشرت سمجھ رہی تھی
کھلا، کہ آوازِ جوئے خوں، یا مہیب جھنکار تیغ کی تھی

یہاں وہ انسان نما درندے فروغ ہر سمت پا رہے ہیں — جو خوں کی بیقرار موجوں سے پیاس اپنی بجھا رہے ہیں
یہ ہر طرف ابتری ہی کیسی، یہ محشرِ فتنہ ساز کیا ہے؟ — خدا اگر ہے، تو اس ہجومِ ملال و عبرت کا راز کیا ہے؟

حیات آئینِ منضبط ہے تو کچھ کہیں انتظام بھی ہے!!
خدا ہے گر حکمرانِ عالم، تو کوئی اُسکا نظام بھی ہے!!

یہی ہیں وہ اعتراض جن پر خدا سے انکار کی بنا ہے — انھیں کے سایہ میں کفر و الحاد کا جہنم دہک رہا ہے
کہا کسی نے کہ "قوم بزدل" خدا کا اقرار چاہتی ہے — کہ آرزو مندِ فتح یابی حیاتِ بیدار چاہتی ہے

کوئی توہم کی روشنی کو سمجھ رہا ہے چراغِ منزل
کسی کی آنکھوں پہ ہے حجابِ نگاہِ حکمت کا زعمِ باطل

گمان کسیکا کہ اہلِ دانش جو اب سے پہلے گذر گئے ہیں — وہ خیر و شر کیلئے مرتب یہاں اک آئین کر گئے ہیں
جو ماہرانِ حیات، رفتارِ نبضِ فطرت سمجھ رہے تھے — زمیں پہ اک ربِ آسمانی کا رازِ حکمت سمجھ رہے تھے

کہیں یہ طوفانِ معصیت کی تباہ کن رو میں بہہ نہ جائیں یہ اسلئے تھا، جہاں میں انساں بنکے حیوان رہ نہ جائیں
مگر اب اس وادیِ خطر سے گروہ انسان گذر چکا ہے جسے مٹانے پہ ہو نہ قدرت، یہ نقش اتنا ابھر چکا ہے

بس اب خدا، اور اسکے عزمِ تلاش سے احتراز کیجئے
خیالِ منزل رسی اگر ہے تو راہ کا امتیاز کیجئے

کہ یہ تصورِ عمل کی آزادیوں کو برباد کر رہا ہے "خدائے گردوں نشیں" زمیں پر بشر کی امداد کر رہا ہے
مگر یہ عقل آزما ترانے، رہینِ حسنِ قبول بھی ہیں یہ دیکھنا ہے کہ ان دلیلوں کی ہم عناں کچھ اصول بھی ہیں

اگر یہ سچ ہے کہ عقل اب نارسی کی حد سے گذر چکی ہے
تمام وا ہو چکے ہیں عقدے کہ زلفِ دوراں سنور چکی ہے

کوئی بتائے کہ پختہ کارانِ عقل بھید اتنا پا سکے ہیں! نمو کے جو بیشمار چشمے زمیں کی تہ سے ابل رہے ہیں
کسی نے پائے ہیں بھید اب تک بہار کی مے پرستیوں کے کسی نے سمجھے ہیں راز اب تک چمن کی سرشارستیوں کے

انھیں کوئی حل سکا ہے اب تک وہ ماہرِ فنِ باغبانی
جو ایک پتّی کو بخش سکتا ہو یک نفس تابِ زندگانی

طبیب یا رازدانِ تشریح کوئی ایسا کہیں ہوا ہے جو صرف اک بوند بھر لہو کے تمام اجزا سمجھ سکا ہے
کھلے ہیں اب تک مقام کتنے، اٹھے ہیں اب تک حجاب کیا کیا ہر ایک ذرہ میں ایک عالم، ہر اک ستارے میں ایک دنیا

دماغ جنکے محیطِ اسرار، جنکا ناخن گرہ کشا ہے،
وہ عالمانِ حیاتِ دوراں ذرا بتائیں کہ روح کیا ہے

غرض یہ ثابت ہے جبکہ مبہم، تلاش اسرار کر رہی ہے مگر ابھی عقل عاجزی کا خود اپنی اقرار کر رہی ہے
بہت ہیں ایسے مقام، پہونچا جہاں نہ پیکِ خیال اب تک بہت ہیں ایسے پیام، سمجھا گیا ہے جنکو محال اب تک

تمہیں نہ ہو اعتراف اسکا، مری نظر تو یہ دیکھتی ہے
کہ ذرے ذرے کے آستاں پر جبینِ انساں جھکی ہوئی ہے

تو پھر یہ ہنگامۂ تکلم، یہ محشرِ اضطراب کیوں ہے؟ خدا ہے بیرونِ فہم، لیکن خدا سے یہ اجتناب کیوں ہے؟
کہ باہمہ عجزِ عقل پھر بھی کریں جو تکذیب ہم خدا کی کمالِ دانشوری تو کیا ہے دلیل ہے جہلِ نارسا کی

چمن کا ہر پھول ہر شگوفہ دلون کو بیدار کر رہا ہے
جو غور کیجئے تو ذرہ ذرہ خدا کا اقرار کر رہا ہے

یہ اک حقیقت ہی جس سے انکار تمکو بھی غالبانہ ہوگا   کہ اختلافات سے مرتب کیا گیا ہے مزاج دنیا
ہر ایک تار رباب مین ہین چھپے ہوئے بیشمار نغمے   ہر ایک ذرے مین ہین چمن کے شگوفہ پرور ہزار جلوے
خیال صد رنگ، مختلف ذوق، آرزوئین جدا جدا ہین
غرض یہی اختلاف طبعی حیات دوران کے رہنما ہین

اسی طرح ذوق علم و فن ہے بہ حسب پیمانۂ تخیل   کسی کو "منقول" سے ہے نسبت کسی کو "معقول" مین توغل
کوئی نجوم فلک کے پیچیدہ راستون سے گذر رہا ہے   نظر جمائے زمین کے ذرون کی سمت اک غور کر رہا ہے
کسی کو ابر گہر فشان کی حقیقتین جاننے کی دھن ہے
کسی کو برق شرارہ افگن کے راز پہچاننے کی دھن ہے

کوئی نباتی فضا کے اوراق مختلف کو الٹ رہا ہے   کوئی ہوا کے تمام اجزا کو جانچنے پر تلا ہوا ہے
حیات عالم کا ایک واقف کشش کے اسرار جانتا ہے   وجود اشیا کا ایک ماہر، صدا کے ذرونکو چھانتا ہے
غرض کہ ہے اکتساب حکمت، مذاق فطرت کی رہبری مین
یہ ورنہ ہے اک راز عریان کہ اتنی محدود زندگی مین

محال ہے سر بسر کہ وہ سب علوم ہم جن سے آشنا ہین   اصول دانش جو کاروان حیات عالم کے رہنما ہین
بنائے درس کمال ہستی علوم و افکار کے خزانے   پیام تکمیل زندگانی، رباب عرفان کے سب ترانے
ہزار اسرار ناکشودہ لئے ہوئے مختلف فضا مین
سب ایک نقطہ پہ جمع ہو جائین ایک سینہ مین ڈوب جائین

یہ جب ہے ثابت تو علم حق بھی جو روح ہی پیکر جہان کی   ہر ایک نقطے مین جسکے روشن ہی شمع اک حسن جاودان کی
فضا مین جسکی دوام، فطرت کی نازنین مسکرا رہی ہے   جہان سدا حکمتون کی دیوی، سر عقیدت جھکا رہی ہے
نہ جبتک اسکی حقیقتون کا طریقۂ امتیاز جانے
کوئی ضرورت نہین کہ ہر شخص اسکی باریکیونکو سمجھے

جہاں ہوں ہر سمت عجزِ دانش سے یہ نظر آزما دھندلکے حجابِ نظارۂ حقیقت اڑے ہوئے ہوں حجاب تنے پردے
وہاں یہ خودسر خیالِ بینش غلط نہیں ہے تو اور کیا ہے تم اُسکے صیدِ زبوں ہو، تمکو فریب جو نفس دے رہا ہے

کبھی اُنھوں نے نگاہ کی ہے حقیقتِ بزمِ زندگی پر
مٹے ہوئے ہیں جو بیخبر اس تباہ کن نشۂ خودی پر

یہ عقدۂ سخت ناخنِ فکر سے نہ ہرگز سلجھ سکیں گے جو لوگ "آئینِ نظم" سمجھے ہوئے ہیں یہ بھی سمجھ سکینگے
کہ انتظامِ حیاتِ دوراں نہیں ہے طفلانہ بات کوئی ہزار اسرار ہیں، گھروندا نہیں ہے یہ کائنات کوئی

کتابِ ہستی کی شرح کرنا تو پھر بھی اک بات دور کی ہے
اگر تمھاری نگاہ تنظیمِ خانہ داری سمجھ رہی ہے

تو یہ سمجھنا نہیں ہے مشکل کہ انتظامِ حیات کیا ہے یہ حشرِ اختلاف کیوں ہے یہ شورشِ کائنات کیا ہے
کبھی ضرورت کا اقتضا ہے کہ اپنی تکلیف تک بھلا دو کہیں ہو مجبور تم کہ اپنے ہی راحتِ جان کو خود سزا دو

کسی کی جانب ہی اسقدر التفات، احسانکی بارشیں ہیں
کسی سے اسدرجہ برہمی ہے کہ تلخ تر آزمائشیں ہیں

کبھی بہ احساسِ شوخ طبعی، کسیطرح کا گلہ نہیں ہے کہیں بہ دعوائے صلح جوئی انھیں کوئی اعتنا نہیں ہے
کچھ اور وسعت ہو گر نظر میں تو سلطنت کا نظام دیکھو جہانِ فانی کے پاسبانوں کا شیوۂ اہتمام دیکھو

بہت حقائق نہیں گذرتے خواص کی حدِ مختصر سے
بہت مسائل چھپائے جاتے ہیں، عام کی سطح بیں نظر سے

خواص بھی جن سے بیخبر ہوں ہزار ایسے اُمور بھی ہیں قریب کے دلفریب منظر جو غور کیجئے تو دور بھی ہیں
مدبرانِ جہان سے فکرِ عروج و رنجِ زوال پوچھو جو ان معارف سے آشنا ہیں۔ انھیں سے کچھ انکا حال پوچھو

گراں ہو تم پر اگرچہ بزمِ لطیف پودوں کی پائمالی
نمو کے اسرار جان سکتا ہے خود مگر پختہ کار مالی

کسی کی صبر آزما فغاں پر، تمھاری آنکھوں سے خون ٹپکا مگر جو پنہاں ہے بطنِ فطرت میں، تمکو اس راز کی خبر کب
بہارِ گلپوش، آتش افگن خزاں میں تبدیل ہو رہی ہے مگر تمھیں کیا خبر کہ اس میں چمن کی تکمیل ہو رہی ہے

تم اپنی پستی کا راز سوچو، ہوس ہے گر سربلندیون کی
کہ خودشناسی کی تہ مین پنہان کلید ہے فتحمندیون کی

زوال ہے ایک قوم کا جو وہ دوسری کا عروج بھی ہے　　اسی شب تار کے دھوئین مین سحر کی ضو مسکرا رہی ہے
حیات خوش مرگ تلخ، سب مین غرض کوئی مصلحت ہے پنہان　　کہ رہنمائے شگفتگی ہے چمن کا شیرازہ پریشان

یہ منتشر کائنات وقفِ ارادہ انتظام بھی ہے
جسے سمجھتے ہو ابتری تم اسی مین اسکا نظام بھی ہے

رہین ایجاد و اختراع دماغ انسان خدا نہین ہے　　یہ کھل گیا اب کہ صرف "ترویج" خیر اک مدعا نہین ہے
خدا ہے اک "مستقل حقیقت" جو خالق کائنات بھی ہے　　جہان فانی کا مہتمم بھی ہے حکمران حیات بھی ہے

حریم گلزار زندگانی کی آپ تزئین کر رہا ہے
"خدا" تصور ہی محض جسکا دلون کی تسکین کر رہا ہے

جو گوش دل سے کبھی سنوگے تو پاؤگے یہ ازل سے ابتک　　کہ اک صدا آ رہی ہے موج ہوائے دشت و جبل سے ابتک
جو روح کی تہ مین سونیوالی حسون کو بیدار کر رہی ہے　　اثر مین ڈوبی ہوئی ہے اتنی دلونکو سرشار کر رہی ہے

کچھ اس لطافت سے یہ سرود رباب فطرت گذر رہا ہے
کہ ذرہ ذرہ جہان فانی کا آجتک وجد کر رہا ہے

کسی نے سمجھا کہ سینۂ سنگ مین یہ دلکش نوا چھپی ہے　　کسی نے جانا کہ موج آب روان کی تہ سے ابھر رہی ہے
کسی نے سورج کی شوخ کرنون کے رقص مین اسکی جستجو کی　　کسی نے آتش کو "مظہر نور" جان کر اسکی آرزو کی

خدا نہین گر تو پھر تلاش خدا مین یہ کارزار کیون ہے
اگر یہ فطرت نہین تو انسان کی روح پھر بیقرار کیون ہے

زمین کی تاریکیون مین خورشید جلوہ گستر کہان سے آیا　　خدا نہین گر تو پھر خیال خدائے برتر کہان سے آیا
جو حاملان پیام حق تھے، کچھ انکی طرز حیات دیکھو　　جنھون نے ڈھونڈھا جنھون نے پایا خدا کی راز الوہیت کو

زبان پہ درس ہوش، سرتاقدم، مگر بیخودی سی طاری
نگاہ پیغام صلح، سینہ مین، سر فروشانہ بیقراری

غم مسلسل کی تلخ کامی، جما ہوا قلب امتحان پر   ہجوم باطل کی سخت گیری، صدائے حق آگئی زبان پر

وہ جنکے انداز بیخبر نے جہان کو ہشیاریان عطا کین   وہ جنکی اک جنبش نظر نے دلون کو بیداریان عطا کین

ازل سے بھٹکے ہوئے گروہون کو جادۂ حق دکھانیوالے

اشارۂ چشم سے بہائم کو رشک انسان بنانیوالے

وہ جنکی ہر بات معرفت کیلئے اک آئین معتبر ہو   وہ جن کا ہر فعل قدسیت کے اصول محکم سے بہرہ ور ہو

فریب تھا انکا ادعا کیا، اگر یہ بازیچۂ زبون تھا   یہ لوگ سمجھے نہ تھے خدا کو تو اسقدر اعتراف کیون تھا

جو ہر برائی سے احتراز اتم کی راہین بتا رہے ہون

ہزار صبر آزما مصائب شعار حق مین اٹھا رہے ہون

ضمیر انسان کو باطل افروز ظلمتون سے بچانیوالے   جو "نشر حق" کے لئے بنے ہون وہ کیا کسیکو فریب دینگے

ہزار ہو پھر بلندی نشیب آخر نشیب ہوگا   وہ خیر ہی کیلئے سہی پھر فریب آخر فریب ہوگا

یہ سچ ہے بے امتیاز دانش جو طے ہون ایسے کام بھی ہین

سپہر جہان عقل ڈالتی ہے مگر کچھ ایسے مقام بھی ہین

بہت ہین وہ مسئلے جنھین ہم نہ جاننے پر بھی جانتے ہین   تمھین بتاؤ کہ تم مین کتنے "کشش" کا اسرار جانتے ہین

بشر کا میمون نژاد ہونا طبیعتون پر گران نہین ہے   اگرچہ ہر شخص اس "گمان عجیب" کا رازدان نہین ہے

غرض ہمین ماننا پڑے گا علوم ہین بیشمار ایسے

کہ باہمہ عجز ناشناسی کیا ہی اقرار جن کا ہم نے

نہین ہے یہ کوئی راز پنہان کہ اس سے ہر شخص آشنا ہے   ہم اسلئے مانتے ہین انکو کہ ایک ماہر یہ کہہ رہا ہے

تو اے مخالف، جب اسپہ مبنی ہے اعتراف علوم دنیا   معارف "علم حق" مین انکار کا تجھے حق کہان سے پہونچا

یہ کس قدر حیرت آفرین ہے کہ عیب اسمین نکل رہے ہین

جو ماہران رموز باطن خدا کی تعریف کر گئے ہین

ضعیف دل اقتضائے فطرت سے عزم بیکار کر رہا ہے   یہ خاک کا اک حقیر پتلا خدا کا انکار کر رہا ہے

ہوئی وہ فردوس دور گیتی، کبھی جو تھی ریگ زار دنیا   عرب کے وہ مضطرب مناظر، عرب کی وہ بیقرار دنیا

رموزِ حق جب ہوئے نمایاں، جماعتِ بادیہ نشین پر
سحابِ رحمت نے بڑھ کے غنچے کھلائے تپتی ہوئی زمین پر
ہوئے وہی رہنمائے منزل کبھی جو گم کردہ راہ بھی تھے　　رہِ حقیقت سے دور، باطل کی ظلمتوں میں تباہ بھی تھے
ابھی جو سیلابِ خونِ انسان سے پیاس اپنی بجھا رہے تھے　　وہی پیامِ سکون و راحت جہان کو پیہم سنا رہے تھے
کیا حقیقت سے جس نے آگاہ، عظمتیں ہیں تمام اُس پر
فدا بہ فرقش ابی و اُمی۔ درود اُس پر سلام اُس پر

علی اختر۔ اختر

صبح کا منظر

(رام گنگا کے پل سے گذرتے ہوئے)

وداعِ ظلمتِ شب ہے گجرِ صبحِ منور کا
فلک نے اپنے چہرہ سے نقابِ شب الٹ دی ہے
چمک تاروں کی۔ رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی جاتی ہے
کبھی کویل کی کو کو اور نسیمِ صبح مل مل کر
کبھی چرخِ چہارم پر دماغِ عجز ہو پہنچا ہے
سپیدۂ صبح کا اور جنگلوں کی خشک تر گھاسیں
سحر کے اٹھنے والے اٹھ رہے ہیں یاد میں کس کی؟
چلا دہقان اپنا ہل اٹھا کر کھیت کی جانب
گیاہِ پُرسکوں کو مضطرب کرنے کی ٹھہرائی
کبھی اونچے درختوں کی جھکی شاخوں پہ مونہہ موڑا
ضیا پاشی پہ خورشیدِ درخشاں آ چلا اپنی
بکھیرے بال کرنوں کے۔ رخِ روشن کو چمکائے

چراگاہوں کو اٹھے قافلے ان بے زبانوں کے
منور ہوتا جاتا ہے جہاں آہستہ آہستہ
اُفق پر۔ شرق میں۔ نورِ سحر کی جلوہ ریزی ہے
اُسی پہلے فلک پر آنے والے کی ثنا خواں ہے
کہ قربانت شوم۔ اے دو جہاں کے روشنی والے
خدا جانے یہ کس منظر کا حیرت زا نظارہ ہیں
دلوں میں کس کی بیچینی۔ زباں پر کس کا چرچا ہے؟
کوئی محوِ تماشائے سحر۔ کچھ گنگناتا ہے
چلے ہیں قافلے ڈھوروں کے جنگل کو۔ اٹھائے سر
کہیں دو چار تپے لیلئے۔ ننھے سے پودھوں کے
اُفق پر مطلعِ انور سنہرا ہوتا جاتا ہے
وہ محبوبِ سحر آ ہی گیا۔ سورج جسے کہیے

عجب ندازسے بڑہنا عجب انداز سے چڑہنا کہ دل محو تماشائے خرام مہر تابان ہے
کوئی شاعر نگار آتشین رخ - اسکو کہتا ہے کوئی وارفتۂ رفتار - یون وقف ترنم ہے

پریشان کاکل و آغوشش و استانہ می آئی
فدایت جان و دل بادا - چہ بے باکانہ می آئی

شوق - مرادآبادی

محبت کا پہلا گیت

کسی کی الفت مین کھو گیا ہون کسیکو اپنا بنا رہا ہون کبھی خیالی مجسمہ کا حسین نقشہ جما رہا ہون
فنا کے نغمے سنا رہا ہون، فنا کی تان اڑا رہا ہون مین اپنی ہستی مٹا مٹا کر دوئی کا پردا اٹھا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

کبھی ہے ذرہ نظر مین دنیا کبھی ہے دنیا نظر مین ذرہ کبھی ہے بیگانہ تجھ سے دنیا، کبھی مین پاتا ہون تجھکو ہر جا
کبھی محبت سے تیری نفرت کبھی اداؤن کا تیری شیدا غرض یون ہی مین بقا کی کشتی عدم کی جانب بڑہا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

غم و الم پر ہے میرا تکیہ، مصیبتون سے ہی مجھکو راحت کبھی مین راحت سے بھاگتا ہون، کبھی ہون مجبور فکر عشرت
فضا کا رہتا ہون منتظر مین بقا سے ہوتی ہے مجھکو وحشت زمین کے نیچے نظر سے پنہان مین اپنا مسکن بنا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

کسی کے گلگون لبون کا شیدا کسیکی ترچھی نظر کا بسمل کسی غزالہ کا قتل کردہ کسی کی قاتل ادا پہ مائل
کسی کی صورت نظر مین رقصان کسیکے جلوہ کا دل سے حاصل کسیکی جادو بھری نظر سے مین اپنی نظرین لڑا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

مری صداؤن مین ہے ترنم ہر اک تنفس ہے میرا نغمہ ہر اک رگ جان رباب سامان ہر ایک جنبش سے درد پیدا
سراسر اک دل ہے میری ہستی مجسم اک حادثہ ہون گویا مین رشتۂ سوز و ساز بن کر خدا سے سبکو ملا رہا ہون
فنا کے نزدیک جا رہا ہون فنا کے نزدیک جا رہا ہون

سلطان محمود ساز اجمیری

مارچ کی ایک دوپہر
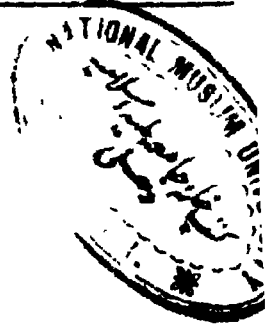
ابر سے عریان ہے اب یہ مرغزار نیلگون
ہر طرف گاتی ہے مستی مین بہار نیلگون
نغمۂ رنگین سے میرا سازِ دل معمور ہے
جسطرف اُٹھتی ہین آنکھین اک جہانِ نور ہے
یعنی سنتا ہون ترنم ہائے مہر نیم روز
ہر شعاع نغمہ ہے مجھکو بہار دل فروز

شور آبادی سے دور اک گوشۂ گلزار مین
آکے بیٹھا ہون سکوتِ سایۂ اشجار مین
مہرِ عالمتاب اوڑھے اک ردائے زر فشان
دیکھتا ہے بامِ گردون سے تماشائے جہان
نیند مین ہین پتیان گل سطرح ہین محو خواب
رات بھر جیسے سُنی ہو داستانِ ماہتاب
گا کے رکھ دیتا ہے مطرب ہاتھ سے جسدم ستار
دیر تک ہلتا ہے جوش نغمہ سے اک ایک تار
کانپتی ہے جوش بیتابی سے یون ہی کل فضا
جسم پر پہنے ہوئے زرین شعاعون کی قبا

اوڑھ کر ہلکی ردائین اُڑ رہی ہین تتلیان،
ہو فضائے گل مین رقصان جیسے رنگین بجلیان
یا ہواؤن مین اُڑاتے اپنے گلگون بادبان،
تیرتی ہین نور کے دریا مین ننھی کشتیان،
دیکھ کر تجھکو چمن مین اے بہار رنگ و بُو،
میرے دل مین کوندتا ہے اک شرار رنگ و بُو،
یاد آتی ہے مجھے وہ عہد طفلی کی بہار،
دیکھ کر جب تجھ کو اے رقاصۂ نیرنگ کار،
تیرے پیچھے دوڑتا تھا دشت مین گلزار مین،
چوٹیون پر کوہ کی اور دامن کہسار مین

اک بہارِ حسن اس وحشت مین بھی رقصندہ ہے
لیکن اپنے نغمۂ خاموش مین تابندہ ہے
جس طرح دست صبا مین جام صہبائے شمیم
یا حریم بزم گل مین حسنِ رخسار نسیم،
اپنے ہر پیرایۂ اظہار مین مستور ہے،
تو خود خواب سے اے خواب کتنی دور ہے

شمیمی

نگار

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۸)	اگست سنہ ۱۹۳۲ء	شمار (۲)

ملاحظات

میں نے گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں بہ سلسلۂ تنقید رسالۂ "قیام الدین" وعدہ کیا تھا کہ اس مہینہ کے رسالہ میں جناب عبدالماجد صاحب دریابادی سے خطاب کرکے بتاؤں گا کہ "یاجوجی" قوت جو آج کل جہات ستہ میں اُنھیں ہر جگہ نظر آرہی ہے۔ اور جس کا ذکر بار بار اُن کی زبان پر آجاتا ہے وہ فی الاصل کہاں پائی جاتی ہے اور اُسکی حقیقت کیا ہے۔

حال ہی میں حبب الناظر پریس سے ضمانت طلب ہوئی اور اخبار سچ کو بند کرتے ہوئے اُس کے فاضل مرتب و محرر نے اس کا اعلان کیا تو اس کے عنوان میں بھی یاجوجی قوت کا ذکر تھا، اس لئے یہ انکشاف میرے لئے بالکل جدید تھا کہ جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کی مراد یاجوجی قوت سے صرف وہی قوت نہیں ہے جو اُنکے مزعومات مذہب و ایمان کے خلاف تنقید کرے بلکہ اس میں حکومت وقت بھی شامل ہے جو آزادی ملک و وطن کے جذبات کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کل کوئی اور واقعہ جناب دریابادی کے خلاف مزاج ظاہر ہو اور وہ اُس کو بھی "ایں ہم بچہ شتر ست" لکھکر یاجوجی قوت سے نامزد کریں۔ اس لئے بغیر اس کے کہ میں اس لفظ کی اُس تمام وُسعت و عمق سے بحث کروں جو صرف جناب دریابادی کے ذہن و دماغ میں پائی جاتی ہے، صرف اس پہلو سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق (ان کے پندار میں) دہریت و لامذہبیت سے ہے۔

اصولاً سب سے پہلے یہ متعین کرلینا چاہیئے کہ "دہریت و لامذہبیت" کس کیفیت کا نام ہے۔ ہر چند یہ تعین ہمارا فرض نہیں ہے بلکہ اُن کا فرض ہے جو یہ الزام قائم کررہے ہیں، تاہم بحث کو بغیر کسی استفسار و مزید انتظار کے شروع کردینے کے لئے ضرور ہے کہ

ہیں اس کا مفہوم بھی متعین کر دیں ـــــ اگر جناب عبدالماجد صاحب کی مراد اس سے تمام وہ آبادی دنیا کی ہے جو مسلمان کے لقب سے یاد نہیں کی جا سکتی (کیونکہ وہ ایک مخصوص طریق عبادت کی پابند نہیں ہے۔ شریعت اسلام پر عامل نہیں ہے) یعنی اگر "دہریت ولا مذہبیت" سے اُن کا مقصود صرف لا اسلامیت و غیر مسلمیت ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بہت پرانی چیز ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ وہ "عہد رسالت" میں اب سے کہیں زیادہ پائی جاتی تھی، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد اُسوقت بہت کم تھی۔ اور اب اس سے بدرجہا زائد ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد اُن کی دنیا کا وہ موجودہ میلان ہے جس نے نہ صرف مذہب اسلام بلکہ تمام مذاہب کی طرف سے انسان کو بے پروا و مستغنی بنا دیا ہے، تو یہ ورد ایسا معمولی نہیں ہے کہ اس کا علاج اس کو صرف "یاجوجی قوت" کہہ کر بڑا کہہ دینے، یا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوسنے دینے سے ہو سکے۔ سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہیئے کہ ارتقاء مذاہب کا فلسفہ کیا ہے۔ ترقی تہذیب و تمدن کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے، عہد حاضر کی ذہنیت کا ساتھ دینے کے لئے مذہب کس حد تک تیار ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ اگر مذہب کی ضرورت اب بھی باقی ہے تو کیوں؟

میں عبدالماجد صاحب دریابادی کو نہایت ہی راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتا ہوں، لیکن اسی قدر جہاں تک "اشدّاءُ علی الکفار" کا تعلق ہے۔ ممکن ہے "رحماءُ بینہم" کا بھی کوئی قابل ذکر واقعہ ان کی مذہبی، سیاسی اور انسانی زندگی میں پایا جاتا ہو، لیکن کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اُن کی حیات کا سب سے زیادہ عظیم الشان تبلیغی یا مذہبی کارنامہ اخبار سچ کا اجراء تھا۔ لیکن اس نے اپنی ساری عمر اسی تنقید و تنقیص میں بسر کر دی، کہ مغرب میں اسقدر شراب پی جاتی ہے، اس حد تک قمار بازی ہوتی ہے، اتنے جرائم ہوتے ہیں، یہ اعداد و شمار مظالم کے ہیں، اور اتنی بے حیائیاں موجودہ تہذیب و تمدن میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی اس امر پر غور نہیں کیا گیا کہ دوسروں کے نقائص کے اظہار سے اپنی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور اگر اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان ذمیم حرکات کے بُرے نتائج دکھا کر احتراز کی تعلیم دی جائے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ جس قوم کی بُرائیاں کیجاتی ہیں، اُن کے محاسن بھی پیش کئے جائیں۔ اور اُن کے اختیار کرنے کی تعلیم دیجائے۔ بہر حال عبدالماجد صاحب نے اخبار سچ کے ذریعہ سے دوسروں کی بینائی کا نقص تو ضرور ظاہر کیا۔ لیکن اپنی آنکھ کے شہتیر کی طرف کبھی نگاہ نہیں کی۔ اور اسی لئے اس میں بجائے مصلحانہ رنگ ہونے کے ہمیشہ جارحانہ کیفیت پائی گئی۔ اور عام طور پر یہی ہوتا بھی ہے کہ انتہائی مجبوری و بیکسی میں زبان پر گالیاں ہی آتی ہیں، اور انھیں سے کمزور فطرت انسانی اپنی تسکین کر لیا کرتی ہے۔

میں جناب عبدالماجد صاحب کے جوش مذہبی اور خلوص نیت کا معترف ہوں، لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جو طریق کار اُنھوں نے اختیار کیا وہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے نادرست تھا اور جن خیالات کے ماتحت اُنھوں نے تبلیغ کی وہ بڑی حد تک تنگ و پست تھے۔ ان کو سب سے پہلے غور کرنا چاہیئے تھا کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا تھا اور عہد حاضر کے مبلغین کس طرح اُسے پیش کر رہے ہیں اور اب جبکہ علوم و فنون کی ترقی نے تمام دنیا کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر کے مذہب

کی ضرورت کو بالائے طاق رکھدیا ہے۔ کیونکہ انھیں اسطرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے یورپ کی بادہ خواریوں کے افسانے تو بیان کئے۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مسلمانوں کے بے پئے ہوئے بہک جانے کا سبب کیا ہے۔ اُنھوں نے مغرب کی تمام اخلاق شکن روایات کے ظاہر کرنے میں تو سارا زورِ قلم صرف کر دیا، لیکن خود اپنے اخلاق کے اسباب خرابی متعین کرنیکی جرأت کبھی اُنھوں نے نہیں کی۔ اُنھوں نے تمام یورپ کو تو معصیت کدہ سمجھ کر سب و شتم کا بازار گرم کر دیا، لیکن اپنے ہاں کے اکابر ملت کے خلوت کدوں کا ذکر کبھی نہیں کیا، جن کی طہارت و عصمت کی داستانیں اور جن کی قدوسیت وللٰہیت کے افسانے یورپ کے کسی بڑے سے بڑے "عشرت کدہ" کو منفعل کر سکتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب کی طرح میں بھی اسی امر کا خواہشمند ہوں، کہ یہ قوم ترقی کرے، اس کے اخلاق درست ہوں، اور موعودہ خلافت ارض اس کے ہاتھ آئے، لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے مولانا زیادہ تر اپنا وقت اس سعی میں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کے معائب کو ظاہر کر کے اپنے نقائص کو ہلکا ثابت کیا جائے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تنقید گھر ہی سے شروع ہو اور سب سے پہلے "غریب خانہ" ہی کو دیکھا جائے کہ اس کے "مشرق" میں کتنا "مغرب" چھپا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جرأت اخلاق جو غیروں کے اصلاح میں صرف کی جاتی ہے۔ اُس سے خود اپنی ہی جماعت کی تہذیب کا کام کیوں نہیں لیا جاتا۔ اور وہ قوت احتساب جو تمام اقطاع مغرب کے حالات کو محیط ہے اُس کو خود اپنے اور اپنی جماعت کے اوپر کیوں استعمال نہیں کیا جاتا۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف

افسوس وہ دل ربا ادائیں،

جناب دریابادی خلافت کمیٹی میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جمعیۃ العلماء کی مجلس میں بھی ان کو کافی درخور حاصل ہے، کانگرسی خیال کے لوگوں میں بھی وہ نامقبول نہیں ہیں، اس انجمن کے بھی وہ رُکن ہیں جس نے لامذہبیت و دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے فرنگی محل کے منبر و محراب پر اسی سال انگڑائی لی ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد خیال، آزاد مقال، نقاد مذہب و دین بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کیا اُن کی ان تمام حیثیات بلند کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمیں حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ کہ کبھی اُنھوں نے اخبار سچ کے ذریعہ سے نہ جمعیۃ العلماء کے ارکان کو اُن کی فرض شناسی کی طرف توجہ دلائی نہ کانگرس کے مطمح نظر کو سامنے رکھکر اُنھوں نے عملی قدم اُٹھایا اور نہ کبھی اس امر کی جستجو کی کہ دنیا میں لامذہبیت کیوں پھیلتی جا رہی ہے، اور ان تمام خرابیوں کا علاج کیا سوائے یورپ کو بُرا کہنے کے۔ کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے وہ نابلد نہ ہوں گے، وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایک مصلح یا پیغمبر کی مسجع و مقفےٰ گفتگو کو کبھی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ نہیں سمجھا گیا، وہ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات پاؤں توڑ کر مقدونیہ میں بیٹھے رہنے سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے بھی بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اکاسرۂ عجم کی قوت صرف وعظ

وتلقین سے پارہ پارہ نہیں ہوئی۔ اور بہ حیثیت ایک صوفی انسان ہونے کے اُن سے زیادہ کون اس حقیقت کا رمز شناس ہو سکتا ہے کہ

رہرو کعبہ بشارت ز قبولش نہ دہند
جز بداں خار کہ از بادیہ در پا ماند

اس لئے وہ کون چیز ہے جو میدانِ عمل میں قدم اُٹھانے سے اُنھیں باز رکھتی ہے اور اس کانٹے کے چُبھنے سے کیوں اُن کے پانوں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے، جس کی خلش حاصل کئے بغیر منزل تک پہونچنا محال ہے۔ وہ کیوں اپنی قوت تنقید سے اُس جماعت کو ختم کر دینے کا کام نہیں لیتے، جس کے طویل جُبہ و عمامہ میں قوم کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار اندر ہزار پنہاں ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے اِن "علمائے کرام" اور "مولویان عظام" کو صفحۂ زمین سے محو کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جنھوں نے اپنے اعمال ردیہ اور افعال سخیفہ سے عالم اخلاق کو سوگوار اور دنیائے نہضت و عمل کو حزین و ملول بنا رکھا ہے۔ وہ اب اس حد سے گزر گئے ہیں کہ اُن کی اصلاح ہو سکے، اُن کی ذہنیت کی پستی اب کبھی اُس بلندی کی طرف نہیں آسکتی جو کسی وقت اسلام کی خصوصیت خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہماری جماعت کا ایک ایسا عضو ماؤف ہیں جس کا قطع کر دینا ہی تنہا علاج ہے، اس لئے اب اگر کوئی سعی کامیاب ہو سکتی ہے تو صرف اسی صورت سے کہ پہلے اس جماعت کو منہدم کیا جائے۔ راہ کو اس خارزار سے صاف کیا جائے اور بالکل جدید اُصول سے، از سرِ نو اس درس کی یاد تازہ کی جائے۔ جو ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے یکساں مشعل راہ ہو سکتا ہے اور وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لب و لہجہ اور طریق استدلال میں تبدیلی پیدا کی جائے اور اس طرح اُس لچک کو قائم رکھا جائے جو ایک فطری مذہب میں ہونا چاہئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ماجد بھی میری ہی طرح

ہرچہ بینند بہ عنوان تماشا بینند

اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ میں "بہ من شراب و بہ زہاد مژدۂ تسنیم" کی مفاہمت پر قانع نظر آتا ہوں اور وہ غریب اس لطف سے بھی محروم ہیں۔

میں نے ابتداءِ ملاحظات میں اس یاجوجی قوت سے بحث کرنے کا وعدہ کیا تھا جس کے خلاف فاضل دریابادی اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، لیکن سلسلۂ کلام میں، بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی اور اصل مقصود پر گفتگو نہ ہو سکی، علاوہ اس کے یوں بھی ملاحظات کے محدود صفحات اس کو انجام تک پہونچانے میں کامیاب نہ ہوتے اس لئے میں اس مہینے اس کو ملتوی رکھتے ہوئے آیندہ کے لئے اُن عنوانات کی تعیین کئے دیتا ہوں۔ جن پر بہ سلسلۂ ملاحظات یا کسی مستقل مضمون کی صورت میں مجھے بحث کرنا ہے۔ سب سے پہلے میں مذاہب کے فلسفۂ ارتقاء پر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد مذہب سے بغاوت کے اسباب پر غور کروں گا اور پھر یہ کہ مذاہب کا مستقبل کیا ہے یا یہ کہ مستقبل میں مذہب کے بقاء کی کوئی صورت ہے یا نہیں، میں چاہتا

ہوں کہ اسطرح ایک بار اور ہمیشہ کے لئے اپنے خیالات ظاہر کردوں تاکہ ناظرینِ نگار کو میرے حقیقی مقصود کے سمجھنے میں آسانی ہو اور انھیں معلوم ہوسکے کہ یاجوجی قوت کا سرچشمہ حقیقتاً کہاں پایا جاتا ہے۔

آجکل ہندوستان جس حالت منتظرہ سے گزر رہا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ اور ملک کی سیاسیات نے جو صورت اختیار کی ہے وہ اہل نظر کو معلوم ہے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا دنیا کا نیا واقعہ ہے، کیا تاریخ عالم میں کسی ملک کے اضطرار و اضطراب کے وقت کبھی وہ کچھ نہیں ہوا جو اب ہو رہا ہے؟ نہیں، ہمیشہ یہی ہوا ہے جو اب ہو رہا ہے ....

....

یہ حقیقت تسلیم ہو چکی ہے کہ دورِ سرمایہ داری اب روئے زمین پر کسی جگہ قائم نہیں رہ سکتا، اور نوعِ انسانی خواہ وہ افریقہ میں ہو یا قطب شمالی میں اپنے اس فطری حق کے لئے بیتاب ہے۔ جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ ملک جس کو آج بیدار ہو جانا چاہئیے۔ کل بیدار ہو، اور وہ جو کل بیدار ہو چکا ہے اس کو اس سے قبل بیدار ہو جانا چاہئیے تھا، لیکن یہ ناممکن ہے کہ اب تقدم شخصی قائم رہے۔

دنیا میں ہمیشہ دو قوتیں پائی گئی ہیں، ایک وہ جو .... اپنے اہرمنی اغراض کو پورا کرتی ہے اور دوسری وہ اخلاقی قوت جو بغیر کسی جسمانی یا مادی استحکام کے زمانہ کا مقابلہ کرتی ہے، پھر ایسا تو ہوا ہے کہ جب ایک قوم کا اخلاقی احساس محو ہو گیا تو قہرمانیت اس پر غالب آگئی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک قوم کے اخلاق میں بیداری پیدا ہوئی ہو اور استبدادیت عرصہ تک قائم رہ سکی ہو۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا اسوقت ہندوستان بیدار ہو گیا ہے، کیا اس میں اپنی ذلت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا جواب آسان نہیں۔

اگر ملک سے مراد اس کی وہ تمام مختلف الخیال ومختلف المذاہب آبادی ہے جس کو حقیقتاً بہ لحاظ وطنیت ایک ہی سررشتہ سے وابستہ ہونا چاہئیے، تو ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں،

لیکن اگر اس سے مراد کوئی خاص آبادی یا جماعت ہے، تو ثبوت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ....

.... وہ قومیں بھی جنھوں نے صرف تماشائی کی حیثیت سے ان تمام مناظر کا لطف اٹھایا ہے اس سے آگاہ ہیں۔

یہ درست ہے کہ قوم اپنی جگہ خواہ کتنی ہی حساس کیوں نہ ہو، لیکن ہمیشہ سے اسکو کسی قائد ورہنما کی ضرورت ہوئی ہے

اور اقدام ورجعت میں بڑا حصہ رہنماؤں اور لیڈروں کا ہوا کرتا ہے، اس لئے اگر اس نظریہ کو سامنے رکھکر غور کیا جائے تو ہم آسانی سے دو جماعتوں کے مستقبل پر حکم لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک جماعت وہ ہے جس کی رہنمائی گاندھی، نہرو پٹیل وغیرہ کر رہے ہیں۔ اور دوسری وہ جسے محمد علی، شوکت علی، شفاعت احمد خاں وغیرہ کی سیادت نصیب ہوئی،...

. . . .

. . . . اب معلوم نہیں دنیا ان دونوں میں سے کس کی حماقت پر حکم لگائیگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے کسکو مستحق آفرین و مبارکباد قرار دیا جائے گا۔

حکومت برطانیہ کے اس احسان کو کبھی ہندوستان فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کی دماغی تہذیب و تربیت اُسکی تعلیمی و ذہنی ترقی حکومت ہی کی ممنون ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ رعایا کے مطالبات اور ارباب ملک کی خواہشات کا خیال رکھا۔ اگر آج بجائے برطانیہ کے... کوئی دوسری مستبد حکومت یہاں ہوتی تو تحریک آزادی و انقلاب کو کبھی اس حد تک بڑھنے نہ دیا جاتا، لیکن چونکہ حکومت ہند ایک خاص آئین کی پابند ہے۔ اس لئے وہ کبھی اُس کے خلاف کوئی عمل نہیں کر سکتی، اور وہ پوری احتیاط کے ساتھ ملک کی صلاحیت پر غور کر رہی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ملک کے صحیح و جائز مطالبات کو رد کردے اور قوم اس باب میں کیوں اسکی طرف سے مایوس ہو . . . .

. . . .

. . . .

آیندہ ماہ میں آصفی نظامی ختم ہو جائے گا۔ جناب خان امتیاز علی عرشی نے جس کاوش سے اس مضمون کو مرتب کیا ہے وہ یقیناً مستحق ستائش و آفرین ہے، لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آصفی نظامی نے اپنے تمام مقاصد قاآنی و عرفی کو سامنے رکھکر کیوں لکھے اور اس "تتبع و تقلید" سے ہٹ کر کیوں اُنھوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا اور اگر لکھا تو کس حد تک کامیاب ہوا۔ افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "بحث سنت" اس مہینے میں ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب اسکا جواب دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ جہاں تک لفظی بحث کا تعلق ہے، وہ کوئی مفید چیز نہیں خواہ فیصلہ مولانا سید سلیمان کے حق میں ہو یا سید مقبول احمد صاحب کے حق میں لیکن معنوی بحث ضرور قابل توجہ ہے۔ ہر چند اسوقت میں کوئی گفتگو اس باب میں نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن مولانا سے اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ جن اُصول کے ماتحت وہ احادیث کے نظری ہونیکے قائل ہیں، کیا اُنکی بناء پر کبھی کوئی ضعیف سی کوشش اُنھوں نے اس طرف کی

کی ہے کہ وہ احادیث کو منتخب کرکے صرف بخاری ہی کا ملخص پیش کر دیتے تاکہ احادیث کے باب میں جو نزاع اسوقت پیش ہے وہ دور ہو جاتی۔ قرآن کے لطائف ادبیہ پر ہمارے فاضل دوست مولوی عبد المالک آروی جو کچھ لکھ رہے ہیں اسکے متعلق میں زیادہ مدحانہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ عبد المالک کا اکتشاف "نگار" ہی نے کیا ہے اور اپنی چیز کو اچھا کہنا مشرقی تہذیب میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

جناب اعظم کریوی کا فسانہ الصاف اُنکے رنگ سے علیحدہ نہیں ہے وہ رنگ ابھی مکمل نہیں ہے۔ نوجوان شہزادہ آسکر وائلڈ کے افسانہ کا ترجمہ ہے اور بالکل "وقت و موسم" کی چیز۔ محمد باقر نسیم کا مضمون معاشیات پر گو بالکل ابتدائی ہے لیکن غیر اہم نہیں۔ شطرنج والا مضمون بھی بُرا نہیں ہے۔

قدر کا غیر مطبوعہ قطعہ جناب نواب عقیل جنگ بہادر (حیدر آباد) کا عطیہ ہے جو مولانا ہوش کے وساطت سے پہونچا ہے۔ شام نشاط میں ہمارے عزیز دوست مولوی علی اختر صاحب نے جس انداز سے اپنے شباب کی ماتم داری کی ہے، اُس جتنی بھی ہمدردی صاحب موصوف سے کی جائے کم ہے۔ جان حزین میں ہمارے محترم دوست امین حزین نے اپنے مشن کو پوری طرح ظاہر کیا ہے اور نیرنگ نمک سازی میں مولانا امید امیٹھوی نے حسن حسن کیساتھ بیک وقت اقدام و احتراز دونوں کا جس ساتھ ساتھ دیا ہے وہ اللہ جانتا ہے کس درجہ کے انسان کے بس کی بات تھی۔ اس نظم کی فارسیت اس عہد میں کس قدر عجیب و غریب چیز ہے۔ مغزلوں کا ذکر جا بجا ہی ذکر اس طرح کئے دیتا ہوں کہ "ماشاء اللہ خوب فرمایا ہے"۔

نیاز

کتاب فلسفۂ مذہب تیار ہے

اور ۲۰ اگست سے روانگی شروع ہو جائیگی

جن حضرات کے آرڈر اس سے قبل آچکے ہیں۔ وہ براہ کرم پھر یاد دہانی کریں، کیونکہ یہاں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ بصورت دیگر تعمیل نہیں ہو سکتی۔

یہ کتاب ۲۰×۲۶ تقطیع کے گیارہ جزو کو محیط ہے اور قیمت معہ محصول عہ رکھی گئی ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

خاقانیِ ہند، قاآنیِ عصر علامہ آصفی نظامی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فخریہ

فخریہ مین اپنے کمالات کا اظہار، حریفون کی جہالت اور کم علمی، زمانہ کی شکایت، اور ابنائے عصر کی قدر ناشناسی کا شکوہ ہوتا ہے۔ گو اس صنف مین قدما اور متوسطین کے ہان بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔ جن مین خاقانی سرگروہ ہین۔ مگر فیضی اور عرفی نے خود بینی، خود ستائی، اور تعلی کا ایک مستقل جہان پیدا کر دیا ہے۔ جو شخص حسب و نسب پر اسقدر نازان ہو، کہ اپنے مقابلہ مین دنیا کو ہیچ خیال کرے، وہ علم و فضل پر جسقدر بھی فخر کرے، بجا ہے جسکی خودی اور کوتاہ بینی کا یہ عالم ہو۔ کہ امرا تو درکنار خود بادشاہ کے سامنے بھی بمشکل سر نیاز خم کرتا ہو، وہ جو کچھ کہے، درست ہے۔

فیضی کا کلام سر دست مہیا نہین۔ صرف عرفی سے تقابل کرکے، مولانا کا پایۂ سخن ظاہر کرتے ہین۔ روشن دماغ کیلئے اسقدر بھی زائد ہے۔ منکرین اور جاحدین کو خدا بھی خوش نکر سکا۔

عرفی نے دو قصیدے لکھے ہین۔ ایک کی صرف تشبیب اور دوسرا تمام فخریہ ہے۔ چونکہ آصفی کی تشابیب طویل ہوتی ہین۔ اسلئے ہمکو صرف ہمقافیہ اشعار پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ پہلے دو چار شعر "انانیت" کے سن لو

عرفی لکھتا ہے۔

۱۔ منم آن سحر بیان کز مدد طبع سلیم
نہ برد ناطقہ نام سخنم بے تعظیم

۲۔ منم آن مایۂ فطرت کہ گر انصاف بود
با وجودم نتوان گفت باندیشہ فہیم

۳۔ منم آن بحر لبالب ز معانی کہ بود
قطرۂ آب ز شرم سخنم در یتیم

عرفی کا ادعا ہے "مین سحر بیان ہون۔ قوت نطق کے لئے میرا کلام مایۂ صد فخر و ناز ہے۔ میرے رو برو خود قوت متخیلہ ناکارہ ہے۔ مین معانی کا دریا ہون۔ اور میرے شعر موتی سے زائد آبدار ہین۔

یہ مفہوم نثر مین ادا کیا جائے۔ تب بھی مزیدار معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان بالطبع خودی پسند ہے۔ لیکن یہی بقید نظم ہو تو زیادہ لطف ہو جاتا ہے۔ خاص کر جب عرفی کی زبان سے ادا ہو۔ چونکہ عرفی اس زمانہ مین پیدا ہوا تھا جب مبالغہ

کلام کا لانیفک جزء ہو چکا تھا۔ اسلئے اس نے اپنی خودی آشکار کرنے کے لئے مبالغہ ہی کا دامن پکڑا۔
مولانا آصفی نے بھی "انانیت" کا کوس بجایا۔ مگر مبالغہ کے لباس میں، اسرارِ حقیقت آشکار کئے۔ فرماتے ہین

منم آن تازہ نہالے ز گلستانِ قدیم — کہ کشند پشۂ او آب زادراکِ حکیم
آن نہالے، کہ برد مند ز فیضِ ازلی ست — ریزد از شاخچۂ او ثمر باغِ نعیم

استعارہ لفظی مناسبات سے بریز ہوتا ہے۔ جب انسان کو سورج کہتے ہین۔ تو اسکے بعد ایسی صفات ضرور بیان کرتے ہین جس مین سورج کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے۔ مولانا نے، اپنی ذات کو گلستانِ قدیم کا تازہ نہال قرار دیا ہے۔ اسلئے از سرتاپا نہال کے متناسب صفات مذکور ہوئے۔ یہ خود ایک صنعت ہے۔ لیکن ہم اسکو ترک کرتے ہین
جس طرح، کاریگر کی قدرتِ فن، اور نزاکتِ صنعت اسکی مصنوعات کی ندرت سے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح نادرہ کار صناع کی طرف منسوب ہو جانے سے بھی، اشیا کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ انسان ایک ایسے صناع کی ساختہ مشین ہے۔ جو اپنی صفات مین بے مثل و نظیر ہے۔ اس لئے اس کی ہمسری بھی دشوار ہے۔ یہ تصرف کا مسلمہ ہے۔ کہ انسان کی حقیقت پا جانا مشکل ہے۔ خود مذہب نے بھی طے کر دیا ہے۔ کہ روح یا انسانی زندگی کا محرک فہم سے بالاتر ہے۔ اہل دانش کی کوششین بھی ناکام ثابت ہو چکی ہین۔ لہذا مولانا دعوی کرتے ہین،

"مین ابدی باغ کی تر و تازہ شاخ ہون۔ میری حقیقت تک حکمت و فلسفہ کی رسائی ممکن نہین۔
ازلی فیض نے آبیاری کرکے مجھے بار آور کیا ہے۔ اور جو کچھ میری زبان سے ادا ہوتا ہے بہشت کا میوہ ہے"

اگر اس حقیقت کے چہرہ سے مجاز کا نقاب الٹ دیا جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ جس طرح خالق کی حقیقت سمجھ مین نہین آتی اسکی مخلوق بھی فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ انسانِ کامل نے اپنے اس قول مین اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کہ جس نے خود اپنی ذات یعنی انسان کی حقیقت دریافت کر لی اسے معرفت حاصل ہو گئی
عرفی کا پہلا دعوی یہ تھا۔ کہ مین "سحر بیان" ہون۔ آصفی کہتے ہین مین "انسان کامل" ہون۔ اب تم ہی فیصلہ کرو۔ بلند مرتبہ سحر بیان ہو سکتا ہے۔ یا انسانِ کامل۔ ظاہر ہے موخر الذکر تمام کمالات کا جامع ہے۔ اسلئے خود سحر بیانی بھی اسکی ایک صفت ہے۔ مگر عرفی نے صرف سحر بیانی ہی پر اکتفا نہین کیا۔ مقتضائے طبع سے اس مین بھی خصوصیت پیدا کی۔ اور دعوی کیا۔ کہ سحر بیانی بھی ایسی کہ "ناطقہ" ادب سے نام لیتی ہے۔ لیکن غور کرکے دیکھا جائے۔ تو اس سے کچھ زائد اضافہ نہین ہوتا۔ چونکہ ہر شخص کی زبان جادو کا اثر نہین رکھتی ہر طبیعت سلیم ہوتی ہے۔ لہذا نتیجہ عیان ہے جو جادو بیان ہوگا قوتِ ناطقہ کیلئے لامحالہ واجب التعظیم ہوگا۔ البتہ کمالِ انسانیت کا دعوی جن الفاظ مین کیا گیا ہے۔ وہ برابر اضافہ کر رہے ہین تازہ نہالِ گلستانِ قدیم۔ آب از ادراکِ حکیم می کشد۔ ز فیض ازلی بردمند ست، واز شاخچۂ خود ثمر باغِ نعیم میریزد۔ چار ٹکڑے ہین۔ جو علی التواتر نظم ہوئے ہین

ہر تکھلا، پہلے الفاظ کے معانی مین خوش آیند اضافہ پیدا کر رہا ہے۔ چنانچہ جب چارون کو یکجا کر لیا جائے۔ تو مفہوم یہ ہو جاتا ہے، کہ "من انسانِ کامل ہستم" اس کے بعد فرماتے ہین۔

منم آن جوہر ادراک، کہ در علم ازل — داشت بر جوہر فعال، وجودم تقدیم

"جوہر فعال" فلسفہ کی اصطلاح مین وہ ذات ہے جس نے نو ین آسمان اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے۔ جوہر ادراک" خلاصۂ معلومات۔ اشرف مخلوقات۔ فرماتے ہین۔

مین وہ خلاصۂ موجودات و اشرف مخلوقات ہون جو جوہر فعال سے بہت پہلے، خدا کے ازلی علم مین موجود تھا" حدیث قدسی ہے "کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق" مفہوم یہ ہے۔ کہ خدا نے دنیا صرف اس لئے آباد کی۔ کہ لوگ اسے پہچانین۔ اور اسکی قوت کاملہ کا اظہار ہو۔ اس مفہوم کی طرف آیۂ کریمہ " وما خلقت الجن والانس الالیعبدون" بھی اشارہ کرتی ہے۔ دوسری حدیث ہے۔ "ان اللہ خلق آدم علی صورتہ" خدا نے آدم کو اپنی مجوزہ ہئیت سے مشرف کیا ہے۔ علاوہ ازین طبقہ اہل تصوف مین، حدیث " لولاک لما خلقت الافلاک" بھی بہت مشہور ہے جسکا مفہوم یہ ہے۔ کہ تخلیق عالم کی غرض انسان ہے۔ ان اقوال کے ساتھ ساتھ شعر کو دیکھو۔ عرفی کا دوسرا دعوی یہ تھا کہ مین مایۂ فطرت ہون۔ میرے ہوتے ہوئے " اندیشۂ وخیال" کو صاحب فہم نہین کہا جا سکتا۔ یہ سراسر غلو ہے آصفی کہتے ہین۔ مین "جوہر ادراک" ہون۔ اور میرا وجود ازلی ہے۔ یہ حقیقت اور قوم کا مسلمہ ہے اب تم ہی انصاف کرو کون بجا فخر کر رہا ہے؟

آگے چل کر فرماتے ہین

منم آن ابر گہر ریز حقائق کہ بگوش — ریزم، از دامن ایثارِ نفس، در یتیم
منم آن ابر گہر زائے معانی، کہ بود — بیشِ ایثارِ رگِ خامۂ من بحر لئیم

ان دونون شعرون کا مفہوم واضح ہے، ان کے مقابلہ مین عرفی کا تیسرا شعر پڑھو۔ اب ہم مقافیہ اشعار لکھتے ہین

عرفی:
گر بیادِ سخنم، عود بر آتش مانند — حشر اموات شود ہر طرف از نشر شمیم

آصفی:
جوشِ ہستی شود از مغز عدم عطسہ کشا — از نسیم دم احیا، چو کنم نشر شمیم

دونون شعرون کا مفہوم قریب قریب ایک ہے دونون عیسی بننا چاہتے ہین لیکن عرفی بلند اڑا ہے۔ سبحان اللہ کلام تو کلام، وہ عود بھی مسیحائی کرتا ہے۔ جو عرفی کے کلام کی یاد مین سلگا دیا جائے۔ چونکہ اس مفہوم کا دروازہ آنے والے شاعرون پر بند ہو چکا تھا۔ اسلئے آصفی نے نئی راہ نکالی۔

"عدم" "ہستی" کا مقابل ہے۔ "ہستی" کا اطلاق اس شے پر ہوتا ہے۔ جو موجود ہو" عدم کے معنی ہین" نہ ہونا" جس طرح

اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو ہو کر ناپید ہوگئی ہو۔ اس طرح اس چیز پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو سرے سے وجود ہی نہ رکھتی ہو
عرفی نے صرف یہی دعویٰ کیا تھا۔ کہ میرا کلام مردے زندہ کرتا ہے۔ آصفی کو موقع مل گیا۔ فوراً کہہ اٹھے۔ کہ میرا
کلام نہ صرف مردون ہی کو زندگی واپس بخشتا ہے۔ بلکہ اُن چیزون کو بھی حیات آشنا کردیتا ہے۔ جو سرے سے معدوم ہین۔
آصفی نے دوبارہ اس قافیہ کو پھر نظم کیا ہے۔ چونکہ مفہوم عرفی سے جدا ہے۔ اسلئے خوب ہی ہوگا۔ فرماتے ہین۔

از بہارِ سخن آندم کہ کنم نشرِ شمیم ۔۔۔ بوئے فردوس زند جوش بمغزِ امکان

یعنی میرا کلام سرمایۂ بہار ہے۔ اس کی ایک ایک پلٹ اسقدر خوشبو در دامن ہوتی ہے۔ کہ جب فضامین پھیلتی ہے
تمام عالمِ امکان کے دماغ مین فردوسی خوشبو کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

عرفی: از حجابِ سخنم، بسکہ عرق داد برون ۔۔۔ صورتِ شیشہ برآورد زلالِ تسنیم

آصفی: گر زُدگر بسرِ چشمۂ نوشم، رضوان ۔۔۔ افگند از کفِ خود، جامِ زلالِ تسنیم

کہنا دونون کو یہ ہے۔ کہ ہمارے کلام مین شیرینی ہے مگر طرزِ ادا مختلف ہے۔ عرفی اس کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ
"نہرِ تسنیم کا شیرین پانی میرے کلام کو دیکھکر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا چنانچہ اب وہ شیشہ کی طرح خشک
اور منجمد نظر آتا ہے" یہ نہایت پاکیزہ غلو ہے۔ لیکن آصفی نے مذکورہ مفہوم کو نہایت سادہ، مگر دلنشین الفاظ مین جلوہگر
کیا ہے۔ فرماتے ہین۔

"اگر رضوان کا میرے سخن کے چشمہ پر سے گذر ہو جائے۔ تو یقین ہے۔ کہ نہر تسنیم کے شہد سے زائد شیرین اور دودھ
سے زائد سپید پانی کے پیالہ کو زمین پر دے مارے۔"

قاعدہ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ انسان کہ اپنی چیز دنیا سے بڑھکر معلوم ہوتی ہے اسلئے دوسری شے کی فضیلت صرف
اسی وقت نظر آتی ہے۔ جب وہ اسقدر نمایان ہو۔ کہ مالک کے پاس کوئی عذر ہی نہ رہے۔ علاوہ ازین جس شے کے کھانے یا
پینے کی عادت پڑجاتی ہے۔ اس کے سوا دوسری اشیاء خواہ اس سے بہترین کیون نہون ناگوار ہی معلوم ہوتی ہین۔ جو لوگ
کنوین کا پانی پیا کرتے ہین انھین نل یا بارش کا شیرین پانی تلخ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیون۔ صرف اسلئے کہ ان کی ذائقہ کھاری پانی
ہی کی عادی ہے۔ دوسرا پانی اسکے لئے نیا ہے۔ اور نئی شئے کی پذیرائی کو ایک مدت چاہئے۔
مگر آصفی کا کلام اسقدر ذائقہ نواز ہے۔ کہ صرف ایک بار سن لینے سے، انسان شیرین ترین شئے کو بھی ہمیشہ
کے لئے خیرباد کہہ سکتا ہے۔ گو وہ اسکا عادی ہی کیون نہون ہمارے خیال مین عرفی کا شعر معناً سقیم ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ قافیہ
آصفی نے اپنا کر لیا۔
اسی قافیہ کو آصفی دوبارہ نظم کرتے ہین

جوئے از نوشِ کشادم بزمینِ امکان ۔۔۔ کز حلاوت رگِ حنظل شدہ موجِ تسنیم

مقصد وہی ہے۔ لیکن ادا مین جدت ہونیکے باعث شعر بے پناہ ہوگیا ہے۔

دنیا مین غصہ سے زائد تلخ کوئی شے نہین۔ اس تلخی کو اگر کوئی شیرینی دباسکتی ہے۔ تو وہ میٹھی بات کی شیرینی ہے۔ جہان دو چار میٹھی باتین کین اور انسان موم ہوگیا۔ ابھی غصہ کے مارے بھوت اور دیو نظر آتا تھا چند لحون کے بعد جو دیکھا تو فرشتہ کی طرح سادہ اور نرم ہے۔ چونکہ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ اسلئے مثالین لکھنے کی ضرورت نہین

آصفی مدعی ہین۔ کہ میرے شیرین کلام نے عالمِ امکان کی طبیعت مین تغیر و تبدل پیدا کردیا ہے۔ حنظل سے تلخ تر ترکوئی پھل نہین۔ آج وہ بھی اسقدر شیرین ہوچکا ہے۔ کہ رگ رگ سے شہد کی دھارین نکلتی ہین۔

اب تم خود فیصلہ کرو۔ کیا یہ دعویٰ باور ہوا ہے۔ ہم یہ نہین کہتے۔ کہ شاعرانہ طرزِ بیان مبالغہ سے بالکل ہی معرا ہو لیکن جہان تک ممکن ہو، اسے ہمارے روزمرہ سے قریب ہونا چاہئے عرفی کا یہ شعر اس معیار پر پورا نہین اترتا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہین۔ کہ آصفی نے یہان اپنے پیشرو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

عرفی	در حرمگاہ و دل و حجلہ گہِ طبع من ست حاملہ مریم و جز مریم اگر ہست عقیم	ہمچو مریم، بحرمگاہِ دلم، عیسیٰ زاست بکرِ معنی، کہ نشد حاملہ و بود عقیم	آصفی

مریم علیہا السلام کے متعلق مروی ہے۔ کہ آپ کو کبھی کسی مرد نے ہاتھ نہین لگایا۔ برابر باکرہ رہین۔ تا آنکہ فرشتہ نے عیسیٰ کی روح آپ کے پیٹ مین پھونک دی۔ عرفی تلمیحًا کہتا ہے۔ کہ میرے حرمگاہِ دل مین، باکرہ کو حمل رہجاتا ہے۔ خواہ وہ مریم ہو یا کوئی اور مقصود یہ ہے۔ کہ مین بڑا اطباع ہون۔ وہ وہ معانی پیدا کرتا ہون۔ کہ باید و شاید۔

گو تلمیح خوب ہے شعر لفظًا و معنیً سقیم ہے اولاً تو "حرمگاہِ دل" اور "حجلہ گہِ طبع" کا سنگم بے فائدہ ہے۔ دوسرے مریمؑ کا ذکر بے ادبانہ کیا گیا ہے۔ تیسرے "جز مریم اگر ہست عقیم" کا ٹکڑا مصرع کو زبان پر گران کرتا ہے۔

آصفی نے یہی مضمون نظم کیا ہے۔ عرفی کے شعر مین جو کوتاہیان تھین۔ وہ ان کے سامنے تھین۔ اس لئے انھون نے کوشش کرکے نہ صرف نقائص دور کئے، بلکہ شعر کو روان اور بلند کردیا۔ فرماتے ہین۔ کہ میرے حرمگاہِ دل مین، مریم کی طرح، بکر معنے سے عیسیٰ مثال پیدا ہوتے ہین۔ "عیسیٰ رح علیہ السلام کا مشہور وصف مردے زندہ کرنا تھا۔ فصیح و بلیغ کلام بھی ایسا ہی اثر رکھتا ہے۔ حدیث شریف مین مروی ہے " وان من البیان لسحرا و ان من الشعر لحکمۃ "۔ کہ بعض تقریرین جادو اور بعض اشعار حکمت و موعظت سے لبریز ہوتے ہین۔ اسلئے انکا دعویٰ مسیحائی کلام غلو نہین کہا جاسکتا۔

عرفی	در پذیرد، ز دمم صورتِ دیوار حیات مایۂ فطرت ازو وام کند فہم حکیم	نفسم روحِ حکم گر بہ تنِ زار دمد رود از خویشتن، از جلوہ اش، ادراکِ حکیم	آصفی

عرفی کا یہ شعر بہت بلند ہے۔ کہتا ہے۔ میرا کلام صرف جادو اثر ہی نہین ہوتا۔ اسرار و رموز سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ اگر مین اپنے دم سے دیوار پر منقوش تصویر کو زندہ کردون۔ تو وہ اسقدر معارف آشنا اُٹھے۔ کہ حکماء کو عقل و فہم قرض دے۔

آصفی نے "حکیم" قافیہ نظم کیا۔ لیکن معنی کے لحاظ سے شعر آدھا رہا۔ اس نے ایک ہی شعر مین دو دعوے کئے تھے مسیحا دم ہون۔ اور حقائق آشنا ہون۔ انھون نے صرف آخری دعوے لکھا۔ اور دست بردار ہوگئے۔

عرفی — آن خردمند حکیم کہ بسا بہ عقل — گیرم اندر جرم جوہر کل، نبض سقیم

آصفی — آن پزشکم کہ بہ تاثیر نگاہم پابند — ہمچو قانون شفا، نسخۂ احوال سقیم

عرفی کا مقصد یہ ہے کہ مین اس قدر دانا ہون کہ اپنے عقل و ذکا سے اُن اشیاء مین بھی نقص کو پالیتا ہون جو بظاہر نقصان سے بالا سمجھی جاتی ہین۔

بات خوب ہے۔ لیکن ناقص ہے۔ حکیم کی حذاقت صرف نباضی سے ظاہر نہین ہوتی۔ ممکن ہے کہ وہ دیکھتے ہی مرض دریافت کرلے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہین آتا۔ کہ اس کے علاج سے مریض کو صحت بھی ہوجائے۔ آصفی اس نقص معنوی سے فائدہ اُٹھاکر فرماتے ہین:-

"مین طبیب حاذق ہون۔ میری نگاہ مین یہ اثر ہے کہ ادھر سقیم یا مریض کو دیکھا۔ اور اُدھر وہ تندرست ہوگیا"۔

ہرچند عرفی نے غلو کا دامن پکڑا۔ مگر فلک پیمائی میسر نہ ہوئی۔ آصفی سیدھی سادھی بات لکھکر آگے نکل گئے۔ یہ طب کا مسئلہ ہے۔ کہ مرض کی دافع خود طبیعت ہے۔ دوا اسکی اعانت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑون جاڑے بخار کے مریض کسی عامل سے تعویذ حاصل کرکے اچھے ہوجاتے ہین۔ موجودہ اصول مسمریزم (   ) سے اسکی تائید ہوتی ہے۔ حکیم حاذق پر ہر مریض کا اعتقاد ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حکیم صاحب آئے۔ اور مین نے مرض سے نجات پائی۔ اس لئے آصفی کا دعوی کسقدر بلند اور سادہ نظر آتا ہے۔ سبحان اللہ! ادھر مریض پر نگاہ پڑی۔ ادھر مرض نے روپوشی اختیار کی

عرفی کے شعر مین بعض الفاظ بھرتی کے بھی ہین۔ مثلاً "خردمند" حکیم کی صفت ہے۔ صفت موصوف مین کچھ اضافہ کرتی ہے۔ یا یون کہئیے کہ ان باتون کو بتاتی ہے۔ جو اُس مین اور افراد سے زائد ہون۔ مگر یہان مطلق نئی بات نہین نکلتی۔ حکیم کے معنے مین خردمندی داخل ہے۔ یعنی جو خردمند نہین اُسکو حکیم نہین کہا جاسکتا۔ عرفی سے ایسی توقع ہرگز نہین تھی۔

آصفی کے مخصوص قوافی رہے جاتے ہین۔ اس لئے ہم تقابل سے دست کش ہوکر وہ چار شعر لکھتے ہین:-

فیض اشراق ضمیرم، ز حقائق تعلیم — ہمچو آئینۂ خورشید کند طبع حکیم

"میرا ضمیر حقائق و معارف کا گنجینہ ہے۔ اگر اس کا پرتو حکیم کی طبیعت پر پڑجائے، تو اسے خورشید کی طرح درخشان بنادے"۔

ازفروغِ گہرِ فطرتِ من، آب شود — درکنارِ صدفِ بحر، دلِ درِّ یتیم

"میری روشن فطرت کیا موتی کو شرماتی ہے۔ دیکھئے بیچارہ سیپ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوا جارہا ہے، اسی میں دریا کے پانی کو اشارۃً موتی کا پسینہ قرار دیا ہے۔ یہ مزید لطف ہے۔

مہر و مہ را ز فروغِ دل و طبعِ روشن — بزمِ اشراقِ ضمیرم نگہِ مست ندیم
از دلم، نکہتِ معنی، صفتِ غنچۂ گل — عطر آلودہ برآید، چو دمِ بادِ نسیم
روحِ معنی بدم تازہ دمیدم ز نوی — بود الفاظ کہن، بر صفتِ عظمِ رمیم
اہتزازے شود از معنیٔ من در دلِ سنگ — گرچہ در طبعِ جمادی نبود ذوقِ سلیم
گوہرِ سرشیوناتِ جہان را ابرم — کہ کنم گنجِ لآلی، صدفِ گوشِ فہیم
دمِ طغیانِ معانی، صفتِ بحرِ محیط — چکد از موجِ رگِ خامۂ من فیضِ قدیم
سازِ خاموشم و خیزد ز دلِ من آہنگ — حرفِ من داشتہ بر جنبشِ لبہا تقدیم
اثرِ معجزِ فیضِ سخنم گر یابد — نطق جوشد صفتِ بو ز رگِ گوشِ صمیم
آن سحابم کہ زمشتِ گہرش جوش زند — از کمالاتِ حکم، موجۂ دریائے قدیم

ان اشعار کی بلند آہنگی، جوشِ بیان، ندرتِ استعارات اور حقیقت کشائی پر صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن فرصت اجازت نہیں دیتی۔

عرفی کا دوسرا قصیدہ "رفتم اے غم زدہ در عمرِ شتابان رفتم" اس زمین میں آصفی نے بھی رائے مرلی دھر بہادر معتمد صرفِ خاصِ شاہی کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔ تشبیب فخریہ ہے۔ اس لئے دو چار صفحے اس پر بھی نذر ہیں۔

لیکن اس پر کچھ لکھنے سے پہلے ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے۔ کہ عرفی کا یہ قصیدہ لاجواب ہے۔ آصفی نے جوشِ مسابقت میں بہت جانفشانی کی ہے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھتے وقت تمہیں خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ لیکن بجز چند اشعار کے، ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی۔ اس قصیدہ میں آصفی عرفی کے ہمنوا نہیں معلوم ہوتے۔ شعر پہ شعر پڑھتے چلے جایئے۔ بیدل کے ساز کی سی آواز معلوم دیتی ہے۔ اور کچھ نہیں۔

گذشتہ قصائد کے برخلاف، یہاں آصفی کو خود اس کا احساس ہے۔ عرفی کے اُن قوافی پر جو حدِ اعجاز کو پہنچ چکے ہیں۔ اُنھوں نے قلم نہیں اُٹھایا۔ یہی امر اس احساس کا غماز ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے تو پھر ہم کیوں حسبت گواہ نہیں۔
لیکن جب ہم قصیدہ کے خاتمہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ شعر سامنے آتے ہیں۔

این گہرہا کہ برآوردہ ام از معدنِ دل — نہ شماری کہ لبِ یاوہ گری کان رفتم
ہمرہِ عرفی و فیضی و حزین و شوکت — اندرین مرحلہ چون برقِ شتابان رفتم

سعی اندیشہ درین عرصہ قدم پیش گذاشت گرچہ در وادیٔ ہستی پس ایشان رفتم

ان اشعار مین کھلا ہوا تقدم نظر آتا ہے۔ لہذا ہمین دیکھنا چاہیئے کہ آخر یہ کہان تک درست ہے۔ ہماری اپنی رائے
جسے ہم تقابل سے پہلے ظاہر کر دینا مناسب سمجھتے ہین۔ یہ ہے کہ عرفی کو مستثنیٰ کرکے باقی ہمراہیون سے آصفی پیش پیش ہین۔
ذٰلک فضل اللہ

ہمقافیہ اشعار سے پیشتر "انانیت" کے دعوے سن لو۔ چونکہ فخریہ کی روح یہی ہے۔ اس لئے بڑی حد تک اس سے
اندازہ ہوسکے گا۔

عرفی
منم آن قطرہ کہ صد سینہ و دل کردم داغ
تا ز نوکِ مژہ غلطیدہ بدامان رفتم

آصفی
منم آن حسرتیٔ دید کہ پیشِ محمل
آہ مجنون شدہ در دشت حدی خوان رفتم

منم آن یوسفِ بدروز کہ نارفتہ بہ مصر
چون برون آمدن از چاہ بزندان رفتم

منم آن طائرِ آزاد کہ در بندِ قفس،
پربرآوردہ لگلزار بہ افشان رفتم،

یہ دونون شعر ہم معنی ہین۔ مدعا یہ ہے کہ اس ناشاد دنیا مین راحت سے پہلے غم نصیب ہوا۔ ابھی جی بھر کر لطف
اندوزِ حیات بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ قیدیٔ حوادث ہوگئے۔ اس مفہوم کو عرفی نے یوسف۔ مصر۔ اور زندان کی تلمیح سے
نذر کر دیا۔ آصفی نے طائر، قفس اور گلزار کی پناہ لی۔ لیکن اسقدر فرق رہا کہ عرفی اس کو بدروزی قرار دیکر ماتم کر رہا ہے
آصفی اسکو آزادی سمجھ کر شادان ہین۔ وبینہما بون بعید ط

عرفی
منم آن غنچۂ پژمردہ، کہ از بادِ خزان
خندہ برلب گرہ و سر بگریبان رفتم

آصفی
منم آن نکہت پیراہن یوسف کہ ز مصر
بدماغ و دل یعقوب، بہ کنعان رفتم

عرفی نے پھر وہی رونا رویا ہے۔ بادِ خزان نے اُسکو کھلنے سے پہلے کھلا دیا تھا۔ اس لئے ہر شعر فریادی ہے
آصفی یہان بھی "حیات نوید" ہین۔ یوسف علیہ السلام کی قمیص، یعقوبؑ کی اندھی آنکھون کے واسطے نور تھی۔ جب یوسف علیہ السلام
کو بھائیون نے شناخت کر لیا۔ اور اپنے کرتوت پر پشیمان ہوئے، تو اُنھون نے فرمایا۔ اذھبوا بقمیصی ہٰذا فالقوا علیٰ
ابی یات بصیراً۔" یہ میرا کرتہ لیجاؤ اور اُنکے چہرہ پر ڈالدو وہ بینا ہو کر چلے آئین گے۔"

آصفی کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ ان کا کلام اپنی معنوی حقائق و معارف اور لفظی محاسن کے باعث مذاق سلیم
کے لئے روحانی غذا ہے۔ اس لئے وہ بجا فرماتے ہین۔ کہ مین دنیا کے لئے پیام زیست ہون۔

عرفی
منم آن ہیکلِ روحانیٔ اندیشۂ خدا
کہ در آب زدم بساغر نان رفتم

منم آن عاشق شوریدہ کہ بالشکرِ شوق
بہر بر ہم زنیٔ بزم رقیبان رفتم

عرفی کہتا ہے۔ عالم تجرد مین مین خدائی اندیشہ کی روحانی صورت تھا۔ گر قسمت مین ذلت لکھی تھی۔

دنیا میں آکر آب ودانہ کے لئے در بدر مارا مارا پھرنا پڑا۔ چونکہ وہ صاحب کمال تھا۔ اس لئے اپنی ذات کو برتر دیکھنا چاہتا تھا۔ خانخاناں اور میر ابو الفتح کی قدردانی نے اشک شوئی کی۔ مگر ہندوستان کی دادودہش نے، جو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے معاصرین کو مالا مال کر چکی تھی۔ اسکی طرف پورا التفات نہین کیا۔ اس لئے قصیدہ بھر میں یہی رونا رویا ہے۔

آصفی بھی صاحب کمال تھے۔ اُنھوں نے بھی ناقدردانی کے مظالم سہے۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے ابجد خوانوں کو شہرت کے تخت پر جلوہ دیکھا۔ مگر یہ دنیا مین عمل کی تعلیم لے کر آئے تھے۔ اس لئے شور وواویلا کی جگہ ہمت کا سبق دیتے ہین فرماتے ہین:۔

"مین ایسا شوریدہ مزاج عاشق ہون۔ کہ اپنے شوق کے ہمراہ رقیبوں پر چڑھ دوڑون گا۔ اور ساری بزم درہم برہم ہو جائے گی"۔ بالفاظِ دیگر انسان کو رقابت کے باعث دل چھوڑ دینا ہرگز نہ چاہیئے۔ ازل سے ابد تک یہان "تنازع للبقا" جاری رہے گا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ ہمین چاہیئے کہ اپنی قوت واستعداد سے خود راستہ صاف کرلین۔ مواقع دیکھکر رونا بزدلی ہے۔

منم آن شیوۂ ارزندہ بہ لبستانِ کمال	منم آن ہدہدِ پیغام بر عالم شوق
عرفی کہ بدست دوہن ذائقہ ارزان رفتم	آصفی سوئے بلقیس نعبد شوقِ سلیمان رفتم

عرفی کو بھی فلک کی شکایت ہے۔ آصفی کو وہی شوق وہی آرزوئے عمل اور اُسی دعوتِ کار کا ذوق ہے۔

منم آن سیر زجان گشتہ کہ با تیغ وکفن	منم آن نالہ کہ با برگ خراشیدنِ جان
عرفی بدرِ خانۂ جلاد غزل خوان رفتم	آصفی ازدلِ خستۂ فرہاد لبِ سامان رفتم

یہان بھی گذشتہ اختلافِ خیال کارگر ہے۔ عرفی کو یاس وحرمان نے جان سے بیزار کر دیا ہے۔ اب وہ اس کو زندگی سمجھتا ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح زنجیرِ حیات سے پاؤن نکال لے۔ مگر آصفی محروم رہ کر بھی جان سے ہاتھ نہین دہو بیٹھتے۔ مانا کہ وہ فرہاد کے خستہ دل کے نالہ پرسوز ہین۔ لیکن پھر بھی اس قدر "اثر در دامن" ہین کہ زمین و آسمان کو ہلا ڈالین گے۔

عرفی کی "انانیت" ختم ہو گئی۔ لیکن آصفی کا دعوےٰ تمام نہین ہوا۔ یہ زنجیر کی چند کڑیان تھین۔ باقی حصہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ فرماتے ہین۔

منم آن نالہ کہ با برگ خراشیدنِ جان	ازدلِ خستۂ فرہاد لبسامان رفتم
گاہ از حسرتِ جان بخشئ لعلِ لبِ یار	جوش خون گشتم و از دیدہ گریان رفتم
گاہ از کشمکشِ رنجِ خمارِ امکان،	صورتِ نشۂ می از سرِ مستان رفتم

گاہ از گرمیٔ داغِ جگر سوختہ	ہمچو آہے ز دلِ تنگِ یتیمان رفتم
گاہ از بہر جلائے نظرِ چشمِ کمال	کُحل بینش شدم و سوئے صفاہان رفتم
گاہ چون ولولۂ شوقِ زلیخا از مصر	بہ طلبگاریٔ یوسف سوئے کنعان رفتم
گاہ چون آینہ در محفلِ رعنا صنمان	رفتم از خویش، و لے با دلِ حیران رفتم
گاہ چون بوئے گل از شیوۂ آزادہ روی	دست در دستِ صبا، از چمنستان رفتم
گہ ز رنگینیٔ لعلِ سخنِ شعلہ فگن	آتشِ رشکِ شدم، سوئے گلستان رفتم

ان اشعار کو پڑھو۔ عرفی کا قصیدہ خوب تر ہے۔ لیکن خوبی خدا نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کئی چیزیں خوب نکلیں۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۷ اور آٹھواں شعر، شاعری کی تصویر ہے۔

عرفی نے "منت ناپذیری" کا راگ الاپنا چاہا ہے۔ احسان قافیہ استعمال کرتا ہے۔

آرزو کشتم و خون خوردم و عشرت کردم	نہ درِ جور زدم، نے بر احسان رفتم

مدعا یہ ہے کہ آرزوؤں کا خون کرنا مین نے گوارا کیا۔ لیکن تیرے میرے آگے فریاد لیکر نہین گیا۔ بات بالکل معمولی ہے۔ لیکن مصرعِ اول کے اجزا ترکیبی سے حسن پیدا ہو گیا ہے۔ آصفی نے بھی اس قافیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہین۔

خلشِ نشترِ غیرتِ منت نہ گزاشت	جوشِ خوننا بہ شدم از رگِ احسان رفتم

شریان خون کا گھر ہے۔ اور خون پر زندگی کا مدار ہے۔ ادھر شریان چھڑی، اور معتد بہ حصۂ خون نکلا کہ اُدھر سلسلۂ حیات ختم ہو گیا۔ شاعرؔ "احسان" کو انسان فرض کرکے، اپنی ذات کو اس مین دوڑنے پھرنے والا خون تصور کرتا ہے۔ رگ نشتر وغیرہ نوکیلی چیز سے چھیڑی جاتی ہے۔ "غیرتِ منت" مین، با ہمت کے لئے، کافی سامانِ خلش ہے۔ اسلئے احسان کا بار، اس کے لئے نشتر کا کام دیتا ہے۔ ادھر احسان قبول کیا۔ ادھر خون کی طرح باہر آرہا۔ اس مفہوم کو جدت نے بلند اور مضبوط بنا دیا ہے۔ فرماتے ہین۔

"مین احسان اُٹھا ہی نہین سکتا۔ کیونکہ مین رگِ احسان کا خون ہون۔ اور منت نشتر ہے۔ نشتر کی نوک کے آگے خون کی کیا مجال کہ باہر نہ بہ نکلے"۔ بالفاظِ دیگر میرے حق مین "احسان" کا وجود ہی نہین۔ اس لئے کہ مین اُس کی زندگی ہون۔ جب مین ہی اس سے جدا ہو گیا۔ تو وہ کس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔

اسی مفہوم کو دوسری جگہ پھر نظم کیا ہے۔ فرماتے ہین:۔

بختم از ہمت بے حامیم داشت نشان	برق گردیدم و بر خرمنِ احسان رفتم

چونکہ قسمت میری یاور تھی۔ اس لئے ازل سے ہمت ساتھ لایا تھا۔ گو اس سے حاصل کچھ نہ ہوا۔ لیکن سہارا تو تھا۔ لہذا مین نے بجلی بنکر خرمنِ احسان کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ نہ دنیا مین احسان کا وجود ہوگا۔ اور نہ دنیا کی اسباب

ننگ و عار میں طوفان نظر آئے گا۔"

عرفی نے صرف خود "احسان" کا بار نہیں اُٹھایا لیکن آصفی نے سرے سے احسان کا وجود ہی مٹا ڈالا۔ بغور پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ گو عرفی کا شعر بھی اپنی جگہ خوب ہے۔ لیکن آصفی کے دونوں شعر خوب تر اور مضبوط ترین ہیں آگے چلکر آصفی نے پھر یہی مضمون نظم کیا ہے۔ لیکن قافیہ اور ہے۔ اس لئے جدت زیادہ نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں۔

در جہانے، کہ خموشی نہ کشد ننگ سوال　　حرف احسان شدم، از یاد کریمان رفتم

سبحان اللہ! شاعر کے تخیل میں ایسی دنیا بھی موجود ہے۔ جہاں خاموشی، سوال کو باعث ننگ سمجھتی ہے۔

عرفی　از پریشانیٔ دل سوختم و بہر علاج　　ہم بدریوزۂ دلہائے پریشان رفتم

آصفی　اندریں دشت بدوش طلب نالۂ شوق　　چون جرس، از دل شوریدہ پریشان رفتم

عرفی　زان شکستم کہ بدنبال دل خویش مدام　　در نشیب شکن زلف پریشان رفتم

آصفی　صورت نغمۂ نے، از غم این کوچہ تنگ　　ہر نفس دست بدیوار و پریشان رفتم

مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے ان قوافی پر تم خود غور کرو۔ آصفی نے یہ دونوں شعر بھی عرفی سے بہتر لکھے ہیں۔ آصفی کے یہ شعر بھی لطافت و رومان کے جا سکتے ہیں:۔

گردش ساغر این بزم دماغم آشفت　　صورت ہوش، ز ہم بزمی مستان رفتم

نشۂ فطرت من، در خور ہر مغز نبود　　جوش صہبا شدم از شیشۂ امکان رفتم

برگ برگ چمن دہر خزانی دیدم　　شور بلبل شدم از سیر گلستان رفتم

کلفت خاطر من بود پریشان آہنگ　　گرد بادے شدم و سوئے بیابان رفتم

عشرت ہستی من بود زملخیٔ حیات　　نوش حسبتم پئے زہرابہ لقبان رفتم

رمز نشگفتنم از خندۂ گلہائے بہار　　زین چمن، غنچہ صفت، سر بگریبان رفتم

کوچۂ زخم دل بسمل حسرت جستم　　بر قفائے اثر شوخیٔ پیکان رفتم

بسکہ کوچک دل ابلہ پا دل داد　　راہ صحرائے جنون با بن دندان رفتم

کاروانم ز قفا دیدہ غارت میداشت　　خواب شیرین شدم از چشم نگہبان رفتم

یاس گردید رفیق سفر ناکامی،　　بخت ناز دکہ سبکبار بجرمان رفتم

شوخیٔ حسن برسوائی نظارہ کشید　　دامن آلودہ تر از باد بہاران رفتم

(باقی)　　خان امتیاز علی عرشی

پھر بحث سنت

(بہ سلسلۂ ماسبق)

معنوی بحث آیندہ صفحات مین مدعی کے اُن دعادن پر بحث ہے، جنکا تعلق معنوی مباحث سے ہے، موصوف نے اپنے تازہ مضمون کے دو نمبر لکھے ہین۔ اور ہر ایک مین اپنے دعوی انکار حدیث یا تذبذب فی الحدیث کے کچھ دلائل دئے ہین۔ ذیل کے صفحات مین بہ ترتیب، پہلے اُن کے پہلے نمبر کے، اور بعد کو اونکے دوسرے نمبر کے دلائل پر نظر کرنا ہے، پہلے نمبر مین دو حسب ذیل دلیلین ہین۔ جنکو بڑے غور و فکر کے بعد دلیل کی حسب ذیل صورت مین کوئی مرتب کر سکتا ہے:

۱- کتب حدیث مین جو عقائد اور مسائل مذکور ہین وہ یہودیون کے عقائد اور مسائل سے ملتے جلتے ہین، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ یہودیون سے ماخوذ ہین۔

۲- حدیثون کی روایت اور کتب حدیث کی تدوین تمامتر عجمیون نے کی ہے۔ اس لئے یہ اعتبار کے قابل نہین۔

یہی اونکی دو عروۃ الوثقی دلیلین ہین جو پرانی "مولویانہ منطق" کے مغالطۂ عامۃ الورود کی طرح اس جدید مذہبی محقق کے ہر مضمون اور ہر تحقیق مین بار بار دہرائی جاتی ہین۔

حدیث کے عقائد اور مسائل میں یہود کی مشابہت مین یہ سمجھنے سے عاجز ہون کہ ایک طرف تو وہ تمام آسمانی مذاہب کے برحق اور من جانب اللہ ہونیکے قابل ہین۔ دوسری طرف تورات یا یہودیون کے بعض عقائد اور مسائل مین مشابہت ہونیکی وجہ سے بلا تمیز تمام احادیث و سنن سے یکسر دست بردار ہوجانیکو آمادہ ہین، کیا وہ سر ولیم مور یا دوسرے عیسائی مصنفین کے طعنون سے گھبرا کر اسی دلیل کے رو سے قرآن پاک سے بھی دست بردار ہوجانیکو آمادہ ہین، عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت و رسالت بعض جانورون کی حرمت، نکاح و طلاق و مہر وغیرہ اور بہت سے احکام اور قصص قرآن و تورات مین، اور عقیدۂ قیامت، اور عقیدہ جنت و دوزخ قرآن و انجیل مین مشترک ہیں، توکیا موصوف یہود و نصاریٰ کی اس مشابہت سے گھبرا کر وہ ان تمام اُصولون سے منحرف ہوجائینگے، حالانکہ اگر یہ سچ ہے کہ یہ تمام مذاہب ایک ہی سرچشمۂ آسمانی سے نکلے ہین۔ تو ان مین یہ مشابہت و مماثلت ناگزیر ہے، اور خود قرآن نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے

انّ ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ۔ — بیشک جو یہ قرآن میں ہے، وہ اگلی کتابوں میں بھی ہے، ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ و عیسیٰ الخ (شوریٰ) — اور دین میں سے وہی شرع بنایا تمہارے لئے جو نوح سے وصیت کی تھی اور جو تمہاری طرف وحی بھیجی اور جو ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی۔ الخ

ما یقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک (حم سجدہ) — تجھ سے (اے محمد) نہیں کہا جاتا لیکن وہی جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ (انعام) — یہی وہ پہلے پیغمبر ہیں جنکو خدا نے سیدھی راہ دکھائی تو تو بھی انہیں کی راہ کی پیروی کر۔

آخر میں وہ آیت پیش ہے، جس میں لفظ سنت بھی موجود ہے، نکاح وطلاق اور محرمات کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے۔

یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم ویتوب علیکم واللہ علیم حکیم ۰ (نساء ۵) — اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تمکو اگلی قوموں کی سنتوں کی ہدایت کرے اور تمکو معاف کرے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

انہ لفی زبر الاولین (شعراء) — یہ پہلوں کی کتابوں میں ہے۔

اس بناء پر اہل کتاب کے احکام سے صرف مشابہت اور مماثلت خطاکاری اور غلطی کی دلیل نہیں ہے، جبتک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ یہ قرآن پاک یا سنت صحیحہ سے ثابت نہیں، یا وہ اونکے خلاف ہے۔

اگر بعض یہود کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے زبانی ایسے احکام بھی ملے تھے جو تورات میں نہیں اور جو ڈیڑھ ہزار برس تک سینہ بہ سینہ نقل ہوتے چلے آئے اور حضرت عیسیٰ کے عہد سے پس و پیش زمانہ میں تحریر کی صورت میں مدون ہوئے، تو نفس یہ عقیدہ یا یہ اصول قابل الزام نہیں، بلکہ ان زبانی احکام کا صحیح طریقہ سے حضرت موسیٰ تک ثبوت نہ پہنچ سکنا۔ اور اس عدم ثبوت پر بھی اونکو تسلیم کرنا اور اونکو تورات پر مرجح کرنا قابل الزام ہے۔ اس لئے یہودیوں کے بعض عقائد ومسائل سے کسی نہ کسی طرح صرف مشابہت ومماثلت دکھا دینے سے کوئی چیز صحیح یا غلط نہیں ہو سکتی، جب تک اوسکے ساتھ اس بات کے دلائل نہ ہوں، کہ یہ امور کلام الٰہی سے ماخوذ نہیں ہیں۔

یہودیوں کے تمام عقائد، احکام اور مسائل یک قلم سرتاپا غلط، محرف اور باطل نہیں ہیں کہ کسی عقیدہ یا مسئلہ کی نسبت یہ کہدینا کہ یہ یہودیوں کے ہاں بھی ہے، اوس عقیدہ یا مسئلہ کی غلطی ثابت کرنے کے لئے کافی ہو جائے، ایسا کہنا بقول صاحب مضمون "فلسفۂ مذہب، تاریخ مذاہب، اور اقوام سامیہ کے لٹریچر" سے ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے، اور اگر ایسا ہی اس مشابہت ومماثلت سے گریز ہے، تو وہ نماز پنجگانہ کی سند سامی مذاہب وصحف کے حوالوں سے کیوں مانگا کرتے ہیں۔

احادیث وسنن کی تدوین مین عجمی ہاتھ

یہ واقعہ تا متر صحیح ہے کہ احادیث وسنن کی ترتیب و تدوین مین اہل عرب سے زیادہ اہل عجم کی کوششین شامل تھین، لیکن یہ نہ صرف احادیث وسنن کے ساتھ واقعہ ہوا بلکہ تمام اسلامی علوم خواہ وہ دینی ہون یا دنیاوی سب کے ساتھ یہ واقعہ ہے۔ اس سے ابن خلدون کے نظریہ کے مطابق اہل عرب کی علوم سے غفلت یا فطری نامناسبت ثابت ہو تو ہو، مگر اس سے یہ کہان ثابت ہوتا ہے کہ اس لئے یہ غلط ہین کہ انکو اہل عجم نے مدون کیا، کیا نعوذ باللہ ہر غیر عرب مسلمان منافق تھا یا اسلام کے مٹانے کے درپے تھا، یا قرآن کی تحریف کے لئے کوشان تھا کہ یہ کہدیا جائے کہ یہ کام غیر عرب مسلمانون نے کیا ہے، اس لئے یہ غلط ہے، کیا قرآن کی پیشین گوئی والذین لم یلحقوا بھم (کہ اور اون قومون کے لئے بھی محمدؐ رسول ہین جو ابتک مسلمان نہین ہوئین بلکہ آئندہ مسلمان ہونگی) کی صریح مخالفت نہین۔

اور اگر اس اصول کو مان بھی لین کہ غیر عرب مسلمان کے ہر کام کو شبہ اور خطرہ کی نظر سے دیکھا جائے تو پھر آپکے لئے دوسری اور تیسری صدی اور تیرھوین اور چودھوین ہجری مین فرق کیون کیا جائے۔ جبکہ اوس زمانہ سے آج علم اور دیانت دونون کم ہین، اسی اصول کی بنار پر بخارا کے محمد بن اسماعیل بخاری، ترمذ کے ابوعیسیٰ ترمذی، اور نیشاپور کے مسلم بن حجاج نیشاپوری، نیز بجنور یا الہ آباد اور امرتسر یا لاہور کے اہل تحقیق، سب کے کام، اور سب کی باتین، اور سب کی تحقیقات مشتبہ اور پرخطر ہین، کیون دوسری اور تیسری صدی کے غیر عرب اہل علم کو منافق، مخالف دین، محرف قرآن باور کیا جائے اور تیرھوین اور چودھوین صدی کے غیر عرب محققین پر منافق، مخالف دین اور محرف قرآن ہونے کا الزام نہ لگایا جائے، اگر ساقط الاعتبار ہین تو دونون، اور اعتبار کے لائق ہین تو دونون، اگر گذشتہ غیر عرب یہودیت و مجوسیت سے متاثر ہونے کی بنار پر قابل الزام تھے، تو آج کے اہل تحقیق، عیسائیت، افرنگیت، یورپیت اور مستشرقیت کے اثر سے متاثر ہین، اگر دوسری اور تیسری صدی کے غیر عربون کی عربی مادری زبان نہ تھی تو آج کے غیر عرب خصوصاً ہندوستانی اہل تنقید کی زبان عربی بدرجہ اولےٰ مادری نہین۔

لیکن آئیے ہم آپ مل کر مصالحت کا راستہ نکالین، اور وہ یہ ہے کہ ہم آپ صرف اون احادیث و روایات کو تسلیم کرلین جو قرون اولےٰ کے عرب مصنفین نے قبول کئے ہین، روایات و انساب سے تحقیق کرکے کہ امام شافعی تو عرب مکہ کے باشندے، اور خاص قریش کی نسل سے تھے، اسی طرح امام مالک تو خاص عرب، مدینہ کے باشندے اور یمن کی قحطانی نسل سے تھے، ان دونون خالص عربون نے جو روایتین کی ہون، اور اپنی کتابون مین درج کی ہون، اونکو صحیح مان لین، امام شافعی کی مرویات جو کتاب الام وغیرہ اونکی کتابون مین ہین وہ مسند شافعی مین جمع ہین، اور امام مالک کی روایتین موطا مین ہین، ان دونون عرب مدونین حدیث و جامعین سنن پر شبہ نہین بلکہ مین درگذر کرکے صرف موطا پر قناعت کرنے کا مشورہ دیتا ہون جس کا نہ صرف جامع و مدون، بلکہ اوسکے اکثر راوی تک عرب ہین، اور جسکی حدیثون مین صحابی اور جامع کتاب مین

صرف ایک یا دو راویون کا فصل ہے، اور یہ وہ راوی ہین، جن کے اعتبار و استناد مین شبہ نہین کیا جا سکتا، کیا یہ پیغام صلح منظور ہے؟

چند اور "دلائل" موصوف نے مضمون کے دوسرے نمبر میں اپنے دعوے کے ثبوت مین چند اور "دلائل" پیدا کئے ہین جو حسب ذیل ہین:-

۱- صحابہ اور تابعین تک یہودیون سے روایات اخذ کرتے تھے،

۲- متعدد اشخاص وضع احادیث کے مجرم تھے، اور جعلی حدیثین بناتے تھے۔

۳- کتب احادیث مین بہت سی ضعیف یا غیر صحیح حدیثین ہین۔

سب سے پہلے مین اپنے محقق دوست کو اونکی اس محنت و جانفشانی کی داد دیتا ہون، جو اونھون نے اپنے ان معلومات کے لئے جنکی اس نمبر مین جا بجا نمائش کی گئی ہے کی ہے، اور اسوقت اردو کی وقعت میری آنکھون مین دو چند ہو جاتی ہے کہ اب اوسمین ہر قسم کے معلومات کا اتنا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس اومین سے مطلوبہ معلومات حاصل کر کے اچھا خاصہ وزندار اور رعب انداز مضمون، اصل کتابوں کے حوالہ سے لکھ سکتا ہے، اور اپنے معلومات سے اردو خوان ناظرین کو مرعوب کر سکتا ہے۔

موصوف نے حدیث و اصول حدیث و رجال کی بڑی بڑی کتابون کے حوالے دئے ہین، مگر خیریت سے ایک کے بھی مقام، باب یا صفحہ کسی چیز کی تعیین نہیں کی ہے، کیا ہمارے دوست کے اصل ماخذ مین بھی ان کتابوں کے اسی طرح حوالے ہین، اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ پرانے مولویوں کا قاعدہ تھا تو موصوف کا عذر ظاہر ہے، تاہم تنقید بخاری وغیرہ کا نام لینا بھی کیا برا تھا، کیا اردو کی کسی کتاب کے حوالہ سے یا کسی دوسری کتاب سے بے حوالہ کچھ لے لینے سے لکھنے والے کی قدر و منزلت لوگون کی نگاہوں میں کچھ کمی تھوڑی ہی آجاتی ہے۔

بہرحال ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں، کہ ہمارے دوست کے معلومات "سکنڈ ہینڈ" نہیں ہیں، بلکہ خود اونکی محنت و کوشش کے نتائج ہین، اس پر یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ اونھوں نے اصل کتابونکے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی، یا مطالب مین دانستہ تحریف کی،

موصوف نے لکھا ہے،

"ایک دوسرا خطرناک پہلو اسرائیلیات کا ہے، جس سے خود اصحاب مثل ابن عمر، ابوہریرہ، ابن عباس بھی نہیں بچے،"

پھر اس دعوے کے ثبوت مین وہ ابو الامداد ابراہیم کے حاشیۂ نخبۃ الفکر سے حسب ذیل اردو عبارت نقل کرتے ہیں۔

"جو صحابہ بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنے والے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت

علیؓ ہیں، اور جو اصحاب ان سے لیا کرتے ہیں وہ عبداللہ بن سلام، اور بعض نے کہا عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں، کہ جب شام کا ملک فتح ہوا تو ایک بار اونٹ (؟) یہود و نصاریٰ کی کتابیں لاتے اور ان میں واقعات بیان کرتے، پس عمرو بن عاص (؟) سے لوگ ان واقعات کو ماخوذ کر لیا کرتے، اسواسطے ان کی حدیثیں کم ہیں، مگر وہ باتیں جو کثرت سے ان سے منقول ہیں وہ صرف اخبار و قصص بنی اسرائیل اور روایات اہل کتاب کی ہیں۔ کہ انکی حدیثیں ابوہریرہ سے بھی زیادہ ہیں۔"

اول تو ابوالامداد ابراہیم نامی صاحب کوئی بڑے پایہ کے آدمی نہیں جنکے سرسری بیانات یوں مان لئے جائیں، دوسرے یہ کہ دنیا یہ "راز" جانکر حیرت میں رہ جائیگی کہ اس میں ابوالامداد صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا ہمارے محقق کا، اس "طرز تحقیق" کی کوئی حد ہے کہ لوگوں کی اصل عبارتوں میں بیجا تصرف کر لیا جائے، دنیا میں کون شخص ہے جو یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علیؓ بنی اسرائیل سے واقعات اخذ کرتے تھے، یہ علمی بیباکی کی انتہا ہے۔

ابوالامداد نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل اسکا الٹا ہے، اوسکی اصل عبارت مع ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

ومثال الصحابی الذی لم یاخذ من الاسرائیلیات ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ، ومثال من اخذ عنها عبداللہ بن سلامؓ وقیل عبداللہ بن عمرو بن العاص فانہ لما فتح الشام اخذ جمل بعیر من کتاب اھل الکتاب کان یحدث منہ،

اوس صحابی کی مثال جس نے اسرائیلیات سے اخذ نہیں کیا، ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم ہیں اور اوسکی مثال جس نے اسرائیلیات سے اخذ کیا عبداللہ بن سلام ہیں، اور کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں کیونکہ جب شام فتح ہوا تو اونھوں نے ایک بار شتر کتابیں اہل کتاب کی لیں اور وہ ان کتابوں سے روایت کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ اس عبارت میں حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علیؓ کے اسمائے مبارکہ اون صحابہ کی مثال میں ہیں جنھوں نے اسرائیلیات کو ہاتھ نہیں لگایا، مگر محقق جدید عبارت کا غلط ترجمہ کر کے کس دلیری سے ان بزرگوں کو اسرائیلیات کے راویوں میں شامل کرتا ہے، حالانکہ اسرائیلیات سے روایت کرنے والوں میں صرف ایک نام اس میں قطعی طور پر لیا گیا ہے، اور وہ عبداللہ بن سلام کا نام ہے، اور بطور ایک کمزور رائے کے عبداللہ بن عمرو بن عاص کا نام گنایا ہے اور فتح شام میں اہل کتاب کے ذخیرہ کتب اونکے ہاتھ لگ جانے اور اونکے واقعات بیان کرنے کا ذکر ہے، مگر یاد رہے کہ یہ کمزور رائے سراسر کمزور ہی ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کتابیں اونکو ملی ہوں، مگر اونکے واقعات بیان کرنے اور اُسکے بعد یہ اظہار خیال کہ اسواسطے اون کی حدیثیں کم ہیں، اور اخبار و قصص بنی اسرائیل اون سے زیادہ مروی ہیں، اور اس لئے اونکی حدیثیں ابوہریرہ سے زیادہ ہیں یہ تمام دعوے یکسر غلط ہیں، نہ تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیثیں اونکی اسرائیلیات سے کم ہیں، اور نہ اون سے بکثرت اسرائیلیات مروی ہیں، اور نہ اونکی روایتیں حضرت ابوہریرہ سے تعداد میں زیادہ ہیں، یہ دعوے غلط در غلط ہیں،

اور ابوالاداد ابراہیم کے اوہام ہیں۔

واقعہ یرموک حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے، مال غنیمت میں اگر اس قسم کی کتابیں آتیں، تو کتب فتوح میں انکا ذکر ہوتا، پھر حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ کتابیں ہاتھ آتیں تو شخصی تصرف میں کبھی نہ آتیں، اور نہ حضرت عمرؓ ایسی بلائے عظیم افراد کے ہاتھ میں دینے والے تھے، اور مجھے اس میں بھی شک ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص جنگ یرموک میں شریک بھی تھے؟ تاہم وہ اون صحابہ میں تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور سب سے پہلے صحابی ہیں جو خود آنحضرت صلعم کے عہد میں احادیث نبوی کو قلمبند کر لیا کرتے تھے، اور اسی لئے حضرت ابوہریرہؓ نے یہ کہا ہے کہ مجھ سے زیادہ صحابہ میں کوئی حدیث جاننے والا نہ تھا، اِلّا عبداللہ بن عمرو بن عاص، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا (دیکھو صحیح بخاری باب کتابۃ العلم) بایں ہمہ اونکی روایتیں حضرت ابوہریرہ سے کم ہیں کہ اونکی سات سو اور ابوہریرہ کی ۵۳۷۴ ہیں، علاوہ ازیں جنھوں نے یرموک میں کتابوں کا اونکے ہاتھ لگنا بیان کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ان کتابوں سے روایت ناپسند کرتے تھے (لسان العرب و مجمع البحار لفظ مثناۃ و مثنی) اور اگر کبھی کرتے تو لوگ اون سے کہدیتے کہ نہیں رسول کی حدیث سنائیے (فتح المغیث سخاوی ص ۱۵۱ نولکشور)

نیز یہ واقعہ بھی کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص اسرائیلیات کے بڑے راوی ہیں، سراسر غلط ہے، اگر کسی کو توفیق ہو تو مسند احمد بن حنبل میں اونکی روایتوں پر ایک نظر ڈال کر میری تصدیق کرے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ صحف تورات سے واقف تھے؛ جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آنحضرت صلعم کی توراۃ میں پیشگوئی کے حوالہ سے ظاہر ہے۔ باقی رہے عبداللہ بن سلام تو ظاہر ہے کہ وہ یہودی عالم تھے، اور بعد کو آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے، اونکا اسرائیلیات کا ذکر کرنا چنداں تعجب انگیز نہیں، لیکن خود صحابہ اونکی اسرائیلی روایتوں کو ناپسند کرتے تھے، اسکی مثالیں حدیثوں میں مذکور ہیں، مگر اس قسم کی روایتوں کو وہ خود صحف انبیائے اسرائیل کے حوالہ سے نقل کرتے تھے، رسول اسلام کے حوالہ سے حدیث کہکر نہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارے دوست کا حضرت عبداللہ بن عمر کا نام لینا سراسر سہو و مسامحت ہے، حضرت عبداللہ بن عمر یعنی عبداللہ بن عمر بن خطاب سب سے بڑے متبع سنت تھے، انکو اسرائیلیات سے کوئی لگاؤ نہ تھا، شاید مضمون نگار کو اون پر عبداللہ بن عمرو ابن عاص کا دہوکا ہوا۔

حضرت ابن عباس کے نام سے بیشک تفسیروں میں اسرائیلی قصے مذکور ہیں، مگر محققین کی تصریح ہے کہ یہ حضرت ابن عباس کا کام نہ تھا، بلکہ زیادہ تر بعد کے لوگوں نے اونکی طرف انکو منسوب کر دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے چند اسرائیلی قصے بیان کئے ہیں، اگر اونھوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اونھوں نے کس سے سنا کیونکہ اونھوں نے خود کہدیا ہے کہ میں نے تورات نہیں پڑھی (بخاری بدء الخلق) اور سخاوی نے تصریح کی ہے کہ وہ اہل کتاب سے نہیں لیا کرتے تھے۔

اس تشریح و تفصیل کے بعد گذارش ہے کہ اسرائیلیات کا موضوع قصص و حکایات ہیں، احکام و سنن نہیں،

بنی اسرائیل سے اگر کسی ایک صحابی نے یا تابعی مفسروں نے واقعات نقل کئے ہیں تو وہ آسمان و زمین کی پیدائش، عجائب عالم پیغمبروں کے قصص اور پیشگوئیاں ہیں، وہ احکام اور سنن اور امر و نواہی نہیں، اور یہاں گفتگو احکام و سنن اور اوامر و نواہی میں ہے، اور اسی سے اسرائیلیات کا پہچان لینا فن حدیث کی معمولی مہارت سے بھی نہایت آسان ہے۔

پھر تمام محدثین اور آئمہ حدیث اور علماء نے ان اسرائیلیات کا غیر معتبر ہونا بتصریح لکھدیا ہے اور اس قسم کی روایتوں کو گنا دیا ہے، اور انکی علامتیں بتادی ہیں، اور ان اسرائیلیات کے نقل کرنیوالے زیادہ تر کعب احبار، ابن بنہ وغیرہ نومسلم یہودی ہیں، اسی لئے انکی روایتوں کا جو رتبہ علمائے حدیث کے نزدیک ہے وہ اس فن کے ادنے طالبعلم پر بھی واضح ہے۔

غلط ترجمہ حافظ ابن کثیر کا یہ قول کہ "ابن عباس بنی اسرائیل سے واقعات اخذ کرلیا کرتے تھے" معلوم نہیں مضمون نگار نے کہاں سے لیا ہے، کیونکہ اس میں اوس نے کتاب تک کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال حافظ ابن کثیر کا جو عربی فقرہ نقل کیا ہے، اوسکا عربی ترجمہ تمام تر غلط کیا ہے، اور غلط نتیجہ نکالا ہے، حافظ موصوف کا حسب ذیل فقرہ نقل کیا ہے۔

وکان ابن عباس تلقاہ من الاسرائیلیات اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:-

"یہ واقعہ ابن عباس نے اسرائیلیات سے لیا ہے"

اس فقرہ کا مطلب اسی قدر ہے کہ ابن عباس نے کوئی مخصوص واقعہ اسرائیلیات میں سے نقل کیا ہے نہ کہ عموم و استمرار عادت جو مضمون نگار نے ترجمہ سے ظاہر کیا ہے کہ:-

"ابن عباس بنی اسرائیل سے واقعات کو اخذ کرلیا کرتے تھے"

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا،

ایک اور تحریف مضمون نگار نے حافظ ابن حجر کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

"یاخذ من کلام غیرہ کبعض السلف الصالح او قدماء الحکماء او الاسرائیلیات"

یہ نہیں لکھا کہ ابن حجر کا یہ قول کہاں سے اوسکو ہاتھ آیا، توجیع النظر شرح نخبۃ الفکر میں یہ عبارت موجود ہے مضمون نگار نے ابن حجر کے اس قول کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے:-

"ابن عباس کبھی لے لیا کرتے تھے دوسروں کے کلام ماسوائے رسول اللہ صلعم کے جیسے بعض سلف صالحین کی باتیں، یا قدیم زمانہ کے حکماء کا کلام یا بنی اسرائیل کے واقعات"

مضمون نگار نے اس تحریف میں سب سے بڑی جرأت اور دلیری کی ہے، کہ اس عبارت میں ابن عباسؓ کا نام تک کوسوں نہیں ہے، اونکا اشارہ تک بھی نہیں ہے، پھر یہ کہ واقعہ کی صورت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ فرضی صورت بیان کی گئی ہے، اصل عبارت مع ترجمہ حسب ذیل ہے:-

ثم المدی قد یحمل الواضع تارۃ یاخذ من کلام غیرہ پھر روایت کو یا تو جعل بنانے والا خود گڑھ لیتا ہے اور یا کبھی وہ

کبعض السلف الصالح اوقدماء الحکماء او الاسرائیلیات — غیر رسول جیسے بعض سلف صالح یا قدیم حکماء یا اسرائیلیات کے کلام سے لے لیتا ہے"۔ (صفحہ ۱۴ مطبوعہ فاروقی)

اللہ اکبر! اس عالمانہ جرأت، فاضلانہ دلیری اور محققانہ بیباکی کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟ حافظ ابن حجر تو یہ کہتے ہیں کہ جعلی حدیث بنانیوالا کبھی خود عبارت گھڑ کر حدیث بنا لیتا ہے، اور کبھی دوسرے سلف صالحین یا پرانے حکماء اور یا اسرائیلیات کی باتوں کو حدیث بنا کر پیش کرتا ہے، اس کو نعوذ باللہ حضرت ابن عباس کا فعل بتانا، کس درجہ گستاخی ہے۔ مضمون نگار کا اس عبارت میں واضع کو جو فاعل ہے حذف کر کے ترجمہ میں حضرت عباس کا نام بڑھا دینا، میں نہیں جانتا کہ اسکو فن اخلاق کی کس اصطلاح سے تعبیر کروں۔ اسرار وجود کے متعلق قرآن سے زائد معلومات کی اہل عرب کو تلاش ہوتی تھی جیسا کہ نفس انسانی کی فطرت ہے، تو وہ اہل کتاب سے دریافت کرتے تھے، جو انھیں کی طرح انکے ملک میں بدوی تھے اور سنی سنائی باتیں جانتے تھے وہی باتیں وہ ان سے بیان کر دیتے تھے، اور یہ زیادہ تر حمیر قبایل والے تھے جو اسلام سے پہلے یہودی تھی، اس کے بعد موصوف نے لکھا ہے:

فلما اسلموا القوا علی ما کان عندھم مالا تعلق لہ بالاحکام الشرعیۃ التی یحتاطون لھا مثل اخبار بدء الخلقۃ وما یرجع الی الحدثان والملاحم وامثال ذالک، وھولاء مثل کعب الاحبار ووھب بن منبہ وعبداللہ بن سلام وامثالھم فاستلأت التفاسیر من المنقولات عنھم۔

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"تو جب یہ (حمیری یہودی) اسلام لائے تو جو معلومات ان کے پاس پہلے تھے جن کا کوئی تعلق ان شرعی احکام سے نہ تھا جنکے لئے وہ احتیاط کرتے تھے، بلکہ ان کا تعلق قصص وغیرہ سے تھا، جیسے آغاز آفرینش کے حالات، یا پیش آنیوالے حوادث اور فتنوں کی پیشین گوئیاں اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے متعلق وہ ان پر قائم رہے، اور یہ لوگ کعب احبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام اور ان کے جیسے دوسرے اشخاص ہیں تو نقلی تفسیریں انکی منقولات سے بھر گئیں"

ذرا اس عبارت کو مضمون نگار کے ترجمہ سے ملا کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے اپنے مطلب کے لئے کہاں کہاں الفاظ گھٹائے اور بڑھائے ہیں۔

یہ بے معنی الفاظ "تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کیجاتی ہے تعلق نہ تھا" سراسر محرف ہیں، حکیم ابن خلدون کا تو یہ کہنا ہے کہ اسلام کے شرعی احکام کے علاوہ جن میں وہ پوری احتیاط کرتے تھے، آغاز پیدائش وغیرہ کے وہ قصے جنکی تفصیل قرآن میں نہیں، اور جن سے ان اہل کتاب کو واقفیت تھی، اہل عرب ان سے انکو پوچھتے تھے، اور وہ بیان کرتے تھے۔

اسی طرح "قرب قیامت کی نشانیوں" کے الفاظ شاید مضمون نگار نے ملاحم کا ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ یہود کا اکثر حصہ سرے سے قیامت ہی کا قائل نہیں، قرب قیامت کے کیا معنی، ملاحم کے معنی فتنہ انگیز لڑائیوں کے ہیں اور محدثین فتنوں کے معنی میں یہ الفاظ بولتے ہیں۔ "جنتوں کی خبریں" کے الفاظ ابن خلدون کی عبارت میں سرے سے نہیں، یہ مطلب خیز اضافہ، موجودہ عہد دیانتداری کی

بہترین مثال ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے نہایت بے احتیاطی سے ایک ساتھ تمام دنیا کو احادیث کے مزخرفات میں شمار کر دیا ہے، کہتا ہے:۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح تر حدیثوں میں قصص ہوشربا، زمانہ ماضیہ کے عجیب غریب واقعات، زمین کی پیدائش، اسکا قیام، زلزلہ، پہاڑ اور درخت حیوانات، انسان کی پیدائش کے حیرت افزا حالات، آسمان، چاند و سورج (؟)، عرش، کرسی، لوح محفوظ، فرشتوں، بادلوں، بجلی رعد کی داستانیں۔ قبر کا عذاب، میزان، پل صراط، دوزخ، جنت، حور و قصور کے حیرت افزا کرشمے، معراج آسمانی، معجزات پیدائش و نزول، عیسیٰ دجال۔ مہدی، صحابہ اور اہلبیت کے مناقب اور مثالب، انکی مذمت و (؟) قیامت کی پیشین گوئیاں، بادشاہوں کے جور و ستم، اور انکی برائیاں، قربانی اور اسکا ثواب، حلال و حرام جانور، حد زنا، پاکی و ناپاکی اور ارکان دین کی باریکیاں حیل شرعی (؟) حیل شرعی، غرض جسقدر خرافات اہل کتاب کا قرآن نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ان سب سے حدیث، فقہ اور تفسیر پٹ گئی"

ہمارے دوست نے ایک سانس میں حق و باطل، رطب و یابس، صحیح و غلط کی بیسیوں مثالیں ایک ساتھ لکھ ڈالیں، حالانکہ صحیح تر حدیثیں ان میں سے اکثر خرافات سے تا متر پاک ہیں، آغاز آفرینش، پہاڑ، زلزلہ، بادل، معجزات پیدائش وغیرہ کے حیرت انگیز واقعات سے وہ مبرا ہیں، باقی باتیں وہ ہیں، جو کسی نہ کسی طرح خود قرآن مجید میں ہیں، یا وہ سرے سے مزخرف اور لغو ہیں، اور ان میں سے اکثر امور کے متعلق احادیث کا ضعیف موضوع اور ناقابل اعتبار ہونا، خود محدثین نے واضح کر دیا ہے، اور اون میں سے ایک ایک حدیث کو گنا دیا ہے۔ اور اونکے راویوں کو بتا دیا ہے اور اونکا بے اصل ہونا ثابت کر دیا ہے، اور اونہیں کا یہ احسان ہے جسکے سبب سے آپ اس قابل ہوئے کہ ان موضوعات کو شمار کرا سکیں۔ تو جن روایتوں اور باتوں کا بے اصل ہونا خود اونھوں نے ثابت کر دیا ہے، اونکو صحیح مان کر اون پر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

"یہ تو صحابہ کا حال تھا، اور جنھوں نے صحابہ تک سند پہنچائی انکا حال بھی سن لیجئے، ابن الحجر (؟) نخبۃ الفکر میں کہتے ہیں"

یاخذ حدیثاً ضعیف الاسناد فیرکب لہ اسناداً صحیحاً یعنی کسی لغو روایت کی اسناد ضعیف پاتے تو اوسکو سند سے ترکیب دے ڈالتے،

ابن حجر کی یہ عبارت نخبۃ الفکر میں تو نہیں ہے، البتہ توضیح النظر فی شرح نخبۃ الفکر میں ضرور ہے، مگر یہاں دو تحریفیں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اس کا فاعل خود تابعین کو بنا لیا گیا ہے، حالانکہ، زیر حوالہ کتاب میں اوسی پہلی عبارت کے بعد یہ فقرہ ہے جس میں فاعل "واضع" یعنی جالی حدیث بنانے والا ہے، نہ کہ تابعین، یا تبع تابعین یا کسی اور عہد کی تخصیص ہے، دوسری تحریف یہ ہے کہ ابن حجر نے اسکو بصورت واقعہ مستمرہ نہیں لکھا ہے کہ "پاتے اور اوسکو ترکیب دے ڈالتے"، بلکہ یہ لکھا ہے کہ جبلی حدیث بنانے کی مختلف صورتیں ہیں، یا نفس کوئی جھوٹا واقعہ گڑھ لے، یا بزرگوں اور حکیموں کے اقوال کو پیغمبر کی جانب منسوب کر دے یا یہ کسی حدیث کی سند ضعیف ہو تو اوسکے لئے اوسکے بجائے کوئی عمدہ سند بنا کر اوسکی روایت کر دے، یہ سب صورتیں ہیں، مضمون نگار کا

انکو صحابہ تک سند پہنچایئو الونکی عمومی اور استمراری حالت ظاہر کرنا کتاب کی عبارت میں تصرف کرنا ہے، ترجمہ میں مضمون نگار نے جو تغیر و اضافہ کیا ہے، اوسکی شکایت کہانتک کیجائے۔

مقدمۂ ابن خلدون میں تحریف

اسی سلسلہ میں مضمون نگار نے مقدمۂ ابن خلدون کی ایک عبارت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"جو لوگ یہودی تھے، جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کیجاتی ہے العقول نہ بنا، مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں، اور فتنوں کی خبریں، وہ سب انکی وجہ سے مسلمانوں میں ابتک ہو گئی (۹)"

یہ بے معنی فقرے جنکا کوئی مطلب ہی نہیں سمجھا جاسکتا، حکیم ابن خلدون کا مفہوم نہیں، حکیم موصوف نے یہ لکھا ہے، کہ نقلی تفسیر میں رطب و یابس اور مقبول و مردود کی ہر قسم کی روایتیں بھر گئی ہیں، جسکا سبب یہ ہے کہ اہل عرب کے پاس کوئی سابق کتاب یا علم تھا تو اسباب خلق دنیا، ابتدائے آفرینش وغیرہ وہ اسرائیلیات سے لے لیتے تھے۔

وضع احادیث

اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض لوگ جعلی حدیثوں کے بنانے کے مجرم تھے، نہ صرف یہ چند لوگ جن کے نام مضمون نگار نے لکھے ہیں، بلکہ اور بھی اشخاص اس گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن آئمہ حدیث، ماہرین رجال اور محققین فن نے اس قسم کی ہر روایت کا پتہ لگایا ہے، اس قسم کے ہر راوی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا ہے، اور اس پر مبسوط کتابیں لکھی ہیں ابن ابی حاتم، ابن جوزی، مقدسی، سخاوی، شوکانی، سیوطی، ملا علی قاری، طاہر فتنی، وغیرہ کی موضوعات کی تفصیل میں کتابیں موجود ہیں، اور ان میں سے اکثر چھپ گئی ہیں، جن میں ایک ایک موضوع حدیث کو گنا دیا ہے، اور بتا دیا ہے اب اگر کسی کو اس پر بھی پورا اطمینان نہ ہو، تو وہ اس باب میں مزید تحقیق کرسکتا ہے، یا انکو مشکوک کہدیا جائے، مگر اس کا یہ نتیجہ نہیں ہوسکتا کہ تمام احادیث کا بالکلیہ انکار کردیا جائے، اگر چند آدمیوں کا جھوٹا ہونا ہم پر ثابت ہوجاتا ہے، تو ہم کبھی بھی یہ نہیں کرتے کہ ہم بالکلیہ تمام آدمیوں کو جھوٹا سمجھ کر، دنیا کی تمام روایتوں اور باتوں کے تسلیم کرنے سے قطعی انکار کردیں۔

کتب حدیث میں ضعیف روایتیں

یہ بھی صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ بھی کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، علمائے حدیث اور آئمہ فن نے ان کتابوں پر تنقیدی بحثیں کرکے ہر ایک کا درجہ متعین کردیا ہے، اور جو چند واقعات آپ نے لکھے ہیں وہ اونھیں کی خوشہ چینی ہے، تاہم اگر آپکو اونکی تحقیقات پر بھروسہ نہیں، تو آپ خود اون اصولوں کے ساتھ جو فن میں مدون ہیں تحقیق مزید کرلیجئے، اس کا یہ نتیجہ تو نہیں ہوسکتا کہ سرے سے تمام کتابوں کو ساقط الاعتبار قرار دیدیجئے۔ فن کے اماموں نے خود صحیح بخاری پر تنقیدیں کی ہیں، اونکے بعض بدعتی راویوں پر اعتراض کئے ہیں، یہ آپ بھی مہارت فن کے بعد کرسکتے ہیں، یہ کوئی بری بات نہیں؛

چند اور بے بنیاد دعوے

مضمون نگار لکھتا ہے:

"حد ہوگئی کہ حضرت عائشہ تین برس میں آنحضرت صلعم سے بیاہی جاتی ہیں، اور چھ سال میں ان سے ہمبستری ہوتی ہے"

اللہ اکبر! یہ کذب و افترا! اپنے اس دعوے کی تائید میں مضمون نگار کوئی چھوٹی سی چھوٹی حدیث بھی پیش کر دے، تو میں اوسکے تمام دعووں کو بے دلیل ماننے کے لئے تیار ہوں، احادیث میں جو کچھ ہے وہ تو یہ ہے کہ چھ یا سات برس میں نکاح، اور نو برس میں رخصتی، یا خلوت، آخر مضمون نگار کو اس دانستہ غلط بیانی سے کیا حاصل؟

ایک جگہ بکمال تحقیق فرماتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ التحیات خود ایک بدعت ہے جو نماز میں بعد کو زیادہ کی گئی اور حدیث سے ثابت نہیں اور اسطرح بہت سے ارکان کا اتلاف اور حذف جو حنفیوں میں ہے، اوسکی کوئی سند حدیثوں میں نہیں"

اس سرتاپا بے بنیاد اور بے دلیل دعوے تو کیا کہا جائے، کیا یہ ارشاد ہو سکتا ہے کہ یہ بدعت اسلام میں کب داخل ہوئی اور اسکی تاریخ کیا ہے؟ اور اس کا بانی کون ہے؟ ایک حدیث نہیں، بیسیوں حدیثوں سے التحیات کا ثبوت ملتا ہے، یہاں تک کہ صحابی فرماتے ہیں کہ "ہمیں آنحضرت صلعم اوس تاکید و اہتمام سے التحیات سکھاتے تھے۔ جیسے قرآن کی سورہ" حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی۔ جسکی کتاب الصلوۃ میں اسکے متعلق حدیثیں نہ ہوں، میں آسانی کی خاطر حدیث کی چند کتابوں کا حوالہ دیتا ہوں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداود وغیرہ کتب معتبرہ کی کتاب الصلوۃ، باب التشہد ملاحظہ فرمائیے، اور تحقیق کی داد دیجئے، کیا اسی "مستشرقانہ تحقیق" کی ہم جاہل مولویوں کو دعوت دیجاتی ہے،

پھر التحیات کے سلسلہ میں حنفیوں کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی، یہ تو حنفی شافعی، مالکی، حنبلی، اہل حدیث، مقلد اور غیر مقلد، بلکہ شاید شیعوں میں بھی بلکہ تمام اسلامی فرقوں کی نماز کا ایک جزء ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے بنیاد دعوے کی ہمت ایک لکھا پڑھا آدمی کیونکر کر سکتا ہے۔

اشاعت اسلام میں کاوٹ فرماتے ہیں:۔

"کم سے کم میری ہمت نہیں پڑتی، کہ انگریزی پبلک کے ہاتھوں میں کوئی حدیث و فقہ و تفسیر کی کتاب دے سکوں، یا اس کے بعد مجھے امید باقی رہے گی کہ وہ اسلام کو قبول کرے گا"

ہاں بیشک آپکو یہ ہمت نہیں پڑ سکے گی، جسکو خود اطمینان نہیں، وہ دوسروں کو اطمینان کیا دلا سکے گا۔ مگر دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں، جنکو اس پر اطمینان ہے اور وہ اوسکو نہ صرف "انگریزی پبلک" بلکہ تمام یورپ کی پبلک بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور وہ کامیاب ہیں، اور لوگ اونکو دیکھکر مسلمان بھی ہوجاتے ہیں، مگر آپ کی اس بے اطمینانی سے تو شاید ایک بھی مسلمان نہ ہوا ہو، کہ آپ کے اصلاح یافتہ نماز جسکا نقشہ آپ نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے اوسمیں اور اوسکی گرجا کی نماز میں کیا فرق ہے؟ کیوں صاحب! پرانے یہودیوں اور مجوسیوں کی نماز کی نقالی تو سراسر گمراہی، جسمیں نعوذ باللہ، رسول اکرم، صحابۂ کرام، آئمہ علام، اور عامۂ مسلمین گرفتار ہوگئے، مگر نئے یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کی نقالی کیوں موجب برکت ہے؟ کیا اس لئے کہ آج اتفاق زمانہ سے وہ برسراوج اور ہمارے حکمراں ہیں، اپنی مجوزہ اسلامی نماز کا

کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

" لیکن مجھے ہمیشہ یہ خلجان رہا کہ عجمیوں اور غیر حافظ قرآن کا نماز میں قرآن پڑھنا جبکہ (قرآن کتاب میں ہے) کیا اس طرح ممکن نہیں کہ امام قرآن کو اپنے سامنے میز پر کھول کر حاضرین کی طرف منہ کرکے قرأت کے ساتھ پڑھے، اور پھر اسکے معنی و تشریح کرے جس طرح یہودی اور عیسائی اپنے معابد میں انجیل و تورات سے ساتھ عمل کرتے ہیں، اور قرآن کے ختم کے بعد رکوع و سجدہ میں خدا کی تسبیح کے ساتھ نماز ختم کر دی جائے۔ پھر اسکے بعد خوش الحانی اور نغمہ کے ساتھ مناجات اور دعائیں مانگی جائیں۔"

لیکن مسلمان نمازی اگر آپ کے حسب مشورہ عمل کریں، تو کیا آپ کے بعد کوئی آپ ہی جیسا اور محقق کرکے نئی بنابیع القرآن یا ینابیع الاسلام نہ لکھ ڈالے گا، اور اسرائیلیات و نصرانیات فی الاسلام کا آپ سے بھی زیادہ تیز و تند طعن نہ دے گا، قدیم اہل کتاب کی مشارکت و مماثلت سے اس شدت کے ساتھ اظہار نفرت بھی۔ اور جدید اہل کتاب کے اسرائیلیات و نصرانیات کی طرف میلان بھی یہ تضاد کا عالم فہم سے بالاتر ہے، اور یورپ اپنی موجودہ پر تکلف مصنوعی نماز سے گھبرا کر اسلام کی سادہ، بے تکلف، بے تصنع اور فطری مکالمہ الٰہی کی طرف تڑپتا ہے، اوسکو اسلام کی اس اکیسویں صدی عیسوی کی مجوزہ اسلامی نماز سے کیا سکون قلب میسر ہو سکتا ہے کیا یہ چیز پہلے سے اوسکے پاس نہیں ہے؟

فلسفہ شک اور احادیث

بالآخر ہمارے کرمفرما ان تمام محرف اور غیر ثابت دلائل کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:۔

" پس حدیث کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کی بنیاد اور اوسکا حلال و حرام اور اوسکا جواز و عدم جواز مشکوک روایات پر قائم ہو سکتا ہے، اور کیا قرآن کے صریح احکام کے مقابل مشکوک کو ترجیح دیجائے گی، اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا تو کسی حدیث کو صرف اس لئے مان لینا کہ بخاری شریف کے مضمون میں موجود ہے، اگر بخاری پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟"

مجھے نہایت خوشی ہے کہ ہمارے منکر حدیث دوست اس حد تک تو اتر آئے کہ احادیث کے اصولی انکار کی جگہ، اونکے مشکوک ہونے کی وجہ سے عدم قبول پر مائل ہوئے، یہ بڑی کامیابی ہے، اب صرف یہ کرنا باقی ہے کہ اون کے شک کو یقین سے بدل دیا جائے۔

موصوف کی مراد اس شک سے اگر منطقی اور فلسفیانہ معنی میں شک ہے تو ظاہر ہے کہ ہر گذشتہ، اور موجودہ، بلکہ ہر واقعہ پر منطقی اور فلسفیانہ کاوش کی بنا پر شک ہو سکتا ہے، تا آنکہ وہ بداہت اور مشاہدہ حواس سے ثابت نہو جائے، اور مشاہدہ حواس پر بھی اوس فلسفی کو کیا اطمینان ہو سکتا ہے جو حواس کی غلطی پر یقین رکھتا ہے،

موصوف نے" اجماع امت" کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ" اجماع" کے قائل ہیں، اگر یہی اصول وہ تسلیم کرلیں تو بھی ہمارے اونکے بہت سے اختلافات دور ہو جائیں، اور اصول میں خواہ کچھ فرق ہو، مگر نتائج میں وہ اور عام مسلمان

متفق ہو جائیں۔

یہ کہنا کہ "حدیث کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں" ایک ایسا دعوٰے ہے جو نقل اور حوالہ کا محتاج ہے، صرف چند کتابوں یا چند حدیثوں کی نسبت شک ثابت کر دینے سے مطلق حدیث کے متعلق یہ کہدینا کہ "امت کا اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں" غلط منطق ہے، چند افراد کے استقصا سے کلیہ نہیں درست ہوتا۔

بہر حال اگر "شک" سے مراد ذہنی شک یا فلسفیانہ شک ہے تو یقیناً تمام تر احادیث مشکوک ہیں، اور نہ صرف حادیث بلکہ تمام دنیا کے اخبار، تواریخ ایام، واقعات مسموعہ، اور روزمرہ کے واقعات کے اطلاعات، سب مشکوک ہیں، لیکن روزانہ کے عملی کاروباروں، قانونی شہادتوں، اور دوسرے عملی اداروں میں اس فلسفیانہ شک کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، اور نہ ہم آپ کوئی اس فلسفیانہ شک کے سبب سے روزانہ کے کاروبار میں عملاً شک کرتے ہیں، ہر خط جو کہیں سے آتا ہے، یا خبر جو ہمارے پاس پہنچتی ہے، ہر سرکاری فرمان و مراسلہ جو آپکے دفتر میں موصول ہوتا ہے، اون سب کے اصلی ہونے کے متعلق ہزاروں منطقی اور فلسفیانہ شکوک ہیں، جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، مگر کیا آپ کبھی عملاً ان پر شک کر کے انکو رد کر دیتے ہیں؟ اور ان احکام کے تعمیل سے آپ اپنے افسروں کی گرفت سے یہ کہکر نجات پا سکتے ہیں کہ مجکو اسی حکم نامہ یا مراسلہ سرکاری ہونے میں فلسفیانہ دلائل کی وجہ سے شک تھا کیونکہ ممکن ہے کہ کسی نے سرکاری کاغذ و لفافہ کو چرا کر آپکے نقلی دستخط بنا کر بھیجدیا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے شکوک آدمی کا عملی دنیا میں کیا حشر ہوگا؟

گھر سے ایک خادم آکر آپ کو اطلاع دیتا ہے کہ آپکی اندر طلبی ہے، آپ فوراً اُٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کیونکہ عملاً آپ خادم پر اعتبار کرتے ہیں تو اوسکے حالات سے اوس کا جھوٹا ہونا ثابت نہیں، اور آپ یہ نہیں کہتے کہ ممکن ہے کہ یہ اس وقت جھوٹ بول رہا ہو، یا اوس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو، یا کسی دوسرے کے نام کو میرا نام سمجھا ہو، یا اوس نے کانوں سے سننے میں غلطی کی، حالانکہ یہ تمام فلسفیانہ احتمالات اسمیں ممکن ہیں۔

بہر حال احادیث کی دو قسمیں ہیں، ایک احاد، یعنی جس کے سلسلہ میں ایک ہی ناقلِ واقعہ ہو، اور نہ اوسکی کوئی دوسری موید روایت ہے، ایسی روایتوں کو بیشک آپ مشکوک کہہ سکتے ہیں، نیز معنعن روایتوں میں بھی آپ گفتگو کر سکتے ہیں، لیکن وہ حدیثیں اور روایتیں جو مختلف راویوں سے متعدد اور کثیر طریقوں اور سلسلوں سے مذکور ہیں، قریب قریب معنوی تواتر تک پہنچ کر شک و شبہ سے بالاتر ہیں، اسلام کے تمام ضروری ارکان اور اعمال الحمدللہ کہ اسی قسم کی روایتوں سے ثابت ہیں، اور ساتھ ہی سنت متواترہ اونکی تائید میں ہے،

ہاں۔ اگر کوئی ایسی صحیح حدیث ہو جو قرآن کے صریح مخالف ہو تو یقیناً وہ رد کر دینے کے قابل ہے، اور خود علمائے اُصول نے یہ بات تسلیم کی ہے، اور خود آپ نے ابن جوزی کی یہ عبارت نقل کی ہے، کہ اونکے نزدیک ہر وہ روایت جو قرآن یا سنت متواترہ، یا اجماع قطعی، یا عقل صریح کے مخالف ہو، ناقابلِ اعتبار ہے، یہی حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے، (دیکھو شرح

تحفہ ابن حجر صفحہ ۱۴۱، فاروقی) تو جب یہ اُصول علمائے حدیث خود تسلیم کرتے ہیں، تو پھر ان پر آپ کا اعتراض کیا رہا، مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا عقل صریح کی مخالفت واقعتاً ثابت ہو، صرف آپ کا غلط اجتہاد، زعم باطل اور قیاس مع الفارق نہ ہو،

اس تفصیل کے بعد اگر آپ کسی ایسے شخص کو پاتے ہیں، جو قرآن، یا سنت متواترہ، یا اجماع قطعی، یا عقل صریح کے مخالف ہونے یا کسی اور روایتی نقص کے باوجود "بخاری شریف کے مضمون میں موجود" ہونے کے باعث کسی روایت کو تسلیم کر لینے پر اڑا ہو، تو ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر اس پر "بخاری پرستی" کا الزام لگانے کو تیار ہیں،

اعتراف اس تمام اخذ و رد، سوال و جواب، اور قیل و قال کے بعد میں مضمون نگار کی اس انصاف پسندی، قبول حق، اور رجوع عن الباطل کے جذبہ کی پوری قدر کرتا ہوں، اور یہ دیکھ کر مجھے حد درجہ خوشی ہوئی کہ گو موصوف نے میرے مضمون سنت کا جواب لکھا ہے، مگر اس نقطۂ نظر اور نتیجۂ بحث کو انہوں نے نہایت عمدگی سے قبول کر لیا ہے جس کی خاطر وہ مضمون لکھا گیا تھا، چنانچہ ممدوح نے نہایت تفصیل، وضاحت، اور فراخدلی کے ساتھ یہ تسلیم کیا ہے کہ:۔

"سنت، فقہ، حدیث، تین مختلف چیزیں ہیں، جنہوں نے قرآن کی جگہ اسلام میں لے رکھی ہے"

موصوف نے کس خوبی سے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ سنت اور حدیث دو مستقل چیزیں ہیں، اور حدیث یعنی "زبانی روایات" جنکو "یوں مشتا" کہتے ہیں، وہ اور سنت دو مختلف اور مستقل چیزیں ہیں۔

اس کے بعد موصوف نے "سنت کو قرآن کی جگہ دے لینے" کا جو الزام علمائے اسلام پر قائم کیا ہے، اس کے بعد ہی موصوف نے بہت خوبی کے ساتھ سنت کو مذہب کا صحیح اصول تسلیم کر کے علمائے اسلام کی ہم آہنگی کی ہے، فرماتے ہیں:۔

"سنت وہ زبانی طریقے (؟) اعمال ہیں جو مسلمان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ابتداء سے چلے آئے، اور اوس پر عامل رہے یعنی رسول اللہ کے طریقہ کو اصحاب نے دیکھا، اصحاب کو تابعین نے، تابعین کو تبع تابعین نے، اور اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ ایک طریقہ اسلام کے مذہبی اعمال کا مسلمانوں میں جاری رہا، سنت کا ساتھ قرآن کے ساتھ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ عمل ظاہری ایسے صاف تھے کہ اس پر کسی رد و قدح کی ضرورت نہ تھی، اور نہ سنت متواترہ پر کسی حسب تقاضا عقل کو کلام یا اعتراض ہو سکتا ہے، خود قرآن شریف میں اگرچہ نماز کے طریقہ پر سکوت اختیار کیا گیا ہے، مگر ایک آیت میں اسکا پتہ ضرور چلتا ہے کہ سنت متواترہ پر عمل کرنے کی رائے دی گئی ہے، (کیا اللہ میاں نے بطور مشورہ کے رائے دی ہے؟ سلیمان) چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ تم نماز پڑھو جیسی تمکو سکھلائی گئی ہے، مسلمان اس سے مشکل سے انکار کرے گا، کہ جو نماز مسلمانوں کی جماعت پڑھ رہی ہے، وہ بجز معمولی فروعی اختلاف کے سنت متواترہ نہیں ہے عملی مذہب کے لئے سنت متواترہ کا اصول ضروری ہے، اور یہ صورت اسلام میں قائم رہتی، اگر فقہاء کا دور دورہ نہ ہوتا جن کے مبارک وجود نے اسلام کو سیاست (؟) سے گذار کر کے اسلام کو ایک قومی مذہب بنا دیا۔"

اخیر فقرہ کے علاوہ ہمارے دوست کے یہ خیالات حرف حرف میرے مضمون سنت کی تائید میں ہیں، مجھے موصوف کے ان فقروں کو پڑھ کر اون سے آیندہ بہت کچھ نیک توقع پیدا ہو گئی ہے، اور امید پیدا ہو چلی ہے کہ شاید دو چار تحریروں کے بعد وہ پوری طرح ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے۔

راہ پر اونکو لگا لائے تو ہیں باتوں میں،
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں،

سید سلیمان ندوی

نوجوان بادشاہ

جو دن تاجپوشی کے لئے مقرر تھا، اس سے ایک رات قبل نوجوان بادشاہ اپنے خوبصورت ایوان میں بیٹھا ہوا تھا، تمام درباری حسب قاعدہ زمین بوس ہو ہوکر قصرِ شاہی کے بڑے کمرے میں افسر تشریفات سے ہونیوالے دربار کے آداب حاضری و حضوری کے چند آخری سبق لینے چلے گئے تھے، کیونکہ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جن کے اطوار ابھی بالکل فطری تھے، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک دربار کے اندر اس قسم کے اطوار سخت ناپسندیدہ خیال کئے جاتے ہیں

نوعمر بادشاہ نے جسکی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ ان درباریوں کے چلے جانے کے بعد اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چپرکھٹ کے زرکار نرم گدوں پر لیٹ گیا۔ اس کے لب کھلے ہوئے تھے، اور آنکھیں حیران، گویا وہ کوئی ہرن تھا جسے جنگل میں شکاریوں نے ابھی گرفتار کیا ہو۔

اور یہ واقعہ بھی تھا کہ وہ برہنہ ہاتھ میں بانسری لئے گڈریہ کے گلہ کے پیچھے پیچھے جارہا تھا کہ اُسے پکڑ لائے۔ یہ بڈھے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کا لڑکا تھا جس نے ایک ادنیٰ درجہ کے آدمی سے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ شخص کوئی اجنبی تھا جس نے اپنی عجیب وغریب جادو بھری بانسری بجاکر شہزادی کو فریفتہ کر لیا تھا، اور بعض کا یہ قول تھا کہ وہ شخص یمینی کا رہنے والا ایک نقاش تھا جسکی شہزادی نے ضرورت سے زیادہ عزت افزائی کی تھی۔ اور جو بعد کو گرجا میں اپنا کام نامکمل چھوڑکر شہر سے اچانک غائب ہوگیا تھا۔

یہ لڑکا ابھی صرف ایک ہفتہ کا ہوگا کہ سوتا ہوا اپنے ماں کے پہلو سے چُرا لیا گیا، اور پرورش کے لئے ایک معمولی کسان کو دیدیا گیا تھا جو ایک دن سے زیادہ کی مسافت پر جنگل کے ایک دور افتادہ حصہ میں رہا کرتا تھا۔ اور اُس حسین شہزادی کا یہ حشر ہوا کہ ٹھیک اُسوقت جبکہ معتمد شاہی بچہ کو اپنے آگے گھوڑے کی زین پر لٹا کرلے گیا، اور اُس نے اپنے تھکے ہوئے مرکب سے اُترکر اس غریب گڈریہ کی جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو اس شہزادی کی لاش ایک ویران قبرستان میں قبر کے اندر اُتاری جارہی تھی، جہاں ایک اور لاش بھی پہلے سے موجود تھی جو کسی نہایت ہی چھیل مگر اجنبی نوجوان کی تھی، اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے، اور اُسکے سینہ پر خنجر کے بہت سے سُرخ سُرخ زخم تھے، اطباء دربار تو یہ کہتے تھے کہ شہزادی کی موت فرطِ غم یا طاعون سے واقع ہوئی۔ لیکن بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب شہزادی بیدار ہوئی تو کوئی نہایت سریع الاثر اطالوی زہر شراب کے ایک جام میں ملاکر اسکو پلا دیا گیا جس کے اثر سے وہ ایک گھنٹہ کے اندر مر گئی۔

جب بڈھا بادشاہ مرض الموت میں گرفتار ہوکر صاحب فراش ہوا، تو اُس نے یا تو اپنے گناہ پر پشیماں ہوکر یا اس

خیال ہے کہ سلطنت اُسکے خاندان سے باہر نہ نکلے، اُس لڑکے کو بلا بھیجا، اور ارباب حکومت کے سامنے اسکو اپنا ولیعہد تسلیم کر لیا۔

اُسی اولین لمحہ سے جب وہ ولیعہد تسلیم کیا گیا، حسن و جمال کے ساتھ اسکی پسندیدگی کا اظہار ہو گیا تھا، جس کا اُس کی آیندہ زندگی پر اثرانداز ہونا مقسوم ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس کے معیت میں رہتے تھے اُنکا بیان ہے کہ جب خوبصورت زرنگار ملبوس اور جواہر کو دیکھتا جو اُسکے لئے فراہم کئے گئے تھے تو اُسکے منھ سے بیساختہ نعرۂ مسرت نکل جاتا اور فرط مسرت سے اپنا چرمی کرتا اور بھدی پوستین اُتار کر پھینکدیتا۔ اگرچہ بعض اوقات اپنی صحرائی زندگی کی دلپسند آزادی کا خیال بھی اُسے آجاتا تھا اور وہ اکثر ان تکلیف دہ درباری مراسم کا مذاق بھی اُڑاتا تھا جن میں دن کا بڑا حصہ اُسے ہر روز گذارنا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسکا شاندار محل بھی اُسے ایک نئی دنیا نظر آتا تھا، جو اُس کے عیش و راحت اور مسرت و شادمانی کے لئے از سر نو آراستہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ جونہی اُسے بزم مشاورت یا ایوانِ دربار سے فرصت ملتی، وہ دوڑ کر محل کے اس عظیم الشان زینہ پر چڑھ جاتا جسکی سیڑھیاں چمکدار سنگ سماق کی تھیں اور جس کے دونوں طرف طلائی ملمع کئے ہوئے برنجی شیر نصب تھے۔ محل میں پہونچکر ایک کمرہ سے دوسرے کمرے میں اور ایک غلام گردش سے دوسری غلام گردش میں اس طرح پھرتا گویا وہ ان مناظرِ جمیل میں اپنے زخم کا مرہم اور درد کا علاج ڈھونڈھ رہا تھا۔

چہل قدمی اُس کے لئے ایک ایسی سیاحت تھی جس کے ذریعہ سے گویا وہ کسی طلسم بند سرزمین میں پہونچ جاتا تھا، اور وہاں کے حیرتناک مناظر میں یکسر غرق ہو جاتا تھا، اس سیاحت میں اکثر و بیشتر وہ تنہا ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی وہ چند نازک بدن، عنبریں مو نوجوان خدام بھی اُس کے ساتھ ہوتے، جن کی ڈھیلی عباؤں کے دامن اور خوشرنگ فیتے ہوا میں اُڑکر رنگین تموج پیدا کرتے تھے لیکن اس کا یہ احساس ہمیشہ تنہائی میں بیدار ہوتا اور فنون لطیفہ کے اسرار خلوت ہی میں خوب منکشف ہوتے ہیں، اور حسن و جمال کی دیوی اسی پرستار کو عزیز رکھتی ہے جو اُسکی پرستش تنہائی میں کرے۔

اس زمانہ میں اس کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں بیان کی جاتی تھیں، ایک قصہ یہ تھا کہ کسی تنومند اور لحیم و شحیم امیر نے جو شہر کے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے آیا تھا، نوعمر بادشاہ کو ایک نئی تصویر کے آگے جو ابھی وینس سے آئی تھی اس طرح دوزانو بیٹھے ہوئے عالم محویت میں دیکھا گویا وہ سچ مچ اس کی پوجا کر رہا ہے اور اس طرح شاید اب ملک میں بعض جدید دیوتاؤں کی پوجا کا رواج ہونیوالا ہے۔ ایک اور موقعہ پر نوعمر بادشاہ کئی گھنٹے تک مسلسل لوگوں کی نظروں سے غائب رہا اور کافی تجسس کے بعد جب اسے قصر شاہی کے شمالی برج میں دیکھا گیا تو حالت یہ تھی کہ وہ عالم محویت میں ایک جواہر کی طرف دیکھ رہا تھا، جس پر ایڈونیس[۱] دیوتا کی تصویر کندہ تھی، ایک قصہ یہ بھی ہے کہ ایک روز اُسے اس حالت میں دیکھا گیا کہ حسین بُت کی مرمریں پیشانی کو بوسہ دے رہا تھا، یہ بُت ایک سنگین پل کی تعمیر کے وقت دریا

[۱] ایڈونیس (Adonis) قدیم یونانیوں کا ایک نہایت خوبصورت اور نوجوان دیوتا تھا جس پر وینس (Venus) عشق و محبت کی

کی تہ سے برآمد ہوا تھا، اور اس پر شہنشاہ ہیڈرین[1] (HADRIAN) کی ایک خوبصورت کنیز کا نام کندہ تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ رات بھر بیٹھا دیکھتا رہا کہ اینڈیمیون[2] (ENDYMION) کے نقرئی بُت پر چاندنی کا کیا اثر ہوتا ہے۔

الغرض تمام نادر اور بیش قیمت چیزیں اُسکے لئے ایک زبردست کشش رکھتی تھیں، اور عمدہ اور بیش قیمت چیزوں کے شوق میں اس نے بہت سے تاجر دوسرے ملکوں کی طرف روانہ کئے۔ بعض کو شمالی سمندروں کی طرف بھیجا کہ وہاں کے ماہی گیروں سے عنبر خرید کر لائیں۔ بعض کو مصر روانہ کیا کہ وہاں سے وہ عجیب و غریب نادر و بیش قیمت سبزی مائل فیروزے مول لائیں، جن میں خاص طلسمی خاصیتیں بیان کی جاتی ہیں، اور جو صرف فراعنۂ مصر کی قبروں میں دستیاب ہوتے ہیں، کچھ تاجر ایران بھیجے گئے کہ وہاں سے ریشمی قالین اور منقش ظروف حاصل کریں۔ کچھ ہندوستان کی طرف روانہ کئے گئے، تاکہ وہاں سے باریک ململیں منقش ہاتھی دانت کا سامان، نیلم کے کنگن، صندل اور نفیس پشمینہ کے دوشالے فراہم کرکے لائیں۔

لیکن سب سے زیادہ توجہ نوعمر بادشاہ کی اپنی اس پوشاک پر تھی، جسے وہ تاجپوشی کے روز پہننے والا تھا، یہ پوشاک اعلےٰ درجہ کے زر بفت کی بنائی گئی تھی، تاج جواہر نگار تھا جس میں بڑے بڑے قیمتی لعل نصب تھے اور مرصع عصائے شاہی تھا جس پر ورہائے شاہوار جڑے گئے تھے وہ اپنے پُرتکلف بستر پر لیٹا ہوا شاہ بلوط کے اس بڑے لٹھے کو دیکھ رہا تھا جو کھلے آتشدان میں جل جلکر غائب ہوتا جاتا تھا، اور انھیں باتوں پر غور کر رہا تھا۔ مہینوں پہلے بڑے بڑے ماہرین فن نے بہترین نمونے اس کے پاس بھیج دیئے تھے، اور اُس نے تمام مشہور کاریگروں کو طلب کرکے حکم دیدیا تھا کہ شب و روز محنت کرکے ان کو تیار کریں، وہ عالم خیال میں اپنے آپ کو شاہی لباس پہنے بڑے گرجا میں کھڑا دیکھتا تھا۔ اور اُسکے نوجوان بدن پر ایک تبسم لرزاں انبساطی کیفیت کا اظہار کر رہا تھا، جسکی جھلک اُسکی سیاہ وحشی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دود کش کے منقش سائبان کے سہارے کھڑا ہوکر کمرہ میں جہاں اسوقت بہت دھیمی روشنی تھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دیواروں پر بیش قیمت مشجر کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرہ کے ایک کونے میں کپڑوں کی ایک خوبصورت الماری سجی ہوئی تھی، جس پر عقیق اور لاجورد سے منبت کاری کی گئی تھی۔ اور دریچہ کے سامنے ایک عجیب وضع کی بند الماری تھی۔ جس پر طلائی تاروں کے علاوہ مرگانگ کا بھی کام بنا ہوا تھا۔ اس پر شہر وینس کے بنے ہوئے چند نہایت نازک اور خوبصورت

دیوی دل و جان سے فریفتہ تھی۔ اس جوان دیوتا کو شکار کھیلتے وقت ایک دوسرے دیوتا مریخ نے جو وینس کا عاشق اور ایڈونیس کا رقیب تھا جنگلی سور بنکر مار ڈالا۔ جب وہ مردوں کی دنیا میں گیا تو وہاں اُس پر پلوٹو (PLUTO) کی بیوی جو پاتال کا دیوتا تھا عاشق ہوگئی۔ بالآخر ایڈونیس کو اس شرط پر دوبارہ زندہ کردیا گیا، کہ وہ چھ مہینے تک دنیا میں اور چھ مہینہ پاتال میں رہا کرے۔ ۱۲۔

[1] ہیڈرین (HADRIAN) روم کا بہت بڑا اور مشہور شہنشاہ تھا (۷۶ لغایت ۱۳۸ء) وہ ۱۲۱ء میں برطانیہ گیا اور نیوکیسل و کارلائل کے درمیان دیوار تعمیر کی۔

[2] اینڈیمیون (ENDYMION) صنمیات یونانی کا ایک نوجوان اور خوبصورت دیوتا جس پر چاند کی دیوی عاشق تھی یہ ہر وقت سوتا رہتا تھا۔

بلوریں جام رکھے ہوئے تھے اور سیاہ رگون کے ایک ڈال سنگ سلیمانی کا ترشا ہوا پیالہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ریشمی پلنگ پوش پر زرد ریشم سے لالہ کے پھول کاڑھے گئے تھے۔ جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا کسی سونے والے کے ہاتھ سے عالم بے خبری میں ابھی ابھی بستر پر گرے ہیں، پلنگ کا مخملی شامیانہ ہاتھی دانت کے ڈنڈوں پر تنا ہوا تھا۔ جس کے کنارے ہلکی نقرئی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ اور چھت میں شتر مرغ کے پروں کے بڑے بڑے گچھے آویزاں تھے۔ جو بالکل کفِ دریا معلوم ہوتے تھے۔ شامیانہ کے اوپر یونانیوں کے خود پرست دیوتا نارکسس[1] (NARCISSUS) کا ایک سبز برنجی بت نصب تھا۔ جس کے ہاتھ میں جو سر کی طرف بلند تھا ایک مصقل آئینہ تھا۔ اور میز پر نیلم کا ترشا ہوا ایک چوڑا اور کھلے منہ کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔

محل سے باہر اس بڑے گرجا کا عظیم الشان گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تاریک سمندر میں ایک بہت بڑا حباب تیر رہا ہے دریا کے کنارہ پشتہ پر سپاہی سستی کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے بھی دکھائی دیتے تھے اور فاصلہ پر کسی باغ میں ایک بلبل چہک رہا تھا۔ غرفہ میں سے سمن و نسترن کی بھینی بھینی خوشبو کمرہ کے اندر آرہی تھی۔ اُس نے اپنے سنہرے بالوں کو جو پیشانی پر منتشر تھے۔ انگلیوں سے شانہ کرکے پیچھے ہٹادیا اور اپنی بانسری لیکر ایک دل آویز راگنی چھیڑی۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں آنکھوں پر جھک آئیں اور عجیب قسم کی سستی بدن پر طاری ہونے لگی۔

جس وقت گھنٹہ گھر میں بارہ بجے اُس نے ایک گھنٹی بجائی۔ خدام فوراً حاضر ہوئے اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اس کا لباس اتارا۔ گلاب سے اس کے ہاتھ دُھلائے اور سیج پر پھولوں کے تکیئے لگادئے۔ چند منٹ بعد یہ کمرہ سے نکل کر باہر چلے گئے جب بادشاہ سو گیا تو اُس نے ایک خواب دیکھا کہ:۔

> "وہ ایک لمبی مگر نیچی چھت کے بالاخانہ پر کھڑا ہوا ہے۔ اور اسکے چاروں طرف کپڑا بننے کے کرگھے چل رہے ہیں، جن سے ایک شور برپا ہے۔ سلاخدار کھڑکیوں میں سے آفتاب کی دھندلی روشنی اندر آرہی ہے۔ اور اس روشنی میں اُس نے دیکھا کہ جلاہوں کے لاغر و نحیف جسم اپنے کاموں پر جھکے ہوئے ہیں۔ سامنے کے بڑے تختوں پر زرد رو، بیمار صورت بچے پیٹ کے بل پڑے لوٹ رہے ہیں۔ جب تانے کے اندر نلیاں دوڑتی ہیں تو وہ بھاری راچھ کو اُبھار دیتے ہیں۔ اور جب نلیاں رُک جاتی ہیں تو وہ راچھ کو گرا کر تاگا ٹھوکتے ہیں۔ اُنکے چہروں سے افلاس برستا ہے اور نقاہت سے اُن کے پتلے دُبلے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ چند لاغر و ناتوان عورتیں ایک میز کے سامنے بیٹھی ہوئی سینے پرونے میں مصروف ہیں۔ چاروں طرف سخت بدبو پھیل رہی ہے۔ ہوا کی عفونت سے دم گھٹا جاتا ہے اور مکان کی دیواروں پر نمی کے باعث چاروں طرف لونی لگی ہوئی ہے"

---

[1] یہ دریا کے دیوتا سیفی سوس (CEPHISUS) کا بیٹا اور خوبصورت نوجوان تھا۔ ایکو (ECHO) نامی جل پری اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ لیکن اس شخص نے اُس سے محبت نہ کی۔ اس پر ناراض ہو کر نیمیسس دیوی نے یہ انتقام لیا کہ وہ تالاب میں اپنے ہی سایہ پر عاشق ہو گیا اور جب وہ سایہ اس کے ساتھ نہ آیا تو خودکشی کرلی۔

نوعمر بادشاہ ایک جلاہہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اُسکے کام کو دیکھنے لگا۔ جلاہہ نے آنکھ اُٹھا کر سخت نگاہ سے اسکی طرف دیکھا اور پوچھا:-

"تو کون ہے اور یہاں کھڑا ہوا مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟ کیا تو ہمارے مالک کا بھیجا ہوا کوئی جاسوس ہے؟"

بادشاہ۔ تمہارا مالک کون ہے؟

جلاہہ۔ (تیوریر بل ڈال کر) ہمارا مالک! وہ بھی مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میں چیتھڑے پہنے پھرتا ہوں اور وہ اعلےٰ درجہ کی پوشاک پہن کر نکلتا ہے۔ اگر میں فاقے کرتے کرتے ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں تو اُسے سوئے ہضم کی حد تک کھا لینے میں بھی تکلف نہیں ہوتا۔

بادشاہ۔ ملک آزاد ہے۔ تم کسی کے غلام نہیں ہو۔

جلاہہ۔ جب جنگ ہوتی ہے تو طاقتور کمزوروں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اور جب امن ہوتا ہے تو مالدار مفلس کو غلام بناتے ہیں۔ ہم لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ ہمکو اسقدر ذلیل اُجرت دیتے ہیں کہ ہم مشکل سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ ہم دن دن بھر محنت کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے خزانوں میں دولت جمع کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے بچے گھُل گھُل کر قبل از وقت مرجاتے ہیں۔ ہم لوگ انگوروں کو نچوڑ نچوڑ کر اپنے ہاتھ دُکھاتے ہیں۔ اور دوسرے شراب پیتے ہیں۔ ہم کھیت میں بیج بوتے ہیں اور ہمارا ہی گھر غلہ سے خالی رہتا ہے۔ ہم طوق و سلاسل میں گرفتار ہیں۔ لیکن کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم غلام ہیں اور لوگ ہمیں آزاد کہتے ہیں۔"

بادشاہ۔ کیا تم سب کا یہی حال ہے؟

جلاہہ۔ جی ہاں سب کا یہی حال ہے۔ جوان سے لیکر بوڑھے تک۔ مرد سے لیکر عورت تک۔ اور بچہ سے لیکر ضعیف تک سب کا یہی حال ہے۔ سوداگر ہمیں پیسے ڈالتے ہیں۔ اور ہمیں اُن کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ پادری صاحب رہوار پر سوار تسبیح پڑھتے ہوئے پاس سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن ہم سے نہیں پوچھتے کہ تمھارا کیا حال ہے؟ الغرض ہماری تاریک گلیوں میں سوائے افلاس کے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے دن اک مستقل مصیبت ہیں اور ہماری راتیں مصیبت لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا غرض؟ تم تو ہم میں سے نہیں ہو، تمہارا چہرہ تو بہت شاداب ہے۔

یہ کہکر جلاہہ نے بادشاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا اور تانے کے اندر بھرنی کو دوڑانے لگا۔ نوعمر بادشاہ نے دیکھا کہ نلی میں سنہرے کلابتوں کا تار ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے جلاہہ سے پوچھا:-

"یہ کپڑا تم کس کے لئے بن رہے ہو؟"

جلاہہ۔ یہ تھان اُس پوشاک کے لئے تیار کیا جا رہا ہے جسے نوعمر بادشاہ تاجپوشی کے دن پہنے گا۔ لیکن تمہیں ان باتوں سے کیا غرض ہے؟

یہ سنتے ہی بادشاہ کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرفہ سے اُس نے دیکھا کہ سامنے سفید چاند

تاریک فضا میں معلق ہے۔ اس کے بعد وہ پھر سو گیا۔ اور اسنے خواب میں دیکھا کہ۔

ایک بہت بڑی کشتی ہے جسے سو غلام کھیتے ہیں۔ اسکے پہلو میں کشتی کا مالک ایک قالین پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شخص ایک سیاہ فام حبشی ہے جس کے سر پر قرمزی رنگ کا ریشمی عمامہ تھا۔ چاندی کے بڑے بڑے بالے کان کی موٹی موٹی لو میں لٹک رہے تھے۔ اور اسکے ہاتھ میں ہاتھی دانت کی ترازو تھی۔

پھٹے ہوئے تہمد کے سوا، غلاموں کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ اور ہر غلام اپنے برابر والے ساتھی سے زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ تیز دھوپ ان لوگوں کے سر پر پڑ رہی تھی اور حبشی لوگ چاروں طرف دوڑ دوڑ کر ان کو چمڑی کوڑوں سے مارتے جاتے تھے۔ یہ غلام اپنے لاغر بازو پھیلا کر بھاری بھاری چپو چلا رہے تھے۔ جن سے کھاری پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ یہ کشتی ایک چھوٹی سی خلیج میں پہونچی۔ ساحل کی طرف سے ایک ہوا چلی اور رعشہ دبادبان گرد و غبار سے اٹ گئے۔ اتنے میں تین عرب جو گدھوں پر سوار تھے وہاں پہونچے اور اُنھوں نے کشتی کے آدمیوں پر نیزے پھینک کر مارے۔ کشتی کے مالک نے ایک رنگین کمان ہاتھ میں اُٹھائی۔ تیر جوڑا اور ایک عرب کو مجروح کر دیا۔ جو سمندر کی موجوں میں گرا اور اُسکے دونوں ساتھی فرار ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت آہستہ آہستہ اونٹ پر سوار جا رہی تھی جو مُڑ مُڑ کر مقتول عرب کی لاش کو دیکھتی جاتی تھی۔

کشتی لنگر انداز ہوئی۔ بادبان اُتار لئے گئے۔ حبشی کشتی کے اندر سے رسی کی بنی ہوئی ایک سیڑھی لائے جو سیسہ باندھ کر وزنی کر دی گئی تھی۔ کشتی کے مالک نے وہ سیڑھی کشتی کے پہلو میں پھینکی اور اوپر کا سرا دو آہنی حلقوں میں مضبوط باندھ دیا۔ اسکے بعد حبشیوں نے ایک سب سے کم عمر غلام کو پکڑا۔ اسکے پاؤں کی زنجیریں کھول دیں۔ اُسکے نتھنوں اور کانوں میں موم کی ڈاٹ لگائی اور اُسکی کمر سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا۔ وہ غلام آہستہ آہستہ سیڑھی کے ذریعہ سے نیچے اترا۔ اور غوطہ مار کر سمندر میں غائب ہو گیا۔ جہاں اُسنے غوطہ لگایا تھا وہاں بلبلے اُٹھنے لگے۔ اور کشتی کے سرے پر ایک شخص ڈھول پیٹ پیٹ کر کوئی افسوں پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ غوطہ خور غلام پانی سے باہر نکلا اور ہانپتا ہوا سیڑھی سے چمٹ گیا۔ اسکے داہنے ہاتھ میں ایک موتی تھا۔ حبشیوں نے وہ موتی اس سے چھین لیا اور غوطہ کھانے کے لئے پھر لوٹا دیا۔ غلام ہاتھوں میں چپو لئے اسیطرح پا بہ زنجیر سو گئے۔

وہ غوطہ خور غلام بار بار پانی پر اُبھرتا اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ ایک خوبصورت موتی لاتا۔ کشتی کا مالک کانٹے میں رکھ کر ان موتیوں کو تولتا اور ایک سبز رنگ کی چرمی تھیلی میں ڈالتا جاتا۔

نو عمر بادشاہ نے بات کرنا چاہی لیکن اُسکی زبان نے کام نہ دیا۔ اور لب نہ کھلے۔ تھوڑی دیر بعد حبشی ایک خوبصورت ہار پر آپس میں لڑ پڑے۔ دو سارس آئے اور کشتی کے گرد چکر لگانے لگے۔

غوطہ خور آخری مرتبہ باہر آیا اور اس مرتبہ جو موتی اس کے ہاتھ میں تھا وہ جزیرہ ہرمز اور بحرین کے تمام موتیوں سے زیادہ خوش آب تھا۔ اسکی شکل بدر کامل سے مشابہ تھی اور وہ ستارہ صبح سے بھی زیادہ درخشاں تھا۔ لیکن اسوقت غوطہ خور کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ اور جوں ہی وہ کشتی میں آیا گر پڑا اور اسکے کانوں اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کانپتا

۔ہا اور پھر ٹھنڈا ہوگیا۔حبشیوں نے اُٹھا کر اسکی لاش سمندر میں پھینکدی۔کشتی کا مالک خوب ہنسا۔ اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر وہ موتی لے لیا۔جوں ہی اُس نے وہ موتی دیکھا تو اُس نے پیشانی سے لگا کر سر جھکایا اور کہنے لگا "یہ موتی نوعمر بادشاہ کے عصا میں جڑا جائیگا"۔ اسکے بعد اُس نے حبشیوں کو لنگر اُٹھانیکا حکم دیدیا۔

جب نوعمر بادشاہ نے یہ بات سنی تو اسکے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ جاگ پڑا۔کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو دیکھا کہ صبح کی نورانی اونگلیاں کملائے ہوئے ستاروں کے پھول چن رہی ہیں۔

اسکے بعد بادشاہ پھر سوگیا اور اُس نے خواب میں دیکھا کہ :-

" وہ ایک تاریک گھنے جنگل میں پھر رہا ہے۔جس کے درختوں میں عجیب قسم کے پھل اور خوبصورت زہریلے پھول لگے ہوئے ہیں۔جسوقت وہ جنگل میں قدم اُٹھاتا تھا تو کالے ناگ پھنکار مارتے تھے۔ اور خوبصورت پروں والے طوطے شاخ بہ شاخ اُڑتے پھرتے تھے۔گرم کیچڑ پر بڑے بڑے کچھوے پڑے سو رہے تھے اور تمام درختوں پر طاؤس اور بندر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ آگے بڑھتا چلا گیا دیکھا کہ آدمیوں کا ایک انبوہ خشک دریا کی زمین پر جمع ہے۔دریا کے کنارہ ٹیکرے پر آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔اور لوگ دریا کی تہ میں گہرے گڈھے کھود کر اُن میں اُتر رہے ہیں۔بعض کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں۔جن سے وہ چٹانیں کھود رہے تھے اور بعض ریت میں کچھ ٹٹول رہے تھے۔لوگوں نے ناگ پھنی کے درخت جڑوں سے اُکھاڑ کر پھینکدئیے اور اس کے خوبصورت سرخ پھولوں کو پاؤں سے روند ڈالا۔ وہ ایک دوسرے کو بلاتے اور اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اور کوئی شخص بھی بے کار نہ تھا۔

ایک تاریک غار سے موت اور طمع ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔اتنے میں موت نے کہا:"میں بہت تھک گئی ہوں۔تم مجھے ان میں سے صرف تیسرا حصہ دیدو اور جانے دو"۔

طمع ۔(سر ہلا کر) نہیں! یہ لوگ میرے خادم ہیں۔میرے غلام ہیں۔

موت ۔ یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے؟

طمع ۔ میرے پاس غلہ کے تین دانے ہیں۔تجھے کیا؟

موت ۔ لاؤ اِن میں سے ایک مجھے دیدو۔میں اپنے باغ میں لگا لوں گی۔بس صرف ایک دیدو اور میں چلی جاؤں گی۔

طمع ۔ میں تجھے کچھ نہ دونگی۔ اور یہ کہکر اُس نے اپنا ہاتھ دامن میں چھپا لیا۔

موت ہنسی اور ایک پیالہ نکالا۔ اور اُسے پانی کے ایک گڈھے میں ڈبویا۔پیالہ میں سے تپ و لرزہ پیدا ہوا جو اس ہجوم سے گذرا اور تہائی حصہ کو ہلاک کرتا چلا گیا۔

جب طمع نے یہ دیکھا کہ ایک ثلث آدمی ہلاک ہوگئے ہیں تو وہ سینہ کوبی اور گریہ وزاری کرنے لگی اور چیخ کر بولی:"ہائے ہائے تو نے میرے ایک تہائی خادم مار ڈالے۔نکل جا یہاں سے۔جا اور دیکھ وہ کوہستان تاتار میں جنگ ہو رہی ہے۔فریقین کے بادشا

مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ دیکھ افغانی میدان جنگ کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور ڈھالیں ہیں۔ ان کے سروں پر آہنی خود ہیں۔ جا کمبخت یہاں سے نکل۔ میری وادی میں کیا رکھا ہے جو تو یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ چل نکل! دور ہو۔ یہاں کبھی نہ آنا۔

موت۔ نہیں۔ جب تک تو مجھے غلہ کا ایک دانہ نہ دیگی اسوقت تک میں ہرگز نہ جاؤں گی۔

طمع۔ (مٹھی بند کرکے اور دانت بھینچکر) میں ہرگز تجھے کوئی چیز نہ دونگی۔

موت ہنسی۔ اوس نے ایک سیاہ پتھر نکالا۔ اور جنگل میں پھینکدیا۔ جو زقوم کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ جھاڑیوں میں شعلہ رنگ بخار پیدا ہوا۔ جو اس ڈرد حام میں سے گذرا۔ اور جس جس کو اُس نے چھوا وہ ہلاک ہوگیا جس گھاس پر وہ بخار چلتا جلکر رہ جاتی تھی۔ یہ بات دیکھکر طمع کانپ گئی۔ اس نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور چلا کر کہنے لگی " موت تو بڑی ظالم ہے! تو بڑی ستم شعار ہے! دور ہو یہاں سے۔ جا وہ دیکھ ہندوستان کے شہروں میں قحط پڑ رہا ہے۔ جاؤ سمرقند کے تمام تالاب اور دریا خشک ہوگئے۔ مصر کو دیکھ وہاں کے شہروں میں بھی قحط پڑ رہا ہے۔ وہاں ریگستان سے ٹڈی دل آگیا ہے۔ امسال دریائے نیل میں طغیانی نہ ہوئی اور نہ اسکا پانی کناروں سے بہا۔ جا کمبخت وہاں جا۔ جہاں تیری ضرورت ہے۔ اور میرے آدمیوں کو چھوڑ "

موت۔ نہیں جب تک تو مجھے غلہ کا ایک دانہ نہ دے گی۔ نہیں ہرگز نہ جاؤں گی۔

طمع۔ مگر میں تو تجھے ہرگز کوئی چیز نہ دونگی۔

موت پھر ہنسی۔ اُس نے منہ میں اُنگلیاں ڈالیں اور سیٹی بجائی۔ فوراً ایک عورت ہوا میں اُڑتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کی پیشانی پر "وبا" لکھا ہوا تھا۔ اسکے چاروں طرف دُبلے کرگسوں کی ایک ٹکڑی چکر لگا رہی تھی۔ اس عورت نے آتے ہی تمام وادی پر اپنے پر پھیلا دئے۔ اور ایک متنفس بھی زندہ نہ رہا۔

یہ دیکھ کر طمع چیختی چلاتی جنگل میں بھاگی۔ موت بھی اُچک کر اپنے سُرنگ گھوڑے پر سوار ہوئی اور سرپٹ دوڑ گئی۔ ندی کی تہ میں جو کیچڑ تھی۔ اس میں سے اژدہا اور دوسرے خوفناک حشرات پیدا ہوئے۔ گیدڑ ریت پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور نتھنوں سے ہوا کو سونگھنے لگے۔ یہ باتیں دیکھ کر نوعمر بادشاہ رو دیا۔ اور بولا۔

یہ کون لوگ تھے اور کیا ڈھونڈھ رہے تھے ؟

ایک آواز۔ تاج شاہی کے لئے لعل نکال رہے تھے۔

یہ آواز سُن کر بادشاہ چونکا۔ منہ پھیر کر دیکھا تو ایک شخص جاتریوں کا سا لباس پہنے کھڑا تھا ہاتھ میں چاندی کا مصقل آئینہ تھا۔ اسوقت بادشاہ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اُس نے پوچھا:۔

کس بادشاہ کے تاج کے لئے ؟

جاتری۔ اس آئینہ میں دیکھو، تمھیں اسکی صورت نظر آجائے گی۔

بادشاہ نے آئینہ میں دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر آئی۔ اس کے منھ سے ایک زبردست چیخ نکلی اور وہ بیدار ہو گیا آفتاب کی منور شعاعیں کمرہ میں کھیل رہی تھیں اور قصر شاہی کے باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

افسر تشریفات اور دیگر ارکان دولت حاضر ہوئے اور مجرا عرض کیا۔ خدام نے تاج عصا اور لباس زرکار سامنے لاکر پیش کیا۔

نوعمر بادشاہ نے ان چیزوں کی طرف دیکھا یہ تینوں بہت خوبصورت تھیں۔ اسقدر خوبصورت کہ آجتک کوئی چیز اسکی نظر سے نہ گذری تھی۔ لیکن بادشاہ کو رات کے خواب کی باتیں یاد تھیں۔ اس لئے اُس نے اُمراء سے کہا: "یہ چیزیں میرے سامنے سے اُٹھا لیجاؤ۔ میں انھیں کبھی نہیں استعمال کروں گا۔"

ارکان دولت سخت حیران ہوئے۔ اور بعض تو یہ خیال کرکے کہ بادشاہ مذاق کر رہا ہے ہنس بھی پڑے۔ لیکن بادشاہ نے دوبارہ سختی سے کہا: "لیجاؤ یہ چیزیں اور کہیں چھپا دو تاکہ میری نظر ان پر نہ پڑے۔ ہر چند آج میری تاجپوشی کا دن ہے۔ مگر میں انھیں ہرگز نہیں استعمال کروں گا۔ کیونکہ یہ لباس "رنج وغم" کے کرگھے پر بُنا گیا ہے۔ اور "درد و کرب" کے ضعیف ہاتھوں نے تیار کیا ہے۔ ان لعلوں کے جگر میں خون اور اس موتی کے قلب میں موت ہے۔" اس کے بعد بادشاہ نے لوگوں سے اپنے تینوں خواب بیان کئے۔ جب اہل دربار نے خواب کی باتیں سُنیں تو وہ باہم سرگوشیاں کرنے لگے: "یقیناً بادشاہ پاگل ہو گیا ہے۔ کیونکہ خواب تو آخر خواب ہی ہوتا ہے۔ اسکی باتوں کا کیا اعتبار؟ وہ کوئی اصلی باتیں تو ہوتی نہیں جو انکی پروا کی جائے۔ اور پھر سوچئے تو سہی ہمیں ان لوگوں کی جانوں سے کیا تعلق جو ہمارے لئے محنت کرتے ہیں۔ کیا کوئی آدمی روٹی نہیں کھاتا۔ جب تک غلہ بونیوالے کو نہ دیکھ لے یا شراب نہیں پیتا جبتک بنانیوالے کی صورت نہ دیکھے؟"

اس کے بعد افسر تشریفات نے نوعمر بادشاہ سے عرض کیا: "ولی نعمت اس قسم کے الم انگیز خیالات کو اپنے دل سے نکال دیجئے۔ یہ لباس زیب تن فرمائیے۔ اور اس تاج کو سر پر رکھئے۔ اگر لباس شاہی جسم پر نہ ہوا تو لوگوں کو کیونکر معلوم ہوگا کہ ان کا بادشاہ اور آقا کون ہے؟"

بادشاہ۔ (غور سے دیکھ کر) کیا واقعی اگر میں یہ لباس نہ پہنوں تو لوگ مجھے اپنا بادشاہ نہ جانیں گے؟

افسر تشریفات۔ بے شک نہیں جانیں گے۔

بادشاہ۔ میں خیال کرتا تھا کہ دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی صورت سے بادشاہی ٹپکتی ہے۔ لیکن میں شاید اُن میں نہیں ہوں — بہرحال نہ میں یہ لباس پہنوں گا۔ نہ یہ تاج سر پر رکھوں گا۔ بلکہ جس حالت سے اس قصر شاہی میں داخل ہوا تھا، اسی حالت کے ساتھ نکلوں گا۔"

یہ کہکر بادشاہ نے ایک خادم کے سوا جو اُس سے عمر میں سال بھر کم اور اس کا رفیق تھا۔ سب آدمیوں کو چلے جانے کا حکم دیدیا۔ صرف ایک آدمی خدمت کے لئے رکھ لیا۔ اس نے صاف پانی سے غسل کیا۔ ایک بڑا رنگین صندوق کھولا اور اُس میں سے

اپنی پُرانی چرمی قمیص اور بھدی پوستین نکالی۔ یہ وہ لباس تھا۔ جسے پہاڑی کے اطراف میں بھیڑ بکریاں چراتے وقت پہنا کرتا تھا۔ اُس نے یہ لباس پہنا اور گڈریہ والا ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔

نوعمر خادم نے کہا:۔ "خیر! لباس شاہی" اور "عصائے شہریاری" تو ہو گیا لیکن "تاج خسروی" کہاں ہے؟

یہ سُن کر نوعمر بادشاہ نے ایک جنگلی بیل کی شاخ توڑی جو بالاخانہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ موڑ کر اس کا ایک حلقہ بنایا اور سر پر رکھ کر بولا:۔ "دیکھو یہ میرا تاج خسروی"

یہی لباس پہنے ہوئے وہ اپنے کمرہ سے نکلکر ایوان عام میں پہونچا۔ جہاں اُمراء، دولت اور اعیان سلطنت اُس کے منتظر تھے۔

یہ حال دیکھکر لوگ ہنس پڑے۔ اور بعض نے پکار کر کہا:۔ "لوگ بادشاہ کے منتظر ہیں۔ نہ کہ گدائے بینوا کے" بعض لوگ بگڑ کر بولے:۔ "اس شخص نے ہماری سلطنت کو ذلیل کر دیا۔ یہ ہمارا بادشاہ بننے کے ہرگز قابل نہیں"۔ لیکن نوعمر بادشاہ نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ نکلا چلا گیا۔ وہ سنگ سماق کے چکدار زینہ سے اُترا۔ برنجی پھاٹکوں سے باہر نکلا۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا گرجا کی طرف چلا۔ ایک آدمی مجمع میں سے نکلکر بادشاہ کے پاس آیا اور بگڑ کر بولا:۔ "آپ نہیں جانتے کہ امراء کی عیش پسندیاں غرباء کی زندگی ہیں۔ آپ کے جاہ وحشم سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔ اور آپ کے عیبوں اور گناہوں سے ہم کو روٹیاں ملتی ہیں ایک سخت گیر آقا کے لئے محنت کرنا ضرور ناگوار گذرتا ہے۔ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے کہ کوئی آقا ہی نہ ہو، جس کی خدمت کیجائے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ چیل کوے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں؟ بتایئے آپ نے ان تمام باتوں کا کیا علاج سوچا ہے۔ کیا آپ کسی خریدار سے یہ کہیں گے کہ "اتنا سودا نہ خریدو" یا دوکاندار کو حکم دیں گے کہ "یہ مال اس قیمت کو فروخت کرو" میں یقین کرتا ہوں۔ آپ ایسا نہیں کرینگے۔ لہٰذا جایئے اور اپنے محل کو تشریف لے جایئے۔ اور اپنا نفیس لباس اور زرکار پوشاک زیب تن فرمایئے۔ آپ کو کیا معلوم کہ آپ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اور ہمکو کسقدر تکلیف ہو رہی ہے؟

بادشاہ۔ تو کیا امیر اور غریب دونوں بھائی بھائی نہیں ہیں؟

آدمی۔ ہیں تو سہی لیکن امیر بھائی کا نام قابیل ہے۔

یہ سُن کر نوعمر بادشاہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا نکلا چلا گیا۔ لیکن وہ چھوٹا سا خادم ڈرا اور اُس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب نوعمر بادشاہ بڑے گرجا کے پھاٹک پر پہونچا تو اسے دیکھ کر فوجی سپاہیوں نے شمشیریں کھینچ لیں اور بولے:۔ "تو کون ہے؟ یہاں کیا لینے آیا ہے؟ اس دروازہ سے بادشاہ کے سوائے اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا"

بادشاہ کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا۔ اور اُس نے سپاہیوں سے کہا:۔ "میں ہی بادشاہ ہوں" یہ کہکر اُس نے سپاہیوں کی تلواریں ہٹا دیں اور اندر داخل ہو گیا۔

جب بڈھے اسقف نے اُسے اس طرح ایک گڈریہ کے لباس میں آتے دیکھا تو وہ حیرت زدہ ہو کر اُٹھا اور بولا:۔

"کیا یہی بادشاہ کا لباس ہے۔ میں کس تاج سے تمہاری تاجپوشی کروں اور کون سا عصا تمہارے ہاتھ میں دوں۔ یقیناً آج کا دن تو تمہارے لئے مسرت وشادمانی کا دن ہونا چاہیئے نہ کہ ذلت ورسوائی کا"

بادشاہ۔ کیا رنج وغم کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں مسرت وشادمانی پیدا کرسکتی ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے تینوں خواب سُنائے۔ خواب سُن کر اسقف کی پیشانی پر بل پڑگئے۔ اور اُس نے بادشاہ سے کہا:" میں بڈھا آدمی ہوں، اور خزاں رسیدہ، میں جانتا ہوں کہ دنیا میں بہت سی باتیں بُری ہوتی ہیں۔ خونخوار ڈاکو پہاڑوں سے اُتر کر تاخت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑلے جاتے ہیں، اور اُنھیں عربوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ قافلوں کے رستہ میں شیر چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ جو کمینگاہوں سے نکل کر اونٹوں پر حملہ کرتے ہیں۔ وادیوں میں جنگلی سور فصلیں کھود ڈالتے ہیں۔ اور پہاڑیوں پر لومڑیاں انگوروں کی بیلیں کتر دیتی ہیں۔ بحری قزاق ساحلوں کو اُجاڑ دیتے ہیں۔ ماہی گیروں کے جہاز پھونک دیتے ہیں۔ اور اُنکے جہاز چھین لیجاتے ہیں۔ شور زمین کی دلدلوں میں جذامی رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں گھاس پھوس سے بنائی جاتی ہیں۔ اور کوئی بھی اُنکے پاس نہیں جاتا۔ بھکاری شہروں میں پھرتے اور کتوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔ کیا تم ایسا کرسکتے ہو کہ یہ باتیں نہ ہونے پائیں۔ کیا تم کسی جذامی کو اپنے بستر پر لیکر سو جاؤ گے یا کسی فقیر کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھالو گے؟ کیا شیر ببر تمہارے حکم کی تعمیل کریں گے، کیا جنگلی سور تمہارا کہنا مانیں گے۔ کیا وہ خدا نہیں جس نے محتاجوں اور مصیبت زدہ لوگوں کو تم سے زیادہ عقلمند بنایا؟ بہرحال جو کچھ تم نے کیا ہے میں اسکو پسند نہیں کرسکتا۔ اور تم سے کہتا ہوں کہ قصر شاہی کو واپس جاؤ۔ اور جو لباس بادشاہوں کے لائق ہے اُسے پہنو۔ پھر میں تمہارے سر پر طلائی تاج رکھوں گا۔ اور عصائے شاہی تمھیں دوں گا۔ ایک آدمی کا کام نہیں کہ تمام دنیا کا بوجھ اُٹھا سکے۔ اکیلا دل دنیا بھر کا رنج وغم برداشت نہیں کرسکتا۔"

"اے شخص تو خدا کے گھر میں بیٹھکر ایسی باتیں کہتا ہے؟" نوعمر بادشاہ نے یہ کہا اور اسقف کے پاس سے گذر کر قربانگاہ کے زینہ پر چڑھ گیا۔ اور یسوع مسیح کے بُت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

وہ مسیح کے بت کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کے داہنے بائیں نہایت خوبصورت طلائی ظروف، شراب زرد رنگ سے لبریز جام، اور مقدس تیل سے بھری ہوئی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسیح کے بت کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ سجدہ گاہ پر بڑی بڑی شمعیں کافوری روشن تھیں۔ عنبر کا دھواں بل کھاتا ہوا گنبد کی طرف چڑھ رہا تھا۔ بادشاہ نے سر جھکا کر دعا مانگی اور پادری قربان گاہ کے پاس سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

اچانک باہر سڑک سے شوروغل کی آواز آئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُمراء درؤسا شمشیر بکف، خودوں پر کلغیاں لگائے ہوئے۔ اور پشت پر صیقل شدہ ڈھالیں لٹکائے گرجا میں داخل ہوئے۔ اور چلّائے:" کہاں ہے وہ خوابوں کا دیکھنے والا؟ کہاں ہے وہ بادشاہ جو فقیروں جیسا لباس پہنے ہوئے ہے؟ کہاں ہے وہ جو ہماری سلطنت کی ذلت کرتا ہے؟ ہم اُسے ضرور مار ڈالیں گے۔ یہ نالائق ہرگز اس قابل نہیں کہ ہم پر حکومت کرسکے۔"

نوعمر بادشاہ نے اپنا سر پھر جھکا لیا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ جب وہ اپنی دعا ختم کر چکا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کیطرف دیکھا ٹھیک اُسی وقت کھڑکی سے آفتاب کی منور شعاعیں اس پر پڑیں۔ کرنوں نے اُس کے جسم کو ایسی نورانی پوشاک پہنا دی جو اس شاہی لباس سے بدرجہا خوبصورت و دلفریب تھی۔ اُس کے ہاتھ کا خشک عصا خود بخود ہرا ہو گیا۔ اور اُس میں سفید کلیاں نکل آئیں جو سچے موتیوں سے زیادہ خوبصورت اور سفید تھیں۔ خشک کانٹے ہرے بھرے ہو گئے، اور اُنمیں گلاب کے اسقدر خوبصورت پھول نکل آئے جو لعلہائے بدخشاں سے بھی زیادہ خوش رنگ تھے۔ اس میں موتیوں سے زیادہ سفید پھول نکل آئے۔ جس کی ڈنڈیاں چاندی کی تھیں۔

نوعمر بادشاہ لباس شاہی میں کھڑا تھا۔ اور خدا کے جلال کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ مخلوق گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ اُمراء نے اپنی تلواریں نیام میں کر کے بیعت کی۔ پادری کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اور وہ بھی بادشاہ کے سامنے گھٹنوں کے بل دوزانو ہو کر بولا: "میرے ہاتھوں ایسی شاندار تاجپوشی کہاں ہو سکتی تھی"؟

نوعمر بادشاہ قربان گاہ سے نیچے اُترا۔ اور مجمع سے گزر کر قصر شاہی کو واپس آگیا۔ کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ اُسکے چہرہ کی طرف دیکھ سکے کیونکہ اُس کا چہرہ ایسا تھا جیسے کسی فرشتہ کا۔ (آسکر وائلڈ)

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

شعرائے حماسہ اور لطائف عشقیہ

عہد اسلام کا ایک مشہور شاعر عبید بن ماویہ طائی کہتا ہے:-

الا حی لیلی واطلالہا ۔۔۔ ورملۃ ریا واجبالہا
وانعم بما ارسلت بالہا ۔۔۔ ونال التحیۃ من نالہا

ہاں میرا سلام پہونچا دے لیلی اور اُسکی قیامگاہ کے کھنڈروں کو، اور رملہ ریا اور اُسکی پہاڑیوں کو جواب سلام بھیجنے کے بدلے خدا لیلی کے دل کو خوش کرے، اور سلام کا لطف اُس نے پایا جسے لیلی ملی۔

شاعر نے جس استغراق اور کیف میں یہ شعر کہے ہیں اُن کا قدرتی تقاضا ہے کہ ذہن سامع پر ایک خاص کیفیت طاری ہو، محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے، اس لئے لیلی کے ارد گرد جو قدرتی مناظر اور معاشرتی سامان ہیں ان سے شاعر کی ہمدردی ایک ناگزیر امر ہے، وہ "تصور جاناں" میں محو ہے، اور گویا وہ اس دنیا میں پہونچ گیا ہے، جہاں دیدۂ بصیرت لیلی اور لیلی کے ارد گرد رہنے والے مناظر کو بہ نظر محبت دیکھ رہی ہے۔ . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

محبوبہ ام سلسبیل کا تصور آیا، حالانکہ میرے اور اُسکے درمیان تیز رفتار قاصد کے لئے ایک مہینہ کی راہ ہے، ہیئے اھلاً سہلاً اور مرحبا کہا تو اُس نے بھی ان الفاظ کو دہرایا۔

والہ داغستانی نے ریاض الشعرا میں سراج الدین خاں آرزو (مصنف مجمع النفائس) کی وہ جرح لکھی ہے جو اُنھوں نے حزین لاہجی کے اس شعر پہ کی ہے۔

ہرچہ خواہی بکن از دورہ ی دیدار مگو | وحشت آباد مکن خانہ ویرانی را

اسمیں شک نہیں شیخ کا دوسرا مصرعہ قابل جرح ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ خان آرزو نے جوش تنقید میں پہلے مصرعہ پر بھی اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں: "گویم درینجا معشوق مخاطب است و خطاب خود حالت وصل صورت نمی بندد" لیکن وہ لبیث کے اس شعر کا کیا جواب دینگے۔

فقلت لہ اھلاً و سھلاً و مرحباً | فرادت تباھیل و سھل و مراحب

حالانکہ لبیث کو ام السلسبیل کا وصل میسر نہیں بلکہ وہ صرف خیال لام السلسبیل کی نیرنگیوں سے لطف حاصل کر رہا ہے

عربوں کی شاعری میں جس طرح تیر و سنان کے ہولناک مناظر کا نقشہ دکھایا گیا ہے، وہاں جذبات لطیف کی وہ درد و حزن پیدا کرنیوالے کیفیات بھی موجود ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد دل میں خود بخود درد پیدا ہوتا ہے۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے:۔

زمانہ نے فراق یار، اور اہل وہمسایہ کی مصیبتوں سے یہاں تک ڈرایا، کہ نہ جدائی کا مجکو خوف رہا اور نہ مصیبت کا ڈر، زمانہ نے میری کوئی دلآویز چیز نہیں چھوڑی، سب کچھ مجھ سے جدا کر لیا، اب کیا رہگیا، جسکے لئے میں بخل کروں۔

لم یترک الدھر لی علقاً اضن بہ | الا اصطفاہ بنأی او بھجران

اسی طرح ایک دوسرا شاعر طفیل غنوی کہتا ہے:۔

میں لذت آشنائے فراق ہوں۔ کیونکہ مہربان ہمسایوں کا درد جدائی مجھے ہمیشہ دیا گیا میں جدائی احباب کے لائق ہوں، کیونکہ جب کوئی دوست مجھے عزیز ہوا، جدا ہوگیا۔

عہد بنی امیہ کا ایک شاعر "راعی" کہتا ہے:۔

وقد قاد فی الجیران حیناً وقد تھم | دفادقت حتی ماتحن جما لیا،

ایک زمانہ تک میرے اور ہمسایوں کے درمیان محبت والفت کی کشش جاری رہی پھر میں جدا ہوگیا، یہانتک کہ اب میری اونٹیاں بھی بہ سبب اشتیاق وطن نہیں بلبلاتیں،

کم و بیش یہی خیالات فارسی شعراء کے یہاں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن تمام ایرانی ماحول کے تشا۔

اخلاقی شاعری

قرآن مجید نے عربی ذہنیت پر کیا اثر کیا؟ اس کا مطالعہ کرنا ہو، تو عربی شاعری پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے، میں اسوقت تمام اخلاقی مباحث پر بحث کرنا نہیں چاہتا، بلکہ صرف دو تین مسائل کو لیتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ نزول قرآن مجید کے قبل عربوں کی ذہنیت میں فلسفۂ اخلاق کے اعتبار سے کیا کیا ذمائم پائے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سارا عرب اخلاق کے اعتبار سے ایک پست حالت میں تھا، شراب نوشی قمار بازی، دختر کشی، فسق و فجور، افتخار نسبی، جدل و قتل، یہ تمام باتیں ان میں موجود تھیں، حسب و نسب کے متعلق عربوں کے خیالات صد درجہ حماقت آمیز تھے، اور قوم و ملک پر انکا بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔

قرآن مجید میں ہے:۔

واذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھہ	اور جب انمیں کسی کو بیٹی کی خبر دیجائے، تو سارے دن اسکا چہرہ
مسودًا وھو کظیم یتوارٰی من القوم	بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے، جس چیز کی
من سوء ما بشر بہ ایمسکہ علی ھون	اسکو خبر دیگئی ہے، اسکے عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے آیا اسکو
ام یدسہ فی التراب الا ساء ما یحکمون	ذلت پر لئے رہے، یا اسکو مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو یہ انکی تجویز بہت ہی بری ہے!

چنانچہ شعرائے اسلام کے کلام میں اکثر یہ انقلاب پایا جاتا ہے، عہد اسلام کا مشہور شاعر اسحٰق ابن خلف کہتا ہے:۔

اگر میری بیٹی امیمہ نہ ہوتی، تو افلاس سے میں پریشان نہ ہوتا، اور نہ شب تاریک میں تاریکی کی تکلیف اٹھاتا، اقرباکی جفاؤں کے وقت اس نتیجہ کی ذلت و خواری کا علم، جس نے مجھکو زندگی کا زیادہ خواہشمند بنادیا ہے، میں ڈرتا ہوں اس پر کسی دن افلاس کی مصیبت نازل ہو، اور اس ذلیل و خوار لڑکی کا پردہ اُٹھادے، جسکو طاقت مدافعت نہیں ہے لڑکی میری زندگی کی خواہاں ہے، اور میں اسکی تکلیف کے خوف سے اس کی موت کا خواہاں ہوں، اور موت عورتوں کا بہترین مہمان ہے، مجھے چچا کی سنگدلی، بھائی کے ظلم کا خوف ہے، اور میں باتوں کی تکلیف سے بھی اس پر رحم کرتا ہوں۔

حطان ابن معلی عرب کا ایک دوسرا اسلامی شاعر کہتا ہے:۔

اگر قطا (ایک جانور کا نام ہے، جسے فارسی میں سنگ خوار کہتے ہیں، جنگل میں اس جانور کے بولنے سے مسافروں کو معلوم ہوجاتا ہے، کہ یہاں کوئی چشمہ ہے) کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح میری ننھی ننھی لڑکیاں نہ ہوتیں، جو میری موت کے بعد ایک دوسرے کے پاس پھینکی جاوینگی (اور انکی کوئی پرورش نہ کریگا) تو میرے لئے طول و عرض زمین میں کشادہ میدان ہوتا، ہمارے بچے پارۂ جگر ہیں۔ ہمارے سامنے اُچھلتے کودتے ہیں، اگر ہوا بھی چل جاتی ہے، تو انکی تکلیف کے خوف سے آنکھوں میں نیند حرام ہوجاتی ہے،

اس میں شک نہیں ایسا خیال عہد جاہلیت کے ایک شاعر امیہ بن ابی الصلت کے کلام میں بھی موجود ہے، جس میں اولاد کو بچپن کی پرورش کی یاد دلائی گئی ہے، وہ کہتا ہے:-

غذوتک مولوداً وعلتک یافعاً تعل بما اُدنی الیک وتنهل[1]

لیکن امیہ ابن ابی الصلت کے متعلق خود سرور کائنات کا بیان ہے، جو مسلم شریف اور بخاری شریف میں موجود ہے، وکاد امیۃ ابن ابی الصلت ان یسلم یعنی امیہ بن ابی الصلت خیالات اسلام سے قریب تھا، شعرائے جاہلی میں امیہ کو یہ شرف حاصل ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکی تعریف کی، لیکن اسکے علاوہ عہد جہالت کے دوسرے شاعر کے یہاں ایسے خیالات نہیں، شعرائے اسلام کے خیالات تعلیم قرآن کا نتیجہ تھے، اس میں شک نہیں اسحق ابن خلف، اور حطان ابن معلی کے مفصلہ بالا کلام میں عرب کے ایام جہالت کی ذہنیت غالب ہے، اور یہ صرف اسلام اور تعلیم قرآن کی برکت ہے، کہ وہ دختر کشی پہ آمادہ نہیں، ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو" قرآن مجید کے اس درس اخلاق اور معاشرانہ اصلاح کے متعلق عہد اسلام کا ایک عربی شاعر یوں اعتراف کرتا ہے۔

فلا تطلبنها یا ابن کوز فانہ غذا الناس مذ قام النبی الجواریا

ابن کوز تو اس لڑکی کو مت طلب کر، کیونکہ جب سے نبی صلعم مبعوث ہوئے لوگ لڑکیوں والے ہوگئے،

اسحق اور حطان کے جذبات سے پتہ چلتا ہے، کہ ایک طرف ان میں عرب کی معاشرانہ ذہنیت کام کر رہی تھی اور دوسری طرف قرآن مجید کا درس اخلاق مل رہا تھا، قرآن مجید کا یہی اعجاز تھا کہ آخر کار حطان دختر کشی کے بجائے اپنی بچیوں کو دیکھکر کہتا ہے:-

وانما اولادنا بیننا اکبادنا تمشی علی الارض

ہمارے بچے پارۂ جگر ہیں، ہمارے سامنے زمین پر اچھلتے کودتے ہیں،

خاقانی نے منوچہر شروان شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ کے اندر اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور گویا قرآن مجید کی آیت سے لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے استفادہ کیا ہے۔

اگر نہ فضل تو فریاد من رسد بیم است کہ قتل من کند او وقت خشیۃ الاملاق

عرب ہی پر موقوف نہیں، دنیا کے اکثر غیر مہذب اور وحشی اقوام بلکہ متمدن اقوام کے جاہل افراد بھی خانگی تعلقات میں احترام جذبات کی پروا نہیں کرتے، بنی ہزان کی ایک شاعرہ ام ثواب اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر

---

[1] میں نے بچپن میں تیری پرورش کی اور جب نوجوان ہوا، تو میں نے تیری کفالت کی جو کچھ میں لاتا تو اس سے بار بار سیراب ہوتا،

کرتی ہے، اور گویا اس نے خانہ بدوش عربوں کی عائلی زندگی کا ایک مرقع پیش کر دیا ہے، وہ کہتی ہے،

بیٹے اسکی (بیٹے کی)، ایسی حالت میں پرورش کی، جبکہ وہ اس چوزہ کے مثل تھا جس کا بزرگ ترین عضو معدہ (پوٹا) ہو اور جسکی جلد پر بجائے پروں کے صرف رونگٹے ہوں، یہاں تک کہ وہ اس درخت کھجور کے مانند جسکی شاخوں کو مالی چھانٹ دے اور اسکے تنہ سے ڈالیوں کو کاٹ دے، بلند بالا ہوا، تو وہ میرے کپڑے پھاڑنے اور میری تادیب کرنے لگا، کیا وہ اس بڑھاپے میں مجھ سے ادب اور تہذیب کا خواہاں ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی عجیب و غریب فلسفہ نفس پر روشنی ڈالی ہے، جو متمدن اور وحشی دونوں اقوام میں ساس بہو کے تعلقات کا مشترک عنصر ہے۔

قالت لہ عرسہ یوماً لتسمعنی مہلاً فان لنا فی امنا اربا
ولو رأتنی فی نار مسعرۃ ثم استطاعت لزادت فوقہا حطبا

یعنی ایک دن اسکی بیوی نے میرے سنانے کے لئے میرے ذکر کے سلسلہ میں کہا کہ اگر مجھکو بھڑکتی ہوئی آگ میں دیکھ لے تو آگ میں اور لکڑیاں ڈال دے۔

عربی شاعری کی ایک اور خصوصیت اس کا رزمیہ جوش و خروش ہے "عہد جاہلیت" میں یہ عنصر تمام شعراء کے کلام میں عمومی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی مناسبت کے باعث ابو تمام نے اس مجموعہ کلام کا نام "حماسہ" رکھا، جسکے معنی بہادری اور شجاعت کے ہیں۔

"ثار" اسی عہد کی سیاسی خصوصیات میں ہے، امیر علیؒ نے "روح اسلام" (دی اسپرٹ آف اسلام) میں اسکی تصریح کی ہے، یہ عہد جہالت کی نہایت بیتنا ک یادگار ہے، چنانچہ اس کا اثر بعض شعرائے اسلام کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے، زیادۃ الحارثی ایک شاعر تھا، اسے ایک شخص ہدیہ بن خشرم نے قتل کر ڈالا، اس کا بیٹا مسور تھا، ہدیہ کی طرف سے سعید بن عاص نے سات دیت دے کر اسے راضی کرنا چاہا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا، اور چند اشعار کہے، جن میں ایک یہ ہے:-

فان لم انل ثاری من الیوم او غد بنی عمنا فالدھر ذو متطول

اے بنی عم اگر ہم آج یا کل اپنا انتقام نہیں لے سکے تو کوئی پرواہ نہیں، زمانہ میں بہت گنجائش ہے،

قرآن مجید نے اس جنگی اور انتقامی ذہنیت کو ایک اخلاقی سطح پر لانے کے لئے یہ معجزانہ خیالات ظاہر کئے،

کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ فمن عفی لہ من اخیہ شیء فاتباع بالمعروف واداءٌ الیہ باحسان ذالک تخفیفٌ من ربکم ورحمۃ فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم ۵ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب (بقرہ)

یوں تو عرب میں دیت (خوں بہا) کا رواج پہلے بھی تھا، لیکن ایک کمزور قبیلہ کا رکن مضبوط قبیلہ کے رکن کے سامنے دیت نہیں پا سکتا تھا، چنانچہ قبیلہ طے کا ایک "جاہلی" شاعر کہتا ہے :۔

توم اخی اما جنی جانیھم امنوا من یوم احسابھم ان یقتلوا قودا

یعنی ہماری قوم کا کوئی فرد کسی کو قتل کرتا ہے ، تو اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا ،

دیت کے لئے بھی خونریزی ہوتی ، زورآور قبائل عموماً دیت دیکر آزاد ہو جاتے ، اور کمزور قبائل کے ارکین کو اکثر دیت کے بدل قتل ہی کیا جاتا ، قرآن مجید نے قوت و ضعف کی تفریق اٹھادی ، اور اس نے عام طور پر مونی کے وارثوں کو حق دیدیا کہ انکی خوشی پر ہے ، خواہ قاتل کا خون بہالیں یا دیت لیکر چھوڑدیں ۔ ذالک تخفیف من ربکم ۔ قصاص ضروری قرار دیا ۔ یہ نہیں کہ ایک امیر آدمی قتل کرے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے یا صرف دیت لیکر چھوڑ دیا جائے اور قاتل غریب ہو تو اسے قتل کر دیا جائے ، اور دیت بھی قبول نہ کیجائے ۔

عرب کے "عہد جاہلیت" کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے ، کہ فردوسی نے شاہنامہ اور نظامی نے سکندرنامہ میں بڑی حد تک اسی عہد کی شاعری سے استفادہ کیا ہے ،

قرآن مجید کا اسلوب بیان

میکڈانلڈ نے اپنی کتاب "رلجس ایٹیچوڈ اینڈ لائف ان اسلام" میں قرآن مجید کے اسلوب بیان اور طرز انشا پر ایک عالمانہ بحث کی ہے ، وہ ایک عیسائی ہیں اس لئے انھیں اپنی تحقیق میں بعض ایسے خیالات پیش کرنے میں مضائقہ ہی کیا تھا جو اسلام کے بنیادی اعتقادات کے سخت مخالف ہوں ، لہذا پہلے میں انکے بیان کا ترجمہ پیش کرتا ہوں ، اسکے بعد ایک محاکمہ کرکے بتاؤں گا ، کہ انھوں نے کہاں کہاں زیادتی کی ہے ، انکی تحقیق کے بعض حصہ سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کر سکتا ، وہ لکھتے ہیں ،

اہل عرب اور اسلام میں نبی کا کیا درجہ ہوتا ہے ، اس پر بحث و تمحیص سے قبل یہ ضروری ہے ، کہ "کاہن" کے متعلق تفصیلی روشنی ڈالی جائے ، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ لفظ ، لغوی حیثیت سے عبرانی لفظ "کوہن" کے برابر ہے ، میں اس وقت طلب مسئلہ پر بحث کرنا نہیں چاہتا ، کہ کس طرح توریت میں یطیفر ، جیھرو ، اور حضرت داؤد کے بیٹوں کو "کوہن" کہا گیا ہے عرب میں یہ مسئلہ اس قدر اہمیت نہیں رکھتا ، عرب میں کاہن یا تو کسی خاص معبد میں جاگزیں ہوتا ، یا کسی قبیلہ میں رہتا ، اور یہاں اسکی عملی زندگی کا وہی نقشہ ہوتا جو "شیلو" میں "ایلی" اور اشموئیل کی زندگانی کا ، ایک کاہن کے نزدیک تمام پُراسرار اور مبہم باتیں بیان کیجاتیں ، وہ لوگ قضاۃ کی طرح بھی کام کرتے ، لیکن ساتھ ہی مستقبل اور غائب کے متعلق بھی پیشین گوئی کرتے ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عربوں کے نزدیک کاہنونکی پیشین گوئیاں کس قدر حقیقت کا پہلو رکھتی تھیں ۔ اس واقعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ خود انکو بھی کاہنوں کے علم غیب کا اعتراف کرنا پڑا ، لیکن جس امر پر پہلو گوں کو اپنی توجہ زیادہ مبذول کرنا ، وہ کاہنوں کا ناقابل تغیر طریق بیان ہے ، جو تقریباً تمام پُراسرار

معلومات کے اظہار کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا جسطرح یونانیوں کا ندائے غیبی نظم میں بیان کیا جاتا تھا، اسی طرح ایک عرب کاہن اپنے انکشافات غیبی نظم یا "سجع" عبارت میں ساز کرتا جس کے لغوی معنی "آواز کبوتر" کے ہیں، ہمیں یاد ہوگا کہ عیسائیہ میں کسطرح "ایدیونم" چھپا کے تھے، وہاں بھی لفظ ہاگہ "ریاباحہ" ہے جو کبوتر کے غٹ غٹ کرنیکے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے "سجع" جو کہ السنہ اسلامیہ کے اندر بلاغت و معانی کے اعتبار سے ایک عام طرز سخن سنجی قرار پا گیا ہے، نثر میں چھوٹے چھوٹے فقروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، یعنی اس میں کسی مقررہ بحر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا لیکن اسمیں وزن کی قید ہوتی ہے، اب اگر اس وزن کو ایک قاعدہ کے ماتحت رکھا جائے، تو باوزن نظم تیار ہو جائے، عبرانی زبان میں بھی اس کا وجود تھا لیکن اس کا استعمال صرف ایک علمی حیثیت رکھتا تھا، عرب میں شاعری نے اوزان و بحر کے اعتبار سے اچھی طرح ترقی کر لی تھی، اور انشاء کا قدیم طریقہ یعنی سجع باقی رہ گیا جو قدیم شعر کا طرز خاص اور کاہنوں کے بیان کے لئے مخصوص تھا، لیکن یہ "سجع" اس ابتدائی زمانہ میں شعر کی ایک قسم تھا وہ علمی طریق انشاء نہ تھا جس کا رواج اہل اسلام میں آخری دور میں پایا جاتا ہے۔

محمدؐ کا ادبی درجہ کیا تھا؟ زمانہ کے کس ادبی طرز کو اُنھوں نے اختیار کیا؟ اس کا جواب بہت آسان ہے، اور ہر وہ شخص جس نے قرآن کے چند سطور، اور بالخصوص اسکے آخری حصوں کا مطالعہ کیا ہوگا، آسانی سے جواب دے سکتا ہے، قرآن تمام و کمال "سجع" میں لکھا ہوا ہے، "سجع" حصے جنہیں "آیات" کہتے ہیں طول میں باہم مختلف ہیں، ابتدائی سورتوں میں یہ آیتیں مختصر ہیں لیکن طرز ادا میں جدت اور روانی ہے، آخر سورتیں، مطول، رنگین اور افسردہ ہیں، اور ان میں وزن کی پابندی نہایت بری طرح پر ملحوظ رکھی گئی ہے، یہ ظاہر ہے کہ محمدؐ کے پہلے بیانات کاہنوں سے ملتے ہوئے ہیں، اور ان میں وہی روح پائی جاتی ہے، جو کہانت کا طغرائے امتیاز ہے، یعنی وہ انھیں اسطرح پیش کرتے جیسے ایک غیر متصرفانہ طور پر کسی خارجی دباؤ کے ماتحت انکے دل و دماغ سے اُبل رہے ہیں، مفصلہ ذیل واقعہ سے جہالت عرب کے زمانہ کی ایک نہایت ہی پُر لطف اور دلکش تصویر سامنے آجاتی ہے، جو اثر نبوت (یا پیشین گوئی) کے ماتحت ایک کاہن کے متعلق ہے۔

بادشاہ حجر نے (جو مشہور جاہلی شاعر امرؤ القیس کا باپ تھا) بنو اسد پر ورزنا ظلم کیا اور انھیں اُنکے مقبوضات سے نکال دیا، آغانی کے اندر امرؤ القیس کی زندگی کے ماتحت مفصلہ ذیل روایت پائی جاتی ہے،

بنو اسد اس کے بعد آگے بڑھے، یہاں تک کہ وہ تہامہ سے ایک دن کی منزل پر پہونچے، انکے کاہن نے جو عوف ابن ربیعہ تھا، پیشین گوئی کی اور ان سے کہا "اے میرے بندو" اُنھوں نے کہا "اے میرے مولا، حاضر" اس نے کہا اونٹوں کے درمیان میں جیسے غزال کا ایک جھنڈ ہو، کون ہے؟ وہ بادشاہ، وہ فاتح کل، غیر مفتوح جس کے سر پر کوئی خود نہیں،

اس کا خون چاروں طرف بہیگا، کل وہ سب سے پہلے پارہ پارہ تباہ ہوگا، اُنھوں نے کہا اے میرے مولا! یہ کون ہے؟ اُس نے کہا اگر میری تڑپتی ہوئی روح میں مزید اضطراب نہ ہوتا تو میں صاف صاف کہتا، کہ یہ حجر بادشاہ ہے، تب وہ گھوڑوں پر سوار ہوکر چلے، اور ابھی اچھی طرح دن کی روشنی بھی نہیں پھیلی تھی، کہ وہ حجر کے لشکر پر آئے اور انکے خیموں پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد اور واقعات پائے جاتے ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے، کہ کس طرح کاہن کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی، لیکن اس سے ہمیں دلچسپی نہیں، یہاں پیشین گوئی کے طریقہ اور لہجہ سے بحث ہے، وہ لفظ کا ترجمہ ہیئے "پیشین گوئی" کی، کیا ہے "تکاھن" ہے، جس کے معنی ہیں "اس پر ایک لمحانہ بیہوشی طاری ہوئی"۔ ظاہر ہے کہ وہ اسوقت اپنے ہوش میں نہ تھا، اس کا طرز بیان مسجع تھا، جس کے متعلق میں سطور بالا میں لکھ چکا ہوں، قابل غور امر یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے رفیق کی حیثیت سے مخاطب نہیں کرتا بلکہ انھیں "عباد" سے موسوم کرتا ہے، اور وہ "عباد" بھی وہی لہجہ اختیار کرتے ہیں جو خدا کے لئے مخصوص ہے، یعنی "اے میرے مولا" کہکر جواب دیتے ہیں

یہ تمام باتیں محمدؐ کی ابتدائی وحی میں موجود ہیں، انہیں اسی قسم کی تصویر ہے، اور انکا لہجہ بھی ایسا ہی ہے، خدا خود مخاطب کر رہا ہے، اور انکی مابعد کی زندگی میں سلسلہ وحی کا اس لہجہ میں ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے اس طرز میں ابتدا کی تھی، یہ وہی طریقہ تھا، جس میں انبیا نے اپنا پیغام دیا، محمدؐ نے اس طرز میں چونکہ شروع کیا تھا اس لئے انھیں اخیر تک اس طریق کو جاری رکھنا ضرور تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ان پر ایک قسم کا عالم بیخودی طاری ہوتا تھا، پہلے پہل خود انھیں خیال ہوا، کہ ان پر کسی جن کا تسلط ہے، (جسے وہ اپنے عقائد کے مطابق ایک بری روح سمجھتے تھے) لیکن بتدریج انھیں یقین ہوتا گیا کہ یہ الہام ربانی ہے، ارواح خبیثہ کا اغوا نہیں، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ ان کیفیات نے جو ان پر طاری ہوتی تھیں، اخیر تک انھیں مشوش رکھا۔ لیکن جب اُنھوں نے سمجھا کہ یہ الہام ربانی کا ایک ذریعہ ہے، تو انھیں اس قسم کے دوسرے مظاہر سے دلچسپی ہونے لگی، مثال کے طور پر اُنھوں نے بتایا کہ کس طرح بعض اوقات اپنی پیشین گوئی میں صادق ہوتے ہیں"۔

میکڈانلڈ نے بخاری، آغانی، مصابیح، اور پروفیسر گولڈزیہر کی کتاب "علوم اسلامیہ" کے حوالہ سے عہد نبوت کی ایک عجیب شخصیت ابن صیاد کی مختصر حالت لکھی ہے، اور اُسکی زندگی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خصائص نبویہ، اور نوامیس ملکوتیہ کا مقابلہ کیا ہے، جو واقعات لکھے ہیں، وہ بعینہ بخاری (کتاب الادب) میں موجود ہیں، البتہ آغانی اور مصابیح سے جو واقعات درج کئے ہیں۔ وہ بخاری کے اندر نہیں، اس لئے میں پروفیسر گولڈزیہر کی روایت کا ترجمہ درج کرنے کی بجائے بخاری کی روایت پیش کرتا ہوں، حضرت عبد اللہ ابن عمر اس حدیث کے راوی ہیں، وہ کہتے ہیں۔

حضرت عمر اور کئی اصحاب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابن صیاد کے پاس تشریف لیگئے، دیکھا تو وہ لڑکوں کے ساتھ بنی مغالہ کے مکانوں میں کھیل رہا ہے، ان دنوں یہ جوانی کے قریب تھا، اسکو (کھیل میں) خبر نہ ہوئی یہانتک کہ

آنحضرتؐ نے اپنا ہاتھ اسکی پیٹھ پر مارا پھر فرمانے لگے تو اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ میں اللہ کا رسول ہوں، آپ نے اس کو ڈھکیل دیا اور فرمایا کہ میں اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لایا پھر آپ نے اس سے پوچھا، بتا تجھے کیا دکھائی دیتا ہے کہنے لگا میرے پاس سچے اور جھوٹے دونوں آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر تو تیرا کام سب غلط ملط ہو گیا۔ پھر آپ نے فرمایا اچھا میں نے تیرے لئے ایک بات دل میں ٹھان لی ہے، بھلا بتا تو، اس نے کہا "دخ" ہے، آپ نے فرمایا چل دور ہو بس تیرا اتنا ہی حوصلہ ہے، اس سے بڑھ کہاں سکتا ہے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ اجازت دیجئے، میں اس کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا اگر یہ دجال ہے تو تو اسکو مار ہی نہیں سکتا، اور اگر دجال نہیں ہے تو اس کے مارنے میں فائدہ ہی کیا ہوگا؟ (ان یکن ہو لا تسلط علیہ، ان لم یکن ہو فلا خیر لک فی قتلہ) سالم نے کہا میں نے عبد اللہ ابن عمرؓ سے اس واقعہ کے بعد ایک بار اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ابن ابی کعب کو ساتھ لیکر اس باغ کے قصد سے چلے جہاں ابن صیاد رہا کرتا تھا، جب باغ میں پہونچے تو آنحضرتؐ نے کھجور کی ٹہنیوں میں چھپنا شروع کیا آپ کا مطلب یہ تھا کہ ابن صیاد آپ کو نہ دیکھے اور آپ اسکی باتیں سن لیں، اسوقت ابن صیاد چادر اوڑھے گن گن کر رہا تھا (مضطجع علی فراشہ فی قطیفۃ لہ فیھا رمرمۃ او زمزمۃ) لیکن ہوا یہ کہ اسکی ماں نے آنحضرتؐ کو دیکھ لیا، اور ابن صیاد کو خبر کردی، یہ سنتے ہی وہ خاموش ہو رہا، آنحضرتؐ نے فرمایا اگر اسکی ماں چپ رہتی تو ابن صیاد کی باتوں سے اس کا کچھ حال معلوم ہوتا،

گولڈزیہر کے ترجمہ سے میکڈانلڈ نے جو اقتباس درج کیا ہے، وہ یہیں تک ہے، لیکن حدیث یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد اور بھی واقعات پائے جاتے ہیں، اسی سلسلہ میں ہے۔[۵]

سالم نے کہا حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ کی تعریف کی جیسی چاہیے، پھر دجال کا ذکر کیا فرمایا کہ میں تم کو اس عالم سے ڈراتا ہوں، اور ہر ایک پیغمبر نے اپنی امت کو اس سے ڈرایا ہے، یہاں تک کہ نوح پیغمبر نے بھی، لیکن میں تم کو دجال کی ایسی نشانی بتلاتا ہوں جو کسی پیغمبر نے اپنی امت کو نہیں بتائی، وہ کیا ہے۔ دجال کانا ہوگا، خدائے تعالے کانا نہیں ہے۔

میکڈانلڈ اب اس واقعہ پر تبصرہ کرتا ہے۔

"مجلس استقرار نفسیہ" کے طریقہ کے مطابق، ایک پیغمبر کا دوسرے پیغمبر کی تحقیق کرانیکے متعلق یہ ایک نہایت عجیب واقعہ ہے محمدؐ نے ظاہر طور پر اپنا اطمینان کرلیا، کہ وہ خطرناک نہیں، وہ مسلمان ہو گیا اور ۱۳ھ تک زندہ رہا، لوگ اسے مشتبہ

سلہ ۵ گولڈزیہر کے ترجمہ میں "الی صاف وھو اسمہ" کا فقرہ نہیں ہے، میکڈانلڈ نے یہ اضافہ البتہ کیا ہے، کہ یہودی ابن صیاد کو اپنا نبی تصور کرنے لگے تھے جو حدیث میں نہیں،

سمجھتے رہے۔ اور ہر چند اس کا ایک لڑکا حدیث کا ایک ثقہ راوی گزرا ہے (بحوالہ نووی) خود ابن صیاد سے لوگوں نے مغالطہ کر لیا تھا، الفرزدق شاعر ایک بار مدینہ میں آیا اور نادانستہ ابن صیاد کے گھر میں داخل ہوا، اُس نے کہا کہ لوگ اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے (بحوالہ آغانی) دوسرے حادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے شکایت کی کہ میں ایک مسلمان ہوں، مدینہ اور مکہ میں میرے لڑکے موجود ہیں، اور یہ مسیح دجال کے لئے ناممکن ہے (بحوالہ مصابیح) لیکن دوسرے لوگ خیال کرنے لگے کہ اس پردہ میں وہ اپنی معاندانہ فکر و احساس کا مبلغ، اور اغراض ذاتی کا طالب ہے، ظاہر ہے کہ ابن صیاد کی زندگی میں محمدؐ نے وہی مظاہر دیکھے جنھیں آپ نے اپنی زندگی میں مطالعہ کیا، لیکن اُنھوں نے اطمینان کر لیا کہ اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

آپ کا طرز خطابت، لہجہ ادا، اسلوب بیان ہر چند کاہنوں سے ملتا ہوا ہے، اور اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کو روح القدس سے فیضان ہوتا تھا تو بھی باوجود اس پُرزور بیان کے جو آپ نے کاہن اور اپنے درمیان امتیاز پیدا کرنے کیلئے پیش کیا۔ آپ کے مخالفین آپ کو شاعر کہنے لگے، ظاہر ہے کہ اس سے انکی یہ غرض نہ تھی کہ ان شعرائے متاخرین کے ساتھ آپکی مشابہت قائم کریں، جو انشا اور لطافت ادبی کے لحاظ سے صحیح وزن و بحر میں اشعار کہتے تھے جسکی استعداد آپ میں موجود نہ تھی۔ بلکہ اُنکی مراد اُن شعراء سے تھی جو حالت بیخودی میں عالم غیب سے ایک رشتہ اتحاد رکھتے، یا جن پر وہ جن کا تسلط بتاتے، آپ کاہن سے ممتاز تھے مگر اس طرح جسطرح بنی اسرائیل سرزمین نبوت کو خط "نبیعیم" (NEBHiiM) سے ممتاز کرتے تھے، جن میں بیخودی کی تحریک تو پائی جاتی تھی، لیکن کسی واضح مذہبی تخیل کا فقدان تھا، (باقی)

عبدالمالک آروی،

شاعر کا انجام

اِنصَاف

(افسانہ)

سارا پوہ گزر گیا لیکن پانی کی ایک بوند نہ گری۔ بادل گرجتے گھنگھور گھٹائیں آتیں لیکن پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ مالدار زمینداروں نے کچھ عرصہ تک تو چرسا لگوا کر کنوئیں سے پانی سے اپنے کھیتوں کو سینچا لیکن آخرکار انھوں نے بھی ہمت ہار دی۔ کسانوں کی نظریں آسمان سے لگی رہتیں۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اندر دیوتا کی ناراضگی کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔ بڑی ذات والوں نے کتھائیں کرائیں۔ مندروں میں پوجا پاٹ کیا۔ نیچ ذات والوں نے "سنگھا دیوی" کی منتیں مانیں۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں دعائیں مانگیں لیکن سب بے سود ہوا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے ننگے بدن ایک لنگوٹی باندھے گاؤں بھر میں چلاتے پھرتے "چھوٹی لگری تیل پیاسا دیکھا بابا پانی دے" بچوں کے ساتھ ہی سادھو سنت لوگ بھی صدا لگاتے "برسیں گے برسادیں گے۔ کوڑی ڈھیر لگادیں گے۔ کوڑی گئی ریت میں۔ پانی آیا کھیت میں۔" لیکن ان دیہاتی ترانوں اور ٹوٹکوں سے بھی اندر دیوتا کا دل نہ پسیجا اور قحط پڑ گیا۔ اس قحط سالی میں "بدن پور" کے اندر اگر کسی کی چاندی تھی تو وہ گیا دین مہاجن کی۔ صبح سے شام تک اس کے دروازہ پر آدمیوں کا ہجوم رہتا۔ وہ دس روپیہ کا زیور مشکل سے ایک روپیہ میں گروی رکھتا۔ اور اس پر بھی ایک آنہ فی روپیہ سے کم سود نہ لیتا۔ جب اس نے گاؤں کو اچھی طرح سے سود در سود کے جال میں پھنسا لیا تو پھر [illegible] اپنی [illegible] سے ستانے لگا۔

گیا دین کے والدین بڑے غریب تھے۔ گو چھپا پیج کر انھوں نے بڑی مشکل سے اپنی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن ان کے مرتے ہی گیا دین پر لکشمی دیوی کی کرپا ہو گئی۔ مہاراج دینا ناتھ گاؤں کے ایک بڑے کاشتکار تھے۔ جب وہ تیرتھ جاترا کو جانے لگے تو انھوں نے ایک ہزار روپے گیا دین کے پاس امانت رکھ دئے۔ لیکن تیرتھ جاترا کر کے مہاراج دینا ناتھ گھر واپس نہ ہوئے معلوم نہیں کہ وہ مر گئے یا کیا ہوئے۔ کئی سال گزر گئے ان کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ان کے رشتہ داروں نے گیا دین سے روپے واپس لینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن گیا دین صاف مکر گیا۔ اس نے کہا کہ مہاراج جی نے اس کے پاس کوئی امانت نہیں رکھی۔ رشتہ دار اسکا کوئی ثبوت نہ دے سکے۔ چنانچہ وہ سب روپے گیا دین کے ہو گئے اور اسی سے اس نے لین دین کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ مالدار سیٹھ بن گیا۔

(۲)

قریباً دس بجے دن کا وقت رہا ہوگا گیا دین مہاجن گھٹنوں تک چڑھی ہوئی پرانی دھوتی اور پھٹی مرزئی پہنے اپنی ڈیوڑھی میں ایک ٹاٹ پر بیٹھے روکڑ بہی لکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ہی انکی بیوی ستیا بیٹھی ہوئی گیہوں پھٹک رہی تھی کہ منّا، کبنی،

نے اندر آکر سیٹھ جی کو سلام کیا۔ سیٹھ جی نے اسکی طرف دیکھکر کہا" کہو متئی کیسے آئے؟"

"کچھ روپے کی ضرورت ہے"۔

مہاجن نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا" آج کل ہاتھ بہت تنگ ہے جانتے تو ہو نہیں تو میں بھلا تم سے انکار کرتا"۔

متئی ابھی نا امید نہیں ہوا تھا اس نے پھر کہا" سیٹھ جی ادیا ہو جائے۔ رام دے ہم لوگ بڑی مصیبت ماں (میں) ہیں۔ کل رات سے ہلوگ روٹی نہیں کھاوا (کھایا)، بچن بھوکن مرت ہیں (بچے بھوکے مرتے ہیں)" یہ کہکر متئی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔

عورت کا دل نازک ہوتا ہے بشیا اُٹھکر وہاں سے چلی گئی۔ لیکن مہاجن کا دل پتھر کا تھا۔ ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا! ایسے ایسے نہ معلوم کتنے متئی صبح سے شام تک مہاجن کے سامنے آکر! گڑگڑا کر چلے جاتے تھے۔ انھوں نے آخیر میں کہا" متئی! میں تمہارے ساتھ بس اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ اگر تم کوئی چیز گروی رکھو تو جہاں سے بھی ہوگا تمہارے لئے روپے کا بندوبست کردونگا"

متئی۔ گھر میں رہ ہی کیا۔ برتن تھے وہ پہلے ہی سے تمہارے پاس گروی رکھے ہیں۔ اب تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

"جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا آگے تمہاری مرضی۔ زمانہ نازک ہے ایسے میں گروی رکھے بغیر کوئی روپیہ نہ دیگا"

متئی نے بہت خوشامدیں کیں لیکن ایک دفعہ گیا دین کی زبان سے جو "نہیں" نکل گیا۔ تو پھر اُنھوں نے "ہاں" نہ کی۔ مایوس ہو کر متئی اپنے گھر واپس ہوا۔ اسکے بچے بھوک کے مارے تڑپ رہے تھے۔ متئی کو دیکھکر سب اسکی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن متئی کے پاس کیا تھا جو ان کی شکم پُری کرتا۔ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر رہگیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی گاؤں کے چودھری کا مکان تھا وہاں آج حاکم علاقہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کے اور اُن کے نوکروں کے لئے کڑاہیاں چڑھی تھیں۔ خستہ کچوری کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن غریب متئی کے یہاں فاقہ تھا۔

رُکیا نے اپنے شوہر سے کہا" تو اسطرح کے دن کام چلیئے۔ (چلے گا۔)

متئی۔ تو میں کا کر سکت ہوں (میں کیا کر سکتا ہوں)

رُکیا۔ نہ ہو مور سونے والا تویج گروی رکھ دیو (کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میرا طلائی تعویذ گروی رکھ دو)

متئی۔ کون تویج (تعویذ)

رُکیا۔ وہی جو تم پردیس سے بنوا لاؤ۔ (جو بنوا لائے تھے)

گذشتہ سال متئی جب کلکتہ نوکری کرنے گیا تھا تو وہاں سے وہ ایک طلائی تعویذ رُکیا کیلئے لے آیا تھا۔ عورتوں کو گہنا بہت پیارا ہوتا ہے۔ جس وقت رُکیا نے اپنی پٹاری سے تعویذ نکال کر متئی کے ہاتھ پر رکھا تو اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

متئی تعویذ لے کر خوش خوش مہاجن کے پاس پہونچا اور بولا" لو مہاجن یہ تویج (تعویذ) گروی رکھ لو"۔

مہاجن نے تعویذ کو ہاتھ میں لیکر خوب غور سے دیکھا اور کسوٹی پر پرکھ کر کہا" کتنے روپیوں کی ضرورت ہے؟"

متیؔ۔ کم سے کم تین روپے میں تو کام چلے ہیں ایک ساٹھ روپیہ دیوں۔ (حالانکہ اسکے ساٹھ روپے دئے تھے۔)

مہاجن۔ لیکن میں تو اتنے پر دو روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دے سکتا آگے تمہاری خوشی۔

آخر کار بڑی مشکل سے گیادین نے متیؔ کو بیس روپے دئے جب متیؔ روپے لیکر چلنے لگا تو مہاجن نے کہا "بیاج معلوم ہے؟"

متیؔ۔ ہاں وہی دو پیسہ روپیہ۔

مہاجن۔ اس بھرم میں بھی نہ رہنا ایک آنہ روپیہ سے کم سود نہ لوں گا۔

مہاجن سے اب کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ متیؔ نے گیادین ہی کے یہاں سے گڑ اور ستو خریدا اور گھر پہنچکر سب کو پیٹ بھر کر کھلا دیا۔ بہت دنوں کے بعد آج متیؔ نے اپنے ناریل کو تازہ کیا۔ رکیا نے چلم بھری اور متیؔ نے بڑی بیفکری کے ساتھ حقہ پیا۔
اس کے دو چار ہی دن کے بعد متیؔ نوکری کرنے کے لئے کانپور چلا گیا اور وہاں کسی کارخانہ میں نوکر ہو گیا۔

(۳)

دو سال کے بعد جب متیؔ اپنے گاؤں میں واپس آیا تو اس کو گاؤں کا نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ کئی نئی پختہ عمارتیں بن چکی تھیں گیادین مہاجن کے کچے مکان کی جگہ پر اب اسے ایک عالیشان کوٹھی نظر آئی۔ لیکن متیؔ کا جھونپڑا بدستور اسی حالت میں تھا جس حالت میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ متیؔ کانپور سے اپنے گھر کے لئے برابر خرچ بھیجتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مہاجن کا بھی قرض ادا کر چکا تھا صرف سود دینا باقی رہ گیا تھا۔ جب اسے گھر کے کاموں سے فرصت ملی تو وہ مہاجن کے یہاں سے اپنا سونے کا تعویذ چھڑانے چلا۔ کوٹھی پر پہونچکر متیؔ نے چاہا کہ ہمیشہ کی طرح وہ اندر گھس کر مہاجن کے پاس پہونچ جائے۔ لیکن دربان نے ڈانٹ بتائی۔ "بڑے آئے کہیں کے بغیر مالک کے اجازت کے اندر جانے کا کسی کو حکم نہیں ہے۔ چل ہٹ یہاں سے" متیؔ بھی اب مفلوک الحال نہ تھا اسوقت اسکی جیب میں چاندی کے سکے پڑے تھے وہ جب غریب تھا تو بلا روک ٹوک مہاجن کے پاس پہونچ جاتا تھا اور اب تو وہ پردیس سے کما کر آیا تھا اسے اندر جانے سے کون روک سکتا تھا اور پھر ایک معمولی پیادہ ڈانٹ بتائے یہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اکڑ کر بولا "تو مو کا نہیں روک سکت ہیں مہاجن کے پاس جرور جیہوں۔ میں اپن سونے کا تو تج چھڑاون آؤں ہوں" (تو مجھے نہیں روک سکتا میں مہاجن کے پاس ضرور جاؤں گا۔ میں اپنا سونے کا تعویذ چھڑانے آیا ہوں)

دربان نے سوچا بڑے بڑے زمیندار اور رئیس تو اس ڈیوڑھی پر سر جھکاتے آتے ہیں۔ آخر یہ کوری کہاں کا تیس مار خاں ہے جو مجھ پر اپنا رعب جماتا ہے۔ تیوری چڑھا کر بولا "تو اتنا گرم کیوں ہوتا ہے۔ میں تیرا نوکر نہیں ہوں۔ کہ تیری دھونس میں آ جاؤں تو وہی تو ہے جو پہلے گاؤں میں مارا مارا پھرتا تھا کھانے تک کو نصیب نہ تھا پردیس سے کما کر کیا لایا ہے کہ اپنی ذات بھول گیا مگر اس ڈیوڑھی پر تجھ ایسے تین سو ساٹھ روزانہ آکر اپنی ناک رگڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اگر تیرا زیور گروی رکھا ہے تو پہلے وہ جو منیم جی سامنے بیٹھے ہیں ان سے جاکر بات چیت کر۔ رہ گیا سیٹھ جی سے ملنا تو جب تک انکی اجازت نہ ہوگی میں تجھے اندر نہ جانے دونگا؟"

باتیں تھیں تو معقول مگر زہر میں بجھی ہوئی۔ انہیں مٹھاس نام کو بھی نہ تھی۔ نفسیات کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ چاہے کوئی بیوقوفی کی باتیں ہی کیوں نہ کر رہا ہو لیکن وہ پسند نہ کرے گا کہ کوئی اُسے بیوقوف کہے۔ متی دربان کے سامنے اپنی شکست ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔ اسکو بھی روپے کی گرمی تھی۔ جس طرح برسات کا پانی پاکر ندی نالے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح متی پر اسکی پردیس کی کمائی نے اثر کیا۔ اُس نے بگڑ کر دربان سے کہا "دربان جی! موسے کا اکڑت ہو۔ میں تمہرے باپ دادوں سے کھوب واکف ہوں۔ تمہارا دادا مورے یہاں بھینس چراوت رہا۔ چار روپلی پر یہ دہولس۔ میں تمہار ساری ہیکڑی بھلائے دیہوں (مجھ سے کیا اکڑتے ہو۔ میں تمہارے باپ دادوں سے خوب واقف ہوں۔ تمہارا دادا میرے یہاں بھینس چراتا تھا۔ چار روپے پر اتنا رعب کیوں جماتے ہو۔ میں تمہاری ساری شیخی نکال دونگا)

ناخلف سے ناخلف اولاد بھی یہ پسند نہ کرے گی کہ کوئی اس کے سامنے اس کے باپ دادوں کی برائی کرے دربان نے آگے بڑھکر متی کو مارنا چاہا۔ ادھر متی اسکے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اگر دربان کو اپنی قوت پر ناز تھا تو متی کو بھی اپنی پہلوانی کا بڑا دعوی تھا وہ اب سے پہلے کئی کشتیاں مار چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ ممکن تھا کہ متی دربان کو خوب ٹھونکتا لیکن سیٹھ جی کی کوٹھی پر دربان سے جھگڑا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ دربان کی پکار سُن کر سیٹھ کے نوکر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور متی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

(۴)

متی سیٹھ جی کے یہاں سے پٹ کر نکلا تو جوش انتقام سے پاگل ہو رہا تھا۔ راہ میں شکردا چمار نے متی سے کہا "بڑا جلم (ظلم) ہے"۔ متی جلا ہوا تھا تڑپکر بولا "جلم (ظلم) نہیں تو اور کا (کیا) ہے مدا (لیکن) میں بھی دبنے والا آسامی نہیں ہوں۔ دربان سالے کو تو سمجھوں گا ہی مدا (لیکن) گیادین کی ہیکڑی نہ بھلادیوں تو مور (میرا) نام متی نہیں۔ گورمنٹی راج ہے ہنسی کھیل نہیں۔"

اسی جگہ عبدالحی خانصاحب آگئے۔ کسی زمانہ میں وہ رسالہ میں نوکری کر چکے تھے۔ لیکن اب تک ان میں فوجی دم خم باقی تھا۔ ان سے اور سیٹھ گیادین سے کبھی کسی بات پر تکرار ہو چکی تھی۔ یہی بدلہ لینے کا موقع تھا۔ متی سے بولے "تمہاری جگہ پر میں ہوتا تو خدا کی قسم خون کی ندی بہا دیتا۔ جب میں رسالہ میں نوکر تھا تو ایک مرتبہ ایک لکھ پتی سیٹھ سے میری تکرار ہو گئی۔ میں نے فوراً اُسے گولی مار دی اور جاکر اپنے کانیر صاحب بہادر سے سب حال کہدیا۔ واہ! واہ! پہلے زمانہ کے افسر بھی راجہ ہوتے تھے مجھسے کہنے لگے "ول خانصاحب تم نے بڑی بہادری کا کام کیا کوئی فکر کا بات نہیں ہے۔ ہم تمہارا ساتھ دے گا۔ بس کیا تھا پولیس نے تو مجھے پھانسنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا کچھ نہ بگاڑ سکے"

گانوں والے خانصاحب کی بہادری کے بہت سے افسانے سُن چکے تھے۔ اُن کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی شکردا چمار نے چٹکی لیکر کہا "خانصاحب آپ کی اور بات ہے مدا (لیکن) بیچارے متی اور سیٹھ کا کیا مقابلہ۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی"۔ متی نے جل کر کہا "سیٹھ ہوگا تو اپنے گھر کا مور (میرا) کا (کیا) بگاڑ سکت ہے (سکتا ہے) میں ابھی تھانہ ماں جاکر رپٹ

لکھاوت ہوں پھر دیکھو کا مجا آوت ہے رہیں ابھی تھانہ میں جاکر رپورٹ لکھاتا ہوں پھر دیکھنا کیا مزہ آتا ہے)

جب متی تھانہ میں رپٹ لکھانے چلا تو زیا نے کہا "جانے دیو سیٹھ جی سے کاہے کو جھگڑا بڑھاوت ہو جو ہوئے کا رہا ہوئے گیا۔ رپٹ لکھانے سے کچھ فائدہ نہ ہوئے گا۔ اور سچ تو ہے ہمار اور سیٹھ جی کی کون برابری۔ ہم غریب وہ امیر۔ سب اونکر ساتھ دیہیں۔ (جانے دو سیٹھ جی سے کیوں جھگڑا بڑھاتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ رپٹ لکھانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم غریب ہیں وہ امیر ہے۔ سب اسی کا ساتھ دیں گے۔

متی نے جھڑک کر کہا "تو چپ بیٹھی رہ مورا بڑھی بے ابتی بھئی ہے میں جرور بدلہ لیبوں (میری بڑی بیعزتی ہوئی ہے میں ضرور بدلہ لوں گا۔) جب متی تھانہ میں پہونچا تو اسے یہ دیکھکر سخت تعجب ہوا کہ دربان اور سیٹھ کے آدمی وہاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

سیٹھ گیا دین لڑائی جھگڑے کے نام سے دور بھاگتے تھے مگر لوگوں نے انھیں سمجھایا کہ اگر متی نے پہلے رپٹ کر دی تو مصیبت آجائے گی۔ اسوجہ سے سیٹھ جی کو مجبوراً پولیس والوں کی خوشامد کرنی پڑی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں پولیس تو ایسے ہی سیٹھوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ سیٹھ جی سمجھتے تھے کہ دو چار روپے میں کام بن جائے گا۔ مگر پانچسو روپے خرچ ہو گئے تب کہیں بڑی مشکل سے دولت کے پجاریوں کا مزاج درست ہوا۔ دربان کے زیادہ چوٹ نہ آئی تھی لیکن اس کی طرف سے بڑی زوردار رپٹ لکھدی گئی۔ اور اُس کو ڈاکٹری ملاحظہ کے لئے سول سرجن کے پاس بھیج دیا گیا لیکن جب متی رپٹ لکھانے کے لئے پہونچا اور فریاد کی تو کانسٹبلوں نے اسے دھکے مار کر تھانہ سے باہر کر دیا اور کہا "جا عدالت میں نالش کر۔ یہاں کچھ نہیں ہو سکتا"

انصاف کا بھوکا متی حیران و پریشان گھر واپس ہوا۔ اب اسکو پتہ چلا کہ انصاف نام ہے دولت کا۔ دنیا میں اسی کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے جو دولتمند ہو غریبوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

ادھر سیٹھ جی کی رشوت اور پولیس کی کوشش سے دربان کو ضرب شدید کا سرٹیفیکٹ مل گیا۔ پھر کیا تھا پولیس والوں کی بن آئی۔ اُنھوں نے متی کو گرفتار کرکے اُس پر فوجداری کا مقدمہ چلا دیا۔ وہ گیا تمام گاؤں میں فریاد کرتا پھرا لیکن کسی کو اُس پر رحم نہ آیا۔ متی کی مدد کرنا گویا سیٹھ جی سے لڑائی مول لینا تھا۔ اور یہ کسی میں طاقت نہ تھی عبدالحی خانصاحب بھی جو بڑی دون کی لیتے تھے وہ بھی متی کی مدد نہ کرسکے۔ عدالت میں پولیس نے متی کے خلاف مکمل شہادت پیش کی۔ متی اپنی صفائی میں ایک گواہ بھی نہ پیش کر سکا۔ عدالت کا فیصلہ تو صرف شہادت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس سے متی کو ۶ ماہ قید سخت کی سزا دیدی۔ انصاف اسی کا نام ہے۔ متی کا رونا اور فریاد کرنا عدالت میں کام نہ آیا۔

(۵)

عجب اتفاق ہے کہ متی کو جیل بھجوا کر سیٹھ جی بھی چین سے نہ رہ سکے لوگوں نے اُسے خدائی انصاف سمجھا خیر کوئی بھی سبب رہا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ سیٹھ جی کے کاروبار میں یکبارگی خلاف توقع زوال آنا شروع ہو گیا۔ دو سال کے

گانوں کے ایک کاشتکار للو نے پچاس روپے قرض لئے تھے۔ کسی بات پر للو اور سیٹھ جی میں کچھ تکرار ہو گئی۔ سیٹھ جی نے اسکا بدلہ یہ لیا کہ للو پر پچاس روپے کے بجائے پانچسو روپے اور سود در سود کی نالش ٹھونک دی۔ اس طریقہ سے وہ کئی آدمیوں کو تباہ کر چکے تھے۔ جعلی رقعہ بنانا اُنکے لئے معمولی بات تھی وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے اپنے اور سرکش قرضداروں کو برباد کر دیا تھا اسیطرح وہ للو کو بھی کوڑی کوڑی کے لئے محتاج کر دیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ گانوں والوں نے جو اب سیٹھ جی کی سرمایہ داری سے سخت نالاں تھے للو کا ساتھ دیدیا اور ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کر لی گئیں جس نے بڑی محنت سے مقدمہ کی پیروی کی اور عدالت پر ثابت کر دیا کہ سیٹھ جی کا رقعہ جعلی ہے اصل میں صرف پچاس روپے قرض لئے گئے تھے۔ اسکی تصدیق سرکاری طور سے بھی ہو گئی۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اسی سلسلہ میں سیٹھ جی کی اور جعل سازیوں کا بھی پردہ فاش ہو گیا۔ اور ان پر کئی مقدمات چلائے گئے۔ جس میں سیٹھ جی کے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔ پھر بھی وہ سزا سے نہ بچ سکے اور اُنھیں دو سال قید سخت اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا ہو گئی۔ سیٹھ جی نے ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن وہاں بھی سزا بحال رہی۔ مقدمہ کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں سیٹھ جی بالکل مفلس ہو گئے اور اُن کا تمام کاروبار تباہ ہو گیا۔

جسدن سیٹھ جی جیل خانہ میں پہونچے ہیں اتفاق سے وہ متئی کی رہائی کا دن تھا۔ جیل کے پھاٹک پر اس کا سامنا سیٹھ جی سے ہو گیا۔ دشمن کو مصیبت میں دیکھ کر کس کو خوشی نہ ہو گی۔ سیٹھ جی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی دیکھکر متئی کی آنکھیں خوشی کے مارے چمکنے لگیں "اور کریں جلم (ظلم) — یہ سب موری (میری) آہ کا اثر ہے۔ اب تو ساری سٹھائی نکل گئی نا — یہ الشوری نیائے ہے عدالت کا انصاف ناہیں (نہیں) ہے۔

پہلے اسی قسم کے خیالات متئی کے دل میں آئے۔ لیکن پھر اس کے ضمیر نے ملامت کی۔ سیٹھ اب اپنی پہلی حالت میں نہ تھے جیل خانہ میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ متئی گو انتقام کا بھوکا تھا پھر بھی دل شریف پایا تھا۔ سیٹھ جی کو تو سزا مل چکی تھی۔ اب وہ کس سے انتقام لیتا۔ سیٹھ جی سر جھکائے کھڑے تھے متئی سے نظر ملانے کی انمیں ہمت نہ تھی۔ یہ سزا سب سزاؤں سے زیادہ تکلیف دہ اور سنگین تھی جس متئی کو کبھی اُنھوں نے بلاقصور سزا دلائی تھی۔ جب اُس نے آگے بڑھکر نہایت ادب سے سیٹھ جی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور دلی ہمدردی ظاہر کی تو سیٹھ جی شرم کے مارے پانی پانی ہو گئے۔ کیا غریبوں اور غریبوں کا دل بھی اتنا صاف اور شریف ہوتا ہے۔ یہ سیٹھ جی کے کبھی وہم و گماں میں بھی نہ آیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ وہ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکے۔ "متئی بھیّا! مجھے معاف کر دو۔ مجھے کرنی کا پھل ملگیا" متئی اسکے جواب میں دیتا۔ سیٹھ جی نے سمجھا کہ شاید اسکا دل ابھی صاف نہیں ہوا پھر کہنے لگے "متئی بھیّا! معاف کر دو جبتک تم اپنی زبان سے نہ کہو گے میری آتما کو شانتی نہو گی" متئی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں ماف (معاف) کر دیں مور پرماتما ماف کرس (دینے معاف کیا میرے پرماتما نے معاف کیا) سیٹھ جی کا جی ہلکا ہو گیا۔ جیل سے نکلکر جب متئی اپنے گانوں میں پہونچا تو سب سے پہلے سٹھانی سے ملا اور اپنی دلی ہمدردی ظاہر کی اس پر گانوں والوں کو سخت تعجب معلوم ہوا اور اکثر لوگوں نے اسکا مذاق بھی اڑایا لیکن متئی نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پرواہ نہ کی اور جبتک سیٹھ جی جیل میں رہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق سٹھانی کی برابر خدمت کرتا رہا۔

(اعظم کُریوی)

شطرنج کا موجد کون ہے؟

اور اسکی اشاعت کیونکر ہوئی؟

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہی سال مصر کے مجلہ الہلال اور ہندوستان کے رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر سے کیا گیا تھا، اس کا جواب ہر دو ایڈیٹروں نے اپنے اپنے رسالوں کے باب الاستفسار کے تحت اتنا اختصار کے ساتھ دیا کہ زبان استفہام سراپا تشنہ کام ہی رہی اور انکے مطالعہ سے ناظرین کو قطعًا اطمینان نہیں ہوا تو عبد العزیز مظفر بغدادی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور الہلال ماہ مارچ ۱۹۳۶ء میں کافی بحث وتحیص کے بعد ایک رائے پیش کی جو یقینًا دلائل کے لحاظ سے قوی ہے۔ نیز صاحب تحقیق نے ناظرین کے لئے کافی معلومات بہم پہونچا دئے ہیں۔

عمومًا قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جسکی شہرت تامہ ہو اُسکی اصلیت اور سرشت میں اس قدر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں کہ غور کرنیوالا شب و روز کی محنتوں اور کامل فکر ومطالعہ کی صعوبتوں کے بعد بھی محقق طور پر مستقل رائے نہیں پیش کر سکتا۔ کیونکہ تضاد و اختلافات کی موجیں ایسی سد راہ ہو جاتی ہیں کہ علمی شاہراہ پر گامزن ہو جانیوالا کبھی لغزش راہ اور کبھی منزل مقصود تک پہونچتے پہونچتے ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اور تلاش وجستجو کی باگ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

جسطرح الف لیلہ، دیوار قہقہہ، آئینۂ سکندری اور جام جم باوجود اپنی شہرت کے بھی اپنے وجود، موجد ومولد کا صحیح پتہ نہیں بتا سکتے، اسیطرح شطرنج بھی کافی ہر دلعزیز ومقبول ہونے کے باوجود اپنے مولد وموجد کا صحیح پتہ بتانے سے مجبور ہے۔

ایسا عمومًا دیکھا گیا ہے کہ جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے اور جس پر محققین و مدققین کی نظر تحقیق گہری پڑتی ہے وہ شئے اسی قدر طلسم بن کر رہجاتی ہے۔ لہذا اس اُصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے شطرنج کے مولد وموجد کے تعین میں اگر چہ متضاد اور لا تحصلی اختلافات پیدا ہو گئے اور آجتک کوئی محکم رائے قائم نہ کیجا سکی۔ یا ایک شخص دوسرے کی تحقیق کو غلط ثابت کر رہا ہے تو یہ قابل استعجاب وتحیر نہیں ہے بلکہ یہ شطرنج کی مقبولیت اور اُسکی اہمیت کی دلیل ہے۔

اسی طرح اختلافات و تضاد کے ہوتے ہوئے محققین کے اس اصول کے مطابق کہ اجماع وکثرت آرا مختلف فیہ اُمور

کی صحت کی دلیل بن سکتی ہے" لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں فاضل عبد العزیز کی اس رائے سے اتفاق نہ کروں کہ شطرنج ہندستان کی پیداوار ہے اور عربوں کی دریادلی کی بدولت اکناف عالم میں اشاعت پذیر ہوا۔

ایسی چیز جو خاص ہندوستان کی ایجاد ہو اسکی اصلیت اور تاریخ سے ہندوستانیوں کا بے خبر رہنا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا، اس لئے میں اس مفید مضمون کا محض ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں تاکہ وہ اس نقش اول کو دیکھکر اپنی ایجادات کی تحقیق وتفتیش کی طرف متوجہ ہو جائیں اور جلد سے جلد زبان اُردو کی گود فراموش شدہ معلومات سے بھر دیں۔

مورخین کی ایک کثیر جماعت کا خیال ہے کہ شطرنج ہندوستان کے برہمی فلاسفر صیصہ[1] یا رسیساک، کی ایجاد ہے، جس نے پانچویں میلاد کے اوائل میں ضرورتاً اس کا اختراع کیا تھا، اس کو قصہ یوں ہے:-

"عہد میلاد مرقوم بالا میں ایک بادشاہ تھا جو باوجود خوش طبع وخلیق ہونیکے اپنے کاہل احباب ومصاحبین کی معیت کے باعث انتظامات ملکی سے غافل ہو بیٹھا تھا، جس سے رعایا کی تکالیف میں اضافہ ہوگیا۔ اور بادشاہ کی غفلت کی وجہ سے اُنکی دادرسی کرنیوالا کوئی نہیں رہا۔ تو رعایا نے بادشاہ کے رحیمانہ وکریمانہ فضائل کا پاس وخیال کرتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح بادشاہ کو امور حکومت کیطرف متوجہ کیا جائے۔ چنانچہ اس پر غور وخوض کرنے کے لئے ملک کے مدبروں کی ایک بڑی جماعت دار المشورہ میں بیٹھی لیکن شاہانہ رعب داب کی وجہ سے تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے سے جھجکتی رہی۔ ان حکماء وزعماء کی جماعت سے ایک شخص صیصہ نامی اُٹھا اور اُس نے اعلان کیا کہ میں بہت جلد ملک کی خدمت اور بادشاہ کی توجہ حکومت کی طرف منعطف کرانے میں عملی قدم بڑھاؤنگا ابھی اس تدبیر میں زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ صیصہ اپنے خیال میں کامیاب ومسرور تھا اور ملک ایوان کے سامنے ایک دلچسپ کھیل موجود تھا، جس میں برہمی فلاسفر نے بتایا تھا کہ بادشاہ کے تغافل کی بدولت ارکان واعیان دولت اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ملک کی تباہی اور حکومت کی بربادی ہوتا ہے۔ وقت کی بات اور صداقت کی کامیابی کو دیکھئے کہ یہ کھیل اپنے حقیقی مقصد کے ساتھ چند دنوں ہی میں ایسا مقبول ہو گیا کہ بادشاہ کی رنگ رلیاں اور عیش وطرب کی مجلس کبھی خالی نہ رہی اور آخر وہی ہوا جو موجد کا مقصد تھا۔ یعنے وزراء کو حکم شاہی ہوا کہ اس کے موجد کو حاضر دربار کیا جائے۔ کہاں تو موجد اپنی کامیابی پر تعلیاں لے رہا تھا اب جو حکم شاہی سُنا تو دم بخود ہو کر رہ گیا کہ دیکھئے قسمت کیا دکھاتی ہے؟ لیکن وطن کی اصلاح کے سامنے جان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ نیز وہ اب بھی حکیم ومدبر تھا فوراً دربار شاہی میں حاضر ہوا اور بادشاہ کو اُس کے اُصول وقوانین کی اسطرح تعلیم دی کہ بادشاہ فوراً خواب خرگوش سے چونک پڑا اور بول اٹھا کہ اے حکیم بتا تجھے کیا اس کا صلہ دیا جائے

---

[1] بعض محققین نے صیصہ کو صصہ (صاد مفتوح میم ساکن) بن داھر ابن فیلسوف لکھا ہے اور بعض نے اس کا موجد حسکیہ بجلاج کو لکھا ہے (فتحی)

صیصہ مودبانہ کھڑا ہوگیا اور بولا ۔ جاہ پناہ میں کسی صلہ کا خواہاں نہیں ہوں اگر حضور دینا ہی چاہتے ہیں تو لیجئے بساط کے پہلے خانہ میں ایک رکھدیجئے ۔ پھر دوسرے خانہ میں دو ، پھر چوتھے خانہ میں تین ، پھر آٹھویں خانہ میں چار ، اسی طرح شطرنج کے سارے گھروں کو بھردیجئے ۔ بادشاہ اس مطالبہ کو سُن کر حواس باختہ ہوگیا اور اُس کو کوئی جواب بن نہ پڑا ۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا کہ بادشاہ کی ساری مملکت کی دولت اور اس سے بھی کہیں زیادہ ثروت اس کے متحمل نہیں ہوسکتی تھی آخر فلاسفر مذکور شاداں و فرحاں اُٹھا اور اپنی کامیابی پر خوشی خوشی گھر روانہ ہوگیا ۔ بادشاہ امورات مملکت اور انتظامات حکومت و نیز رفاہ عام کی طرف ایسا متوجہ ہوا کہ لوگوں کو حیرت ہونے لگی ۔

لفظ شطرنج کی وجہ تسمیہ

جسطرح شطرنج کے موجد میں اختلاف ہے ، اسیطرح اس کے اشتقاق و استخراج ' در وجہ تسمیہ و تلفظ میں میں بھی اختلاف ہے ۔ لیکن میں یہاں انھیں اقوال و آراء کو پیش کروں گا جو کچھ بھی اہمیت رکھتی ہیں (اس کا صحیح تلفظ شین بالکسر ہے لیکن بعض نے بالفتح لکھا ہے مگر صحیح کسرہ ہی کے ساتھ ہے ۔ نیاز)

(۱) بعض مورخین کا خیال ہے کہ شطرنج "چاتورآنگا" TCHATORANGA کا محرف ہے اور یہ لفظ سنسکرت زبان کا مرکب لفظ ہے ، جسکے معنی ارکان اربع کے ہیں ۔ نیز لغات سنسکرت میں TCHATARANGA چاتورآنگا لشکر کے معنی میں بھی آیا ہے لہذا شطرنج کی وجہ تسمیہ یہ ہوا کہ حکیم صیصہ کے عہد میں چونکہ ہندوستانی افواج چار حصوں میں منقسم ہوتی تھیں ، اس لئے موجد نے بھی اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کھیل کو چار حصوں میں منقسم کیا ، فیلہ ، کشتی ، سوار ، پیادے ،

(۲) بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ شطرنج شاترانش (عالم فلکی کا ایک نظام) کا محرف ہے اور چونکہ یہ کھیل اُنھیں نظام کے مطابق ہے ، جو شاترانش کے ہیں ، اس لئے اسکو بھی شاترانش یا شطرنج کہنے لگے ۔

(۳) اختراع شطرنج کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ دارالسلطنت لنکا (سرندیپ) میں ۲۸۰۰ قبل مسیح ایک بادشاہ (راون) تھا جس کا مشغلہ شب و روز جنگ و نبرد آزمائی تھا ، اس وجہ سے وہ اپنے بال بچوں کے پاس بہت ہی کم رہتا اور یہ جدائی اُسکی بی بی کے لئے سوہان روح سے کم نہ تھی ، اس لئے اس نے ملک کے تمام حکماء و عقلاء کو جمع کیا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ کوئی ایسی صورت بتائیں کہ بادشاہ بجائے جنگل و بیابان کی ہوا کھانے کے رنگ محلوں میں عیش و راحت کے ساتھ زندگی گذارے ، اور ہم سبھوں کے ساتھ دل کے کنول کھلائے ۔ ملکہ کے حکم کی دیر تھی ، اختراع و ایجاد کرنیوالے دماغوں کی کمی نہ تھی ۔ ابھی ہفتہ عشرہ بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ ایک کھیل جس میں جنگ و میدان کارزار کی دلچسپی کے سامان پیدا کئے گئے تھے ۔ ملک والوں کے سامنے موجود تھا ، جبکی اُن لوگوں نے ساترانش (دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنیوالا) کے نام سے پذیرائی کی ۔ لیکن مورخین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے ، کیونکہ بادشاہ اس ایجاد سے پیشتر ہی ملکہ ماندھاری (MANDADHARI) کا شیدائی اور حقیقی معنوں میں

رفیق تھا، اور ہمہ وقت اس کے پاس موجود رہتا تھا۔

(۴) ایسا ہی مورخوں کا دوسرا طبقہ یہ کہتا ہے کہ شطرنج بودھ مت کی ایجاد ہے اور اُن ہی سے براہمہ نے سیکھا تھا چونکہ بودھ مت کی تعلیم جنگ کی منافی ہے۔ اس لئے کھیل کے ذریعہ اس کے نقصانات و معائب کو بتا کر عقیدتمندوں کو باز رکھنے کی کوشش کیجاتی تھی۔

(۵) اسی طرح چینیوں کا دعوے ہے کہ یہ ہماری ایجاد ہے، اور ہمارے ہاں تقریباً دو سو برس قبل میلاد سے رائج ہے۔ اپنے اس قول کی دلیل میں یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ کوتسو (KAETSU) نے شنسی (SCHENSI) کی جنگ میں لشکروں کی جودت طبع و دلچسپی کے لئے ہان سنگ (HAN SINGH) کو کیونکر یہ کھیل اختراع کرایا تھا اور اس کا نام اسی مناسبت چوک چوہونگ کی (TCHAUKTCHOHONGKI) "فن حرب کا کھیل" رکھا گیا۔

(۶) ماہرین علم کا ایک طبقہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ فارس کی ایجاد ہے اور ثبوت میں بتاتا ہے کہ شطرنج دو کلموں یعنے شش رنگ (چھ رنگ) سے بنا ہے جو اشارہ ہے، شاہ، وزیر، اسپ، رخ، فیل، پیادہ کی طرف اور یہی طبقہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسکو نظام فلکی کی مانند ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لئے اسکا نام شاترانش رکھا گیا۔

لیکن ایرانی مورخین و شعراء خصوصاً فردوسی اس سے انکار کرتے ہیں۔ فردوسی نے تو شاہنامہ کے اندر صاف لفظوں میں لکھدیا ہے کہ ہندی بادشاہ نے کسریٰ نوشیرواں کے پاس جب وفد بھیجا تو اُس کے ساتھ شطرنج اور شطرنج کے قواعد و رموز اور اُسکی ساری ضروری اشیا بھیجی تھیں۔ فردوسی کے اس خیال کو تقویت پہونچانے کیلئے یہ روایت بھی کافی ہے کہ کسریٰ نوشیرواں یا اسکے کسی عزیز نے بزرگواری لئے ایجاد کیا تاکہ لوگ ہندوستانی کھیل (شطرنج) کی طرف راغب ہو جائیں۔

(۷) رومی شاعر ورگل (VIRGELE) کا گمان ہے کہ اس کھیل کو قائد اعظم پلامیڈس (PALAMEDES) نے ٹروئے (TROIE) کی جنگ میں سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے ایجاد کیا تھا۔ لیکن یہ کھیل شطرنج سے مختلف ہے جسکا نام لوڈوکالکولر (LUDUS CALCULARIUS) ہے۔

(۸) اسی طرح ایک اور بڑی جماعت ہے جو اس کو روما، فارسی، عرب، یونان، آئرلینڈ وغیرہ کی طرف منسوب کرتی ہے۔ لیکن اُس کے پاس نہ تو کوئی علمی ثبوت ہے اور نہ تاریخی دلائل، اور نہ اُن کے براہین، عقل سلیم رکھنے والوں کے لئے قابل قبول ہیں۔

اس افراتفری سے یہ ضرور ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی ایجاد ہے۔ اور یہیں سے براعظم ہوتا ہوا یورپ، امریکہ

---

[1] بہار عجم والے نے شطرنج کو ستررنگ بمعنی گنجفہ قرار دیا ہے اور لبعض نے وزنے رنج کا مرادف بتایا ہے۔ اور لبعض نے صدرنگ بمعنی سینکڑوں حیلے کا کھیل لکھا ہے۔ (نیاز)

اور سارے عالم میں انجا دت پذیر ہوا۔ خواہ وجہ اختراع کچھ بھی ہو۔

شطرنج کی مقبولیت

شطرنج کی مقبولیت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ عرصہ طویل تک یہ ہندوستان ہی کی زمین میں لوگوں کے لئے باعث دلچسپی و مسرت بنا رہا۔ لیکن پانچویں میلادی میں جبکہ براہمہ کا دور ہوا اور اُنکی سخت گیریوں کے باعث بودھ مذہب کو یہاں سے نکلنا پڑا تو شطرنج اُن کے ساتھ اُن کی دلچسپیاں بھی ہندوستان سے منتقل ہو کر دیگر ممالک میں پھیل گئیں۔ شطرنج بھی جو خاص اُن کی ایجاد تھی اپنے موجد کے ساتھ ملک ملک کی ٹھوکریں کھاتا اور آوارہ گردی کرتا ہوا فارس اور فارس سے عرب جا پہونچا۔ یہاں اسکی گرمجوشی کے ساتھ پذیرائی کی گئی۔ اب یہاں سے یہ اپنے ایرانی اور عربی النسل فاتح کے ساتھ یورپ اور ایشیا میں داخل ہوتا رہا اور غم غلط کرنے کیلئے انکی مجلس طرب ونشاط میں موجود ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ فاتح کی ہر ایک ادا کی تقلید کے ساتھ ساتھ یہ بھی اشاعت پذیر ہو گیا۔ یا مفتوح کے دیگر املاک کی طرح یہ بھی عربوں سے نکلکر دوسروں کی دلچسپی کا باعث بن گیا۔

چنانچہ بعض اقوال اس پر شاہد ہیں کہ یہ عربوں کی وجہ سے مقبول عام بنا اور یہ ہے بھی صحیح۔ اس کا ثبوت اکثر تاریخوں میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ ایک جگہ مذکور ہے کہ ہارون رشید نے شارلمان کو جو تحائف و ہدایا بھیجے تھے، اُسمیں شطرنج بھی تھا۔

گرچہ انگریز مورخین اس واقعہ کو نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شطرنج عربوں کی وجہ سے ضرور پھیلا۔ لیکن یورپ والوں کو اندلسی عربوں سے حروب صلیبیہ کی پہلی جنگ میں حاصل ہوا تھا۔ میرے خیال میں انگریز مورخوں کی رائے درست ہے۔ کیونکہ ابوالفداء لکھتا ہے کہ سنہ ۸۰۲ء میں ہارون رشید کو شاہ روم نے جو خط لکھا تھا وہ یہ تھا:-

بادشاہ روم نقفور (NIECPHORUS) کی طرف سے بادشاہ عرب ہارون رشید کو۔ اما بعد ملکہ (LRANE) جو مجھ سے پیشتر آپ کے لئے رُخ کا کام دے رہی تھی حقیقتاً وہ پیادہ کی چال چل رہی تھی، چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اُس نے آپ پر اس چال سے جو حقیقت میں اُسکی چال نہ تھی، حملہ کردیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُسکے مقابلہ کی تاب نہ لاسکی اور یہ اُسکی نسوانی کمزوری اور حماقت تھی۔

جب میری تحریر تمہاری نظر سے گذرے تو فوراً اطلاع دو کہ تم نے اسکی تلافی کی کیا صورت سوچ رکھی ہے اور خسارہ ونقصان کی تلافی کس طرح کر سکتے ہو، اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو سمجھ لو کہ اس کا فیصلہ ہماری تلوار کرے گی۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج وہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خط میں رُخ اور پیادہ کی مثال دی گئی ہے۔

اس خیال کو مزید تقویت پہونچانے کے لئے ہم فاتیکان کے کتب خانہ کے اُس وثیقہ کو پیش کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حروب صلیبیہ سے پیشتر بھی یورپ والوں کے لئے شطرنج دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا اور وہاں کے پادری اور راہبین

اس کو ہر وقت کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ اور جس وثیقہ کا میں نے تذکرہ کیا ہے اُس میں پطرس دامیان و (PETRS DAMIAN) اسکندر ثانی کو ۱۰۶۱ء میں جو خط لکھا ہے اس میں شطرنج کی ترویج کی مذمت ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"حکمت و قیادت کے بالکل منافی ہے کہ ایک راہب غرور کو اپنا شیوہ بنائے اور اپنے وقت کو شطرنج کھیلنے میں ضائع کرے، اور ان مقدس جگہوں اور مبارک ہاتھوں کو لہو و لعب میں استعمال کرے۔ اپنی اس زبان کو جو خدمت خلق اور عبادت رب کے لئے مخصوص ہے، اس طرح لغویات میں استعمال کرے۔ اسیطرح لیقوب وی ساسونی پہلا محقق و مصنف شطرنج لکھتا ہے کہ یہ کھیل نویں میلاد کے اوائل ہی میں یورپ کے اندر اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ جسکی تائید میں وہ ان احکامات کو پیش کرتا ہے جو کلیساؤں اور عیسائی عبادتگاہوں سے شطرنج کی تحریم پر صادر کئے گئے تھے۔"

چنانچہ وہ ان احکامات و ہدایت میں سے چند واقعات اپنی کتاب میں نقل کرتا ہے جنکا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ فرانسیسی پادری دی ساسونی نے فیلپ اوغسطس کے زمانہ میں جو ہدایت بادشاہ کے نام لکھی تھی وہ ان الفاظ میں تھی: "اکلیروس پر اس کھیل کا کھیلنا حرام کیا جاتا ہے۔" دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ:-

"سافٹ لوئیس شاہ فرانس کے عہد میں تو اس کھیل سے دلچسپی رکھنے والوں اور کھیلنے والوں کو تاوان دینا پڑتا تھا" اور کینسر النا (ELNA) سے یہ حکم نافذ ہوا تھا کہ جو پادری اس کھیل کو کھیلے گا وہ گرجوں میں داخل نہ ہو۔

بہرحال ان سارے احکامات و ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج حروب صلیبیہ سے پہلے ہی یورپ والوں کے دلوں میں گھر بنا چکا تھا، اگرچہ اُسوقت اس کے کھیلنے کا جو طریقہ تھا وہ آجکل سے بہت ہی متضاد و مخالف تھا اور یہ تغیر عظیم بوجہ امتداد زمانہ اور تغیرات کثیرہ کے واقع ہوا۔

یورپ والوں کے لئے سب سے پہلے جس نے شطرنج کھیلنے کے آداب و طریقے بتائے اور اُسکی ترتیب کی وہ جرمن مولف روی لوبزدی سیغورا (RAY LOBEZ DE SEGURA) ہے، کیونکہ پہلی تصنیف ۱۵۶۱ء میں اسی نے اس موضوع پر کی جسکی مدد سے اہل یورپ اس سے واقف ہو گئے۔ مختصر یہ کہ فن شطرنج پر بے شمار طبع آزمائیاں کی گئی ہیں اور ہر عہد و قرن میں اس پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ان لاتعداد تصانیف میں سے کوئی تصنیف اختلافات و تضاد سے خالی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کو کوئی ایک رائے قائم کرنی مشکل پڑ جاتی ہے لیکن پھر بھی ان متضاد و متباین تصانیف میں سے صرف ایک کتاب ایسی پائی جاتی ہے جو کسی حد تک معلومات و کثرت دلائل سے مملو نظر آتی ہے۔ اور کتاب وان ڈر لنڈ جرمنی کی تصنیف "تاریخ الشطرنج و آدابہ" ہے۔

اہل یورپ کے نزدیک شطرنج اسقدر مقبول و محبوب ہے کہ آج خاص اس موضوع پر متعدد رسائل و اخبار نکل رہے ہیں جنمیں شاش زیتونگ، جرمن کا خاص طور پر قابل تذکرہ ہے، کیونکہ ۱۸۴۶ء سے یہ رسالہ مستقل طور پر شطرنج

ں خدمت کر رہا ہے۔ اور اپنی برادری میں بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کے قدم بقدم التغبہ ر (KASLRATGIA
۱۸۶۰ء سے شائع ہو رہا ہو۔

یورپ میں رسائل و اخبارات ہی تک اس کی مقبولیت و دلچسپی تمام نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے وہاں متعدد انجمن
مخصوص ہیں جن میں روزانہ مختلف گروہ اور پارٹی کے شائقین شطرنج کھیلنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، اور اسی قسم کی انجمن ۱۸۵۱ء
سے برابر شطرنج کی خدمت کر رہی ہیں جن میں روز افزوں ترقی ہے۔ نیز وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں شطرنج کے مقابلہ کا اعلان
ابر ہوتا رہتا ہے۔ جن میں کثرت کے ساتھ تماشہ میں اور دلچسپی لینے والے پہنچ جاتے ہیں۔

یہی حال وہاں یونیورسٹیوں کا ہے کہ ایک یونیورسٹی کے لڑکے دوسری یونیورسٹی کے لڑکوں سے مقابلہ کرتے ہیں
مرتبہ میں تو کبھی کبھی بجلی کے ذریعہ بھی مقابلہ ہوتا ہے اور یہ ۱۸۹۹ء سے جاری ہے۔ اسی طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کے
لباء کے درمیان سالانہ مقابلہ ۱۸۷۳ء سے برابر ہوا کرتا ہے۔

شطرنج کے مہرے

شطرنج کے وہ واقعات جو اس کی تاریخ سے متعلق تھے میں نے بیان کر دئے، اب مہرے کی ہسٹری بیان
جاتی ہے:۔

جیسا کہ اس کے ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ چھ قسم کے ہوتے ہیں، شاہ، فرزین، رُخ، فیل، اسپ، پیادے لیکن
رپ والے فرزی کو نادانی سے ملکہ کہتے ہیں، اور یقیناً انکی یہ غلطی ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ مشرق کی پیداوار ہے۔ تو
شرقی عادات کے مطابق اسکی ترتیب ہوگی اور چونکہ مشرقی ملکہ کی توہین سمجھتے ہیں کہ اُسے مہمات و نبرد آزمائی کے لئے میدانِ
گ میں بھیجا جائے تو یورپ والوں کا مشرقی کھیل میں ملکہ کا شریک کرنا قطعاً بھول ہے۔

میرا جہاں تک خیال ہے کہ یورپ میں شروع شروع فرزی کو فرزی ہی کہتے تھے لیکن ان لوگوں نے کثرت
ستعمال کی وجہ سے اسکے تلفظ کو بگاڑ کر فرجی (VIRGE) کر دیا جس کے معنی کنواری لڑکی کے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فرزی
یا سیدہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

یورپین زبانوں میں مہرے کے نام ایک دوسری زبان سے بہت ہی مختلف ہیں۔ مثلاً فیل ہی کو لیجئے کہ لنڈن
لے اسکوپوپ (FERCIA) اور فرانسیسی دیوانہ (FOU) اور جرمنی راکفن کہتے ہیں، غرض کہ سارے اسماء میں بعید آزاد ہے
س لئے میں مضمون ختم کرتے ہوئے چاہتا ہوں۔ کہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے جدول میں مہروں کے اردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی
رمنی اسماء جمع کر دوں۔

اُردو	عربی	انگریزی	فرانسیسی	جرمنی
شطرنج	شطرنج	CHESS	ECHECS	SCHACHSHIEL
شاہ	شاہ = الملک	KING	R OR	DERKOENIG
وزیر = فرزی	الفرز = ملکہ	QUEEN	DAME (سیدہ)	DIEKOENIGIN (ملکہ)
فیل = پیلہ	الفیل (اپوپ)	BISHOH	FOU (دیوانہ)	DERLAEUFER (راکفن)
اسپ = گھوڑا۔	الفرس (سوار)	KINGHL	CAVALIER (سوار)	DERSHRINGER (تحنت)
کشتی = رُخ	الرخ = (رُخ)	ROOK	FOWR (برج)	DERTURM (برج)
پیدل = پیادہ	البیادق = (ڈاکیہ)	PAWNS	PIONS (گروہ)	DIEBAUERN (نجات پانیوالے)

"فخر" (بھاگلپور)

معاشیات کا ایک اہم سوال

تعین قیمت و مقدارِ زر

قیمت اور زر کا تعلق کسی چیز کی قیمت ہمیشہ اصطلاحاتِ زر میں ، فی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ قدر سے مختلف ہے عام طور پر ہم قدر، اور قیمت کو ایک ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر علم معاشیات میں دونوں کا مفہوم جدا ہے۔ کسی چیز کی قدر سے مراد دیگر اشیاء کی وہ مقدار ہے جس سے شئے مذکور کا تبادلہ ہو سکے۔ مگر کسی چیز کی قیمت زر کی وہ مقدار ہے جس سے وہ چیز خریدی جا سکے۔ قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر رسدِ موادِ زر بڑھ جائے۔ تو زر کی قوتِ خرید کم ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چیزوں کی قیمت بڑھ جائیگی۔ علیٰ ہذالقیاس اگر رسدِ موادِ زر کا فقدان ہو جائے۔ تو زر کی قوتِ خرید بڑھ جائیگی۔ اور چیزوں کی قیمت گر جائیگی۔ قیمت اور زر کے تعلق کے متعلق یہ نظریہ چند شرائط کے ماتحت ، لکل صحیح ہے۔ اور وہ شرائط یہ ہیں کہ :-

(۱) مقدارِ تجارت جس سے کہ طلبِ زر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ہمیشہ یکساں رہے۔

(۲) اعتباری کاروبار (جو کہ زر کی مدد کے بغیر کیا جاتا ہے) کی حیثیت بھی ہمیشہ یکساں رہے

(۳) زر کی رفتارِ گردش یکساں رہے۔

اگر مذکورہ بالا تمام شرائط پوری ہو جائیں۔ تو زر کی قدر میں رسدِ زر کی کمی اور بیشی سے علی الترتیب بیشی اور کمی واقع ہوتی ہے۔ مگر کسی ملک میں بھی یہ تمام شرائط پوری نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں بھی جہاں کہ ابھی اعتباری کاروبار معراج پر نہیں پہونچا۔ مسئلۂ مقدارِ زر[۵۱] پورے طور پر عمل پذیر نہیں۔ یہ نمائندہ[۵۲] اعداد سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۹۴ء اور ۱۹۱۲ء کے مابین کے نمائندہ اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس عرصہ میں مقدارِ زر ۶۴ فی صدی کے حساب سے بڑھ گئی تھی۔ مگر اشیاء کی قیمتوں میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اور اسی طرح پر قیمتوں کی ارزانی مقدارِ زر کی قلت کے تناسب سے نہیں ہوئی۔

---

۵۱ مسئلۂ مقدارِ زر یہ ہے کہ زر کی قدر میں رسدِ زر کی کمی اور بیشی سے علی الترتیب بیشی اور کمی واقع ہوتی ہے۔

۵۲ اس کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے

نمایندہ اعداد

اشیار کی قیمت ہمیشہ ایک سطح پرنہیں رہتی۔ بلکہ اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ بعض دفعہ یہ تغیر قلیل مدت میں رُونما ہوتا ہے۔ جس کا سبب ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت ہوتی ہے، عام طور پر یہ تغیر مقدار زر کی کمی اور بیشی سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ تمام چیزوں کی قیمت کی گرانی اور ارزانی کا نرخ ایک نہیں ہوتا۔ جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ قیمتیں اور بھی کئی اسباب کی بنا پر گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ جن کی وجہ سے قیمتوں کی تبدیلی کو ماننے کے لئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کئی دفعہ قیمتوں کی سطح کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستانی اشیار کی شرح مبادلہ قائم کرنے کے لئے ہندوستانی اشیار کی قیمتوں کا علم لازمی ہے۔

قیمتوں کا اندازہ صرف نمایندہ اعداد سے لگایا جاتا ہے۔ جن کی ترتیب و تشکیل کے لئے مندرجہ ذیل طلاعات کا بہم پہونچانا ضروری ہے:۔

(۱) زمانہ کا انتخاب:۔ اشیار کی قیمتوں کے موازنہ کیلئے ہمیں ایسے زمانہ کا انتخاب کرنا چاہئے۔ جس میں کہ چیزوں کی قیمت معمولی ہو۔

(۲) اشیار کا انتخاب:۔ اس انتخاب کا انحصار اُس مخصوص استعمال پر ہے۔ جس کے لئے نمایندہ اعداد مرتب کئے جائیں گے اگر ہمارا مدعا دو مختلف زمانوں کے مزدوروں کی حالت کا موازنہ کرنا ہے۔ تو ہم انھیں اشیار کا انتخاب کریں گے۔ جو اُنکے استعمال میں آتی ہیں:۔

(۳) اشیار کی قیمت:۔ ہمیں اُن اشیار کی قیمت بھی تلاش کرنی ہوگی۔ جو ہمارے نمایندہ اعداد سے متعلق ہوں۔ اب اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم خوردہ فروشی کی قیمتوں کو لیں گے۔ یا تھوک فروشی کی قیمتوں کو۔ اگر ہمارا مدعا ایک جماعت کے مصارف خرچ کے تغیر کو معلوم کرنا ہے تو ہمیں خوردہ فروشی کی قیمتوں کو ہی لینا پڑے گا۔

(۴) قیمتوں کی اوسط:۔ چوتھا کام موازنہ کے زمانوں کی قیمت کی اوسط کی تحصیل ہے۔ عام طور پر حساب کی رُو سے اوسط نکالی جاتی ہے۔ کہ یہی آسان ترین طریقہ ہے۔

اگر مختلف ازمنہ کے ان چار عناصر کو مختلف خانوں میں بالترتیب درج کر دیا جائے تو نمایندہ اعداد تیار ہو جائینگے جن سے کہ مختلف ازمنہ کی مختلف اشیار کی قیمتوں کا موازنہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

قیمتوں کی گرانی کے اسباب

اشیار کی قیمتوں کی کمی بیشی کے کئی اسباب ہیں۔ جب قیمتیں گراں ہو جاتی ہیں۔ تو اُسوقت زر کی قدر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کمی کو فرسودگی زر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:۔

(۱) ناکافی رسد اشیار:۔ بعض دفعہ فرسودگی زر، رسد زر سے بالکل غیر متعلق ہوتی ہے۔ اگر وہ سرمایہ زر بھی یکساں رہے جو کہ تبادلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو قیمتیں ناکافی رسد اشیار سے گراں ہو جاتی ہیں۔ جب رسد اشیار طلب اشیار کے لئے ناکافی ہو تو اُس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ قیمتیں گراں ہو جائیں گی۔

(۲) تکثیرِ زر:- قیمتوں کی گرانی عموماً تکثیرِ زر سے عمل میں آتی ہے۔ اگر ایک کا منتظمہ دستورِ زر[۵] ہو۔ تو قیمتوں میں عموماً بیشی ہوتی رہے گی۔ کیونکہ وہ افسر جس کو زر کا انتظام سپرد کیا گیا ہوگا۔ ملک کی ضروریات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکنے کی وجہ سے مطالبۂ زر کو پورا نہ کر سکے گا۔ ہندوستان قیمتوں کی بیشی عموماً اسی وجہ سے واقع پذیر ہوتی ہے۔

(۳) تکثیرِ اعتبار:- فرسودگی زر یا قیمتوں میں گرانی بسا اوقات آلاتِ اعتبار[۶] کی تکثیر سے بھی ہو جاتی ہے۔ گو تکثیرِ آلاتِ اعتبار قیمتوں کو اس حد تک متاثر نہیں کرتی جتنی کہ تکثیرِ زر۔ تاہم یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ کہ اس کا اثر قیمتوں پر ضرور ہوتا ہے۔

(۴) سرعتِ رفتارِ گردشِ زر:- قیمتوں میں گرانی زر کی رفتارِ گردش کی سرعت کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہ سرعت بنکوں کے وسیع پیمانے پر جاری ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں موجودہ قیمتوں کی گرانی کے ذمہ دار یہی بنک ہیں۔

ہندوستان اور قیمتوں کی گرانی

ہندوستان میں قیمتیں اندرونی اور بیرونی دونوں اسباب سے متاثر ہوتی ہیں آجکل کی بین الاقوامی تجارت کے زمانہ میں ہندوستانی قیمتیں تمام دنیا کی قیمتوں کے ساتھ کم و بیش ہوتی رہتی ہیں۔ اگر لندن میں گندم کی قیمت بڑھ جائے تو لازماً ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ ہندوستانی گندم کی برآمد کرنیوالوں کے لئے گندم کو لندن برآمد کرنا پُرمنفعت ہوگا۔ اور نتیجتاً ہندوستانی بازار میں بھی گندم کی مانگ بڑھ جائے گی۔ اور اس کا اثر قیمتوں پر پڑے گا۔

پچھلے دنوں سے تمام دنیا کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:-

(۱) طلبِ اشیاء معیارِ تمدن بلند ہو جانیکی وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔

(۲) جنگِ عظیم میں اشیاء کی بربادی اور غیر بار آور محنتِ انسانی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔

---

[۵] منتظمہ دستورِ زر وہ دستورِ زر ہے جس کا انتظام ایسے ہاتھوں کے سپرد کیا گیا ہو۔ جو مطالباتِ زر کا صحیح اندازہ لگائے بغیر زر کا انتظام کریں۔ جیسے کہ ہندوستان میں زر کی منتظم حکومت ہے۔ جو ملک کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگائے بغیر مقدارِ زر میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔ اس دستور کے علی الرغم ہندوستان سے زیادہ متمدن ممالک کا دستورِ زر ہے۔ جسے مرتبہ دستورِ زر کے نام سے پکارا جاتا ہے اس دستورِ زر سے مراد وہ دستور ہے جو ملک کے صحیح مطالباتِ زر کے مطابق ملک میں مقدارِ زر کو پھیلائے یہ عام طور پر ایک مرکزی بنک کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ یعنی زر کا منتظم حکومت کی بجائے مرکزی بنک ہوتا ہے جو ملک کے مطالباتِ زر کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اور اس طرح پر مناسب مقدارِ زر کو ملک میں پھیلاتا ہے۔

[۶] آلاتِ اعتبار سے مراد وہ آلاتِ مبادلہ ہیں جنھیں زر کی ضرورت نہ ہو۔ جیسے ہنڈی، پرچہ، تمسک وغیرہ۔

(۳) اعتباری دستور کی وسعت سے بھی قیمتوں کو گراں کر دیا ہے۔ مغربی ممالک میں عموماً کاروبار آلاتِ اعتبار سے ہوتا ہے۔ بلکہ زر کی بجائے حالاتِ اعتبار زیادہ مستعمل ہیں۔

یہ تو بیرونی اسباب ہیں جنھوں نے کہ تمام دنیا کے ساتھ ہندوستان کی قیمتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ان کے علاوہ چند اندرونی اسباب بھی ہیں جنھوں نے کہ خاص طور پر ہندوستان کی قیمتوں کو متاثر کیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) تکثیرِ آبادی:۔ ہندوستان کی آبادی رسدِ خوراک کی بہ نسبت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ رسدِ خوراک آبادی کے قدم بقدم نہیں چل سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوراک کی قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے مالتھس کا قضیۂ آبادی ہندوستان میں شدت سے عمل پذیر ہے۔

(۲) برآمدِ گندم:۔ ہندوستان سے ہر سال ایک کثیر مقدار گندم اور دیگر پیداوار کی دیگر ممالک کو بھیجی جاتی ہے ہندوستان کا معیارِ تمدن بلند ہونے کی وجہ سے اسے بدیشی اشیا کا بہت سا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جن کے تبادلہ میں اسے بہت سی پیداوار دیگر ممالک کو ارسال کرنی ہوتی ہے۔

(۳) قلتِ باراں:۔ ہندوستان میں عموماً اشیاء کی گرانی فصلوں کے خراب ہو جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی زراعتی صنعت و حرفت کا انحصار بارش پر ہے۔ فصلیں قلتِ بارش یا غیر موسمی بارش سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے آئے دن ہندوستان میں قحط پڑا کرتا ہے۔

(۴) ذرائع آمد و رفت کی وسعت نے بھی قیمتوں کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ اگر ذرائع آمد و رفت بہتر ہو جائیں تو اس تمام ملک کی قیمتیں تقریباً ایک سطح پر آ جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز ایک جگہ پر گراں ہو گئی ہے تو دوسری جگہوں پر بھی گرانی ظہور پذیر ہو گی۔ اب چونکہ ہندوستان میں مالتھس کا قضیۂ آبادی عمل پذیر ہے تو اس کا اثر یہ ہے کہ ذرائع آمد و رفت کی وسعت کے ساتھ قیمتیں بھی گراں ہوتی جا رہی ہیں۔

قیمتوں کے تغیر و تبدل کا مختلف طبقات پر اثر

قیمتوں کی گرانی مختلف طبقات کے لوگوں کو مختلف طور پر متاثر کرتی ہے۔

سلہ مالتھس کا قضیۂ آبادی یہ ہے کہ کسی ملک کی آبادی ہر سال سلسلۂ ہندسیہ کے حساب سے بڑھتی ہے۔ اور پیداوار سلسلۂ حسابیہ کے حساب سے بڑھتی ہے، یعنی اگر آبادی پہلے سال ایک ہے۔ تو دوسرے سال دُگنی۔ تیسرے سال چوگنی۔ اور چوتھے سال آٹھ گنی ہو جائے گی۔ مگر پیداوار پہلے سال ایک ہے۔ تو دوسرے سال دُگنی۔ تیسرے سال تگنی۔ اور چوتھے سال چوگنی ہو جائے گی۔ یعنی چوتھے سال کے بعد آبادی آٹھ گنی ہو جاتی ہے۔ اور پیداوار چوگنی جس کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کے لحاظ سے پیداوار کی قلت ہو جاتی ہے جس کا اثر قیمتوں پر پڑتا ہے۔

(۱) آجر کو قیمتوں کے گراں ہونے سے نفع حاصل ہوگا۔ کیونکہ اُس کی اشیاء پہلے سے گراں نرخ پر فروخت ہوا کریں گی مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ یہ منافع اسی حالت میں حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ قیمتوں کی گرانی کے ساتھ ... پیدائش نہ بڑھ جائیں۔

(۲) قرضدار:۔ قیمتوں کے گراں ہونے سے قرضدار کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ قرض دہندگان کو ... بمع سود ادا کرے گا۔ جس کی قدر، قرض لینے کے وقت زیادہ تھی۔ مگر دینے کے وقت قیمتوں کی گرانی کے سبب کم ہو جائے گی۔

(۳) چھوٹے زمیندار بھی قیمتوں کے گراں ہونے سے مستفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی زمین کی پیداوار کی قیمت ... بڑھ جاتی ہے۔ مگر اُن کا لگان وہی رہتا ہے۔

(۴) بڑے زمیندار جن کی آمدنی کا انحصار اُس لگان پر ہوتا ہے۔ جو وہ مزارعان سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ... وہ بڑھا نہیں سکتے۔ قیمتوں کی گرانی سے نقصان اُٹھاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ بہ معائیکہ اُن کی آمدنی وہی رہتی ہے۔

(۵) مستقل آمدنی والے اصحاب کو بھی قیمتوں کی گرانی سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکاری ملازم۔ وکلاء اور ڈاکٹر جن کی تنخواہ اور فیس مقرر ہوتی ہے۔ قیمتوں کی گرانی کے سبب بہت نقصان اُٹھاتے ہیں۔

(۶) مزدور بے مہارت کی تنخواہ پر قیمتوں کی گرانی کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ آجر خود غرض ہونے کے سبب مزدور کی تنخواہ نہیں بڑھاتا۔ اور اُس کی مزدوری کے زائد منافع سے خود متمتع ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ایسی کوئی تنظیمی انجمن نہیں۔ جو کہ آجر کو مجبور کر کے مزدور کی تنخواہ میں اضافہ کرا سکے۔ انجمن اتحادِ مزدوراں کی تحریک ہندوستان میں تاہنوز مستقل طور پر کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہی۔

کیا قیمتوں کی گرانی ملک کیلئے مفید ہے؟

ہندوستانی ماہرینِ معاشیات کی متفقہ رائے ہے کہ قیمتوں کی گرانی ملک کے لئے مفید ہے۔ جس کے لئے ذیل کی وجوہات پیش کی ہیں:۔

(۱) قیمتوں کی گرانی نے ہندوستان کی پیداوار کی ترقی میں گرانقدر مدد دی ہے۔

(۲) قیمتوں کی گرانی نے ملک کی دولت میں بہت اضافہ کیا ہے۔ کیونکہ ملک کا صنعتی اور زراعتی منافع بہت بڑھ گیا ہے۔

(۳) ہندوستان کی تجارت برآمد بہت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے توازنِ تجارت ہندوستان کے موافق ہو گیا ہے۔ اور یہ توازن ... کرنے کیلئے ہندوستان دیگر ممالک سے قیمتیں وصول کر کے درآمد کرتا ہے۔ (۴) مزدور جماعتوں کی تنخواہیں بڑھ گئی ہیں۔ جو ملک کی خوشحالی پر دلالت کرتی ہیں۔

ملک محمد باقر نسیم رضوی

اصطلاحات

Price	قیمت	Money	زر	Value	قدر	Economic Science	معاشیات
Exchange	تبادلہ	Supply	رسد	Purchasing Power			قوتِ خرید
Volume of Trade	مقدارِ تجارت	Demand for Money					طلب زر
Credit Transaction	اعتباری کاروبار	Velocity of Circulation					سرعتِ گردش
Quantity Theory of Money	مسئلہ مقدارِ زر	Index Numbers					اشاریہ اعداد
Rate of Exchange	شرح مبادلہ	Normal Price					معمولی قیمت
Labourer	مزدور	Retail Sale					خردہ فروشی
Wholesale	تھوک فروشی	Cost of Living					مصارفِ حیات
Depreciation of Money	فرسودگیٔ زر	Inflation					تکثیر زر
Managed System of Currency	منتظم دستورِ زر	Central Bank					مرکزی بینک
Growth of Credit	تکثیرِ اعتبار	Instruments of Credit					آلاتِ اعتبار
Bill	ہنڈی	Bond	تمسک	Internal & External Causes			اندرونی و بیرونی اسباب
International Trade	بین الاقوامی تجارت	Export	برآمد	Import			درآمد
Market	بازار	Standard of Living	معیارِ تمدن	Unskilled Labourer			بے مہارت مزدور
Unproductive Labour	غیر بار آور محنت	Credit System	دستورِ اعتبار	Growth of Population			تکثیرِ اعتبار
Food Supply	رسدِ خوراک	Malthusian Doctrine of Population					مالتھس کا نظریۂ آبادی
Arithmetic Progression	سلسلۂ حسابیہ	Geometric Progression					سلسلۂ ہندسیہ
Agricultural Industry	زراعتی صنعت و حرفت	Means of Communication					ذرائع آمد و رفت
Cost of Production	مصارفِ پیدائش	Debtor					قرضدار
Creditor	قرض دہندہ	Rent					لگان
Trade Union	انجمن اتحادِ مزدوراں	Balance of Trade					میزانِ تجارت

(Terms اصطلاحات)

بابُ المراسلة والمناظرہ

(ملقیس رعنا۔ پھول گلی۔ بمبئی)

"آپ نے جولائی کے "نگار" میں جس کیفیت کے ساتھ میری تحریر کا جواب عنایت فرمایا ہے۔ اُس کا شکریہ قبول فرمائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی "ادبیت" ایک افسوں ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کی تحریروں سے خاص لطف اُٹھاتے ہیں۔ آپ نے مذہبی تنقیدوں میں بھی اپنے زورِ قلم سے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ جی چاہے یا نہ چاہے لیکن اُن کو دیکھ کر ایمان متزلزل ہی کرنا پڑتا ہے "کا فرماجرائی" کی ایسی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔

میں پہلے بھی سمجھتی تھی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ خلوص سے خالی نہیں اور اب آپکے جواب سے اور زیادہ یقین ہو گیا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کی "تلقین" کو مانتے ہی ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے اور جی ہچکچاتا ہے، کیا آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟

میں آیندہ کے لئے یہ نہیں چاہتی کہ میری تحریروں کا نگار کے ذریعہ سے جواب دیا جائے، بلکہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرائیویٹ طور پر میرے اُن خدشوں کو دُور کیا جائے جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے ہیں، اور جن کو میں آپ کے سامنے پیش کرتی رہوں گی۔ فی الحال میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے نزدیک سب سے بہتر مذہب کونسا ہے اور کیوں؟ اصولِ اسلام میں آپ کو کیا خرابیاں نظر آتی ہیں اور وہ کیونکر دور ہو سکتی ہیں؟

(نگار) آپ نے میری "ادبیت" کی "فسوں زائی" اور انشا پردازی کی تعریف میں جو کچھ سپردِ قلم فرمایا ہے، وہ خواہ کتنا ہی خلافِ حقیقت کیوں نہ ہو، لیکن مجھے مغرور بنا دینے کے لئے کافی سے زائد ہے۔

خوشا لطافتِ اندازۂ ادا فہمی!

اگر میں اپنی زندگی میں کسی ایک ہی کا ایمان (بقول آپ کے) "متزلزل" کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے خود بھی اس "کا فرماجرائی" پر فخر کرنا چاہیئے۔ مگر اے میری محترم خاتون، کبھی آپ نے اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ جس کیفیت کو دنیا "کفر و ایمان" سے نامزد کرتی ہے، وہ صرف "تعبیراتِ لفظی" کی نزاع تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی چیز کے دو جدا جدا نام رکھکر مجادلہ ہو رہا ہو، آہ، دنیا کی عمر اس بحث و اختلاف میں گذر گئی ہے کہ پردۂ جمال کو "حجاب" کہیں یا "نقاب" اور یہ ہوش کسی کو نہیں کہ "طرفِ نقاب" اُٹھا کر "حسنِ مستور" کا مشاہدہ کیا جائے، جو ان تمام ظاہری امتیازات سے بہت

بندہ واقع ہے: منصور و فرہاد کی سرگزشت پر جو تنقید چاہے کرو، لیکن آخر کار حقیقت وہی ایک نظر آئیگی کہ:-

آشفتہ نوائے بہ سر دار بر آمد،
شوریدہ ادائے بدم تیشہ رواں داد،

کیا اب بھی آپ مجھ سے دریافت کرینگی کہ میرے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون ہے؟ دیکھئے اُن لوگوں سے جن کا مذہب "مسلک عشق" ہو، اس قسم کے سوالات نہیں کئے جاتے۔ کیا آپ نے نہیں سُنا:-

بادشہ گاں ہر کہ در افتاد بر افتاد،

کسی "پیراں" سے یہ نہ دریافت کیجئے کہ اُسے "جلوۂ محبوب" کہاں نظر نہیں آتا اور ایک "عاجز و سرگشتہ" سے یہ نہ پوچھئے کہ اُس نے شاہد مقصود کو کس جگہ پایا۔ وہ تو آسانی سے کہہ دے گا کہ "ہر جگہ اور کہیں نہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جواب کو سُن کر اپنی ہنسی ضبط کر سکیں گی؟

بیدل کہتا ہے:-

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجا ست　　چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجا ست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم　　کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجا ست
اے سمندر بہ ہوس داغ خوش آتش کو　　ماہیاں تشنہ بہ سیر یدہ دم آب کجا ست

لیکن شبلی وغیرہ جیسی سطح بیں نگاہ صرف الفاظ کو دیکھتی ہے اور اُس پر ہنستے ہیں:-

---

آپ کو میری "تلقین" پر یقین لاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے، جی "تِلملاتا ہے"۔۔۔ یوں کیوں نہ کہئے کہ "کلیجہ دھڑکتا ہے"۔ اس کا جواب بہت عرصہ ہوا دہلی کا ایک شاعر ان الفاظ میں دے چکا ہے کہ:-

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی،　　پکڑ لیں چور کا دل سہم ہیں سے،

مجھے آپ کے اسی خوف اور اسی دھڑکن سے حقیقت کا سُراغ ملتا ہے اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب میں آپ کو اپنے "حلقۂ خیال" کا اسیر دیکھ کر آزادی سے کہہ سکوں گا۔

کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگان مائی،

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے "خدشات" دور کرنے میں کامیاب ہوں اور اگر آپ نگار کے ذریعہ سے مناسب نہیں سمجھتیں تو اُسی طرح سہی جسطرح آپ چاہتی ہیں۔

دل را بہ طرہائے خم اندر خم افگنم،　　نیاز

بابُ الاستفسار

دُعا اور توبہ

(سید ذاکر علی صاحب۔ شاہجہانپور)

"مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر دعا مقبول ہوتی ہے، اور خدا دعاؤں کا قبول کرنیوالا ہے، اسی طرح توبہ کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے اور دعا و توبہ کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟"

(نگار) دعا اور توبہ کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے، جن کا مفہوم مسلمانوں میں عام طور پر بالکل غلط لیا گیا ہے اور سچ حقیقت یہ ہے کہ اس غلطی نے بڑی حد تک اس قوم کے قواءِ عمل کو مضمحل کر دیا ہے۔ دعا کے لغوی معنے پکارنے، طلب کرنے، مدد مانگنے اور طلبِ خیر کے ہیں۔ مذہب کی اصطلاح میں بھی معنے یہی رہتے ہیں، لیکن ندا و استعانت کا تعلق صرف خدا سے ہو جاتا ہے۔ یعنی دعا نام ہے اُس التجا یا پکار کا جو خدا کے حضور میں پیش کیجائے۔ اس حد تک دعا کا مفہوم اسقدر بلند، اس درجہ برتر و اعلےٰ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر طریقہ خود اعتمادی "پیدا کرنے کا کوئی اور ہو۔ لیکن ہمارے عقائد جن معنے میں اس سے متعلق ہیں۔ وہ بہت پست و دنی ہیں۔

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مصیبت و تکلیف میں، ہر کلفت و آزار میں خدا سے اس کے دور کرنے کی التجا کرنا کافی تدبیر ہے، اور اگر کوئی خواہش کسی چیز کے حصول کی پیدا ہو، تو ہم خدا سے اسے طلب کر سکتے ہیں اور وہ ہمیں دینے کا ذمہ دار ہے کیونکہ "ادعونی استجب لکم" کی نص قطعی قرآن میں موجود ہے۔ حالانکہ دعا کی حقیقی روح یہ نہیں ہے، اور نہ ایسا ہونا خدا کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے موافق ہے۔ اس غلط فہمی نے رفتہ رفتہ ایسی نامعقول صورت اختیار کر لی کہ صحت و بیماری، اولاد و موت، دولت و افلاس، سب کچھ دعا پر منحصر ہو گیا، اور دعا، گنڈا، تعویذ، وغیرہ کی بنیاد پڑ گئی، جو حد درجہ لغو و مہمل چیز ہے پھر یہی نہیں بلکہ خود قرآن بطور تعویذ کے استعمال ہونے لگا، ملاکٹ کے اندر بند کر کے گلے میں لوگ اس کو لٹکانے لگے اور اس طرح آخر کار، خدا، قرآن اور دعا سب کا مفہوم واہمہ پرستی ہو کر رہ گیا۔

نظام عالم ایک خاص اسلوب و قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ اور تمام حوادث و واقعات اُسی کے زیر اثر ظاہر

ہوتے ہیں۔ اگر اُن اُصول کے خلاف ساری دُنیا سر پٹک کر مرجائے تو بھی کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ خدا شخص کی دعا کو سُن کر قبول کرلیتا ہے، حد درجہ سفیہانہ اعتقاد ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آج تک نہ کسی ماں کا بیٹا مرتا اور نہ کسی بیوی کا شوہر فنا ہوتا۔ علاوہ اس کے خدا سخت خلجان میں پڑ جاتا کہ وہ دو متضاد دعاؤں میں سے کس کو منظور کرے اور کس کو نامنظور۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کسی کی دعا قبول کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے تو کیوں اُس سے دعا کیجائے۔ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اگر دعا کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ہر خواہش کو پوری کرتا ہے تو یقیناً دعا فعل عبث ہے، اور اس سے زیادہ احمقانہ حرکت کوئی نہیں ہوسکتی۔

ممکن ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب رونما ہوئے اُن میں دعا کا مفہوم یہی رہا ہو اور روزی کی خوراک بھی اسی طرح طلب کیجاتی ہو، لیکن اسلام نے کبھی اس کاہلی کی تعلیم نہیں دی اور اُس نے عملی زندگی کا وہ زبردست قانون بنا کر پیش کیا جسے کہیں "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کہیں "لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ" سے ـــــ (میں اس کو اسی دنیا کے انجام سے متعلق سمجھتا ہوں، اور جس چیز کا نام آخرت ہے وہ ہماری اسی دنیاوی زندگانی سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں ہے) ـــــ

جن لوگوں نے تعلیماتِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے مخفی نہیں کہ اس سے زیادہ عملی زندگی پیدا کرنیوالا کوئی مسلک نہیں، نہ وہاں واہمہ پرستی ہے، نہ رسم و رواج، نہ قانون فطرت کے خلاف کوئی تلقین کی گئی ہے، اور نہ محض بربنائے اعتقاد آسمانی برکات کے نزول کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسلام کا ایک اور صرف ایک سادہ فلسفہ یہ ہے کہ:-

"سپند دار بروں شو، سمند دار بیا"

اضطراب عمل، حرکت، ارتقاء، اقدام اصلاح اس کا تنہا مقصود ہے اور ترقی تمدن، تہذیب اخلاق و تشکیل اجتماعی اس کا مقصد فرید، لیکن اسی کے ساتھ اس نے خدا سے بے نیاز و بے پروا ہوجانے کو بھی کبھی روا نہیں رکھا۔

اور اس میں بھی ایک خاص نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے جو بآسانی ہر شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کوئی کام کرتا ہے، کسی سعی و عمل میں مصروف ہوتا ہے تو قدرتاً اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ جلد پیدا ہو اور وہ اس سے متمتع ہو۔ لیکن چونکہ اسباب و حالات پر نہ اس کا اختیار ہوتا ہے نہ پوری نظر، اس لئے بعض اوقات جب وہ اپنی کسی کوشش میں ناکام ہوتا ہے تو اس پر مایوسی و تعطل کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور قوائے عمل میں اضمحلال، اس لئے ضرور تھا کہ اس جذبہ کو فنا کیا جائے۔ اور اسی بناء پر یہ تعلیم دی گئی کہ تمام حوادث طبیعی کی طرح انسانی مساعی کے نتائج بھی خدا ہی پیدا کرتا ہے اور ہر حال میں خواہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام، اسکی مصلحتیں ہمارے لئے زیادہ مفید ہیں، اور اگر یہاں نہیں تو دوسرے عالم میں ان کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ یہ ایک ایسی تعلیم ہے جو انسان پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہونے دیتی اور اسکی عملی زندگی ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ ہر چند دوسرے عالم سے حیات بعد الممات کا عالم مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں

اور اس سے مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ "کوشش کرتے رہو اگر آج نہیں تو کل کامیاب ہوگے"۔ لیکن چونکہ انسان زمانۂ نامعلوم سے مذہبی زندگی کا عادی چلا آرہا ہے، اور ہمیشہ مذہب ہی کی نہ سمجھ میں آنیوالی قوت کے ذریعہ سے اصلاحِ امم کا کام لیا گیا ہے، اسلئے اسلام نے بھی اسی مصلحت اندیشی سے کام لیا، اور وہی تعلیم دی جو نفسیات مذہب کے ماتحت انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرنے والی تھی۔

دعا بھی منجملہ اُن دیگر تدابیر کے ہے جو کافۂ انام کی اصلاح کے لئے اختیار کی گئیں۔ دعا کا مفہوم صرف طلب خیر ہے یعنی خدا سے نیکی و عمل کی توفیق طلب کرنا تاکہ اپنے اندر ولولہ پیدا ہو۔ اور پورے جوش کے ساتھ ہم میدانِ عمل میں آسکیں۔ اس میں نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ جس وقت انسان خدا سے دعا کرتا ہے تو اُس کے اندر ایک کیفیت یقین، تکمیل آرزو کی پیدا ہوتی ہے اور یہ کیفیت اس میں خاص جوش پیدا کر دیتی ہے۔ جو اصل راز کامیابی کا ہے۔ اس سے زائد دعا کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا کا مفہوم خدا پر بھروسہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اور اسی طرح وہ لوگ راستی پر نہیں۔ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ بغیر کوشش کے خدا ہماری آرزوؤں کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔

توبہ اور دعا میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دعا نام ہے آیندہ کے لئے طلب خیر کا اور توبہ کہتے ہیں گزشتہ غلطیوں کا اعتراف اور اُن سے احتراز کرنے کو۔ دعا کرنے والے کے دل میں توبہ کا خیال آنا ضروری ہے اور جو شخص توبہ کرتا ہے وہ معناً گویا طلب خیر بھی کرتا ہے جو مدعا ہے دعا کا۔ رہا یہ امر کہ جب تک آفتاب مغرب سے نہ نکلے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اور ہر وقت توبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ آفتاب مغرب سے کبھی نہ نکلے گا۔ اور جب مغرب سے نکلے گا تو وہی مشرق ہو جائے گا۔ اسی قسم کی باتیں ہر زبان کی انشا میں پائی جاتی ہیں۔ اور محاورات میں لغوی معنے مراد لینا درست نہیں۔

اُمّت اور اُسکی اَجَل

(جناب شیخ نور حسین صاحب۔ ہیڈ ماسٹر لِیّا مظفر گڈھ)

"جناب کی توجہ۔ قرآن کریم کی سورۂ اعراف کے رکوع ۴ کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے۔ فرمایا۔ "ولکل امۃ اجل ط فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون"

اس آیت میں "امۃ" سے کیا مراد ہے؟ اور "اجل" کے کیا معنے ہیں؟ براہِ مہربانی آیت بالا کے ترجمہ اور تفسیر پر روشنی ڈالیں، اور عام لوگوں کے فوائد کے لئے ان مطالب کو اخبار نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کر دیں۔

"نیز اس آیت کے بعد (متصل) ایک اور آیت آتی ہے :- یابنی آدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایاتی ، فمن اتقی واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ط

عرض ہے کہ پہلی آیت کا دوسری آیت سے کیا تعلق ہے؟ ان کا باہمی ربط بیان کرتے ہوئے واضح کیا جائے کہ "بنی آدم" سے کون مراد ہیں؟ اور "رسل" کا "اتیان" کس رنگ میں ہے؟ جب کہ فعل "یاتینکم" (نون ثقیلہ) مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔

امید ہے کہ ان سب امور کو مفصل بیان کیا جائے؟

ان ہر دو آیات کے بعد یہ آیت آتی ہے۔ والذین کذبوا بآیتنا واستکبروا عنھا اولئک اصحب النار ھم فیھا خالدون۔

سے واضح ہوتا ہے کہ "بنی آدم" "رسل" کے آنے پر ان کے آیات کی "تکذیب" کے جرم میں "اصحاب النار" قرار دئے جاکر "خلود" کی سزا کے مستحق ہونگے۔

سوان تینوں آیات بالا کی تفسیر اور تشریح کرکے رسالہ "نگار" میں شائع کردیں۔

(نگار) امت سے مراد قوم انسانی ہے اور اجل سے مراد اس قوم کا تباہ و برباد ہوجانا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر قوم ایک عمر لے کر آتی ہے اور اُسکی عمر اُسی وقت ختم ہوتی ہے جب وہ اپنے اعمال شنیعہ سے اپنے آپ کو تباہی و بربادی کی حد تک لے آئے۔

اس کے بعد جو دو آیتیں آتی ہیں وہ بھی اسی سے متعلق ہیں اور اسی فلسفہ کی صراحت کرتی ہیں کہ ج[illegible] لوگوں نے انبیاء و رسل کی تعلیمات پر عمل کیا، انھوں نے ترقی کی اور جنھوں نے انحراف کیا وہ تباہ ہوئے۔ اصحاب نا[ر] سے مراد تباہ و ذلیل ہوجانے والے لوگ ہیں اور خالدون سے مقصود یہ ہے کہ راہ راست سے ہٹے رہنے کی حالت [میں] وہ کبھی تباہی سے نہیں نکل سکتے۔

یہ آیتیں تو بہت صاف ہیں۔ معلوم نہیں کیوں آپ کو تفسیر و تشریح کی ضرورت ہوئی۔ اور اگر کو[ئی] خاص شبہ آپ کو پیدا ہوا ہے تو آپ نے اس کی صراحت نہیں فرمائی۔

قدر کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ

یہ غیر مطبوعہ قطعہ اُسکا ہے جو ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۱۳۰۱ھ میں ناپید ہوگیا اور اُسوقت سے لکھنؤ میں قیامت کی نیند سو رہا ہے۔ یہ وہ ہے جس نے سحرؔ و برقؔ سے بندش کے بند سیکھے تھے۔ یہ وہ ہے جس نے غالبؔ و بحرؔ سے اپنے لباس شعر میں پیوند لگوائے تھے۔ جبھی تو دنیائے شاعری اسکو قدرؔ کے نام سے پکارنے لگی۔

نظامیؔ کی عروسی روح اسکی قواعد العروض میں موجود۔ سحرؔ و برقؔ کی بندشوں کی چستی اور غالبؔ و بحرؔ کے لفظی پیوند اُسکے دیوان کے ہر صفحہ میں دیکھ لیجئے۔

نواب عماد الملک کے خلف الصدق نواب عقیل جنگ بہادر بلگرامی صدر المہام تعمیرات عامہ سلطنت آصفیہ جن سے مجھکو یہ قطعہ ملا ہے۔ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان قدرؔ کی طرز اصلاح کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اور قدرؔ کا طرز بھی سب سے اس لئے الگ تھا کہ قدرؔ بادشاہوں کی نازک مزاجی سے واقف تھے۔ جس شعر میں زبان و محاورہ یا مضمون کا کوئی نقص پاتے تھے تو فن شعر کا جب تذکرہ ہوتا تو باتوں باتوں میں عرض کر دیتے تھے کہ فلاں مضمون یا محاورہ کو فلاں اُستاد نے اسطرح باندھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی ذہانت خود بخود اپنے شعر کی اصلاح کر لیتی تھی۔

عسرت و تنگ دستی شعرا کی عام قسمت ہے۔ قدرؔ بھی اس میں مبتلا تھے۔ جب دکن کی مہنگی زندگی کی تاب نہ لا سکے تو قطعہ کی لپیٹ میں نواب عماد الملک بہادر اعلی اللہ مقامہ سے نہ معلوم کیا کیا کہہ گئے۔ نصف صدی پہلے کے جینے والے کے احساسات دیکھئے جس میں خودداری کے ساتھ اپنی جیب کی مفلسی کا رونا بھی ہے۔

ہوش بلگرامی

قطعہ

چاند کا غرّہ ہوا شہر میں شہرا ہوا ، صبح کا بھولا ہوا آ تو گیا شام کو ،

چھائی شب ماہتاب خوب شب تار پر کفر کا قلعہ ملا لشکر اسلام کو

پھیل گئی چاندنی کب شب تاریک میں لت کیا کافور میں مشک سیہ فام کو

قبضۂ قدرت میں ہے جسکے سپید و سیاہ
اُس نے یہ نقرہ کیا ابلق ایام کو ،

فرش بنی چاندنی ہو گیا فراشِ ماہ
خوب جھکا جھک گیا صحن و در و بام کو

کسکا بنا مجمرئی پشتِ خمیدہ ہلال ،
پایا جو انعام میں مملکتِ شام کو

میر علی یار خاں موتمن جنگ کا ،
نام ہے سید حسین عزّہ نہیں نام کو

علم و عمل عقل و حلم سامنے انکے ہے یوں
سامنے آقا کے ہو رتبہ جو خدّام کو

خذ بیدی مرحبا مجھ سے نگہ رو برو
عرش سے ٹکّر رہے تیرے لب بام کو

کیا کہوں میرا بنا حال ہے مری صورت سوال
چھٹی زبانِ مقال جاکے مرے کام کو

بخت بنا قلعہ دار فوج بنی رنج و غم
لیکے بنایا حصار گردشِ ایام کو

پھر مجھے دے کر شکست اسمیں کیا قلعہ بند
پاؤں کی بیڑی کیا رشتۂ اوہام کو

عقل و خرد فہم و ہوش ہو گئے سب مجھسے دور
ہونے لگی روک ٹوک برسوں کے خدّام کو

ایسا جھکایا مجھے خاک بسر کر دیا
جیل کی وردی ملی بندۂ ناکام کو

آہ نے اُٹھکر کہا لے یہی پہرا ہوا
شرم کی میعاد میں ننگ نہیں نام کو

ہند میں دو سو روپے پاتا تھا کلدار میں
کل مری بگڑی تمام سوچا نہ انجام کو

اب تو مری آبرو آپ ہی کے ہاتھ ہے
دیجئے کاوا کوئی ابلق ایام کو

یا تو ملیں چار سو اور دکن میں رہوں
یا وہی دو سو ملیں ہند میں اس خام کو

عرض مری دوسری ہو جو پسند آپ کو
دام وہ منصب میں ہوں اور رہوں مادام کو

یہ تو سمجھتا نہیں مجھ سے کروگے دریغ
پھر بھی ستاؤں گا میں آپکے خدام کو

آپ ہی سوچیں ذرا کس سے کہوں ماجرا
کون سنے گا بھلا اس مرے آلام کو

قدر کا یہ منہ بھلا وصف لکھے آپ کا
محفلِ جم میں کجا رتبہ سگلی جام کو

مدح سرائی گئی اپنی ہی گانے لگا
کرنے لگا کون کام آیا تھا کس کام کو

ترجمہ کرنے لگا آپ کی جب مدح کا
سعدیِ شیراز بھی بول اُٹھے فرجام کو

وصف ترا یا کریں یا نہ کریں اہلِ فضل
حاجتِ مشاطہ کیا روئے دلآرام کو

شامِ نشاط

وہ ہوائیں، نغمۂ دلکشا، وہ فضا حسین و طرب فزا
وہ سکوتِ شام، وہ سرخوشی، وہ شفق کی بادہ چکاں ضیا

وہ طراوتِ چمن آشنا، وہ تبسمِ سمن آفریں
وہ نشاطِ روح، وہ دلکشی، وہ تجلیاں نظر آزما

لبِ نہر، نورِ شگفتگی، سرِ مہر، حلقۂ تیرگی
وہ خرامِ آب، وہ نرم رو، وہ سکوں فروش رمِ ہوا

وہ ہر ایک ذرہ زباں کشا، وہ ہر ایک جلوہ ضیا فگن
وہ ہجومِ کیف، وہ بیخودی، مے رنگ و بو، سمن و صبا

وہ نظر حجاب سے بیخبر، وہ تڑپ جبیں نیاز میں
وہ حریمِ جلوۂ ناز وا، وہ سرودِ راز چھڑا ہوا

وہ ہر ایک ذرّے کو جستجو، کوئی مجھ سے آنکھ ملائے تو
یہ ہر ایک غنچے کی آرزو، کوئی میری سمت بھی دیکھتا

وہ خیالِ حسنِ نہاں کہ اب سرِ بزم آئینہ توڑ دے
وہ پیامِ ذوقِ نظر، کہ آ، کوئی زلفِ راز بنا چکا

وہ جمالِ ناز کی بخششیں، وہ ترنمِ دلِ آرزو
وہ قبولِ عام کی ساعتیں، وہ تبسمِ لبِ التجا

وہ حیاتِ کشمکش آزما، طلبِ نشاط میں گرم رو
وہ ضمیرِ ہستیٔ مضطرب، رہِ جستجو میں شکستہ پا

پئے ہر نظر وہ ضیا فشاں، چمنِ حقائقِ زندگی
سرِ ہر نفس، وہ ترانہ گر، اثرِ طرب کدۂ وفا

کبھی میں بھی وقفِ حیات تھا، کبھی میرے دل میں بھی روح تھی
مری صبح، موجِ بہار تھی، مری شام نغمۂ جانفزا

مگر آہ، اب نہ وہ شام ہے، نہ وہ کیفِ عشرتِ سرمدی
وہ نشاطِ روح کدھر گئی؟ یہ سکونِ قلب کو کیا ہوا؟

ہیں مدتیں کہ تجھے نہیں، مرے حالِ زار کی جستجو
نہ وہ عرضِ حسرتِ دلنشیں، وہ نازِ حوصلہ آزما

تجھے یاد ہیں وہ مسرتیں، وہ لطیف نغمۂ بیخودی
سرِ شام سیرِ چمن، کبھی لبِ نہر لطفِ رمِ صبا

وہ تڑپ کے گھر بنا، کبھی جو نگاہ ذرّے سے لڑ گئی
وہ جھٹک کے پھول ہوا، کہیں جو کسی شگوفے کو چھو دیا

سرِ خاک بارشِ گل ہوئی، کبھی مسکرا کے جو بات کی
شبِ ماہ، پاؤں پہ جھک گئی، جو نقاب رخ سے ہٹا دیا

مرے اشک تھے وہ جمے ہوئے، جو گہر بنے ترے ہار میں
تجھے یاد ہے؟ کہ تری ہی موجِ نگاہ کا یہ کرشمہ تھا

جو حریمِ روح میں کر رہا تھا، ترے خیال سے روشنی
وہ چراغِ موجِ ہوائے غم کی ستمگری نے بجھا دیا

تو بہارِ جلوۂ ناز بن، خجستہ نشاطِ دو عالم ہو
وہی سیر ہو، وہی لطف ہو، مری شام پھر وہی شام ہو

علی اختر، اختر

جانِ حزیں

ضمیرِ جہانِ مکافات ہے تو — ضیا گیرِ نورالسموات ہے تو

مری جان! آئینۂ ذات ہے تو

جو کہتا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو — تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

بہ ظاہر تو اک نقطۂ نور ہے تو — بہ باطن مگر رشکِ صد طور ہے تو

میری جان! اک شعرِ منثور ہے تو

جو سمجھا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو — تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

جہانِ محبت کی ہستی ہے تجھ سے — مئے جامِ فطرت کی مستی ہے تجھ سے

یہ ساری بلندی و پستی ہے تجھ سے

جو سنتا ہوں میں گر یہ سب کچھ نہیں تو — تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

تو ہی شاہدِ بزمِ ارض و سما ہے — نگہ تیری ہر ذرہ کا آسرا ہے

یہ ہنگامہ سارا تجھی سے بپا ہے

اگر در حقیقت یہ سب کچھ نہیں تو! — تو پھر کیا ہے اے میری جانِ حزیں تو؟

ہے تیری محبت عبادت میں داخل — ہے تیرا تحفظ ریاضت میں داخل

بجا صرف تیرا شہادت میں داخل

متاعِ گرانمایہ ہے بالیقیں تو — کسی کی امانت ہے جانِ حزیں تو!

امین حزیں

نیرنگِ نمکسازی

باقسمتِ خود ہر کس باشد بہ عمل انبازی
ما و شکر از لعلش کاندہی و نمک سازی

حق شرف و دولت حاصل نہ شود ہرگز
از معرکہ آرائی و زعربدہ پردازی

این نکتہ بیاموزید از من نہ ز فارابی
این راز نہاں از من خوانید نہ از رازی

اینجا نہ بیاد آرید از شافعی و حنبل
اینجا نہ سخن رانید از جوزی و شیرازی

این معنی بیگانہ این گوہر یکدانہ
ہرگز نتواں جستن در ترکی و در تازی

من بالب نوشینت کردم سخنے تازہ
شکر چہ بدشنامے شاید کہ تو بنوازی

تا در نمک اندوزی جمعے نمک انگیزند
در مجمع تو گرداں تو ہم شکر اندازی

زین بیش نمک یارا مفروش بدل ریشاں
تا دل شکنی بگسل نیرنگ نمک سازی

از انجمن نازت دل بر نہ کنم حاشا
چوں عود اگرم سوزی چوں شمع چہ بگدازی

از دیدہ دلم از تو غیر از تو نمی خواہد
خواہ ام بہ نگہ داری خواہ از نظر اندازی

آنکس کہ در گاہت سر تافت چو گیسویت
پامال کفِ پا شد با جملہ سرافرازی

امید مرا صبر و انصاف ترا یادا
من با تو ہمی سازم با من تو نمی سازی

اے آنکہ تو میدانی خود را بہ سخن داناں
اے آنکہ تو بہ نشانی خود را بہ سخن سازی

اے آنکہ نمی یابی از مشرب من راہے
اے آنکہ نمی داری این بادۂ شیرازی

تکریر اگر از حرفے بینید بہ تحریرم
عیبم نہ شمارید از کج رائی و کج بازی

لاے عرق ہند از جامِ دگراں در کش
جو شد مے صاف من در شیشۂ شیرازی

از بزم بد انجامت وز صحبت خودکامت
بر گیرم و بر دارم دل را کہ بد آغازی

اشعار بہ خود را خوانی و نکو خوانی
گفتار بد خود را پوشی بہ خوش آوازی

امروز من از دادت صد شکوہ بدل سنجم
رفت آنکہ ز بیدادت بودم بہ گلہ سازی

شکر شکنا تا در آتش نمک افگندن
شوریدہ سرا در مے تاکے نمک اندازی

اے از تو نمی آید ہمکاری و ہمراہی
اے از تو نمی خیزد ہم بزمی و ہمرازی

اے با تو نمی باید عیاری و غداری
اے با تو نمی شاید نمامی و غمازی

سوزن بہ جگر دوزی گویند کہ خیاطی
دیبائے حق بافی نامند کہ بزازی

با شیر نرت روزے ترسیم کہ بر ساند
بز خوئی و بز کاری بز گیری و بز بازی

بندے گفت یارا از مصلحت اندیشی!
دل را شکن بہ شکن قانونِ نمک سازی

(امید امیٹھوی)

غزلیات

(باسط بھوپالی)

اور ہوتی ہے عشق عزت دو رسوائی مجھے
تم بھی اپنے منہ سے کہدیتے جو سودائی مجھے

اب یہ مجھ سے پوچھتے ہیں کیوں گریباں چاک ہے
آپ ہی نے ہنس کے فرمایا تھا سودائی مجھے

چھوڑ کر عشق بتاں حوروں سے ہیں الفت کرو
حضرتِ ناصح نے اچھی بات سمجھائی مجھے

پردہ دوری مرے دستِ تصور سے اُٹھا
انجمن اُن کو مبارک۔ میری تنہائی مجھے

آنا کہکر جان دیدی باسط اُنکے سامنے
دیکھنا ہے آپ کا رنگِ مسیحائی مجھے

(جگر بھوپالی)

عداوت بڑھ رہی ہے باغباں سے
دھواں اُٹھیگا اک دن آشیاں سے

تھکے ماندے مسافر کچھ خبر ہے
وہاں جانا ہے آیا ہے جہاں سے

چلے سوئے قفس ہم کس خوشی سے
لگا کر آگ نکلے آشیاں سے

. . . .

لدی پھولوں سے تھی شاخِ نشیمن
چلے تھے جب قفس کو آشیاں سے

مسہری پر بچھائے جا رہے ہیں
یہ آخر پھول آئے ہیں کہاں سے

جو اُٹھواتے ہو اتنا حکم دیدو
لپٹ کر رو تو لیں ہم آستاں سے

. . . .

. . . .

تمہیں ظالم کہے سارا زمانہ
مگر ہم کیا کہیں اپنی زباں سے

ابھی ہے منزلِ مقصود کوسوں
رہے پیچھے جگر ہم کارواں سے

(دلؔ شاہجہانپوری)

دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے
آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

آئی بہار حاصلِ دنیا لئے ہوئے
ہر شاخِ گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

سعیِ طلب سے پہلے ہی شکلِ مآل دیکھ
اک آئینہ ہے نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

ہر اشکِ خوں کو دیکھ رہا ہوں محیطِ غم
قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ساقی اسی نظر سے جو کیف آفریں رہا
رندانہ چلیں گے ساغر و مینا لئے ہوئے

مست کر بڑھا کچھ اور بھی ہنگامۂ جنوں
اٹھا غبارِ قیس تو صحرا لئے ہوئے

نشتر سے دل کو چھیڑ تو دو بزمِ ناز میں
پھر دیکھ لو کہ بیٹھے ہیں کیا کیا لئے ہوئے

ٹھہرا رہا ہے دعوئے پندار و اتقا
آتا ہے کوئی ساغر و مینا لئے ہوئے

بالا ہے بزمِ طور سے بھی جو مقامِ دید
پہونچے وہاں ہم اُن کی تمنا لئے ہوئے

اے احترامِ ساقیِ محفل [illegible]
لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

اے دلؔ سب اُنکی راہ میں ہو چکے ہیں پائمال
تم بھی بڑھے چلو یہ تمنا لئے ہوئے

عشقؔ رامپوری

کیا بتاؤں کون سا اندازِ دل تڑپا گیا
اک نظر سے دیکھنا اونکا قیامت ڈھا گیا

جستجوئے حسن نے ایسا بڑھایا اضطراب
موت سے پیمانۂ عمرِ رواں ٹکرا گیا

سن رہا ہوں سسکی چپ بیٹھا محبت میں تری
دل میں جو آئی تھی کہہ جانے سے ہر آیا گیا

یہ تسلی کیا کہ جب آیا تسلی کے لئے
کیسی تسکیں اور بھی ظالم مجھے تڑپا گیا

بزمِ عشرت میں بھی قسمت سے رہا محروم مے
دیکھتے ہی دیکھتے ساغر کو سر چکرا گیا

کیا کہوں کیا بات تھی کیوں آ گیا دلکو قرار
وہ کچھ ایسا ہی تھا جو سنے تجھے سمجھا گیا

مار ڈالا عشقؔ اس کے التفاتِ ناز نے
کھا گیا ہاں عمر بھر میں آج دھوکا کھا گیا

(فرخ بنارسی)

وصال و ہجر کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
خیال بن کے وہ دل میں سمائے جاتے ہیں

ملے بھی وہ تو ادائے ستم نہیں باقی
نگاہ پھیرے ہوئے مسکرائے جاتے ہیں

مشاہدات کی رنگینیاں بڑھانے کو
حجاب ناز سے جلوے دکھائے جاتے ہیں

شب فراق کا عالم ارے معاذ اللہ
چراغ شام ہی سے جھلملائے جاتے ہیں

فنا بقا ہیں وہ آئینے جن میں عاشق کو
عذاب و لطف کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

بقائے دولت آشفتہ خاطری کے لئے
تعینات کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں

نہ راز میکدۂ عشق پوچھ اے زاہد
ہمیں تو ساغر وحدت پلائے جاتے ہیں

الٰہی کیسے کٹے گی جنون عشق کی راہ
خیال ہی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

غرض یہ ہے کہ حقیقت شناس ہو کوئی
ہزار رنگ کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

دکھا کے آئینہ حسن مجاز کا فرخ
حقیقتوں کے تماشے دکھائے جاتے ہیں

ڈاکٹر قیس شروانی

آتے آتے ہاتھ میں دامان ساحل رہ گیا
دہر میں افسانۂ بربادیٔ دل رہ گیا

آہ میری ہمتوں نے کب دیا مجھکو جواب
دور جب دو چار گز دامان ساحل رہ گیا

مٹ گیا آ کر وطن میں دل سے غربت کا خیال
اک تصور میں سواد شام منزل رہ گیا

آہ وہ جوش جوانی وہ جنون انبساط
یاد جب آیا مجھے میں تھام کر دل رہ گیا

ہو اسے کیا عشرت آزادی دل کی خبر
دہر میں جو ہو کے پابند سلاسل رہ گیا

سب نے لوٹا اس حیات چند روزہ کا نشاط
ایک میں نیرنگیٔ قسمت سے غافل رہ گیا

پوچھ دیکھو قلب پروانہ سے لذت عشق کی
ہو کے جو قربان حسن شمع محفل رہ گیا

مجھ سے اے زنجیریٔ صحرا نوردی کچھ نہ پوچھ
کس طرف لیلائے آزادی کا محمل رہ گیا

دیکھ اس واماندۂ تقدیر کی مجبوریاں
قیس جو کر کے نگاہیں سوئے منزل رہ گیا

نظیر لدھیانوی

بسکہ بھایا تھا ترے عشق میں ویراں ہونا　ورنہ منظور نہ تھا خاک کو انساں ہونا

زیرِ شمشیر کھلا ابن ابراہیم پہ یہ　کام اول ہے رہِ عشق میں قرباں ہونا

غم نے چھوڑی نہ تری یاد بھی دل میں آخر　اصل میں یہ ہے بھرے گھر کا بیاباں ہونا

آؤ محفل میں ترا راز نہ چھپنے دے گا　مثلِ فانوس میرا شعلہ بداماں ہونا

چھپ گیا روزِ ازل خاکِ الم ہر رگ میں　تھا مری خاک کی قسمت میں گلستاں ہونا

برق ہوں، صبح کا تارا ہوں، حباب سا ہوں　یعنی ہر طرح عیاں ہے مرا مہماں ہونا

بٹ گئی خلد کی نعمت بھی صنم خانوں میں　میرے کچھ کام بھی آیا نہ مسلماں ہونا

دور ہے پھر مری آنکھوں سے کوئی شمع جمال　دیکھ اے شامِ سیہ میرا پریشاں ہونا

آج اس دشمنِ ایماں کی حکومت میں نظیرؔ
جان سے ہاتھ اٹھانا ہے مسلماں ہونا

جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کے رسالہ کے متعلق ایک تجویز

گزشتہ تین سال سے نگار کا جنوری نمبر تقریباً دوچند ضخامت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے سنہ ۲۸ء کا پہلا پرچہ مومن کیلئے مخصوص تھا۔ سنہ ۲۹ء کے جنوری نمبر میں سنہ ۲۲ء کی جلد کا اقتباس تھا اور سنہ ۱۹۳۰ء کا جنوری نمبر ظفر کیلئے وقف کیا گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سنہ ۳۱ء کا جنوری نمبر کیا ہو؟ پہلے میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اسکو مصحفی کیلئے مخصوص کر دیا جائے لیکن اب یہ خیال مضمحل ہو گیا ہے اسلئے کہ اول تو مصحفی پر ایک طویل مضمون نگار میں نکل چکا ہے، دوسرے یہ کہ مجھے اس کا یقین نہیں کہ لکھنے والے اسطرف توجہ کرینگے اور تیسرے یہ کہ ناظرینِ نگار، شاعری کے قصہ کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتے پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟ میری دو تجویزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کا پورا پرچہ میرے ہی مضامین سے پُر ہو اور دوسرے یہ کہ اسوقت تک کے باب الاستفسار کے تین حصہ کرکے ایک حصہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع کر دیا جائے گویا اسطرح تین سال کے اندر استفسارات کا پورا مجموعہ لوگوں کے پاس پہونچ جائیگا۔ ہر چند اسمیں میرا تجارتی خسارہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن میں اس خسارہ کو برداشت کرونگا۔ کیونکہ اسطرح میں آسانی سے اور جلد، پبلک کی ایک بڑی خواہش کو پورا کر سکونگا۔ بہرحال میں آپ حضرات سے رائے طلب کرتا ہوں کہ ان میں سے کس تجویز پر عمل کیا جائے۔ **نیاز**

معلومات

عجائباتِ قدرت پر انسانی تصرف کی ایک مثال

یورپ و امریکہ میں، جھریوں کے ازالہ، ناکوں کی اصلاح، آنکھوں کی تحسین کے لئے جراح کے نشتر سے کام لیا جاتا ہے

بڑھاپے میں جب آنکھوں کے نیچے رخساروں پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، تو جراح نشتر سے کان کے پاس کی تھوڑی سی جلد کاٹ لیتا ہے۔ پھر اُنکو برابر کرکے دھاگے سے سی دیتا ہے۔ اس ترکیب کے بعد چہرہ کی تمام بدنمائی جاتی رہتی ہے۔ اسیطرح لمبی اور بھدی ناکوں کو بھی کاٹ کر متناسب طوطی کی طرح سُبک اور حسین بنا دیتا ہے۔ سینما کی اکثر عورتیں گوشۂ چشم کی طرف سے آنکھوں کو کشادہ بنوانے کیلئے جراحوں کے پاس جاتی ہیں اور کامیاب ہو کر آتی ہیں۔

قطع و جراحت کے علاوہ تجمیل اور تحسین کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے یہ طریقہ صرف غذا اور تدلیک کے ساتھ ساتھ ریاضت کی مشق ہے۔ ایکٹ کرنیوالی نوجوان عورتیں ہمیشہ ریاضت کرتی ہیں۔ اور جسم کو فربہ بنانیوالی غذائیں مطلق نہیں کھاتیں۔ اس سے اُنکے حسن و جمال کی رونق اور بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے سامان بھی تیار کئے گئے ہیں جنکو استعمال کرنیکے بعد ایک بھدی عورت کے جسم کی تمام ناہمواریاں زائل ہو جاتی ہیں۔

متمدن دنیا کے اندر زینت اور سنگار کے کارخانوں میں حسن و جمال کے بہت سے مخصوص سامان موجود ہیں۔ اگر شمار کیا جائے تو یورپ و امریکہ میں اسوقت کروڑوں اشرفیوں کے صرف غازے اور پوڈر ہوں گے۔ ناظرین متحیر نہ ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یورپ کی غیر معمولی تجارت کا ⅓ حصہ صرف مستورات و خواتین کے سامانات زینت کے لئے وقف ہے۔

لیکن لعبتانِ فرنگ کو تجربوں کے بعد معلوم ہوا کہ جلد کے کاٹنے سے چہرہ کی کوئی پائدار اصلاح نہیں ہوتی بلکہ تھوڑے ہی دنوں میں پہلے کی طرح پھر ناہمواری آجاتی ہے۔ نیز پوڈروں اور غازوں کے استعمال سے بھی جلد کو صدمہ پہونچتا ہے اسی لئے ماہرین فن نے آجکل ایسے جدید آلات ایجاد کئے ہیں۔ جنکو استعمال کرنیکے بعد اَدھیڑ عورتوں کے خشک چہروں میں شباب کی سی تازگی آجاتی ہے۔ ۴۰ برس کے سن میں رخسارے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور ہڈیاں نکل آتی ہیں۔ لیکن یہ جدید اختراع جو طوق کی شکل پر ایجاد کی گئی ہے ان تمام بدنمائیوں کا بڑی خوبی کے ساتھ خاتمہ کر دیتی ہے۔ یہ طوق سر کے گرد لگایا جاتا ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں رخساروں کی تمام ناہمواریوں کو ہموار بنا دیتا ہے۔ دن بھر لگائے رہنے کے بعد ایک مسن عورت کے رخسارے بیس برس کی دوشیزہ کے حسین گال ہو جاتے ہیں اور اس عمل کا اثر چند مہینوں تک باقی رہتا ہے۔

ہونٹوں کی ہمواری اور تبسم کی دلفریبی کے لئے بھی ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے۔ اس آلہ کو نوجوان یا اَدھیڑ عورتیں شب میں

سونے سے پہلے لگاتی ہیں۔ یہ آلہ دونوں گوشوں میں باندھ دیا جاتا ہے اور صبح تک ہونٹوں میں غیر معمولی نزاکت آجاتی ہے۔

نکلے ہوئے ناہموار کانوں کو درست بنانے کے لئے بھی ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے، یورپ و امریکہ میں ننھے ننھے بچوں کے کان ٹھیک کرنے کے لئے یہ آلہ برابر خریدا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ حسن وجمال کے اور بھی بہت سے جدید آلات ایجاد کئے گئے ہیں جن کی تفصیل نہ معلوم ہونے کی وجہ سے سردست انکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یہ جدید طریقے جراحی سے زیادہ کارآمد اور بہتر ہیں، اس نئے طرز میں وہ دشواریاں بالکل نہیں ہوتیں جو اگلے طریقوں میں تھیں، کہا جاتا ہے کہ ماہرین فن بعض ایسے آلات بنانے میں مصروف ہیں جن کے بعد امید ہے کہ دنیا سے بدصورتی کا قطعاً خاتمہ ہوجائے گا۔　　(بدر اصلاحی)

باب زریں

باب زریں قسطنطنیہ کے آثار قدیمہ میں عجیب وغریب چیز ہے۔ اسکو شاہ تھیوڈولس نے ۳۸۸ء اور ۳۹۱ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔ دروازہ کی محراب پر یہ کتبہ تھا۔ "ایک جابر کے مرجانیکے بعد تھیوڈولس نے اسکو تعمیر کرایا۔ اور باب زریں کا بنوانے والا یقیناً صاحب حیات زریں ہے۔" اس زمانہ سے اب تک اس کے متعلق عجیب وغریب حکایات وروایات چلی آرہی ہیں۔ اگلے زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ اس میں سے گذرنے والا شخص قسطنطنیہ کا بادشاہ ہوسکتا ہے۔ ترکوں کی یورش کے بعد سے اسکو قطعی بند رکھنے کا حکم جاری کردیا گیا تھا تاکہ کوئی خوش نصیب اسمیں سے گذر کر ترکی سلطنت نہ ہتھیائے۔ ۱۹۱۸ء میں جب انگریزی فوج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو یہ بات عام شہریوں کے زبان زد تھی کہ فوج باب زریں سے داخل نہیں ہوئی ہے اسلئے اس قوم کی حکومت یہاں قائم نہیں رہ سکتی اور حیرت ہے کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ پانچ سال بعد انگریزوں کا استنبول سے تسلط نہ رہا۔

اس دروازہ کی موجودہ حالت افسوسناک ہے۔ یوں تو مدتوں سے زلزلہ اسکو نقصان پہنچاتا رہا ہے لیکن ۱۸۹۴ء کی شدید زلزلہ نے اسکی برجیاں اور محرابیں بالکل منہدم کردیں۔ بقیۃ الآثار میں پھر بھی بہت سی چیزیں عجائبات سے خالی نہیں۔ اسکی محراب بہت بڑی ہے جسکے حجم کو اینٹیں دور تک وسعت دیتی چلی گئی ہیں۔ اسکی بنیاد خالص سنگ مرمر کی تخت نما سطح پر قائم ہے۔ ستون بھی سنگ مرمر کے ہیں۔ اسیطرح پینتالیس ستون اور ہیں۔ کھودنے سے قبل یہ دروازہ مٹی سے لدا ہوا تھا اور اسکے تمام تاریخی صنائع زیر زمین تھے۔ مدت تک مٹی ہٹائی جاتی رہی تب کہیں صفائی ہوسکی۔ برآمد شدہ اشیاء کو برٹش اکاڈمی نے استنبول کے عجائب خانہ میں پہنچادیا۔ اس دروازہ کے بالمقابل ایک چھوٹی محراب اور تھی۔ یہ دونوں راہیں صرف فاتحان وقت کے گذرنے کے لئے مخصوص تھیں۔ چنانچہ ہرکلس یا ہرقل بھی فارس کی فتح کے بعد اسی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا تھا۔

اسکو کھودنیکا مقصد یہ تھا کہ پیشتر یہاں سیاح نکیے یا ئے موقوف پارہ اور خوبصورت سنگ مرمر کے ستون تھے جو ۱۷۹۱ء میں غائب ہوگئے۔ ایک فرنچ سیاح نے ۱۵۴۴ء میں پورے بارہ ستون دیکھے تھے۔ سرطامس پر رو بمشکل انمیں سے چھ ستون ۱۶۲۵ء تک جمع کرسکا مگر وہ نہایت خراب حالت میں دستیاب ہوئے۔ مسٹر پٹی نے ۶۰۰ کراؤن کے عوض مقامی محافظوں سے انکو خریدنا چاہا مگر وہ لوگ اپنی

تاریخی صنعت فروخت کرنے پر راضی نہوئے۔ آخر سرطامس رو اور مسٹر پٹی کو لوگوں کی ناراضگی کے خوف سے فرار ہونا پڑا۔ شہر والوں کا عقیدہ تھا کہ دروازہ کی تمام سنگ تراشی سحر بند ہے اور اسکے وہاں سے ہٹتے ہی ان پر کوئی آفت نازل ہو جائیگی۔ سرطامس رو لکھتا ہے "خواہ یہ صحیح ہو یا غلط مگر ان پتھروں کو چھونے کی کوشش کرنے سے قبل ہی وہ لوگ تو ہمارے لئے مصیبت بنگئے تھے" آخر ان پتھروں میں کیا صنعت تھی کہ سرطامس اور مسٹر پٹی دندان از تیز کئے بیٹھے تھے؟ طامس رو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیرکلیس، پیگاسیس اور اینڈیمیون کی صنعت کے بہترین نمونے تھے۔ بہر صورت وہ انگریزوں کے ہاتھ پڑ ہی گئے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس بیش بہا شے کی حفاظت شہریوں نے ۱۶۲۵ء میں اسقدر اولوالعزمی سے کی تھی وہ ایک صدی بعد مفت میں اغیار کے ہاتھ پڑ گئی۔

ان سنگ تراشی کے نمونوں میں پہلا بہ لحاظ اپنی صنعت و کاریگری کے بہت اچھا تھا۔ اسپر ماہتاب کا پورا چہرہ بنا ہوا تھا رومن کے زمانہ کی صناعی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بذات خود اصل تھا یونانیوں کی کسی صنعت کا چربہ نہ تھا۔ ماہتاب کا غمگین چہرہ جس کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ تھے۔ سنگ تراش نے نہایت کاریگری سے تراشا تھا۔ دوسرا نمونہ گو اس قدر خوبصورت نہ تھا مگر اپنی ندرت کے اعتبار سے وہ بھی خوب تھا۔ سنگ مرمر کا ایک سالم ہاتھ تراشا گیا تھا جو روشن مشعل لئے ہوئے تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک صنعت کے دو مختلف نمونے نہ تھے بلکہ غمگین چاند افسردگی کے عالم میں آسمان پر نظریں جمائے مشعل بکف ایک ہی ستون میں تراشا گیا تھا۔ اینڈیمیون کی صنعت زیادہ نمایاں نہ تھی۔

ان بتوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے بت تھے۔ ایک بہت بڑے گھوڑے کا سر برآمد ہوا لیکن افسوس سحر کار بت تراش کی یہ تمام صنعتیں نہایت خراب حالت میں دستیاب ہوئیں۔ اسکی وجہ یہی معلوم دیتی ہے کہ وہ بت شکن مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

دروازے تین ہیں۔ دائیں بائیں چھوٹے ہیں درمیان کا دروازہ بڑا ہے۔ شاید جسٹنین کے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے اسقدر بڑا دروازہ رکھنا خطرہ سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان دروازوں کی وسعت کم کرکے انکو مستطیل کر دیا گیا۔ گیارھویں صدی میں بائیں جانب کا چھوٹا دروازہ بالکل مسدود کر دیا گیا اور وسطی دروازہ پر محراب رکھکر اسکو داہنی جانب کے دروازہ کے برابر کر دیا مگر اس کو بھی مخدوش سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ شب و روز شہر پر یورش ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس کو بھی تیغہ لگا دیا گیا اور صرف ایک باقی رہنے دیا گیا۔

ترکوں کی دست برد کے بعد بقیۃ الآثار میں ایک شے اور دستیاب ہوئی۔ یہ ایک فولادی خود تھا جسکو اٹلی کی پندرھویں صدی کی صنعت سمجھنا چاہئیے۔ ترکوں کے زمانہ میں یہ باب زریں ایک قلعہ کی شکل میں آگیا اور ہفت منارہ مشہور ہوا۔ سالہا سال تک ان ممالک کے سفیر اور ایلچی وغیرہ مقید رہے۔ جن سے سلطنت ٹرکی اس زمانہ میں مصروف پیکار تھی۔ ان قیدیوں نے اپنی اسیری کے زمانہ میں جو الفاظ دیواروں پر کندہ کئے۔ وہ ابتک وہاں نظر آتے ہیں۔ سب سے نمایاں وینس کے ایک بحری افسر کی عبارت ہے جو سات سال تک وہاں مقید رہا تھا۔ (قیسی)

بسم اللہ

نگار

جلد ۱ فہرستِ مضامین ماہِ ستمبر ۱۹۳۰ء شمارہ ۳

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ ستمبر ۱۹۳۳ء شمارہ ۳

ملاحظات

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، لازم و متعدی اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

یہ دماغی بیماری مذہب کے غلو اور مذہبی جماعت کی عدم صلاحیت نے پیدا کی اور جس وقت تک ناحق کوش علماء مذہب کا وجود باقی ہے، دنیا کبھی امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے:۔ تصدیق بالجنان و اقرار باللسان۔ یعنی ضمیر کا اطمینان اور اُس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہوگا، ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور جب یہ نقش اچھی طرح دلنشیں ہو جائے گا۔ تو زبان سے اسکا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اس اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے۔ یہانتک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدۂ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہر چند اب دنیا اس منزل میں نہیں ہے۔ کہ وجود باری پر یقین لانے کے لئے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے، تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ و التباس کی کارگاہ ہنوز قائم ہے۔ اور غالبًا زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ، زیادہ اُلجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے۔ پھر یہ

کسقدر عجیب و غریب ذہنیت انسانی ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کیجاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینان قلب کے لئے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا، اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دیجاتی کہ ہم ان جانشینانِ رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بنا پر اپنے آپ کو حامل دین متین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا کا تنہا فطری مذہب ہمکو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے؛ وہ ہمکو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح، نظام عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے، لیکن یہ مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ حسنہ میں ظاہر کرتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا، دیا جا چکا ہے، اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس ترقی کی حد کیا ہوگی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا اب تک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی و ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف احمقانہ تقلید و اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہو اس تبلیغ کا نام اس نے "اعلاء کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے۔ در آنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام اور اس سے زیادہ اشاعت کفر و الحاد کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ اپنی ہمہ دانی کی ہیبت جاہلوں پر طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشافِ حقائق کا، استقراء و مشاہدہ کا، اور اس لئے ٹھیک اسوقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھکر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے، صاحبانِ عقل و دانش اس پر ہنستے ہوتے ہیں، اور جس اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے، اسے دیکھ کر لوگ اور اس سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم حق و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے۔ کیونکہ دنیا سے مذہب اٹھ چکا ہے اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی۔ پھر اگر کوئی اس دورِ ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک "مکانکی" چیز ہو کر رہ گیا ہے، روح کا اضطراب سکون کا طلبگار ہے، جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں "دنیا کا امن" کہا جاتا ہے۔ غالباً مبلغین مذہب کو اسکا علم نہ ہوگا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے، اسکے لئے مذہب میں ایک نہایت

ہی جامع و پُر معنی لفظ "صراطِ مستقیم" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا۔

جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں اُس منزل تک پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاء انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جسے اسلام نے بتایا اور جو تمام نوع انسانی کو بلا تفریق نسل و قومیت بلا امتیاز ملک و ملت، یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔ لیکن کیا اسلام کی یہ صلح کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درس اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید برداران فردوس سے چاہو، اُن اجارہ داران خلد سے طلب کرو اور ان قائدین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو، جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا ایک مخصوص رسم و رواج کا اور جو آخرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، کیا اُن سے میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو خیر، ورنہ ازراہِ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں "لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر" کا کیا مفہوم ہے۔ اور "لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ" سے کیا مراد ہے۔ کیا عبادت و منسک ایک ہی چیز ہیں، کیا نماز اور منسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ ہیں؟

اسوقت دنیا اس اعلان کے لئے گوش بر آواز ہے جو شملہ کی چوٹی سے سنایا جانیوالا ہے اور جس پر ہندوستان کی سیاسیات کا مستقبل بڑی حد تک منحصر ہے۔ آج ۲۶ راگست تک سوائے اسکے کوئی اہم خبر موصول نہیں ہوئی کہ سر سپرو اور مسٹر جیکار شملہ پہونچکر وائسرائے سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ اور اُن شرائط کو پیش کر چکے ہیں۔ جو ہندوستان کے زعماء سیاست کی طرف سے طے پائی ہیں۔ اخباروں نے ظن و تخمین سے کام لیکر بڑی حد تک ان شرائط کی تصریح بھی کر دی ہے اور ممکن ہے کہ وہ بڑی حد تک صحیح ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ وقت و مصلحت کا اقتضا یہی ہے کہ جس طرح ممکن ہو، موجودہ نزاع کو ملتوی کیا جائے اور گزشتہ چند ماہ کے اندر جو توازن اقتصاد و معاشرت درہم برہم ہو گیا ہے اُسے اپنے اصلی حال پر لایا جائے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حکومت ہند کو بھی اطمینان سے غور کرنے کا موقعہ ملے گا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں وہ کیونکر ہندوستان کے جذبات کی صحیح نمائندگی کر سکتی ہے اور دوسری طرف خود کارکنان قوم کو آیندہ زیادہ قوت و جوش کے ساتھ کام کرنیکا حوصلہ ہوگا۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس حقیقتًا کوئی معنے نہیں رکھتی اگر کانگرس کی نمائندگی وہاں نہ ہو اس لئے قیدیوں کی آزادی

کا مسئلہ اس جگہ آکر بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ البتہ حکومت ہند کے لئے یہ وعدہ کرنا کہ وہاں ڈومی نین رُول ہی پر گفتگو ہوگی بیشک دشوار ہے۔ علی الخصوص اُسوقت جبکہ لیبر پارٹی سے بھی اس باب میں زیادہ فیاضی کی توقع نہیں کیجاتی۔ بہرحال یہ گھڑیاں بڑی فیصلہ کُن گھڑیاں ہیں اور ملک کو بغیر کسی قسم کے اضمحلال کے نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

حال ہی میں مسلمانوں نے پھر اُسی عجیب و غریب چیز میں روح پھونکنا چاہی ہے جو اس سے قبل بھی اسی تنظیم کانفرنس کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ اس کے ناشرین میں سے فی الحال سب سے زیادہ اہم ہستیاں جناب ماجد بدایونی اور شوکت علی کی ہیں، جو بدقسمتی سے دونوں مولانا ہیں، ایک بہ لحاظ اپنے جبہ و عمامہ کے اور دوسرے بہ حیثیت اپنے شحم و لحم کے۔ تنظیم کانفرنس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے ذریعہ سے کیسی کیسی اہم خدمات انجام دیجائیں گی۔ اسکا جواب زیادہ دشوار نہیں۔ ایک انسان کے ماضی کو دیکھو مستقبل آپ سامنے آجائے گا۔ جنھوں نے انجمن تبلیغ میں اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں جناب بدایونی کے کارنامے دیکھے ہیں اور جنھوں نے خلافت کی تحریک میں شوکت علی صاحب کی کارگزاریوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بہ آسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تنظیم کانفرنس کا کیا حشر ہوگا اور وہ ملک و قوم کی دشواریوں میں کتنی آسانیاں پیدا کرگی۔

اول اول جسوقت مسٹر کچلو نے اس کانفرنس کی بنیاد رکھی تو یہی شوکت علی تھے جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اب بھی اپنے تمام "ابعاد ثلثہ" کے ساتھ وہی شوکت علی ہیں جو اس کو "اصل کار" اور "کعبۂ مراد" بتا رہے ہیں۔ اس بوالعجبی کا اظہار ایسی ہستیوں سے مستبعد نہیں ہے، کیونکہ ان حضرات کو نہ قوم و ملک سے کوئی صحیح تعلق ہے، نہ مذہب و انسانیت سے۔ یہ وہ بندگان ہوس و غرض ہیں جنھوں نے ہمیشہ یہی کیا اور کرتے رہیں گے۔ البتہ امتداد زمانہ سے اتنا انقلاب ضرور ہوا ہے کہ لوگ پہلے ان سے واقف نہ تھے اور اب کچھ حقیقت آشنا ہو چلے ہیں۔

جسوقت سید جالب اڈیٹر ہمت کا انتقال ہوا میں حیدرآباد میں تھا۔ یہاں آنیکے بعد مجھے صرف ایک یا دو ماہ کے ملاحظات میں اس واقعہ کے اظہار کا موقعہ ملا، لیکن وہ "قیام الدین" اور اُس کے متعلقات کے نذر ہوگئے۔ تاہم میں نے یہاں کے ایک مقامی روزانہ اخبار میں، اپنے خیالات لبغرض اشاعت روانہ کردئے تھے جنھیں اُس نے کسی مصلحت کی بنا پر شائع نہیں کیا۔ بہرحال اب میں اس تعویق پر عذر پیش کرتے ہوئے سید جالب کی وفات پر اظہار ملال کرتا ہوں، اور یقیناً اس سانحہ کو اُردو صحافت کا سخت حادثہ سمجھتا ہوں۔

سید جالب نہ صرف ایک صحافی بلکہ ایک انسان ہونے کے لحاظ سے بھی عجیب و غریب چیز تھے۔ مجھے اول اول ۱۹۱۷ء میں اُن سے دہلی میں ملنے کا فخر حاصل ہوا تھا، جب میں اُنکے مکان کے سامنے ہی رہا کرتا تھا۔ وہ دہلی کی قدیم تہذیب و شائستگی کے یادگار تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ شرافت و انسانیت کے لحاظ سے کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں۔ اُردو صحافت میں تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو مرتبہ اُن کا تھا وہ ظاہر ہے۔ اخیر میں جب وہ ہمدم سے علحدہ ہوئے تو ہمت جاری کیا

جو اب تک قائم ہے۔ ہر چند اپنی پالیسی کے لحاظ سے وہ سید جالب کی زندگی میں بھی کبھی قابل قدر [illegible] شخصیت کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ اب چونکہ اُن کے پسماندگان نہ وہ اثر رکھتے ہیں [illegible] موجودہ اسکا چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجود ملک کے لئے نہ باعث خیر و برکت ہے نہ موجب لطف [illegible] تجویز اس اخبار کے قائم رکھنے کیلئے پیش کی تھی وہ منظور نہیں کی گئی ورنہ شاید یہ ایک بہتر یادگار مرحوم کی ہوتا۔ بہر حال سید جالب [illegible] قابل قدر شخص تھے اور اس فقدان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے عزیز دوست جناب مجنوں بی۔ اے گورکھپوری نے جن سے نگار کا حلقہ بخوبی واقف ہے۔ گورکھپور میں ایک "ایوان اشاعت" قائم کیا ہے۔ جس سے مقصود ملک میں ادب و تنقید، علم و تاریخ کا بلند ذوق پیدا کرنا ہے۔ یہ تحریک صرف اُن کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کام کو وہ اجتماعی حیثیت سے انجام دینا چاہتے ہیں ــ چنانچہ گورکھپور کے بعض ارباب علم و ثروت نے اسمیں کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوان اشاعت کی پہلی کتاب جس میں فلسفۂ خوشی پر نہایت پُر لطف روشنی ڈالی گئی ہے شائع ہو چکی ہے۔ جناب مجنوں نہ صرف ایک بلند ذوق کے ادیب ہیں۔ بلکہ وہ فلسفہ کا بھی نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں اور تنقید کی صلاحیت بھی۔ اس لئے اگر ایوان اشاعت ان کے اہتمام میں ملک و زبان کی قابل قدر خدمات انجام دے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری کتاب جو بہت جلد شائع ہونے والی ہے وہ مثنوی زہر عشق ہے۔ جو بہترین تنقید کے ساتھ مع چند تصاویر کے نہایت اعلےٰ طباعت و کتابت کے ساتھ پیش کیجائے گی۔

میں ملک کو متوجہ کرتا ہوں کہ ایوان اشاعت کی امداد کریں اور اسکی ممبری وغیرہ کے قواعد ان سے طلب کرکے اسکو کامیاب بنانے میں ہر ممکن سعی سے کام لیں۔

جناب نسیم انہونوی مدیر الکشاف نے ارادہ کیا ہے کہ وہ لکھنؤ سے ایک نسائی رسالہ جاری کریں جو اپنے ذوق کے لحاظ سے بہت بلند و دلچسپ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ملک میں نسائی رسالوں کی بہت کمی ہے، حالانکہ اس کی کو سب سے پہلے پورا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قوم عبارت ہے ملک کے بچوں سے اور بچوں کی تربیت منحصر ہے ملک کی ماؤں پر اسلئے حقیقی خدمت یہی ہے کہ اس طبقہ میں ذوق علم پیدا کیا جائے اور اس کی ذہنیت میں اصلاح

اس رسالہ کا نام حریم ہوگا۔ یہ وہی نام ہے جو میں نے سب سے پہلے ایک زنانہ رسالہ کیلئے تجویز کیا تھا اور جس کو بیدل مرحوم کے امارت میں شائع کرنیکا ارادہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ جناب نسیم میری اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے پورے جوش کے ساتھ آمادہ ہیں اور جس حد تک اُن کی محنت و کاوش کا تعلق ہے۔ مجھے ان کی کامیابی کا بھی یقین ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب جس نہج و اصول پر ہوگی، وہ میری ہی رائے سے طے پایا ہے اور اگر پابندی کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا تو میں کہہ سکتا ہوں

... صورت سے ارادہ تھا کہ فرصت ... [illegible]

سے استفادہ ... ہے۔ لیکن چونکہ فرصت و اسباب کا ... [illegible]

کوئی صورت نہ نکل سکی تھی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے اب وقت آیا ہے کہ یہ ... انشاء اللہ پوری ہو ... [illegible]

سول جج پشاور اور ان کے احباب کو حاصل ہے۔ جن کی دعوت کو رد کرنا میرے ... سے باہر ہے ... [illegible]

محبت، صدق و خلوص کا گنہگار ہمیشہ زیر بار رہا ہے۔

غالباً اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں یہاں سے روانگی ہوگی اور پانچ دن پشاور میں قیام کرنے کے بعد ... [illegible]

اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے احباب سے ملتا ہوا آخر اکتوبر تک واپس آؤں گا۔ خدا کرے وہاں کے سیاسی اضطراب میں اُس وقت تک سکون ہو چکا ہو، لیکن نہ اس حد تک کہ سفر کی "رومانیت" ہی مفقود ہو جائے۔ میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب مکرم سردار احمد خاں صاحب کا نامۂ گرامی پشاور سے موصول ہوا جس میں انہوں نے وہاں کے موجودہ عدم سکون کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا ہے۔ بہرحال اگر حالات میں کوئی قابل اطمینان انقلاب پیدا ہوا تو سفر یقینی ہے۔ روانگی سے قبل میں اپنے احباب سرحد کے پاس مستقل پروگرام سفر کا بھیج دوں گا۔ تاکہ مجھے بھی ملنے میں آسانی ہو اور وہ بھی بیجا زحمت انتظار سے بچیں۔

بمبئی میں ایک جماعت حال ہی میں پیدا ہوئی ہے جو تمام مذاہب کی جماعتِ علماء کے خلاف پروپگنڈا کرنا چاہتی ہے چونکہ اس کے دائرہ عمل میں بیرون ہند کے بھی تمام ممالک شامل ہیں۔ اس لئے اس کا لٹریچر انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ اور غالباً زیادہ استواری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میرے پاس جو کاغذات آئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو اُصولی طور پر چلانے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے احاطۂ عمل کو وسیع کریں اور زیادہ واقف الحال لوگوں سے مدد چاہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اب دنیا کی بیزاریاں اس طبقہ کی طرف سے ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی ہیں۔ اور وہ وقت دُور نہیں جب اُنکا بُت توڑ کر خدا کی زمین کو اُنکے ناپاک وجود سے پاک صاف کر دیا جائے گا۔

جو ابتک قائم ہے۔ ہرچند اپنی پالیسی کے لحاظ سے وہ سید جالب کی زندگی میں بھی کبھی قابل قدر و تحسین نہیں سمجھا گیا تاہم انکی شخصیت کی وجہ سے وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ اب چونکہ اُن کے پسماندگان نہ وہ اثر رکھتے ہیں نہ وسعتِ نظر، اس لئے بحالت موجودہ اسکا چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجود ملک کے لئے نہ باعث خیر و برکت ہے نہ موجب لطف و تفریح۔ میں نے جو تجویز اس اخبار کے قائم رکھنے کیلئے پیش کی تھی وہ منظور نہیں کی گئی ورنہ شاید یہ ایک بہتر یادگار مرحوم کی ہوتا۔ بہرحال سید جالب خوب قابل قدر شخص تھے اور اس فقدان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے عزیز دوست جناب مجنوں بی۔ اے گورکھپوری نے جن سے نگار کا حلقہ بخوبی واقف ہے۔ گورکھپور میں ایک ایوانِ اشاعت" قائم کیا ہے۔ جس سے مقصود ملک میں ادب و تنقید، علم و تاریخ کا بلند ذوق پیدا کرنا ہے۔ یہ تحریک صرف اُن کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کام کو وہ اجتماعی حیثیت سے انجام دینا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ گورکھپور کے بعض ارباب علم و ثروت نے اسمیں کافی دلچسپی کا اظہار کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایوانِ اشاعت کی پہلی کتاب جس میں فلسفۂ شوپنہار پر نہایا پُر لطف روشنی ڈالی گئی ہے شائع ہو چکی ہے۔ جناب مجنوں نہ صرف ایک بلند ذوق کے ادیب ہیں۔ بلکہ وہ فلسفہ کا بھی نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں اور تنقید کی صلاحیت بھی۔ اس لئے اگر ایوان اشاعت ان کے اہتمام میں ملک و زبان کی قابل قدر خدمات انجام دے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ دوسری کتاب جو بہت جلد شائع ہونیوالی ہے وہ مثنوی زہر عشق ہے۔ جو بہترین تنقید کے ساتھ مع چند تصاویر کے نہایت اعلےٰ طباعت و کتابت کے ساتھ پیش کیجائے گی۔

میں ملک کو متوجہ کرتا ہوں کہ ایوانِ اشاعت کی امداد کریں اور اسکی ممبری وغیرہ کے قواعد ان سے طلب کرکے اسکو کامیاب بنانے میں ہر ممکن سعی سے کام لیں۔

جناب نسیم انہونوی مدیر الکشاف نے ارادہ کیا ہے کہ لکھنؤ سے ایک نسائی رسالہ جاری کریں جو اپنے ذوق کے لحاظ سے بہت بلند و دلچسپ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ ملک میں نسائی رسالوں کی بہت کمی ہے، حالانکہ اس کمی کو سب سے پہلے پورا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قوم عبارت ہے ملک کے بچوں سے اور بچوں کی تربیت منحصر ہے ملک کی ماؤں پر اسلئے حقیقی خدمت یہی ہے کہ اس طبقہ میں ذوق علم پیدا کیا جائے اور اس کی ذہنیت میں اصلاح

اس رسالہ کا نام حریم ہوگا۔ یہ وہی نام ہے جو میں نے سب سے پہلے ایک زنانہ رسالہ کیلئے تجویز کیا تھا اور جس کو بیدل مرحوم کے امارت میں شائع کرنیکا ارادہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ جناب نسیم میری اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے پورے جوش کے ساتھ آمادہ ہیں اور جس حد تک اُن کی محنت و کاوش کا تعلق ہے۔ مجھے ان کی کامیابی کا بھی یقین ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب جس نہج و اصول پر ہوگی، وہ میری ہی رائے سے طے پایا ہے اور اگر پابندی کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا تو میں کہہ سکتا ہوں

کہ یہ ہندوستان کا پہلا رسالہ ہوگا جو حقیقی معنی میں دنیا کی اس "اہم مخلوق" کی خدمت کرنے والا ثابت ہوگا۔ یہ رسالہ غالباً نومبر کی کسی تاریخ میں شائع ہو جائے گا۔ جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ اس کے متعلق پوری معلومات" دفتر رسالہ حریم لکھنؤ سے طلب کریں۔

عرصہ سے ارادہ تھا کہ فرصت ہو تو صوبہ سرحد کے اضلاع جا کر دیکھوں جہاں کے لوگوں کو نگار اور اس کے مقالات سے اسقدر دلچسپی ہے۔ لیکن چونکہ فرصت و اسباب کا یہاں ہمیشہ فقدان رہتا ہے بنا بریں اسوقت تک اس ارادہ کی تکمیل کی کوئی صورت نہ نکل سکی تھی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے اب وقت آیا ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو جس کا امتیاز تمامتر جناب سردار احمد خاں صاحب سول جج پشاور اور اُن کے احباب کو حاصل ہے۔ جن کی دعوت کو رد کرنا میرے اختیار سے باہر ہے اور جن کے لطف و محبت، صدق و خلوص کا نگار ہمیشہ زیر بار رہا ہے۔

غالباً اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں یہاں سے روانگی ہوگی اور پانچ دن پشاور میں قیام کرنے کے بعد، بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے احباب سے ملتا ہوا آخر اکتوبر تک واپس آؤں گا۔ خدا کرے وہاں کے سیاسی اضطراب میں اُسوقت تک سکون ہو چکا ہو، لیکن نہ اس حد تک کہ سفر کی "رومانیت" ہی مفقود ہو جائے۔ میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب مکرم سردار احمد خاں صاحب کا نامۂ گرامی پشاور سے موصول ہوا جس میں انھوں نے وہاں کے موجودہ عدم سکون کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا ہے۔ بہرحال اگر حالات میں کوئی قابل اطمینان انقلاب پیدا ہوا تو سفر یقینی ہے۔ روانگی سے قبل میں اپنے احباب سرحد کے پاس مستقل پروگرام سفر کا بھیجدوں گا۔ تاکہ مجھے بھی ملنے میں آسانی ہو اور وہ بھی بیجا زحمت انتظار سے بچیں۔

بمبئی میں ایک جماعت حال ہی میں پیدا ہوئی ہے جو تمام مذاہب کی جماعت علماء کے خلاف پروپگنڈا کرنا چاہتی ہے چونکہ اس کے دائرۂ عمل میں بیرون ہند کے بھی تمام ممالک شامل ہیں۔ اس لئے اس کا لٹریچر انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ اور غالباً زیادہ استواری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میرے پاس جو کاغذات آئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو اُصولی طور پر چلانے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے احاطۂ عمل کو وسیع کریں اور زیادہ واقف الحال لوگوں سے مدد چاہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ اب دنیا کی بیزاریاں اس طبقہ کی طرف سے ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی ہیں۔ اور وہ وقت دُور نہیں جب اُنکا بُت توڑ کر خدا کی زمین کو اُنکے ناپاک وجود سے پاک صاف کر دیا جائے گا۔

"قرآن کے لطائف ادبیہ" کا سلسلہ اکتوبر یا نومبر میں ختم ہو جائے گا۔ اسکے بعد مولوی عبدالمالک صاحب اس سے بھی زیادہ اہم مضمون شروع کرنیوالے ہیں۔ جس کی ابتدا ادسمبر سے ہوگی۔ آصفی نظامی کے عقائد پر تنقید اس مہینے میں ختم ہو گئی۔ ممکن ہے بعض حضرات کو اسکی طوالت ناگوار ہوئی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مضمون نگار نے پوری سعی و کاوش سے اس مقالہ کو مرتب کیا۔ اور آصفی کے کلام کی داد دینے میں اُنھوں نے اپنے پورے اعتقاد سے کام لیا۔ تصویر کی قیمت افسانہ ہے اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت دلچسپ۔ "مذہب کی ضرورت" اس مضمون کا عنوان ہے جسکا یہ سلسلۂ تنقید رسالہ "قیام الدین" وعدہ کیا گیا تھا۔ آیندہ ماہ میں غالباً یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ نظامی گنجوی کے دیوان کے متعلق جناب آسی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ خود میں نے بھی یہ دیوان دیکھا ہے۔ لیکن میں آسی صاحب سے اس مسئلہ میں متفق نہیں ہوں کہ نظامی کی غزلیں بھی وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو انکی مثنوی کا ہے۔

زخم دل آسکر وائلڈ کے ایک افسانہ کا ترجمہ۔ انگریزی میں اس رنگ کے افسانے استعاری (ALLEGORICAL) کہلاتے ہیں۔ اور آسکر وائلڈ اس رنگ کے فسانے خوب لکھتا تھا۔ اردو میں بھی اول اول اس کا تتبع بعض حضرات نے کیا تھا، لیکن شاید زیادہ کامیابی کے ساتھ نہیں۔ آسکر وائلڈ کا یہ فسانہ بھی سابق دو فسانوں کی طرح اشتراکیت کے ان اصول پر قائم ہے جنھوں نے اب روس میں کمیونزم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس بار باب الاستفسار بالکل تاریخی ہے اور یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ نظموں میں مولوی سید علی اختر اختر کی نظم محبت کے عنوان سے بہت دلچسپ و پُر مغز ہے حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب خوب سوچتے ہیں خوب لکھتے ہیں، اور ممکن ہے کہ یہ نتیجہ ہو "اُس بُوئے جانفزا" کا جسکی فضا میں وہ ہر وقت سانس لیتے رہتے ہیں۔ خاقانی کی طرح تیس سال کے بعد مجھے بھی یہ آج ہی معلوم ہوا ہے کہ :- "ذوق ایں دو نوانی بخدا تا نہ چشی" کا اصل مفہوم کیا ہے۔

ملیریا کا زمانہ ہے اور ہر شخص اپنی جگہ پریشان۔ نگار کا کاتب، پریس کا مشین مین، اور دفتر کے کام کرنیوالے تقریباً سبھی مبتلا ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ مجھے کس وقت اس کا خیر مقدم کرنا پڑے۔ بیگم نے کل ابتدا کر ہی دی ہے اور اسوقت ۱۰۴ ڈگری سے زیادہ تپ موجود ہے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اگر اکتوبر کا نگار دو چار دن کی تعویق سے شائع ہو تو اُسکو ان طبیعی حوادث پر محمول کرنا چاہیئے۔

رسالہ جن کی اشاعت بھی اس قسم کے بعض اسباب سے تعویق میں آجاتی ہے اور لوگوں کو شکایت ہوتی ہے۔

آیندہ سے نگار نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک اور جن کی ۲۵ تک آنا چاہیئے۔

قرآن کے لطائف ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

میکڈانلڈ کے نظریات پر محاکمہ

ایک عیسائی عالم سے اس کے سوا اور امید ہی کیا ہو سکتی تھی کہ وہ محمد کو قرآن مجید کا مصنف قرار دے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، جارج سیل، پامر، نکلسن وغیرہ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے، مجھے یہاں اس مسئلہ پر بحث کرنا نہیں کہ قرآن مجید کا مصنف غیر متمدن عرب کا ایک امی صحرانشین تھا، یا کوئی باطنی طاقت، بلکہ یہاں اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے، کہ قرآن مجید کے اسلوب انشا میں سجع کا لحاظ کیوں رکھا گیا ہے؟ اور یہ کہ میکڈانلڈ کی وہ تمام کوشش جو انھوں نے ایک کاہن اور آنحضرت کا مقابلہ کرنے میں صرف کی ہے، کسی حد تک اہمیت بھی رکھتی ہے یا نہیں؟

مصنف موصوف کی ذاتی تحقیق ہے، کہ عربی شاعری میں "سجع" کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، انہیں معلوم میکڈانلڈ نے یہ کہاں سے لکھدیا اول تو نثر میں جاہلی ادبا کا کوئی ایسا کارنامہ ہی موجود نہیں، جسے صحیح معنی میں "سجع" کہہ سکیں، "سجع" اور "نثر فنی" کے متعلق "المجمل فی تاریخ الادب العربی" میں جو واقعات ملتے ہیں ان سے میکڈانلڈ کے نظریہ کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔

وہ نثر فنی جو رسائل، جغرافیہ، تاریخ، قصص، اور سیرت کی کتابوں میں استعمال ہوتی تھی، اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ خیال کی نقش طرازی اور وجدان وشعور کے حرکات کی توضیح کیجائے یا قدرت کلام (براعۃ القول) میں تفوق اور صنعت لفظی میں دستگاہ رکھنے کا اظہار کیا جائے، یہ نثر فنی چوتھی صدی ہجری میں مروج تھی، اس کے بعد محاسن معنوی کی بجائے رعایت لفظی کی طرف لوگوں کا رجحان ہو گیا اور نثر میں "مسجع" کا رواج ہوا جسکو چھوٹے چھوٹے فقرے مستلزم ہوتے ہیں اور شرح واستدلال میں کثرت سے اسالیب شعریہ، تخیلات، تشبیہات اور استعارات بدیعیہ سے کام لیا جانے لگا معانی کا اختراع کم ہو گیا، ایک ادیب اشعار کے معانی جمیل کی شرح وبسط اور قرآن وحدیث اور امثال سے لفظی ومعنوی اقتباس کیطرف رغبت کرنے لگا، یہاں تک کہ ادبا اپنی خاص اصطلاح میں اس ادبی صنف کلام کو "شعر منثور" سے تعبیر کرنے لگے، اور پہلے پہل جس شخص نے اس طریقہ کا رواج دیا ابن عمید (وزیر آل بویہ تھا) تھا اور اسکے اکثر معاصرین اور اس کے بعد والے ادیبوں نے اسکی پیروی کی اس صنف کلام کا سب سے بڑا نمونہ "مقامات حریری" ہے۔ ابن عمید مشرق، فارس اور حلب میں اس طریق انشا کا معلم اول گذرا ہے، باوجود اسکے کہ شعر منثور کا وہ امام تھا لیکن فن بلاغت میں اس کی انشاپردازی کا کوئی نمونہ نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ متاخرین میں اسکے پیرووں کی انشاپردازی میں نظر آتا ہے، کہا جاتا ہے کہ انشاء کی ابتدا عبدالحمید سے ہوئی۔ اور ابن عمید پر اسکا خاتمہ ہو گیا، اس نے سنہ ۳۶۰ھ میں وفات پائی اس طریقہ کے سب سے بڑے انشاپردازوں میں

بدیع الزماں ہے، جس کے اشعار کا ایک دیوان، مقامات اور دیوان رسائل چھپکر شائع ہو گیا ہے، دوسرا خوارزمی ہے جسکے رسائل کا ایک دیوان طبع ہو چکا ہے، تیسرا الثعالبی ہے، جسکے رسائل کا ایک دیوان ہے، اور اسکی پہلی جلد چھپکر شائع ہو چکی ہے، چوتھا حریری ہے جو مقامات (مشہور کتاب) کا مصنف ہے، اور جو مختلف صورتوں میں طبع ہو چکی ہے، اور اسکی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔

نثر فنی کے متعلق "المجمل" میں مفصلہ ذیل تحقیق پائی جاتی ہے۔

عہد جاہلیت کے اشعار کی بہت کثیر تعداد بیان کیجاتی ہے، لیکن اس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، کیونکہ یہ کہیں لکھا ہوا نہ تھا اور جیوں جیوں زمانہ گزرتا گیا لوگ بھولتے گئے، اور راویوں کی موت نے بہت سا کلام کھو دیا۔

لیکن عہد جاہلیت کا نثر نگاری کا تو بہت ہی قلیل تذکرہ پایا جاتا ہے،[سلہ] اور اس حد تک قلیل کہ شعر کے مقابلہ میں اسکی تاریخ بیان کرنی فضول ہے، قدما کو نثر نگاری کی بجائے شعر گوئی کا ذوق تھا، کیونکہ وزن اور قافیہ کی بدولت اشعار کے یاد کرنے اور روایت کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور عہد جاہلیت کے نثر (فنی) کلام کی کمی کی وجہ جو بیان ہوئی بذات خود صحیح ہو اسکے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی شعر کو نثر فنی پر تقدم زمانی حاصل ہے، کیونکہ شعر کی زبان، خیال اور ذوق کی زبان ہوتی ہے، اس کے برعکس نثر نگاری میں عقل و فکر کے نتائج پیش کئے جاتے ہیں، اور یہ حقیقت عصر جاہلی کے اشعار کی کثرت اور نثر فنی کی قلت کی توجیہ ہے، ظہور اسلام تک اہل عرب اکثر امی تھے، ان پڑھ ہونے کے ساتھ شعر کا وجود ہو سکتا ہے۔ لیکن نثر فنی نہیں پائی جا سکتی۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ قوم عرب کے بعض افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اور وہ عصر جہالت کے اخیر زمانہ میں اپنے معاملات اختیاری میں تحریر و کتابت کا استعمال کرتے تھے، لیکن کتابت نے اس حد تک رواج نہیں پایا تھا کہ لوگ شعر و ادب کی تدوین میں اس سے کام لیتے۔

میکڈانلڈ نے آغانی کے حوالہ سے، بادشاہ حجر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے، عوف ابن ربیعہ بنو اسد کے مشہور کاہن کی جو تمثیل پیش کی ہے، اسکے لئے انہوں نے صرف انگریزی ترجمہ پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ یہاں چاہیئے تھا کہ وہ عربی عبارت درج کرتے۔ بہر حال اگر اسلوب بیان کو بھی لے لیا جائے تو اس میں اور قرآن مجید کے لہجہ میں ایک نمایاں فرق ہے، اور عوف ہی پر موقوف نہیں۔ حماسہ میں اکثر جاہلی شعرا اسی طرح پیشینگوئی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید یقیناً شروع سے آخر تک مسجع ہیں ہے (ہر چند مصر کے علمائے جدید نے اختلاف کیا ہے) جیسا کہ "المجمل"

سلہ اما النثر الذی یروی عن العصر الجاهلی فقلیل جدا لا یکاد یذکر الی جانب الشعر وکان القدماء یعللون قلة النثر وکثرة الشعر بان وزن الشعر وقافیه یسهلان حفظه وروایته علی حین ان حریة النثر واطلاقه من القیود یجعلان حفظه عسیرا وروایته عسرا (المجمل فی تاریخ الادب العربی)

سے واضح ہوتا ہے، لیکن میں اس نظریہ میں میکڈ انلڈ کی تائید کرتا ہوں، اور "المجل" کے مصنفین سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن میں اسکے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یہ کاہنوں کے بیان کی تقلید اور انکی انشا کا تتبع ہے، اسمیں شک نہیں کہ سرسری مطالعہ سے قرآن مجید کی بعض مسجع عبارتوں میں وہی قوافی پائے جاتے ہیں جو جاہلی شعرا کے اشعار میں ہیں، لیکن جستجو کرنیکے بعد قرآن مجید میں ایسی آیتیں شاذ و نادر ملتی ہیں[1]، چنانچہ اسلوب قرآنیہ کے متعلق "المجل" میں مفصلہ ذیل مباحث ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب بیان عجیب و غریب ہے، اور اس اسلوب سے مختلف ہے، جسے عرب اپنے نظم و نثر میں ملحوظ رکھتے تھے، قرآن مجید کے حسن تالیف، انتخاب معنی، وجوہ اعجاز، جودت مقاطعہ، حسن تذئیل، روانی قصص، بدیعہ امثال، ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور خوبیوں نے اسے بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیا اور اس کے اسلوب میں ایک ایسی کشش پیدا کر دی کہ قلب بے اختیارانہ اسکی طرف کھنچنے لگتا ہے، اسکی عبارت کبھی کبھی مسجع ہوتی ہے، لیکن اسمیں "سجع" کا التزام نہیں پایا جاتا، کبھی کبھی اس میں وزن بھی آ جاتا ہے، لیکن اسکی پابندی نہیں (مجھے اس نظریہ سے اختلاف ہے، جیسا کہ سطور بالا میں لکھ چکا ہوں، اور آئندہ سطور میں اسکی توجیہ کر دی گئی ہے) آسانی الفاظ کے لئے قرآن ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اور سہولت لفظی کے ساتھ عبارت میں حلاوت اور روانی پائی جاتی ہے۔

دعوت اور تبلیغ کے لئے قرآن میں ایک خاص اسلوب ہے، اس لئے اکثر مکی سورتوں میں (جیسے ص اور ق وغیرہ) تہدید اور وعید کے متعلق چھوٹی چھوٹی آیتیں، قوی مقاطع (SYLLABLES) اور زور دار معانی پائے جاتے ہیں، اسی طرح مدنی سورتوں میں (باستثنائے ان سورتوں کے جو غزوات کے متعلق ہیں) طویل آیتیں، اور سنجیدہ مقاطع ملتے ہیں، جن میں نرمی اور رحمت کا بیان ہوتا ہے۔

زبان عربی کی حفاظت میں قرآن مجید کا زبردست اثر ہے، اس کے بیان نے انسان کو مسحور کر لیا، لوگوں میں اس کا ذوق پیدا ہوا، لوگ اسے حفظ کرتے اس سے اقتباس کرتے اس کے واقعات بیان کرتے، اس کے اسالیب، الفاظ، اور تراکیب سے اثر پذیر ہوتے، ایک جماعت اٹھی وہ علوم (جیسے بلاغت، اور نحو) کی تدوین سے دلچسپی لینے لگی، اور انھیں قرآن مجید کے فہم اسرار کا ذریعہ قرار دیا اور جب مختلف قومیں اسلام لائیں، تو اُنھوں نے زبان عربی کی تعلیم کو فہم دین کا ایک وسیلہ قرار دیا، اُنھوں نے علم دین سمجھکر تحصیل زبان شروع کی، اور اُن میں سے کثیر افراد نے اپنی زبان اور اپنے محاورے چھوڑ دئے

---

[1] نابغہ ذبیانی کے اشعار ہیں (نابغہ عہد جاہلیت کا مشہور شاعر ہے۔)

فلما رقاها الیہ ضربۃ فاسۃ　　وللبوعین لا تغمض ناظرۃ
فقال تلی نجمل الیہ بنیتا　　علی مالنا او تجزی لی آخرہ
ابی لی قبر لا ینزال مقابلی　　وضربۃ فاس فوق راسی فاقرہ

ان کے مقابلہ میں قرآن مجید (سورہ قیامہ) کی مفصلہ ذیل آیتیں پڑھیئے۔

وتذرون الآخرۃ ٥ وجوہ یومئذ ناضرۃ ٥ الی ربھا ناظرۃ ٥
ووجوہ یومئذ باسرۃ ٥ تظن ان یفعل بھا فاقرۃ ٥

اور جب قوموں نے لہجہ میں اختلاف کیا، اور ہر قوم کی ایک زبان بن گئی، تو ادب و انشا کی زبان پر ایک پردہ پڑ گیا، اس معنی میں قرآن مجید کو بہت بڑا مرتبہ حاصل رہے،[1] (یعنی اُسکی زبان خالص رہی اور اُس نے عربی زبان کی حفاظت کی)۔

ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ نزول قرآن کے بعد اکثر شعرائے عرب نے عبارت قرآنی کے قوانی اور بعض اوقات اوزان میں اشعار کہے ہیں جیسا کہ "المجمل" کے مفصلہ ذیل واقعات سے پتہ چلتا ہے۔

عبید اللہ بن قیس الرقیات کے کلام میں ایک خاص قسم کی رقت لفظی پائی جاتی ہے، اور اس نے اپنے عہد کے اعتبار سے ایک انوکھے طریقہ پر سہولت الفاظ میں کوشش کی ہے، اس کے کلام میں ایسی رقت کی وجہ یہ تھی، کہ وہ عورتوں کے ساتھ حد سے زیادہ میل جول رکھا کرتا تھا۔ خلیفہ عبد الملک نے معنوی اعتبار سے اسکے ایک قصیدہ آئیہ کو "مخنث" کہہ دیا، عبید اللہ نے اس پر احتجاج کیا کہ یہ قافیہ قرآن مجید سے متاثر ہے، اور فی الواقع شعر گوئی میں وہ قرآن مجید سے اثر پذیر ہوا ہے۔ اور اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ اس کے لہجہ ادا میں ایسی لینت، الفاظ میں سہولت اور عبارت میں شیرینی پائی جاتی ہے، جو اس کے ہم عصر شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی،

اسی طرح عہد عباسیہ کا مشہور شاعر منصور نمری "قرآن" سے استفادہ کرتا ہے۔

خلیفہ ہارون رشید "منصور نمری" کے اشعار سے ایسا ہی متاثر ہوتا تھا، جس طرح عبد الملک اخطل کے اشعار سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سیاسی لوگ شعر کو شعراء، علم کو علم کی حیثیت سے نہیں پسند کرتے، بلکہ وہ شعرا اور علما کو اپنے اغراض سیاسی کا آلہ بناتے ہیں۔ یہ ایک صریح بے عقلی کی بات ہو گی اگر ہم یہ گمان کریں کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں "نمری" کی عزت اور رسائی کا سبب شاعرانہ کمال تھا، یا جیسا کہ ادب عربی کے بعض مورخوں کا وہم ہے کہ خاندانی قرابت کے باعث اسے جاہ و منصب عطا ہوا تھا، بلکہ ہارون رشید نے محض اسلئے اس شاعر کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا کہ آل عباس اور اُنکی خلافت سے اسے قلبی لگاؤ تھا اور آل علیؑ ابن ابی طالبؓ سے وہ نفرت رکھتا تھا، جن کا وجود اور اثر

---

[1] چنانچہ علوم فقہ و حدیث کے حامل ابو حنیفہ، امام بخاری، مسلم، ادب و فلسفہ کے ماہر ابن مقفع، کسائی، جاحظ، ابن قتیبہ، سیبویہ، ابن الرومی (جنہوں نے عربی زبان کی ترقی میں ایک ایسا حصہ لیا) تمام عجمی تھے، ابن الرومی عہد عباسیہ کا ایک بہت بڑا عربی شاعر خیال کیا جاتا ہے، وہ یونانی الاصل تھا لیکن عربی ادب میں اسے ایسی مہارت تھی کہ اُسے اُستادِ فن کہتے ہیں، مسلم بن ولید (شاعر) انصار کے ایک غلام تھے، ابو العتاہیہ، بشار بن برد، عربی زبان کے فارسی الاصل شعراء تھے، ابو نواس کے بعض شعر کو دیکھکر فوراً ایک معمر غیر عربی کہہ سکتا ہے، کیونکہ وہ گلنار، نرگس، گلاب، اور یاسمن کا تذکرہ کرتا ہے، جن کا عرب میں وجود بھی نہیں اور نہ عصر جاہلی کے عربی شعراء میں ایسے لطیف خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی ماں اہواز (فارس) کی رہنے والی تھی۔ ("المجمل فی تاریخ الادب العربی" اور "الموازنہ بین الشعراء")

سیاسی نقطۂ نظر سے خلافت عباسیہ کے زوال کا صریح سامان تھا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے آل علیؑ ابن ابیطالبؓ کے خلاف یہ اشعار کہے ہیں۔

بنی حسن وقل لبنی حسین	علیکم بالسواء من الامور
امیطوا عنکموا کذب الامانی	واحلاماً یعدن عداة زور
لتسمون النبیّ اباً دیابی	من الاحزاب سطراً من سطور

خلاصہ مطلب یہ ہے،

بنی حسنؓ اور بنی حسینؓ ایک ایسی آرزو میں مبتلا ہیں جو حقیقت سے دُور ہے، وہ محض ایک خیال پریشاں میں سرگرداں ہیں وہ حضرت نبی آخرالزماں صلعم کو اپنا باپ بتاتے ہیں، حالانکہ خود نبیؐ کی طرف سے سورۂ احزاب کی ایک سطر میں سکا انکار پایا جاتا ہے،

اسکی شرح میں ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں۔

یرید قوله تعالی فی سورة الاحزاب "ما کان محمد ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین" ویذکرون ان الرشید قال له ما عدت ما فی نفسی ثم امر ان یدخل بیت المال فیاخذ ما احب کما قال صاحب زهرالاداب مع ان للآیة وجها غیر هذا لوجه وتاویلاً غیر هذا التاویل (الموازنه بین الشعراء مطبوعہ مصر)

نمری نے سورۃ احزاب کی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں کے خاتم ہیں"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رشید نے کہا کہ تم نے وہی کہا جو میرے دل میں ہے پھر اس نے اسے اجازت دی کہ بیت المال سے جتنا چاہے لے جائے یہ زہرالاداب کے مصنف کا بیان ہے، باوجودیکہ آیت کی روح معنی اور تاویل کو نمری کی جدت طرازیوں سے تعلق نہیں۔[۱]

---

[۱] اس قسم کی شاعر نوازی کا ایک واقعہ عادلشاہی خاندان کے ایک فرماں روا اسمٰعیل عادل شاہ کی زندگی میں بھی گزرا ہے، مولانا ملک قمی، نورالدین ظہوری کے گہرے دوست بھی تھے اور خسر بھی، گجرات سے آئے، اسمٰعیل عادل شاہ ان کی شاعری کا بڑا گرویدہ تھا کہا کہ خزانہ سے جتنا مال ایک مرتبہ لاسکیں لے لیں، قدرت جسے شاعری کا ذوق عطا کرتی ہے، اُسے ظرافت کی چاشنی بھی دیدیتی ہے مولانا نے فرمایا کہ سفر کی تکلیف اُٹھانے سے اسوقت کی بہ نسبت جب میں یہاں تھا آجکل نصف طاقت رہگئی ہے، اگر بادشاہ کی اجازت ہو، چند روز کے توقف کے بعد جب کامل قوت حاصل ہو جائے یہ کام عمل میں لاؤں بادشاہ نے کہا سہ کہ آفتاست در تاخیر وطالب را زیان دارد اچھا ایسا ہی ہے تو "دو مرتبہ" جاکر لاؤ مولانا کے "نصف زور" گھٹ جانے کا یہی مقصد تھا بیت المال میں گئے اور دو مرتبہ میں پانچ ہزار ہون (تقریباً ڈیڑھ من) سونا لے آئے خازن گھبرا گیا اور بادشاہ کو خبر کی بادشاہ نے ازراہ خوشطبعی فرمایا "مولانا راست می گفت کہ من قوتے ندارم" سلاطین نے ہمیشہ علما و فضلا اور ماہرین فن کو نوازا ہے، لیکن علم و فن یا صنعت کمال کی قدرشناسی سے زیادہ انھیں اس سرپرستی میں، سیاسی اغراض کا حصول مطلوب رہا ہے۔

شعرائے مخضرمی اور اسلامی کے کلام میں اکثر ایسے قافئے اور ردیفیں ہیں جو قرآن مجید میں بھی ہیں بلکہ بعض اوقات آیت میں جو وزن پایا جاتا ہے، وہ بھی اُنکے کلام میں موجود ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے قرآن مجید کے محاسن انشا سے استفادہ کیا ہے عمرو بن معدیکرب (مخضرمی شاعر) نے اپنے بعض اشعار میں قرآن مجید کے سورۂ مریم کے اسلوب بیان سے استفادہ کیا ہے، اسکے مشہور اشعار ہیں۔

لیس الجمال بمئزرٍ　　　فاعلم وان رُدّیت بردا

عمرو نے اس زمین میں سترہ اشعار کہے ہیں جنہیں علی الترتیب یہ قوافی پائے جاتے ہیں۔

اور ثن مجدا - عداءٗ علندی - تدًّا - نہدا - قدا - استعدا - شدا - تبدّی - جدّا - بدّا - اشدّا - الحدا - زندا - جلدا - عدّا - فرحدا -

اسی طرح قرآن مجید میں سورۂ مریم کی آخری آئتیں پڑھیئے۔ قل من کان فی الضلالۃ فلیمد ولہ الرحمن مدّا الی آخر فانما یسرنہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قومًا لدا - تقریبًا بیس آئتیں ہیں، عمرو کے بعض اشعار میں قرآن کے قوافی بھی ملتے ہیں، یہی نہیں بلکہ قرآنی قافیہ لیکر معنوی حیثیت سے بھی عمرو نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں:-

أغنی غناء الذاھبی　　　انا اُعِدُّ للاعداء عدّا

میں سلف کا کام انجام دیتا ہوں (اور انکا قائم مقام ہوں) اور لوگوں نے مجھے دشمنوں ہی کے مقابلہ کے لئے رکھ چھوڑا ہے یا یہ کہ دشمنوں کے مقابلہ کی گھڑیاں شمار کرتا رہتا ہوں کہ کب مقابلہ ہو اور میں اپنا جوہر دکھاؤں۔

قرآن مجید میں ہے۔ فلا تعجل علیھم انما نعد لھم عدا (سو آپ اونکے لئے جلدی نہ کیجئے، ہم انکی (باتیں) خود شمار کر رہے ہیں یا اُنکی حاضری کے لئے دن گن رہے ہیں) جو شخص کچھ بھی عربی کا ذوق رکھتا ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ اُعدّ للاعداءِ عدّا لکھکر عمرو نے قرآن مجید کے جملہ انما نعد لھم عدا سے کس حد تک فائدہ اوٹھایا ہے؟

عمرو بن معدیکرب:-　　ذھب الذین احبھم　　وبقیت مثل السیف فردا

میرے احباب چل بسے اور میں تلوار کی طرح یکہ و تنہا رہ گیا۔

قرآن مجید:-　　ونرثہ مایقول ویاتینا فردا (اور اوس کی کہی ہوئی چیز کے ہم مالک ہو جاوینگے وہ ہمارے پاس تنہا ہوکر آوے گا۔

ارباب بلاغت نے سرقۂ غیر ظاہر کی ایک قسم یہ لکھی ہے کہ معنی کو الٹ کر یہ بیان کیا جائے، قرآن مجید میں اُن لوگوں کو ڈرایا گیا ہے، جو خدا کے متعلق طرح طرح کی باتیں گڑھتے رہتے ہیں اور ان کو یکہ و تنہا ہوکر آنے کی بیچارگی کا خیال دلایا گیا ہے، عمرو نے اسکو جذبہ لطیف کا جامہ پہنا دیا ہے، لیکن مرکزی خیال کے اعتبار سے دونوں عبارتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے "بقیت فردا" اور "یاتینا فردا" کی یک رنگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔

الغرض جستجو کیجائے، تو معلوم ہوگا کہ بہتیرے شعرائے مخضرمی اور اسلامی کے کلام میں قرآن کے ادبی اعجاز نے اثر کیا ہے، چنانچہ خود جارج سیل نے بھی مقدمہ قرآن میں اسکا اعتراف کیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

قرآن مجید کے اسلوب بیان اور مسجع عبارت سے عرب ایسا لطف محسوس کرتے ہیں کہ بعض شعرائے متاخرین نے اپنے کلام میں قرآن مجید کی عبارت اور بعض قرآنی اشارات وکنایات سے اپنے کلام کو مزین کرنا شروع کیا۔ اور اگر ناممکن کے بعد کوئی دوسرا لفظ ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ بغیر قرآن (مجید) پر تبحر رکھے ہوئے ان اشعار وکلام کو سمجھ نہیں سکتے۔

اسلامی ادبیات میں مسجع کا رواج قرآن مجید پر غور وفکر کا نتیجہ ہے، چنانچہ عرب مصنفین کے حوالے سطور بالا میں دئے جاچکے، فارسی ادبیات وانشا میں بھی جو مسجع عبارتیں ہیں، وہ مطالعہ قرآن ہی کا حاصل ہیں، سعدی نے گلستان، جامی نے بہارستان، اور نورالدین ظہوری نے "سہ نثر ظہوری" میں محاسن مسجع کے جو غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں وہ استفادہ قرآنی کی پیداوار ہیں۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے، کہ قرآن مجید میں مسجع کا لحاظ کیوں رکھا گیا؟ میکڈانلڈ نے یہودی، یونانی اور قدیم عربی ادبیات سے جو نظریہ پیش کی ہیں اگر انھیں مان بھی لیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی مذہبی عبارت کے لئے مسجع اختصاصی حیثیت رکھتا ہے، اور قرآن مجید کا الہام بھی اسی طریق انشا میں ہوا، لیکن اس سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا کہ نزول قرآن کے وقت عربی شاعری اپنی منزل شباب سے گزر رہی تھی، اگر کوئی پیام روح اور درس اخلاق دیا جا سکتا تھا تو زمانہ ہی کے انداز ذوق اور رجحان طبیعت کے مطابق، اس سے تو میکڈانلڈ کو بھی انکار نہیں کہ کاہنوں کے بیان میں مسجع عبارتیں تو ضرور رہا کرتی تھیں، لیکن ان میں کوئی اصلاح سیرت اور تزکیہ اخلاق کا سبق نہیں ہوتا، موصوف کا خیال ہے کہ کاہن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہی فرق ہے، جو بنی اسرائیل کے نزدیک "نبیھیم" اور نبوت میں مابہ الامتیاز ہے، جب دنیا کے نطق الہامی کے لئے مسجع عبارت مخصوص رہی ہے، تو پھر اعتراض ہی کیاہے؟ جان بلیکی کے اعتقادات کے متعلق اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے، اس کا خیال ہے کہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنا درس اخلاق اس انداز ذوق میں پیش کرے جو عوام میں متداول ہو، کیونکہ کوئی شاعر خدا کے لئے اپنا کلام نہیں پیش کرتا، بلکہ مخلوق کے لئے اس لئے اسے ماحول کے رجحان اور نفسی خصوصیات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے بعثت اسلام کے وقت شعروادب کا چرچا تھا، مسجع چونکہ شعر کی ایک قسم ہے سطور بالا میں یہ ثابت کیا جا چکا کہ نثر فنی میں قدیم عربوں کا کوئی ایسا کارنامہ ہی نہیں جس میں مسجع کا وجود ہو اسلئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے ایک خاص طرز انشا کی ابتدا کی) اس لئے قرآن مجید نے اپنے درس اخلاق اور تزکیہ انفاس کے لئے جو عبارت پیش کی، اسمیں طریق انشا کی وہی خصوصیت پیدا کر دی جس میں عام رجحان کو دعوت نشاط اور درس اخلاق دونوں ساتھ ساتھ ملتے رہیں، بلکہ عربوں کے اخلاق اور سیرت کی اصلاح کے لئے اس سے بڑھکر کوئی دوسری صورت ہی نہ تھی کہ مسجع عبارت مخصوص کر لی جائے، تاکہ عام رجحان کو دعوت دینے میں سہولیت ہو اور انکی شاعرانہ التفات اسطرف مبذول کی جاسکے۔

چونکہ میکڈانلڈ نے قرآن مجید کے اعجاز ادبیہ کو آنحضرت کی طرف منسوب کیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کی ان تصریحات کے متعلق ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جو شعر و ادب کے متعلق ہیں۔

سرسری مطالعہ کرنے کے بعد قرآن مجید میں پانچ جگہ شعر و شعرا کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

والشعراء یتبعھم الغاؤن ط الم تر انھم فی کل واد یھیمون ط وانھم یقولون ما لا یفعلون ط الا الذین امنو وعملوا الصلحت وذکر اللہ کثیرا وانتصروا من بعد ما ظلموا ط وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ط (شعراء)

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین (یٰس)

بالحق وصدق المرسلین (صفت)

ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون ط قل تربصوا فانی معکم من المتربصین (طور)

انہ لقول رسول کریم ط وما ھو بقول شاعر قلیلا ما تذکرون ولا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون (حاقہ)

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ متذکرہ بالا پانچ مقامات میں جہاں شعر و شعرا کا تذکرہ ہے، انمیں تیسرا اور چوتھا نمبر کفار کا مقولہ ہے، جسے اللہ تعالےٰ نے قرآن میں نازل فرمایا، بقیہ تین مقامات میں خود اللہ تعالےٰ کی رائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے ان تین مقامات میں شعر و شعرا کے متعلق کیا محاکمہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ سورہ شعرا میں شعر و شاعری کی مذمت کی گئی ہے، کہ وہ ادھر سے اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں، کفار کو اسی جماعت سے مشابہ کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک شعرا کا کیا درجہ ہے؟ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ "وانتصروا من بعد ظلموا" کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس سے شعرا کی توصیف ظاہر ہوتی ہے، لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ توصیف ضمنی طور پر آگئی ہے، حقیقتاً شعرا کی توصیف مراد نہیں۔ دراصل مقصود یہ ہے کہ کفار اور شعرا کے عادات ضعیف میں مماثلت قائم کر کے جو شعرا کی برائیاں ہیں، انھیں کفار پر صادق لائی جائیں، اس لئے انکے یتبعھم الغاؤن فی کل واد یھیمون یقولون ما لا تفعلون وغیرہ کے نقص و عیوب کا بیان کیا، لیکن چونکہ شعرائے اسلام کفار کے ہجو کا جواب دیا کرتے تھے، اور اسلام اور مبلغ اسلام کی حمایت کرتے تھے، اس آخری طبقہ "وانتصروا من بعد ظلموا" کو اگلے طبقہ سے علیٰحدہ کر لیا، پس معلوم ہوا، کہ گو اتباع غوا، قول و فعل کا تضاد آخری طبقہ میں نہیں لیکن انکی توصیف مترشح نہیں ہوتی، لہذا نتیجہ نکلتا ہے کہ متذکرہ بالا آیات میں شعرا کو بہ کراہت و استحقار دیکھا گیا ہے، بہ نظر استحسان نہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالےٰ نے صاف صاف فرما دیا کہ اپنے پیغمبرؐ کو ہم نے فن شاعری کی تعلیم نہیں کی اور نہ شاعری آپکے لئے کوئی مفید چیز ہے۔

تیسری جگہ شاعری اور علم کہانت کو ایک ہی طبقہ میں رکھا، اور فرمایا کہ میرا رسولؐ جو کچھ کہتا ہے وہ شعرا کا

تخیل اور کاہنوں کی پیشین گوئی نہیں بلکہ جو کچھ اسے وحی کے ذریعہ سے پہونچتا ہے، اسی کی تبلیغ کرتا ہے۔

دو مقامات میں کفار کا مقولہ ہے، وہ نبی صلعم کو شاعر مجنون کہا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منصب نبوت کے لئے شاعری ایک عیب تھا اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنے پیغمبر کو اس الزام سے بچایا ہے۔

اب تحقیقات کا یہ مرحلہ باقی رہجاتا ہے، کہ حدیث نے اس کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل عنوان پر غور کرنا ضروری ہے،

(۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کہے یا پڑھے ؛

(۲) آپ نے اشعار سُنے یا نہیں ؟ کیا صحابہ میں شاعری کا شغف تھا ؟

(۳) اشعار کے حسن و قبح کے متعلق آپ کا کیا فرمان ہے ؟

پہلی شق کے متعلق تو قرآنی شہادت کافی ہے، "وما علمنہ الشعر" آپکی زندگی گویا قرآن مجید کی عملی تفسیر تھی عہد رسالت کی ۲۳ سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ آپنے شاعری میں حصہ نہ لیا لیکن چونکہ آپکی طفولیت کا بڑا حصہ عرب کے فصیح قبیلہ میں بسر ہوا تھا، اس لئے آپ کی باتیں "جوامع الکلم" کی صفت سے ضرور متصف تھیں، گو آپ نے شاعری نہ کی لیکن آپ کی زبان مبارک سے بعض اوقات ایسی باتیں نکلتیں جو شعر کی صورت اختیار کر لیتیں، غزوہ احزاب ہو رہا تھا، صحابہ کرام خندق کھودنے میں مشغول تھے، نبی باہر تشریف لائے، آپ نے صحابہؓ کے جد وجہد کا معاینہ کیا اور بے اختیار فرمایا۔

اللھم ان العیش، عیش الاٰخرہ ۔ فاغفر للانصار والمھاجرہ [۵]

گو مرقومہ بالا الفاظ (دعائیہ) نے شعر کی صورت اختیار کر لی ہے، لیکن یہ بالکل اضطراری طور پر تھا، ارادی نہ تھا چنانچہ تاریخ فرشتہ میں شیخ ابوالحسن خسرو دہلوی کے تذکرہ میں لکھا ہوا ہے کہ جب اُنکے والد ماجد شیخ سیف الدین نے انتقال کیا تو وہ سات سال کے تھے، عہد طفلی کے اس زینہ میں خسرو شاعری کے اصول سے واقف نہ ہوں گے، لیکن فرط جذبات میں اُنھوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

سیف از سرم گذشت و دل من دو نیم شد ۔ دریائے ماروان شد و در یتیم ماند

معلوم ہوا کہ اعلیٰ تربیت کے باعث کلام میں کبھی کبھی شاعری کی خصوصیت آجاتی ہے، اور یہ بالکل اضطرارًا ہوا کرتا ہے، پس عہد رسالت کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ نبی صلعم شاعر نہ تھے لیکن آپ نے وقتاً فوقتاً اشعار پڑھے ہیں

---

[۵] اے اللہ، عیش دراصل آخرت کا عیش ہے، انصار اور مہاجرین کو بخشدیجئے۔

امام بخاری نے انس بن مالکؓ کی روایت سے کتاب التفسیر (متعلقہ سورہ احزاب) میں پوری حدیث نقل کی ہے، اس میں لفظ "عیش" کے بدلے "خیر" ہے بقیہ الفاظ وہی ہیں جو "مغازی" کی مفصلہ بالا حدیث میں مذکور ہیں۔

چنانچہ امام بخاری نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں مذکور ہے۔

فسمعتہ یرتجز بکلمات ابن رواحۃ وھو ینقل من التراب	میں نے آپ کو مٹی ڈھوتے ہوئے ابن رواحہؓ کے اشعار پڑھتے سنا۔

امام بخاری نے حدیث میں وہ اشعار بھی نقل کر دئے ہیں جو آپ نے جنگ خندق کے موقعہ پر مٹی ڈھوتے وقت پڑھے۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا	ولا تصدقنا ولا صلینا
فانزلن سکینۃ علینا	وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الالی قد بغوا علینا	وان ارادوا فتنۃ ابینا

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں "ثم یمد صوتہ باخرھا" دوسری روایت میں مذکور ہے، ودفع بھا صوتہ ابینا ابینا، یعنی آپ جوش کے ساتھ بلند آوازی سے چھٹے مصرعہ کے آخری الفاظ پڑھتے، یعنی زور سے ابینا ابینا فرماتے۔

امام مسلمؒ نے اپنی حدیث میں "الشعر" کے نام سے ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے، جس میں دو تین ایسی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ نبیؐ نے حضرت عمرو بن شریدؓ کے والد سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار پڑھنے کی فرمائش کی، چنانچہ انھوں نے شاعر مذکور کے اشعار پڑھے، پھر آپ نے فرمائش کی یہاں تک کہ صحابی موصوف روایت کرتے ہیں، حتی انشدتہ مائۃ بیت۔

امام مسلم نے دوسری حدیث حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے لکھی ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ عرب لوگوں کے جو کلام ہیں انمیں سب سے عمدہ لبید ابن ربیعہ کا یہ کلام ہے، الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل۔

اسی حدیث میں مشہور جاہلی شاعر امیہ ابن ابی الصلت کے متعلق آپکی رائے ہے۔ "وکاد ابن ابی الصلت ان یسلم" ابن ابی الصلت اسلام کے قریب تھا۔

اب سوال یہ باقی رہجاتا ہے کہ آیا صحابہ میں شاعری کا شغف تھا یا نہیں؟ صحابہ کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں، کہ انمیں بڑے بڑے جلیل القدر حضرات شاعری کا مذاق رکھتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں عبداللہ بن رواحہ، لبید ابن ربیعہ، حسان ابن ثابت، حضرت عامر وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے، اور انکا کلام حدیثوں میں محدثین نے نقل کیا ہے، حضرت عبداللہ ابن رواحہ اور عامر کے اشعار بخاری (کتاب المغازی) میں ملتے ہیں، حضرت لبید ابن ربیعہ کے متعلق امام مسلم اور بخاری نے روایت کی ہے اصدق کلمۃ قالھا شاعر کلمۃ لبید، حضرت حسان کے متعدد اشعار امام بخاری نے کتاب المغازی میں نقل کئے ہیں، جو انھوں نے بنی نظیر کی بربادی، حضرت عائشہ کی عصمت، آبی اور نبیؐ کے ساتھ اپنے اظہار خلوص وعقیدت کے متعلق کہے ہیں۔[۵]

---

[۵] میں نے اپنے عزیز دوست جناب مولوی عبداللہ صاحب ادیب مدرس ثانی مدرسہ وحیدیہ آرہ کے پاس ایک عربی دیوان دیکھا ہے، جسمیں صرف صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے اشعار درج ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں کثرت سے مسلمان (مرد اور عورتیں) شاعری کا شغف رکھتے تھے،

واقعات بالا سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ میں شاعری کا شغف تھا، اور وہ وقتاً فوقتاً اشعار پڑھا کرتے تھے، عہد رسالت کی تاریخ بتاتی ہے، کہ گو آپنے اشعار موزوں نہیں کئے، لیکن آپ نے اشعار پڑھے، سُنے اور پڑھنے کی فرمائش کی، اب باقی رہا شاعری کے حسن و قبح کے متعلق آپ کا صحیح فرمان کیا تھا؟ امام مسلم نے حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے جسمیں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لان یمتلئ جوف الرجل قیحا یریہ خیلہ من ان یمتلئ شعرا — اگر کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جاوے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ شعر سے بھرا رہے۔

بہ ظاہر یہ حدیث شاعری اور حفظ اشعار کی مذمت کے متعلق معلوم ہوتی ہے، لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاوے گا، کہ نبیؐ نے انہاک شاعری کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے، کیونکہ اشعار سے پیٹ بھرے رہنے کے یہ معنی ہیں، کہ قرآن و حدیث، اور دوسرے علوم و فنون سے دلچسپی باقی نہ رہے، انسان کے خیالات کا رجحان صرف شاعری کی طرف ہو، ایسی شاعری بیشک مذموم ہے، لیکن اگر دینیات اور دوسرے علوم کے ساتھ شاعری کا شغف ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، اگر مطلق شاعری کے متعلق آپ کا یہ خیال ہوتا تو آپ عمرو بن شرید کے والد سے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار پڑھنے کی فرمائش کیوں کرتے، اور سو بیت تک کیونکر سنتے رہتے؟

کیا قدیم شعرائے عرب کے مصرے اور فقرے قرآن میں پائے جاتے ہیں؟

ڈاکٹر سنڈل نے اپنی کتاب "ماخذ قرآن" میں اس حیثیت سے بھی گفتگو کی ہے کہ قرآن پر سرقہ لفظی کا الزام صحیح ہے، یا نہیں؟ وہ لکھتا ہے

"بعض اوقات محمدؐ کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ اُنھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ عرب کے ایام جہالت کے بعض قدیم عادات اور مذہبی مراسم کو اسلام میں داخل کر لیا، بلکہ اُنھوں نے ایک قدیم عربی شاعر امرؤ القیس کے بعض اشعار سے سرقہ کیا ہے، لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آیتیں ہنوز قرآن مجید کے اندر موجود ہیں، معلقات کے ایک نسخہ کے اخیر میں جو فلاں میں مجھے ملا ہے، بعض ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں جنھیں لوگوں نے امرؤ القیس کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اُس کے کلام کے کسی دوسرے مجموعہ میں جو میری نظر سے گذرا ہے، میں نے یہ اشعار نہیں دیکھے، ان اجزا میں جن کے مصنف کی حالت بہت مشکوک ہے، میں مفصلہ ذیل اشعار پاتا ہوں، ہر چند ان اشعار میں بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں، لیکن میں انھیں بغیر تصحیح، انکی اصلی صورت میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

دنت الساعۃ وانشق القمر — عن غزال صاد قلبی ونفر
احور قد حرت فی اوصافہ — ناعس الطرف بعینہ حور
مر یوم العید فی زینتہ — فرمانی فتعاطی فعقر

بسهام من لحاظ فانش فتركني كهشيم المحتظر
واذا ما غاب عني ساعة كانت الساعة ادهي و امر

۵۱

اقبل والعشاق من خلفه كانهم من حدب ينسلون
وجاء يوم العيد في زينه لمثل ذا فليعمل العاملون

جن مصرعوں اور فقروں پر خطوط کھنچے ہوئے ہیں وہ قرآن مجید کے اندر بھی، سورۃ قمر، سورہ انبیا اور سورۂ صفت میں پائے جاتے ہیں، صرف بعض جگہ دو ایک الفاظ کا فرق ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ان اشعار اور قرآن مجید کی آیات میں کوئی علاقہ ہے۔

امرؤالقیس کے ساتھ منفصلہ بالا اشعار کی نسبت کے متعلق شبہ کے کافی اسباب موجود ہیں، بہت ممکن ہے، قرآن مجید میں ایک شاعر کے کلام سے اقتباس درج ہونیکے بجائے خود قرآن ہی سے کسی شاعر نے استفادہ کیا ہو، ایک طرف یہ بھی خیال کرنا ایک وقت طلب امر ہے کہ استقرار اسلام کے بعد ایک آدمی قرآن مجید ہی کی عبارت کو شعر وسخن کے اس (عشقیہ) اسلوب بیان میں داخل کرنیکی جرأت کر سکتا ہو، جس سے مرقومہ بالا اشعار کا تعلق ہے، دوسری طرف موجودہ زمانہ میں بھی مروج ہے، کہ کسی فلسفیانہ یا مذہبی رنگ کے کلام میں قرآن مجید کی آیتیں نقل کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے کلام سے مندرجہ بالا اشعار کا تعلق نہیں (ڈاکٹر صاحب کو خبر نہیں، شاید انھوں نے فارسی شعرا کے دواوین کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ وہ اس اقتباس قرآنی کو فلسفیانہ اور مذہبی مضامین ہی تک محدود نہیں رکھتے، کیونکہ کثیر شعرائے فارس نے اپنے رنگ تغزل کو قرآنی آیتوں کے اقتباس سے رونق و تازگی دی ہے، جسپر آئندہ اوراق میں تفصیل کے ساتھ بیتے بحث کی ہے)

یہ ایک وقت طلب مسئلہ ہے، کہ محمدؐ نے امرؤالقیس جیسے ایک مشہور شاعر کے کلام سے سرقہ کرنیکی جرأت کی گو اس حیثیت سے یہ قیاس ہو سکتا ہے، چونکہ معلقات سبعہ کے مروجہ مجموعہ میں یہ غزلیں عام طور پر مشہور تھیں۔

باوجود مشرقی، روایات کے قرینہ غالب ہے، کہ محمدؐ نے سرقہ اور تلقین سے کام نہیں لیا ہے[۵۲]، جسکا ان پر الزام لگایا جاتا ہے، سرسی بے لائل کی یہی رائے ہے، جن سے بڑھ کر قدیم عربی شاعری کے رموز کا ماہر دستیاب نہیں ہو سکتا، ایک

---

۵۱ دراصل "اقبل العشاق" تھا کاتب کی غلطی کو ڈاکٹر صاحب نے رہنے دیا جیسا کہ خود لکھا ہے۔

۵۲ ڈاکٹر ٹسڈل حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "ریورنٹ ڈاکٹر زویمر ساکن بحرین مجھے آگاہ کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک نسخہ ہے، جسکے اندر امرؤالقیس کے آخری کلام کے آخری سکشن میں "اقتربت الساعۃ وانشق القمر" موجود ہے، اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ایک شیخ جو جامع ازہر میں مدرس ہیں مجھسے کہتے تھے کہ یہ صریح اقتباس علمائے اسلام کو مشوش کر دیتا ہے۔

خط میں جو انھوں نے بطور عنایت مجھے لکھا ہے، ان اشعار کے مسئلہ تلفیق کے متعلق روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ یہ امرؤ القیس کا کلام نہیں اور اُسکے لئے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اسلوب بیان اور وزن و بحر سے متعلق ہیں، اسکے بعض افکار سے میں نے اس باب میں استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر شنڈل کے نظریات کی تنقید

ڈاکٹر صاحب نے امرؤ القیس کے جن اشعار کا تذکرہ کیا ہے، وہ دراصل امرؤ القیس کے اشعار ہی نہیں، معلقات سبعہ کی تدوین اور تالیف کے متعلق علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ "ماخذ قرآن" کے حوالہ سے میں اس مسئلہ پر ایک سرسری روشنی ڈال چکا ہوں، معلقات سبعہ، "المعلقات العشرۃ" کا انتخاب معلوم ہوتا ہے، میرے پاس عربی ادب کی ایک مختصر تاریخ ہے، جسے مصر کی "وزارت معارف" نے ترتیب دی ہے (جنمیں طہٰ حسین، احمد امین، احمد ضیف، جیسے السنہ مغربی و مشرقی کے ماہر ادیب شامل ہیں) اسمیں کہیں معلقات سبعہ کا تذکرہ نہیں بلکہ "المعلقات العشرۃ" کی تاریخ پر ایک مختصر بحث کی گئی ہے، جسکا ترجمہ حسب ذیل ہے،

عہد جاہلیت میں مختلف قبائل اور مختلف خطہ عرب میں کثرت سے مشہور شعرا گذرے، لیکن قدیم عرب اور بعثت اسلام کے بعد بھی چار شاعروں کی فوقیت کے متعلق لوگوں کا اجماع تھا، جنہیں لوگ اُستاد کامل اور فن شاعری کا ماہر خیال کرتے تھے، انکے نام امرؤ القیس بن حُجر، زیاد بن معاویہ، معروف بہ نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سلمیٰ، قیس بن میمون معروف بہ اعشیٰ ہیں، انہیں سے ایکدوسرے کی فضیلت اور کمال کے متعلق قدما کا اختلاف ہے، انمیں ہر ایک شاعر کے طرفدار اور حامی لوگ تھے، جنمیں بدوی، شہری اور اہل علم حضرات شامل ہیں، ان چار شاعروں کے بعد طبقہ ثانیہ کے شعرا ہیں جنمیں مشہور ترین یہ ہیں، طرفہ بن عبد، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم التغلبی عنترہ بن شداد عبسی، حارث بن حلزہ لشکری اور عبید بن ابرص،

پہلی صدی ہجری کے بعد قدیم عربوں نے ان شعرائے عشرہ کے قصائد کا انتخاب کرکے ایک مجموعہ مرتب کیا اور اسکا نام مطولات رکھا، پھر اُسکا نام معلقات پڑگیا، لوگ ان دس قصائد سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، اُنھیں جمع کرتے انکی شرحیں کرتے، اُنھیں جدا جدا لکھتے، اور حفظ کرتے۔[1]

معلقات سبعہ میں "المطولات" کے تین شعرا نابغہ ذبیانی، اعشیٰ، اور عبید بن ابرص کے قصائد نہیں ہیں۔ ورنہ "المجمل" میں جتنے قصائد کی تحلیل کیگئی ہے وہ وہی ہیں جو معلقات سبعہ میں بھی ہیں، لہذا نتیجہ نکلتا ہے کہ معلقات سبعہ

---

[1] واختار القدماء بعد القرن الاول للهجرة عشر قصائد لهولاء الشعراء العشر سموها "المطولات" ثم سميت بعد ذالك "بالمعلقات" والناس يعنون بهذه القصائد العشر عناية خاصة فيجمعونها ويفسرونها ويفردون لها الكتب و يحفظونها (المجمل في تاريخ الادب العربي)

دراصل "المعلقات العشرہ" سے ماخوذ ہے، جب حقیقت یہ ہے، تو ڈاکٹر تسڈل کا تمام نقد و بصر، رد و قدح، اور شک و شبہ ایک "سعی لاطائل" سے زیادہ نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب عرب منافقوں کے خاص لہجہ میں فرماتے ہیں کہ "محمدؐ پر سرقہ کا غلط الزام لگایا جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس اسلوب سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، اسے دیکھکر عہد نبوت کی وہ تاریخ سامنے آجاتی ہے، جب نبی کریم کے سامنے ظاہر داری کے طور پر منافقین اگر رسالت کا اقرار کرتے اور دراصل انکا اعتراف رسالت ایک انکار تھا، چنانچہ قرآن نے نفسیات کے اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے،

اذا جاءک المنافقون قالوا نشهد	جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول
انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک	ہیں، اور اللہ تعالے جانتا ہے کہ واقعۃً آپ اسکے رسول ہیں لیکن
لرسولہ واللہ یشهد ان المنافقین لکاذبون	(ساتھ ہی) اللہ اسکی شہادت بھی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اس مسئلہ پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، جب تاریخ بتاتی ہے کہ معلقات کی تدوین ہجرت کی ایک صدی کے بعد ہوئی تو ظاہر ہے کہ عہد نبوت میں معلقات کا کوئی نسخہ ہی نہ تھا، تو انکے اس نظریہ کا کیا مفہوم باقی رہجاتا ہے کہ "معلقات کے مروجہ نسخوں میں یہ غزلیں نہیں اسلئے قیاس ہو سکتا ہے، کہ محمدؐ نے عرب کے قدیم شعرا کے کلام سے سرقہ کیا،

ڈاکٹر صاحب کی یہ بے سود خامہ فرسائی تو اس اعتبار سے ہے کہ معلقات کی تدوین اور تاریخ کے متعلق انھیں کافی معلومات بھی حاصل نہ تھیں اور انھوں نے اس مسئلہ کو معرض بحث میں لاکر تشنہ چھوڑدیا اور لطف یہ کہ ڈاکٹر زویمر کی روایت لاکر انھوں نے ثابت کردیا کہ سرقہ کے متعلق وہ کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہونچے، جس سے مقصود یہ ہے کہ عوام میں غلط فہمی پھیل جائے، سرسی سے لایل نے جس ادبی نقطہ نظر سے بحث کر کے مسئلہ سرقہ پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے، وہ قابل قدر ہے، معلقات میں تمامتر قصائد ہیں، سرقہ کی مثال میں جتنی غزلیں پیش کی گئی ہیں، انکے اوزان قصائد کے اوزان سے نہیں ملتے، اسکے علاوہ جارج سیل نے مقدمہ قرآن مجید میں لکھا ہے کہ عرب کے شعرائے متاخرین قرآن کی آیتیں اور فقرے اپنے کلام میں استعمال کرتے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر تسڈل نے امرؤ القیس کے جن اشعار کا تذکرہ کر کے مسئلہ سرقہ پر روشنی ڈالی ہے، وہ امرؤ القیس کی بجائے عہد عباسیہ کے کسی غزل گو کا کلام ہے، جس نے قرآنی آیات اور فقروں سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ عبید اللہ بن قیس الرقیات، منصور نمری اور ابو تمام کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ (باقی)

عبد الملک آروی

خاقانی سند قاآنی عصر علامہ آصفی نظامی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

آصفی کا تیسرا فخریہ "دبستانش، اور حیرانش" ہے، غالباً ان قوافی میں سب سے پہلے انوری نے قصیدہ لکھا تھا، خاقانی، عرفی، اور قاآنی وغیرہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو اُنھوں نے بھی اپنے پیش رو کا تتبع کیا۔ لیکن جہاں تک ہماری نظر ہے، خاقانی کا قصیدہ سب سے بہتر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے تشبیب میں سب سے پہلے متصوفانہ نغمہ استعمال کیا۔ اور آیندہ کے لئے نئی راہ پیدا کر دی۔ متاخرین میں صرف عرفی سے امید تھی۔ کہ اس روش کو اختیار کرے گا لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب اس کا قصیدہ بایں الفاظ ہماری نظر سے گذرتا ہے کہ

دلِ من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش!
ازل دروازہ باغ و ابد حسد خیابانش!

عرفی نے قصیدہ کیا لکھا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ تم خود خاقانی اور عرفی کے قصیدے کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھ لو۔ کہاں تصوف کے نازک ترین معاملات، اور کہاں گل، گلستان، باغبان، اور باغ وغیرہ کا بیجا صرف۔ خیر اس میں بھی کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اکثر شعرا نے اس پردہ میں لیلیٰ جمال کو جلوہ گر دیکھا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ یہاں عرفی اپنی مسلکِ شعر کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ اگر اس کے کلیات کے تمام نسخوں میں یہ قصیدہ مندرج نہ ہوتا تو شاید ہی یقین آتا کہ یہ الحاقی نہیں ہے۔

اس کے برخلاف آصفی نے اس دریا کو مشاق ترین تیراک کی طرح عبور کیا۔ اُنھوں نے ٹھیک اُسی جگہ قدم رکھا جہاں سے خاقانی نے قدم اُٹھایا تھا۔ مگر اسی طرح نہیں۔ زیادہ سنبھل کر، اور زیادہ تیزی سے فرماتے ہیں۔

دلم طفلے، و درسش عشق، و خاموشی دبستانش
معلم فیضِ ہستی، نقشِ امکاں حرفِ نسیانش

سرِ زانوی جنبش بود اندم تختۂ مشقے،
کہ عقلِ اولیں گرد و سبق آموزِ امکانش

بجز فیضِ معلم، در نگاہِ حیرت ایجادش،
نمی گردے سیاہی، از نگین چشمِ حیرانش

سوادِ ہوش روشن کرد چوں از فطرتِ عالی
نمود خود بحالِ خویشتن میداشت گریانش

معلم دید استعدادِ فطرت از فنا ایمن!
سرشکِ خوں بدامن پاک فرمودہ ز مژگانش

بہ پیشِ چشم او آئینۂ بنہاد از راز سے!
کہ عکسش بے نیازی داشت از اعیانِ امکانش

تجلی برق زد بر دیدہ او را کہ او آدم! | کہ عکس آئینہ شد محو ماندہ چشم حیرانش
پس از حیرت نگاہی یافت چوں سرمایہ بینش! | تجلی کرد و گم جلوہ در آغوشش مژگانش
باں پرتو تجشم او فروغ آگہی آمد | کہ خواہد در کنارش چرخ وصد خورشید تابانش
شیونات محشر در محیط نقطہ دیدہ! | کہ از پرکار وحدت بود ہم عنوان و پایانش
نہ نقطہ بلکہ از میم محمد چشمہ بودہ | کہ از ہر قطرہ اش سر بر زدے صد چرخ و کیوانش

ان اشعار کو پڑھو۔ اور دیکھو صوفیانہ نقطۂ نظر سے، انسان اور عالم کی حقیقت کا اظہار کس پختگی سے کیا گیا ہے خاقانی نے بھی یہی نغمہ الاپا ہے۔ لیکن الحق کہ اس درجہ معجز نہیں۔ مولانا آگے چلکر فرماتے ہیں۔

ز طفلے گوش کن اسرار ہستی کز نو آموزی | معلم بود فیض لایزالی در دبستانش
ز لوح عشق درس خامشی زاں پیش بگرفتم | کہ عقل اولیں از کاف نون گردد سبق خوانش،
دراں مکتب کہ باشد حیرت انشا خامۂ فطرت | نہ باشد غیر مشق خامشی در لوح عنوانش
ز درد عشق خاموشی بہ است از نالہ انگیزی | کہ می نالد طبیب عقل از اندوہ درمانش

مخلص سلسلۂ کلام میں نامعلوم طور پر، کسی کی تعریف یا مذمت شروع کر دینا، مخلص یا گریز کہلاتا ہے۔ بہتر مخلص وہ ما نا جاتا ہے۔ جہاں اس خوبی سے مدعا بیان کیا جائے، کہ سننے والا اُسے ماقبل کا نتیجہ خیال کرے۔ ذہن سرعت سے اس طرف منتقل ہو سکے، اور طبیعت میں استعجاب نہ پیدا ہو۔

شعرا نے عموماً مخلص میں زور لگایا ہے۔ آصفی نے بھی بڑے حسن سے اس فرض کو انجام دیا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) نعتیہ قصیدہ لکھ رہے ہیں۔ تشبیب میں علو ہمت کی تعلیم، خودداری اور منت ناپذیری کی تلقین، اور گداگری کی مذمت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

گر حرص کشد دامن فقت بسوا لے | سلطان عرب داد دہد دخل عجم را
آں شاہ جہاں گرد جہاں بخش کہ جودش | طغرائے کمال ست منا شیر کرم را

(۲) بہار کی لطافت سے صفحے روکش گلزار ہیں، نشو و نما کی فراوانی سے عالم خطۂ کشمیر نظر آ رہا ہے۔ گھاٹے ترکے جوشِ رنگ و بو سے دشت و صحرا کو گلبن و بوستاں کی ہمسری کا دعوٰے ہے، یاسمین و نسترن اور سنبل و نرگس سے دنیا بھری ہے، رندانِ مے آشام رنگ رلیاں منا رہے ہیں، دنیا میں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہیں، ہجولی کھیل کود میں مشغول ہیں۔ احباب باہم مبارکباد دے رہے ہیں، مصاحب رؤسا و سلاطین کے حضور میں تہنیت نامے پیش کر رہے ہیں گو شاعر گوشۂ عزلت میں بیٹھا ہوا یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے، مگر اُسے کچھ ایسی لو لگی ہے کہ صرف ایک ہی آستانہ کا

پرستار اور ایک ہی ذات کا والہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ بلبلوں کے نغمے سن کر ضبط نہیں کر سکتا۔ اور آسمانی ترانہ شروع کر دیتا ہے۔
یہ مضمون آصفی کے ہاں یوں ادا ہوا ہے۔ بہار کا تذکرہ کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

دریں بہار کہ ہرکس کشادہ بر رخ دل — درِ نشاط پرستی و عیشِ ایوان را
عجب کہ سجدہ زمستی بپائے خم نکنند — کہ گشت میکدہ بیت الحرام مستاں را

نہد اساس بہ وضعِ ہنروری کمال — ندیم ارسطو ستائش گری سلطان را
باتہزاز طرب از درونہ جوش زند — بلب ترانۂ گل، ہلبل خوش الحان را

بگرمئ نفس افروختم بہ کلبۂ تار — زلفتِ نورِ خدا، شمعِ دین و ایماں را
ظہورِ ہستئ حق، عینِ قدرتِ اعجاز — کہ کرد پارہ لب ہا بہ، ناوک نا بلد را

(۳) صنم پرستی میں عمر کا گراں مایہ حصہ صرف ہو چکا ہے، نیاز عشق پتھر کے مفرور و بیجان مجسمہ کے روبرو نیم لسبمل ہے۔ گریہ بے سود۔ یکایک معاملہ ضبط کی حدود سے گذر جاتا ہے، اور طبیعت دیر کی جگہ حرم اور صنم کی جگہ خدا کی جویا ہوتی ہے۔ گر راستہ دشوار گذار اور منزل کٹھن ہے۔ ادھر سامنے راہ ناپید ہے۔ نگاہ اٹھتی ہے اور ناپید کنار وسعت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔
عقل سرگرداں ہے۔ کہ راہ پر کہاں سے لائے۔ یکایک ممدوح کا خیال آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ ایں مرحلہ از صعب گزاری — فرسودہ کند حوصلۂ اہل ہمم را
اما عجبے نیست، کند آصفِ دوراں — خضرِ رہِ من، قائدِ، توفیق کرم را

(۴) برسات کا موسم ہے۔ تمازتِ آفتاب نے بخارات کے انبار لگا دئے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور ان فروں کو فلک تاز بنا دیتی ہیں۔ ذرات بادل اور بادل کالی کالی گھٹائیں بنکر عالم پر چھا جاتی ہیں، بادل گرجتا ہے، بجلی چمکتی ہے اور دنیا مارے ڈر کے سہمی جاتی ہے۔ شاعر دیکھ کر حیران ہے۔ اللہ۔ اللہ کسقدر ڈراونی گھٹا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ سچ ہے،

جہاں در ظلمتش خفتے، ہمہ انوار بنہفتے
بنودے عدلِ سلطانِ دکن، گر مطلع بیضا

(۵) بہار کا موسم ہے۔ اور دنیا رشکِ فردوس نظر آ رہی ہے۔ مگر شاعر اپنے تنگ و تاریک گھر ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ مناظرِ قدرت کا تماشا کرے۔ مگر یہ نہ ہے کہ پڑا گھٹ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دل سے نہیں رہا جاتا۔ اور مجبور ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

عالمے از بادۂ عشقم دماغے تازہ کرد مغز جانم از خمارِ غم پریشاں آمدہ است
تو دریں خلوت نشستی، عرصہ بر من تنگ شد وقتِ چاکِ جیب و داماں و گریباں آمدہ است
تا بکے در کنجِ تنہائی، بخلوت خوں شدن غنچہ آسا تا بلب خوناب شریاں آمدہ است

شاعر سُنکر جواب دیتا ہے۔

گلشنمش باشد جنوں بے یار و ساقی سیرِ باغ گرچہ در گلزار، سازِ باغِ رضواں آمدہ است
تا نہ باشد ساغر و مینا بہ پیشش می گسار لالہ و گل ہمچو خوناب شہیداں آمدہ است

دل ہوا و ہوس کا مطیع بندہ ہوتا۔ تو اسے منظور کر لیتا۔ لیکن وہ "عرشِ الٰہی" ہے۔ لہذا اس پر برہم کو سنجیدہ فہمائش شروع کرتا ہے۔

گفت بود خبر ہوائے نفس، ساقی و شراب عقل زیں سازِ ہوس، بر خویش لرزاں آمدہ است
دل بہ مہرِ سادگاں بستن، ز فسق ست و فجور صحبتِ ام الخبائث، کارِ شیطاں آمدہ است
از حضورِ نفس بگذر، ہمدمِ عقل کن آں چہ زنداں ست ایں چوں باغِ رضواں آمدہ است

شاعر اس کا جواب وہی دیتا ہے۔ جو ہر امرد پرست صوفی دیا کرتا ہے۔ یعنی "ہم ان خاکی نقوش میں صنعِ باری کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قضائی شہوت مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ

ہر چہ خوباں را بود خوبی حسن از خط و خال حسنِ صانع، در نقابِ خطِ خوباں آمدہ است

دل یہ جواب سن کر ہنس پڑتا ہے۔ یا اللہ کسقدر مکار لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مغالطے میں ڈالتے ہیں۔ کیا فطرت کا مظہر صرف یہی ہے۔ کیا قدرت کی گلکاریاں اسقدر محدود تھیں، کہ اُن سے صرف انسان ہی بہرہ مند ہو سکا۔ سبحانک ہذا بہتان عظیم" اے فطرت کی توہین کرنیوالے۔

عالمِ نیرنگ دارد، ہر گلے اندر کنار عالمِ امثال از گلشن نمایاں آمدہ است

کیوں کہ

ہر گلے آئینہ دارِ لالہ رویاں آمدہ است

جلوۂ ہر نقش می بین و بہ حسنش دل مبند بستنِ دل بر صور، از نقصِ انساں آمدہ است
گر نہ داری آگہی، اوضاعِ عالم را نگر کو حدوثِ ذات، نقصانش بامکاں آمدہ است

شاعر کی عقل سے غفلت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ایسی رہنما ذات کہاں تلاش کرے، جو اسرارِ عالم سے کما حقہ واقف ہو۔ اس پر دل رہنمائی کرتا ہے۔ اور رسول خدا کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

گفت بر گیر از کمالِ ذاتِ پیغمبر سبق آنکہ ذاتش مظہرِ اسرارِ اکواں آمدہ است

گلبنِ باغِ نبوت، گلشن آرائے شرف آنکہ خاشاکِ حریمش، باغِ رضواں آمدہ است

(۶) بہار دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ درخت، شاخ، پھول، پھل، پتے، کونپلیں، گھاس، غرض ہر وہ شے جس میں نمو کام کر سکتا ہے، سرمست ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں شراب خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن خاصکر ایسے زندہ وقت میں تو یہ صرف مزہ ہی نہیں، ہمہ زندگی ہے۔ اس عیش تو یہ ہنگام سے زمانہ حظ اٹھا رہا ہے۔ لیکن شاعر اب بھی غم نصیب ہے۔ کیونکہ

چرخ بمن داشت جنگ، غصہ لم تنگ داشت
پیکرِ بیرنگ داشت، بخت ستیزہ شعار

یکایک دروازہ پر کوئی دستک دیتا ہے۔ شاعر دیوانہ وار دوڑتا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی، آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے۔ سامنے وہ ذات نظر آتی ہے، جو مختصراً الفاظ میں اسکی روح ہے، لیکن یہ کس لئے، کیا آج اسکی امیدیں بر آئیں گی۔ ہاں، بیشک۔ کیونکہ آج اُس نے آتے ہی

لب بہ لب من نہاد، جاں بہ تنِ مردہ داد
غنچۂ دل بر کشاد، ہمچو نسیم بہار

جب شاعر کی رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے، تو وہ ہر طرح دادِ عیش دینے کو تیار ہو جاتا ہے معشوق ساقی بنتا ہے۔ اور ایسی مجلس میں شراب ہی شراب ہے! جب ذرا دماغ بادۂ عیش سے تازہ ہو جاتا ہے تو معشوق خسرِ دکن کی مدحت شروع کرتا ہے کہ وہ ایسا بہادر کرم گستر، سخی اور مسیحا ہے کہ زمانہ میں نظیر نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس میں تو مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی تو واقعہ ہے کہ اس ذات تک رسائی کہاں۔ اہلِ جاہ وہاں رسا ہیں، وہی فیض یاب بھی ہوں گے معشوق۔

گفت ندانی مگر، نیست ترا زاں خبر	بادشہ دادگر، از خرد خردہ کار
از ہمہ دانشوراں، وز ہمہ نام آوراں	زعمِ دگر برتراں، کرد گزیں مردِ کار
صدرِ امیراں گزید، بدرِ مشیراں گزید	فخرِ وزیراں گزید، شاہ عدالت شعار
حضرت عبدالرحیم، آں خردِ مستقیم	معتقدِ ہست و کریم، بہمہ صفا ردکیار

(۷) معشوق نے آکر شاعر کو بیتابِ شوق کر دیا۔ آہ۔ کوئی کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ جبکہ

صورتِ عقدِ ثریا، کہ بود در شفق	بود درحقۂ یاقوتِ لبش سلکِ گہر
بود از پرتوِ رخسارۂ او شب کا نور	بود کافور ہم از سایۂ شب چون عنبر
از حریرِ تنِ صافی گہرش می لغزید	گر رسیدے بہ تنِ او ز ہوس دستِ نظر

ذوق از لعل لبش در شکرستاں آمد   لذتش بر وزدل لذت قند و شکر

سنبل غالیہ گونش بدماغم افگند   شور سودائے جنونے بہ ہوا ئے دگر

جسطرح تشنہ سراب کو دیکھ کر دیوانہ دوڑ پڑتا ہے، ٹھیک اُسی اضطراب و شوق کے ساتھ شاعر اُسے آغوش میں لے لیتا ہے۔ ناز و غمزہ کے بعد معشوق کہتا ہے "یہ تونے اپنا حال کیا بنا لیا ہے۔ نہ سیر باغ ہے۔ نہ بادہ و ساغر ہے۔ دنیا میں مجلس عیش آراستہ ہے۔ تجھے دیکھو تو سیہ خانہ میں پڑا ہوا ہے۔ نہ معشوق شیریں کام در پر ہے۔ نہ انیس و جلیس میسر" شاعر جواب دیتا ہے "یہاں ساغر شراب، اور شاہد روح پرور کا کیا ذکر۔ یہاں تو صدائے "اللہ اکبر" کانوں میں آجاتی ہے۔ اور بس۔ ہر طرف رندی و ہوسناکی کے عوض، زہد و اتقا کا دور دورہ ہے" وہ پوچھتا ہے "یہ کون مقام ہے" ہم نے تو ایسی جگہ نہ دیکھی نہ سنی۔ یہاں کا فرماں روا کون ہے۔ اور وزارت کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے" شاعر جواب دیتا ہے

گفتم ایں شہر نہ باشد کہ بہشت امن ست   مطمئن ہست دل خلق ز ہر گونہ حذر

میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ   کہ بود فخر سلاطین و خدیو کشور

آسماں جاہ ارسطوئے زماں دستور لیست   کہ پئے عز و جلال ست وجودش مفخر

(۴) "سورج اپنی خواب گاہ میں استراحت کو جا چکا ہے۔ نیلے آسمان پر، روشن فرشتے جلوہ آرا ہیں، چاند سبعہ سیاروں کو ہمراہ لیکر، مجلس میں آ بیٹھا ہے۔ شمعیں روشن ہیں، حسین رقاصہ کھڑی ہے، اور ارباب نشاط سامعہ نوازی کر رہے ہیں، شاعر اپنے تاریک صحن میں لیٹا ہوا، رشک آمیز نگاہوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا ہے۔ کاش اسکا دل بھی پہلو میں ہو کہ اتنے میں

ماہ دو ہفتہ من، گونت در پستہ من   داد آواز مستی بنوائی دف و چنگ

یہ کفے بساغر مے، در کف دیگر میداشت   لب جامے را چو عقابے، کہ بگردد در جنگ

گفتم اے ناز تو سابق قدم از فتنۂ حشر   وی بتاراج نگاہ تو ہمہ چین و فرنگ

طرۂ لیلیٔ شب، مشک، سیہ افشاند   تو دریں پردۂ نیرنگ چہ دارائی آہنگ

پردۂ کحلیٔ شب، مشک فروش خوابست   خفت در مشک بایں لحظہ چہ دم ست چہ زنگ

سر بپالش بنہ و نرگس فتاں بربند   محتسب تا نخند عربدہ ہا باسر جنگ

گفت امشب بہ یکے بادہ ہست اندو خراب   عس و محتسب و شحنہ بود یا سر بنگ

گفتم اندازۂ گفتار نگہدار بہوش   تو مپندار بہ مستی، کہ جہان ست پلنگ

گفت ہشیاریٔ چو نتو بدرِ غفلت زد   حال کشور چہ شناسی تو دریں گوشۂ تنگ

امشب از وسعت مشرب بدکن داد صلا   جشن سال شہ زینت دہ تاج داد رنگ

(۹) نواب سر فزل اللہ خاں بہادر رئیس بھیکم پور کی مدح میں میمیہ قصیدہ لکھا ہے یہاں جس بے ساختگی کے ساتھ گریز کی ہے اُس کی مثالیں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں ہلالِ رمضاں شد شرف افزائے صیام
تافت از روے بفلک اختر عزِ اسلام

مستجل روزہ بر آراست چناں مفتیٔ روز
کہ بر آفاق حلالش ہمہ گردید حرام

گر مسیحا ز فلک مائدہ می آورد
بودے از نعمتِ جنت تنفر لب دکام

فی المثل خضر اگر آبِ حیات آوردے
حرمتش بود بعجا لم صفتِ آبِ حرام

بانگِ تہلیل ہم گشت ز ہر سینہ بلند
شورِ تسبیح ز دل بست بہا احرام

جائے گلبانگِ صراحی، نفس توبہ پرست
جائے مے بود سرشکِ شفقی اندر جام

نارسا گشت چناں سلسلۂ زلفِ دراز
کز کشاکش دلِ شوریدہ پذیرفت آرام

از دکن روئے نہادم بسوئے کشورِ ہند
پائے جولاں بکشادم بہ سفر از آرام

دلِ آشفتہ نمی یافت تسلی کہ رہ
طبعِ شوریدہ نمی کرد بہ یک جائے مقام

چار میں ہفتہ شد آخر چو ازاں ماہِ صیام
ماہِ دو ہفتۂ من آمدہ چوں ماہِ تمام

جنبشِ ابروئے او برقِ قیامت آثار
مستیٔ نرگسِ او فتنۂ محشر انجام

گردشِ چشمِ سیہ، فتنۂ دورِ گردوں
حلقۂ زلفِ رسا، سلسلۂ روزِ قیام

ور او نگاہِ نیازش ز خمِ ابروئے
پشت دستے بزمیں داشت مہِ نو بسلام

شوخِ مستانہ، لبِ راز نہادہ بلبم
بوئے صہبائے لبش برد ز سر ہوشِ انجام

گفت سلخِ رمضاں ست بغربت مپسند
کہ کنم صبر زمے تا سحرِ عیدِ صیام

ساز و برگِ طرب آرائے کہ بمن از ماہ ہے
بادہ ثانیٔ عشرت رمضاں کرد حرام

گفتم اے شوخ بغربت چہ طرب می جوئی
ساقی و بادہ کجا لست و کجا شیشہ و جام

نہ حریفے کہ لبازیم بادہ سازِ طرب
نہ حبیبے کہ طرازیم بادہ بزم مدام

چوں من و تو ز سفر سوئے وطن باز رسیم
بگزنیم بہم ہمدمی شیشہ و جام

اس پر معشوق برافروختہ ہو گیا۔ ریائی زہد کے طعنے دئے۔ اور ترکِ ملاقات کی دھمکیاں دیں۔ اور

شکست توبہ پر آمادہ کیا۔

گفتم اے بادہ لعلِ تو خمارِ امکاں گفتم از مستیٔ چشم تو جہاں مست مدام
اندریں کشورِ بیگانہ مشو عیش پرست کہ پشیماں شوی از رنج خمارِ انجام
محتسب و قاضیٔ کشور برسند جرگہ بندند بگردِ من و تو زیں آشام

اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ ہے وہ نقطۂ جہاں سے بیک جولانیٔ فکر، آصفی مدح کیطرف متوجہ ہوجاتے ہیں یعنی

ماجرائے من و تو فاش و ہم صبح کنند پیشِ فرزانۂ دین پرورِ عزِ اسلام

مذکورہ مثالیں صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ مزید شوق کے لئے کلیات میں کافی سامان سکون ہے۔

خاتمہ خاتمہ اصطلاحِ شاعری میں، قصیدہ کے وہ آخری اشعار کہلاتے ہیں، جن میں ممدوح کی درازیٔ عمر و جاہ وغیرہ کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ عربی قصائد میں ابتداً اس کا التزام نہ تھا۔ یا تو مدح پر قصیدہ کو ختم ہی کردیتے، یا کچھ تھوڑی بہت استدعا بھی کرلیتے تھے۔ غالباً خاتمہ کی زیر بحث شکل اس وقت معرض وجود میں آئی ہے۔ جب عرب کے قصائد فارسی رنگ روپ اختیار کرچکے تھے۔ بہرحال فارسی میں خاتمہ قصیدہ کا لازمی جز رہا ہے

خاتمہ میں شعرا نے سب سے زیادہ غلو کیا ہے۔ جس قصیدہ کو اٹھا کر دیکھو۔ زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ سب سے کم، ورغلو غالب نے اپنے ایک قطعہ میں استعمال کیا ہے۔ کہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قصیدہ، مدحیہ نظم کا نام ہے۔ مدح کسی مطلب سے کیجاتی ہے۔ اس لئے چناں و چنیں کے بعد حرفِ مطلب زبان پر آنا لازمی ہے۔ مداح فرض کرتا ہے۔ کہ ممدوح ستائش پر خوش ہوکر صلا دیگا۔ اسلئے اُسکو زائد خوش کرنے کیلئے، مدعا طلبی کے بعد، اس کے لئے دعا کرتا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ سب سے پہلے جس نے دعا دی ہو۔ وہ پرخلوص ہو۔ لیکن کاغذ نے جن قصیدوں کو محفوظ رکھا ہے انہیں بلا استثنا کوئی ایک بھی سچی اور صحیح دعا پر حاوی نہیں۔ جب اوصاف میں، اسقدر ملمع برتا گیا ہے، تو دعا کسطرح سادی رہ سکتی تھی۔ سب سے زائد جس شئے سے انسان کو محبت ہے، وہ عمر ہے۔ انسان کسی حالت میں ہو۔ سچے دل سے موت کی تمنا کبھی نہیں کرتا۔ دولت کے ساتھ ساتھ یہ حالت زیادہ ترقی کرجاتی ہے۔ جو جسقدر زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ اسیقدر زندگی پر زیادہ حریص بھی ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے دامن آرزمیں، عمرِ خضر و الیاس کے بھی چیتھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ طالبِ عمر

کی دعا سے خوش ہوتا ہے۔ شاعر جو کچھ لینا چاہتا ہے۔ چند لفظ خرچ کرکے، اسکی آرزو کو تسکین دیدیتا ہے۔ اور کچھ لے بھاگتا ہے۔ وہ کوئی قبولیت، تو نہ اسے قبولیت سے کچھ فائدہ، اور نہ عدم قبولیت پر کوئی نقصان۔

خیر، مقصد یہ ہے، کہ آصفی نے بھی اپنے خاتموں میں سراسر تقلید برتی ہے جس راہ پر شعرائے سلف چلتے رہے تھے، وہی اختیار کرلی۔ بہت ممکن تھا، کہ وہ اجتہادی قدم اٹھاتے، لیکن یہ یقینی ہے، کہ وقتی فضا میں ان کے لئے آزادی کا سانس لینا محال تھا۔ وہ اسوقت پیدا ہوئے تھے، جب بزم مدح کا خمار حد سے گذر چکا تھا طبیعتیں فرضیات کی عادی ہوگئی تھیں۔ اس لئے خمار شکنی کے لئے بھی اسی شراب کی ضرورت تھی، مجبوراً انھیں وہی پیش کرنا پڑی۔ البتہ بعض مقامات پر یہ کوشش ضرور کی، کہ واقعاتی دنیا، فرض دادعا کو اپنے ہمراہ لیلے۔ مگر یہ پہاڑ کے مقابلہ میں رائی کا دانہ تھا۔

شاعر نے فرض وادعا کو سب سے زائد پناہ لغت میں ملتی ہے۔ لغت میں ممدوح وہ ذات ہوتی ہے۔ جو اعتقاداتی دنیا میں خدا کے بعد سب سے بزرگ و برتر ہے۔ اس لئے اس کے اوصاف میں بھی، زبان و قلم سے وہ تمام اسمائے صفت نکل جاتے ہیں، جو حقیقت پر محمول کئے جائیں، تو بلا استثنا انسان کی ہستی سے بالاتر نکلیں، مگر اس کے باوجود قائل کی عقیدت "ہل من مزید" پکارتی ہے۔ وہ جسقدر مبالغہ کرتا ہے۔ اپنے الفاظ کو اسیقدر کوتاہ پاتا ہے۔ آخر مجبور ہوکر دعا کرتا ہے، اور جوش شوق میں سب کچھ مانگ بیٹھتا ہے، چونکہ مدحت نگاری میں اسکو قصور کا اعتراف ہے، اس لئے ہم مناجات میں اسکو مقابلہ سے ؎ دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز۔ کا مصداق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس کے برخلاف ہم کو یقین ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ غیر ممکن ہی نہیں۔ وقوعی ہے۔ ذیل کی مثالیں اسکی وضاحت کرتی ہیں، جب انہیں تم یہ دیکھوگے کہ صرف وہی درخواست کی گئی ہے کہ جو لغت کے اندر کسی حالت میں بھی مبالغہ نہیں کہی جاسکتی، تو تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ اسی قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں آصفی کے دل میں، دوسرے عاشقان رسالت سے کم پیدا نہیں ہوئیں۔ فرماتے ہیں۔

تا در چمن و دشت بود فیض بہاراں	از لالہ و گلہا مطرا، چمن آرا
تا سینۂ کہسار بود خون ز دل لعل	تا لعل جگر رنگ برآرند زخارا
بادا رخ احباب تو در گلشن ہستی	از بادۂ عشرت، صفت لالۂ حمرا
چوں لعل ز افسردن سر نجۂ غم باد	خوں بستہ دل اندر تجرِ سینۂ اعدا

جب تک دنیا میں، بہار کا دور دورہ رہے، اور پہاڑوں میں، پتھر کے اندر سے خونیں رنگ لعل نکلیں، تیرے دوست سرخ رو اور دشمن، خونیں دل رہیں۔

تا حرف و رقم، مبدء اسرار کمال اند	با حرف و رقم تا کہ فتد کار قلم را
کلک ازلی نقش طرازندہ کند صرف	در مدحت ذات تو، ہمہ حرف و رقم را

جبتک دنیا میں، اسرار و رموز کے اظہار کا ذریعہ تحریر سمجھی جائے، اور تحریر کے لئے قلم درکار ہو، تمام حروف

صرف تیری نعت میں صرف ہوا کریں۔ اور دنیا کو اپنے مطالب کے اظہار کیلئے کوئی حرف نہ ملے۔

بدہر تا کہ زخوئی ستیزہ کار فلک   شود نزول ز بالا بہ زیر حدثاں را
زخوئی فتنۂ و سنگِ حوادثِ گردوں   دلِ شکستہ رواں خستہ باد خصماں را

جبتک آسمان، دنیا پر حوادثات کی بارش کرتا رہے۔ تیرے دشمنوں کے دل زخمی رہیں۔

ہاں آصفی دعا، دمِ صبح اجابت ست   کز مطلعِ قبول بر آرد سر آفتاب
تا از پے صبوحیٔ مستانِ صبح خیز   در بزمِ روزگار بود ساغر آفتاب
در محفلِ شہود، بدساقیٔ ازل   با میکشانِ عشقِ تو از کوثر آفتاب
در جامِ بختِ خصمِ تو در دحمیم باد   ہر جرعہ شعلہ قطرہ کند اخگر آفتاب

جبتک دنیا میں سورج نکلتا رہے، تیرے دوستوں کو شرابِ طہور، اور دشمنوں کو پیپ اور لہو پینے کو ملے۔

آصفی گوید دعائے دانت اے ختم الرسل   زاں نمط کز نصِ قطعی ہم بقرآں آمدہ است
باد فرمانِ نبوت، سربسر ختم تو   تا قضا گوید فلاں رفتہ ست بہماں آمدہ است

جبتک دنیا میں، پیدائش و وفات کا سلسلہ جاری رہے، تیرا شریک نبوت نہ پیدا ہو۔

تا غزالانِ حرم را بنود دام کمیں   تار حسرت، دلِ صیادِ ستمگر شکند
چنگ ہر دامِ جفائی کہ نہد در راہم   نیروئے عدلِ تو ہر حلقۂ و چنبر شکند

جبتک حرم کی ہرنیاں، شکاریوں پر حرام رہیں، اور جبتک ظالم شکاری انھیں دیکھکر کفِ افسوس ملے، میرے راستہ میں جسقدر مشکلات حائل ہوں، تیرے عدل و انصاف سے سب دور ہو جایا کریں۔

تا کہ دولابِ چرخ گردندہ   دیو زریں بچہ در اندازد
صورتِ دیو مہر، چرخ، بجاد   دشمناں را نگوں سر اندازد

جب دنیا میں سورج غروب ہو، آسمان تیرے دشمنوں کو ذلیل و خوار رکھے۔

شود تا شاخِ خشکِ خامہ تر از رشحۂ معنی   کند تا آبیاریٔ مطالب لالہ افشانش
شود گلدستہ گلہائے معنی زیبِ بزمِ او   معطر باد از بویش دماغ آل و یارانش
پئے گلدستہ بندِ نعت او از حضرتِ باری   شود فردوس نزول و باغ آرا باد رضوانش
رسد با آصفی از فیضِ نفتش نکہتِ رحمت   پئے تعطیرِ مغزِ آرزوی از فیضِ بستانش

تا بہارِ چمنِ دہر ز ہستی جوشد   تا دہد آب، سحابِ کرمِ فیضِ ازل

لب ہر غنچہ ارم خندہ زفیضت بادا
پہ نشاط دل مخلوق بگلبن زار ان
روز محشر زپئے امتِ تو چوں نوروز
عرصۂ حشر بخورشید شود برج حمل

تا دلِ پاک تمنا کند از فیضِ ازل
منتی تا نشود سلسلۂ عہد قدیم
تا کشد نقمت عصیاں بسوئے قعرِ سقر
تا بُرد عفوِ گناہاں بطرب گاہِ نعیم
بادِ احباب ترا گلشنِ فردوس مقام
باد اعدائی ترا منزلے از قعرِ جحیم

تا فراقِ تو مرا آرد بایجادِ فغاں
تا کہ باشد عرش جولانگاہ ہاپائے من
شور محشر باد از عشقت نوائی ذوقِ من
صورِ اسرافیل ہم آہنگِ ایں غوغائے من
آستانِ حضرتت باد امرا دار السلام
عشرت آبادِ تمنا جنت المعلائے من

ان دعاؤں میں، کوئی ایک دعا بھی ایسی نہیں، جسکو ہم یہ کہہ سکیں کہ "مطلب مشکل" ہے" اس لئے "فنون نیاز" اس کا حریف نہ ہوگا، آصفی مسلمان ہیں - عقیدت کیش ہیں - عاشق ہیں - وہ آرزو کرتے ہیں، کہ رسول اللہ کے دشمن مقہور اور دوست کامگار رہیں - یا آپ کی پاک اور مقدس محبت، اُن کے دل کو جلوہ زار بنا دے، یا قیامت میں، آپ کے اتباع کرنیوالوں پر رحمت نازل ہو - ایک عقیدتمند یہی چاہتا ہے، اور عنقا جیسی چیز کا طالب نہیں، پھر اسکی تحدید میں، جو مدت ذکر کرتا ہے، وہ مثلاً یہ ہے کہ جب سورج طلوع ہوا کرے، یا جبتک نیکی نیکی، اور بدی بد پھل لائے، وغیرہ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں، کہ جبتک دنیا کا موجودہ نظام قائم رہے، یعنی قیامت تک چونکہ رسول اللہ خاتم النبین ہیں اور آپ کا مذہب عالمگیر قانون ہے، اس لئے یہ دعائیں بالکل ایسی ہیں، جیسے کوئی کہے - خداوند فلاں شخص کو اتنی عمر دے، جتنی وہ پائے گا - اور جسطرح یہ محال طلبی نہیں - اسی طرح وہ بھی محال طلبی نہیں -

لیکن اب اس کے مقابل وہ دعائیں رکھی جائیں جو دوسرے ممدوحوں کے حق میں ہیں، تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے، وہ معمولی انسان ہیں، اس لئے انہیں ہر صفت، بشرطیکہ وہ پائی بھی جائے بالکل سادہ ہوتی ہے، لیکن شاعر اس نقص کو مٹاتا ہے، اور ممدوح کو محامد کی بلند ترین چوٹی پر بٹھا دیتا ہے، اس حالت میں صرف یہی دعا کہ آپ پھلتے پھولتے رہیں - ایسی ہے جو محاورہ نہ ہو، تو قطعاً غیر منطقی ہے، پھر اس پر اس سے کہیں زائد بلند اوصاف کو، اور کہیں مشکل باتوں کو اس کے بلئے مانگا تو بالکل ایسا ہوتا ہے، جیسے کوئی کہے "اللہ میاں تو مجھے خدا بنا دے" ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے، اور اس قسم کی دعا کرنیوالے کو اگر کچھ ہی نہ کہا جائے تو زبودہ کہتے ہیں -

لیکن زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر، قوم کی بہترین ہستیاں اپنے آپ کو اس ذلیل لفظ کا مصداق بناتی ہیں، چونکہ اس قسم کی مجبوریاں آصفی کو بیش آئی ہیں، اسلئے انکے ہاں بھی مذکورہ قسم کی دعائیں بکثرت ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تا بہرۂ ایثار کند ہمت نیساں
گوہر کدہ سازد گہر دامن یم را

از دستِ سخا، ہمتِ فیاضِ تو بخشد
گنجینہ لعل و گہر اصنافِ امم را

در موکبِ اقبالِ تو دوران پئے نصرت
رنگیں کند از خونِ عدو، پائے الم را

الٰہی تا کہ در گیہاں، روان ست از قضا فرماں
ز اجلالِ قدر ہر آں، بود ہر شہ جبیں فرسا

جہاں را او بود آمر، زماں را او بود قاہر
ز فرمانش شود ظاہر، تسلط بر ہمہ دنیا

ز ملک ہند تا دکھن، ز عدلِ او شود گلشن
جہاں را در گہش مامن، زماں را عتبہ اش ملجا

تا ہمہ کائنات ز سر چشمۂ وجود
فیضِ بقا بچشمۂ حیواں برابرست

تا صبح و شام را فلقِ نور و تیرگی
بہرِ نظامِ عالمِ امکاں برابرست

بادا بقائے تو بجہاں ہمچو مہر و ماہ
بارائے تو، قواعدِ گیہاں برابرست

تا دور آسماں بہ ترقی مساعد ست
تا پایۂ رفیع بجز رشید خاور ست

باشی چو آفتاب، باوجِ سپہر جاہ
کز بختِ تو جہانِ معانی منور ست

تا کہ در عالمِ امکاں بود آثارِ عروج
وز رتب فرۂ اجلال با عیاں گردد

آں مراتب کہ بود در خورِ ادراکِ عقول
از عروجِ تو نشانمند بامکاں گردد

وقت آن ست کہ با لدِ نفس عرضِ دعا
بہ نیازے کہ اجابت کشد اورا بکنار

شاہ را عمر چناں باد کہ دورِ پیہم
عمرِ صد خضر بسرعت گرہ آید بہ شمار

سال و مہ، ہفتہ و ہر روز کند جشنِ طرب
بسر آرد بہ نشاطِ ابدی لیل و نہار

خلق را باد نظامے بہ نظامِ عدلش
ملک پرداختہ از فتنۂ چرخِ دوّار

تاکہ چکد از سحاب، قطرۂ درِ خوشاب ۔۔۔ تاکہ بآں درِ ناب، دہر کند گوشوار
سال و مہت چوں گہر، منتظمِ یک دگر ۔۔۔ چوں قطراتِ مطر، بیش بود از شمار
چرخ کند گوشوار، زاں گُسستہ شمار ۔۔۔ زینتِ لیل و نہار، باد بہ آں گوشوار
ساقیِ دورِ زماں، از طربِ جاوداں ۔۔۔ با تو دہد شادماں، جام بہ لیل و نہار

تاکہ در عالمِ ایجاد بود عشرت و غم ۔۔۔ تاکشد دوست مے و خصم خورد خونِ جگر
دوستاں را ز مئے عشرتِ تو پُر ساغر ۔۔۔ دشمناں را قدحِ زہر ز زقومِ سقر
بہرہ یابند ز خوانِ کرمت صبح و مسا ۔۔۔ در خورِ حوصلۂ خواہشِ خود، اہلِ ہنر

تاکہ گوہر گسلد ابرِ بہاری بصدف ۔۔۔ تاشود آبروئے بحر و صدف از گوہر
بہ نثارِ تو قدر گوہرِ شب تابِ نجوم ۔۔۔ دائم آرد فلک از دامنِ بحرِ اخضر

تاکہ خوابد شبِ دیجور، در آغوشِ ظلام ۔۔۔ تاکہ از چشمِ فلک خواب برد آبِ غطاط
شاہدِ بختِ تو بیدار بماند دائم ۔۔۔ باد روز و شبِ تو، روز و شبِ عیش و نشاط

تاکہ خورشیدِ جہاں تاب زند دورِ عشرت ۔۔۔ بند از حوت بآہنگِ طرب روی بحمل
عہدِ نوروز بود آخرِ عہدِ عمرت ۔۔۔ روزِ نوروز بود ثانیِ د روزتِ اوّل

تابود طبعِ سخنور ز سخن گوہرزا ۔۔۔ تاکہ باشد نسقِ گوہرِ معنی بہ کلام
گوہرِ اہلِ سخن باد نثارِ مدحت ۔۔۔ باد آغازِ ثنائی تو ز حسنِ انجام
سایۂ ذاتِ تو مبسوط بود بر سرِ خلق ۔۔۔ بارگاہِ تو بود موئلِ اعیانِ کرام
باد با عمرِ تو عمرِ خضری ہم سوگند ۔۔۔ بادۂ عیش تو چوں آبِ بقا باد مدام

تا بود دورِ بقا، تا بود دورِ فنا ۔۔۔ تاکہ در باغِ جہاں آید بہار و ہم خزاں
گلبنِ دولتش ہمیشہ باد ریّاں از بقا ۔۔۔ وز بہارِ عیش و صحت باد دائم گلفشاں
تاکہ آبادی و ویرانیست در ملک و جور ۔۔۔ تا بہ نیرنگی بود برپا طلسمِ آسماں

خلق یا د از دادو عدلش کامیاب ملک باد از نصفت او از حوادث در اماں

ان دعاؤں میں یا تو یہ خواہش ہے، کہ ممدوح کو غیر فانی ہستی عطا کیجائے، اور یا یہ کہ اُس کو وہ مرتبہ ملے: جو ہر بلند مرتبہ شئے سے اعلےٰ ہو۔ اول محال ہے، دوسرا تقریبًا غیر ممکن، غیر ممکن یا محال شئے کی طلب میں خلوص پیدا ہونا بھی اسیطرح غیر ممکن یا محال ہے، لیکن چونکہ یہ حصہ قصیدہ کا جزہے، اور قصیدہ ترقی کرکے سرتاپا غلو ہوچکا ہے، اس لئے اس میں بھی غلو ہی غلو جلوہ گر ہے۔

بعض قصائد میں، آصفیؒ نے ایسی دعا بھی دی ہے، جو تھوڑی سی تاویل کے بعد معمولی بول چال میں شامل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

تا در حرم و دیر بود رسم پرستش معبودِ حقیقی و دگر سنگِ صنم را

اندر حرم سینہ و ہر شام و سحر گاہ چوں شمعِ حرم، قلبِ تو، انوارِ قدم را

مقصد یہ ہے کہ تیرا سینہ نورِ ایمان سے روشن رہے۔ لیکن شاعرانہ ادا نے اس کو ذرا شرح سے الگ کر دیا ہے، فرماتے ہیں "جبتک دیر و حرم میں خدا اور بت کی پرستش ہو، تیرا دل، شمعِ حرم کی طرح، سینہ کو انوارِ الٰہی سے روشن رکھے" یا فرماتے ہیں۔

تا صوم و صلوٰتے و دگر حج و زکاتے از طاعتِ خلاق کند عرض نشاں را

ہر کام دلِ صائم امید فزا ید ابروئے آعیشِ مہِ عیدِ رمضاں را

اقبالِ ترا سلسلۂ عہد ابد باد چندانکہ بود سلسلۂ دورِ زماں را

در عہدِ تو پیوستہ ز قانونِ عدالت بر دامنِ تو دوراں نگزیند حدثاں را

یعنی جب تک دنیا میں، خدا کی پرستش و بندگی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ داخل رہیں، تیرا اقبال پائندہ اور تیرا عدل عالمگیر رہے۔ امیدوار تجھے دیکھے، تو ایسی خوشی محسوس کرے، جیسے روزہ دار عید کا چاند دیکھکر باغ باغ ہوجاتا ہے" بالفاظِ دیگر تو سدا اقبال مند، عدالت شعار، اور کرم گستر رہے۔

اسی مضمون کی مختصر دعا۔ ان الفاظ میں نظم فرماتے ہیں۔

تا ہلالِ عید باشد در جہاں عشرت نوید تا کہ باشد از نشاطِ عید صائم کامیاب

ابروئے اقبال او در آسمانِ عز و جاہ چوں ہلالِ عیدِ عشرت باد بہر شیخ و شاب

تا بود سلطانِ انجم بر سپہر چار میں از جلال و احتشامِ خویشتن گردوں جناب

بارگاہِ افسر الدولہ بہادر در دکن بہر اعیاں ملجا و بہر سراں باد آماب

دشمنان سوزند اندر آتش رشک چو عود ناکساں نالند از غم صورتِ چنگ و رباب

یعنی جبتک آسمان پر آفتاب جلوہ فگن رہے، تیری بارگاہ، اعیانِ ملک و قوم کا ملجا رہے، اور دشمن آتشِ حسد سے جل بھن کر خاک ہوا کریں۔

تا نسق را بدکن شیوۂ تجدید بود تا مدار نسق و نظم بعقلِ دانا ست

بہر ہر نظم و نسق یار بعقل تو مدار حکمراں تا کہ نظامِ دکن ملک آراست

یعنی جبتک دکن میں نظم و نسق کے نئے نئے طریق پیدا ہوتے رہیں، اور دنیا عقل کو مدارِ انتظام شمار کرے ہر موقعہ پر صرف تیری ہی عقل راہنمائی کرے۔

بود تا کہ دورِ سپہر کبود رسد تا بہ گیتی بہارِ بسنت

بہ بزمِ وزیرِ دکن پیشکار بہاراں شود پیشکارِ بسنت

بمدحش نئے خامۂ آصفی شود ملبلِ نو بہارِ بسنت

یعنی تیری بزم سدا ترو تازہ رہے، اور آصفی کے اشعار سے ہمیشہ مالامال۔

تا قضا دفترِ ایجادِ طراز و جود داورِ یگاہ بدیوانِ قضا تا بینند

تا براتِ اہلِ اہلِ جہاں بنویسد تا کہ از خامۂ قدرت خطِ اجرا بینند

سرورِ جنگ بود قاسمِ ارزاقِ جہاں بہرہ بخت از و مخلص و اعدا بینند

نحلِ بخشش کہ خور و آب ز جوئے اقبال ثمر اشان کمالِ جم و دارا بینند

یعنی سرورِ جنگ کے پاس سدا لنگر جاری رہے، جس سے دوست دشمن سب فیضیاب ہوں، اور تا ابد جمشید و دارا کی طرح صاحبِ اقبال رہے۔

تا کہ میدارد تسلسل زلفِ عمرِ کائنات زلفِ عمرت چوں حیاتِ خضر طولانی کند

تا کہ زلفِ شاہدِ کشور بد وشش روزگار گہ جمعیت بود گاہے پریشانی کند

زلفِ رعنا شاہدِ ملکِ دکن مجموع باد عدل و انصافِ تو دائم شانہ گردانی کند

مقصد یہ ہے کہ خدا آپ کی عمر بڑھائے، اور عدالت کی توفیق دے۔

مولانا شبلی مرحوم کو دعا دیتے ہیں۔

جائے شبلی بدکن باد چو ملبلِ بچمن کہ نوا سنجی اور رونقِ بستاں آمد

نواب ماہر جنگ کے لئے آرزو ہے کہ

فلک مراتبِ او آنقدر کہ افزاید بروں ز دائرۂ عقلش انحصار کند

خدا آپ کو اسقدر مراتب عطا کرے کہ ہم گن بھی نہ سکیں۔
نواب فخر الملک وزیر تعلیمات سے خطاب کرکے فرماتے ہیں۔

تا کہ از لیل و نہار ست نظام عالم | تا بود مہر و مہ و گردش چرخ دوار
جمع آیند بدرگاہ تو اصحاب علوم | کام یابند ز جود و کرمت لیل و نہار
ہمچو خورشید فروزندہ جہاں آرا باد | نیر رائے منیر تو ز نور الانوار

مقصد یہ ہے کہ سدا تیری مجلس میں علما اور فضلا کا مجمع رہے۔ اور تیری روشن رائے سورج کی طرح سب کو منور رکھے۔
مذکورہ بالا مثالوں میں، آصفی نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی دعائیں صرف معمولی مبالغہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوگئے، ان کے کلیات میں اس قسم کی اور مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حتی الامکان قدیم شاہراہ سے الگ چلنا چاہتے ہیں۔

یہاں بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دعاؤں میں بھی کافی غلو ہے۔ اسلئے کہ تقریباً ہر جگہ یہی کہا گیا ہے، کہ جب تک سورج طلوع ہو، یا حوادث نازل ہوں، یا جبتک یہ نظام عالم قائم رہے، وغیرہ پھر ان مثالوں کو واقعاتی کسطرح کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ذرا بھی دقت نظری سے کام لیا جائے۔ تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے، مدعا یہ نہیں کہ کلام مبالغہ سے خالی ہو جائے مقصد یہ ہے کہ جو دعا کیجائے وہ دعا غلو نہ ہو۔ رہی تحدید وقت تو وہ کتنے ہی سیدھے سادے الفاظ میں ہو غلو ہی رہیگی۔ مثلاً صرف یہی کہدیا جائے کہ "سدا ایسا ہو جو" تو یہ بھی حقیقت اور واقعیت سے دور ہے ———— پہلی مثالیں واقعیت آشنا آرزوؤں سے خالی ہیں، ان میں اسقدر حقیقت سے دور راستہ اختیار کیا گیا ہے، کہ صاف بناوٹ نظر آتی ہے، اسکے برخلاف ان خواہشوں میں ذرا سی فکر بھی درکار نہیں ہوتی۔ سامع سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ با اثر ہے۔ یہ کیوں، صرف اسلئے کہ اگر زیادہ سے زیادہ کچھ طلب کیا ہے تو اقبالمندی۔ عدالت شعاری وغیرہ، رہی درازیٔ عمر، تو اولاً تو اسکے لئے براہ راست کوئی خواہش ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو تشبیہ کے سہارے، یعنی خضر کی طرح بڑی عمر ہو۔ چونکہ تشبیہ کے لئے صرف معمولی وجہ شبہ کافی ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں، "مقصد یہ نہیں ہے کہ عمر بالکل خضر کی برابر ہو، بلکہ جسطرح انکی عمر دراز ہے، ممدوح بھی بڑی عمر پائے۔"

تبصرہ کے ان صفحات میں، مولانا آصفی کے قصائد کے اجزا اور خصوصیات کا ہر ہر پہلو روشن ہو چکا ہے، بات حد سے زائد بڑھ گئی، اس لئے ہم علٰحدہ علٰحدہ، تخیل، تشبیہ، زور، اور چستی وغیرہ کی مثالیں نہیں دیتے۔

خان امتیاز علی عرشی

ایک تصویر کی قیمت

(ایک المیہ رومان)

بادشاہ کے محل میں ایک ہندو خادمہ چمپا بی تھی، جسپر لوگ کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ محل میں اسکے آنے کا واقعہ ایک ایسا سادہ سا واقعہ تھا کہ حیرت کی کوئی بات اسمیں نہیں ہوسکتی۔ نواب کے محل کی ایک خادمہ پنّا جب اپنے بھائی سے ملنے گئی تو اسکو معلوم ہوا کہ پڑوسن آج ہی صبح ایک بچی چھوڑ کر مرگئی ہے، اور اس کا کوئی نگراں نہیں ہے۔ اسنے ترس کھاکر اس لڑکی کو اپنے آغوش میں لے لیا اور اپنے ساتھ نواب کے محل میں لے آئی۔

جب محل میں یہ لڑکی داخل ہوئی تو دوسری کنیزوں نے پنّا کی اس حرکت پر بہت ہنسی اُڑائی اور بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت مول لینے پر اسکی بہت تضحیک کی، لیکن پنّا کے کوئی اولاد نہ تھی، اسلئے وہ بے یار و مددگار چمپا کی معصومانہ آنکھیں دیکھکر ان تمام باتوں کو فراموش کردیتی تھی، اور اس بچی کی پرورش کر رہی تھی،

پنّا سب سے بڑی بیگم کی منہ چڑھی خادمہ تھی، اسلئے اسے کام بہت ہی کم کرنا پڑتا تھا اور تنخواہ سب سے زیادہ ملتی تھی۔

پنّا کی پرورش گو حرم کی زہریلی فضا میں ہوئی تھی، مگر چمپا پر اس کا اثر نہیں ہوا تھا، چونکہ پنّا اب بہت نحیف و ضعیف ہوگئی تھی، اس لئے اس کا بہت سا کام نوجوان چمپا کو انجام دینا پڑتا تھا۔ نواب شہنشاہ بیگم چمپا کو کسی قدر التفات کی نظروں سے دیکھتی تھیں، کیونکہ اسوقت اس کے محل میں یہی ایک کنیز ایسی تھی، جسپر مکان کو فخر ہوسکتا ہے، جوں جوں بیگم کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا، اسکی محفلیں سرد پڑتی گئیں۔ حتیٰ کہ نواب نے بھی آنا جانا کم کردیا، ایک وقت تھا جب اس کا محل شباب روشنی سے جگمگاتا اور پھولوں سے معطر ہوتا تھا، مگر اب یہ حالت تھی کہ روشنیاں شام ہی سے گل کردی جاتی تھیں اور مرجھائے ہوئے پھول فرش پر بکھرے رہتے تھے۔

البتہ نوجوان شہزادے کی محفلیں ضرور جگمگانے لگیں، جہاں نہ کبھی روشنیاں گل ہوتی تھیں اور نہ پھول مرجھاتے تھے، شہزادہ کے لئے اور زیادہ کنیزوں کی ضرورت روز بروز محسوس ہونے لگی اور محل کے ہر ہر گوشہ کا حسن و جمال کھنچکر اس کے قصر میں آگیا، صرف چمپا تھا ایک ایسی نوجوان کنیز تھی جو بوڑھی بیگم کے محل میں تنہا رہ گئی تھی۔ چمپا پر کام کا بار بہت تھا،

لیکن جب ضروری کاموں سے اسکو فرصت ملتی، تو وہ بیگم کے پاس زردوزی اور کشیدہ کاری کا کام بھی ضرور سیکھتی تھی۔ بوڑھی بیگم شباب رفتہ کی شاکی اور خاوند کی محبت و التفات سے محروم تھی، وہ عیش و عشرت سے تنگ آ گئی تھی اور عمر کے آخری ایام اس لڑکی کے ساتھ گذارتی تھی تاکہ اُس کا دل بہلتا رہے۔ اور ایام رفتہ کی یاد دل نہ دکھائے، وہ چمپا کو زردوزی بہت شوق سے سکھاتی تھی، جسکی وہ اچھی ماہر تھی

جب شام ہونے لگتی اور غبار شب محیط ہونے لگتا تو زردوزی کا مشغلہ بھی مجبوراً بند کر دیا جاتا تھا، کیونکہ جب آسمان کے سیاہ مخملی غلاف میں زرتار تارے چمکنے لگتے تو زردوزی کے روپہلے اور سنہرے تاروں میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

چمپا اپنی خدمات سے فارغ ہونے کے بعد محل سے نکلکر اس غلام گردش میں چلی جاتی تھی، جہاں سامنے ہی نوجوان شہزادہ کا محل تھا، اسے اس محل کی کھڑکیوں سے رنگین روشنی دکھائی دیتی اور پھولوں کی رومانی خوشبو آتی، اور رنگین آوازیں اسکے دل میں ایک تلاطم سا پیدا کر دیتی تھیں۔

مریم اور گلابی شہزادہ کی نئی کنیزیں کبھی کبھی اسکے پاس آجاتی تھیں، اور شہزادہ کے حرم میں جو جو کچھ ہوتا تھا وہ سب چمپا کے سامنے دُہراتی تھیں۔

ایک صبح جب چمپا اُٹھی تو محل میں اُسے غیر معمولی چہل پہل نظر آئی، اور اُسے معلوم ہوا کہ بادشاہ اور اُسکا نوجوان شہزادہ آج محل میں آنیوالے تھے۔ بیگم ان دونوں کے خیر مقدم کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں، چمپا بھی تیاری میں مصروف تھی۔ لیکن آج اُس کا دل کام میں نہیں لگتا تھا وہ آج کوئی غیر معمولی بےچینی محسوس کر رہی تھی،

(۲)

چمپا رات کی آمد کا بےچینی سے انتظار کر رہی تھی، وہ محل کے کمروں میں مضطرب پھر رہی تھی۔ بیگم کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی، وہ خوش تھی کہ اُسے پھر ایک بار بادشاہ (اپنے شوہر) کا التفات نصیب ہوا۔ مگر چمپا کا دل خدا جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ کہ دفعتاً کمروں کے اندر سے ستار کی سُریلی آواز بلند ہوئی اور قبل اس کے کہ چمپا کسی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی، بادشاہ معہ شہزادہ کے اسکے سامنے سے گذرا، چمپا نکلکر باغ میں ایک جگہ جا بیٹھی تاریکی اسکے چاروں طرف محیط ہو گئی، ہوا نے گلاب کی کٹوریوں کو متحرک کیا، مگر چمپا بےحس و حرکت بیٹھی رہی۔

شہزادہ کو اپنی ماں کا محل کچھ پسند نہیں آیا، وہ اِدھر اُدھر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا، بادشاہ کی عمر مضطرب ہونیکی نہ تھی، اسلئے وہ ایک مکلف کوچ پر پڑا ہوا رقص دیکھ رہا تھا، ماں نے لڑکے کے اضطراب و پریشانی کو تاڑ لیا، اُسکے محل میں متعدد چیزیں دیکھنے کے قابل تھیں، ضرورت تھی کہ کوئی اسے لیجا کر سب چیزیں دکھلائے۔ خود وہ نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ بادشاہ کو کیونکر اکیلا چھوڑا جا سکتا تھا، کنیزیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ چمپا کہیں دکھائی نہیں دی۔ بیگم نے جالیوں میں سے جھانک کر اُسے پکارا۔ اور بادل ناخواستہ چمپا نے دمکتے ہوئے ستاروں سے

اپنی نظریں ہٹائیں اور آہستہ آہستہ محل کی طرف چلی۔

جونہی وہ کمرہ کے دروازہ پہ پہونچی، بیگم نے حکم دیا "شہزادہ کو مشرق کی جانب لیجاؤ اور سب چیزوں کی سیر کراؤ۔ ایک شمع ساتھ لیلو"

شہزادہ نے چمپا پر ایک غلط انداز نظر ڈالی، اور چمپا نے شمعدان اُٹھایا اور شرمائی ہوئی آگے بڑھی اور شہزادہ پیچھے پیچھے۔ متعدد کمرے دکھائے گئے، کسی میں قیمتی ہاتھی دانت کا سامان تھا، اور کسی میں کشمیر کے زرکار کپڑے اور کرشیدہ کاری کے عمدہ نمونے۔ غلام گردش کے سب سے آخری کونہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں قفل لگا ہوا تھا، جہاں تک چمپا کی یاد کام کرتی تھی، اُس نے اسے ہمیشہ مقفل دیکھا تھا، شہزادہ اس دروازہ کے سامنے پہونچکر رُک گیا اور پوچھا "یہ بند کیوں ہے؟ اس میں کیا ہے؟" چمپا اپنے دل میں جواب کے لئے مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی کہ بوڑھی پنا لکڑی ٹیکتی ہوئی ایک طرف سے برآمد ہوئی، شمعدان کی ناکافی روشنی اس وسیع جگہ کو روشن نہیں کر سکتی تھی، اس تاریکی میں پنا کا سفید سر اور جھریاں پڑا چہرہ ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا، شہزادہ یہ منظر دیکھکر ڈر گیا، اور کسی قدر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

(۳)

بوڑھی خادمہ جھک کر آداب بجالائی، اور بولی کہ "حضور! آپ خوفزدہ نہوں میں آپکی پرانی خادمہ پنا ہوں میں آپکی دایہ ہوں، لیکن اب میری صورت بدل گئی ہے، آپ چمپا سے اس کمرہ کی بابت پوچھتے ہیں۔ حضور! بھلا اس لڑکی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ جس ہولناک واقعہ کے بعد یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے مقفل کیا گیا تھا، اسے ایک زمانہ گذر چکا ہے، اُسوقت میں جوان تھی، اسکی کنجی میرے پاس ہے، میں اسے پچاس سال سے محفوظ رکھے ہوئے ہوں، شاید آپ نے اپنے دادا کی پُراسرار موت کا حال تو سُنا ہوگا۔ اسکی تصویر آپ کے تصویر خانہ میں نہیں ہے، کیا آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسکی تصویر کہاں ہے؟"

شہزادہ نے سر ہلایا، معلوم ہوتا تھا اُس سے قوت گویائی چھین لی گئی ہے۔ بوڑھی خادمہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنجی نکالی اور قفل کھولا، کمرہ کا دروازہ بغیر کسی وقت کے کھل گیا، شہزادہ باہر کھڑا رہا، خادمہ اندر گئی اور وہاں سے پکارا۔

چمپا جو بُت بنی کھڑی تھی چونک پڑی اور شمعدان لئے ہوئے اندر داخل ہوئی، اس کے پیچھے شہزادہ داخل ہوا، کمرہ آراستہ تھا، لیکن مخمل کے پردوں کا رنگ اُڑ چلا تھا، دیوار کے قریب ایک بڑا عروسی پلنگ رکھا ہوا تھا جس پر پژمردہ پھولوں کے ہار بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، اُسکے قریب ہی دیوار پر ایک قدآدم آئینہ آویزاں تھا، کسی سخت ضرب کی وجہ سے اسکے دو برابر کے حصّے ہوگئے تھے، فانوسوں کا عکس آئینہ کے دونوں حصّوں پر پڑ رہا تھا۔

جونہی شہزادہ کمرہ میں داخل ہوا اُسکا عکس اس آئینہ میں پڑا، چمپا دفعتاً چونک پڑی۔ کیونکہ آئینہ میں شہزادہ کے عکس کے علاوہ اسی کی شکل وشمائل کا ایک دوسرا عکس بھی پڑ رہا تھا۔ شہزادہ کے پیچھے ایک اور ویسا ہی عکس تھا اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، لیکن شہزادہ کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔

پنا کی آواز پھر کمرہ میں سُنائی دی "حضور دیکھئے آئینہ کے عین سامنے آپکے دادا کی شبیہ لٹک رہی ہے جو وہ شکستہ آئینہ میں آپکو نظر آرہی ہے، جب یہ تصویر بنی تھی اُسوقت اُنکی عمر آپ ہی کے برابر تھی، لیکن اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ہولناک رات آئی جس نے ہمیں اُن سے جُدا کر دیا"

یہ کہکر تمام مجمع تصویر کی جانب بڑھا۔ یہ کوئی روغنی تصویر نہ تھی بلکہ کسی صناع نے نیلگوں مخمل پر سُنہرے و روپہلے تاروں سے اسکی خوبصورت شبیہ کاڑھی تھی، زردوزی کا شاہکار تھا، یہ تصویر اب بھی جاندار معلوم ہوتی تھی اور زمانہ سے کام دھندلا سا معلوم ہوتا تھا۔

بعد ازاں اُن میں سے کسی نوجوان لڑکی نے کہا "کیسی خوبصورت تصویر بنائی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ایسی چیزیں تیار کر سکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس نے بنائی ہے؟"

بوڑھی عورت نے جواب دیا "اسکا بنانیوالا عرصہ ہوا مر گیا، وہ اپنے فن کا اُستاد تھا اُس نے یہ تصویر نا تمام چھوڑی، کیونکہ قبل اسکے کہ یہ پایۂ تکمیل کو پہونچے اُسکی بینائی نے جواب دیدیا، کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا، لیکن اُس کے بیٹے نے اسکو پورا کر دیا۔"

نوجوان لڑکی بولی "اسکا اندھا ہو جانا یقینی تھا! میں اپنی بصارت اس شخص کی تصویر بنانے کے لئے دینے کو تیار ہوں جو اسی کی برابر خوبصورت ہے" لڑکی کی تبسم نظریں شہزادہ کی طرف مائل تھیں

شہزادہ اپنے دادا کی شبیہ کو ایک سرد مہر نقاد کی طرح دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر بعد اسکی نظریں ادھر سے ہٹیں اور کہا "امینہ! محض خوبصورت ہونا ہی کام نہیں دیتا ویسی ہی قسمت بھی ہونی چاہئے، تم اپنی مرضی سے مجبور اپنی آنکھیں قربان کر سکتی ہو، لیکن تم میں وہ جوہر نہیں ہے اور اگر کوئی ایسا ماہر فن مل بھی جائے جو ایسی ہی شبیہ مخمل پر کاڑھ سکے تو وہ کب اپنی آنکھیں برباد کرنی گوارا کرے گا۔"

امینہ نے ہنسکر جواب دیا "اگر کوئی ایسا قربانی کرنیوالا مل جائے تو آپ کیا دینگے؟"

شہزادہ نے بھی جواب دیا "کیا دونگا؟ سب کچھ جو میرا ہے!"

اب کوئی چیز دیکھنے کے لئے باقی نہ رہی تھی اس لئے سب لوگ رخصت ہو گئے۔

رات کو جب روشنیاں گُل ہو گئیں، چمپا غلام گردش کو طے کرکے پنا کے آخری کمرہ کی جانب جاتی ہوئی دکھائی دی۔ جونہی چمپا کمرہ میں داخل ہوئی وہ چلائی "ہائیں! اسوقت تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

چمپا نے پوچھا "وہ شخص جس نے نواب کی تصویر کی تکمیل کی تھی اب کہاں ہے؟"

بوڑھی عورت نے پہلے تو چمپا کی طرف متحیر ہو کر دیکھا اور پھر کہا "کیا تو اس سے زر دوزی کا کام سیکھنا چاہتی ہے! نادان لڑکی اس خیال خام سے باز آ، ہمیشہ یاد رکھ کہ اگر ایسے مہلک کام میں ہاتھ ڈالا تو وہی سال کے اندر اندر تیری بینائی جاتی رہیگی، تو نے بیگم سے جتنا سیکھ لیا اسی پر اکتفا کر۔ رحمت جس نے تصویر کو مکمل کیا تھا، بینائی کے ضائع ہونے کے خوف سے اس کام سے دست بردار ہو گیا ہے، اور اب آگرہ میں ہے۔"

چمپا نے بوڑھی کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور کہا "بس اب میں جاتی ہوں!"

شام سے طوفان کے آثار تھے۔ لیکن اب سکون تھا، گلابی باغ میں زرد پتے اپنا مجنونانہ رقص ختم کر چکے تھے ایک لڑکی کا نازک جسم گلاب کے کنجوں میں سے گذرتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہی سکون طاری ہو گیا۔

(۴)

گذشتہ ساٹھ سال کی زندگی میں رحمت کو کبھی اس سال کی سی سردی کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ جب سے وہ آگرہ میں آ کر رہا تھا، ہمیشہ سردی کی شکایت کرتا تھا۔ لیکن امسال تو وہ بالکل ٹھٹھرا جا رہا تھا۔

جب سورج بلند ہوا وہ اپنی چارپائی سے اٹھا لیکن قبل اسکے کہ وہ ضروریات سے فارغ ہوتا، دفعتاً دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر داخل ہوا، جسکے بعد ایک خاموشی چھا گئی۔ رحمت نے متعجب ہو کر اپنی آنکھیں کھولیں کیونکہ اس کے دوستوں میں سے کسی کو بھی خاموشی کی عادت نہ تھی۔ پہلے تو رحمت یہ سمجھا کہ سن و سال کا تقاضہ ہے اور اسے کوئی وہمی شکل دکھائی دے رہی ہے مگر مسلسل گھورنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ سامنے نیلگوں چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے۔ رحمت ایک نوجوان لڑکی کو اپنے کمرہ میں دیکھکر کسی قدر پریشان ہوا، وہ متحیر تھا کہ اسوقت کیا کرے کہ نووارد نے پوچھا "کیا جناب ہی رحمت علی کا مکان ہے؟"

"ہاں! میں ہی رحمت ہوں! تم کہاں سے آئی ہو؟" رحمت نے کسیقدر حواس مجتمع کر کے جواب دیا۔

"میرا نام چمپا ہے۔ میں بادشاہ کے محل سے آئی ہوں!"

(۵)

یہ سنکر رحمت کو ایک ایک کر کے جوانی کے تمام واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے لڑکی سے پوچھا، "تم کیا چاہتی ہو، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"کسی نے نہیں۔ میں اپنے کام کے لئے آئی ہوں۔ میں آپ سے کچھ متوقع ہوں۔"

رحمت نے سوچا شاید یہ کوئی بھکارن ہے، مانگتی ہوئی آگرہ آئی ہے، رحمت نے کسیقدر نرم لہجہ میں کہا "بیٹی! تم مجھ سے فقیر سے کیا متوقع ہو، مجھے روح و جسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے خود دوسروں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے، یہاں امیروں کے مکانات بھی ہیں وہاں جاؤ شاید تمہاری مدد ہو جاوے گی۔"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں تم سے روپیہ کی بھیک نہیں مانگتی۔ میں تم سے اس سے زیادہ کی متوقع ہوں، مجھے زردوزی سکھا دو"!

زردوزی! رحمت خوفزدہ ہوا کیونکہ اُس نے آنکھوں کے ضائع ہونے کے خوف سے عرصہ ہوا اس فن کو خیرباد کہہ رکھا تھا، مگر اب بھی کبھی کبھی ایک آدھ ٹانکا بھر لیا کرتا تھا تاکہ مشق نہ چھوٹے۔ اس لڑکی کی درخواست نے اسکی جوانی کے تمام تاثرات کی تجدید کردی اور وہ زردوزی کے لئے اپنے اندر ایک نیا جوش محسوس کرنے لگا۔ اُس نے لڑکی کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور پہلا سبق دیا۔

رحمت کے گھر میں چونکہ کوئی عورت نہ تھی، اسوجہ سے چمپا کو فاطمہ نامی ایک عورت کے ہاں جاکر رہنا پڑا، جو رحمت کے ہاں کام کاج کرنے کبھی کبھی آیا جایا کرتی تھی۔

اسی طرح چمپا کو رہتے ہوئے عرصہ گذر گیا لیکن تصویر بنانے کی ابھی تک نوبت نہ آئی، کیونکہ اُستاد نے ابھی اسکا امتحان نہیں لیا تھا، چمپا بہت محنت و عرق ریزی سے مختلف قسم کے پھول، بیل بوٹے، اور جانوروں کی شکلیں بنا لیتی تھی، لیکن اسکا دماغ ہمیشہ محل کے اس کمرہ میں چکر لگاتا رہتا تھا جہاں خوبصورت زردوزی تصویر آویزاں تھی۔

(۶)

اسی طرح چمپا پر زندگی کا پورا ایک سال ختم ہو گیا اور اس زمانہ میں اُس نے اسقدر محنت کی کہ تاج محل کی زردوزی کی تصویر اُس نے تیار کرلی، جسے اُستاد نے بہت پسند کیا اور اُسے امید ہوئی کہ اب وہ شہزادہ کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اُسے بصارت ضائع ہونے کا خوف ابتدا ہی سے تھا، اسلئے اب وہ بہت محتاط ہو گئی تھی اور رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اُسے شہزادہ کی تصویر تیار کرنا تھی اس لئے وہ اپنی آنکھیں کھونے کے لئے تیار نہ تھی، وہ اب صرف دن کی تیز روشنی میں کام کیا کرتی تھی۔

چمپا کا اثاثہ چند دنوں کے بعد کم ہونے لگا، فاطمہ نے فرنیہ۔ دہیہ کی فرمائش کی جسے چمپا پیش کرنے سے قاصر تھی، چمپا نے ایک وقت کھانا بند کردیا اور دیگر اخراجات میں بھی کمی کردی مگر تصویر بنانے کے لئے سنہرے روپہلے تار ضرور کہیں نہ کہیں سے مہیا کرتی۔

ایک وقت کھانے اور شب و روز کی محنت کرنیکی وجہ سے چمپا کی صحت نے جواب دینا شروع کردیا، کیا رحمت کی تنبیہ صحیح تھی کہ ضرورت سے زیادہ محنت کی وجہ سے وہ آنکھیں کھو بیٹھیگی؟ ہاں! اُسے اب شبہ ہونے لگا تھا، کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُسکی بصارت روز بروز کم ہو رہی تھی۔ وہ اب کام میں بھی بہت غلطیاں کرتی تھی، تصویر ختم ہونے میں ابھی کافی عرصہ تھا اب اُس نے رات کو مٹی کے چراغ کے سامنے کام کرنا شروع کردیا، کیونکہ دن کو سورج کی چمک سنہرے تاروں پر پڑکر اُس کی

آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی تھی۔

دن رات محنت کرنیکی وجہ سے اسکی آنکھوں سے پانی بہنے لگا، مگر تصویر اب قریب الختم تھی، خزاں کا موسم تھا رات بھیانک اور ڈراؤنی تھی اور وہ جلد جلد سوئیاں نکال رہی تھی، آج کی رات اسے وہ طوفانی رات یاد آئی جب وہ محل سے رخصت ہوئی تھی۔

چمپا اب آگرہ سے رخصت ہونیکی تیاریاں کر رہی تھی کیونکہ تصویر ختم ہونیوالی تھی۔ فاطمہ صبح ہوتے ہی کہیں باہر نکل گئی اور چمپا اپنا کام لیکر بیٹھ گئی۔ اب عمل کی تکمیل ہو رہی تھی، یکایک اسنے محسوس کیا کہ تاریکی نے ادھر اُدھر سے بڑھنا شروع کیا، اسنے سوچا ابر آیا ہے مگر جب اس نے باہر نکل کر آسمان کو دیکھا تو وہ بالکل صاف تھا، وہ پھر کمرہ میں آبیٹھی اور کام میں لگ گئی۔ تاریکی پھر عود کر آئی اور اُس نے آنکھیں ملکر ادھر اُدھر دیکھا مگر اُسکی آنکھیں دھندلی سی تھیں، کیا وہ مصیبت جسے دور کرنیکے لئے اُسنے انتہائی کوشش کی تھی اب آنیوالی تھی؟

چمپا خوفزدہ ہو گئی کیا اُسکی آنکھیں نورِ بصارت سے محروم ہو رہی تھیں، کیا اسکی زندگی کا سرمایہ چند آخری ٹانکوں سے محروم رہیگا؟ کیا شاہکارِ زندگی ناتمام رہیگا؟ کیا وہ نذرِ پیش نہ کر سکیگی؟ یہ خیالات تھے جو چمپا کے دماغ پر چھاگئے۔ اور وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آئی، اسوقت اُسکے سامنے شہزادہ کی تصویر تھی۔ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ وہ خوبصورت شہزادہ سامنے کھڑا ہوا تھا، تصویر ہر طرح مکمل تھی —— مگر آنکھیں بے حس و بے کیف تھیں! تصویر کی آنکھیں بیجان و مُردہ تھیں، ان میں جسم کے بقیہ حصوں کی سی حیات نہ تھی، کیا چمپا اپنی زندگی کی قربانی سے ان آنکھوں میں حیات پیدا کر سکتی تھی؟

چمپا نے ایک غیر انسانی قوت کے ماتحت حواس کو مجتمع کیا اور مخمل لیکر کھڑکی کے قریب روشنی میں آبیٹھی۔ کمرہ کی تاریکی ہر طرف سے ہجوم کر رہی تھی، آج چمپا اس عجیب مخمل میں اس خزانہ کو تفویض کر رہی تھی جو اُسکے نہاں خانۂ دل میں عرصہ دراز سے پوشیدہ تھا —— آہ وہ نظریں! —— شہزادہ کی مخمور نگاہیں تو اسوقت تک صرف چمپا کے اعماقِ دل میں پنہاں تھیں، آج مخملی سطح پر مادی صورت میں تبدیل ہونیوالی تھیں۔ سنہرے ٹانکے سیاہ مخمل پر اسطرح متحرک تھے گویا تاریک آسمان پر بجلی کوندرہی تھی۔ آخری ٹانکا ختم ہوتے ہی خوبصورت شہزادہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں —— اب اُنمیں جان تھی!

چمپا نے سوئی ہاتھ سے رکھدی اور متبسم ہو کر اپنے شاہکار کو اُٹھایا اور نگاہ سے دور رکھکر دیکھا —— ایک بجلی سی کوندی اور پھر اسکے بعد تمام کائنات پر ایک سیاہ پردہ آہستہ آہستہ گرنے لگا!

(۷)

ابھی تک پو نہیں پھٹی تھی اور ستارۂ صبح اپنی آخری کرنیں زمین پر ڈال رہا تھا کہ ایک تاریک دلدلی سڑک پر سے دو عورتیں گذرتی ہوئی نظر آئیں، ایک بڑھی تھی، دوسری جوان۔ بڑھیا کی بغل میں ایک بنڈل تھا اور ایک ہاتھ سے

وہ جوان عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے لیجا رہی تھی۔ کمر کی نقاب چھائی ہوئی تھی اور ہر چیز ایک سایہ معلوم ہوتی تھی۔ جوان عورت کے پاس بھی ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسے وہ بہت احتیاط کے ساتھ چادر میں چھپائے ہوئے تھی۔

بوڑھی عورت نے دفعتاً بلند آواز سے کہا "میں تھک گئی ہوں۔ اب آگے نہیں جا سکتی! محل قریب آگیا ہے، تھوڑی دیر آرام کرلو، پھر چلیں گے۔ محل وہی ہے نا ——— "سفید سی برجی!"

لڑکی نے سر ہلا کر کہا "اچھا تو بیٹھ جاؤ"۔

قریب ہی ایک درخت کے نیچے دونوں عورتیں بیٹھ گئیں۔ بوڑھی عورت نے لڑکی سے کہا "بیٹی سب نے تم جیسے ملی تھی تو تمہارے متعلق یہ کہا تھا کہ تم محل کی عورت ہو، اور تمہارے پاس بہت روپیہ ہے تم آگرہ سے ہمارے گاؤں تک پیدل کیوں آئیں؟"

نابینا لڑکی نے اپنی بے بصر آنکھیں اُسکی طرف کرکے کہا "میں محل کی شہزادی نہیں ہوں! میں تو ایک غریب خادمہ تھی! میرے پاس جو کچھ بھی تھوڑا بہت روپیہ تھا وہ ختم ہوگیا"۔

"اوہ! تم خادمہ ہو! دیکھو فاطمہ کتنی جھوٹی عورت ہے! کمبخت! بیٹی تیری آنکھیں کیونکر ضائع ہوگئیں۔" لڑکی کے لبوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ پیدا ہوئی اور اُس نے جواب دیا "میں نے یہ آنکھیں اپنے خداوند کے حضور میں نذر کردی ہیں ———" اور یہ کہکر رونے لگی۔

عورت نے تسلی دیکر کہا "بیٹی رو نہیں! صبر کر! خدا تیری مصیبت آسان کرے گا۔ بیٹی اس بنڈل میں کیا ہے، سونا یا چاندی؟"

"سونا! چاندی! ——— ان سب سے زیادہ قیمتی چیز! کیونکہ میں نے اسکے لئے اپنی زندگی قربان کی ہے۔ یہ بہت بیش قیمت چیز ہے!"

بوڑھی عورت نے دل میں کہا "سونا چاندی سے بھی زیادہ قیمتی یقیناً جواہرات ہونگے، اور محل سے چُرائے ہونگے"

چمپا بالکل تھک گئی تھی، اس لئے وہ درخت کے نیچے پڑکر سو رہی۔ بوڑھی عورت بھی سو رہی، مگر وہ جلد اُٹھ بیٹھی۔ چمپا کو سوتے سوتے کئی گھنٹے ہوگئے تو بوڑھی عورت نے اسے جگایا اور کہا "بیٹی اب شام ہونے آئی چلو محل کی طرف چلیں، ورنہ چلتے چلتے رات ہوجائے گی" چمپا یہ سُنکر اُٹھ بیٹھی اور کپڑے جھاڑ کر پھر چل پڑی۔ جب دونوں محل پر پہنچ گئے تو اس نے بوڑھی سے کہا کہ اس دربان کو ایک روپیہ دو اور اس سے کہو کہ ہمیں شہزادہ کے حرم میں لیچلے"۔

چمپا مرمریں زینہ پر سے ہوتی ہوئی اوپر چڑھی۔ اب اسکی بے بصری کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی تھی کیونکہ اسکے تمام حواس نے اسکی مدد کرنی شروع کردی تھی۔ وہ محل کے چپہ چپہ سے واقف تھی۔

چمپا کو اب وہ زمانہ یاد آرہا تھا، جب وہ پُرانے محل کے بیرونی غلام گردش میں کھڑی رہا کرتی تھی۔ شاید اب

بوڑھی بیگم گلابی باغ میں جا بیٹھی ہوئی۔ کیونکہ وہ اسی وقت جایا کرتی تھیں۔ چمپا یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی کہ بوڑھی پنا بھی زندہ ہے یا نہیں:

(۸)

چمپا اب ملاقاتی کمرہ کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اسکی زندگی کے صبر آزما لمحات قریب سے قریب تر ہو رہے تھے اسکے قدم آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے۔ تمام جوش ختم ہو چکا تھا، وہ بہت کچھ کہنے آئی تھی، مگر اب ایک لفظ بھی اس کے دماغ میں نہ تھا۔

دربان چمپا کو وزیر کے حوالہ کرکے رخصت ہو گیا اور وزیر نے چمپا سے مخاطب ہو کر کہا "میرے ساتھ آؤ"۔ چمپا نے ہمت کرکے آگے قدم بڑھایا اس حال میں کہ اسکا قیمتی خزانہ سینہ سے لگا ہوا تھا۔

قدموں کے نیچے نرم قالین کے مس ہونے اور پھولوں کی خوشبو سے چمپا نے سمجھ لیا کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئی ہے۔

وزیر نے جھک کر سلام کیا اور بآواز بلند کہا "جہاں پناہ! ایک بھکارن حضور کی قدمبوسی کرنا چاہتی ہے"۔ چمپا نے تمام حاضرین کی آنکھیں اپنی طرف مرکوز ہوتی ہوئی محسوس کیں۔ کیا کوئی اسے پہچان سکتا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ وہ کبھی اس محل میں نہیں آئی تھی اور شہزادہ نے بھی اسے صرف ایک بار سرسری طور پر دیکھا تھا۔

کوئی شخص قریب آیا۔ قدموں کی آہٹ وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی اور نہ اسکی آواز اجنبی تھی جس نے یہ پوچھا کہ "تو کیا چاہتی ہے؟"

یہ الفاظ چمپا کے کانوں میں گونجے اور کئی دفعہ اس نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر وفورِ شوق نے اسے بولنے نہ دیا۔ پھر پوچھا گیا "تم یہاں کس لئے آئی ہو؟ کیا چاہتی ہو؟"

چمپا نے بمشکل تمام ایک گلوگیر آواز سے جواب دیا "میں مانگنے نہیں آئی ہوں۔ دینے آئی ہوں"۔ چمپا نے محسوس کیا کہ تمام محفل میں ایک حیرت واستعجاب کی لہر دوڑ گئی۔

شہزادہ نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور کہا "ہاں! بیشک، وہ کیا ہے؟"

چمپا نے اپنی زندگی کا سرمایہ ــــ وہ خزانہ جسکی کوئی قیمت نہ تھی اور جسے اسنے اپنی آنکھیں قربان کرکے تیار کیا تھا ــــ آگے بڑھایا اور شہزادہ کو دیا۔ شہزادہ نے مضطربانہ انداز سے اسے لیلیا۔

چمپا کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ قالین پر ہانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ سینہ بلیوں اچھل رہا تھا اور اسکے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

کہ دفعتاً بنڈل کے اوپر سے غلاف کے کھلنے کی آواز آئی اور اب چمپا نے سمجھا کہ ــــ اسکی زندگی کا راز کھلنے والا تھا!

دفعتاً ایک قہقہہ کی آواز فضا میں گونجی! چمپا سرد پڑ گئی! اسکا جسم ایک سنگین مجسمہ بنگیا! کیا اسکی تمام زندگی کے سرمایہ کی یہی قیمت تھی! ایک طنزیہ قہقہہ! آہ! اس قہقہہ کا کیا مطلب تھا؟

ایک آواز سنائی دی۔ "کیا یہ عورت دیوانی ہو گئی ہے! دیکھو کیسی گستاخ ہے! شہزادہ کے حضور میں چند چیتھڑے پیش کرنے لائی ہے"!

"چیتھڑے"! وہ کیا سُن رہی تھی اسکا دماغ چکرا رہا تھا!

چمپا ایک ہچکی کے بعد شہزادہ کے قدموں میں گر پڑی۔ وہ اندرونی نور جس نے اسوقت تک نابینا لڑکی کو منور کر رکھا تھا آج ہمیشہ کے لئے بجھ کر ختم ہو گیا۔

شہزادہ نے برافروختہ ہو کر کہا "اس بدبخت و گستاخ لڑکی کو یہاں سے نکالدو۔ اس نے میری محفل کو مکدر کر دیا۔ لیجاؤ ابھی میرے سامنے سے ہٹاؤ اگر یہ مرگئی ہو"!

شہزادہ کی ایک محبوبہ بولی "بھلا اس لڑکی کو یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ آج صبح ہی آگرہ کی ایک بڑھیا نے زردوزی کا ایک شاہکار پیش کیا تھا۔ شہزادہ اُسے دیکھکر کتنا خوش ہوا تھا اور بڑھیا کو کتنا انعام دیا! شاید یہ بھی اسی لالچ میں آئی تھی۔ ہم سمجھے تھے جسطرح صبح ایک عمدہ تحفہ حاصل ہوا تھا، شام کو بھی ایسا ہی ملے گا، مگر نہیں یہ لڑکی مذاق کر رہی تھی! اور بیوقوف بنانے آئی تھی"!

سارا مجمع چمپا کے بیحس جسم پر حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ مقابل کی دیوار پر ایک زردوز مجسمہ لٹک رہا تھا جسکی وہ خوبصورت آنکھیں ــــ جنہیں زندہ کرنے کے لئے چمپا نے اپنی بصارت کی قربانی کی تھی ــــ اُسکے بیحس جسم اور آنکھوں کے گمشدہ نور کی طرف دیکھ رہی تھیں!

(ماخوذ)

ظفر قریشی دہلوی

دُنیا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں
اگر ہے تو وہ مذہب کون ہو سکتا ہے

میں نے جولائی کے ملاحظات میں رسالہ قیام الدین پر تبصرہ کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اگست کے ملاحظات میں اس حقیقت سے بحث کرونگا کہ وہ یاجوجی قوت کونسی ہے جو اس مذہب کو برباد کرنا چاہتی ہے اور میں نے اگست کے ملاحظات میں اس مسئلہ کو چھیڑا بھی تھا، لیکن چونکہ یہ بحث بہت زیادہ وسعت بیان کی طالب تھی۔ اسلئے تمہید ہی تمہید میں ملاحظات کے صفحات ختم ہو گئے، بہر حال اب وعدہ کے مطابق میں ایک مستقل مضمون کی صورت میں اس مسئلہ کو شروع کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی ظاہر کر چکا ہوں اس مضمون کے تین حصے ہونگے، پہلا وہ جس میں مذاہب عالم کی ابتدا اور اُن کے مدارج و معتقدات سے بحث ہوگی، دوسرے حصہ میں اُن اسباب و حالات کا ذکر ہوگا، جنھوں نے مذہب کی طرف سے انسان کو باغی بنایا اور تیسرے حصہ میں مستقبل کے مذہب یا مذہب کے مستقبل کا ذکر ہوگا آج کی اشاعت میں حصہ اول کی ابتدا کرتا ہوں اور چونکہ یہ بحث ذرا طویل ہے، اسلئے ممکن ہے اس ماہ میں ختم نہ ہو سکے۔ باقی دو حصے غالباً اتنے طویل نہ ہونگے اور اسطرح گویا زیادہ سے زیادہ نومبر ۲۸ء تک اس بحث کا پورا ہو جانا یقینی ہے۔

نیاز

طبقات الارض و فلکیات کے ماہرین کا قول ہے کہ دنیا کروڑوں برس کی عمر رکھتی ہے، یعنی اُسکی موجودہ حالت کروڑوں برس کے تدریجی ارتقا اور تغیر و تبدل کے بعد قائم ہوئی ہے، ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے، لیکن بعض ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ کم از کم پچاس لاکھ سال ہوئے جب اول اول انسان کا ظہور ہوا، اور غالباً اُسی وقت سے مذہب کا بھی وجود پایا جاتا ہے، ہر چند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ چھ ہزار سال سے شروع کیا ہے، اور قدیم زمانہ کی جو روایات اُس نے قلمبند کی ہیں وہ خرافیات کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں، لیکن انسان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اقوام و ملل کی رفتار میں ان ارتقا میں یکساں نہیں

رہی اور ماحول کا اثر اس پر برابر پڑتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں مدارج ارتقا طے کر کے جلد معراج ترقی تک پہونچ گئیں اور بعض قومیں ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہر حال ہمیں اقوام عالم کی صحیح تاریخ کا علم ہو یا نہ ہو لیکن فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا اور ہمیشہ اسکے ساتھ رہیگا، لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اس پر ہوتا ہے اُسکے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں، اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا مذہب ابتدا میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔ اس مقصد کیلئے ہم اقوام عالم کی دو تقسیمیں کرتے ہیں، ایک وہ جو مدارج ارتقا طے کرتے کرتے متمدن و مہذب ہو گئیں، دوسری وہ جو ہنوز غیر متمدن اور وحشی ہیں۔

مدارج ارتقار جب ذہن انسانی کا ابتدائی دور ختم ہوا اور اُس میں سوچنے کی کیفیت پیدا ہوئی تو سب سے پہلی اسکی توجہ اپنے جسم کے سایہ کی طرف منعطف ہوئی اور عدم پختگی عقل کی وجہ سے اس نے اس سایہ کو خود اپنا ہی ایک جزو یا "ذو مثنیٰ" سمجھا، اسی کے ساتھ اس کے خیال میں یہ بھی آیا کہ جب وہ سوتا ہے تو شاید یہ اُس کا سایہ ہی ہے جو دنیا بھر کی سیر کرتا ہے، اور رات کو جب چاروں طرف تاریکی چھا جاتی ہے، تو شاید یہ روحیں ہیں جن سے سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان روحوں کی صفات کا خیال بھی دل میں پیدا ہوا، اور موذی ارواحوں سے خوف و دہشت اور شفیق روحوں سے محبت کا اظہار کرنے لگا اور یہ تھی اولیں بنیاد مذہب کی۔

پرستش ابتدائے آفرینش میں انسان بحالت اشتراکیت رہا کرتا تھا، اور دنیا کی کوئی چیز کسی شخص خاص کی ملکیت نہ سمجھی جاتی تھی، سب ملکر شکار کرتے تھے اور سب ساتھ ملکر کھاتے تھے، لیکن ہمیشہ یہ حالت قائم نہیں رہی اور بعد کو طاقتور نے کمزور کو دبانا شروع کیا۔ اور "ادارۂ حقوق و ملکیت" قائم ہو کر رفتہ رفتہ سردار، راجہ، و فرمانروا کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن سرداری یا فرمانروائی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں سمجھی گئی بلکہ اُس کے مرجانے پر بھی وہی احترام قائم رہا اور اُسے دیوتا سمجھنے لگی یعنی اس طرح دنیا میں زندہ بادشاہ کی فرمانبرداری اور مردہ بادشاہ کی پرستاری کا سلسلہ جاری ہو گیا جسے "عبادت و پرستش" کی ابتدا کہنا چاہیئے۔

بہشت و دوزخ اس کے بعد انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ وہ تاریک جنگلوں میں یا نظروں سے دور کسی مقام میں رہتی ہے، لیکن جب جنگلوں میں چلنے پھرنے سے کبھی کسی سے ملاقات نہ ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ وہ یا تو برفپوش پہاڑوں پر رہتی ہے، یا زمین کے نیچے کسی مقام پر چلی جاتی ہے اور یہیں سے سورگ و پاتال، بہشت و دوزخ، علیین و سجین وغیرہ کی روایات پیدا ہوئیں۔

مقتدایان دین ارتقاء تمدن کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک مستقل جگہ اقامت اختیار کی اور زراعت و فلاحت میں مصروف ہو گیا تو اُس نے اپنے مختلف اغراض و مشاغل کے لحاظ سے مختلف

دیوتا بنا لئے۔ انسان قدیم سمجھتا تھا کہ اسکی صحت و بیماری، زراعت و شکار، اور تمام مقاصد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار انھیں دیوتاؤں کی خوشنودی یا برہمی پر ہے اور اسی لئے وہ پوجا پاٹ یا پرستش و نیایش کو بہت اہمیت دینے لگا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا بھی انسان کی طرح الحاح و زاری سے خوش ہوتے ہیں، اور اگر خوشامد نہ کیجائے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پرستش کے خاص مراسم قائم ہوئے، اور جن لوگوں نے ان مراسم کے ادا کرنے میں مہارت حاصل کی، ان سے لوگ اپنی عبادت میں مشورہ لینے لگے۔ اور اُن کی خدمات کے بدلے میں کچھ نذرانہ بھی دیا جانے لگا۔ اسطرح پنڈتوں۔ پجاریوں۔ ملاؤں۔ دستوروں۔ موبدوں، بھکشوؤں۔ پادریوں وغیرہ کی ابتدا ہوئی۔

مگر چونکہ درحقیقت اغراض و مقاصد میں کامیابی کا انحصار بھوتوں یا ارواح کی مدد پر نہیں ہے، اسلئے جب کبھی عبادت کرنے کے بعد بھی کسی شخص کا مقصد حاصل نہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پجاری یا مقتدائے دین سے شکایت کرتا تھا، اور وہ اپنا اعتبار و اعتماد قائم رکھنے کیلئے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ناکامی کی توجیہ کرنا شروع کر دیتا تھا، یہ تھی ابتدا اُس جھوٹ کی جو سب سے پہلے ارباب مذہب کی طرف سے بولا گیا، اور جس نے آگے چلکر تمام دنیا کو مکر و فریب میں مبتلا کر دیا۔

بت پرستی ارتقاء تمدن کے ساتھ انسان کے خیالات میں بھی ترقی ہوئی۔ وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھتا اور اُن پر غور کرتا تھا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ طوفان کیوں آتا ہے؟ آگ کیوں بھڑکتی ہے؟ دریا کیوں بہتا ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے؟ بارش کیوں ہوتی ہے؟ شیر و نہنگ اسقدر طاقتور و موذی کیوں ہیں؟ نباتات ہر سال از سر نو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس کے ذہن کی طرف سے یہ ملتا تھا کہ یہ سب ارواح کے کرشمے ہیں۔ چنانچہ ہر بات کے لئے ایک بت قائم کر دیا گیا اور پوجا ہونے لگی۔

قاعدہ ہے کہ چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے، جب چھوٹی چھوٹی ارواح کا خیال آیا تو اسکے بعد قدرت کی بڑی بڑی باتوں کا خیال آنا ضرور تھا۔ اس لئے سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین، بارش، بجلی، رعد وغیرہ کو بڑے بڑے دیوتاؤں سے منسوب کر کے اُن کے ہیکل قائم کئے گئے اور اسطرح دنیا میں بت پرستی کی ابتدا ہوئی۔

توحید جس طرح ایک قبیلہ دوسرے کو مغلوب کر کے طاقتور ہو جاتا تھا، اسی طرح بعد کو جب ایک بادشاہ نے دوسرے فرمانرواؤں کو مغلوب کر کے اپنا تابع بنا لیا اور شہنشاہ ہو گیا تو انسان کا خیال دنیائے پرستش میں بھی اسی اُصول پر کار بند ہوا، اور اُسنے سمجھا کہ دیوتاؤں میں بھی کسی ایک دیوتا کو سب پر غالب آنا چاہیئے، اور اسطرح سب سے پہلے توحید کی بنیاد انسان کے دل میں پڑی۔

الحاد لیکن انسان کے دماغ کو قرار نہیں۔ جوں جوں عقل میں پختگی آتی گئی خیالات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی، تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کی بنیاد پڑی، کتابیں لکھی جانے لگیں۔ وسعت خیالات کے ساتھ عقائد پر مناظرے شروع ہو گئے، جن اُمور کا منصرم بتوں یا دیوتاؤں کو سمجھا جاتا تھا، اُن کے اسباب و علل کچھ اور نکل آئے۔ کیں

گیس کا کرشمہ نظر آیا۔ کہیں برق و بخار کا عمل اور اسیطرح تمام حوادث قدرت کی توجیہیں ہونے لگیں، یہ تھا سلسلہ مذہب جو مذہب کو اب سے دو تین ہزار سال قبل پہونچا اور جسے دنیا الحاد سے تعبیر کرنے لگی۔

مذاہب اخلاق

یہ حال اُن مذاہب کا تھا جنھیں "مذاہب فطرۃ" (Nature Religions) کہتے ہیں لیکن بالکل اسی طرح سے ایک دور ارتقاء اُن مذاہب کی بھی ہوئی ہے، جنھیں "مذاہب اخلاقی" (Ethical Religions) کہتے ہیں۔ اسمیں کلام نہیں کہ مقتدایان مذہب اول اول اسی پر زور دیتے رہے کہ دیوتاؤں کی پوجا کرو، بھینٹ چڑھاؤ، قربانیاں کرو اور پجاریوں سے مدد لیکر ان کو نذر دو، لیکن جب رفتہ رفتہ انھیں تعلیم بڑھی تو انھوں نے انسان کی اہلی زندگی پر بھی اقتدار قائم کر دیا، اور معیشت و معاشرت کے آئین و قوانین بنا کر انھیں دیوتاؤں سے منسوب کیا یہی تھی بنیاد مذہب اخلاق کی۔

کتب مقدسہ

اول اول پوجا پاٹ کی رسمیں اجزاء اسرار سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں، لیکن جب بعد کو انسان نے حروف ایجاد کئے اور وہ لکھنے پڑھنے لگا تو مقتدایان دین نے ان ابتدائی اعتقادات اور قدیم رسوم کو مدون کرنا شروع کیا۔ چونکہ حافظہ زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے انھوں نے سُنی سُنائی باتوں سے ان کتابوں کو بھر دیا لیکن اسی کے ساتھ اپنی قوم کی عظمت و شان بھی بیان کی۔ پرانے بادشاہوں اور قوموں کے کچھ قصے بھی داخل کئے، اپنے معبود کو تمام معبودان عالم سے غالب قرار دیا۔ اور اپنی قوم کو خیر الامم ظاہر کیا۔ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اُن کا مذہب ابتدائے آفرینش سے اسیطرح چلا آتا ہے۔ اور ہر جگہ اپنے خدا کی بزرگی اور جلال کا اظہار کیا۔

اب چونکہ احیاء علوم و فنون کا زمانہ ہے۔ تمام باتیں سائنس کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ماہرین فن نے "علم معیار المذاہب" اور "علم تقابل المذاہب" بھی ایجاد کیا ہے جس سے مختلف مذاہب کو بالمقابل رکھکر جانچا جا سکتا ہے علاوہ ازیں ماہرین آثار قدیمہ نے تمدن قدیم کے وہ تمام خزائن برآمد کرلئے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے کتب مقدسہ کے بیانات کی بخوبی جانچ کی جاسکتی ہے۔

قدیم مذاہب دراصل مظاہر قدرت کے متعلق جاہل اقوام و ملل کی سیدھی سادی خیال آرائی سے زیادہ کوئی چیز نہ تھے۔ لیکن جب بعد کو ان میں کچھ علمی تاویلیں اور اخلاقی اُصول شامل ہوگئے۔ تو مقتدایان دین یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ ان کا مذہب "الہامی" ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب دوسرے کا مضحکہ اُڑانے لگا۔ کیونکہ مذہب کا صحیح علم صرف طبقۂ علماء تک محدود رہا۔ اور عوام کو اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ تاہم تقابل مذاہب سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب دوسروں سے نسبتاً اعلیٰ ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو مذہب سب سے آخر میں ظاہر ہوا ہوگا وہ سب سے بہتر ہوگا۔

مذاہب تاریخی

موجودہ تہذیب و تمدن کا آغاز اب سے پانچ چھ ہزار سال پیشتر ہوا، لیکن ایک جگہ نہیں بلکہ اسکی ابتدا کئی جگہ سے ہوئی، سب سے پہلے تمدن کی ابتدا کریٹ، مصر اور عراق میں ہوئی۔ یہ تینوں ملک قریب قریب واقع ہیں۔ اور اب سے پانچ چھ ہزار سال قبل سرزمین کریٹ علیحدہ جزیرہ نہیں تھی۔ بلکہ مغربی ایشیا کا ایک حصہ تھی۔ الغرض ان تینوں ملکوں نے اپنا اپنا تمدن تقریباً ایک ہی ساتھ شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ اسقدر ترقی کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار تصویروں کے ذریعہ سے کرنے لگے۔ جسے "خط تصویری" کہتے ہیں۔

کریٹ

کریٹ (Crete) کا تمدن بھی اسیقدر اعلیٰ تھا، جیسا ملک مصر کا۔ اور ہر چند ابھی تک وہاں کی قدیم زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا۔ لیکن وہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کوئی "مذکر دیوتا" نہیں تھا۔ صرف ایک "دیوی" کی پرستش ہوتی تھی۔ اور اس دیوی کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی بنائی جاتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دیوی دراصل "دھرتی ماتا" تھی۔ گویا اہل کریٹ کا مذہب اس درجہ سے آگے نہیں بڑھا تھا، جب صرف مظاہر قدرت کی پرستش کی جاتی ہے۔

مصر

اہل کریٹ ہی کی جنوبی شاخ مصر قدیم کا مذہب معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند دونوں کے معتقدات مذہب اور مذہبی رسوم میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی اگر کریٹ میں صرف ایک "دیوی" تھی تو مصر میں دیوتاؤں اور دیویوں کی خاصی فوج موجود تھی۔ اور ان دیوتاؤں اور دیویوں کے پجاری بھی مختلف تھے۔ ان لوگوں میں حیات عقبیٰ کا وہی عقیدہ موجود تھا جو آج کل مسیحیت یا اسلام میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا "ہمزاد" حنوط شدہ لاش کے ساتھ قبر میں رہتا ہے۔ اور اس کی روح جزا و سزا کے لئے خداوند اوسیرس (Osiris) کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو عالم ارواح کا بادشاہ ہے۔ اگر اس روح کی بداعمالیاں نیکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں تو وہ روح تباہ یا فنا کر دی جاتی ہے۔ اگر روح کی نیکیاں اس کی بداعمالیوں سے زیادہ ہیں تو اسے "مسرت ابدی" کی حالت بخش دیجاتی ہے۔

مصری مذہب کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جانور کا سا سر رکھنے والے دیوتاؤں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ حالانکہ جس قوم کا تمدن اسقدر اعلیٰ رہا ہو، اس کو ایسے عجیب الخلقت خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ لیکن مطالعہ "مصریات" سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کا صرف "طبقہ جہلا" ایسے دیوتاؤں کا معتقد تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا۔ پجاریوں کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے مختلف دیوتا بنالئے تھے۔ جن پر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ علاوہ اسکے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وادی النیل" میں مختلف قومیں مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئی تھیں۔ اور اسی لئے ان دیوتاؤں کو مختلف ہونا چاہیئے تھا۔ کسی قوم کا خدا سورج تھا، کسی کا چاند، کسی کا عقاب، کسی کا گھڑیال، کسی کا بیل

اور کسی کا بیٹا[۵]۔ ان مختلف دیوتاؤں کے پجاری مدتوں تک خانہ جنگی کراتے رہے اور آخرکار صدیوں کی لڑائی کے بعد مسیح سے چودہ سو برس قبل ان تمام اقوام کو ایک بادشاہ نے فتح کر کے انھیں پوری طرح منظم کیا اور ایک قوم بنا دیا۔ یہ بادشاہ امان حاطب رابع (Amen Hotab IV) تھا۔ اس بادشاہ نے نہ صرف یہ کیا کہ مصریوں کو ایک قوم بنا دیا۔ بلکہ ملک میں ایک خالص روحانی مذہب بھی قائم کیا جو بڑی حد تک توحید کا درس دیتا تھا۔

بابل اب سے تقریباً پانچ چھ ہزار سال قبل وادی فرات کے مختلف علاقوں میں طوائف الملوکی قائم تھی۔ جگہ جگہ بہت سے آزاد شہر آباد تھے۔ اور ہر شہر ایک جداگانہ خودمختار ریاست تھا جس میں حکومت مقتدایانِ دین کی تھی۔ اگرچہ بابل کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن اسیقدر بتا دینا کافی ہوگا کہ تمام ملک میں دو قومیں پورے اختلاط و ارتباط کے ساتھ بستی تھیں۔ اُن میں ایک قوم سامری (Samerians) اور دوسری سامی یا ساماتی (Semitic) تھی۔ دونوں قومیں شیر و شکر کی طرح ملی ہوئی تھیں حتیٰ کہ دونوں قوموں نے اپنے اپنے معبود بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ لوگ کسی حیوان پیکر دیوتا کے پرستار نہیں تھے۔ لیکن جب کامیاب پجاریوں نے اپنے دیوتاؤں کی عظمت و جلال کو فروغ دیا تو بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوتا بن گئے۔ سامریوں کے دیوتاؤں میں بڑے بڑے دیوتا سنو و لیقل (Sna ANDBAAL) خدائے آسمان) آیا (EA) دھرتی ماتا) سِن (SIN) چندرمان) نوسکو (NUSKU) اگنی) وغیرہ تھے۔ اور سامیوں کے بڑے دیوتا اور دیویاں یہ تھیں:۔ شمس (SHAMSH) سورج) مردوق (MARDUKo) سورج) اشتار (ISHTAR) عشق و محبت اور جنگ و جدال کی دیوی) تموز (SHAMMUZ) افزائش نسل و فصل کا دیوتا)

جب یہ تمام ریاستیں ملکر سلطنت بابل قائم ہوئی، اُسوقت بھی مقتدایانِ دین کی خصومت بدستور پائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اسقدر اور آخرکار وہاں کا مقامی خدا مردوق سب سے بڑا خدا بن بیٹھا، جس کے بعد شمس کا دور دورہ ہوا۔

الغرض ارتقاء تمدن کے ساتھ تہذیب معتقدات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور دیوتاؤں کی شخصیت میں زیادہ تجرید اور روحانیت پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ اشتار جو پہلے فسق و فجور کی دیوی تھی اور جس کے بھون میں مقدس حرامکاری ہوا کرتی تھی وہی درماندگان معصیت کی جائے پناہ اور زاہدان مرتاض کی سرپرست بن گئی۔

چین یہ امر باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ملک چین کی قدیم تہذیب و تمدن کا ابتدائی سرچشمہ مغربی ایشیا تھا۔ اسی لئے قدیم چین کا تمدن، بابل کے تمدن سے ملتا جلتا تھا۔ ہر چند چینیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اون کا تمدن کم از کم بیس[۲۰] ہزار

---

[۵] بعض قدیم مصری دیوتاؤں کے نام یہ ہیں:۔ اوسیریز (Osiris) "مالک یوم الدین" رع (Ra) "سورج" ہورس (Horus) نجات دہندہ) آئسس (Isis) افزائش نسل زراعت کی دیوی) ایپت (Nut) دولت و خوشحالی کی دیوی) آتور (Hathor) گائے سر دیوی یا دھرتی ماتا) انوبیس (Anubis) سگ سر دیوتا محافظ قبرستان)

سال کا ہے۔ لیکن محققین کا خیال ہے کہ اسکی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔

قدیم چین کے مذہب کا حال اُن مغول قبائل کے معتقدات و رسوم سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو حدود چین کے اندر یا اُن کے متصل آباد تھے۔ یہ قومیں چکچی۔ یوکا غیر۔ قزاق اور تانیو تھیں۔ چکچیوں کے نزدیک درخت، جنگل، جھیل، دریا وغیرہ ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ جسے ان کی اصطلاح میں "آقا یا مالک" کہتے تھے۔ مرجانیوالوں کی روحیں سعید ہوں یا خبیث زندہ سمجھی جاتی تھیں خبیث ارواح کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ دیہات و ریگستان میں رہتی ہیں۔ اور لوگوں کو ستاتی ہیں، انھیں وہ لوگ شیاطین کہتے تھے چونکہ یہ ارواح خبیثہ لوگوں کو بہت ستاتی تھیں، اس لئے جھاڑ پھونک والوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی۔ جنھیں وہ لوگ "دشمن" کہتے تھے۔

انیس ایک بڑا دیوتا بھی تھا، جسے وہ اپنی زبان میں "جان بخش" (آفریدگار) کہتے تھے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے) ہندوؤں میں بھی "آفرینندہ" دیوتا برہما ہے۔ لیکن اسکی پرستش نہیں ہوتی)، یوکاغیروں اور قزاقوں میں بھی ایک آسمانی خدا تھا، اور ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اُس کے حضور میں جانوروں کی قربانی دینے میں کوتاہی کیجاتی ہے تو وہ ناراض ہو کر سو جاتا ہے اور پھر دنیا میں "فساد" پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ تھی ابتدائی حالت چین کے معتقدات کی۔

قدیم چینیوں کے مذہب میں بھی عام دیوتاؤں پر ایک "مہا دیو" تھا جسے وہ لوگ "شنگتی" (اعلیٰ آسمانی بادشاہ) یا "تین" (آسمان) کہتے تھے جو سب سے بلند مرتبہ کا معبود خیال کیا جاتا تھا، الغرض یہاں مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل ایک "آسمانی خدا" کا عقیدہ ضرور موجود تھا، اگرچہ طبقہ عوام و جہلا میں چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں دولت چین پر ادبار و زوال کی گھٹائیں چھائیں۔ عالم فساد طاری ہو گیا۔ اسوقت ملک میں دو شخص ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کو ظلمت و جہالت سے نکالنا چاہا ایک کا نام لاؤ تشہ (Laotse) تھا اور دوسرے کا نام کانگفوتشہ (Confucius = Kong Fu Tse = کنفوش) یہ دونوں "لاادریت" (Agnosticism) کے قائل تھے اور اُن کے اثر سے تعلیم یافتہ چین اب سے اڑھائی ہزار سال پیشتر درجۂ "لاادریت" کو پہونچ گیا تھا۔ لاؤتشہ نے جسے فارسی زبان میں "لوشا" کہتے ہیں مذہب "تاؤئیت" (Taoism) قائم کیا (لفظ "تاؤ" کے معنی چینی زبان میں صراط مستقیم کے ہیں) لیکن بعد میں یہ مذہب "بودھیت" (Budhism) سے ملکر مجموعۂ اوہام ہو گیا۔

حکیم کنفوشا کی تعلیم بھی لاادریت پر مبنی ہے، اور اسکا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ روحانی ہستیوں کا احترام کرتے ہوئے ان فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے جو اس پر از روئے حقوق العباد عائد ہوتے ہیں۔ روحانیات میں مبتلا ہونا مناسب نہیں۔ یہ مذہب صرف مجموعۂ ضوابط اخلاق ہے۔ جس پر اڑھائی ہزار برس سے چین کا روشن خیال طبقہ عامل ہے۔

جاپان

جاپان کے تمدن و شائستگی میں چین کا اسقدر حصہ ہے کہ جاپان کو اس سے علحدہ کرنا فضول ہے۔ جاپان میں عوام کا مذہب شنتوئیت (Shintoism) ہے جو چین کے مذہب تاؤئیت کا مترادف ہے۔ علاوہ ازیں چین کی

ہر دیوتا کے پجاری علیحدہ ہوتے ہیں۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دیوتا حسب المطلب "اُن کے سر آتے ہیں" (ہندوؤں کی چھوٹی اور جاہل قوموں کا بھی یہی عقیدہ ہے)، ان کے علاوہ بڑے بڑے دیوتا الگ ہیں، سب سے بڑا دیوتا "زندگی کا دیوتا" یعنی آفریدگار ہے۔ جس کی جائے قیام آفتاب ہو (یہ وہی دیوتا ہے جو ہندوؤں میں "سورج نارائن" کہلاتا ہے) ایک دیوی آسمان کی لافانی "بڑھیا" ہے جو چاند میں رہتی ہے (چنانچہ یہاں بھی عوام میں مشہور ہے کہ چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے) اول الذکر دیوتا کی ایک عجیب کرامت بتائی جاتی ہے یعنی قبائل کہتے ہیں کہ جب یہ دیوتا اپنے سر میں کھجاتا ہے تو زمین پر بارش ہوتی ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اُنمیں بعض قومیں زیادہ متمدن اور شائستہ ہوتی گئیں۔ اور اسی نسبت سے اُن کے معتقدات مذہبی میں بھی رفعت پیدا ہوئی۔ ان اقوام متمدن میں ایک قوم مایا (MAYA) تھی۔ اس قوم میں قدیم آریوں کی طرح ہوا کا دیوتا (ہندوؤں کا وَرُون)، بارش کا دیوتا (آریوں کا اندر) افزائش نسل و فصل کی دیوی (گورا پاربتی یا پرتھوی) موت کا دیوتا (آریوں کا یم سوراج) وغیرہ موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے پجاری نہایت دولتمند اور اُنکے مندر نہایت عالیشان تھے۔ مندر کا متولی نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا تھا۔ مایا قوم میں دو زبردست قومی ہیرو ایسے گذرے تھے جنھیں دیوتا بنا دیا گیا تھا۔ ان میں ایک کا نام کوکل کان (KUKALCAN) تھا (ممکن ہے "کوکل کان" دراصل "گوکل کا نھیا کا تھا" رہا ہو جو سری کرشن جی کی عرفیت ہے۔) اس قوم میں انسانی قربانی کا رواج تھا، جسے کوکل کان نے منع کر دیا تھا۔ شہر چیچن اِتزا (Chichen Itza) میں ایک مقدس تالاب تھا۔ جس میں قربانی کے انسانوں کا خون ڈالا جاتا تھا۔ قومی ضرورت کے وقت سینکڑوں جوان اور کنواری لڑکیاں دیوتا پر قربان کر دی جاتی تھیں۔

پیرو (PERU) میں بھی یہی تمدن تھا۔ لیکن زیادہ تر ترقی یافتہ وہاں کے لوگ بھی شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ان چھوٹے دیوتاؤں کے ساتھ بڑے بڑے دیوتا بھی اُنکے یہاں موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے بُت ٹھوس سونے کے بنائے جاتے تھے جنھیں نہایت عالیشان اور خوبصورت مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ انکے علاوہ وہی پرانے دیوتا۔ بارش۔ بادل اور بجلی وغیرہ کے بھی پائے جاتے تھے۔ آخری زمانہ میں سورج کا درجہ سب دیوتاؤں پر غالب ہو گیا تھا۔ جسکی خدمت کے لئے مندر میں حسین و جمیل لڑکیاں رکھی جاتی تھیں (جنوبی ہند کے مندروں میں بھی ایسی دیوداسیاں موجود رہتی ہیں)

امریکہ کی دوسری قدیم قوموں میں ایک قوم تولتیق (TOLTECS) تھی جو میکسیکو میں پھیلی ہوئی تھی۔ تمام ملک میں اسس قوم کے عالیشان آثار قدیمہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قوم کا صنم اکبر قوتیزالکوتل (Quetzalcoatl) تھا جسکے معنی "پردار سانپ" کے ہیں۔ یہ دیوتا اس قوم کا "آفریدگار" تھا۔ لیکن روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل "چندرمان دیوتا" تھا۔ پھر وہ ہوا کا دیوتا بنگیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نام کا ایک بادشاہ تھا جس نے انسانی قربانی کی رسم بند کر دی تھی، ایک روایت میں لکھا ہے کہ اس صنم اکبر کی ایک بیوی بھی تھی۔ جسے وہ لوگ اپنی زبان میں تیزکاتلی پوقا (TEZCATLIPOCA) (اندھیرے پکش کا چاند) کہتے تھے۔ یہ اخلاقیات کی دیوی تھی اور گنہگاروں کے اعمال

کی جانچ اور جزا و سزا کا کام اسی کے سپرد تھا۔

امریکہ کی ایک اور متمدن قوم آزتیق (AZTEC) تھی۔ اس قوم کا صنم اکبر سورج تھا جس پر وہ انسان کی بھینٹ چڑھاتے تھے انسانی قربانی کا اسقدر رواج کسی دوسری قوم میں نہ تھا۔ ان کے قدیم دیوتاؤں میں چند رمان دیوتا، ستارۂ صبح کی دیوی[1] افزائش نسل و فصل کی دیوی[2] اور اوسٹر یلو پوچتلی (HUITZILOPOCHTLI) جنگ کا دیوتا تھے۔

الغرض اول اول اہنیں۔ سورج۔ چاند۔ ہوا۔ بارش۔ آگ۔ رعد وغیرہ سب کے دیوتا موجود تھے۔ اور بعد کو یہ سب دیوتا ملا کر صرف ایک دیوتا بنایا گیا تھا اور اسی کو جزا و سزا کے اختیارات دیئے گئے تھے۔

مذاہب عجم جسطرح کوئی بڑا دریا اپنے سرچشمہ سے نکلکر وادی کے خشک علاقوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بیسیوں ندی نالے آ کر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہب بھی مختلف زمانوں میں مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بھی اِدھر اُدھر کے مختلف خیالات و معتقدات داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا مذہب جسے سب سے پہلا آسمانی یا الہامی دین بتایا جاتا ہے۔ مذاہب بابل۔ مصر۔ ایران اور یونان کا رہین منت ہے۔ اور انجیل میں تو ایران کے مذہب کا بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک کے اس علاقہ سے جہاں قدیم زمانہ میں آریا قوم کی ہندی ایرانی شاخ آباد تھی، اہل ایران نقل و حرکت کر کے ان کوہستانوں میں جا بسے جو عراق کے شمال میں واقع ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ لوگ بحالت گمنامی دخانہ بدوشی پھرتے رہے۔ اسوقت ان کا مذہب وہی تھا جو قدیم ہندوؤں کا تھا۔ رفتہ رفتہ بابل و آشوریہ کے شاندار تمدن وجود میں آئے جنھوں نے وادئ فرات و دجلہ کو رشک جنت بنا دیا۔ ان کی شان و شوکت اور جلالت و عظمت دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں جب روز روز کی جنگ و جدال سے دونوں تمدن خاک میں مل گئے اور بابل و نینوا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ تو دنیا کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھ آئی۔

ان قدیم ایرانیوں کی مقدس کتب ژند و اوستا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی حسب معمول بیشمار روحوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ہر ملک۔ صوبہ۔ شہر۔ گاؤں۔ دریا اور درخت وغیرہ کا ایک دیوتا تھا اور روحوں کے بقا کے قائل تھے، اُنکے یہاں سعید اور خبیث دو قسم کی روحیں تھیں، ان سب پر ایک آسمانی خدا تھا جس کا نام مترا (MITHRA) ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مذہب کے اور دیوتا بھی پائے جاتے تھے، مگر بعد میں ایرانی اور ہندو مذہب میں بہت کچھ اختلاف ہو گیا۔ ہندوؤں کا

---

[1] جیسے یونانیوں میں وینس (VENUS) رومیوں میں جونو (JUNU) آشوریوں میں اشتارتہ (ASTARTE) عربوں میں زہرہ اور ایرانیوں میں ناہید کہتے تھے۔ [2] مصریوں کے یہاں آتور (ATHOR) کے نام سے یونانیوں کے یہاں آفرودیتہ (APHRODITE) کے لقب سے اور ہندوؤں کے یہاں پاربتی و پرتھوی کے نام سے موسوم تھی۔

"دیو" ایران میں "شیطان" بن گیا۔ اور جو ہستی ہندوؤں میں "اسُر" کہلاتی تھی وہی ایران کا "آہورا" بن گئی۔ علاوہ ازیں ماحول اور آب و ہوا کے اثر سے دیگر اختلافات بھی پیدا ہو گئے لیکن "اگنی پوجن" (آگ کی پوجا) دونوں میں بدستور باقی رہی۔

چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایران کے اندر ایک جدید مصلح یا پیغمبر کا ظہور ہوا جس کا نام "زرتشترا" اور زرتشت یا زردشت ہے۔ اس پیغمبر نے مذہب ایران کی صورت بدل دی اور اسمیں زیادہ پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہو گئی۔ زرتشت میں چھوٹے چھوٹے دیوتا سب غائب ہو گئے۔ صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں۔ آہورا مزدا (خدائے خیر) اور اہرمن (خدائے شر) یا بالفاظ دیگر یزدان و شیطان۔ اس مذہب میں بھی مصریوں کی طرح یہ عقیدہ موجود تھا کہ انسان کی روح بعد موت باقی رہتی ہے اور اعمال نیک و زشت کی جزا و سزا ملتی ہے۔ لیکن زرتشت نے اس عقیدہ کو اور زیادہ تقویت دی۔ نیکو کاری اور پاکدامنی پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ قوت خیر کے علاوہ ایک زبردست قوت شر بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بیشمار "اخوان الشیاطین" موجود ہیں۔ آہورا مزدا یعنی قوت خیر نے ڈھیل ڈال رکھی ہے۔ لیکن وہ بالآخر ان تمام شیاطین کا استیصال کردے گا۔ اُسوقت "آسمانی سلطنت" کا دور دورہ ہوگا۔ پہلی دنیا بذریعہ آتش تباہ کردی جائیگی۔ تمام شیاطین ہلاک ہو جائینگے نیکو کاروں کو مسرت ابدی کا انعام ملے گا جن لوگوں کے اعمال زشت ہیں انھیں میعادی سزائیں ملیں گی۔ لیکن جب وہ گناہوں سے پاک ہو جائیں گے تو بہشت میں داخل کردئے جائیں گے۔ اور بالآخر بہشت ہی بہشت رہجائے گی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس مذہب کے عقائد میں اختلال پیدا ہوا۔ بابلی تمدن کا اثر رنگ لایا۔ پرانا خدا متھرا (MITHRA) جو قدیم زمانہ میں ایک موہوم آسمانی دیوتا تھا۔ اب آہورا مزدا کے بجائے تخت اجلال پر آبیٹھا اور مستقل طور پر "سورج نارائن" ہو گیا۔

ایران سے یہ مذہب "مترائیت" رومی دنیا میں پہونچا۔ جو ابتدائے مسیحیت کے وقت تک روم میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر سال ۲۵ دسمبر کو متر دیوتا کا جشن میلاد منایا جاتا تھا جسکی ولادت ایک پوشیدہ غار میں ہوتی تھی۔ (یہی زمانہ سورج نارائن کی "پیدائش" یعنی آغاز عروج کا ہوتا ہے اور دن بڑا ہونے لگتا ہے) مترا کے بھگتوں کو خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔ اور وہ سخت ریاضتیں کیا کرتے تھے۔

فلسطین

ارض فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جسکا محل وقوع اسطرح واقع ہوا ہے کہ اسکے چاروں طرف بڑی بڑی سلطنیں واقع تھیں۔ یعنی مشرق میں بابل، جنوب مغرب میں مصر، شمال میں سلطنت حطیون (HITTILES) سواحل پر فنیقیہ (PHOENICIA) ان تمام سلطنتوں کی فوجیں اور سوداگروں کے قافلے فلسطین سے گذرتے تھے جن کا سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ آخر میں آکر ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس ملک کو روند ڈالا۔

یہ باور کرنیکے لئے کافی وجوہ ہیں کہ جس پُراسرار قوم کو قدیم عبرانی "فلسطینی" (PHILISTINES) کہا کرتے تھے وہ دراصل جزیرہ کریٹ سے ہجرت کر کے آئی تھی۔ اور اپنے ساتھ سلیمان سے بھی پہلے کا قدیم تمدن لائی تھی۔

مسیح سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے جب عبرانی قوم عراق سے ہجرت کر کے صحرا و بیابان کو عبور کرتی ہوئی حدود شام میں پہونچی تھی۔ اسوقت وہ بمشکل متمدن و مہذب کہی جا سکتی تھی۔ ان کا قومی معبود یاہوہ (JEHOUAH) تھا۔ یہ آسمانی خدا غالباً اسی قسم کا تھا جسطرح دیگر قدیم اقوام وملل میں آسمان، سورج و رعد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ اگر عہد نامۂ عتیق کے ابتدائی صحف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے مضامین معیار اخلاق سے اسقدر گرے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کا اور اخلاق مصر، بابل و ایران کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول اول یہ ایک خانہ بدوش پہاڑی قوم تھی، جسکا مشغلہ صرف مویشی پالنا تھا۔ اسکے بعد جب گرد و نواح کے تمدن کا اثر پڑا تو اُن کے خیالات میں وسعت و رفعت پیدا ہو گئی، اور جب ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں زیادہ روشن خیال "انبیاء بنی اسرائیل" پیدا ہوئے تو معیار اخلاق اور بلند ہو گیا جیسا کہ ان کے صحف سے ثابت ہوتا ہے۔ پانچویں صدی میں جب بنی اسرائیل گرفتار ہو کر بابل گئے تو وہاں کی باتیں بھی اُنھوں نے سیکھیں۔

اسکے بعد مسیح اور ارتقاء مسیحیت کا زمانہ آیا۔ اور عبرانیوں کا فطری مذہب کسی قدر ترمیم و تہذیب کے بعد دنیا کا آدھا مذہب بن گیا۔

یوروپ

اقوام فن (فنلینڈ FINNLAND) مجار (MAGAYARS باشندگان ہنگری) اور ترک کے علاوہ جتنی ایشیائی قومیں ہیں وہ اور یوروپ کی تمام اقوام وملل قوم آریا کی نسل سے ہیں۔ جو ایرانیوں اور ہندوؤں کی مورث اعلیٰ تھی ایک شاخ اس قوم کی جانب مغرب پہونچی اور سواحل بحیرہ بالٹک پر مستقر ہو گئی۔ یہ تیوتانی (TEUTONS) کہلائی دوسری شاخ جانب جنوب گئی اور یونان و اطالیہ پر قبضہ جمالیا۔ تیسری شاخ وسطی ممالک میں رہی اور وہ اب سلافی (SLAVS) کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ یوروپ کی تمام قدیم اقوام کا مذہب تقریباً ایک ہی تھا۔ یونانیوں کا سب سے بڑا آسمانی دیوتا زیوس (ZEUS) تھا جو روم میں جیوپتر (JUPITAR) کہلایا اور ہندوؤں میں اسی کو دیو پتر کہنے لگے۔ دراصل ان تمام ناموں کا مادہ لفظ دیو (DEVA) ہے۔ یونانیوں اور رومیوں کی "دھرتی ماتا" اس آسمانی باپ کی بیوی تھی، دونوں قوموں میں جنگ کا دیوتا موجود ہے۔ جو یونان میں "ایریس" (ARES) اور رومیوں میں "مارس" (MARS) کہلایا۔ آگ کا دیوتا یونانیوں میں ہفاستوس (HEPHAESTOS) اور رومیوں میں ولکن (VULCAN) ہوا (اور یہی قدیم ہندوؤں کا اگنی تھا) پانی کے دیوتا کا نام یونانی زبان میں پوسی آڈن (POSEIDON) اور رومی زبان میں نیپچون (NEPSTUNE) ہے (اور یہی ہندوؤں میں شاگرد دیوتا کہلاتا ہے) یونانیوں میں عشق و محبت کی دیوی آفرودیتہ (APHRODITE) ہے اور رومیوں میں وینس (VENUS) کہلاتی ہے وہی بابلیوں کی اشتار۔ عربوں کی زہرہ اور ایرانیوں کی ناہید ہے۔

ناروے۔ سویڈن۔ جرمنی۔ اور انگلستان کے قدیم باشندے بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔ ہفتہ کے دنوں کے ناموں پر غور فرمائیے۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا مثلاً سنڈے (SUNDAY = آفتاب کا دن۔ ہندی آدتوار یا اتوار) منڈے (MONDAY = MOONSDAY = چاند کا دن) ٹیوزڈے (TUESDAY = TUISCOSDAY = MERCURYSDAY)

وڈنسڈے (WEDENSDAY = MARS DAY = WODENSDAY) ووڈن اور مارس دونوں جنگ کے دیوتا ہیں۔
اسی طرح جوپٹر کو تھورس (THOR S) کہا جاتا تھا جس سے تھرسڈے (THURSDAY) بنا، وینس کو فریجا کہتے تھے
اس سے فریجا سڈے (FRIDAY) اسی طرح سٹرڈے دراصل سٹیرن (SATURN) (زحل) سے بنا۔

ان ناموں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ قدیم اقوام یورپ کا مذہب دراصل مظاہر فطرت کا مذہب (NATURE RELIGION) تھا۔ اور اسکے علاوہ۔ درختوں۔ دریاؤں۔ جنگلوں۔ کنوؤں وغیرہ کے بھی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ (ہندوؤں میں اسی قسم کے سینکڑوں دیوی اور دیوتا موجود ہیں۔) الغرض عہد تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے تمام یورپ کا وہی قدرتی مذہب تھا جو دیگر اقوام عالم کا تھا۔ دیوتاؤں اور دیویوں میں بعض بزرگان قوم بھی شامل کر دئے جاتے تھے (جیسے ہندوؤں میں رام اور کرشن موجود ہیں) یونانیوں کے آسمانی دیوتا کوہ اولمپس (OLYMPU S) پر رہتے تھے اور وہیں انکی بہشت تھی۔ اسی طرح ایرانیوں کی بہشت بھی کوہ البرز پر تھی۔ اور ہندوؤں کے دیوتا کیلاش اور میرو پربت پر رہتے ہیں۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ یونانیوں کے خیالات میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ حکما رکے خیال سے تمام مختلف دیوتا محو ہو گئے۔ اور وہ آخر میں توحید پرست ہو گئے۔ چنانچہ سقراط۔ فلاطون اور ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ لیکن حکیم زینو (ZENO) اور ابیقورس (EPICURUS) ملحد تھے وہ کسی خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔

مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یونانیوں نے یورپ کے قدیم قبائل کا دیوتا "دیونی سوس" (DIONYSOS) بھی اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔ یہ دراصل شراب اور فسق و فجور کا دیوتا تھا۔ یہ ہر سال مرتا اور دوبارہ زندہ ہوتا تھا۔ انکے تہوار خاص اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ سوانگ اور تماشے ہوتے تھے۔ جلوس نکالے جاتے تھے۔ لیکن دراصل ان تہواروں سے مقصد اس حقیقت کی یاد دلانا تھی کہ ایک بار زمین کی قوت نمو مر جاتی ہے۔ جسے خزاں سمجھنا چاہیئے۔ اور پھر پیدا ہو جاتی ہے، جو موسم بہار ہے۔ مصر۔ شام اور بابل میں بھی اسی قسم کے تہوار منائے جاتے تھے جنمیں دیوتا مر کر زندہ ہوتا تھا۔

الغرض جملہ مذاہب قدیمہ پر سرسری نظر ڈال کر یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ (۱) عہد وحشت میں انسان کا اعتقاد یہ تھا کہ اسکا ایک سایہ یا ہمزاد ضرور ہے اور مرنے کے بعد روح اسی دنیا میں رہتی ہے (۲) روحیں سعید و خبیث دو قسم کی مانی جاتی تھیں جو انسان کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکتی تھیں۔ (۳) قدرت کی ہر چیز میں روحوں یا دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا اور سینکڑوں بن گئے۔ (۴) متعدد دیوتاؤں میں سے چند کو بلند مرتبہ دیکر مذہب میں رو[حانیت] پیدا کی گئی (۵) متعدد دیوتاؤں کو باہم ملا کر ایک بڑا دیوتا بنایا گیا۔ اور اس طرح توحید کی طرف میلان ہوا۔ (۶) توحید پرستی کے اندر ہی غور و خوض کرتے ہوئے روحانیات الٰہیات سے لاادریت پیدا ہوئی اور احکام مذہب احکام اخلاق و حسن معاشرت بنگئے۔ (۷) روحانیت غائب ہونے کے بعد ذات واجب الوجود کا اعتقاد متزلزل ہوا اور الحاد کی بنیاد پڑی۔ جیسا کہ فرانس اور امریکہ میں آج کل نظر آ رہا ہے۔

مسیحیت | قدیم موسوی یا یہودی مذہب میں چند ترمیمیں کرنے کے بعد عیسائی مذہب بنایا گیا۔ اس کی تعلیم اخلاقی ہے۔ ہر

بات میں تزکیہ نفس بلکہ نفس کشی کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اس مذہب کے بانی مسیح خیال کئے جاتے ہیں۔ اناجیل اربعہ جن میں مسیح کی سوانحعمری اور اُنکی تعلیم ہے، وفات مسیح کے بہت دنوں بعد اُنکے حواریئن نے لکھی تھیں۔ مسیح کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ (۱) وہ اپنی والدہ مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مریم کنواری تھیں۔ اسلئے مسیح ابن اللہ ہیں (۲) یسوع نے حسب اقتضاء وقت شریعت موسوی میں ترمیم و تنسیخ کی اور ایک جدید اصلاح شدہ مذہب اخلاق جاری کیا (۳) علماء یہود نے یسوع پر بغاوت کا الزام لگایا اور رومی حاکم کے فرمان سے وہ مصلوب کرکے دفن کردئے گئے (۴) تین دن بعد وہ اپنی قبر سے زندہ ہوکر باہر نکلے۔ اور اپنے شاگردوں سے مل کر انھیں آخری ہدایات کیں۔ اور پھر آسمان پر اپنے باپ خدا کے پاس چلے گئے۔ (۵) آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کرکے تمام بنی نوع انسان کو گنہگار بنایا۔ مسیح نے مصلوب ہوکر انسان کے گناہوں کا کفارہ کردیا۔ (۶) قیامت کے قریب مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ (۷) مسیح مامور من اللہ تھے اور اُنکا مذہب الہامی ہے۔

جب مسیحیت کو دیگر قدیم مذاہب کے ساتھ رکھکر دیکھا جاتا ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کہ جس مسیحیت کو الہامی مذہب بنایا جاتا ہے وہ صرف قدیم مذاہب کی مختلف روایات وعقائد کا مجموعہ ہے۔ جسے مختلف رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً جب کوئی جویائے حق جو مسیحیت سے بھی واقف ہے قدیم مصری مذہب و رسوم کے حالات پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اعمال کی جانچ کی تعلیم جو مسیحیت پیش کرتی ہے وہ مسیح سے کم ازکم پانچہزار سال پیشتر میں موجود تھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ مسیحیت حقیقتاً تثلیث کی آڑ میں شرک ہے لیکن دیگر مذاہب قدیمہ میں خالص روحانیت اور توحید پرستی مسیح سے صدیوں پہلے موجود تھی۔ وہ دیکھتا ہے کہ زبور کی بہترین دعائیں وہی ہیں جو دیگر مذاہب کی دعاؤں سے لی گئیں۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اکثر قدیم مذاہب میں ایک آسمانی دیوتا کسی کنواری عورت پر اپنا پرتو ڈالکر حاملہ کردیتا ہے اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ جو الوہیت سے متصف ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اسکندریہ میں جہاں مسیحیت نے زیادہ تر نشو ونما پائی قدیم مصریوں کے اندر حد درجہ کی رہبانیت تھی۔ پاکدامنی کو اُنھوں نے ایک دیوی بنا رکھا تھا۔ اور اس دیوی کے مندر میں صدہا کنواریاں رہا کرتی تھیں۔

جب وہ بابلی مذہب کی سیر کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُسکے معتقدایان دین بھی۔ تکوین عالم۔ تخلیق آدم۔ ہبوط آدم۔ جنات عدن۔ اور طوفان کی وہی روایتیں سُناتے ہیں۔ جو یہود و نصاریٰ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ قدیم بابلیوں میں بھی ایک دن یوم سبت ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس طرح عیسائی لوگ مریم کو ایک دیوی اور پاکدامنی کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اہل بابل استار دیوی کو نکوکاری اور پارسائی کی دیوی مانتے تھے۔ آخر میں وہ یہ بھی دیکھے گا۔ کہ بابلیوں کا مذہب ترقی کرتے کرتے توحید پرستی ہوگیا تھا۔ حالانکہ مسیحیت کو آجتک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی دیکھیگا کہ بابلیوں کا ایک ہر دلعزیز خدا ہر سال مرکر زندہ ہوتا تھا، اور اس کا دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ بابلیوں نے اپنے مذہب میں مسیح کی طرح ایک نجات دہندہ خدا بھی مان رکھا تھا۔

جب وہ ایران قدیم کے مذہب کی سیر کرتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ مسیح سے صدیوں پیشتر وہاں ایک مصلح یا پیغمبر پیدا ہوا

جس نے لوگوں کو اعتدال پسندی، نکوکاری اور پارسائی کی تلقین دے کر ایک خالص روحانی مذہب سکھایا وہ دیکھے گا کہ ایرانیوں میں صدیوں پیشتر یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ایک روز تمام کائنات کو بذریعۂ آتش نابود زدست کا۔ بعد ازاں "آسمانی بادشاہت" کا دور دورہ ہوگا۔ لوگوں کے اعمالنامے جانچے جائیں گے۔ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دی جائے گی۔

ایران کے مذہب مترائیت میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اُن کا ایک دیوتا ہر سال ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوتا ہے جسکا جشن مولود ہر سال نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دیوتا بنی نوع انسان کے گناہوں کا تمام بوجھ اپنے سر لے لیتا ہے۔ روم میں اسی دیوتا کی پیدائش کے دن یعنی ۲۵ دسمبر کو ہر سال سرکاری طور پر تعطیل ہوتی تھی۔ (یہی عیسائیوں کا بڑا دن ہے) الغرض وہ یہ دیکھتا ہے کہ عیسائیت میں کوئی بات ایسی نہیں جو دیگر مذاہب قدیمہ سے نہ لی گئی ہو۔ (باقی)

جنوری ۱۹۳۱ء کا نگار

کیسا ہونا چاہیے اس کے متعلق ناظرین کرام کی جو رائیں موصول ہو رہی ہیں وہ بہت مختلف ہیں۔ بعض چاہتے ہیں کہ مجموعۂ استفسارات ہو اور بعض کی خواہش یہ ہے کہ پورا پرچہ میرے مضامین سے پُر ہو۔ میں نے اس اختلاف رائے کو دیکھ کر جو فیصلہ کیا ہے وہ ان دونوں سے بالکل علحدہ ہے۔ میں ابھی اس فیصلہ کو بالکل راز میں رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس کے متعلق بھی اختلاف و اتفاق کا جھگڑا پیدا ہو جائے۔ اور پھر میں کچھ نہ کر سکوں۔ لیکن یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جنوری ۱۹۳۱ء کا نگار ۶۰ صفحات کا ہوگا اور جو کچھ اس میں ہوگا وہ نہ صرف نہایت دلچسپ و مفید بلکہ جدید و لذیذ بھی ہوگا یقیناً اس میں کسی شاعر کے کلام پر تنقید نہ ہوگی۔ نہ یہ مجموعۂ استفسارات ہوگا۔ بلکہ یہ ان سب سے علحدہ ایک اور چیز ہوگا جس کا اظہار میں نہیں کرنا چاہتا۔

نیاز

نظامی گنجوی کا نایاب و گمشدہ دیوان

ایک جوہر گرانمایہ کی دستیابی

مولانا نظامی رحمۃ اللہ علیہ چھٹی صدی ہجری کی اُن مقتدر اور مایۂ ناز ہستیوں میں تھے جنکے کمال کو ہر فرد مانتا تھا اور بہ لحاظ تصنیف اُن کا شمار ایسے لوگوں میں تھا جنکی تقلید و اتباع کو لوگ فخر جانتے تھے۔ اُن کے مخزن اسرار کے سینکڑوں جواب لکھے گئے۔ ایران کا جو مشہور شاعر اُٹھا۔ اس نے سب سے پہلے خمسے کے جواب کے لئے قلم اُٹھایا۔

دوسری تیسری صدی ہجری سے ایران میں ادبیات کے مٹے ہوئے نقش پھر اُبھر آئے تھے۔ شاعری ترقیوں کے مدارج طے کر رہی تھی۔ ہر صنف کلام میں جان پڑتی جاتی تھی۔ اور ہر شعبہ میں ایک انداز کا اضافہ ہو رہا تھا۔ گر یہ ترقی ایک محدود دائرہ اور ایک خاص حد سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ایک منزل خاص مقرر تھی کہ ہر ایک وہاں پہونچکر یا خود ٹھہر جاتا تھا یا اتنی سکت ہی باقی نہ رہتی تھی۔ کہ دو چار قدم اور آگے بڑھے۔ اسمیں کسکو کلام ہے کہ عسجدی۔ فرخی۔ حکیم ناصر خسرو۔ غضائری رازی۔ بندار رازی۔ امیر معزی۔ اسدی۔ طوسی۔ عنصری۔ فردوسی۔ ابوالعلا گنجوی۔ انوری۔ وغیرہ سب کے سب خدائے سخن تھے۔ اور ایک راستہ نکال گئے۔ نظامی بھی اگر اسی راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلتے تو زیادہ سے زیادہ وہ بھی اسی منزل پر پہونچ جاتے جسپر یہ سب پہونچے تھے۔ مگر اُنھوں نے صرف اتنی بات کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا۔ وہ اور آگے بڑھے اور اتنا بڑھے کہ پیشرو تو پیشرو اونکے پس رووں میں بھی کوئی شخص وہاں تک نہیں پہونچا۔ اُنھوں نے نظم میں جس جس چیز کو ترقی دی اُنکی تفصیل کے لئے گو زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ مگر مجملاً یہ ہے۔ کہ شعر کو چار چاند لگادئے۔ اور اُنھیں پہلے نقوش میں معمول سے زیادہ گلکاریاں کیں۔ کلام میں زور بڑھایا۔ بلاغت کو فصاحت کے ساتھ شامل کیا۔ استعارات میں جدت۔ تشبیہات میں اختراع سے کام لیا۔ قوت خیال کو بہت بڑھایا۔ سادگی میں رنگینیاں پیدا کیں۔ اور بہت سی باتیں ایسی ایجاد کیں جنکی وجہ سے انکو بڑے نقادوں نے موجد تسلیم کر لیا۔ سب باتوں کو نظر انداز کر کے اگر صرف اسی بات کو مدِ نظر رکھا جائے کہ اُسوقت تک جتنے شعرا تھے وہ صرف ایک ایک چیز میں باکمال تھے۔ مثلاً فردوسی صرف رزم کے۔ خیام فلسفہ کے۔ انوری قصائد کے۔ سنائی نصائح کے۔ تو بھی نظامی کا درجہ بہت بلند رہتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے سب چیزوں کو اپنے کلام میں اسطرح جمع کر دیا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

ہر صنف کلام میں عمر کا پورا حصّہ صرف کیا ہے۔ رزم۔ بزم۔ وعظ و پند۔ تصوف۔ عاشقی و سرمستی۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ غرضکہ یہ تمام چیزیں تنہا انکے کلام میں نظر آتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر چیز گل سرسبد ہے۔

آج اگر دیکھا جاتا ہے تو نظامی کا نام صرف اُن کے خمسے کے نام سے اور خمسے میں بھی بیشتر سکندر نامہ کے نام سے زندہ ہے۔ باقی نقوش غیر فانی ہیں سہی مگر اتنے دھندلے اور اتنے تاریک ہیں جو نظر نہیں آتے۔

یہ بات کسی طرح قیاس میں نہیں آتی کہ اُنھوں نے عاشقانہ شاعری بھی اُسی درجہ کی نہ کی ہو۔ جو اُن کے شایان شان تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنکا عاشقانہ کلام ایسا گم ہے کہ اب اُسکے متعلق شکوک اس درجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ کوئی صحیح صحیح یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ کب تھا؟ کہاں تھا؟ اور تھا تو کتنا تھا؟ کس انداز کا تھا؟ کس نے اُسکو جمع کیا۔ اور کیا کیا اوسمیں موجود تھا یہ تو سب کہتے ہیں کہ اونکا عاشقانہ کلام جسکو دیوان کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے تھا۔ مگر اسمیں سخت اختلاف ہے کہ کتنا تھا؟ اور کس رنگ کا تھا؟ نقادوں نے سخت سے سخت تحقیقاتیں کیں ہیں مگر دیوان کی نایابی نے سب کی آنکھوں پر شکوک واوہام کے گہرے پردے چھوڑ دئے۔ دیوان تھا اور ضرور تھا۔

دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ اُنکے قصائد۔ موشحات۔ اور صنائع وغیرہ کے بیس ہزار شعر ہیں۔ مگر جب لکھتے ہیں تو ثبوت میں صرف ایک غزل کے آٹھ شعر نقل کرتے ہیں۔

شب تیرہ است و رہ مشکل غیبت راعناں درکش ۔۔۔ زمانے رخصت ہستی را بخلوت گاہ جاں درکش

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر بروں کردی ۔۔۔ کسے رمزش نمی داند عناں درکش عناں درکش

بیس ہزار شعروں کے دیوان کا ذکر کرکے ایک قصیدہ نما غزل کے آٹھ شعر نقل کرنیکے اسکے سوا اور کوئی معنے نہیں ہیں کہ سمرقندی نے صرف ایک سنی سنائی بات لکھدی ہے۔ دیوان ہرگز نظر سے نہیں گزرا۔

لطف علی آذر اپنے آتشکدہ میں دیوان کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:۔

"گویند بیست ہزار بیت از قصائد و غزلیات و قطعات و رُباعیات سوائے خمسہ داشتہ کہ حال درمیان نیست ایں چند بیت از تذکرہ چند ملاحظہ و انتخاب شد"

یہ لکھکر اکثر اشعار نقل کئے ہیں۔ مگر اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ دیوان اُنھوں نے بھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بہت ممکن ہے کہ صرف دولت شاہ کے تذکرہ میں دیکھ کر تعداد اشعار لکھدی ہو۔ اور دوسری جگہوں سے منتخب اشعار کو نقل کر دیا ہو۔

عوفی یزدی نے اپنے **لباب الالباب** میں بہت صاف صاف کہدیا ہے کہ ان (موجودہ) مثنویوں کے سوائے نظامی نے بہت کم شعر لکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص کی زبان سے سُنے ہوئے کچھ شعر لکھدئے ہیں۔ باقی کوئی ذکر دیوان کا نہیں۔ **کشف الظنون** میں دیوان نظامی کا ذکر ہے۔ گو وہ صرف ذکر ہی ذکر ہے۔

مصنف تذکرہ مجمع الفصحا نے کچھ شعر قصائد کے کچھ غزلیں اور ایک رباعی نقل کردی ہے دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے کا کوئی ذکر نہیں۔

یورپ کے مشہور و معروف مستشرق ڈاکٹر ایتھے نے انسائیکلوپیڈیا میں نظامی پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے اوسمیں دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ۵۸۴ھ میں اُنھوں نے اپنا دیوان خود مرتب کیا۔ اور اس بات کی تردید کی ہے کہ اُنکے دیوان میں بیس ہزار شعر ہیں۔ بلکہ لکھا ہے کہ اس دیوان کے چند نسخوں میں جو ہمکو دستیاب ہوا اشعار کی ایک قلیل تعداد موجود ہے۔ مگر یہ تحقیق تذکرہ دولت شاہ کے مصنف کی تحقیق کے سراسر خلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظامی کا انتقال ۵۷۶ھ میں ہوا۔ اگرچہ اسمیں کلام نہیں ہے کہ اونکے سن وفات میں سخت اختلاف ہے جیسا کہ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ تقی کاشی ۶۰۶ھ اونکا سال وفات لکھتے ہیں اور مولانا کا خود بھی یہی خیال ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُنکی وفات ہوئی۔

ایک اور مستشرق ڈاکٹر ولیم باخر جنھوں نے نظامی کے حال میں ایک محققانہ کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ انکا دیوان موجود تھا جو ۵۸۴ھ میں لیلی مجنوں کے تصنیف کے ساتھ ساتھ مرتب ہوا تھا اور اسکا ثبوت یہ کہ اونکو نظامی کے اس کلام سے ملا ہے۔

روزے بہ مبارکی و شادی	بودم بہ نشاط کیقبادی
ابروئے ہلالیم گشادہ	دیوان نظامیسم نہادہ
آئینۂ بخت پیش رویم	اقبال بہ شانہ کردہ مویم
درحال رسید قاصد راہ	آورد مثال حضرت شاہ

اس سے معلوم ہوا کہ جسوقت شاہی قاصد مثنوی لیلی مجنوں کے لکھنے کے لئے حکم لایا تو یہ اپنا دیوان دیکھ رہے تھے یا مرتب کر رہے تھے۔

ان شہادتوں کے علاوہ بعض بیرونی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے نظامی کے دیوان یا کلام عاشقانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالقادر بدایونی نے نظیری کے حال میں لکھا ہے کہ اس نے شیخ نظامی کے قصیدے کے تتبع میں جسکا مطلع یہ ہے ؎

ملک الملوک فضلم بہ فضیلت معانی	زمی و زماں گرفتہ بثال آسمانی

اسی طرح حضرت شاہ نعمت اللہ نے ۸۰۱ھ میں نظامی کے اسی قصیدے کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا ہے جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

بجہاں کجا نظامی کہ بہ طیبتش بگویم	کہ من ایں ترانہ گفتم تو بگو اگر توانی

جامی نے بھی ایک غزل نظامی کی غزل کے جواب میں لکھی ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ انکا دیوان موجود تھا۔ اور انکا کلام عاشقانہ قابل اتباع تھا۔

خود نظامی کے خمسہ میں بعض بعض شعر ایسے موجود ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشقانہ غزلیں کہتے تھے مثلاً

غزلہائے نظامی را غزالاں زدہ بر زخمہائے چنگ نالاں

ایسے ایسے متعدد شعر انکی مثنویوں میں موجود ہیں جو تائید کرتے ہیں کہ وہ غزل کہتے تھے۔ اور خوب کہتے تھے۔ مولانا شبلی ان کے دیوان کی بابت شعر العجم میں لکھتے ہیں "پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے"۔ اس کے بعد دولت شاہ کا قول نقل کرتے اور تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انھیں کی بدولت وجود میں آئیں۔ لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں"۔ اگرچہ ہمکو مولانا کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے کہ انکی غزلیں بیمزہ اور پھیکی ہیں۔ کیونکہ جس شخص سے عاشقانہ شاعری کا وجود ہوا۔ پھر اوسکے یہاں ایسے کلام کا پھیکا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پھر بھی مولانا کے اس قول سے ہماری اتنی تائید ہوتی ہے کہ نظامی کا دیوان موجود تھا۔ ہر چند کہ مولانا نے دیوان اپنی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور نہ بغیر دیوان کے دیکھے ہوئے یہ تنقید کرنے کا حق تھا۔ پھر بھی اتنی تائید بہت کافی ہے۔

مگر پروفیسر براؤن جو آخری دور کے ایک زبردست مستشرق اور کامل محقق تھے۔ ان سب شواہد کے باوجود بھی سب سے الگ ہیں۔ اور ان کو اس باب میں سخت تامل ہے کہ مثنویات کے علاوہ نظامی کا کوئی اور کلام بھی تھا۔ لطف یہ ہے کہ انکو ایک یہ بھی وہم کا ہے کہ اسی تخلص کے کئی شاعر گذرے ہیں جنھیں ممکن ہے کہ ہمارے غلط نویس تذکرہ نویسوں نے نظامی گنجوی سمجھا ہو۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نظامی کا کوئی دیوان تھا تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دولت شاہ جس کے یہاں سے متقدمین میں نظامی کے دیوان کی موجودگی ثابت ہوتی ہے غیر محتاط ہے مگر یہ خیال کرنا کہ ایسا نہ ہو نظامی عروضی کا دیوان انکے نام سے موسوم ہو گیا ہو۔ سخت غلطی ہے۔ نظامی عروضی کا کلام ہرگز نظامی سے مماثل نہ تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے غلطی سے مثنوی ویسہ ورامیں کو مولانا نظامی سے منسوب کر دیا ہے۔ اور ہرگز باور نہیں کرتے کہ یہ کلام اوس نظامی کا ہو سکتا ہے جس نے سکندر نامہ کہا ہو، لطف علی آذر آتشکدہ میں لکھتے ہیں:۔

"مثنوی حکایت ویسہ ورامین را بعضے بہ شیخ نسبت و بعضے بہ نظامی عروضی نسبت میدہند و بزعم فقیر اگر از منظومات جناب شیخ باشد در اوایل حال کے کلام ہنوز بپختگی بہم نرسانیدہ بود گفتہ بہر حال نظر بہ خمسہ شیخ را احتیاطی بآن نیست"

جب یہ حال ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ پورا دیوان ان سے منسوب ہو گیا ہو۔ یہ ایک نظری غلطی ہے۔ جس کا ثبوت خود کلام کو معائنہ سے ہو سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی تذکرہ نویس اونکے دیوان کا دیکھنا بیان نہیں کرتا۔ مگر اسکے یہ معنے نہیں ہیں کہ انکا دیوان ہی

نہ تھا۔ چنانچہ حال ہی میں معارف کے فروری ۳۲ء نمبر میں جناب قاضی اختر میاں جوناگڈھی نے اس جملہ کی تردید میں ایک زبردست محققانہ مضمون لکھا تھا جس میں سے اکثر باتیں ہم نے بھی اپنے مضمون میں استدلالاً پیش کی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے کہ ہندوستان میں کوئی نسخہ دیوان نظامی کا موجود نہیں۔ البتہ آغا احمد علی کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جسکی نسبت وہ فرماتے ہیں۔

"نزد بندہ احمد یک موجز دیوان شیخ نظامی گنجوی محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات عارفانہ کہ تخمیناً بگی بالفصد بیت خواہد بود موجود است و کتابخانہ ام را از وشرفی نامحدود"

اسکے علاوہ قاضی صاحب موصوف پروفیسر ہوتشما کے تین نسخہ نظامی کے دریافت کرنیکی بابت بھی لکھتے ہیں۔ جس میں سے دو اکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں۔ اور تیسرا نسخہ ڈاکٹر اسپرنگر کے ذخیرۂ کتب میں ہے جو اسوقت برلن کی پروشین نیشنل لائبریری میں موجود ہے۔

ان سب بیانات سے بھی پروفیسر براؤن کے قول کی تردید ہوتی تھی اور یوں بھی کہ اسوقت نظامی کا دیوان خود ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ نسخہ نولکشور پریس کے کتب خانہ میں موجود ہے اُسکے آخر دیوان میں یہ عبارت درج ہے۔

"دیوان حضرت اولیائے نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ در دارالخلافت شاہجہاں آباد بہ اشتیاق تمام بہ سرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۲۵ء روز دوشنبہ بخانۂ پنڈت دہرم نرائن اختتام پذیرفت"

اس نسخہ میں ۳۰ صفحات ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد مصنف ہفت اقلیم کے دیوان سے بہت زیادہ یعنے نو سو پچاس ہے جس میں دس قصیدے ایکسو چھ غزلیں چار قطعے اور سینتیس رباعیاں شامل ہیں۔ خط نہایت پختہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کاتب نے یا تو عجلت کی وجہ سے نہایت ہی جلدی میں لکھا ہے یا غلطیاں جو رہ گئی ہیں۔ وہ منقول منہ کی خرابی کی وجہ سے ہیں۔ مطبع نولکشور کا کتب قدیم کے بارہ میں جو روّیہ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ سینکڑوں ایسی ایسی نادرالوجود کتابیں طبع کی ہیں کہ اگر طبع نہ کیجاتیں تو آج انکا کہیں بھی نشان نہ ملتا۔ اس لئے اپنے علو ہمت سے مطبع کا خیال ہے کہ اس نایاب کتاب کو بھی شائع کیا جائے۔ مگر چونکہ اس میں غلطیاں ہیں۔ اور دوسرا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے اسواسطے سخت دقتیں لاحق ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ وہ حضرات جن کے پاس کوئی قلمی نسخہ دیوان نظامی موجود ہو اُس سے مطلع فرمائیں گے اور عاریتاً یا جسطرح ممکن ہو مرحمت فرمائیں گے۔ تعداد اشعار وغیرہ کو دیکھکر یہ نسخہ سب سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہی اصل دیوان نظامی ہے۔ کیونکہ اسمیں تمام وہ اشعار موجود ہیں جو مولانا نظامی کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

آخر میں ہم اس دیوان کے چند اشعار منتخب کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ نظامی تغزل کے رنگ میں کس درجہ بلند تھے۔

باتو پدید می کنم حال تباہ خویش را	تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را
چوں ز نقاب بر کشی روئے چو ماہ خویش را	عرضہ کنند عاشقاں حال تباہ خویش را

سفرے بسوئے ما کن گذرے بکوئے ما کن | نظرے بروئے ما کن ز برائے روز فردا
ز غمت چو من ہزاراں بچنیں بلا و خواری | اگرم فرو گذاری من و کوہ و دشت و صحرا

اے دیدہ ترا بما نظر نیست | اے عقل ترا بما گذر نیست
از دیدۂ و عقل تا چہ گویم | کاں رفت ز دست وزاں اثر نیست
راضی نہ شود بہ دیں قدر نیز | جاں دادن اگرچہ مختصر نیست
بردار نظامیا دل و جاں | کایں جائے سکونت و مقر نیست

ہر آں کش راچنیں معشوق باشد | بہر دو عالمش خلوت مہیا است

اے پیک خجستہ یار چون است | من بیدلم آں نگار چون است
من بے سر آتشم شب و روز | آں نرگس آبدار چون است
اندر ہمہ عمر خود نہ پرسید | کاں شیفتہ را قرار چون است

تا بہ چہل سالگی زاہد پنہاں شدم | زاہد پید اکنوں کافر پنہاں است

بر ہمہ خستہ دلاں داد گری کردہ | چوں بہ نظامی رسید قصد دگرگوں چرا ست

سو میخانہ و مسجد کدام است | کہ ہر دو بر من مسکیں حرام است

کردم سوالہا بامید از دہانِ تو | معذوری اے نگار کہ جائے جواب نیست
گفتی نظامیا ز غمت عافیت مباد | دل شاد میزیم کہ دعا مستجاب نیست

عاشقاں خور وند مے واں مفلساں گشتند مست | باش تا روز پسیں نوبت بہ ہشیاراں رسد

عمرے زجہاں قسمت من بے جگری بود — دیں آرزوئے عشق توام خیرہ سری بود
تو نیز ولم بردی و در پردہ نشستی — مقصود ت ازیں پردہ ہمیں پردہ دری بود

نام لبش شنیدہ ام خرقہ ازاں ریدہ ام — بادۂ ناچشیدہ بیں تا چہ خمار میکند

ہمہ جہاں ز تو در عافیت گناہم چیست — کہ از تو بر سر ما جز بلائی آید

داد من غم کشتۂ مسکیں بدہ از وصل — زاں پیش کہ ایں قصہ بہر انجمن افتد

بچشمہائے عزیزت نمی توانم گفت — کہ بے تو عمر عزیزم چہ خوار می گردد
سرکشی میکن کہ بارت می کشم — وزدل صافی غبارت می کشم
روزگارم می کشد در جور تو — جور او از روزگارت می کشم
مستم از عشقت کہ روشن بادہ است — لاجرم رنج خمارت می کشم

تدبیر کنم ہر شب تا دل ز تو برگیرم — چوں روز فرود آید مہر تو ز سر گیرم
پیش ازیں افتادہ ام در عشق خوباں چندبار — بر من مسکیں نگرکیں بار زار افتادہ ام
گفتی نظامیا بغم من صبور باش — در من کجاست صبر مگر از زبان تو
ہر جا کہ غمے بینی خواہی ز برائے من — ہر جا کہ دلے بینم خواہم ز برائے تو

از دستِ فراق تو کسے زندہ نماندہ است — پس باز چہ پرسیم کہ چونی و کجائی
اندر طلب عشق تو بودہ است نظامی — منعش مکن اے دوست کہ کاریست قضائی

آسی

مدرسہ کے طلبا روز شام کو واپسی کے وقت جبار کے باغ میں جاتے وہاں انکے کھیل کود اور ہر قسم کی دلچسپیوں کے کافی اسباب موجود تھے۔ یہ باغ نہایت وسیع، سرسبز اور شاداب تھا۔ اس کے دلکش اور دلفریب مناظر آنکھوں کو سرور اور دل کو فرحت و بہجت سے معمور کر دیتے۔ زمین پر سبز پودوں کی مخملی چادر بچھی تھی جس میں رنگ برنگ کے پھول پتے جڑے تھے اس باغ میں چند عالیشان مکانات تھے جن کے درمیان شفتالو کے درخت تھے۔ جو بہار میں خوشنما کلیوں اور خزاں میں عمدہ اور لذیذ میوے سے لدے رہتے۔ درختوں پر ہر وقت چڑیوں کے چہچہے باغ کی رونق اور دلفریبی میں اور اضافہ کر دیتے۔ یہ چڑیاں دن بھر مصروف نغمہ و سرود رہتیں۔ درخت کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے اسطرح جھومتیں گویا چڑیوں کی نغمہ طرازیوں پر تالیاں بجا رہی ہیں۔ لڑکے بھی یہ دلفریب منظر دیکھ کر بیخود ہو جاتے اور حالت طرب میں ہر طرف چھلانگیں مارتے اور ایک دوسرے سے خوش خوش کہتے کہ ہمارے کھیل کود کے لئے کیسا اچھا مقام ہے۔

اسی باغ کا مالک جبار تھا جو اپنی ضرورت سے کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں لڑکوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ ہر روز شام کو آتے اور بیخوف و خطر باغ کی سیر کرتے، اس کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور دلپسند گیت گا گا کر دل خوش کرتے۔ جبار سفر سے واپس آیا اور لڑکوں کو باغ میں کھیلتے دیکھکر غصہ سے بھر گیا اس نے چیخ کر کرخت لہجہ میں کہا کہ تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو۔ لڑکے یہ سخت آواز سن کر سہم گئے اور سب نے بدحواسی کے عالم میں اپنا اپنا راستہ پکڑا، تھوڑے ہی دور گئے ہونگے کہ انکے کانوں نے ویسی ہی کرخت آواز سنی کہ "کیا تم جانتے نہیں کہ یہ میرا باغ ہے۔ اسمیں ہرگز کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

چند ہی روز بعد اس نے باغ کے اردگرد ایک مضبوط حصار تعمیر کرا دیا اور دروازہ پر لکھدیا کہ "ہرگز کسی کو باغ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسکی خلاف ورزی کرنے پر وہ مورد عتاب ہوگا۔"

جبار اپنی خود بینی اور خود نمائی سنگدلی اور بے مروتی میں ضرب المثل تھا، اوسکا دل مخلوق کے رحم و محبت سے بالکل خالی تھا اب اسکے بعد لڑکے کھیل کود سے بھی محروم ہو گئے۔

بارہا انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ راستہ یا سڑک پر اپنے کھیل جاری رکھیں، لیکن راستہ کی ناہمواری، ڈھیلوں اور کنکروں کی کثرت اور گرد و غبار انکے اس شوق میں سخت مزاحم تھے۔ وہ ہر روز مدرسہ سے واپسی کے وقت حصار کے

اور گرد حسرت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے پھرتے اور گزشتہ آزادی کا تذکرہ نہایت غم و افسردگی سے کرتے۔
جاڑے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے، چڑیوں کے نغمے، درختوں کی شادابی، کلیوں کا دلفریب تبسم، ہر طرف فصل بہار کی آمد آمد کی خوشخبری دیرہا ہے۔ لیکن جبار کے باغ پر ابھی وہی ویرانی اور وہی خزاں بدستور مسلط ہے کیونکہ باغ میں لڑکے نہیں ہیں۔ درخت کی شاداب شاخیں بھی خشک ہو رہی ہیں۔ پتوں اور کلیوں کا کہیں وجود نہیں۔ ایک خوبصورت کلی نے شگوفہ سے سر نکالا۔ لیکن دروازے کا اعلان پڑھکر لڑکوں کی محرومی اور حالت زار پر متاسف ہوئی۔ اور پھر منھ ڈھانپکر سوگئی۔ برف اور کُہر کو بہار کے نہ آنیکی بڑی خوشی تھی۔ وہ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے سے کہتیں کہ بہار اس باغ میں آنا بھول گئی اچھا ہوا مزے سے سال بھر ہمارا اسی باغ پر تسلط رہے گا۔
برف نے آرام سے اپنی سفید چادرتان دی اور درختوں کی شاخوں کو ڈھک لیا۔ اس خوشی میں بادِ صرصر کو بھی دعوت دی۔ اُس نے انکی دعوت قبول کی اور اپنی تباہ کن تیزی اور برودت کے ساتھ مسلسل گھنٹوں تک باغ پر مسلط رہی۔ برف اور کُہر کی دعوت پر بدلی نے بھی مسلسل تین روز اپنے دل کا بخار نکالا۔ پانی کی کثرت سے مکانوں کی دیواریں ہل گیئں۔ کھڑکیوں کے اکثر شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے۔ غرض بادِ صرصر کی ستم رانیوں سے جو ذخیرہ بچ رہا تھا وہ موسلا دھار بارش کی نذر ہو گیا۔
جبار کو آٹھ پہر فصلِ بہار کے انتظار میں گذرتے۔ ایک روز وہ حالت اضطراب میں اُٹھا اور کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر باغ پر ایک پُر حسرت نگاہ ڈالی۔ دیکھا کہ ہر طرف خزاں اور برف کا دور دورہ ہے۔ اُسکی زبان سے بے اختیار نکلا "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سال بہار کہاں غائب ہو گئی"۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اب آنا ہی چاہتی ہے۔ اے باغ صبر کر کیونکہ ہر خزاں کے بعد بہار اور ہر تکلیف کے بعد آسائش ہے"۔ لیکن بہار کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ عالم کے گوشہ گوشہ میں بہار آچکی تھی۔ درخت پتوں اور پھولوں سے آراستہ ہو چکے تھے، لیکن جبار کا ایک اکیلا باغ تھا جسکو بہار نے اپنی نظر کرم کا مستحق نہ سمجھا، کیونکہ جبار تندمزاج اور سنگدل تھا۔ جاڑا اپنے پورے سازوسامان، برف، ٹھنڈ، بدلی اور ہوا کی تیزی کے ساتھ بدستور قائم رہا۔
ایک روز صبح کے وقت جبکہ جبار اپنی چارپائی پر غنودگی کے عالم میں پڑا ہوا تھا، اُسکے کانوں میں ایک دلکش اور سُریلی آواز آئی۔ جبار سمجھا شاید باغ کے کنارے سے گانیوالوں کا کوئی طائفہ گذر رہا ہے۔ لیکن یہ آواز گانے کی آواز نہ تھی، ایک چڑیا کی آواز تھی جو باہر ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی گا رہی تھی۔ اب جاڑا ابھی رخصت ہو گیا، ہوا کی رفتار معتدل ہو گئی اور سارا مکان بھینی بھینی خوشبو سے معمور ہو گیا۔ جبار جلدی سے بستر سے اُٹھا اور کھڑکی سے سر باہر نکالا "اب بہار ضرور آگئی ہے"۔ لیکن اس نے اپنے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا، جس کا اسے کبھی گمان تک نہ تھا۔ لڑکے جو باغ سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ ان سے رہا نہ گیا اور اُنھوں نے چاردیواری کے ایک کمزور حصّہ میں

نقب لگائی اور اندر داخل ہو کر باغ میں چھپ گئے۔ جبّار کی نظر جس درخت پر پڑتی اُسکے نیچے ایک لڑکا نظر آتا۔
اس نے دیکھا کہ باغ کے مکانات جوشِ محبت میں لڑکوں پر جھک پڑے ہیں۔ کلیاں شوق میں بیتابانہ باہر نکل آئی ہیں۔ درخت کی نرم شاخیں ان معصوم بچوں کو پیار کرنے کے لئے جھک پڑی ہیں۔ چڑیاں نیچے کی شاخوں پر عالم بیخودی میں نغمہ سنج ہیں۔ لیکن ابھی تک باغ کا ایک گوشہ بدستور برف، ٹھنڈ اور خزاں کا شکار بنا ہوا ہے۔ اُسمیں ایک ننھا بچہ روتا اور شور کرتا ہے وہ درخت پر چڑھنے کے لئے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ لیکن چڑھ نہیں سکتا۔ درخت بھی برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اُس پر تیز ہوا چل رہی ہے۔ درخت کو ترس آیا اُس نے اپنی شاخیں جھکا دیں اور لڑکے سے نہایت ترنم ریز لہجہ میں کہا۔ آ! آ! اے پیارے بچے آجا۔ میری گود میں آجا۔ لڑکے نے پھر اپنے ننھے ہاتھ اوپر کئے اور شاخیں پکڑنے کا ارادہ کیا لیکن پہونچ نہ سکا۔

جبّار دور سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا اوسکا دل نرم ہو گیا۔ اسکے دل میں رحم و محبت کا جذبہ موجیں لینے لگا اُس نے کہا میں کتنا سخت اور سنگ دل ہوں میں کتنا مغرور اور خود بیں ہوں۔ آج مجھے بہار کی تاخیر کا سبب معلوم ہوا افسوس میں نے اپنی ساری عمر گناہوں میں بسر کی۔ مجھے اب اسکا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ میں جاؤں اور معصوم بچے کو درخت پر چڑھا دوں۔ چہار دیواری بھی منہدم کرا دوں اور باغ کو بچوں کے لئے وقف کر دوں وہ اسمیں جو چاہیں کریں۔ دل میں یہ باتیں کہیں اور مکان سے نکلکر تیزی سے باغ کی طرف چلا لیکن لڑکے اسے دیکھتے ہی چلائے اور بھاگ گئے اور اُنھیں کے ساتھ بہار بھی اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی اور کچھ دیر کیلئے پھر خزاں کا دور دورہ ہو گیا۔

باغ میں سوائے اس ایک چھوٹے لڑکے کے کوئی باقی نہیں رہا۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اسی لئے وہ جبّار کو نہ دیکھ سکا۔ جبّار تیزی سے جھپٹ کر لڑکے کے پاس پہونچا۔ اور اسکو پیار سے سینہ سے لگا لیا اور درخت پر چڑھا دیا۔ اس کے چڑھتے ہی درخت پتوں اور کلیوں سے لد گیا اور اس کے پاس کی فضا طیور کی نغمہ طرازیوں سے معمور ہو گئی۔

لڑکوں نے جب یہ ماجرا دیکھا انکو خیال آیا کہ جبّار اب اپنی شرارت اور سنگدلی سے باز آگیا۔ سب کے سب پھر باغ میں واپس آئے اور انھیں کے ساتھ ساتھ بہار بھی اپنی سرسبزی اور چمک دمک کے ساتھ واپس آئی۔

جبّار نے لڑکوں کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور منت سماجت سے کہا کہ میرے پیارے بچو! اب یہ باغ تمہارا ہے۔ اب تمھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ اب تم اس میں جو چاہو کرو، وہ ایک کدال لیکر اُٹھا اور چہار دیواری بھی منہدم کرادی۔

راہرو باغ کے کنارے کے راستے سے گذرتے اور اس ناگہانی انقلاب پر حیرت زدہ ہو جاتے۔ چہار دیواری اب منہدم تھی۔ جبّار لڑکوں میں ٹہل رہا تھا اور اس کا رشک فردوس باغ بچوں کی حکومت میں تھا۔ لوگ باغ کا منظر دیکھتے اور مبہوت ہو جاتے۔ اس سے پہلے انکو باغ کی سرسبزی، شادابی، رونق اور دلکشی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہونے کا

اقرار تھا لیکن اب انھیں نظر آیا کہ چھوٹے بچوں کی صحبت سے جو تازہ حسن وجمال اسمیں ہوا اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔

آج لڑکوں کی تعطیل کا دن تھا وہ دن بھر کھیل کود میں مشغول رہے۔ شام کو گھر جانے لگے تو جبار کے پاس سلام کے لئے گئے۔ جبار کا دل اس چھوٹے بچے کی محبت سے معمور تھا ان سے دریافت کیا کہ وہ بچہ کہاں ہے ؟ مجھے نظر نہیں آتا سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور یک زبان ہوکر کہا کہ اس سے قبل ہم نے اسکو دیکھا بھی نہیں ہم نہیں جانتے وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں گیا۔ جبار اسکی محبت میں سرشار تھا وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا اسکا دم گھٹنے لگا۔ زبان رک گئی۔

لڑکے روزانہ شام کو باغ میں آتے۔ انکے ساتھ جبار بھی کھیل کود میں دلچسپی لیتا اگرچہ وہ سب لڑکوں کے ساتھ لطف ومہربانی سے پیش آتا۔ لیکن اس کی آنکھیں اسی ایک کی تلاش میں بیتاب تھیں۔ اسکا دل اسی ایک کے پالینے کی تمنا رکھتا تھا دل میں کہتا (کاش اسے دیکھ لیتا) اسی اضطراب اور بےچینی میں جبار نے کئی سال بسر کئے اب وہ بوڑھا ہوچکا تھا اسکے اعضاء میں اضمحلال آگیا تھا اب اس میں پہلی سی طاقت باقی نہ تھی۔ اب وہ لڑکوں کے کھیل میں بھی شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور انکا کھیل دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دل میں کہتا کہ اگرچہ باغ میں عمدہ عمدہ پھول۔ شاداب پتے خوشنما کلیاں اور طرح طرح کی زینت کے سامان موجود ہیں لیکن لڑکے ہر زینت سے بڑھ کر ہیں۔ بہار کا زمانہ تھا جبار سوکر اٹھا اور کپڑے بدلکر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوکر باغ کی سیر میں مشغول ہوگیا۔ اسوقت اس پر نشاط اور کیف کا عالم طاری تھا اسے چھوٹے سے چھوٹے رنج والم کا بھی کھٹکا نہ تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بہار کا زمانہ نشاط وشادمانی کا زمانہ ہے۔ دفعتاً اسے ایک عجیب وغریب منظر نظر آیا اسنے پریشانی کے عالم میں اپنی دونوں آنکھیں ملیں۔ اسے اسی پہلے گوشہ میں ایک درخت نظر آیا جو سفید خوبصورت کلیوں سے لدا ہوا تھا۔ اسکی نرم و نازک شاخوں پر پھل لٹک رہے تھے اور اسکا وہی کمسن محبوب درخت کے نیچے پھل چننے میں مشغول تھا اسے دیکھتے ہی جبار بجلی کی طرح ایک لمحہ میں باغ کو طے کرکے اس کے پاس پہونچا۔ اسے لڑکے کے ہاتھ اور پیر زخمی نظر آئے یہ دیکھ کر وہ بیتاب ہوگیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ زور سے چیخ لگائی اور کہا "یہ زخم کیسے ہیں"؟ اس نے مکرر سوال کیا یہ زخم کیسے ہیں؟ جلد بتا تاکہ اس ظالم کے خون سے دل کو تسکین دوں لڑکے نے جواب دیا "یہ زخم عشق کا زخم ہے"!

جبار اس جواب سے تھرا اٹھا اور لڑکے کے سامنے زانو ٹیک کر پوچھا آپ کون ہیں؟ لڑکے نے ہنستے ہوئے نرم لہجہ میں جواب دیا "تم نے مجھے اپنے باغ میں کھیلنے کی اجازت دی اب میں تمہیں اپنے باغ یعنی جنت میں لیچلونگا"!

شام کے وقت لڑکے باغ میں آئے۔ اور جبار کو اسی درخت کے نیچے سفید کلیوں سے ڈھکا ہوا مردہ حالت میں پایا (آسکر وائلڈ)

شیر محمد اصلاحی

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید جعفری صاحب۔ کامٹی)

آپ نے بلقیس رعنا کے خطوں کا جواب دیتے ہوئے ایسی پُر لطف چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ اسکو دیر تک جاری رکھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ اب نہ انکے خطوط نگار میں شائع ہونگے اور نہ آپکا جواب میں آپ کے اس فیصلہ سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ جب انکے خطوط ایسے امور پر مشتمل ہوتے ہیں جنکا تعلق پبلک سے ہو سکتا ہے اور صرف ذاتیات سے بحث نہیں ہوتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انکو شائع نہ کیا جائے۔
میں جناب بلقیس رعنا سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس خیال کو ترک کردیں اور آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ ایسا نہ کیجئے، کیونکہ میں آپکے ہر لفظ کو خواہ وہ کیسی ہی خلوت کا کیوں نہ ہو، ملک عام سمجھتا ہوں۔

(نگار) آپ ہی کیطرح اور بعض احباب نے بھی اس سلسلہ کو نگار میں شائع کرنیکی رائے دی ہے اور بعض نے مخالفت بھی کی ہے۔ لیکن موافق و مخالف دلیلوں میں سے کسی کو سامنے نہ رکھتے ہوئے میں دونوں جماعتوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی تک ان دو خطوں کے علاوہ اور کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی کہ اسکی اشاعت یا عدم اشاعت کا سوال پیدا ہوتا۔ لیکن اگر آئندہ کوئی خط موصول ہوا تو میں اصولاً اسکی اشاعت نہیں کرسکتا جبتک اسکا لکھنے والا اس پر راضی نہ ہو۔ میں اس باب میں نہ جناب بلقیس رعنا سے کوئی مراسلت کرنا چاہتا ہوں اور نہ اسکو "چھیڑ چھاڑ" سمجھکر لطف لینے والوں کے لئے اشاعت پر اصرار کرسکتا ہوں۔
میرا مسلک اس باب میں بالکل وہی ہے جو فطرت کا۔ بلورات ثلجی ([illegible]) کی تعمیر میں ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ہوگا اُسی خصوصیت کے ساتھ، اسی تزئین و تحسین کے ساتھ ورنہ نہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہدیا کہ وہ لوگ جنکی سنجیدگی میری اس نوع کی تحریروں کو بھی پسند نہیں کرتی، وہ اپنی جگہ مایوس ہوجائیں اور جو اس روش کو پسند کرتے ہیں وہ میری طرف سے مطمئن ہوکر اُسوقت کا انتظار کریں جب "بلقیسیات" کی یاد تازہ کرنیوالی کوئی تحریر "بغرض اشاعت" میرے پاس آئے۔
یہ بھی کسقدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ مردوں کا ایک گروہ مجھے عورت کا پرستار کہتا ہے اور برہم ہے۔ دوسری طرف عورتوں کی ایک جماعت مجھے بقول ایک خاتون کے "عورت بیزار" کہتی ہے اور چیں بر جبیں ہے وہ اس لئے کہ نسائیات

عرصہ تک میرا موضوعِ گفتگو رہا ہے اور یہ اسی بنا پر کہ میں اُنکی افسانہ نگاری و غزل سرائی کو پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ میں انسان ہوں اور اُن تمام "کمزوریوں اور قوتوں" کے ساتھ، جو ایک انسان میں پائی جاتی ہیں، اگر میں عورت کے ذکر پر بے قابو ہو جاتا ہوں، تو زیادہ سے زیادہ آپ اسکو میرے احساس کی قوت کہہ سکتے ہیں اور اگر میں اُن کے "معشقیات" کی عریانی کو پسند نہیں کرتا تو اس کو بیہودہ "اخلاقی کمزوری" کہئے نہ اسطرح اُنکے حدود انسانیت سے گذر جانیکا مخالف ہوں

بہرحال جو سبب بھی ہو، اس کیفیت سے میں ناخوش نہیں ہوں، بلکہ اسوقت سے ڈرتا ہوں جب جماعت اول کی "خوشی" مجھے صرف "تہجد گزار" بناکر میرے خوابِ صباحی کی شیرینی کو مجھ سے چھین لے اور جماعت ثانی کی موافقت مجھے اخلاق کے اس درجۂ انحطاط پر پہونچا دے جہاں انسانیت نام "عمرانیت" کا نہیں بلکہ "حیوانیت" کا ہے۔

(جناب محمد ذکی صاحب۔ لاہوری گیٹ امرتسر)

دنیا آپ کی کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو، لیکن ایک وقت آئیگا جب آپ کے خیالات کی قدر کیجائیگی اور لوگ سمجھیں گے کہ حقیقت وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن معاف فرمائے اگر میں آپ کی اس کمزوری کا ذکر کروں جس نے آپ کو ایک جگہ پاؤں توڑکر بیٹھ جانے پر مجبور کیا ہے اور آپ کو مختلف مقامات پر جاکر اپنے مشن کی تبلیغ سے باز رکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ میں ہمیشہ ہر مصلح کی مخالفت ہوئی ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی کسی مصلح نے مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ اس لئے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ تحریروں کے علاوہ تقریروں سے بھی آپ اپنے خیالات کی اشاعت کیجئے اور یہ غالباً آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہونگے کہ

وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

(نگار) آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب "من گویم و بعد از من گویند بدستانہا" کی عام کیفیت زمانہ میں پیدا ہو جائے گی، اور جس تیزی کے ساتھ انسانی ذہنیت میں انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ ممکن ہے کہ ہماری آپکی زندگی ہی میں اس حقیقی شرف و امتیاز کو قائم کردے جس پر ایک انسان فخر کرسکتا ہے، لیکن آپ کا مجھے مصلح کے لقب سے یاد کرنا حقیقتاً غلط تعبیر ہے۔ مجھ میں مطلقاً اسکی صلاحیت نہیں ہے اور نہ یہ "کارِ عظیم" میرے بس کا ہے۔ اس میں کوئی مولویانہ یا شاعرانہ "انکسارِ غرور آمیز" شامل نہیں ہے۔ بلکہ بالکل حقیقت و واقعیت کا اظہار ہے۔

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے دل کی بے ساختہ پکار ہے، میری روح کی دردمندیوں کی ناقابلِ ضبط فریاد ہے جس کو زیادہ سے زیادہ "دردِ طلبی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، میں خود جستجو کی منزل سے باہر نہیں نکلا، دوسروں کے لئے دلیل راہ کیا بن سکتا ہوں، میں بہت درماندہ و عاجز ہوں، بہت بے مایہ و کمزور ہوں۔ اور یہ غالباً آپ کو بھی معلوم ہوگا۔

که سلطاں نخواہد خراج از خراب

پھر آپ کے مطالبہ کو میں کیونکر پورا کر سکتا ہوں اور کس طرح مجھ میں وہ مصلحانہ جرات پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر آپ نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔

میرے حالات کا اقتضا نہیں ہے کہ میں مختلف مقامات میں جا کر اپنی آواز لوگوں تک پہونچاؤں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ مجھ میں وہ "جرأت رندانہ" نہیں ہے جو "فکر فضول" کے ساتھ مل کر ایک انسان کو کامیاب بنا سکتی ہے لیکن میرے نزدیک اسکی بڑی وجہ وہی ہے جسے میخواروں کی اصطلاح میں "نارسائی بادہ" کہتے ہیں۔ یہ تو ہوا حقیقت کا اظہار۔ لیکن اگر میں شاعری کرنے پر آؤں تو کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ کے نزدیک وہ وقت نہیں ہے کہ "در خانہ نشینی بیکار" تو میرے نزدیک یہ قرین مصلحت نہیں ہے کہ "از پردہ بروں افتد راز" فی الحال خاموش رہیے، جس وقت میں مصلحانہ ادعا، مہدیانہ دعوت اور پیغمبرانہ عزم کے ساتھ اٹھوں گا تو پنجاب کے حواریین کی فہرست میں سب سے پہلا نام آپ کا ہوگا۔

باب الاستفسار

سندھ میں عربی حکومت کا نشو و زوال
عہد بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ
اور
مقام قندہار کی تعیین

(جناب سید اکبر حسین صاحب۔ شاہ گنج۔ الہ آباد)

میں آجکل تاریخ ہند کا مطالعہ کر رہا ہوں اور بعض مسائل میں آپ کی رہبری کا طالب ہوں۔ بہ لحاظ اختصار میں اپنے سوالات کی تعیین علیحدہ علیحدہ کئے دیتا ہوں۔

(۱) سندھ میں عربی حکومت کا آغاز کیونکر ہوا۔ اس کے مدارج ترقی کیا تھے اور زوال کیونکر ہوا؟

(۲) حقیقی معنی میں اسلامی حکومت ہند کب سے شروع ہوئی۔

(۳) اگر کوئی شخص حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا مطالعہ اصلی ماخذوں سے کرنا چاہے تو اُسے کن کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیئے اور ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟

(۴) سندھ کی ابتدائی فتوحات میں ایک مقام قندہار کا بھی ذکر آتا ہے۔ کیا اس سے مراد موجودہ قندہار ہے؟

(نگار) ہر چند آج کل مجھے وہ سکون و دلجمعی میسر نہیں ہے، جو آپ کے اس اہم مجموعۂ استفسارات کا جواب دینے کے لئے حاصل ہونا چاہیئے، تاہم کوشش کروں گا کہ اس حالت بے اطمینانی میں بھی کسی حد تک آپکو مطمئن کر سکوں۔

رحلت نبوی کے بعد بیس سال کے اندر اہل عرب نے جس تیزی کے ساتھ، شام و فلسطین، مصر و ایران کو زیر کر کے حکومت اسلام وہاں قائم کر دی، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ ہرچند ہمارے موضوع سے یہ بحث بالکل جدا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے عرب کے دشتیوں میں یہ شاہانہ عزم پیدا کیا اور وہ کیا انقلاب ذہنی تھا جس نے پست و پامال قوم کو یکدم زبردست ولولۂ عمل سے لبریز کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب پہلی صدی ہجری میں اہل عرب تمام قدیم دنیا میں منتشر ہو گئے تو انھوں نے اپنے مقبوضات وسیع کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا اور اسوقت تک وہ اپنے فاتحانہ اقدام سے باز نہیں آئے، جبتک خود فطرت نے ان کے سامنے ناقابل تسخیر حجابات پیدا نہیں کر دیئے۔ وہ شمالی افریقہ میں پھیل گئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کہاں جاکر ٹھہرتے اگر خشک و گرم ریگستان ان کے سامنے حائل نہ ہو جاتا، اسی طرح انھوں نے جب ہسپانیہ کو زیر نگیں کیا تو اپنی حدود سلطنت وسیع کرنے کے لئے اسوقت تک برابر مضطرب رہے، جبتک بحر اٹلانٹک کی موجوں نے انکے سامنے خط فاصل نہیں کھینچ دیا۔ بالکل یہی صورت مشرق میں پیش آئی کہ وہ فارس کو فتح کر کے آگے بڑھے اور اگر ہندو کش کی برف پوش سنگین دیواریں سامنے نہ ہوتیں تو سرزمین ہند تک ان کا پہونچ جانا یقینی امر تھا۔

ہرچند اہل عرب ان دولتوں سے آگاہ نہ تھے جن سے سمندر کی گہرائیاں مالامال ہیں، تاہم وہ مغربی ہند کے سواحل سے بیخبر نہ تھے، جہاں زمانۂ قدیم سے عرب تاجروں کی آمد و رفت پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کر کے دریائے سندھ کے دہانے تک اور وہاں سے سپرا، کمبایت اور کبھی کبھی کالی کٹ اور ساحل مالابار کی بندرگاہوں تک پہونچ جاتے تھے۔

اس سے مدعا یہ ہے کہ اہل عرب ہندوستان سے ناواقف نہ تھے اور تجارتی تعلق ان دونوں ملکوں کے درمیان پہلے سے قائم تھا جس میں کوئی ملوکانہ اقدام شامل نہ تھا۔ سب سے پہلی فوجی مہم ساحل ہند پر ۱۵ھ میں خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں روانہ کی گئی، جو بمبئی کے قریب تھانہ[۵۱] پر قابض ہو کر بھروچ[۵۲] تک پہونچ گئی تھی۔

چونکہ خلیفۂ دوم اسکو پسند نہ کرتے تھے کہ اہل عرب اپنے ملک سے بہت دور رہکر وہیں کے ہو جائیں اس لئے انھوں نے بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا اور تھانہ و بھروچ کی یہ مہم بے مقصد ہو کر رہ گئی۔

خلیفۂ ثالث (عثمان غنی) کے زمانہ میں حکیم بن جبلہ ہند و سندھ کا حال دریافت کرنے کیلئے مامور کئے گئے لیکن انھوں نے ایسے مایوس کن حالات بیان کئے کہ اسطرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

عہد خلیفۂ چہارم (جناب امیرؑ) میں البتہ ایک مہم آخر ۳۸ھ میں روانہ کی گئی جو کوہ قیقان[۵۳] تک پہونچی اور حارث بن مرہ

---

۵۱ بلاذری نے اس مقام کا نام تانہ لکھا ہے۔

۵۲ معجم البلدان میں بھروچ کو بروج اور بروص لکھا ہے۔

۵۳ بلاذری کی تحقیق ہے کہ قیقان سندھ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔

افسر فوج تھے۔ لیکن اُسی وقت حضرت علیؓ کی شہادت وقوع میں آئی اور اس مہم کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

امیر معاویہ کے عہد میں سب سے پہلے مہلب نے سندھ پر حملہ کیا اور پھر عبداللہ ابن عامر نے کران پر مسلمانوں کا قبضہ اسی زمانہ میں ہوا۔ یزید اور معاویہ ثانی کے عہد میں بھی مسلسل کئی بار حدود ہند پر حملہ کیا گیا۔ اور مروان کے زمانہ میں راجپوتانہ پر بھی حملہ ہوا۔ جس میں حسب بیان کرنل کاڈ (راجستھان) اجمیر کا راجہ معہ اپنے بیٹے کے مارا گیا۔

جب مروان کے بعد عبدالملک تخت نشین ہوا اور عراق کی گورنری حجاج بن یوسف کے سپرد کی گئی تو اُس نے یکے بعد دیگرے دو افسر حملۂ ہندوستان کے لئے متعین کئے، لیکن جب وہ کامیاب نہ ہوئے تو محمد قاسم کا انتخاب کیا گیا۔

محمد قاسم کے حملۂ سندھ کا افسانہ حقیقتاً ایک تاریخی رومان ہے۔ ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ اُس وقت تک عربوں کا گزر یہاں بہت کم ہوا تھا، آبادی سخت جنگجو تھی، اور اُس کے اخلاق واطوار عقائد وخصائل عربوں کے بالکل منافی تھے۔ مرکز خلافت اور ہندوستان کے درمیان کوہستانوں، دریاؤں، اور صحراؤں کا غیر متناہی سلسلہ حائل تھا، لیکن ان دشواریوں کی مطلقاً پرواہ نہیں کی گئی، اور ایک نوجوان عرب کو جس کی عمر ابھی صرف سترہ سال کی تھی اور جس کو سپہ آزمائی کا بھی کوئی خاص تجربہ حاصل نہ تھا۔ اس اہم خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ محمد قاسم ہی پہلا شخص تھا جس نے صحیح معنی میں لوائے حکومت سرزمین ہند میں بلند کیا۔

ولید کے انتقال کے بعد جب سلیمان تخت نشین ہوا تو محمد قاسم معزول کر دیا گیا اور اُس کی جگہ ایک شخص یزید مامور کیا گیا۔ لیکن یہ سندھ پہونچتے ہی مر گیا اور اس کے بجائے حبیب ابن مہلب بھیجا گیا۔ جس نے مقامی راجاؤں سے جنگ جاری رکھی۔ سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانہ میں راجہ داہر کا بیٹا جیسیا مسلمان ہو گیا اور عمرو بن مسلم نے جو یہاں کا گورنر تھا ہندوؤں کے متعدد صوبوں پر حملہ کئے۔

جب عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید کی حکومت شروع ہوئی تو جنید بن عبدالرحمان یہاں کا حاکم مقرر ہوا جو خلیفہ ہشام کے زمانہ تک بحال رہا۔ اس کے بعد تمیم بن زید العتبی گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ گورنر بڑا فیاض تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کروڑ اسی لاکھ درہم جو خزانہ سندھ میں جمع تھے لوگوں کو تقسیم کر دئے۔ اس کے بعد حکم الکلبی یہاں کا حاکم ہوا اور اسی کے زمانہ شہر محفوظہ کی تعمیر ہوئی۔ اس کا جانشین عمرو بن محمد قاسم ہوا اور شہر منصورہ طیار کیا گیا۔ آخری گورنر بنو امیہ کی طرف سے یہاں منصور[۵] تھا۔

سلہ ۵ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منصور کو سفاح (بنو عباس کے اول خلیفہ) نے مامور کیا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ برہمن آباد کے کھنڈروں سے جو سکے برآمد ہوئے ہیں۔ انہیں بعض سکے منصور کے بھی ہیں جنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان کی طرف سے مامور تھا۔

جب بنو عباس کا دور شروع ہوا تو خلیفۂ اول سفاح کے زمانہ میں عبدالرحمان یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا لیکن منصور نے اس کو شکست دی۔ اس کے بعد موسیٰ بن کعب بھیجا گیا اور اُس نے منصور کو مغلوب کر لیا۔

سفاح کے بعد خلیفۂ منصور کے زمانہ میں ہشام یہاں کا گورنر مقرر ہوا۔ اُس نے تمام اُن مقامات کو فتح کیا جو مسلمانوں کے اقدام میں حائل تھے۔ اُس نے ایک بیڑہ عمرو بن جمل کی سرکردگی میں بردہ[۱] روانہ کیا اور ایک لشکر مملکت ہند کی طرف جو پنجاب تک پہونچکر ملتان پر قابض ہو گیا۔ اسی زمانہ میں قندابیل بھی فتح ہوا۔ (جس کا ذکر آپ نے اپنے استفسار میں کیا ہے) قندابیل سے مراد قندہار نہیں ہے۔ بعض مستشرقین نے خلیج کبایت کے قریب اس شہر کا واقع ہونا ظاہر کیا ہے بعض نے اس کو گندہارا (بالائی حصہ سندھ کا ایک شہر) سمجھا ہے۔ حالانکہ اس کا صحیح نام گندادار ہے جو کاٹھیاوار کے ایک مقام کا نام ہے)

خلیفۂ ہارون الرشید کے عہد میں بہت جلد جلد یہاں کے گورنر تبدیل کئے گئے تاکہ وہ زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے خود سر نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد دوسرے خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں بھی سلسلۂ فتوحات جاری رہا اور ساکورہ بگر، بھم پور، قیقان، قندابیل وغیرہ قبضہ میں آئے (ان تمام مقامات کی جغرافی تحقیق کہ اُنکی اصل جائے وقوع کہاں تھی اور اب انکا کیا نام ہے، اور کہاں ہیں۔ کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں)

خلافت عباسیہ کا زوال المستعصم کے عہد سے شروع ہو گیا تھا جس کی تکمیل المقتدر و المعتمد کے وقت میں ہوئی۔ موخرالذکر خلیفہ کے زمانہ میں سندھ کی حکومت یعقوب بن لیث صفاری کے سپرد کی گئی۔ جس کے انتقال پر یہ حکومت ملتان اور منصورہ دو مستقل سلطنتوں میں قائم ہو گئی۔

مسعودی ۳۰۳ھ میں یہاں آیا تھا، اس لئے ان دونوں سلطنتوں کا حال مروج الذہب میں لکھا ہے کہ:۔

"ملتان کی سلطنت خراسان تک وسیع تھی اور قریش خاندان کا ایک امیر یہاں حکمراں تھا اور قنوج بھی اسی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ منصورہ میں بھی ایک قریشی نسل کا سردار ابوالمنذر بن عبداللہ حکمران تھا ریاست منصورہ سمندر سے آلور تک وسیع تھی اور اُس میں تین لاکھ گاؤں تھے۔"

خلیفۂ المطیع باللہ اور القادر باللہ کے عہد میں ابن حوقل ہندوستان آیا تھا اُس نے اپنے چشم دید حالات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:۔

---

[۱] اس مقام کو بارند، باریہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بیرونی نے اس کا نام بارَوَہ یا بارُوا لکھا ہے۔ اس سے مُراد مقام جیتوار ہے جو سرحد گجرات پر واقع ہے۔

"ملتان، منصورہ سے چھوٹا شہر ہے۔ یہاں کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تاتاری اور قندہاری درہم کا رواج ہے۔ ملتان اور منصورہ دونوں آزاد حکومتیں ہیں۔ الور[۵] جو ہندوؤں کا قدیم دارالسلطنت تھا، اُس کی تحصیل دُہری ہے اور منصورہ کی حکومت میں شامل ہے۔ سوائے ان دو سلطنتوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں پائی جاتی ہیں۔ ایک ریاست توران ہے۔ جس کا حاکم ابوالقاسم باشندہ بصرہ ہے، دوسری ریاست قصدار ہے۔ جس کا حاکم ایک عرب نژاد معین بن احمد ہے، تیسری ریاست مکران ہے۔ جس کا دارالریاست قیز ہے۔ اس کی آبادی ملتان سے نصف ہے۔ یہاں کا حاکم عیسےٰ بن معدان ہے۔ چوتھی ریاست مشکی ہے جو مکران کی سرحد پر ہے۔ منصورہ، ملتان و دیگر اضلاع میں عربی و سندھی زبان بولی جاتی ہے، و مکران میں مکرانی و فارسی"

ابن حوقل نے قرامطہ کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اثر سندھ میں بعد کو قائم ہوا۔ ابوالفداء کا بیان ہے کہ قرامطہ کو سنہ ۳۶۲ و سنہ ۳۶۳ھ میں مصر کے اندر سخت شکست حاصل ہوئی۔ غالباً اس شکست کے بعد یہ جماعت سندھ کیطرف آئی۔ اور چونکہ سارا سندھ منتشر حالت میں تھا اس لئے اُنھوں نے منصورہ اور ملتان پر قبضہ کرلیا، جہاں سے اُن کو محمود غزنوی نے نکالا۔

عربوں نے جس شان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور جو نمایاں کامیابی اُنھوں نے حاصل کی، اسکا اقتضاء یہ تھا کہ یہ پیش قدمی اور زیادہ جاری رہتی، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف سندھ کے اندر ان کی حکومت قائم ہوئی اور وہ بھی تین صدی کے اندر ہی اندر رفتہ رفتہ کمزور ہوکر نیست و نابود ہوگئی۔ اس کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی بڑی وجہ قبائل عرب کا باہمی نفاق تھا۔ اگر خلیفۂ اول یا دوم کے زمانہ میں سندھ فتح ہوگیا ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ آج ہندوستان کی تاریخ کسی اور نہج سے مرتب کی جاتی، لیکن سندھ بنو امیہ کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا جب عرب دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا تھا اور تمام وہ سازشیں جو ملک کو تباہ کرسکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جارہی تھیں۔ اگر محمدؐ قاسم اس قبیلہ پرستی کی بنا پر سندھ

---

[۵] اس مقام کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ مسعودی نے "الروڑ" لکھا ہے۔ ابن خورداذبہ "الدور" لکھتا ہے۔ اصطخری "الزور" کہتا ہے۔ اور ادریسی "دور" ــــــ اس شہر کے کھنڈر بھکر اور خیرپور کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور الور کے نام سے مشہور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کا اصل نام "اور" تھا۔ "ال" عربی کا زائد ہے۔ اب بھی انھیں کھنڈروں سے قریب ایک قصبہ "اوری" کے نام سے موجود ہے۔ جسے اُسی قدیم الور یا اَرور کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

سے بلا کر قتل نہ کر دیا جاتا تو یقیناً اس کا سلسلۂ فتوحات چین تک پہونچ جاتا، جیسا کہ حجاج ابن یوسف کا عزم و ارادہ تھا۔ پھر اسی کے ساتھ یہ وقت بھی تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے اصول حکومت بالکل جدید ہوتے تھے، اور ہر جدید حکمران کے ساتھ ساری دنیا نئی ہو جاتی تھی۔ اس لئے کبھی کوئی گورنر اطمینان و سکون کے ساتھ نہ سندھ میں حکومت کر سکا، نہ سلسلۂ فتوحات کو بڑھا سکا۔ اگر کسی نے اصلاحات شروع کیں اور آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کئے تو بدقسمتی سے خلافت بدل گئی۔ اور اس غریب کو بھی معزول ہو جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ عمال سندھ کا مرکز خیال بدل گیا۔ اور پایۂ تخت کے ساتھ ہمدردی نہ رہنے کی وجہ سے خود مختاری و خودسری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ چونکہ سندھ میں عرب کے مختلف قبائل آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے جب عرب میں قبائل کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو یہاں کے قبائل میں بھی اختلاف شروع ہو جاتا تھا۔

عہد بنی عباس میں بیشک بعض خلفاء ایسے ہوئے کہ یہ اختلاف چند دن کے لئے اُنھوں نے مٹا دیا۔ لیکن جب خلیفۂ معتصم کے زمانہ میں یمنی و نزاری کی نزاع شروع ہوئی تو سندھ پھر اختلاف کا شکار ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جب مرکز حکومت ضعیف ہو جائے گا۔ تو اس کا اثر نزدیک و دور ملک کے ہر حصہ پر پڑے گا۔ چونکہ عہد عباسیہ میں ہارون ہی کے زمانہ سے عجمیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا، اس لئے تمام اُن مقامات میں جہاں خالص عربی حکومت قائم تھی، ضعف پیدا ہونے لگا۔ یہانتک کہ آخر کار ایک وقت وہ آیا جب خوارج، قرامطہ، ملاحدہ اور روافض نے ساری سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا اور ہر جگہ حکومت کی عمارت متزلزل ہو گئی۔ چونکہ سندھ پایۂ تخت سے بہت دور واقع تھا، اور شورش پسند جماعتوں کے لئے ایک اچھی جائے پناہ بن سکتا تھا، اس لئے یہاں، خوارج و زنادقہ، ملاحدہ و علویین نے کافی قوت حاصل کر لی اور تمام مکران و سندھ میں پھیل کر سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا، چنانچہ اب بھی سندھ میں بہت سے خاندان سیدوں کے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو اُنھیں علویین کی اولاد میں سے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف سندھ کے اندر اپنے مستقل شہر قائم کئے بلکہ مشرقی ہندوستان تک بڑھ آئے اور اکثر موجودہ خاندان سادات انھیں علویین کی ذریات میں سے ہیں جو کسی وقت وادی سندھ میں آ کر ٹھٹا اور بھکر پر مستولی ہو گئے تھے۔

یہاں تک آپ کے پہلے سوال کا اور اسی کے ضمن میں چوتھے سوال کا جواب ہو گیا۔ دوسرے سوال کا جواب نہایت مختصر و آسان ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی حکومت اسلامی حقیقتاً عربوں کی تاریخ سے بالکل جدا چیز ہے اور اس کا تعلق صرف ترکوں سے ہے۔ جنھوں نے وسط ایشیا سے نکلکر

مختلف ملکوں اور زمانوں میں اپنے فتوحات کے سیلاب سے دنیا میں ہنگامہ برپا کردیا اور ساری دنیا اس سے زیر وزبر ہوگئی۔

تیسرے سوال کا جواب بہت اہم و تحقیق طلب ہے۔ اس لئے اجازت دیجیئے۔ کہ فی الحال آپ سے رخصت ہوں اور ماہ آئندہ میں اسپر توجہ کروں۔

مروت

ہم نے تو نہایت شوق سے اپنے باغ میں نارنگی کے درخت لگائے اور اُنکو ہمارے پڑوسی بھائی امجد کی بکری اس طرح چرگئی کہ اگر ہم نہ آجاتے تو جڑ بھی تناول فرما جاتی۔ اب اسوقت ہمارا دل تو یہی چاہتا ہے کہ بھائی امجد کو مارتے مارتے گرادیں۔ اور اُنکی بکری کے کباب بناکر تمام محلہ میں تقسیم کریں۔ یا اُسکو اتنا پیٹیں کہ وہ خود نارنگی کا درخت بن جائے۔ لیکن سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈنڈے لگاکر بکری کی ٹانگ توڑدیں۔ اور ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا، یا ہمارے دوست آئین ہمارے گراموفون کو اپنی بیوی کے نام سے مانگ کرلے گئے، اور وہاں اس میں اتنی کوک بھردی کہ وہ ٹوٹ گیا۔ اب ہم اس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں کہ اُن سے اُس کی مرمت کے لئے کہیں۔ حالانکہ ہم کو نیا گراموفون لینا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں لے سکتے۔ اسی طرح سراج نے ہماری گھڑی کا شیشہ توڑدیا۔ لیکن ہم نے ان کا سر نہیں توڑا۔ اس لئے کہ ان سے مراسم تھے۔ اور یہ ذرا اچھوتی سی بات تھی کہ ہم چار آنہ کے شیشہ کے لئے اُن کا قیمتی سر توڑدیتے لیکن اُنھوں نے فوراً دوسرا شیشہ لگوادیا حالانکہ اُن کو نئی گھڑی یا گھڑی کے دام دینا چاہیئے تھے۔ سلطان نے ہماری بائیسکل میں ایسا روگ پیدا کردیا ہے کہ وہ ایک قسم کی موٹر سائیکل ہوکر رہ گئی ہے۔ یعنی اُس کے مڈگارڈ چلنے میں "پھڑ پھڑ" ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ نئی بائیسکل یا دونئے مڈگارڈ بنواؤ۔ اس لئے کہ وہ کہدیں گے کہ میں نے ڈھبری لگوادی تھی اور ہم کو خاموش ہوجانا پڑے گا۔ بھائی جمیل کے لڑکے نے ہمارے قلم کا نب توڑدیا۔ لیکن ہمارے چہرہ پر ایک شکن بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ورنہ سب یہی کہتے کہ بچے کی غلطی پر افسوس کرتے ہیں۔ بلکہ جب بھائی جمیل نے دوسرا نب لگایا۔ اُسوقت بھی ہم سے یہ کہتے نہ بن پڑا کہ جو نب ٹوٹ گیا ہے وہ ایک پیسہ والا تھا اور جو لگ رہا ہے وہ اس سے بہت کم قیمت ہے۔

ہماری اس قسم کی باتوں کو لوگ مروت کہتے ہیں اور واقعی یہ مروت ہی ہے جس سے ہم شدید سے شدید نقصان اُٹھانے کے باوجود خاموش رہتے ہیں یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ نئی روشنی یعنی موجودہ دور میں مروت "آؤٹ آف فیشن" یعنی متروک ہوگئی ہے۔ لیکن جن لوگوں کی فطرت میں مروت داخل ہوچکی ہے جیسے ہم۔ وہ لوگ غیر ارادی طور پر مروت کرتے ہیں اور نقصان اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ اسوقت کامیاب انسان وہی ہے جس میں مروت کا نام نہ ہو اور انتہائی بدقسمت وہ ہے جس کی آنکھ میں مروت ہے۔ اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اپنے کسی دوست کو ایک رقم قرض دیکر معہ سود در سود واپس لے لیں تو یہ ہمارے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ ہم مروت سے مجبور ہوکر اصل رقم بہت خفیف منافع کے بعد لیکر خاموش ہورہیں گے لیکن اگر کوئی ایسا شخص جس میں مروت نہ ہو اپنے باپ کو بھی یہ قرض دیگا تو اصل رقم کی سہ گنی وصول کرے گا اور جبتک وصول نہ ہو جائے گی اتنے تقاضے کرے گا کہ بیچارے قرضدار کو کسی دوسرے قرض لیکر ان حضرت سے جان چھڑانا پڑے گی۔

محبت

سمندر کی فضا، کف در دہاں، موجیں لرزاں ہے
بپا ہیں، چار سو، ہمت شکن، محشر صداؤں کے
گرج ہے بادلوں میں، بجلیاں بہیم کڑکتی ہیں
شکوہ جنبشِ امواج سے دل کانپ جاتے ہیں
گرج، شورِ ہوا، بجلی کے کڑکے، جوششِ تاریکی
خروشِ ابر ہے ہنگامہ افگن، آسمانوں سے
گرفت بادِ طوفانی ہے، یکساں ماہ و ماہی پہ
زمیں پر اسطرف، امواج طوفانی میں، محشر ہے
پریشاں ہے، حیاتِ منضبط، اجزائے طوفانیں
جہاز اک منتشر سا جا رہا ہے، قلبِ دریا میں
کبھی موجیں اُٹھا کر سوئے گردوں، لیگئیں اُسکو
وہ جنبش ہے کہ ٹکڑے اُڑ گئے ہیں، بادبانوں کے
جھکولے پر جھکولے دے رہی ہے، بادِ موج افزا
بھڑکتی آگ سے کچھ شعلۂ مضطر لپکتے ہیں
مسافر زرد ہیں، باقی نہیں دم ناتوانوں میں
شکایت بھی تو ان سے ہو نہیں سکتی نصیبوں کی
معاذ اللہ! وحشت خیز، کتنی یہ گھڑی بھی ہے
پتہ کچھ سمت منزل کا، نہ کچھ احساس منزل ہے
غرض چھایا ہوا ہے اس قدر خوف پریشانی

بھیانک رات کی تاریکیاں ہیں، شورِ طوفاں ہے
چلے آتے ہیں، ہیبت ناک، سرائے ہواؤں کے
بسانِ "قلب ترساں" دہر کی نبضیں پھڑکتی ہیں
کہ یہ کوہِ گراں :: بشِ ہوا پر اُڑتے آتے ہیں
یہ کھلتا ہے کہ گرم کارہے اک جنگ بربادی
صدا پُرہول یا آتی ہے توپوں کے دہانوں سے
تلی ہیں قہرمانی قوتیں، تکسیر تباہی پہ
اُدھر اوجِ فلک سے بارشِ ہنگامہ پرور ہے
جڑیں ہلتی ہیں، دنیا کی ہجوم باد و باراں میں
کوئی تنکا، ہے یا امواج کے اس حشر برپا میں
کبھی گرداب نے چاہا، کہ کر دے تہ نشیں اُس کو
یہ عالم ہے کہ دل ہٹتے ہیں شیر افگن جوانوں کے
گماں ہے ناخدا کا ہر قدم پر یہ کہ اب ڈوبا
یہ موجیں ہیں کہ منہ کھولے ہوئے اژدر لپکتے ہیں
کہ یہ سہمے ہوئے، بیٹھے ہیں، طائر آشیانوں میں
لہو شاید رگوں میں جم گیا ہے ان غریبوں کی
زبانیں بند، مرگِ ناگہاں آنکھوں میں پھرتی ہے
نظر، لبریز غم، سینے میں اک ڈوبا ہوا دل ہے
کہ عجز نامرادی بن گئی ہے عقلِ انسانی،

ادھر یہ "عالم تخریب" ہے بیدار طوفاں میں
یکایک سازِ غم سے نغمۂ عشرت نکلتے ہیں۔
وہ دیکھو نور کی اک لَو زمیں سے آسماں تک ہے
سرودِ زندگانی، ذرہ ذرہ اب، سُناتا ہے
نہ اب وہ جوش ہے، بپھری ہوئی امواجِ طوفانیں
نہ ہمت آزما بجلی کے کوندوں کا وہ عالم ہے
جہاز اب سطحِ دریا پر رواں ہے مطمئن ہو کر
ربابِ عیش ہے، ہر موج رقصاں، شادمانی سے
نئے انداز سے عشرت فشاں جلوے نکھرتے ہیں
فضا میں، بادلوں کے پاس۔ اک حلقہ ہے نورانی
صدائیں روح پرور گونجتی ہیں، "امن و راحت کی
محبت ہی یہاں صرف ایک رازِ کامرانی ہے"

اُدھر فطرت کہ ہے گرمِ عمل تعمیرِ دوراں میں
ہوائیں جھوم جاتی ہیں یہ نظارے بدلتے ہیں
بہار جلوہ گر، نبتانِ ہستی سے جہاں تک ہے
یہ عالم ہے کہ ہر گوشہ زمیں کا مسکراتا ہے
نہ اب وہ زور ہے ہنگامہ پرور بادوباراں میں
نہ وہ عفریت پیکر بادلوں کا شورِ پیہم ہے
فسانہ رہ گیا طوفاں کا آخر مختصر ہو کر
ترانے اٹھ رہے ہیں دلنشیں دھیمی روانی سے
چمن بیدار ہوتے ہیں، ستارے وجد کرتے ہیں
مہ و خورشید کو شرما رہی ہے جسکی رخشانی
کہ اس حلقے میں ہے "نوزائیدہ ذیوی" محبت کی
کہ طوفاں خیز عالم اور جہازِ زندگانی ہے

سید علی اختر اختر

مغربی پھول

دیکھا جو میں نے دور سے مسحور ہو گیا
جی چاہتا تھا تیری نزاکت کی داد دوں
اس وضعِ شاندار کا مدحت سرا بنوں
لکھوں قصیدہ تیرے تناسب کا شاندار
منہ تیرا جھک کے فرطِ محبت سے چوم لوں
سونگھا جو بڑھ کے دل میں پشیماں سا ہو گیا
مغرب کے پھول! تجھ میں نزاکت ہے بو نہیں
رنگِ نظر فریب پہ بھولا ہوا ہے تو

کیفیتِ نظارہ سے مسرور ہو گیا
رنگت کی داد دوں تری صورت کی داد دوں
اس حسنِ باوقار کا مدحت سرا بنوں
تیری ادا ادا پہ دل و جاں کروں نثار
"تجھکو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں"
فقدانِ بُو سے قلب پریشاں سا ہو گیا
میرے مشامِ جاں کو تری آرزو نہیں
اک برق پا نمود پہ پھولا ہوا ہے تو

آں گُل کہ بوئے خوب ندارد عزیز نیست
دلبر کہ خوئے خوب ندارد عزیز نیست

امین حزیں

سرودِ نیم شبی

(۱)

یہ رات بلاخیز، یہ پرہول فضائیں
ظلمت کی قبائیں
پہنے ہیں ہوائیں
گاتی ہیں گذرتی ہوئی غم ناک نوائیں
ہر سمت ہیں گونجی ہوئی دہشت کی صدائیں
کرتی ہے اجل دور سے ہنس ہنس کے اشارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۲)

اس نیم شبی کیف میں اب نیند کی پریاں
ہیں مست خراماں
رخ سوئے شبستاں
تکتی ہیں نظر خانہ میں سب خواب کا داماں
ہنستا ہے کوئی سونے میں، کوئی ہے پریشاں
بیٹھا میں غرض دیکھ رہا ہوں یہ نظارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۳)

گل ہنستے ہیں کھولے ہوئے اپنا رُخِ رنگیں
یہ لالۂ و نسریں
رشکِ مہ و پروین
نکہت سے صبا کہتی ہے افسانۂ غمگیں،
شبنم کے لئے کھولے ہے نکہت در زریں
تاریک فضاؤں میں ہیں چمکتے ہیں ستارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۴)

ڈوبی ہوئی اک کیف کے عالم میں ہے دنیا
یا مستی صہبا
چھائی ہے ہر اک جا
سب ڈوب گئے خواب میں اے جانِ تمنّا
تو آکے سرِ بام ہو اب محوِ تماشا
آتی نہیں نیند آہ مجھے رنج کے مارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(۵)

نکہت سے صبا ملتی ہے، اور پھول سے شبنم
کس جوش میں باہم
مستانہ و بے غم
سورج کی کرن ملتی ہے شبنم سے سحر دم
موجیں لب ساحل سے ملا کرتی ہیں پیہم
ملتا نہیں کیوں مجھ سے تو اے آنکھ کے تارے
رقصاں ہیں مرے دل میں محبت کے شرارے

(شمیمی بی۔اے)

یادِ ایام

(۱)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
تصورِ محوِ حیرت تھا فلک پر!

کہاں وہ دن کہ جب دل میں تڑپ تھی!
تخیل کی عناصر سے جھڑپ تھی!

(۲)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
گدائے نور تھے انجم مہ و مہر!

کہاں وہ دن کہ جب دل میں ضیا تھی!
خدا جانے وہ کس شمعِ بزم کیا تھی!

(۳)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
حریمِ ناز تھی میری کفِ خاک!

کہاں وہ دن کہ جب دل میں سحر تھی!
شبِ دیجور کی کس کو خبر تھی!

(۴)

کہاں وہ دن کہ جب پہلو میں دل تھا!
مرے نالوں میں تھا اک عالمِ سوز!

کہاں وہ دن کہ جب دل میں خلش تھی!
رگِ جانِ حزیں وقفِ تپش تھی!

امین حزیں

اک لمحۂ حیات!

اُن کے ہونٹوں پہ تبسم ہی نہایت بے حجاب
یہ مری مایوسیاں اور اسقدر ہنگامہ خیز
میں اس اک لمحے کو عمرِ جاوداں سمجھا کیا

ہو گیا شاید مرا حالِ تباہی کامیاب
یہ مری ناکامیاں یارب! اور اتنی کامیاب
جس میں آیا اور رخصت ہو گیا عہدِ شباب

ساغر (نظامی)

غزلیات

(اظہر نعمانی)

تا بکے اے ہم نفس خونِ تمنا کیجیے
بے زباں بن جائیے اور ان کو دیکھا کیجیے

گھٹ رہی ہے گوشۂ دل میں تمنائے جمال
آپ یوں مشتاقِ نظر دل سے نہ پردا کیجیے

تابِ نظارہ کہاں ہے صورتِ چشمِ کلیم
محوِ حیرت کو نہ ممنونِ تماشا کیجیے

المدد اے نالۂ دل ضبط کی حد ہو چکی
خود بھی رسوا ہو جیے انکو بھی رسوا کیجیے

ہے ترحم کی ادا طرزِ تغافل کے خلاف
وعدۂ باطل کو کیوں مرہونِ ایفا کیجیے

عرضِ مطلب سنکے پڑ جاتی ہے ماتھے پر شکن
روبرو انکے نہ چپ رہیے تو پھر کیا کیجیے

خود سکونِ قلب وجہ انتشارِ قلب ہے
زندگی بے کیف ہے پھر درد پیدا کیجیے

حیلہ جوئی ہے شعار انکا تو اظہر کس لئے
انتظارِ وعدۂ امروز و فردا کیجیے

(جگر بریلوی)

لیجیے تابانیٔ عالم کے ساماں ہو گئے
دل کے ذرے اڑ کے ہر جانب پریشاں ہو گئے

فرطِ تنہائی سے مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا
کیا کہیں غم سے مگر کچھ عہد و پیماں ہو گئے

اب میں سمجھا سینۂ سوزاں کے شق ہونیکا راز
آپ پنہاں کیا ہوئے گویا نمایاں ہو گئے

جن کو ہونا ہی نہ تھا راہِ محبت میں غبار
کسطرح وہ خاک کے پتلے پھر انساں ہو گئے

صحبتِ احباب میں حاصل ہوا وہ لطفِ نسبت
آج ہم بھی قائلِ فردوسِ رضواں ہو گئے

حسن نے روزِ ازل جب رخ سے سرکائی نقاب
چند جلوے رنگ بنکر بزمِ امکاں ہو گئے

رفتہ رفتہ آرزوئے رستگاری مٹ گئی
رہ کے زنداں میں جگر آزادِ زنداں ہو گئے

(سنجر عظیم آبادی)

بیدار کر تو جلوۂ بے انتہا مجھے
ہے خواب زندگی ستم ناروا مجھے

اے کیف بیخودی ترے صدقے ہزار ہوش
رگ رگ میں پھر رہا ہے کوئی ڈھونڈتا مجھے

دُہرا رہا ہوں قصۂ ہستی کو بار بار
ملتا نہیں ہے دہر میں میرا پتا مجھے

ہر شوق بزم ناز میں ایذا پسند ہے
مرنے نہ دیگی حشر میں تیری ادا مجھے

وہ صورتِ مجاز میں شاید ہو جلوہ گر
اے دل اسی امید پہ جینا پڑا مجھے

دلتنگی زمانہ سے امید واریاں
اس وسعتِ خیال نے رسوا کیا مجھے

صبحِ وطن کے جلوۂ پنہاں ہیں منتشر
کس نے یہ خواب زیست سے چونکا دیا مجھے

حیراں کئے ہے محفل ہستی میں ایک ایک
سنجر یہ عکس آئینہ خود نما مجھے

(شاد صابری)

نہ پہونچا ہے نہ پہونچیگا تصور تک ہاں اپنا
جہاں جلووں میں نظر بن ڈھونڈتی ہے آشیاں اپنا

اگر ملتی مجھے آزادیٔ فکر تصور بھی
قفس کے سامنے تعمیر کرتا گلستاں اپنا

نہ دے تکلیفِ اظہارِ حقیقت اے دلِ ناداں
میں حبکا راز ہوں وہ آپ ہی ہے راز داں اپنا

وہیں کھولی ہے چشم ضبط میری سوزش دل نے
مقید تھا جہاں نظارۂ جوشِ نہاں اپنا

فضائے لامکاں تو آگئی، پرواز اب کبتک
دکھا اے طائر حسن تصور، آشیاں اپنا

ضعیفی نے مٹادی طاقت و تابِ توانائی
کہاں لوٹا گیا اللہ اکبر کارواں اپنا

درِ مقصود پر لاکھوں سجودِ شوق ادا کرکے
جبینِ شوق کو اے شاد سمجھا آستاں اپنا

(شباب بدایونی)

کیا سمجھکر شکوہ سنجِ اضطرابِ دل ہوں میں،
ناز ہے مجھکو کہ جورِ دوست کے قابل ہوں میں

کام آتی ہیں زمانے کے مری ناکامیاں
دیدۂ عبرت طلب کی سعی کا حاصل ہوں میں

دیکھ یہ آنکھوں سے ٹپکے اشکِ خوں اے چارہ گر
ترکِ عشق اچھا ہے لیکن کیا اب اس قابل ہوں نہیں؟

کم نگاہی نے تری کھویا مگر ذوقِ نظر
یوں تو ہو بیٹھے سلیٔے ہوں اور سرِ محفل ہوں نہیں!

کیا کہوں کیا کیا تھپیڑے دہر کی ہیں موجِ غم
آ کے ساحل پر بھی وقفِ حسرتِ ساحل ہوں نہیں

ایک مجبورِ الم کی ہائے یہ ناکامیاں
جان دینے کو بھی وقفِ منتِ قاتل ہوں نہیں

چارہ گر اب [illegible] کو حد سے گزر جانے بھی دے
رحم کر مجھ پر کہ جویائے سکونِ دل ہوں نہیں

پیش و پس اب کس لئے راہِ طلب آسان ہے
مژدہ اے دل بے نیازِ خطرۂ منزل ہوں نہیں

ہو بھی تو دل سے کوئی سرگرمِ سعیِ جستجو
بول اُٹھے شوقِ طلب خود رہبرِ منزل ہوں نہیں

بے وفا سے کر رہا ہوں شکوۂ فرقتِ شباب
وائے ناکامی کہ محوِ سعیِ لا حاصل ہوں نہیں

(سید محمد عمر شمس حیدرآبادی)

فلک بھی کانپتا ہو جس سے میں وہ آہِ بسمل ہوں
مری فریاد سے ڈرنا کہ میں ٹوٹا ہوا دل ہوں

مری وارفتگی ہی میری بربادی کا باعث ہے
میں اپنے حق میں گویا خود ہی اک زہرِ ہلاہل ہوں

سراپا اک نگاہِ یاس ہوں اس بزمِ ہستی میں
نہ اُبھرا جو کسی صورت سے وہ بیٹھا ہوا دل ہوں

حیات اور موت کی تصویر ہے رودادِ الفت کی
کبھی زندوں میں شامل ہوں کبھی مُردوں میں داخل ہوں

عجب پُر کیف حالت ہے کہاں جھگڑے من و تو کے
بھلا دے دل سے جو دنیا کو وہ محویتِ دل ہوں

خودی نے پردۂ غفلت مری آنکھوں پہ ڈالا ہے
مآلِ کار سے جو بے خبر ہے میں وہ غافل ہوں

نہ تابِ ضبط ہے دل کو نہ یارائے فغاں مجھ میں
ورائے کاروانِ یاس ہوں، گم کردہ منزل ہوں

اُمیدیں مجھ سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں حسرت سے
میں اس بحرِ حوادث میں لبِ خاموشِ ساحل ہوں

یہ ہستی شمس میری کیا سراپا ننگِ ہستی ہے
نہ میں دنیا کے لائق تھا نہ میں عقبیٰ کے قابل ہوں

(قیس شیروانی)

راہِ الفت میں سکوں کیسا کہ منزل دور ہے
ہاں ابھی انجامِ کارِ حسرتِ دل دور ہے

ہو نہ جائے کشتیٔ دل رہنِ گردابِ فنا
موجزن دریائے بیتابی ہے ساحل دور ہے

یہ فریبِ جذبِ دل ہے یا طلسمِ آرزو
جان سے نزدیک بنتے ہیں مگر دل دور ہے
حسرتِ دل رہروانِ عشق کی ہے دید نی
راستہ ہمت شکن ہے اور منزل دور ہے
کیوں ہجومِ یاس حسرت گوشہ گیرِ دل نہ ہو
قطع ہے دستِ طلب دامانِ ساحل دور ہے
قیس ہے دامن کشاں بیسود لیلائے امید
جبکہ آوازِ جرس کہتی ہے محمل دور ہے!

(محمودؔ الہ آبادی)

ہاں جنوں انگیز اتنا نعرۂ مستانہ تھا
ذرے ذرے میں جہاں کے کیفِ مجنونانہ تھا
اضطرابِ دل سے پیرپاؤں تک اٹھتے نہ تھے
میں کھڑا تھا سامنے اور روا درِ جانا نہ تھا
اُسکے ایک اک لفظ پر سب اہلِ دل رہتے رہے
درد و غم میں اسقدر ڈوبا ہوا افسانہ تھا
روح کو کیونکر پلاتا بادۂ ذوقِ نشاط
ساغرِ دل میرا اک ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا
ذرہ ذرہ کر رہا ہے رقص بزمِ دہر کا
اللہ اللہ کس بلا کا نعرۂ مستانہ تھا
یہ بھی اک اعجاز تھا محمودؔ وحشت کا مری
جسطرف آنکھ اُٹھ گئی ویرانہ ہی ویرانہ تھا

(ناطقؔ جیلانی گلاوٹھوی)

ہمیں جو یاد ہے ہم تو اُسی سے کام لیتے ہیں
کسی کا نام لینا ہو اُسی کا نام لیتے ہیں،
ابھی ہم جان دیکر سوئے ہیں دم لیکے اُٹھینگے
نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں
نکل جاتے ہیں جب وہ ہاتھ آ کر کیا کمیں دل کی
نکل جاتا ہے جب دامن کلیجہ تھام لیتے ہیں
کسی نے کیا کہا ہم کیا بتائیں یہ تو دنیا ہے
ہزاروں نام رکھتے ہیں ہزاروں نام لیتے ہیں
نہیں لینا ہے کچھ جا کر اگر بازارِ ہستی میں
تو اچھا لاؤ دیدہ وہم دل ناکام لیتے ہیں
غضب ہے نا کہ اُن کو شرم بھی آتی نہیں ناطقؔ
ڈبو کر نام جو اپنے بڑوں کا نام لیتے ہیں،

مطبوعاتِ موصولہ

موجِ تبسم ۔ جناب شوکت تھانوی کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے جسے بجائے "طوفانِ تبسم" یا "سیلابِ تبسم" کے "موجِ تبسم" کے نام سے جناب نسیم انہونوی نے شائع کیا ہے۔ ممکن ہے لفظ موج کی تعیین کی نسیم صاحب نے خود اپنے نام کی لطافت و نزاکت کا لحاظ رکھا ہو۔

شوکت تھانوی اُن چند مخصوص مزاحیہ نگاروں میں سے ہے جن کے ذکر سے اُردو لٹریچر کی تاریخ خالی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو مزاح شوکت کے مضامین میں پایا جاتا ہے وہ ایسا نرم، لطیف و شبک ہے کہ کسی اور جگہ پایا ہی نہیں جاتا۔

جس طرح شاعر پیدا ہوتا ہے اُسی طرح مزاحیہ نگار بھی بنتا نہیں۔ لیکن اُسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جسطرح ایک شاعر فرطِ احساس یا ماحول کے اثرات سے بگڑ کر مرثیہ گو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مزاحیہ نگار بھی ادنےٰ بے احتیاطی سے مسخراپن جاتا ہے۔ چنانچہ ملک کے موجودہ مزاحیہ نگاروں میں سے بعض اسی مصیبت میں مبتلا نظر آتے ہیں جسطرح بعض لکھنوی غزل گو، مرثیہ نگاری کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً تنقید کی ایک قسم ہے اور میرے خیال میں بہترین قسم کی ہے۔ چونکہ اس رنگ کے لکھنے والے کی "تلخ گفتاریاں" ہمیشہ خوشی سے برداشت کر لیجاتی ہیں۔ اس لئے "شخص مجروح" کو بھی سمجھنے اور انصاف کرنے کا موقعہ ملجاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں نہیں پہونچتی۔

مزاحیہ نگاری حقیقتاً ایک مستقل موضوع ہے، جس پر اصولاً، تاریخاً اور روایتاً بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن اس کا موقع موجِ تبسم کے تنقید کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت تھانوی کی یہ کتاب آپ جس نگاہ سے بھی دیکھیں گے قابلِ قدر نظر آئے گی۔

ہر چند نگار میں اسوقت تک شوکت صاحب کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ لیکن ملک کے مختلف رسائل میں اُنکے افکار شائع ہوتے رہتے ہیں اور پورے لطف کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں تقریباً ایک درجن مضامین ہیں، جن میں سے بعض غیر مطبوعہ بھی ہیں اور بلا استثنا سب کے سب پُر لطف ہیں۔

اس مجموعہ میں جناب نسیم کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے اور خوب ہے۔ لیکن ان کی یہ ستم ظریفی ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اُنھوں نے اس مجموعہ میں فہرست شامل نہ کر کے کم از کم مجھے ضرور اُس ریب و وہم میں مبتلا کر دیا کہ اگر کوئی

مجھ سے پوچھے کہ اس مجموعہ میں کتنے مضامین ہیں تو میں کبھی صحت کے ساتھ نہ کہہ سکوں گا۔

شوکت صاحب اور نسیم صاحب کی تصاویر بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جس سے مقصود شاید اس ردِ عمل میں قوت پیدا کرنا ہے، جو "مزاحیہ صحبت" کے بعد کبھی کبھی از خود رونما ہوتا ہے، لیکن میں ناظرین نگار کو یقین دلاتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کی صورت حقیقتاً ویسی نہیں ہے جیسی اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ معہ محصول ہے اور نگار بک ایجنسی سے مل سکتا ہے۔

شوپنہار

یہ ایک رسالہ ہے جسے نگار کے مشہور افسانہ نویس مجنوں گورکھپوری نے جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات اور اُس کے فلسفہ کی تنقید میں لکھا ہے۔ شوپنہار دورِ حاضر کے اُن فلاسفہ میں سے تھا جن کی نظیر تاریخ عالم میں بمشکل سے ملتی ہے۔ یہ فخر صرف شوپنہار ہی کو حاصل تھا کہ اس کی فلسفہ طرازیوں سے لوگوں نے شعر و شاعری کا سا لطف اُٹھایا۔

غالباً کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ مجنوں نہ صرف افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ وہ نہایت بلند فلسفیانہ ذوق بھی رکھتے ہیں اور یہ دونوں باتیں ان میں اسقدر حسن کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ شوپنہار کی طرح ہم اُنکے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان دونوں میں سے کونسا عنصر ان میں غالب پایا جاتا ہے۔ اس لئے شوپنہار کے فلسفہ کو اردو میں منتقل کرنیکے لئے مجنوں سے زیادہ اہل کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ فلسفہ کے خشک مباحث پر اُنھوں نے کسقدر شگفتگی و ادبیت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور مجھے افسوس ہوگا اگر پبلک نے اس خصوصیت کا لطف حاصل نہ کیا۔ کتاب نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ سنہری جلد میں شائع ہوئی ہے اور شوپنہار کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے قیمت ایک روپیہ ہے اور ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتی ہے۔ دفتر نگار سے بھی

بسم اللہ

نگار

جلد　فہرست مضامین ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء　شمارہ ۴

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء شمار (۴)

ملاحظات

حکومت ترکی کی آزادروی کے متعلق ہندوستان کے مسلم اخباروں میں، جسوقت کوئی خبر نظر آتی ہے، تو ہمیں اتنا متعجب نہیں ہوتا، جس قدر ان اخباروں کی توجیہ وتادیل کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اگر کبھی وہاں سے خبر آجاتی ہے کہ حکومت ترکی نے قدیم شکستہ مسجدوں کو مسمار کر کے چمن بنا دئے ہیں، اذان کا طریقہ انھوں نے لاسلکی مکبر الصوت کی صورت میں رائج کیا ہے، عورتیں بے نقاب احتفالات رقص میں شریک ہوتی ہیں۔ عربی رسم الخط کو مٹا کر انگریزی حروف کو اختیار کیا جارہا ہے۔ مغربی ٹوپی لباس کا جزو قرار دیگئی ہے، مذہبی دفعتی تعلیم کے ساتھ ہمدردی اُٹھتی جارہی ہے، علماء مذہب کو کوئی مخصوص شرف و امتیاز نہیں دیا جاتا، نماز کا مفہوم وہاں صرف عبادت (اور عبادت بھی قومی اجتماع کے اصول پر) نہ رہ کر اسوقت بینڈ بجانے کا دستور ہوتا جارہا ہے، الغرض ترکی کے متعلق جب کوئی خبر ایسی آجاتی ہے جو ہندی مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے قابل نفرت و استکراہ ہے، تو بعض اڈیٹروں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ ان خبروں کو دشمنوں کا پروپگنڈا قرار دیکر ان کی صحت سے انکار کردیتے ہیں، کیونکہ ان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایک قوم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے اس قدر "نامسلمانی" کا اظہار کرے، اور بعض انکو صحیح جان کر ترکی کی گمراہی و ضلالت والحاد پر اظہار افسوس کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔

پھر سوال یہ نہیں ہے کہ ترکی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ گفتگو اس میں ہونی چاہیئے کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ اگر آج غلط ہے تو کل تک صحیح ہونیوالا ہے یا نہیں۔ اگر اندیشہ ہونے کا ہے تو پھر یہ غور کرنا چاہیئے کہ اسکے اسباب کیا ہیں؟

ہمارے یہاں کے علماء کرام کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آج ساری دنیا کے مسلمان ان عقائد سے ہٹ جائیں جن پر مذہب اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا ظاہر کیا جاتا ہے، تو وہ حد درجہ استغنا کے ساتھ کہدینگے کہ اسلام اور خدائے اسلام کسی کا محتاج نہیں اگر روئے زمین پر کوئی مسلمان سوائے ان کے، باقی نہ رہے تو کیا پرواہ ہے۔ حالانکہ ان کو غور کرنا چاہیئے کہ اگر وہ تمام عالم کے مسلمانوں کو جہنم کے سپرد کرکے خود تنہا جنت میں بیٹھ گئے تو انھیں کیا خاک لطف آئے گا۔ اور حور و قصور، فردوس و سلسبیل کی ضرورت وجود پر کس چیز کو بطور حجت پیش کیا جائیگا۔ برخلاف اس کے اگر وہ اپنی محدود و مختصر جماعت کو علیحدہ رکھ کے باقی سب کو فردوس کا مستحق قرار دیں تو بیشک اس میں ایک بات ہے اور اس سے کچھ خدا کی خدائی بھی ظاہر ہوتی ہے ورنہ یوں تو کائنات کا مفہوم صرف ایک خدا اور چند مولویوں سے زیادہ کچھ نہیں قرار پاتا۔

الغرض یہ لوگ خدا کی بے نیازی ظاہر کرنے میں یہ تو آسانی سے کہدیتے ہیں کہ اسے مطلق پرواہ نہیں، اگر ساری دنیا کافر ہو جائے، لیکن کبھی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا خدا، اسلام کا پابند ہے، اور جسطرح وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے، کیا اسی طرح وہ اسلام سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کا مبتلائے کفر ہو جانا اسکو نقصان نہیں پہونچا سکتا، تو سارے عالم کا مسلمان ہو جانا بھی اسکی عظمت و برتری میں کسی اضافہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔

پھر جب مذہب ملت کے مسائل میں، خدا اور اسکی مرضی کا سوال اٹھ گیا، تو کفر و اسلام کا فرق کوئی خدائی امتیاز نہ ٹھیرا، بلکہ صرف عقائد کا اختلاف اور اصول اخلاق کا اختلاف ہوا اور عقائد و اصول بھی وہ جنھیں خود انسان نے بنایا ہے پھر ایک انسان یہ دعوے تو کر سکتا ہے کہ اسکے بنائے ہوئے قواعد حیات و معاشرت ایک مخصوص ملک و عہد کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، لیکن وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو اصول زندگی اب سے دو ہزار برس قبل پائے جاتے تھے، وہی اب بھی پائے جاتے ہیں یا جو اب موجود ہیں وہ آئندہ دو ہزار سال کے بعد بھی اسیطرح قائم رہیں گے۔ جبکہ اصول اخلاق و معاشرت انسان کی ذہنیت کے تابع ہیں اور انسانی ذہنیت کا وقت اور ماحول کے لحاظ سے تغیر پذیر ہونا ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔

پھر اگر آج ترکی، مولویوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد سے منحرف ہو رہا ہے تو دنیا میں وہ کونسی قوت ہے جو اسکی موجودہ ذہنیت کو بدل سکتی ہے، جبکہ اب کا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس کی ترقی کا راز ہی ان اصول سے انحراف کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ترکی کی ترقی اسوقت سے شروع ہوتی ہے جب اس نے خلافت کی زنجیر سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور چونکہ خلافت بھی مولویوں ہی کا مسلط کیا ہوا عذاب تھا۔ اس لئے قدرتاً اس کو اس جماعت سے متنفر ہونا چاہیئے تھا۔ اور اس تنفر کے بعد قدرتاً ان تمام اصول سے بیزار ہو جانا چاہیئے جو اسکے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اسلئے اگر حالات یہی ہیں تو بہت جلد وہ وقت آنیوالا ہے

حب مذہب کا بعید ترین واسطہ بھی مفقود ہو جائے گا۔ اور اگر انھوں نے زیادہ تنگ نظری سے کام لیا تو ان کے مذہب کا نام ترکیت بلکہ صرف انسانیت قرار پائے گا جو نہ وضع و لباس کو دیکھتی ہے، نہ کسی مخصوص عبادت و نیالیش کو بلکہ صرف اخلاق کو، اصول تہذیب و تمدن کو، اور اُس جذبہ کو جو تمام انسان کو ایک ہی رشتہ سے منسلک کرنیوالا ہے۔ پھر اگر یہ اصول حقیقتاً غلط ہیں، اگر یہ ذہنیت گمراہی ہے، تو اس غلطی و ضلالت کے ثبوت کا بار کس پر ہے؟ اُن پر جو اُن کو صحیح سمجھکر اختیار کئے ہوئے ہیں، یا اُن پر جو اُن کی غلطی کے مدعی ہیں۔

ہمارے یہاں کے علمبرداران مذہب اس امر کے لئے تو بیقرار ہیں کہ انکا اقتدار بدستور قائم رہے، منصب ہدایت ان سے نہ چھینا جائے، لیکن وہ اس کی فکر نہیں کرتے کہ لوگوں کے خدشات قلب دور کریں، اپنی تعلیمات میں تمدن حاضرہ کے اقتضاء کے مطابق تغیر و تبدل کریں، اور خود اپنے اندر وہ ذہنیت پیدا کریں جو اس دور علم و حکمت کی ترقیوں کا ساتھ دے سکے۔

اب زمانہ وہ ہے کہ الہام و وحی کے مفہوم کو صرف تبلیغی مکر و فریب سمجھا جاتا ہے، کتب مقدسہ و ملہمہ کے بیانات کو بربنائے تحقیقات تاریخی غلط ٹھیرایا جارہا ہے، تعلیمات مذہبی کو ناقص و ناکمل ثابت کرکے اُسے تقویم پارینہ بتایا جارہا ہے اسلئے میرے نزدیک اب سوال مقابلہ کا نہیں ہے، بلکہ سپر ڈالدینے کا ہے یا پھر مذہب کو اسقدر بلند لیجانے کا کہ ان تمام اعتراضات کی دسترس سے دور ہو جائے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ایران کی موجودہ ذہنیت کو پیدا ہوئے چند سال سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا، لیکن وہاں کا بھی یہ حالم ہے کہ جو خواتین گھروں کے اندر سے باہر دہلیز میں بھی قدم رکھنا پسند نہ کرتی تھیں، آج بے نقاب ہیں، آزاد ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے بالوں کو بھی مغربی تقلید میں خیرباد کہہ چکی ہیں۔ مصر پر اس سے قبل ہی یہ زمانہ آچکا ہے اور افغانستان بھی خدا جانے کہاں پہونچ گیا ہوتا اگر وہاں کی ترقی کو قصداً قوت و عسکریت سے نہ دبا دیا جاتا۔

موجودہ عہد صرف علم و عمل کا عہد ہے، لیکن وہ علم و عمل نہیں جو صرف خانقاہوں اور مسجدوں کو آباد کرنیوالا ہے بلکہ وہ، جو انسان کی خوشحالی، نشاط انگیزی اور آسودگی قلب و دماغ کا ضامن ہے، اور وہ جسے ہم جنات عدن بھی کہہ سکتے ہیں اور فردوس بریں بھی۔ پھر دنیا کا کوئی ملک نہیں جو اس کے حصول کے لئے بیتاب نہ ہو، اور مغرب سے بلند ہونیوالے اس سیلاب میں کود پڑنے کے لئے مضطرب نہ ہو۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جو ملک آزاد ہیں وہ اس طوفان میں اپنے آپ کو ڈال چکے ہیں اور جو آزاد نہیں ہیں وہ اپنی ذہنی غلامی کی بدولت اس کی جسارت نہیں کر سکتے اور حسرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس لئے اگر اس وقت تک ہندوستان کی مولوی میں کچھ جان باقی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ واقعی وہ زندہ رہنے کے قابل ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ اُسکی موت کے اسباب ابھی پیدا نہیں ہوئے اور اگر ترکی، مصر اور ایران وغیرہ میں، اس مخلوق کو فنا کر دیا گیا ہے تو صرف اسوجہ سے کہ اُنھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ مولوی کی موت قوم کی حیات ہے۔

اور چونکہ وہ آزاد ہیں، حکومت اُن کی ہے ملک اُن کا ہے، اس لئے اُنھیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے جس عضو ماؤف و مفلوج کو چاہیں قطع کر کے پھینکدیں۔ یہاں جب ہماری جسمانی صحت کے لئے حکومت آجتک تالاب کے مچھروں اور ملیریا کے جراثیم کو فنا نہیں کر سکی، تو مولویوں کی تباہکاریوں کا اسکو کیا خیال ہو سکتا ہے، جبکہ وہ خود بھی کبھی کبھی اخلاق میں عفونت پھیلانے کا کام اُن سے لے لیا کرتی ہے۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اکثر ممبر "دیار دوست" کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اور جو رہ گئے ہیں وہ عازم سفر ہیں اس درمیان میں متعدد بار اخباروں میں یہ خبر آچکی ہے کہ مہاتما گاندھی کی رہائی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اور وہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہونگے۔ مہاتما گاندھی رہا ہوں یا نہ ہوں، کانفرنس میں اُنکی شرکت ممکن ہو یا ناممکن، لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جا سکتا ہے کہ اس کانفرنس کی تکمیل کی طرف سے لوگ مطمئن نہیں ہیں اور وہ اس میں کسی ایسے عنصر کی کمی محسوس کر رہے ہیں جسکا فقدان اس اجتماع کو بے معنی بنا دینے والا ہے۔

اس سے غالباً انگلستان کی استبداد پسند جماعت کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسیات ہند کا موجودہ مفہوم صرف کانگرس سے پیدا ہوتا ہے اور ہندوستان کی وہی ایک جماعت ایسی ہے جو اسوقت ملک کے حصۂ غالب کی ذہنیت پر حکمرانی کر رہی ہے، پھر ظاہر ہے کہ کوئی ایسی کانفرنس جو ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتی ہے کس طرح اپنے آپ کو کانگرس کی نیابت سے بے نیاز ثابت کر سکتی ہے۔ اور اگر اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ ہو بھی تو اس کا نفاذ اور نفاذ کے بعد قیام امن و سکون کیونکر ممکن ہے جس کی جستجو اور حصول کا دعوےٰ کیا جاتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ جن ممبران کی نامزدگی ہوئی ہے وہ اس کے اہل نہیں یا ہندوستان کی اور جماعتوں کی نیابت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن چونکہ کانگرس کی کوئی آواز وہاں بلند ہونے والی نہیں ہے، اس لئے یہ تمام نظم و اہتمام، یہ جملہ مصارف کسی ٹھکانے لگتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے اور یہ حقیقت غالباً حکومت برطانیہ سے بھی مخفی نہیں ہے کہ "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" فی الاصل کوئی معقول بات نہیں ہے۔

کانگرس کا لائحہ عمل مفید ہو یا مضر ہیں اس سے بحث نہیں، کیونکہ نفع و ضرر کے متعلق پیشین گوئی کرنے کا سوال اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب نتائج سامنے نہ ہوں۔ لیکن ایک تحریک کا مدعا میری سمجھ میں نہیں آتا اور وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کو کیوں خیرباد کہا جا رہا ہے، اگر اس سے مقصود صرف بچوں میں ہیجان سیاسی پیدا کرنا ہے تو مفید مطلب نہیں اور اگر مراد تعلیم گاہوں کو نقصان پہونچانا ہے تو فعل عبث ہے، کیونکہ ایک مدرسہ یا کالج کا نقصان اُسوقت ہوگا جب پہلے طلبہ کا نقصان ہو جائے اور یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سیاسی اغراض اور دماغی تربیت کی تخریب میں باہم کیا نسبت ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ مدرسگاہیں تعلیم صالح کا ذریعہ نہیں ہیں تو بھی تعلیم غیر صالح، عدم تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے۔ جناب امیر کا ارشاد ہے کہ "کم دینے سے نہ حجاب کرو کیونکہ نہ دینا کم دینے سے بھی کم ہے"
بہرحال تعلیم کے متعلق ارباب سیاست کا موجودہ فیصلہ وطریق عمل میرے نزدیک مناسب نہیں ہے اور نہ لڑکوں میں سیاسی ہیجان پیدا کرنا قرین عقل وانصاف ہے، کیونکہ اس سے ایک طرف اُن کی تعلیم کا نقصان ہوگا اور دوسری طرف عدم اشتداد کی پالیسی بھی مجروح ہوگی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون "بحث سنت" کے بعد مولوی سید مقبول احمد صاحب بی۔اے کا ایک مضمون اور موصول ہوا ہے، لیکن چونکہ ایک دوسرے صاحب کا مضمون جس میں سید صاحب سے خطاب کیا گیا ہے، اس سے قبل کاتب کو دیا جا چکا تھا، اس لئے ترتیب نگار کے اصول کو دیکھتے ہوئے دونوں مضمونوں کا اجتماع مناسب نہ سمجھا گیا۔ آئندہ اشاعت میں اسے درج کیا جائے گا۔ یہ میں نے اس لئے لکھدیا کہ کہیں ایک سید کو دوسرے سید کی طرف سے غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے اور تاخیر اشاعت کا سبب بھی مضمون نگار کے علم میں آجائے۔
مولانا سید سلیمان ندوی نے "بحث سنت" کے متعلق جو نقلی تحقیق اپنے مقالہ میں کی ہے، اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس نزاع ماخذ ومصدر کا فیصلہ سید صاحب ہی کے حق میں کیا جائے، تو کیا اس سے اصل بحث "حدیث سنت" کے ذوق واعتبار کی اُٹھ جاتی ہے، اور کیا اس دلیل سے ایک شخص کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب ومسلک، اپنے یقین واعتقاد کی بنیاد کتب احادیث پر قائم کرے۔ اسوقت سب سے زیادہ اہم سوال ہمارے علمارکرام کے سامنے یہی ہے کہ وہ یا تو متفقہ طور پر حدیث کی اہمیت سے انکار کردیں یا اسکا کوئی مجموعہ ایسا مرتب کریں۔ جسے قرآن کے بعد صحیح معنے میں کوئی اصولی وبامعنی چیز قرار دیا جائے۔

بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ نگار میں جو مذہبی مباحث ہوتے ہیں، وہ صرف دلچسپی دکان قائم رکھنے کے لئے ہیں، اور اُن سے تحقیق حق مقصود نہیں ہے۔ ہر شخص قیاس کرنے کا مجاز ہے اور اس قیاس کے لحاظ سے نتیجہ تک پہونچنے کے لئے بھی آزاد۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی یہ بحث اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے کہ جو کچھ لکھا جاتا ہے (خواہ وہ کسی نیت سے ہو) قابل غور واعتنار ہے یا نہیں۔
فرض کیجئے ایک شخص جو داڑھی منڈاتا ہے، کسی دوسرے کی داڑھی کو دیکھکر کہتا ہے کہ کس قدر کثیف اور اُلجھی ہوئی چیز ہے۔ پھر یہ ممکن ہے کہ اس کا کہنا صرف اس بنا پر ہو کہ وہ اپنی صفائی ریش وبردت کا پروپاگنڈا کر رہا ہے لیکن اس سے اُس داڑھی کی کثافت وژولیدگی تو دور نہیں ہوتی، وہ تو اسی طرح اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔
اس لئے اگر میں مولویوں کی موجودہ سیرت پر تنقید کرتا ہوں، اگر میں اُن کی گمراہ کن تعلیمات سے لوگوں کو متنبہ

کرتا ہوں، اور اگر میں اسلام کا ایک ایسا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں جو تمام عالم کے نزدیک قابلِ قبول ہو، تو اگر اس سے میرا مدعا صرف دلق و کانِ ملا ہوتو بھی اس سے ایک مولوی اور اس کے اسلام کی پاکبازی کیونکر مشتبہ ہو سکتی ہے، جبکہ اسکی حالت ہر شخص کو تنقید کی دعوت دے رہی ہے، خواہ تنقید کرنیوالے کی نیت تحقیق حق ہو یا تجارت کی گرم بازاری۔

اسی کو کہتے ہیں کسی بحث میں ذاتیات پر اُتر آنا اور بعض کے نزدیک یہ اولین منزل ہے اعترافِ شکست و اقرارِ مغلوبیت کی بہرحال میں ان دونوں میں سے کسی پر اعتماد نہ کرتے ہوئے یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تحقیق حق کے لئے کسی خاص امر کے اظہار یا اقرار کی ضرورت ہے تو مجھے بتا دیا جائے، میں اس باب میں ہر شرط کے ماننے کے لئے طیار ہوں، کیونکہ اس سے میرے مقاصد کو کسیطرح نقصان نہیں ہو سکتا، میں نے تو پرائیوٹ خط و کتابت کے ذریعہ سے بہت سے امور کو طے کرنا چاہا لیکن اسکا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چنانچہ جسوقت میں نے ایک مطبوعہ استفتاء ہندوستان کے تمام علماء کرام کے نام روانہ کیا اس سے بھی مقصود صرف طمانیت نفس تھی لیکن بعد کو ان باتوں کی حقیقت بھی یوں واشگاف ہوگئی کہ جب میں نے انھیں جواب دینے والے علماء میں سے ایک سے انکے جواب کی اشاعت کا خیال ظاہر کیا تو وہ پریشان ہوگئے اور انھوں نے فرمایا کہ اسکی اشاعت مناسب نہیں ہے۔

سفرِ پشاور کے متعلق ۱۰ر اکتوبر کے بعد فیصلہ ہو سکے گا لیکن میں احبابِ سرحد کو ان کے خطوط کے جواب میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب کبھی اُسطرف آؤنگا، انھیں ضرور اطلاع دونگا۔

کوہاٹ جیل سے جن بزرگ کا پیام مجھ تک پہونچا ہے، انکو اطمینان دلاتا ہوں کہ کوہاٹ ۲۰ر اکتوبر کے بعد ہی پہونچوں گا۔ اور کبھی انکے خلوص سے اپنے آپ کو محروم رکھنا گوارا نہ کرونگا۔

ایک خاتون نے اپنی بنائی ہوئی چار چیزیں مجھے مرحمت کیں۔ کاجل، سرمہ، چورن، منجن، تاکہ میں انکا تجربہ کرکے اپنی رائے ظاہر کروں۔ میرے نزدیک چاروں چیزیں مفید و قابل قدر ہیں میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ انکی طیاری میں خدا معلوم کیا کیا دوائیں اور جڑی بوٹیاں فراہم کرتی ہیں۔ کاجل میں خود استعمال کر رہا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ آنکھیں بہت صاف اور منجلی رہتی ہیں۔ چورن میں نے کئی بچوں کو دیا اور درد کے دور کرنے میں اکسیر پایا۔ سرمہ بھی بعض لوگوں کو دیا گیا اور سب نے تعریف کی۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین نگار خاتون موصوف کے جذبۂ عمل کی قدر کرینگے۔ اور ان مفید دواؤں سے خود بھی فائدہ اُٹھائینگے اور دوسروں کو بھی اسطرف متوجہ کرینگے۔ اس ماہ کی اشاعت میں کسی جگہ انکا اشتہار بھی درج کیا گیا ہے۔

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مقالہ سلسلہ کا ہے۔ جو آیندہ اشاعت میں ختم ہو جائیگا، اُس کے اختتام پر جو رائے میری اس مضمون کے متعلق ہے اس کو کسی قدر تفصیل سے ظاہر کرونگا۔

"جہنم میں دو گھنٹے" میرا مضمون ظنزیات کے رنگ کی تنقید ہے۔ یہ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ کہیں میرے اس مضمون کو میرے خلاف "وجودِ جہنم" کے ثبوت میں نہ پیش کیا جائے۔

جس مضمون میں مولانا سید سلیمان ندوی سے خطاب کیا گیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے، اگر اُس کا کوئی جواب دیا جائیگا تو نگار اُس کی اشاعت کے لئے موجود ہے۔

"دنیا اور ضرورت مذہب" پر دوسری قسط اس رسالہ میں شائع ہو رہی ہے۔ آئندہ مہینے میں اسکو بھی ختم سمجھئے۔ "مرشد" ملک کے مشہور مزاح نگار مسٹر رشید احمد صدیقی کا مضمون ہے اور آج ایک نوجوان ادیب کے ساتھ میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

باب الاستفسار میں بھی ایک جواب مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ غالباً آئندہ اشاعت میں ختم ہو جائے۔ برسات کی نظم جناب جوش کی ہے اور غیر مطبوعہ لیکر میرے پاس بھیجی گئی ہے۔ نظم کی خوبی پر گفتگو فضول ہے۔ میری دنیا مولوی علی اختر صاحب اختر کی فکر عمیق کا نتیجہ ہے۔ اور عورت جناب فرخ بنارسی کی فکر جمیل کا۔ "مزدور کی آواز" پر جناب کاظمی نے بہت بامعنی اور برمحل اظہار خیال کیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۱ء کے نگار کا انتظار کیجئے اور بے چینی کے ساتھ، ماہ آئندہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز ہوگا؟ اسی کے ساتھ اگر ممکن ہو تو یہ بھی سوچ لیجئے کہ اپنے دائرہ احباب میں آپ کس کس کو حلقۂ "نگار" سے وابستہ کرنے کی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

نیاز

رسالہ "جن" کی اشاعتیں

اسوقت تک حسب ذیل مضامین نکل چکے ہیں:-

عمل تنویم۔ غیر معمولی تمثیل۔ بھوت پریت۔ خواب کی دنیا۔ مقناطیسیت اور جسم بیجان۔ مسمریزم۔ کیا مُردوں سے باتیں کر سکتے ہیں؟ ایک انسانی روح۔ حالات مابعد الموت۔ ماضی کا مشاہدہ حال کی آنکھوں سے۔ روحانی علاج۔ مغرب اور روحانیت۔ کیا روحیں شکل اختیار کرتی ہیں۔ حیات بعد الممات۔ خواب و غیب کی خبریں۔ ماورائیت یا مابعد الطبیعیات۔ افکار خفی۔ سادہ بادہ کے حوادث سیمادی۔ مغرب کا ایک حیرت انگیز واقعہ۔

یہ تمام مضامین آپکو صرف ایک روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ نگار کے خریدار ہیں یا بنے رہیں۔

مینیجر نگار لکھنؤ

جنوری ۱۹۳۱ء کا نگار غیر معمولی حجم کا

زیر ترتیب ہے اور دلچسپیوں و رنگینیوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ آئندہ سے جن حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے (خواہ وہ اکتوبر میں ختم ہو یا نومبر و دسمبر میں) اُن کے ساتھ حسب ذیل رعایت کیجائیگی۔

"تذکرۂ خندۂ گل۔ شاعر کا انجام۔ نفسیات پر دو مقالے جائیں گے اور سائنس کے عجائب" مفت۔ اسی کے ساتھ رسالہ جن کے گزشتہ پرچے اور آج لیکر آئندہ تک بجائے بارہ کے ہر فی پرچہ کے حساب دیئے جائینگے۔ جنوری و فروری کا جن موجود نہیں ہے۔ جو حضرات یہ تمام چیزیں طلب کرینگے اُن سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

مینیجر نگار لکھنؤ

قرآن کے لطائفِ ادبیہ

(بہ سلسلۂ سابق)

قرآن مجید "صور شعریہ" کے اعتبار سے ایک نظر

قبل اسکے کہ قرآن مجید کے محاسن ادبی پر "صور شعریہ" کے اُصول کے مطابق روشنی ڈالی جائے یہ ضروری ہے کہ خود اصطلاحِ "صور شعریہ" کی شرح کردیجائے، دورِ جدید میں شعر کی تنقید کے لئے "صور شعریہ" ایک معیار مقرر کیا گیا ہے، اسکی تفسیر میں ڈاکٹر زکی مبارک[1] لکھتا ہے۔

الصورة الشعرية هي أثر الشاعر المفلق الذي يصف "المرئيات" وصفاً يجعل قارئ شعره مايدري ان يقرا قصيدة مسطورة ام يشاهد مناظر الوجود

"صور شعریہ" تعبیر ہے ایک ذہین شاعر کی اثر آفرینی سے اگر اس نے "مرئیات" (جسکو آنکھوں سے دیکھ سکیں) کی تعریف کی ہو، تو اس پیرایہ میں کہ پڑھنے والے کو یہ نہیں ہو تا کہ آیا وہ ایک لکھا ہوا قصیدہ پڑھ رہا ہے، یا کسی منظر فطریہ کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اگر شاعر نے

---

[1] ڈاکٹر زکی مبارک مصر کی جدید علمی تحریک کا ایک مایۂ ناز ادیب ہے، قدیم عربی (اسلامی) طرزِ انشا جس میں سجع کا لحاظ اور قوافی کی پابندی پائی جاتی تھی مصریوں نے اسے بدل دیا، اب مصر کے اخبار و رسایل اور جدید مطبوعات میں انشا کا وہی سلف ہے جو السنہ یورپ میں آج کل پایا جاتا ہے، ڈاکٹر زکی بیک وقت ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی ہے اور فلسفیانہ اور تاریخی تحقیقات کا ناشر بھی، قدرت کی طرف سے وہ بہت بڑا اجدت طراز دماغ لیکر آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسکی کتابیں جدید علمی طبقہ میں نہایت مقبول ہیں اسنے بعض ایسے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں کہ اس سے قبل عربی میں ایسی کتابیں نہیں لکھی گئیں بلکہ جہانتک میرے ذاتی مطالعہ کا تعلق ہے میں نے مغربی زبان میں بھی ایسی کتابیں نہیں دیکھیں، لطائف ادبیہ کے سلسلہ میں اسکی مفصلہ ذیل کتابیں ہیں۔ مدامع العشاق۔ افنان الجمال۔ موازنة بین الشعرا۔ الاخلاق عند الغزالی۔ آراء الجاحظ الفلسفیہ والادبیہ۔ حب ابن ابی ربیعہ۔ الاخلاق عند الغزالی میں اسنے امام غزالی کے فلسفہ اور ڈیکارٹ، ہوبس، کالیل، اسپینوزا، کے فلسفیانہ نظریات سے موازنہ کیا ہے، اسی تصنیف پر جامع ازہر کے شیوخ نے زکی مبارک کو "ڈاکٹر" کا خطاب دیا ہے، اسکی دو کتابیں الموازنہ بین الشعرا اور مدامع العشاق عربی زبان کی جدید ترقی میں قابل ناز اضافہ ہیں: موازنہ میں ڈاکٹر صاحب نے اُصول تنقید بتاتے ہیں اور کثیر التعداد قدیم و جدید عربی شعرا کے کلام کا موازنہ کیا ہے، اور اسپر پاکیزہ تنقید بھی کی ہے اسکے گیارہویں باب میں قرآن مجید کے محاسن ادبیہ پر شاعرانہ پہلو سے تبصرہ کیا ہے جسکا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ مدامع العشاق میں ایسے مضامین سے بحث کی ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں ملتے، اُنھوں نے آہ و نالہ، ہجر و فراق، شکوہ و عتاب، قاصد رقیب، محبوب کی بیوفائی اور سنگدلی، اور سینکڑوں دوسرے عاشقانہ۔ (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

والذی یصف الوجد ایاتہ وصفاً یجعل للقاری انہ یناجی نفسہ ویحاور ضمیرہ لا انہ یقرأ قطعتہ مختارۃ لشاعر مجید ؕ

"وجد انیات" کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے تو پڑھنے والے کو خیال نہیں ہوتا کہ آیا یہ کسی بڑے شاعر کا کلام ہے، یا خود اسکے نفس کی آواز اور ضمیر کا اظہار ہے۔

بعض ادیبوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ "صور شعریہ" ایک قسم کا استعارۂ تمثیلی ہے، حالانکہ دونوں میں فرق ہے، استعارۂ تمثیلیہ "صورت معنوی" کا اظہار کرتا ہے، اسکے برعکس صور شعریہ ایک "غرض" کی تمثال ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "والسماء مطویات بیمینہ" یہ ایک قسم کی تمثیل ہے جس سے ایک خاص معنی کا ادا کرنا مراد ہے، اور وہ "قدرت الٰہی" ہے لیکن "صورت شعریہ" کے مطابق غرض کی تصویر سورۂ مایدہ کی مفصلۂ ذیل آیتوں سے ثابت ہوتی ہے۔

واذ قال اللہ یا عیسی ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ قال سبحانک مایکون لی ان اقول مالیس لی بحق ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک انک انت علام الغیوب ؕ ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم وکنت علیھم شھیداً مادمت فیھم ج فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم ط وانت علیٰ کل شیء شھید ؕ ان تعذبھم فانھم عبادک ج وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم ؕ

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ تعالےٰ فرماوینگے کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمنے ان لوگوں سے کہدیا تھا کہ مجھکو اور میری ماں کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دیلو۔ تو عیسیٰ عرض کرینگے، کہ میں آپکو منزہ سمجھتا ہوں مجھکو کسیطرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جسکے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا تو آپکو اسکا علم ہوگا آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں اور میں آپکے علم میں جو کچھ ہے اسکو نہیں جانتا، تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہیں، میں نے تو اُن سے اور کچھ نہیں کہا مگر صرف وہی جو آپنے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، میں ان پر مطلع رہا جبتک میں ان میں رہا؛ پھر جب آپنے مجھکو اٹھالیا تو آپ ان پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں اگر آپ انکو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ انکو معاف فرما دیں تو آپ زبردست حکمت والے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ مفصلہ بالا آیتوں میں معنی کی بجائے غرض کی تصویر پیش کی گئی ہے، اور معنی غرض کا ایک

(بقیہ صفحہ ۹) امیال وعواطف کے متعلق تمام مشہور عربی شعراء کے کلام کا ایک دیوان مرتب کر دیا ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اندیش کھٹکا تھا کہ اُنکے اخلاق اور کیرکٹر کے متعلق علما و مشائخ نہایت غضب آلود خیالات ظاہر کرینگے، اور فاسق و فاجر کہیں گے۔ غزالی کے بارے میں ایک طبقہ نے انپر کفر والحاد کا فتویٰ صادر کیا، لیکن نکتہ شناس دماغوں نے انھیں "ڈاکٹر" کا لقب عطا ہی کر دیا۔ "افنان الجمال" زیر طبع ہے، اس میں اُنھوں نے شعرا کے وہ کلام جمع کر دیئے ہیں جو محبوب کے حسن و جمال سے متعلق ہیں، زکی مبارک کی دوسری کتابیں جو زیر طبع ہیں وہ یہ ہیں، الصور الشعریہ صبابہ ابن الاحنف۔ خمریات ابی نواس۔

جزو ہے۔ یہ قرآن کا ایک پیش کردہ مرقع ہے، جو حضرت باری اور اُسکے جلوہ اور رسول حضرت عیسیٰ کے درمیان ہوگا جس میں غرض کلی کے تمام نقوش موجود ہیں اور جزوی معانی کے اعتبار سے بھی بعض افکار پائے جاتے ہیں۔ پس معنی جزوی کی تصویر کا نام استعارہ یا تمثیل ہے، اور غرض کلی کی تصویر تعبیر ہے "صورِ شعریہ" سے۔

سورہ توبہ کی مفصلہ ذیل آیتوں میں صورِ شعریہ کے تمام محاسن پائے جاتے ہیں۔

واذان من الله ورسوله الى الناس
يوم الحج الاكبر ان الله بري من
المشركين ۵ ورسوله فان تبتم فهو خير
لكم وان توليتم فاعلموا انكم غير معجزى
الله وبشر الذين كفروا بعذاب اليم ۵ الا
الذين عاهدتم من المشركين ثم لم
ينقصوكم شيئا ولم يظاهروا عليكم احدا
فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم ان الله
يحب المتقين ۵ فاذا انسلخ الاشهر الحرم
فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم
واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد فان
تابوا واقاموا الصلوة واتوا الزكوة فخلوا سبيلهم
ان الله غفور رحيم ۵ وان احد من
المشركين استجارك فاجره حتى
يسمع كلام الله ثم ابلغه مامنه ذالك
بانهم قوم لا يعلمون ۵ كيف يكون للمشركين
عهد عند الله وعند رسوله الا الذين
عاهدتم عند المسجد الحرام فما استقا
موا لكم فاستقيموا لهم ان الله يحب المتقين
كيف وان يظهروا عليكم لا يرقبوا فيكم
الا ولا ذمة ۵ يرضونكم بافواههم وتابى

اور اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں
میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے، کہ
اللہ اور اُسکا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں
ان مشرکین سے پھر اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے
اور اگر تمنے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز
نہیں کرسکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر
سنا دیجئے، ہاں گروہ مشرکین مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا
پھر اُنھوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے
مقابلہ میں کسی کی مدد کی سو انکے معاہدہ کو انکی مدت تک
پورا کردو، واقعی اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو
پسند کرتے ہیں، سو جب "اشہر حرم" (وہ مہینے جنمیں لڑائی
حرام ہے) گزر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ مارو
پکڑو، اور داؤ گھات کے موقعوں میں انکی تاک میں بیٹھو
پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں
تو انکا راستہ چھوڑ دو، واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت
کرنیوالے ہیں، اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے
پناہ کا طالب ہو تو آپ اسکو پناہ دیجئے، تاکہ وہ کلام الٰہی
سن لے پھر اُسکو اسکے امن کی جگہ میں پہونچا دیجئے، یہ حکم
اس سبب سے ہے، کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے
ان مشرکین کا عہد اللہ کے نزدیک اور اسکے رسول کے نزدیک
کیسے رہیگا مگر جن لوگوں نے مسجد حرام کے نزدیک تم سے عہد لیا

قلوبهم وأكثرهم فاسقون ۞ اشتروا بآيات
الله ثمنا قليلا فصدوا عن سبيله إنهم
ساء ما كانوا يعملون ۞ لا يرقبون في مؤمن إلا
ولا ذمة وأولئك هم المعتدون ۞ فإن
تابوا وأقاموا الصلوة وآتوا الزكوة فإخوانكم
في الدين ونفصل الآيات لقوم يعلمون ۞
وإن نكثوا أيمانهم من بعد عهدهم و
طعنوا في دينكم فقاتلوا أئمة الكفر إنهم
لا أيمان لهم لعلهم ينتهون ۞ ألا تقاتلون
قوما نكثوا أيمانهم وهموا بإخراج الرسول
وهم بدؤكم أول مرة أتخشونهم
فالله أحق أن تخشوه إن كنتم مؤمنين
قاتلوهم يعذبهم الله بأيديكم و
يخزهم وينصركم عليهم ويشف
صدور قوم مؤمنين ويذهب غيظ
قلوبهم ويتوب الله على من يشاء
والله عليم حكيم ۞ أم حسبتم أن
تتركوا ولما يعلم الله الذين جاهدوا
منكم ولم يتخذوا من
دون الله ولا رسوله ولا
المؤمنين وليجة ۞ و
الله خبير بما تعملون ۞

سے جبتک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو
بلاشبہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں کیسے حالانکہ
انکی حالت یہ ہے کہ اگر کہیں تم پر غلبہ پالیں تو تمہارے بارہ میں نہ
قرابت کا پاس کریں اور نہ قول قرار کا یہ لوگ تمکو اپنی زبانی باتوں سے
راضی کر رہے ہیں اور انکے دل نہیں مانتے اور انمیں زیادہ آدمی شریر
ہیں انہوں نے احکام الٰہیہ کے عوض میں متاع ناپائدار کو اختیار کر رکھا
ہے سو یہ لوگ اللہ کے رستے سے ہٹے ہوئے ہیں یقیناً یہ انکا عمل بہت ہی برا
ہے یہ لوگ کسی مسلمان کے بارہ میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول قرار
کا اور یہ لوگ بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں سو اگر یہ لوگ توبہ کر لیں
اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جاوینگے
اور ہم سمجھدار لوگوں کیلئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور اگر یہ
لوگ عہد کرنیکے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو تم لوگ
اس قصد سے کہ یہ باز آجاویں ان پیشوایان کفر سے لڑو، انکی قسمیں نہیں
رہیں تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور
رسول کو جلا وطن کرنے کی تجویز کی اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی کیا
ان سے ڈرتے ہو سو اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو
اگر تم ایمان رکھتے ہو ان سے لڑو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دیگا
اور انکو ذلیل کریگا اور تمکو ان پر غالب کریگا اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا
دیگا، اور انکے قلوب کے غیظ کو دور کریگا اور جس پر منظور ہوگا اللہ تعالیٰ
توجہ فرمائیگا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں کیا تم
یہ خیال کرتے ہو کہ تم یونہی چھوڑ دئیے جاؤگے، حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ
نے ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو، اور اللہ تعالیٰ
اور رسول کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو، اور
اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے،

قرآن مجید میں "صور شعریہ" کے امتیازی پہلو وہاں نمایاں ہیں جہاں مقام کے لحاظ سے معنوی تثبیت اور تاکید مراد

ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی مفصلہ بالا آیات میں شروع سے آخر تک مشرکین کی لعنت، انکی تحقیر، اُنکے مبتلائے عذاب ہونے ذلیل خوار ہو کر مارے جانیکے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور انھیں اغراض اساسی کا اعادہ کرنا یہاں مطلوب ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ مہربانی کا حکم ہوتا ہے، جب کہا جاتا ہے "اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اُسکو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الہی سن لے، پھر اُسکو اُسکے امن کی جگہ پر پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے" اسکے بعد غضب کی ڈانٹ بتائی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے "ان مشرکین کا عہد اللہ کے نزدیک اور اُس کے رسول کے نزدیک کیسے رہیگا، مگر جن لوگوں نے تم سے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا ہے، سو جبتک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو، بلاشبہ اللہ تعالے احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں، حالانکہ اُنکی حالت یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارہ میں، نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور انکے دل نہیں مانتے اور انمیں زیادہ آدمی شریر ہیں"۔ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ پھر کہا جاتا ہے "انھوں نے احکام الہیہ کے عوض میں متاع ناپائیدار کو اختیار کر رکھا ہے سو یہ لوگ اللہ کے رستہ سے ہٹے ہوئے ہیں، یقیناً ان کا یہ عمل بہت ہی برا ہے" اسکے بعد اللہ تعالے فرماتا ہے "تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا، اور رسول کے جلا وطن کر دینے کی تجویز کی اور انھوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی، کیا ان سے ڈرتے ہو، سو اللہ تعالے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو" اس کے بعد جوش میں آتا ہے "ان سے لڑو، اللہ تعالے انکو تمہارے ہاتھوں سزا دیگا، اور ان کو ذلیل کریگا اور تم کو انکو غالب کریگا اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا دیگا اور انکے قلوب کے غیظ کو دور کریگا، اور جسپر منظور ہوگا اللہ تعالے توجہ فرماویگا، اور اللہ تعالے بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

اگر قاری اس واقعہ پر غور کرے تو زیادہ بہتر ہے، کہ رسول اللہ کا زمانہ فتنہ جہل اور گمراہی کا زمانہ تھا، اور یہ غضب جسکا قرآن مجید کی مفصلہ بالا آیات سے اظہار ہو رہا ہے، ایک طبعی غضب ہے، نہ اسمیں کوئی برائی ہے، نہ دشمنی، یہ میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ قاری اس راز سے آگاہ ہو جائے کہ میں قرآن مجید سے صور شعریہ کی مثالیں پیش کر رہا ہوں حالانکہ نبی صلعم شاعر نہ تھے، پس قرآن محض ایک شرعی کتاب ہی نہیں بلکہ وہ مسائل کو آسان پیرایہ میں شرح کے ساتھ بیان کرتا ہے، اور اُسکے بعد قوت اور جدت کے ساتھ ملاتا ہے۔

ایک انوکھے قسم کے صور شعریہ کی مثال قرآن مجید کی مفصلہ ذیل آیات میں ملتی ہے۔

واتل علیھم نبا ابراھیم اذ قال لابیہ	اور انکے سامنے حضرت ابراہیم کا قصہ بیان کیجئے
وقومہ ما تعبدون قالوا نعبد اصناما	جبکہ اُنھوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ آپ
فنظل لھا عاکفین ۵ قال ہل یسمعونکم	لوگ کس کی پرستش کرتے ہیں اُنھوں نے کہا کہ ہم
اذ تدعون، او ینفعونکم او یضرون ۵	بتوں کی پرستش کرتے ہیں ....

قالوا بل وجدنا آباءنا کذالک یفعلون ٭ قال افرایتم ما کنتم تعبدون ٭ انتم وآباءکم الاقدمون ٭ فانهم عدو لی الا رب العالمین ٭ الذی خلقنی فهو یهدین ٭ والذی هو یطعمنی ویسقین ٭ واذا مرضت فهو یشفین ٭ والذی یمیتنی ثم یحیین ٭ والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین ٭ رب هب لی حکما والحقنی بالصالحین ٭ واجعل لی لسان صدق فی الآخرین ٭ واجعلنی من ورثة جنة النعیم ٭ واغفر لابی انه کان من الضالین ٭ ولا تخزنی یوم یبعثون ٭ یوم لا ینفع مال ولا بنون ٭ الا من اتی الله بقلب سلیم ٭

ابراہیم نے فرمایا کیا وہ آپکی فریاد سنتے ہیں، کیا آپکو کوئی نفع یا نقصان پہونچاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے اگلوں کو اسی طرح عبادت کرتے دیکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ تم اور تمہارے اگلے جسکی پرستش کرتے ہیں، وہ کس خیال پر مبنی ہے؟ یہ تمہارے دشمن ہیں، حقیقی معبود اللہ ہے، جس نے ہمیں پیدا کیا اور ہدایت کرتا ہے جو کھلاتا ہے پلاتا ہے اور جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو شفا دیتا ہے، اور جو موت کے بعد زندہ کرتا ہے، وہ جس سے امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ معاف کرے گا خداوندا، مجھے حکمت عطا کر، اور نیکوکاروں کے ساتھ مجھے ملا دے .... اور مجھے جنت النعیم کا وارث بنا، اور ہمارے والد کو بخش دیجئے جو گناہگاروں میں تھے اور مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے، جس دن نہ مال کام آوے گا اور نہ اولاد، مگر وہ جسے خدا نے قلب سلیم عطا کیا ہے۔

قاری اسے ایک مرتبہ دو مرتبہ، تین مرتبہ پڑھے، اور بتائیے کیا اس سے بھی بڑھکر کوئی شیریں کلام ہو سکتا ہے۔ کیا سامعہ نے کبھی اس سے زیادہ نرم و حزیں آوازیں سنیں، کیا قلب نے اس سے زیادہ کوئی دلکش چیز محسوس کی، کیا نفس اس سے زیادہ ملائم اور نرم احساسات سے اثر پذیر ہوا۔[1]

شعرائے فارس کا استفادہ قرآنی

پہلی صدی ہجری سے فارسی زبان اسلامی زبان ہو گئی، اور اس کی شاعری میں وہ تمام خیالات منتقل ہونے لگے، جو دنیا کے کسی ذہنی انقلاب اور نفسیاتی ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں، عرب کی قدیم شاعری قرآن مجید کی جدید تخئیل سیاسیات و معاشرت کے تغیر و تبدل اقوام

---

[1] یہ تمام تاثرات نتیجہ ہیں صرف اس اعتقاد کا کہ کلام مجید کی عبارت حد درجہ فصیح و بلیغ ہے۔ وہ لوگ جو یہ اعتقاد نہیں رکھتے یا جو عربی زبان سے واقف تام نہیں رکھتے انھیں نہ اس میں کوئی شیرینی نظر آتی ہے نہ دلکشی۔ ایک برہمن سنسکرت کا اشلوک پڑھتا ہے تو وہ بھی بالکل یہی کیفیات اپنے اندر پاتا ہے، درآنحالیکہ ہمارے نزدیک وہ ایک مجموعہ ہے لغو و مہمل الفاظ کا۔ اس لئے ابھی تک یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کا کوئی ایسا ثبوت پیش نہیں کیا گیا جو غیر مسلم کے لئے قابل تسلیم ہو اور نہ یہ ثبوت ممکن ہے، کیونکہ جہانتک الفاظ کا تعلق ہے قرآن کو کسی معجزہ کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔

وطن کے اختلاط وارتباط نے مسلمانوں کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اس لئے انکی تاریخ ادب و شاعری نے بھی ایک جدید صورت اختیار کرلی، چنانچہ شعرائے مولدین (عرب) کے کلام کے مطالعہ سے یہ نظریہ پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، اسی طرح فارسی شاعری کے مختلف زبانوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فارس کی عشقیہ اور صوفیانہ شاعری بھی اسی انقلاب ذہنی سے اثر پذیر ہوئی ہے۔

عہد اسلام کے اکابر شعرائے فارس چونکہ عموماً عربی علوم کے بڑے ماہر گزرے ہیں، اس لئے انکی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے، کہ انکے کلام میں عربیت کا کس قدر غلبہ تھا، اُنکے اشعار میں عربی فقرے اور محاورات کی ایسی ہی کثرت ہے، جیسی مرزا غالب کے اُردو کلام میں فارسی کی، فارس (اسلامی) کی ابتدائی شاعری سے لیکر آٹھویں صدی تک عربی اور فارسی فقروں اور جملوں کی یہ آمیزش عام طور پر مروج تھی، چنانچہ سعدی ورومی، وخاقانی، وانوری، وحافظ، وجامی وغیرہم کے کلام میں یہ اختلاط ظاہر ہے۔ حافظ اور جامی نے تو غزلیات کے اندر بھی بہت کثرت سے عربی مصرعے چسپاں کئے ہیں، عربی و فارسی جملوں کی آمیزش رومی کی غزلیات میں کم ہے، اور خسرو کے رنگ تغزل میں تقریباً شاذ کی حیثیت رکھتی ہے، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ رومی نے قرآن و حدیث سے الفاظ کی بجائے روح معانی سے استفادہ کیا ہے، جو ان کی "مثنوی" اور "دیوان" (شمس تبریز) دونوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ خسرو دہلوی پر ماحول ومقامی تمدن کا اثر پڑا، انکی توجہ زیادہ تر ہندی زبان اور اُسکی شاعری کی طرف مبذول ہوگئی، اور یہی وجہ ہے کہ انکے فارسی کلام میں عربی فقرے اور مصرعے شاذ و نادر پائے جاتے ہیں، متاخرین میں عرفی شیرازی سے لیکر علی حزین تک جتنے بڑے بڑے شعرائے فارس نظیری، ظہوری صائب وغیرہ گزرے ہیں انمیں باستثنائے فیضی و حزیں تمام اساتذہ کے کلام میں بالکل سادہ فارسی زبان پائی جاتی ہے، حزین نے سادگی الفاظ اور نزاکت خیال میں تو کمال پیدا کیا، لیکن اکثر اُنھوں نے حافظ اور جامی کے تتبع میں فارسی مصرعوں کے ساتھ عربی مصرعے شامل کئے ہیں، اساتذہ فارس نے عربی اور فارسی زبان کا یہ خلط ملط دو طریقے سے شروع کیا، ایک تو یہ صورت پائی جاتی ہے کہ مسلم مصرعے یا بعض فقرے عربی ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات یا فقروں کو فارسی مصرعوں کے ساتھ مخلوط کرلیا ہے اس قرآنی استفادہ کی بھی دو صورتیں ہیں ایک الفاظ قرآن کی شمولیت، دوسری قرآن کے بعض بیان کردہ واقعات کی طرف اشارہ، اور تقریباً فارسی زبان کا کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے قرآن مجید کے اعجاز ادب سے ان دونوں صورتوں میں سے دونوں یا ایک سے استفادہ نہ کیا ہو،

فارسی شاعری کا تمام کمال مطالعہ کرنیکے بعد اگر اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جائے، تو غالباً ایک ضخیم جلد میں یہ اشعار مرتب ہوسکیں، یہاں چونکہ صرف مثال مقصود ہے، اس لئے اختصار اور ایجاز سے کام لیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کا لفظی استفادہ

سعدی شیرازی بغداد یونیورسٹی کے تربیت یافتہ تھے، انکو عربی زبان پر بھی کامل مہارت تھی، بوستاں میں ابوبکر سعد بن زندگی کی مدح کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

فطوبیٰ لباب کبیت العتیق　　حوالیہ من کل فج عمیق

کیا خوب بارگاہ (ممدوح) ہے جو خانۂ کعبہ کے مثل مامون ہے، اور لوگ اسکی طرف دور دراز رستوں سے آتے ہیں، ۔

اسکے قبل فارسی کا ایک بیت لا چکے ہیں جسکا ایک مصرعہ ہے، ؎ ندارد جزایں کشور آرامگاہ

اب اس "کشور" کے لئے خانہ کعبہ کی تشبیہ لائے ہیں اور اسکے لئے سورہ حج کی مفصلہ ذیل آیات کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسکے بعض فقروں سے مستفید ہوئے ہیں۔

واذن فی الناس بالحج یأتوک رجالا　　اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس پیادہ پا بھی چلے

وعلی کل فج عمیق　　آئینگے، اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز رستوں سے پہونچی ہونگی۔

ایک آیت کے بعد پھر یہ حکم ہے۔

ثم الیقضوا تفثھم والیوفوا نذورھم　　پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کردیں اور اپنے واجبات کو

والیطوفوا بالبیت العتیق　　پورا کردیں، اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔

جلال الدین رومی تو مولانا تھے، انکا کلام مولویت اور تصوف کا صحیح مرقع ہے، اپنی بعض غزلیات میں انھوں نے بھی قرآن مجید کے فقرے استعمال کئے ہیں۔

چو عنکبوت چنیں صید ہائے زفت گرفت　　ببیں کہ تا چہ کند دام ربی الاعلیٰ

جب مکڑی نے اتنا بڑا شکار پکڑا ہے، (تو) دیکھ کہ "ربی الاعلیٰ" کا دام کیا کرتا ہے،

ڈاکٹر رینالڈ انے نکلسن نے اپنے "انتخاب دیوان شمس تبریز" مطبوعہ کیمبرج میں یہ شعر بھی لکھا ہے، اور اسکی شرح میں لکھتے ہیں کہ قرآن میں یہ فقرہ "ربی الاعلیٰ" نہیں پایا جاتا، لیکن غالباً فرعون کے تکبر آمیز بیان "انا ربکم الاعلیٰ" کی طرف اشارہ ہے، "باب" کے خطابات میں سے ایک حضرت ربی الاعلیٰ بھی تھا بحوالہ تاریخ "باب" مصنفہ براؤن)

نکلسن نے جس قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہاں چسپاں نہیں ہوتی، صرف اس وجہ سے نہیں، کہ الفاظ میں اختلاف ہے، بلکہ معنی کے اعتبار سے بھی کوئی مناسبت نہیں، سورۂ "نزعت" میں ہے۔

اذھب الی فرعون انہ طغی　　فقل ھل لک الی ان تزکی

واھدیک الی ربک فتخشی　　فاراہ الایۃ الکبری

فکذب وعصی　　ثم ادبر یسعی

فحشر فنادی، فقال انا ربکم الاعلی　　فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولی

موسیٰ کو فرعون کی ہدایت کا حکم ہوتا ہے، آپ معجزہ دکھاتے ہیں، وہ تکذیب نبوت کرتا ہے، اور قبطیوں کو مخاطب کرکے انا ربکم الاعلیٰ کہتا ہے، اس پر خدا فرماتے ہیں وہ دنیا اور آخرت کی بدبختی میں گرفتار ہوا،

ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے سیاق و سباق سے رومی کے شعر کو نسبت نہیں، اور خود رومی کے اس شعر میں تسلسل مضمون کا لحاظ پایا جاتا ہے، اور پروانے اشعار میں جستجوئے عشق کے لئے خیال ناموس سے بے التفاتی، فنا گزینی اور صحرا نوردی کی تلقین کی ہے، اس کے قبل ایک شعر ہے،

گہے قبا بدریدہ گہے بہ کوہ دویدہ گہے ز زہر چشیدہ گہے گزیدہ فنا

یعنی عاشق کے لئے جامہ دری، فنا گزینی، لاپروائی ناموس، اور دشت پیمائی ناگزیر ہیں اب چونکہ ایک جان ناتواں کے ساتھ یہ سرشاریاں ہیں وکان الانسان ضعیفا اس لئے مولانا نے سیرت نبوی کے ایک نہایت اہم واقعہ غار ثور کی طرف اشارہ کیا ہے، جب آنحضرتؐ ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں چھپ گئے، تو دہانہ غار پر ایک کڑی نے جالا بنا دیا تھا یہ خیال رومی کے پہلے مصرعہ سے اور راسخ ہو جاتا ہے، کہ انھوں نے "عنکبوت" کے لئے "صید ہائے زفت" لکھا ہے جس سے دونوں مبارک ذاتیں مراد ہیں اور اسکے بعد "دام ربی الاعلیٰ" کے منتظر ہیں، یعنی جسطرح کڑی نے آنحضرتؐ اور ابوبکر صدیق کو اپنے جال میں گرفتار تو کر لیا، اسی طرح عشق اختیار کر کے نفس انسان نے مقامات ور دطے کر لئے، یہ گویا کڑی کی طرح "صید زفت" گرفتار کرتا ہے، لیکن جسطرح کڑی کے جال کو خدا نے تجسس کافروں کے مقابلہ میں کامیاب کر دیا اسیطرح دروہائے عشق کی مصیبتوں کو اُٹھانے کے بعد نفس کو منزل عرفاں اسیوقت حاصل ہو سکتا ہے، جب "ربی الاعلیٰ" کا فضل ہو، چنانچہ نکلسن نے "صوفیائے اسلام" میں علامہ ہجویری کے حوالہ سے، اور مولانا محمد حسین سبزواری نے جواہر الاسرار شرح مثنوی معنوی میں تصوف کی اصطلاح "حال" کے متعلق بحثیں کی ہیں، جو محض ایک فیضان الٰہی ہے، اور ارادہ انسانی سے بالاتر، اس شعر میں "نزعت" کی آیت "انا ربکم الاعلیٰ" کی بہ نسبت سورہ اعلیٰ کی آیت سبح اسم ربک الاعلیٰ سے زیادہ مناسبت ہے، ہر چند یہاں بھی "ربی الاعلیٰ" کی بجائے "ربک الاعلیٰ" ہے

تو باز خاص بدی در وثاق پیرزنے چو طبل باز شنیدی بہ لامکاں رفتی

ڈاکٹر نکلسن نے "طبل باز" کی شرح میں لکھا ہے کہ مثنوی کے فرہنگ میں ایک جگہ اس کا یہ معنی بتایا گیا ہے کہ شکاری جب اپنے باز کو آسمان سے واپس لانا چاہتا ہے تو ایک نقارہ بجاتا ہے، چونکہ "باز" کو نقارہ کی آواز سے ایک اُنس رہتا ہے اس لئے وہ فوراً اُتر آتا ہے،

اب مولانا کے شعر کا مطلب صاف ہے، یعنی ارجعی الی ربک (سورہ فجر) "طبل باز" کے مثل ہے، اور انسان کو اس کی آواز سننے کے بعد جلد از جلد طلب مولا کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

خاقانی کو تلمیحات میں خاص کمال ہے، اور اسکے قصائد میں واقعات کی طرف ایسے لطیف اشارے اور کنائے پائے جاتے ہیں، کہ شعر بعض اوقات ایک معمہ بنجاتا ہے، اس نے فسانہ، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، قرآن، حدیث، فقہ تمام مسائل کے متعلق بے مثل تلمیحات پیش کئے ہیں، انوری، سلمان، ساوجی، حافظ، جامی وغیرہ کی طرح اس کے یہاں بھی بکثرت

قرآن مجید کے بعض فقرے اور واقعات قرآن کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

خاقانی کا ایک قصیدہ ہے، جس میں یہ اشعار ہیں۔

اگر نہ فضل تو فریاد من رسیدیم است ❊ کہ قتل من کند او وقت خشیۃ الاملاق

~~~~~~~~~~~~

مدام در حق ملکت دعائے خاقانی ❊ قبول باد زحق بالعشی والاشراق،

پہلے شعر کے متعلق اگلے سطروں میں لکھا جا چکا ہے، دوسری بیت میں بھی قرآنی استفادہ ہے، سورۂ ص میں ہے: انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق — اور ہم نے پہاڑوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ان کے ساتھ شام صبح تسبیح کیا کریں۔

خاقانی کے اس قصیدے میں ایک اور شعر ہے، جسکا قافیہ قرآن سے مستعار ہے، دل من خفقان دوم زمانہ فواق" یہاں "فواق" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس معنی میں سورۂ ص کے اندر اسکا استعمال ہوا ہے۔

وما ینظر ھؤلاء الا صیحۃ واحدۃ ما لھا من فواق — اور یہ لوگ بس ایک زور کی چیخ کے منتظر ہیں جس میں دم لینے کی گنجائش نہیں۔

خاقانی کا ایک اور مطول قصیدہ بائیہ ہے، جس میں اکثر قرآنی قوافی پائے جاتے ہیں۔

زمن حکیمے سوگند نامہ درخواست ❊ بنام شاہجہاں قبلۂ "اولو الالباب"

وبعد اش گفتم واکنوں پناہ من بخدا است ❊ "الیہ ادعو ابر خواندہ ام" "والیہ مآب"

خسرو دہلوی کے دیوان میں جستجو کے بعد یہ شعر ملتا ہے۔

منم وشاہد بردائے خواجہ موذن ❊ تو در مسجد خود زن وانی ربک فارغب

اسمیں سورہ انشراح کی آیت سے لفظی استفادہ کیا گیا ہے۔

سلمان ساوجی کو علامہ شبلی موجد نکات اور خیال آفریں نہیں مانتے ہر چند اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ خواجہ سلمان کے قبل خاقانی قصیدہ گوئی کے وہ تمام دلآویز نقوش پیش کر چکا، جنھوں نے اسکی حیات کو غیر فانی بنا دیا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ اکثر متاخرین نے اپنے خیالات میں خاقانی سے مدد لی ہے، قصیدہ گوئی میں وہ تمام شعرا کا امام کہا جاسکتا ہے، بایں ہمہ سلمان ساوجی کے قصائد اپنی سادگی بیان، لطافت احساس، عذوبت الفاظ، غرابت معانی وغیرہ کے اعتبار سے بیمثل ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ میدان قصیدہ میں اُنھوں نے اپنی بالکل جداگانہ راہ اختیار کی ہے۔

خاقانی کی طرح خواجہ سلمان نے بھی اپنے قصائد میں قرآنی الفاظ اور فقروں سے استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں،

بزم احباب ہمہ جنت عدن خالدین ❊ روز اعدایت ہمہ یوماً عبوساً قمطریر

قرآن مجید میں سورۂ دہر کے اندر ہے، انا نخاف من ربنا یوماً عبوساً قمطریرا، ترجمہ ہم اپنے رب کی طرف
~~~~~~~~~~~~

ے ایک جنت اور تلخ دوزخ کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

املکوت اذلت سبع سموات طباق ‏ نقش درگاہ تو طبتم فادخلوہا خالدین

خواجہ سلمان نے پہلے مصرعہ میں سورۂ نوح کی آیت الذی خلق سبع سموات طباقا، اور دوسرے مصرعہ میں سورۂ زمر کی مفصلہ ذیل آیت سے استفادہ کیا ہے۔

وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمراً حتی اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے، گروہ گروہ کرکے جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے، یہاں تک جب اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے، تو وہاں کے محافظ ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مزے میں رہے سو اس میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ

حور و ولدان پائے کوب از طرب چو روز بزم ‏ در طواف آیند غلمانت بکاس من معین

معنی کے اعتبار سے شعر گویا سورۂ دہر کی آیت ویطوف علیھم ولدان مخلدون اور ولیشربون من کاس کا ترجمان ہے، آخری تین الفاظ قرآنی ہیں، جو سورۂ صفت کی آیت سے لئے گئے ہیں "یطاف علیھم بکاس من معین"۔ (ان کے پاس ایسا جام شراب لایا جاوے گا جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جاوے گا)

جنتے اینک رواں با جنت درخت ساحت ‏ حور و مقصور و درخت و طوبی و ماء معین

اسیں سورۂ ملک کی آیت فمن یاتیکم بماء معین سے استفادہ کیا گیا ہے،

آفتابی از دل با نور رحمت وا گیر ‏ آسمانی از سر با ظل ہمت وا پدار

تا دعائے دولتت از سر امن و امان ‏ می کند اندر آناء اللیل اطراف النہار

چوتھے مصرعہ میں سورۂ ہود کی مشہور آیت واقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل اور آپ اپنے نماز کی پابندی رکھئے دن کے دو نوں سروں، اور رات کے کچھ حصہ میں سورۂ آل عمران میں ایک جگہ "اناء اللیل" استعمال ہوا ہے لیسوا سواء من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیت اللہ آناء اللیل۔

بر براق فکر رایت عزم معراجے نہ ساخت ‏ کاسمان تسبیح "سبحان الذی اسریٰ" نہ کرد

اس کے متعلق رومی کے سلسلہ میں لکھا جا چکا،

بر گرفتی ز سر من ہمی سایۂ لطف ‏ سرو نورستہ "من انبتک اللہ" چرا

یہ غالباً اشارہ ہے، سورۂ نوح کی آیت واللہ انبتکم من الارض نباتا کی طرف اسیں "انبتک اللہ" کا فقرہ تو نہیں، تاہم قرآن کے لفظی استفادہ سے انکار نہیں ہو سکتا، اور تلمیح تو صاف ہے، خواجہ سلمان نے ایک دوسرے شعر میں سورۂ آل عمران کی آیت فتقبلھا ربھا بقبول حسن وانبتھا نباتا حسنا کی طرف اشارہ کیا ہے،

روح امینش ز سر سدرہ گفت ‏ انبتھا اللہ نباتاً حسن

حافظ اور جامی نے جس کثرت سے فارسی اشعار میں عربی فقرے اور مصرعے استعمال کئے ہیں، اسکی نظیر باوجود تلاش بھی (بجز استثنائے خاقانی) کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی، اور حق تو یہ ہے کہ عربی کلام کی اس آمیزش نے حافظ اور جامی کے کلام کو چار چاند لگا دیئے ہیں، حافظ کہتے ہیں،

بحسن عارض وقد تو بردہ اند پناہ　　　بہشت وطوبیٰ و طوبیٰ لھم وحسن مآب

سورۂ ص کی آیت ہے، وان لہ عندنا لزلفیٰ وحسن مآب اور ہمارے یہاں نکلی قرب و نیک انجامی ہے،

کدام طاعت شائستہ آید از من مست　　　کہ رنگ صبح ندانم ز فالق الاصباح

سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ اپنے متعلق فرماتا ہے، فالق الحب والنوی (تخم اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا) اور فالق الاصباح (صبح کا پھاڑنے والا)

قصۃ العشق لا انفصام لھا　　　وصمت ھھنا لسان المقال،

مطلب یہ ہے کہ قصہ عشق تو ختم ہو نہیں سکتا، لیکن زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ کیفیات عشق کی بسط وکشا ہو سکے، یہاں بھی شعر کا فقرہ "لا انفصام لھا" قرآن سے مستعار ہے، فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا (تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، جسکو کبھی شکستگی نہیں۔

بیا ساقی بدہ رطل گرانم　　　سقاک اللہ من کاس دھاقا

ساقی! آ اور بڑے پیمانہ میں شراب دے اللہ تعالیٰ تجھے لبالب بھرے ہوئے جام شراب پلائے،

پندرہ اشعار کی ایک غزل ہے اور اسمیں کثرت سے عربی فقرے، مصرعے، اور پورے عربی اشعار پائے جاتے ہیں لہجہ ادا سے بالکل معلوم ہوتا ہے، عربی خیالات کی اقتدا میں اشعار کہے گئے ہیں یعنی عہد اموی و عباسی کی عربی شاعری کا مزہ آرہا ہے، چنانچہ خود حافظ نے ایک شعر میں اقرار بھی کیا ہے،

بساز اے مطرب خوش خوان خوش گوئے　　　بشعر پارسی صوت عراقی،

ہر چند "صوت عراقی" موسیقی میں ایک راگ ہے، جیسے "حجازی" "نیم شبی" وغیرہ لیکن "شعر پارسی" کہکر حافظ صاحب نے اسکی خصوصیت کو تعمیم سے بدل دیا ہے، یا پھر یوں کہیئے اسے ذو معنی کر دیا ہے، بہر حال یہاں بھی حافظ صاحب نے سورۂ نبا کی آیت سے استفادہ کیا ہے، ان للمتقین مفازا ۰ حدائق واعنابا ۰ وکواعب اترابا ۰ وکاسا دھاقا، ساتھ ہی بیان میں حافظ نے غضب کی شوخی اور ظرافت پیدا کر دی ہے جس سے مقصود "پختہ وضع زاہدان خام" کو چھیڑنا ہے۔

مولانا جامی نے غزلیات میں بالکل حافظ کا تتبع کیا ہے، اور انکا کلام اکثر حافظ سے ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ جامی کے اشعار میں صوفیانہ خیالات کا غلبہ ہے، اور حافظ کی غزلیات میں رندانہ خیالات کا،

شد کہ قطع روئے چو مہت زلف شب آسا　　　سبحان قد یجعل اللیل لباسا

یعنی معشوق کا چہرہ ماہتاب کے مثل ہے، اور اُس کا زلف شب کے مثل ہے، تو اس صانع مطلق کی حکمت بالغہ قابل تعریف ہے، کہ اُس نے رات کو پردہ کی چیز بنا دیا، یعنی زلف محبوب اُسکے رُخ انور کا پردہ دار ہے، جامی نے بھی سورۂ نبا کی آیت وجعل اللیل لباسا سے استفادہ کیا ہے،

خوش آں برق رخشاں کہ از کوئے جاناں درخشد چو بر آسماں نجم ثاقب

"سورۂ طارق" میں وما ادرک ما الطارق ؕ النجم الثاقب، اور آپکو معلوم ہے، وہ رات کو نمودار ہونیوالی چیز کیا ہے؟ وہ روشن ستارہ ہے، ہے قرآن مجید میں ستاروں کا بیان ہے، اور جامی نے بھی اس معنی میں استعمال کیا ہے،

چشمت بہ غمزہ لب بہ شکر خندہ می کند تفسیر آیت خلق الموت والحیات

چشم محبوب سے غمزہ ٹپکتا ہے، اور یہی عشاق کے لئے موت کا سامان ہے، لب معشوق اپنی شیرینیت کے لئے امتیاز رکھتا ہے، تو یہ گویا حیات کی تفسیر ہوئی، یہ فقرہ سورہ ملک کی آیت وخلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا سے مستفاد ہے،

بس دلکش است قصۂ خوبان زماں میاں تو یوسفی وقصہ تو "احسن القصص"

محبوبان عالم کا فسانہ تو یوں بھی دلکش ہوتا ہے، لیکن تم چونکہ یوسف زماں ہو، اس لئے تمہارا افسانہ بھی احسن القصص (بہترین قصہ) ہے اسمیں جامی نے لفظا اور معنی دونوں اعتبار سے استفادہ قرآنی کیا ہے، حیات یوسفی کو خود اللہ تعالےٰ احسن القصص سے تعبیر کرتا ہے۔ نحن نقص علیک احسن القصص

جامہ زغم کبود کنم چوں نمی رسد جز نیل معصیت زخم "صبغۃ اللھم"

اسمیں جامی عمدہ استعارہ لائے ہیں، پہلے مصرعہ میں جامہ کبود اور دوسرے مصرعہ میں "نیل معصیت" کی رعایت لفظی قابل داد ہے سورۂ بقرہ کی مشہور آیت ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغہ

اے برخت ہر نفس مہر دل ما فزوں وجھک شمس الضحےٰ "ونحن لہ عابدون"

اے وہ کہ تمہارے رُخ سے ہر گھڑی میری قلبی محبت بڑھتی ہے، تمہاری صورت دوپہر دن چڑھے آفتاب کی طرح ہے، اور ہم اسکے پوجاری ہیں،

قرآن مجید میں ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون۔

ابروے دقد خوشت صورت "نون والقلم" نقش خط دلکشت معنیٔ "ما یسطرون"

سورۂ "نون والقلم" کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالےٰ نے نبی صلعم کی تعریف کی ہے "وما یسطرون" اسی ابتدائی سورہ کا ایک فقرہ ہے، جامی نے نعت میں یہ شعر کہا ہے، یعنی سورہ نون والقلم کے لفظ "نون" کی طرح آنحضرتؐ کا ابرو خمدار ہے چونکہ "نون" کی شکل خمدار رہتی ہے اور آپکا قد "قلم" کی طرح بلند بالا اور سیدھا ہے، اور آپکا حلیہ مبارک گویا تفسیر ہے،

"وما یسطرون" کی یعنی اللہ تعالے کی قدرت کا انکشاف، آپکی صورت سے ٹپک رہا ہے غالب کہتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کسکی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

عرفی کی غزلیات میں باوجود تلاش بھی کوئی ایسا شعر نہیں ملتا عرفی نے اپنی غزلیات میں عربی فقرے اور مصرعے بہت کم استعمال کئے ہیں، کلیات حزیں میں البتہ فارسی اشعار کے ساتھ عربی فقروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

بر افسون بے چون نے حزیں ز خود تھی گشتم — تو آگاہی ز حال بجو داں اے عالم النجویٰ

یہ سورہ مجادلہ کی مفصلہ ذیل آیات کی طرف اشارہ ہو جنہیں نجوی (کانا پھوسی) کے تفصیلی ہدایات ہیں۔

الم تر ان اللہ یعلم ما فی السموات والارض	کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا آسمان اور زمین کے تمام حالات سے مطلع ہے
ما یکون من نجوی ثلاثۃ الا ھو رابعھم	کسی خفیہ صحبت میں تین آدمی نہیں ہوتے مگر یہ کہ چوتھا خدا ہوتا ہے
ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنی من	اور پانچ آدمی نہیں ہوتے مگر یہ کہ چھٹا خدا ہوتا ہے، اور اس سے
ذالک ولا اکثر الا ھو معھم۔	کم یا زیادہ آدمی نہیں ہوتے، مگر یہ کہ خدا انکے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں معنی اور لفظ دونوں عبارت سے استفادہ پایا جاتا ہے، اسی طرح حزیں کا دوسرا شعر ہے،

حزیں نہ باشد غم نہانی سحر نمودن نکتہ دانی — کہ یار جانی چنانکہ دانی بکل شیٔ احاط علما

اسمیں شک نہیں حزیں نے سورۂ طلاق کی مفصلہ ذیل آیت سے استفادہ کیا ہے۔

اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیٔ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شیٔ علما۔

لیکن قرآن مجید میں "احاطہ بکل شیٔ علما" ہے، حزیں نے ضرورت شعریہ کے لحاظ سے الفاظ الٹ دیئے ہیں۔ "بکل شیٔ احاط علما" کہا ہے، استفادہ قرآنی کا یہ معیوب طریقہ ہے، اور اس کی نظیر اساتذہ کے کلام میں مشکل سے ملتی ہے۔

تلمیحات قرآنیہ شعرائے فارس نے استفادہ قرآنی کی دوسری صورت یہ اختیار کی تھی، کہ رمزیات (SYMBOLISM) کے طور پر قرآن مجید کے تفصیلی واقعات کی طرف اشارے کرتے، چنانچہ انھوں نے اس موضوع کے لئے چند واقعات مخصوص کر لئے ہیں، واقعات حضرت داؤد و سلیمان، ابراہیم و نمرود، یعقوب و یوسف، موسیٰ و خضر، اور عیسیٰ اسکے لئے امتیاز رکھتے ہیں اور انھیں کے اجزا و تفصیلات کے متعلق فارسی شاعری میں اشارے پائے جاتے ہیں۔

یوسف و زلیخا کے واقعات حسن و عشق، گریہ یعقوب، یوسف کا دور غلامی، اور دور سلطنت، دیوار خضر، چشمۂ حیوان، بدرقۂ راہ، عصائے موسیٰ، ید بیضا، دم عیسیٰ، احیائے موتیٰ، مائدہ سماء کے متعلق مختصر الفاظ میں ایسی ایسی دقیقہ سنجیاں کی گئی ہیں کہ اگر واقعات قرآن پر نظر نہ ہو، تو ایسے اشعار کا سمجھنا ناممکن ہے اور بالفرض صرف واقعات ہی معلوم ہوں

تو بھی الفاظ کی نکتہ آفرینیاں قلب سامع پر وہ کیفیات طاری نہیں کرسکیں، جو الفاظ قرآن کا علم رکھنے کے بعد پیدا ہوسکتی ہیں۔

لحن داؤد و باد سلیمان

چو گل سوار شود بر ہوا سلیمان وار
سحر کہ مرغ در آید بہ نغمۂ داؤد (حافظ)

حافظ از دولت عشق تو سلیمانی یافت (حافظ) یعنی از وصل تواش نیست بجز باد بدست

پست شد خسرو مسکیں بہ لگد کوب فراق (خسرو) مور در خاک فرو رفت سلیمان چو نشست

چہ بودے کہ یک مرغ پرّاں شدے (رومی) بر و طوق سرّ سلیمان ما

پہلے شعر میں "لحن داؤد" اور پہلے اور دوسرے اشعار میں حضرت سلیمان کے اس عالمگیر قبضہ و اقتدار کی طرف اشارہ ہے، جسکا بیان قرآن میں "سورۂ انبیا" کے اندر "وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر" (اور ہمنے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو تابع کردیا تھا کہ وہ تسبیح کیا کرتے تھے، اور پرندوں کو بھی) اور "ولسلیمٰن الریح عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا" اور ہمنے سلیمان کا زور کی ہوا کو تابع بنادیا تھا، کہ وہ انکے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی تھی) آیا ہے، حافظ صاحب نے صبح کے وقت نغمۂ طیور، اور شگفتگی گل منظر دکھایا ہے، اور اسکے لئے "باد سلیمان" اور "تسبیح داؤد" کی تشبیہ لائے ہیں۔

خسرو اور رومی نے "سورۂ نمل" کی مفصلۂ ذیل آیات کی طرف اشارہ کیا ہے،

حتیٰ اذا اتوا علیٰ واد النمل قالت نملۃ یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمٰن وجنودہ وھم لا یشعرون فتبسم ضاحکا من قولھا

یہاں تک کہ جب وہ (سلیمان) چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تمکو سلیمان اور انکا لشکر بیخبری میں نہ کچل ڈالیں۔

اذہب بکتابی ھذا فالقہ الیھم (سلیمان نے کہا) یہ خطاب جانور ہد ہد کو خطاب ہے، اور اسکو انکے پاس ڈال دینا (یعنی قبیلہ سبا میں)

اب خسرو اور رومی کے اشعار کا مطلب صاف ہے، خسرو فرماتے ہیں کہ میرا محبوب بمنزلہ سلیمان ہے اور میں ابتک ایک چیونٹی کے مثل ہوں، اسکے فراق میں پیسا ہی ہوں، جسکا لفظ "لا یحطمنکم" لکر ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو دلایا تھا، کہہ سکتے ہیں کہ "مور در خاک فرو رفت سلیمان چو نشست" لکر جناب خسرو نے اپنے معشوق پر تعریض کی ہے یعنی حضرت سلیمان تو چیونٹی کے کلام پر ہنس پڑے، انکو تو چیونٹی کی خبر ہوگئی، لیکن نہ معلوم میرے محبوب کو میری پامالی کی اطلاع

رومی کے یہاں صوفیانہ خیال ہے، اور وہ اپنے "طائر روح" کے گردن میں سلیمان کی طرح اپنا خط قبیلہ سبا کی شاہزادی بلقیس کی بجائے جو نشیمن فانی" کی ملکہ ہے، وہاں بھیجنا چاہتے ہیں جسکی تمنا علی حزیں لاہجی نے اس شعر میں ظاہر کی ہے،

تو رشک یوسف مصری فتادہ در چہ تن تو باز کنگر عرشی بہ خاکداں چونی،

گلخن ابراہیم

چراغ عشق بہ گلخن شود دلیل مرا

بہ گشت گلخن خود می برد خلیل مرا (عرفی)

یعنی محبت کی رہنمائی یہ ہے کہ میں دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑوں، جو میرے نزدیک کسی طرح حضرت ابراہیم کے اس گلخن (آگ کی بھٹی) سے کم نہیں جس میں چمن کا لطف حاصل تھا، یہ بھی قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کی طرف اشارہ ہے

قالوا حرقوہ وانصروا الٰہتکم ان کنتم فاعلین ۞ قلنا انار کونی برداً وسلاماً علی ابراہیم

وہ لوگ (نمرود اور اُسکے رفقا) کہنے لگے اُنکو (ابراہیم) آگ میں جلادو، اور اپنے معبود کا بدلہ لو، اگر تم کو کچھ کرنا ہے، اور ہم نے کہا اے آگ تم ٹھنڈی اور بے گزند بن جاؤ ابراہیم کے حق میں)

صبر ایوب

ناصبوری گر کند عرفی دلم عیش مکن

ناصبوری شرط اصلاحست ایوب مرا

عرفی نے قرآن مجید کے واقعہ سے استفادہ عکسی کیا ہے، حضرت ایوب بڑے صابر تھے، انکی اولاد، دولت، جائداد تمام چیزیں تباہ ہوگئیں، آخر میں جسم سڑ گیا، کیڑے پڑ گئے، تاہم وہ لذت صبور سے آشنا رہے، آخرکار کردگار عالم نے اس صبر و تحمل کے صلہ میں انھیں پھر یہ نعمتیں عطا کردیں، اسی کا تذکرہ سورۂ انبیاء میں ہے،

وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین فاستجبنا لہ فکشفنا ما بہ من ضر و اتینٰہ اھلہ ومثلھم معھم رحمۃ من عندنا

اور ایوب کا تذکرہ کیجئے، جبکہ اُنھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھکو یہ تکلیف پہونچ رہی ہے، اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں، سو ہم نے انکی دعا قبول کی اور اُنکو جو تکلیف تھی اُسکو دور کردیا، اور ہم نے انکو انکا کنبہ عطا فرمایا اور انکے ساتھ انکے برابر اور بھی اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے۔

عرفی کہتے ہیں کہ حضرت ایوب کی اصلاح کا سبب تو صبر اور جفاکیشی تھی، میری اصلاح کے لئے ناصبوری شرط ہے اور اس لئے میرے دل ناصبور کا گلہ نہیں کرنا چاہیئے۔

(باقی دارد)

(عبدالمالک آروی)

دو گھنٹے جہنم میں

صبح تک میں خود بھی اپنے آپ کو ایسا بیمار نہ سمجھتا تھا کہ وصیت کی فکر کرتا یا اُن سب ناتمام کاموں کا انتظام کر جاتا جن کو میں کبھی اپنی ۴۰ سال کی عمر میں پورا نہ کر سکا تھا اور نہ شاید کبھی انجام تک پہونچا سکتا، خواہ اتنی ہی عمر اور کیوں نہ ملجاتی۔ اکثر کبھی کبھی قلب کے حوالی میں درد کی چمک محسوس ہوتی تھی اور میں سینہ پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا، دوپہر تک مجھے اور سب کو یہی یقین رہا کہ ریاح کا تکاثف ہے، فکر کی بات نہیں، لیکن جب شام کے وقت درد کے شدید پے درپے حملوں نے تشویش پیدا کی تو ڈاکٹر صاحب بلائے گئے۔ یہ میرے پرانے رفیق تھے۔ ان کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ اس زمانہ میں لوگ تداخل فصلین کے وقت بھی اس قدر بیمار نہیں پڑتے، جتنے پہلے اچھے موسم میں صاحب فراش ہو جاتے تھے، اس میں شک نہیں کہ آدمی ذہین تھے، تجربہ کار تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے۔ بہر حال وہ اس کی تاویل یہی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آتے ہی نبض دیکھی آنکھوں کے پپوٹے چیر کر معائینہ کئے، زبان نکلوا کر اسکا رنگ دیکھا اور پھر آلہ سینہ پر رکھ کر ضربات قلب کی حالت دیکھی اور حد درجہ مایوسانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر میرے اعزہ اور تیمار داروں سے کہا کہ "آپ لوگ اگر چند منٹ کے لئے باہر چلے جاتے تو بہتر تھا۔" میں اسوقت سکون کی حالت میں تھا۔ جب تنہائی ہوگئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ بہت بڑے آدمی ہیں اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ گھبرائیں گے نہیں اگر میں یہ کہوں کہ آپ جلد سے جلد اپنی وصیت مرتب کر لیجئے اور جو ہدایتیں اپنے پسماندگان کو کرنا ہیں، کر دیجئے، کیونکہ آپ کے قلب کی حالت بہت نازک ہے اور مشکل ہی سے شاید دو گھنٹے اور وہ اپنا کام کر سکے"،

اس میں کلام نہیں کہ میں فطرتاً بہت جری ہوں اور بڑی سی بڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسقدر ناگہانی طور پر مجھے صرف دو گھنٹہ کا نوٹس، اُس دنیا سے چلے جانیکا دیا جس میں میں اپنی زندگی کے چالیس سال اس قدر انہماک و تعلق شدید کے ساتھ بسر کر چکا تھا —— میں واقعی گھبرا گیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ اتنی میں کمزور طبیعت کا انسان نہیں ہوں، لیکن یہ غلط ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرا خیال کیا یقین تھا کہ کم از کم ۸۰ سال ضرور جیوں گا، کیونکہ میری صحت اچھی تھی، میرے قوا صحیح تھے، بیمار بہت کم پڑتا تھا، پورے دو من کا وزن رکھتا تھا اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ مجھے دنیا میں بہت سے کام کرنا تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فطرت اسقدر ظالم ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے قبل از وقت اُٹھا لے درآنحالیکہ میرے رہنے سے اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اس لئے جب میں نے یہ سنا کہ ۸۰ سال میں سے دفعتہً ۴۰ سال کم ہو گئے ہیں اور میں اپنے تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ جانے پر مجبور ہوں، تو میری تمام جرات و ہمت مفقود ہو گئی، اور میری حالت اس کبوتر کی سی ہو گئی جو باز کے پنجہ میں پہونچکر، بازو پھٹ پھٹانے کی بھی قوت

کھو بیٹھتا ہے، سب سے پہلے مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ اس صدمہ کو کیونکر برداشت کریں گی، بیس برس کی معیت کا یوں دفعتہً ختم ہو جانا، ان کو کسقدر بیتاب کر دے گا، اس کے بعد میں نے سوچا کہ میرے دو بچے جن کی تعلیم بھی ابھی پوری نہیں ہوئی کیا کریں گے۔ میری چھوٹی بچی جو مجھی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی ہے، کیونکر زندہ رہ سکے گی، روپیہ اپنی بے احتیاطیوں کی وجہ سے کبھی پس انداز نہیں کر سکا، کاروبار کی حالت درست نہیں اور ہو بھی تو اس کا چلانے والا کون ہے، بیمہ کی رقم بھی اتنی نہیں کہ بیوی بچوں کے لئے معقول سہارا ہو سکے۔ الغرض یہ تمام ہولناک خیالات مجسّم ہو ہو کر سامنے آگئے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ جسم کے ریشہ ریشہ میں کسی نے برف پگھلا کر بھر دیا ہے۔ سر و پیشانی سے ٹھنڈا پسینہ بہ بہ کر ٹپکنے لگا، اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے پڑ گئے گویا کہ ان کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی جواب دوں لیکن زبان نے کام نہ دیا اور میں بیہوش ہو کر وہیں پلنگ پر گر پڑا ....

اس کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ میں کب مرا اور کس وقت قبرستان پہونچایا گیا۔

دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ سامنے سے ایک بڑا شعلہ چلا آ رہا ہے، لیکن تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اس کی روشنی بالکل نہیں پھیل سکتی اور گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے تو معلوم ہوا کہ میں کسی گڈھے کے اندر بند ہوں اور جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ وہ شعلہ بڑھتے بڑھتے قریب آیا اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر میرے دونوں پاؤں کے اوپر قائم ہو گیا۔ اب گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اور کیفیت یہ تھی کہ جسم پسینہ کے ساتھ گھلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے کہ کہیں یہ دونوں شعلے مجھے جلا نہ دیں، لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں روشنیاں طول میں بڑھنے لگیں، یہانتک کہ ان میں سے ہر ایک بہت لمبی سلاخ سی بن گئی، اور عجیب قسم کے بھیانک سے چہرے ان میں سے پیدا ہو کر میری طرف گھورنے لگے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ کہیں نکیرین ہی تو نہیں ہیں۔ جنکا ذکر میں نے کتابوں میں دیکھا تھا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا نہایت ہی وزنی گرز سر پر پار رہے ہیں اور میرا دماغ پاش پاش ہوا جا رہا ہے۔ میں چیخ اٹھا کہ خدا کے لئے مجھے کیوں مارتے ہو انھوں نے کہا کہ "آج تو ہمیں خدا کا واسطہ دلاتا ہے، لیکن یہ تو بتا کہ کبھی تو نے بھی خدا سے کوئی واسطہ رکھا تھا، تو نے اسکو ہمیشہ ایک قوت سمجھا اور قوت بھی مجبور قسم کی جو مقررہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر آج کیا ہوا جو اسکی پناہ میں آنا چاہتا ہے"۔

اب مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ "یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بات کا جواب بھی نہیں سنتے اور مارنا شروع کر دیتے ہو۔ مجھ سے سوال کیا ہے تو اس کا جواب سن لو پھر مارنے نہ مارنے کا تمہیں اختیار ہے"۔

وہ لفظ "انسانیت" سن کر بہت ہنسے۔ (ان کی ہنسی بہت ہی مہیب قسم کا زہرخند تھی) اور بولے کہ "اسے بیوقوف "انسان" اور "انسانیت" یہ سب دنیا اور مادی عالم کی اصطلاحیں ہیں، یہاں ان کا استعمال درست نہیں۔ پھر یہ کہ ہم انسان کب ہیں جو ہم سے انسانیت کی توقع رکھتا ہے۔ ہم لوگ فرشتے ہیں، فرشتے، یوں ہی گرز چلاتے چلاتے نامعلوم زمانہ

گذر گیا ہے اور روشنی کی وہ آگ جو آدم کی پیدائش کے وقت سے مخفی طور پر ہماری مخلوق میں انسان کی طرف سے بھڑکتی آرہی ہے، اُسے اسی طرح بجھایا کرتے ہیں۔ بیشک ہم نے آدم کو سجدہ کیا تھا، لیکن وہ سجدہ مجبوری کا تھا، نہ کہ دلی خوشی کا۔"

میں نے یہ خیال کرکے کہ انکی گفتگو سے تو کچھ خدا کی طرف سے بھی بیزاری پائی جاتی ہے، بہت خوش ہوکر کہا کہ "سچ کہتے ہو، واقعی تمہاری سخت توہین کی گئی، کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور کئے گئے۔ اس لئے اگر تم لوگ مجھے مہلت دو، تو میں تمہیں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے آمادہ ہوں، اور سچ پوچھو تو خدا انھیں کو ہونا چاہیئے کہ تمہارے گُرز سے سام و نریمان، رستم و اسفندیار کا کلیجہ بھی دہل سکتا ہے۔ میں نے تو خدا کا واسطہ صرف اس عادت کی بنا پر دلایا تھا جو دنیا کی زندگی میں پڑ گئی تھی، اور جس سے مقصود گفتگو میں زور دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھا تو مجھے اُٹھاؤ اور اس تاریک غار سے باہر نکالو تاکہ میں آزادی سے سانس لیکر سوچوں کہ کیونکر تمہاری خدائی دنیا میں قائم ہوسکتی ہے۔"

وہ یہ سُن کر بہت ہنسے اور بولے کہ "ساری عمر میں تو ہی آج پہلا مُردہ ایسا ملا ہے جو ہمیں بہکا کر خدا سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ احمق تجھے نہیں معلوم کہ ہماری تمام حرکتیں مشین کی طرح ہیں، اور ہم کو نہ سوچنے کا اختیار ہے، نہ اُس کے علاوہ کچھ کرنے کا، جو بے اختیارانہ طور پر ہم سے سرزد ہوتا رہتا ہے، زیادہ بک بک نہ کر، اُٹھ، جہنم تیرا انتظار کر رہا ہے، اور آگ کے شعلے تجھے ڈھونڈھ رہے ہیں۔"

اب مجھکو پہلی مرتبہ واقعی طور پر معلوم ہوا کہ میں مرگیا ہوں اور جہنم کا نام سُنکر پھر میرے حواس نے جواب دینا شروع کیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نکیرین غائب ہیں۔ اور میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے تپتے ہوئے ریگستان کے اوپر سے گھسیٹتی ہوئی کسی طرف لئے جارہی ہے۔ ادھر، ادھر جو میں نے نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دو، دو رفاصلہ پر مجھ ایسے سینکڑوں مُردے گھسیٹے جارہے ہیں۔ انہیں سے کوئی چیخ رہا ہے کوئی تڑپ رہا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو میری طرح بالکل خاموش ہیں، اور خدا جانے بیچارگی کے ساتھ گھسیٹے جارہے ہیں۔ تھوڑی دور چلکر میں نے دیکھا کہ ہر مردہ کی سمت رفتار بدل گئی ہے، اور اب میں تنہا رہ گیا ہوں، وہ زنجیر دفعتہً مجھے غار تک پہونچا کر غائب ہوگئی۔ اور میں اُس کے اندر اس تیزی سے جانے لگا جیسے کوئی اژدہا اپنی گرم و مسموم سانس سے کھینچ رہا ہو، مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک اسطرح گھسٹتا رہا، دفعتہً یہ کشش بھی دور ہوئی، اور میں نے اپنے آپ کو ایسے میدان میں پایا جو حد نظر تک وسیع تھا اور آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سُرخ آندھی چھائی ہو۔ جا بجا چنگاریوں کے بگولے، بلند ہو رہے تھے۔ اور کہیں کہیں آگ کے فیل پیکر شعلے جن میں سے بعض بالکل تاریک تھے، اور بعض بالکل سفید، اس طرح اُٹھ رہے تھے۔ جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا، زبان باہر نکل پڑی تھی، تالو چٹخا جارہا تھا، اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں سے کھولتا ہوا پانی ہی میسر آجائے لیکن بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ پر عذاب ہی ہوتا ہے، تو وہ کیوں نہیں شروع ہوجاتا، اور کیوں

نہیں مجھے آگ میں ڈالدیا جاتا کہ جل بھن کر خاک ہو جاؤں اور اس تکلیف سے نجات پاؤں۔ ناگہاں ایک فرشتہ سامنے سے اُڑتا ہوا نظر آیا جس کے پر مبازو شعلہ کی طرح چمک رہے تھے، اور جس کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کھولتا ہوا تانبہ۔ اس چہرہ میں صرف ایک آنکھ چاندی کی طرح درمیان میں چمک رہی تھی جس کے اندر سے کبود رنگ کی شعاعیں، ببول کے کانٹوں کی طرح نکل نکل کر جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ میرے سامنے آکر قائم ہو گیا اس حال میں کہ اُس کا سارا جسم ایسا نظر آتا تھا، جیسے گندھک کے ڈھیر میں آگ دیدی گئی ہو۔

اُس نے کہا "تمہارے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ فی الحال چند دن تک جہنم میں آزاد چھوڑ دئے جاؤ اور سوائے اس ایذا کے جو یہاں کی فضا میں از خود تمہیں پہونچ جائے کوئی اور عذاب مسلط نہ کیا جائے"۔

یہ کہکر فرشتہ دھوئیں کی شکل اختیار کرکے فضا میں از خود تحلیل ہو گیا اور میں حیران کہ آزادی بھی ملی تو کہاں جاکر، لیکن اس خیال سے کہ خیر فردوس کی پابندی سے بہرحال جہنم کی آزادی بہتر ہے، آگے بڑھا اور یہ دیکھکر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اب بجائے چٹیل میدان کے نہایت وسیع قلعہ کا سا حصار سامنے تھا۔ میں اُس پھاٹک پر تھا جو سرنگ کی طرح بالکل کُھلا تھا۔ وفعتہً دروازہ کُھلا اور میں اندر داخل ہو گیا ایک طرف نہایت وسیع جھیل کھولتے ہوئے پانی کی تھی، جس میں نئے مُردے لالاکر غوطہ دئے جا رہے تھے۔ اور اس طرح گویا سب سے پہلے اُن کی چربی نکالنے کی رسم پوری ہو رہی تھی۔ عفونت سے دماغ سڑا جا رہا تھا اور چیخ پکار سے کلیجہ دہلا جاتا تھا۔ داہنی طرف نگاہ گئی تو بہت سے آہنی مکان نظر آئے، جنکی دیواریں بلند تھیں لیکن شعلے اُن کے اوپر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر مکان کا ایک دروازہ تھا، لیکن بہت تنگ اور اسکے اندر سے بھی دہکتی ہوئی آگ اس طرح نظر آتی تھی جیسے انجن کی بھٹی دروازہ کھلنے کے بعد ــــ

سب سے پہلے مکان کے دروازہ پر آتشیں حروف میں ابلیس کے نام کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ لیکن یہ مکان مکین سے خالی تھا، کیونکہ قیامت کے دن تک یہ دنیا میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اندر صرف دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور آتشکدے ہنوز روشن نہیں کئے گئے تھے،

اس کے پاس ہی دوسرے مکان پر فرعون کا نام درج تھا۔ یہ نام دیکھتے ہی تمام وہ جھگڑے سامنے آگئے۔ جو اُسکے اور موسیٰ کے درمیان پیدا ہوئے تھے اور بیتابانہ اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک نہایت ہی مہیب شکل کا انسان بیتابانہ ادھر اُدھر دوڑتا پھر رہا ہے۔ تمام جسم میں اُسکے سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں۔ اور وہ اُن کے زہر کی تکلیف سے بیچین ہو کر قریب ہی ایک گڑھے میں جس کا پانی سرد معلوم ہوتا ہے کود پڑتا ہے۔ لیکن اس کے کودتے ہی آگ لگجاتی ہے، اور وہ پھر وہاں سے گھبرا کر باہر نکل آتا ہے۔ میں نے چاہا کہ ٹھہرے ہو کر کچھ حالات دریافت کروں لیکن اس کی بیتابی کسی ایک جگہ لمحہ بھر کے لئے بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لئے میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سامنے اسکے عذاب کا مفصل پروگرام دیوار پر منقوش تھا اور اسکے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہزار طرح کے عذابوں میں سے یہ صرف دوسرے قسم کا عذاب تھا جو ایک ہزار

سال تک اسی طرح قائم رہے گا، اس کے بعد تیسرے عذاب کا زمانہ آئے گا۔ پھر چوتھے کا یہانتک کہ جب یہ ہزار قسم کے عذاب پورے ہو جائیں گے تو پھر دس لاکھ سال کا دوسرا پروگرام بنایا جائے گا۔

میں گھبرا کر یہاں سے نکلا، تو قریب ہی قریب، ہامان و شداد کے مکان نظر آئے لیکن میں اندر نہیں گیا اسی طرح قارون، نمرود، سامری، ضحاک وغیرہ کی عذاب گاہوں سے گزر گیا، لیکن جب دفعتہً میری نگاہ کلیوپٹرا کے بورڈ پر پڑی تو میں ٹھہر گیا، کیونکہ مجھے اسکی زیارت کا بڑا شوق تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں اس میں وہ کونسی بات تھی۔ جسنے مصر قدیم کو دیوانہ بنا رکھا تھا، اندر گیا تو سب سے پہلے ایک آتشیں آبشار نظر آئی جو ایک سنگین مورت پر تیزی کے ساتھ گر رہی تھی، جس وقت اس آبشار کی دھار اس بت پر پڑتی تھی تو فوارہ کی شکل میں اس سے چنگاریاں بلند ہونے لگتی تھیں۔ یہ بت کلیوپٹرا کا تھا، بلند بالا، پُر شباب، آشفتہ گیسو، اور سر سے پاؤں تک بالکل عُریاں و بے پردہ۔ میں حیران تھا کہ اگر کلیوپٹرا کو پتھر بنا کر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے تو اسکو خدا کے جمالیاتی ذوق کی رعایت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ دفعتاً وہ بت شق ہوا اور اُسکے اندر سے ایک عورت شکل و صورت اور خد و خال کی نمودار ہوئی۔ اُس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے، لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر گالوں پر رنگین خطوط اتے ہوئے نیچے گر رہے تھے، گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا آگ کی لپیٹ سے جنبش میں آ آ کر جسم سے مس کرتا تھا اور ہر بار اُس کے گورے گورے جسم پر ایک سُرخ نشان چھوڑ جاتا تھا، اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا۔ اور قیصر و انطونی اگر اس حال میں بھی اسے دیکھ لیتے، تو شاید اس سے دوبارہ ملجانے کے گناہ میں ایک عمر دوزخ اور بسر کرنیکے لئے آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اسکی وہ نگاہیں دیکھوں جن سے مسحور ہو کر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا، اسکی لانبی لانبی پلکیں خون تو ضرور ٹپکاتی رہیں، لیکن اسکی نگاہوں نے بلند ہو کر فضا کو مسموم نہیں کیا، تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ بت پھر شق ہوا اور اُسکے اندر کلیوپٹرا سمانے لگی، یہ غالباً اُس کے لئے سب سے بڑا عذاب تھا، کیونکہ جتنا حصہ اس کے جسم کا پتھر میں تبدیل ہوتا جاتا تھا اس قدر زیادہ اس کے چہرہ سے کرب و ملال کے آثار ظاہر ہوتے جاتے تھے، یہانتک کہ جب گردن تک وہ پتھر کی ہو گئی تو ایک ایسی چیخ اُس کے منھ سے نکلی جیسے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے دب گئی ہو اور پھر دفعتہً اس کا چہرہ و سر بھی اسی سنگین حالت میں منتقل ہو گیا۔ دوزخ میں آنیکے بعد یہ پہلا منظر تھا جسنے بجائے غم و غصہ کے ملال کی کیفیت میرے اندر پیدا کی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے مینوا و بابل کی اس مشہور رقاصہ کا مکان ملا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاروت ماروت کو مبتلائے حسن کر کے اس نے اسم اعظم سیکھ لیا تھا اور آسمان پر زہرہ بنکر اُڑ گئی تھی۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آسمان پر اُڑ جانا غلط خبر تھی، بلکہ وہ قعر جہنم میں، ہاروت ماروت کے ساتھ پھینکدی گئی تھی۔ میں اُس کے بھی دیکھنے کا شائق تھا اس لئے اندر گیا۔ یہاں میں نے نہایت ہی تاریک دھواں دیکھا، جس میں چنگاریاں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیر تک آنکھیں

ملنے کے بعد اسی تاریکی میں دور ایک عورت نظر آئی۔ جو انگاروں پر لوٹ رہی تھی، اس کے جسم سے چربی اور خون کے جو قطرے ٹپک ٹپک کر آگ پر گرتے تھے، تو سخت عفونت پیدا ہوتی تھی۔ میں یہاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکا اور فوراً ناک بند کرکے باہر نکل آیا۔

میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا، اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا، اسکی تفصیل کو آئندہ صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب اُس طبقہ میں پہونچا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا تو میر، مصحفی ناسخ، آتش، وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالب کے پاس پہونچا، تو وہاں ایک عجیب و غریب لطیفہ اُنھوں نے سنایا کہ:۔

"جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھکر مجھے جنت کے ایک نہایت ہی حقیر حصہ میں لیجا کر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا۔ جہاں سوائے ایک خشک گملے کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی آرزوئیں ناکمل چھوڑ کر آئے ہو، اور تمھارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز داد طلب پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے بتاؤ ان میں سے کوئی ایک آج پوری ہو سکتی ہے۔ میں نے فرط مسرت میں گھبرا کر کہدیا کہ "کوئی ایک"۔ میرے منھ سے یہ نکلا ہی تھا کہ فردوس کے اس حجرہ کو اُٹھا کر یہاں دوزخ میں ڈالدیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ میری کونسی آرزو تھی جو اس طرح پوری کیجا رہی ہے کہ ناگہاں سامنے دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ:۔

دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے اوپر اس مصرعہ کی وجہ سے یہ عذاب نازل کیا گیا ہے۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن میری سمجھ میں آجتک یہ نہ آیا کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ "طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ" خدا کو سُنایا گیا یا نہیں ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہونچی۔ ورنہ مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنی چاہیئے تھی نہ کہ ایسا حقیر و کثیف حُجرہ، جو اگر جہنم میں نہ ڈالدیا جاتا تو میں خود اُس کے اندر آگ جلا کر اسکی گندگی و عفونت کو دور کرتا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ ان ظاہر پرست ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا ہے اور افسوس ہے کہ اب فردوس بھی رہنے کے قابل جگہ نہ رہی"۔

میں نے یہ سنکر کہا کہ "آپ کا یہ خیال غالباً درست نہیں، کیونکہ میں نے تو آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ اُن کی نسبت کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اعلےٰ علیین سے ایک قدم نیچے اُتریں گے"۔

یہ سن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ "پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی۔ تمام عمر اُن کے صلاح و تقوے کے وعظ نے مجھے دنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے کچھ دیکھا نہیں۔ جہنم میں آیا تو

معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کہو تم یہاں کس سلسلہ سے آئے ہو"

میں نے عرض کیا کہ مجھے ابھی تک بالکل اس کا علم نہیں۔ فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں۔ آیندہ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ شاعروں کے سلسلہ میں کہیں جگہ نہ دیجائے کیونکہ ان پر جس قسم کا عذاب ہوتے میں نے دیکھا ہے وہ حد درجہ توہین آمیز ہے۔ اُن کے ہر ہر جھوٹے شعر کی ایک تمثالی صورت عذاب کی صورت میں پیش کیجاتی ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاعر کس کسطرح جھوٹ بولتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ شعر

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں اب تو دے

کسی واقعہ کی بنا پر کہا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شعر جھوٹ کہا گیا ہے تو یقیناً یہ حرکت آپ کو یہاں کرنا پڑے گی اور ایک ہزار سال تک جو یہاں کی ریاضی کی اکائی ہے برابر آپ کو کسی نہایت ہی کروہ شکل والے کے پاؤں دابنا پڑینگے۔ الغرض میں اس وقت سے کانپتا ہوں جب شعراء کے زمرہ میں مجھ پر عذاب نازل کیا جائے۔ ہرچند اس کا اندیشہ کم ہے کیونکہ اول تو میں نے شعر ہی بہت کم کہے ہیں اور جو چند کہے بھی ہیں تو وہ شعروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔

وہ اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دفعتہً اپنے ہاتھوں سے اپنا منھ نوچنے لگے، سینہ زخمی کرنے لگے میں نے خیال کیا کہ یقیناً یہ بھی "عذاب شعری" ہے اور دیر تک سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ داد ہے اُن کے اس شعر کی۔

تا بند نقاب کہ کشو دست کہ غالب
رخسارہ بہ ناخن صلہ دادیم و جگر ہم

میں یہ دیکھ کر یہاں سے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ اور سوچتا رہا کہ دیکھئے اب کبتک غریب غالب اس حال میں مبتلا رہتا ہے۔

جہنم کے کتنے طبقات ہیں اس کا علم مجھے نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہر گروہ و جماعت کے لئے ایک ایک حصہ مقرر ہے۔ مثلاً ایک حصہ جہنمی بادشاہوں کا ہے، جن میں سے صرف فرعون کا حال میں نے لکھا، دوسرا حصہ حکماء اور علماء کا ہے۔ جن میں سے ارسطو، افلاطون، فیثاغورث وغیرہ سینکڑوں کو مختلف عذاب میں مینے مبتلا دیکھا، ایک حصہ مولویوں، متقیوں اور نمازیوں کا بھی ہے، اور یہ دیکھکر مجھے کتنی حیرت ہوئی کہ ان میں سے بعض ایسے ایسے اکابر بھی مبتلائے عذاب تھے جنھوں نے دنیا میں اپنی مستقل شریعتیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن سب سے زیادہ ہنسی مجھے اُس وقت آئی جب مینے اپنے محلہ کے ایک مولوی کو بھی یہاں دیکھا اور وہ مجھے دیکھکر سخت شرمندہ ہوا۔ کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کافر اور جہنمی کہا کرتا تھا اور اپنے آپ کو رضواں کے بیٹے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے آزاد پھرتا دیکھ کر اسے بڑا رشک آیا، لیکن مینے کوئی طعن آمیز فقرہ استعمال نہیں کیا، کیونکہ اُس کی حالت خون اور پیپ پیتے پیتے بہت سقیم ہو گئی تھی اور ا

ببول کے کانٹوں کی طرح سینکڑوں خار پیدا ہوگئے تھے جن کی وجہ سے وہ زبان کو اندر نہ لیجا سکتا تھا۔

جب بادشاہوں، امیروں، فیلسوفوں، مولویوں، شاعروں اور مصنفوں کے طبقات سے گزر کر میں اُس حصہ میں پہونچا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا تو مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے قطب مینار سے اُٹھا کر مجھے نیچے پھینکدیا۔ میں چونک پڑا اور آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بیوی بُری طرح رو رہی ہیں، بچے تڑپ رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ کفن لاکر میرے غسل کی طیاری میں مصروف ہیں۔ ٹھیک ۵ بجے شام کو ڈاکٹر صاحب نے میری دو گھنٹہ کی زندگی کا اعلان کیا تھا اور ۷ بجے شام کو دو گھنٹے بعد جو میری آنکھ کھلی تو میں زندہ تھا۔

غالباً اس کا ذکر فضول ہے کہ اس واقعہ سے کیسی عجیب و غریب لہر مسرت کی تمام گھر میں دوڑ گئی ہوگی لیکن اس کا اظہار ضروری ہے کہ باوجود اس علم کے بھی کہ میں واقعی زندہ ہوں دیر تک اپنے آپ کو مردہ سمجھا کیا اور جہنم کا ایک ایک نظارہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

میں حیران تھا کہ کیا واقعی جہنم کوئی حقیقی چیز ہو سکتی ہے، اور اگر ہے تو کیا خدا بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے کسی طرح دل اس کے ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔

میری عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اگر خدا واقعی اپنے مخلوق کو اسی طرح مبتلائے عذاب کرتا ہے تو کیوں نیرو، چنگیز، ہلاکو کو بُرا کہا جائے اور کیوں نہ ایسے خدا سے پناہ مانگی جائے۔ اگر انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سے خدا کی خدائی کو کیا نقصان پہونچتا ہے، جو وہ ایک وحشی، جاہل اور خونخوار بادشاہ کی طرح مخلوق کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچا کر اپنی خواہش انتقام کو پورا کرتا ہے۔

اگر جہنم کے یہ تمام بیانات حقیقی نہیں بلکہ تمثالی ہیں اور مقصود ان سے صرف لوگوں کو ڈرانا ہے تاکہ وہ اس خوف سے اچھے کام کریں تو اس کا سوسائٹی اور اخلاق پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جبتک لوگ اچھے کام کو اچھا کام سمجھ کر ایک فرض انسانی جان کر بغیر کسی مُزد کی توقع یا سزا کے اندیشہ کے نہ کریں، اُسوقت تک کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر جہنم کے عذاب سے ڈرا کر کسی شخص کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے، تو ہم اس بندر یا ریچھ کو بھی انسان کہہ سکتے ہیں جو لکڑی کے بل پر ناچنے لگتا ہے۔

دوسری صبح کو اُٹھکر سب سے پہلے میں نے اس "سیاحت جہنم" کو قلمبند کیا، جس کے چند اوراق یہ ہیں ارادہ ہے کہ اسی طرح جستہ جستہ کرکے ان تمام مناظر کو الف کو پیش کردوں جو میری نظر سے وہاں گزرے

نیاز

سید سلیمان ندوی صاحب جواب دیں

کہ

کیا واقعی احادیث کی کوئی دینی قیمت ہے

رسالہ نگار میں، مولوی مقبول احمد صاحب کے ایک مضمون پر مولانا سید سلیمان صاحب نے سنت کی لفظی اور معنوی حیثیت سے دو نمبروں میں بحث کی ہے لیکن اصل چیز جس پر بحث شروع ہوئی تھی، اس کا ذکر تک کہیں آنے نہیں دیا یعنی سنت کی دینی حیثیت سے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا اور سارا زور، صرف اُن ضمنی امور پر صرف کیا گیا جو سنت کی نوعیت یا اس کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں اُن ضمنی باتوں کی بحث کو مولوی مقبول احمد صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں وہ جو جواب دینا مناسب سمجھیں گے لکھیں گے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اصل بحث جو شروع ہوئی تھی وہ تاریخی الجھاؤ میں کیوں ڈالی جائے، اور کیوں نہ اس معاملہ کو صاف کیا جائے کہ سنت کی دینی حیثیت کیا ہے۔

مولانا اور اُن کے جملہ ہم خیالوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ

"احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں"

لہٰذا اسی پر بحث ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ ہمارے نزدیک دین اور خالص دین قرآن اور صرف قرآن ہے۔ اس لئے جو شخص بھی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ مناظرہ کرنا چاہے اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن ہی سے استدلال کرے کیونکہ وہی فریقین کی مسلّم کتاب اور بمنزلہ اصول متعارفہ کے ہے۔ حدیثوں کو ہم دینی حجت نہیں مانتے اور اجماع و قیاس ہمارے نزدیک محض وقتی اور ہنگامی چیزیں ہیں۔

ہر چند کہ ہمارا یہ دعوےٰ سلبی ہے اور اُصول مناظرہ کے مطابق حدیثوں کے دین ہونے کا بارِ ثبوت مخالف کے ذمہ ہے مگر مزید وضاحت کے لئے ہم اپنے اس دعوے پر قرآنی دلائل بھی پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

قرآن نے شروع سے آخر تک کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نبی سے حدیثیں روایت کرکے اُن کو اپنا دین بنالو بلکہ جابجا اس نے تصریح کر دی ہے کہ قرآن ہی کا اتباع کرو۔

وہذا کتٰب انزلناہ مبارک فاتبعوہ　　یہ کتاب جسکو ہمنے اتارا ہے مبارک ہے۔ اسکی پیروی کرو۔

ایک آیت میں تصریح فرمادی ہے کہ سوائے قرآن کے اور کسی چیز کی پیروی نہ کرو

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء　　اسکی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اُتارا گیا اور اُسکے سوا اولیا کی پیروی نہ کرو۔

حدیث کی بنیاد اسی پر ہے کہ لوگوں نے بزرگان دین کو اولیا یعنے مقربین الٰہی سمجھکر انکی، وانیوں کو واجب الاتباع اور دین سمجھ لیا تھا

اب اس نص صریح کے بعد کسی مومن شخص کے لئے مزید دلیل کی حاجت نہیں رہجاتی۔

لاریب قرآن پاک سے رسول کی پیروی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی　　کہدے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

مگر خود رسول کو بار بار تصریح کے ساتھ احکام دئے گئے ہیں کہ

واتبع ما یوحیٰ الیک　　اُسکی پیروی کر جو تجھے وحی بھیجی جاتی ہے۔

دوسری آیت سے زیادہ وضاحت اور حصر کے ساتھ ہے۔

قل انما اتبع ما یوحیٰ الیّ من ربی　　کہدے کہ میں تو بس اُسکی پیروی کرتا ہوں جو وحی میرے رب کی طرف سے مجھ پر بھیجی جاتی ہے۔

جب رسول بھی قرآن ہی کا تابع ہے تو اتباع قرآن اور اتباع رسول در اصل دونوں ایک ہی چیز ہوئی۔

اتباع سنت کے متعلق ادنےٰ اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حیثیتیں مختلف تھیں۔ ایک یہ حیثیت تھی کہ آپ انسان تھے اور وہ طبعی فرائض اور اعمال آپ بھی ادا کرتے تھے۔ جو دوسرے انسان ادا کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ قضائے حاجت۔ لباس وغیرہ۔ دوسری حیثیت عرب ہونے کی تھی۔ کہ اس ماحول میں جس طریقہ سے زندگی بسر کیجاتی تھی اسکی بہت سی باتوں کی پابندی آپ کو بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً عرب میں رہنا۔ عربی زبان بولنا۔ عربی لباس پہننا۔ عربی عورتوں سے شادیاں کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمامتر دنیاوی اُمور ہیں جن میں رسول کے طریقہ کی پابندی نہ دین کا جزو ہو سکتی ہے نہ دنیا سے کرائی جاسکتی ہے۔ اسلئے سنت یعنے طریقۂ زندگی رسول مامور بہ کیونکر ہوسکتی ہے۔

بے شک آپکی معظم ترین حیثیت رسول اللہ اور معلم امت کی تھی۔ اور آپ اوامر الٰہی کے اولین مامور تھے اور اُنکو عمل کرکے دکھلاتے تھے تاکہ امت کے لئے نمونہ ہوں۔ اس حیثیت سے آپکی ذات پیشوائے امت تھی۔ یعنے تعمیل احکام الٰہی کا

نمونہ آپکی ذات سے سیکھا جاتا تھا۔ اور یہ سنت نہیں ہے بلکہ اسکو قرآن نے اُسوہ رسول کہا ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

سنت اور اُسوہ اُسوہ رسول یہ ہے کہ رسول اللہ احکام الہی پر عمل کرکے دکھلائیں اور امت کے لئے نمونہ بنیں اس نمونہ کو اللہ تعالےٰ نے امت کے لئے اچھا نمونہ قرار دیا اور یہ شرع اور دین ہے۔ اور سنت مطلقاً طریقۂ زندگی رسول کو کہتے ہیں خواہ کسی حیثیت سے ہو۔ جس میں سے بڑا حصہ محض انسان اور عرب ہونیکی وجہ سے تھا جو نہ دین ہے نہ شرع نہ ماموربہ۔

مولانا نے اسی اسوہ بلکہ تعامل امت کا نام سنت رسول رکھا ہے اور اس اصطلاح پر انکو ناز بھی ہے چنانچہ اپنے مضمون کے آخری حصہ میں وہ مولوی مقبول احمد صاحب کی مدح سرائی کرتے ہیں کہ انھوں نے سنت کا وہی مفہوم لیا جو میں نے لیا ہے اور یہ کہ سنت اور حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آپکی مراد سنت سے وہی اُسوہ رسول ہے جو امت میں متواتر معمول بہ چلا آتا ہے تو پھر ہمارے اور آپکے درمیان زیادہ بحث باقی نہیں رہجاتی۔ لیکن اگر آپ سنت کا لفظ بولکر اور اس سے تعامل امت مراد لیکر روایات کے وہ دفاتر ہم سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ جو بقول مولوی مقبول احمد صاحب نہیں بلکہ حقیقتاً مظنون اور مشکوک ہیں تو یہ مناظرانہ فریب ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا مقصد یہی ہے۔ اسلئے کہ آپ نہایت مصالحانہ انداز سے فرماتے ہیں۔

"آئیے ہم آپ ملکر مصالحت کا راستہ نکالیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم آپ صرف ان احادیث

در وایات کو تسلیم کرلیں جو قرون اولےٰ کے عرب مصنفین نے قبول کئے ہیں۔"

دیکھیے سنت کا لفظ بولکر آپ احادیث کے تسلیم کرانے پر اُتر آئے یا نہیں جو خود آپ کے قول کے مطابق سنت سے ایک جداگانہ حقیقت رکھتی ہے۔ اسکے آگے پھر آپ لکھتے ہیں۔

"میں درگزر کرکے صرف موطا پر قناعت کرنے کا مشورہ دیتا ہوں جس کا نہ صرف جامع

و مدون بلکہ اسکے اکثر راوی تک عرب ہیں۔"

کیا عجیب بات ہے!! میں پوچھتا ہوں کہ کیا عرب کی صداقت پر کوئی آسمانی محضر آپ کے پاس ہے؟

راویوں کو جانے دیجئے۔ میں گڑے مُردے اُکھیڑنے کا عادی نہیں ہوں لیکن امام مالک جامع موطا کی سوانحعمری تو خود آپ نے لکھی ہے۔ امام مغازی محمد بن اسحاق نے انکے متعلق جو جرح کی ہے وہ تو نظر سے گذری ہوگی۔ تفصیل کیلئے کتاب فضل العلم و اہلہ لابن عبد البر ملاحظہ فرمالیں۔ اور کیا اس سے آپ کو انکار ہے کہ جبتک امام مالک زندہ رہے ہر سال کچھ نہ کچھ اپنی کتاب میں ردوبدل کرتے رہے؟

حیرت یہ ہے کہ احادیث کے بیان کرنیوالے۔ راوی۔ راویوں کو ثقہ کہنے والے۔ راوی۔ اور ان ثقہ کہنے والوں کی

ضمانت کرنے والے۔ راوی۔ ایک چراغ کی تلاش کے لئے دوسرا چراغ۔ دوسرے کے لئے تیسرا۔ ....

کیا اللہ تعالیٰ جو حکیم و علیم ہے اپنے بندوں کو ایسے چکر میں ڈالنا پسند کرے گا ....

فلسفۂ شک

مولانا شک سے بہت گھبراتے ہیں۔ کیونکہ یقین انکو بہت سستے داموں ملجاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"گھر سے ایک خادم آکر آپ کو اطلاع دیتا ہے کہ اندر طلبی ہے۔ آپ اُٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ممکن ہے اسوقت جھوٹ بول رہا ہو۔ یا اُس نے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔"

میں تمثیل کا قائل نہیں۔ کیا اگر اس خادم کو میں جھوٹا سمجھ لوں تو میرے اوپر کوئی کفر کا فتوے لگا ئیگا۔ پھر آپ روایت حدیث کے متعلق شک کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے ہیں۔

یہ مغالطہ چونکہ قائلین حدیث کی طرف سے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلئے میں اس باب میں کسی قدر تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔

روزانہ معاملات بے شک اعتبار پر چلتے ہیں لیکن انہیں شک کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اور کبھی کبھی قرائن دیکھکر ہم شک کرتے بھی ہیں۔ لیکن یہی معاملات جب آج کل کی عدالتوں میں جاتے ہیں تو حکام تحریری دستاویزوں کی بھی تصدیق طلب کرتے ہیں۔ حاشیئے کے گواہ لیتے ہیں۔ اور بلا اچھی طرح جانچے انکو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا آپ نے دینی امور کو اسقدر خفیف سمجھ رکھا ہے کہ انہیں وہ معمولی احتیاطیں بھی نہ کی جائیں جو دنیاوی عدالتیں متخاصمین کے معاملات میں کرتی ہیں۔

بخاری یا مسلم سے روایت کرتے ہیں۔ لازم تھا کہ اس روایت کے دو شاہد عدل ہوتے۔ پھر وہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اُسکے بھی دو گواہ معتبر درکار تھے۔ کیا اس اصول کے مطابق آپ کے پاس ایک حدیث بھی ہے؟

راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سُنی۔ پھر وہ دعوےٰ کرتا ہے کہ اس سے اس کو فلاں نے بیان کیا۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ رسول اللہ تک پہونچتا ہے۔ اور کسی درجہ میں نہ کوئی شاہد ہے نہ کوئی گواہ۔ پھر کیا شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت۔ در شہادت سے آپ کسی اسلامی یا غیر اسلامی عدالت سے ایک پائی کا بھی فیصلہ اپنے حق میں لے سکتے ہیں؟

میں پھر کہتا ہوں کہ حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ تاریخی علوم ہیں نہ کہ دینی۔

اطاعتِ رسُول

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کیلئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے۔

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن امراء کی جو تم میں سے ہوں

کہتے ہیں کہ جبتک حدیثیں تسلیم نہ کی جائیں رسول کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس کے دو جواب ہیں ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی۔

الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعتِ رسول کے ساتھ ہی ساتھ امراءِ اسلام کی بھی اطاعت کا حکم ہے۔ آپ نے احادیثِ رسول کے دفاتر تو تیار کر لئے لیکن امراءِ اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا اُنکی احادیث کے اُن کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض الآیہ — کیا تم کتاب کے ایک ٹکڑے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے پر نہیں۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعتِ رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ — اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اسلئے کہ اذن الٰہی سے اسکی اطاعت کیجائے۔

لیکن رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جسکی اتباع وہ خود کرتا ہے اُسکی پیروی کیجائے۔ قرآن میں یہی ہے۔

فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون

جو لوگ اس پر (رسول) ایمان لائے اور اُسکی مدد کی اور ساتھ دیا اور اس نور (قرآن) کی پیروی کی جو اسکے ساتھ اُتارا گیا ہے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

یہ ہرگز رسول کی اطاعت نہیں کہ اسکے نام کی طرف جو کوئی سچ یا جھوٹ منسوب کرے اسکو ہم مانیں۔ کیونکہ یہ ہمارے نزدیک دین اور انسانیت دونوں کی اہانت ہے۔ ہمارا ایمان تو اس نورانی کتاب پر ہے جسکو اُتارنے کے لئے اللہ تعالے نے اُس فرشتہ کو آسمان میں نامزد فرمایا۔ جو ملائکہ میں امین ہے اور زمین میں اس رسول کو منتخب کیا جو انسانوں میں امین تھا۔ زمین سے آسمان تک شہاب ثاقب کے پہرے شیطانوں پر قائم کئے کہ اس مقدس کلام میں آمیزش نہ کرسکیں۔ اُتارنے والا امین۔ راستہ مامون۔ جسپر وہ اُتارا گیا وہ امین۔ پاک کلام۔ ہر آمیزش سے بری۔ سراسر حق۔ جسکی شان یہ ہے۔

وبالحق انزلناہ وبالحق نزل — ہم نے حق کے ساتھ قرآن کو اُتارا اور وہ حق کے ساتھ اترا۔

ہماری نگاہ میں جملہ مجموعہ احادیث قرآن کے ایک حرف کی بھی قیمت نہیں رکھتا۔ ہم جب امام یحیٰے بن معین وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل کے یہ الفاظ سنتے ہیں کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے" یا علماءِ اصول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے تو اس روایت پرستی پر ہمکو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ہم تو ان لوگوں کو اصل علم مانتے ہیں جنکی نسبت قرآن کریم کہتا ہے۔

ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق

جنکو علم دیا گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ تجھپر تیرے رب کیطرف سے اُتارا گیا ہے وہی حق ہے

یقیناً حدیث پرستوں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہم جھوٹ اور سچ کو جانچ لیتے ہیں۔ اور ائمہ حدیث نے بخاری وغیرہ کی حدیثوں کو تنقید کرکے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ رواۃ کی صداقت ایک باطنی وصف ہے جسپر قطعی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ شہادت خود ظنی ہے۔ اور ازیں قبیل حدیث کی تصحیح اور تغلیط کے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اہل نظر متکلمین نے قدم قدم پر اختلافات کئے مگر شخصیت پرستی کے جذبہ میں محدثین نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ اور انہیں کمزور اصولوں پر حدیث کی عمارت کھڑی کردی

اس صورت میں ہم ہر راوی کے بیان کو اسی کا قول سمجھتے ہیں نہ کہ قول رسول۔ اور قرآن نے یہ زریں اُصول سکھلایا ہے۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر انکی اطاعت کرو تو اللہ کی راہ سے وہ تمکو گمراہ کر دینگے وہ نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی

علماء حدیث احادیث کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور ظنیات سے دین کا کام نہیں چلتا۔

ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً　　ظن حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

امام غزالی المستصفیٰ میں لکھتے ہیں (جلد اول صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ مصر)

خبر الواحد لا یفید العلم　　خبر واحد مفید یقین نہیں۔

خبر واحد کسکو کہتے ہیں؟ یہ بھی اسی صفحہ میں انھیں کے قلم سے دیکھئے۔

انا نرید بخبر الواحد فی ہذا المقام ما لا ینتہی الی حد التواتر۔ فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فہو خبر الواحد

ہم خبر واحد سے اس مقام پر وہ حدیث مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک نہ پہنچی ہو مثلاً جو حدیث ایک جماعت یا پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

بے شک متواتر یقینی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی ایک قسم ہے۔ مگر کسی متواتر حدیث کے وجود ہی میں بحث ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین حدیثیں ہیں۔ جنکو لوگوں نے متواتر کہا ہے۔ امام ابن صلاح اور ابن تیمیہ کا ذکر چھوڑیئے۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کو حدیث کے معاملہ میں غلو ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیثیں جو جملہ آئمہ حدیث کے نزدیک غیر متواتر اور ظنی ہیں۔ انکے نزدیک یقینی ہیں اور بجز اپنے عقیدہ کے اور کوئی دلیل انکے پاس نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

بعض لوگ حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں۔

اسمیں بغیر علم کا لفظ خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث کو مفید علم نہیں قرار دیا ہے۔

الغرض جسکا نام لوگوں نے سنت رکھا ہے اُسکی کوئی تائید قرآن سے نہیں ملتی بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب نے ایک آیت سے سنت پر استدلال کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ یہ ہے۔

یرید اللہ لیبین لکم ویہدیکم سنن الذین من قبلکم ، ،

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کر دے اور تمکو اگلوں کے راستوں کی ہدایت کرے ، ، ، ،

اللہ جس سنت کو خود بیان کرنا چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اُس نے انبیائے سابقین کو سکھلایا تھا اور اسی کو ہماری ہدایت کیلئے ہمارے واسطے بیان کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ وہی صراط مستقیم ہے جسکی ہدایت ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ یعنے ایمان۔ تقوےٰ۔ تزکیہ نفس۔ اصلاح اعمال۔ ادائے ذوالحقوق وغیرہ جنکے ساتھ دنیا اور آخرت کی سعادت وابستہ ہے اور جو آسمانی دین ہے۔ نہ کہ اس قسم کی سنت

کہ رسول اللہ نے زندگی بھر تہجد اور عمامہ باندھا۔ داڑھی چھوڑی اور مونچھ ترشوائی۔ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے۔ اور دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور عورت مرغوب خاطر تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ شخصی حالات ہیں جو تاریخ ہیں نہ کہ دین۔

قرنہا قرن گزر گئے کہ امت اسلامیہ اسی مشکوک اور ظنی تاریخ کو دین کے نام سے حاصل کرتی چلی آتی ہے اور اپنی فرقہ بندیوں میں اس سے امداد لیکر اصل دین کو جو قرآن ہے چھوڑ بیٹھی ہے جس سے دنیا بھی گئی اور دین بھی گیا۔ اور عقلی اور علمی خرابیاں تو حد شمار سے زیادہ پیدا ہو گئیں۔

عہد اول سب سے پہلے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں حدیث کی حیثیت کو دیکھنا چاہئیے کہ کیا تھی؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے برخلاف قرآن کے حدیث کی حفاظت کی طرف کبھی توجہ نہ فرمائی بلکہ آپ نے یہ حکم دیا کہ:-

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئًا فلیمحہ

مجھے سوائے قرآن کچھ نہ لکھو۔ اور جس نے مجھے کچھ لیا ہو چاہئیے کہ اسکو مٹا ڈالے

خلیفہ اول نے چند حدیثیں لکھی تھیں لیکن آخر میں انکو جلا دیا۔

قاضی مکہ ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ تم لوگ حدیثیں بیان کرتے ہو جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلافات کرینگے اسلئے رسول اللہ سے کوئی روایت نہ کرو۔

خلیفہ اول قبول حدیث میں بہت محتاط تھے۔ اور بغیر شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے۔ جدہ کی وراثت کے متعلق حضرت مغیرہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ایک سدس دلوایا کرتے تھے۔ اس پر ان سے شہادت طلب کی۔

حضرت عمر بھی بلا شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی اُنھوں نے اس روایت پر کہ رسول اللہ سے میں نے سُنا ہے کہ جب کوئی تین بار پکارے اور مکان سے آواز نہ آئے تو واپس چلا جائے۔ شہادت طلب کی اور کہا کہ اگر نہ لاؤ گے تو خبر لوں گا۔

امام ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ سے پوچھا کہ کیا تم حضرت عمر کے عہد میں اسی طرح روایت کرتے تھے اُنھوں نے کہا کہ میں انکے زمانہ میں اسطرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھکو اپنے درّے سے پیٹ ڈالتے۔

حضرت عمر صحابہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ جہانتک ہو سکے رسول اللہ سے روایتیں کم کریں۔ جب عراق کی طرف فوج روانہ کی تو خود مشائعت کیلئے گئے۔ اور رخصت کرتے وقت فرمایا کہ میں اسی لئے تمکو پہونچانے آیا تھا کہ یہ نصیحت کروں کہ تم ایسی جگہ جاتے ہو جہاں لوگ قرآن میں مشغول ہیں۔ دیکھو روایتیں بیان کرکے اُنکو قرآن سے نہ روکنا۔

حضرت عثمان روایتوں کو نہیں مانتے تھے۔ انکے پاس محمد بن علی بن ابی طالب اپنے باپ کے پاس سے وہ صحیفہ لیکر

گئے جس میں زکوٰۃ کے احکام تھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے بشیر بن کعب نے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ اُنھوں نے نہیں سُنا۔ اسپر بشیر نے کہا کہ میں رسول اللہ کی حدیثیں بیان کرتا ہوں اور آپ نہیں سنتے۔ فرمایا کہ ہم اُسوقت حدیثیں سنتے تھے جب رسول اللہ پر لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اب جب سے لوگ ہر قسم کی رطب و یابس باتیں کہنے لگے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت "الوضوء مما مستہ النار" کو تسلیم نہیں کیا۔ نہ حضرت علیؓ کی حرمت متعہ والی روایت کو مانا۔ ابن عمر کے سامنے جب ابو ہریرہ کی روایت کلب زرع کے متعلق بیان کی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ابو ہریرہ کے پاس کھیتی ہے۔[۵]

انصاف کی بات یہ ہے کہ جب میں حدیث کو خود دینی حجت نہیں سمجھتا تو دوسروں پر خواہ اُسکو وہ تسلیم بھی کرتے ہوں کیوں اس سے حجت لاؤں۔ لیکن یہاں صحابہ کا طرز عمل حدیث اور روایت کے ساتھ میں نے اس لئے دکھلایا کہ ناظرین یہ سمجھ لیں کہ صحابہ کرام نے حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھا۔ اُنھوں نے اسکی حفاظت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُسکو فتنہ سمجھکر روکتے رہے۔ انکے زمانہ ہی میں لوگ جھوٹ بولنے لگے تھے۔ اسوجہ سے بہت سے صحابہ نے حدیث کو چھوڑ بھی دیا تھا۔ امام شعبی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سال تک ابن عمر کی خدمت میں رہا۔ اور اُنکی زبان سے کوئی حدیث نہ سُنی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر بھی شاذ و نادر ہی کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی موطا دوسری صدی ہجری اور بخاری اور مسلم تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئیں۔ جبکہ حدیثوں نے دینی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور ائمہ حدیث مقدس اور مقتدائے امت سمجھے جانے لگے تھے۔ مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ اور ہر ہر فریق اپنے فرقے کی حمایت میں حدیثیں پیش کرنے لگا تھا۔ اسوجہ سے وضع جعل اور کذب کے امکانات حدیثوں میں بہ نسبت تاریخ کے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ اور جو اُصول تصحیح حدیث کے لئے مرتب کئے گئے۔ وہ عقلی طور پر بیشتر غلط اور محض شخصی اعتبار پر قائم کئے گئے۔ جن کی وجہ سے حدیثوں کی حیثیت ایک ظنی تاریخ سے زیادہ نہیں۔ نہ وہ قرآن کے کسی خاص کو عام اور عام کو خاص کر سکتی ہیں۔ نہ مطلق کو مقید اور مقید کو مطلق۔ اور زیادتی علی الکتاب کا تو خیال ہی مہمل ہے۔ اور نسخ کا اس سے زیادہ۔ (مسلمان)

---

۵ یہ جملہ روایات کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر مصنفہ شیخ طاہر جزائری سے میں نے نقل کی ہیں

ایک سفر مجھکو چند مارواڑی عورتوں اور ـــــ مُرشد کے ساتھ کرنا پڑا۔ میرے سفر کی محرک اکثر دو چیزیا ہوتی ہیں۔ آپریشن کرانا یا سفر خرچ وصول کرنا جسکے مجموعہ کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے۔ پھر ایسے سفر کا کیا پوچھنا جس میں دونوں مقاصد پیش نظر ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہوگا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ لیکن یہاں امکان سے بحث نہیں ہے، واقعہ سے بحث ہے۔ اور واقعہ کی حیثیت سے ہر واقعہ برابر ہے خواہ وہ کانگرس کی صدارت ہو یا راؤنڈ ٹیبل کی شرکت!

بہرحال ناظرین سمجھ لیں کہ ایسا اکثر ہوا اور ـــــ سفر بھی شروع ہوا۔ چنانچہ مُرشد پہلو میں تھے، پاؤں کے تلے اوپر، اِدھر اُدھر وہی بڑے سے سنے ہوئے پتے، بیڑی اور دیا سلائی کے نیم سوختہ ٹکڑے، پانی سے لبریز لیکن ٹپکتی ہوئی بالٹی، یہ تھرسے لٹکتی ہوئی ایک نمناک وہوتی، برساتی ہوا اور ـــــ معلوم نہیں کس کس چیز میں بسی ہوئی۔ سامنے مارواڑی عورتیں اور وہ بھی اُسی رازدارانہ مائے مجامانہ انداز سے جسکی کچھ دھندلی سی مصوری غالب نے کی ہے۔

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں!

میرے اس میلان طبع کو جس چیز پر چاہیئے محمول کر لیجیئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھکو مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے سے سخت کوفت ہوتی ہے اور یہ عجیب سانحہ تھا کہ اس سفر میں میرے ہمسفر یہ تمام لوگ اور شاید اُنکی اعجوبہ ترین نمونے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرشد ہمراہ نہ ہوتے تو میں یا تو زنجیر کھینچ لیتا یا سمت مخالف سے آنے والی گاڑی پر کود جاتا، خواہ وہ اپنی پوری رفتار کے ساتھ جاتی ہوتی۔ ایک میں نقصان مال تھا اور دوسری میں اتلاف جان لیکن کچھ ہوتا یہ کیا کم تھا کہ اپنا ہی ہوتا دوسرے کا نہ ہوتا۔ لیکن قومی نقطہ نظر سے یہ صورت کچھ زیادہ مفید یا مستحسن نہ تھی اور پھر مرشد کا ساتھ جنکی معیت میں ایک بار میں کانگرس کے پنڈال میں بھی ہو آیا تھا اور حکیم اجمل خانصاحب مرحوم سے بھی مل سکا تھا چنانچہ قوم کی خاطر میں نے زندہ رہنا گوارا کر ہی لیا۔

بہرحال انھیں قومی اور ذاتی مسائل کی اودھیڑبُن میں مصروف تھا کہ یکایک مرشد پر نظر جا پڑی تو معلوم ہوا کہ وہاں برہمی یا انقباض طبع کے بجائے افسردگی کا عالم ہے۔ مرشد کا افسردہ ہونا میرے نزدیک سانحات عالم میں سے ہے لیکن خیریت یہ ہے کہ اس افسردگی کی بھی دو نوعیتیں ہیں اور دونوں میں بلحاظ اہمیت بیّن فرق ہے۔ مرشد کی افسردگی کا ایک تو وہ موقعہ ہوتا ہے۔ اور جو اکثر پیش آتا رہتا ہے۔ جب مرشد بھوکے ہوتے ہیں اور دوسرے ـــــ اس کا موقعہ صرف

ایک دفعہ پیش آیا جو میرے اور مرشد کے درمیان بحیثیت ایک راز کے مدت سے چلا آتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہر راز کی ایک عمر ہوتی ہے جسکے بعد اسکو صیغۂ راز میں رکھنا بد مذاقی ہے۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جس سال نان کوآپریشن کا حملہ ایم اے او کالج پر ہوا ہے، مرشد اور میں، ہم نوالہ، ہم اقامہ ہم سبق، اور ـــــ ہمخیال تھے، مرشد ان طلبا میں سے تھے جن سے کالج کے ارباب حل و عقد بجا طور پر مرعوب تھے اور شاید اس کا سبب یہ تھا کہ مرشد کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی اور یونیورسٹی میں اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے یونین کے بے پناہ مقرروں میں تھے، کرتا، پاجامہ، اور داڑھی شرعی، شیروانی حیدرآبادی، غذا ڈائننگ ہال کی، ناشتہ دوسروں کا اور دوا دہلی کی! مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ انکی تندرستی خطرہ میں ہے اور اس فکر میں وہ آس پاس کے تمام اطبا سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس میں حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب بھی شامل تھے اور ایسے حکیم اور ڈاکٹر بھی جن کا نام سوا انکے سائن بورڈ یا خود مرشد کے کسی کو معلوم نہ تھا یا پھر

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد!

مرشد ساری دوائیں خرید لاتے اور اسمیں انگریزی، یونانی، اور ویدک سب شامل ہوتیں، کیونکہ مرشد دہلی جاکر ہر قسم کے اطبا سے ملتے اور ان سب کی تجویز کردہ دوائیں بڑے تکلف اور اہتمام سے لاتے۔ دواؤں کے ساتھ، دہلی سے ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں بھی لاتے، ہر اسٹیشن پر خوانچہ والے سے کچھ نہ کچھ خریدتے اور وہ بھی ساتھ لاتے۔ بورڈنگ ہاؤس پہونچ کر صلائے عام دیتے۔ لیکن شرط یہ تھی کہ جو شخص پھل یا مٹھائی وغیرہ میں شریک ہو اسکو دوا بھی کھانی پڑے گی۔ مرشد ہر دوا کے افعال و خواص کو اس جوش اور شدت کے ساتھ بیان فرماتے کہ ہر شخص کو شریک ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ یہی نہیں مرشد کو بعض امراض کی شناخت کا بھی عجیب غریب ملکہ تھا، اگر کسی شخص نے دوا کھانے میں ذرا تامل کیا تو پھر اسی جوش و شدت کے ساتھ اس پر یہ بھی ثابت کر دیا کرتے تھے کہ وہ فی الحقیقت کسی مرض میں مبتلا ہے اور اس کے شدید و سنگین نتائج جلد از جلد رونما ہونیوالے ہیں۔ مرشد نے اپنی لائی ہوئی دوا شاید کبھی نہیں کھائی۔ لیکن جہاں کہیں پہونچ جاتے اور کوئی دوا رکھی ہوئی ملجاتی اسکو بغیر کھائے ہوئے نہیں رہتے تھے، خواہ کسی قسم کے مرض یا مریض کی دوا تیار ہونے کا اہتمام یا چندہ ہوتا مرشد اسمیں ضرور شریک ہوتے، قدمے، درمے، سخنے!

ایک دفعہ کا واقعہ ہے، مرشد ہمارے دوست عطاء اللہ خاں کے کمرہ میں پہونچ گئے۔ ہمارے دوست عطاء اللہ خاں بھی عجیب غریب شخص تھے، معلوم نہیں اسوقت مرحوم علیین میں ہیں یا امریکہ میں۔ خان کو کھچڑی پکانے اور کیمیا بنانے کا خبط تھا، صبح سے شام تک کچی بارک کے برآمدہ میں انگیٹھی دہکتی رہتی تھی، کھچڑی پکا چکتے تو کیمیا بنانے میں مصروف ہوجاتے اور کیمیا سے سیر ہوجاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھدیتے۔ یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے مسلسل تمام دن تیار ہوتی

رہتیں۔ لونیاسے ڈر گئے تھے، اور ایک لڑکی پر عاشق تھے۔ مرشد نے فرمایا، بھوکا ہوں، کچھ کھلاؤ، خاں نے فرمایا، کچہری میں تو دیر ہے اور اسکے علاوہ اس وقت کوئی چیز موجود نہیں ہے، مرشد نے بریکٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا اور اس مرتبان میں کیا ہے، فرمایا، معجون جالینوس، ابھی ابھی دہلی سے منگایا ہے، اتنے میں خان کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے اور مرشد نے ساری دوا مرتبان سے معدہ میں منتقل کر دی۔

مرشد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، پوچھنے پر فرمایا کہ ہندوستانی دواؤں میں شکر اور خوشبو یا بدبو کے علاوہ کوئی اور چیز قابل اعتنا نہیں ہوتی، اس لئے انکے استعمال میں مقدار کا سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا، میں نے کہا پھران دواؤں کے استعمال کا فائدہ ہی کیا ہے۔ کہنے لگے واقعہ تو یہ ہے کہ دواؤں کی ایجاد اور انکا استعمال غلط اصول پر کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا مرشد یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی، ایجاد کا غلط اصول پر ہونا تو کچھ یونہی سا معلوم ہوتا ہے، اس کو ذرا اور واضح کیجئے، مرشد نے بگڑ کر فرمایا، تم بھی جان کر انجان بن جاتے ہو، اچھا یہ تو بتاؤ اطبا ریونانی نے خراطین کا استعمال کس اصول پر مفید قرار دیا ہے، میں نے کہا، میں تو اس کے استعمال سے واقف ہوں، لیکن اصول سے قطعاً ناآشنا! فرمایا، اس کا اصول تمھاری سمجھ سے باہر ہے، تعلیم بالغاں اگر مانٹی سوری سسٹم سے دیجائے تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجائے گا، میں نے کہا تعلیم بالغاں کیلئے آپ نے تو متعدد "شبینہ" درسگاہیں کھول رکھی ہیں، اس کا بھی انتظام کہیں کیا ہے یا نہیں، بگڑ کر فرمایا، تم پھر ذاتیات پر آ گئے اور میں تمھاری درسگاہ کی خبر لوں تو کیسی رہیگی، میں نے کہا کوئی ہرج بھی نہیں، معاملہ صرف ممبر اسٹاف اور ممبر کورس ہی کے درمیان رہے گا!

میں نے کہا ہاں مرشد، وہ بات تو رہی گئی، مرشد نے فرمایا، بس بس اب آپ خراطین کے نفع پر اپنا اطمینان کرلیں تو پھر مزید گفتگو ہو۔ میں نے عرض کیا، قصہ تو آپ نے ہی خراطین کا چھیڑا تھا، مجھے صرف تشابہ لگا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، بہرحال خراطین کی طرف سے مطمئن ہو کر فرمایا، بھئی سنو، اطبا مرض کا علاج کرتے ہیں، حالانکہ انکو مریض کا علاج کرنا چاہیئے، مرض قطعاً ایک غیر شخصی چیز ہے اور مریض ایک شخصیت۔ عام طور پر اطبا اور انکا طریقہ، علاج نے دونوں کو ایک قرار دیدیا ہے اور اسی سبب سے اکثر مرض جاتا بھی رہتا ہے تو مریض ہمیشہ کیلئے ماؤف ہوجاتا ہے۔ میں نے کہا مرشد اگر آپ معجون جالینوس کے مورد نہیں بلکہ موجد ہوتے تو اسوقت دنیا کو کس اصول یا طریقہ، علاج کا زیر بار منت ہونا پڑتا، فرمایا میں تو ہر مرض کا علاج اچھے سے اچھے کھانے سے کرتا، میں نے کہا علاج الغربا اسی اصول پر تصنیف ہوئی ہے۔ فرمایا، پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اظہار قابلیت مقصود ہے یا مذاق کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا دونوں، اس پر جھلا پڑے، فرمایا، ایک سے تو آپ کی جاہلیت متیقن ہوتی ہے اور دوسرے سے جیلخانہ جانے کے آثار ہویدا ہیں، میں نے عرض کیا مرشد اچھا اتنا اور بتا دیجئے، جہالت کی بنا پر لوگ جیلخانہ جاتے ہیں یا جیل خانہ کا نتیجہ جہالت ہے۔ فرمایا، تم پھر ذاتیات پر حملہ کرنے لگے۔ جیلخانہ جانیوالے محب قوم ہوتے ہیں، میں نے کہا اس

قوم کے بارہ میں آپ کا خیال ہے، جو اپنے مجبوں کو جیل خانہ بھجواتی ہے اور خود جیل خانہ کے باہر ہے۔ فرمایا یہ قوم اس قوم سے بہرحال بہتر ہے جو اپنے مجبوں کو کونسل اور اسمبلی میں بھجواتی ہے!

میں نے کہا مرشد ذاتیات اور قومیات دونوں پر لعنت بھیجئے، اس قوم کی باتیں آپ دہلی اور میں علی گڈھ پہنچکر شروع کرینگے۔ فی الحال مجھے یہ بتائیے کہ اچھے سے اچھے کھانے سے علاج کرنا کس اُصول پر مبنی ہے اور پھر یہ اصول صحیح بھی ہو تو آپ یہ بتائیے کہ ہندوستان ایسے مفلس ملک میں آپ کا یہ علاج کس طور پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ فرمایا، جب ہندوستان کے لوگ ڈاکٹر ورناف کے علاج المامون بالیمون کے متحمل ہو سکتے ہیں تو پھر علاج بالغذا کے کیوں نہ متحمل ہوں گے۔ میں نے کہا مرشد خوب یاد دلایا اور یہ تو بتائیے یہ علاج بالغدود آپکے نزدیک کیسا ہے۔ فرمایا یہ علاج میمونی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ صرف علاج الاعضا بالاعضا کرائیں گے اور آج سے کم و بیش سو سال کے اندر، آپ دیکھیں گے طبیبوں کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ آیندہ سرجن انجنیئر ہوا کریں گے۔ ہر بیماری کا علاج سرجری سے ہوا کرے گا۔ جتنے انسانی اعضا ہیں وہ سب کے سب علیحدہ علیحدہ مربہ اور اچار کی مانند مرتبانوں میں رکھکر دواخانوں میں فروخت ہوا کرینگے۔ ہر سائز اور ہر قسم کے ہونگے جیسے گھڑی اور موٹر کے پُرزے۔ جو انسانی عضو خراب ہوگا اُسکو نکال دیا جائیگا اور اُسکے بجائے دوسرا مصنوعی عضو فٹ کر دیا جائے گا، ہر عضو اسکرلو (SCREW) (پیچ) پر ہوگا، جب چاہا نکال لیا اور جب چاہا فٹ کر دیا۔ میں نے پوچھا، کیوں مرشد آپکا کیا خیال ہے۔ اس طریقہ علاج سے لوگوں کے تعلقات خانہ داری پر کیا اثر پڑیگا فرمایا اس سے تعلقات نہایت خوشگوار رہیں گے، بدگمانی کا عنصر بالکل حذف ہو جائے گا، اس میں شک نہیں حکومت ملک کو اس کے لئے خاص قوانین وضع اور نافذ کرنے پڑیں گے۔ مثلاً کسی شخص کو اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ ایک سے زائد عضو اپنے قبضہ میں رکھ سکے، ہر شخص کو لائسنس لینا پڑے گا جس طور پر شراب یا مسکرات بچوں کے ہاتھ نہیں فروخت کئے جا سکتے، اسی طور پر کوئی عضو بچہ کے ہاتھ نہیں فروخت کیا جائے گا۔ بعض اعضا ایسے بھی ہوں گے جن کا استعمال صرف اپنے مکان مسکونہ پر ہو سکے گا اشنانو درگاہوں، اور تفریح گاہوں پر ان کے لیجانے کی سخت ممانعت ہوگی، اس کے لئے قرنطینہ اور کسٹم ہاؤس قائم ہوں گی۔ جہاں ہر شخص کے بارہ میں پہلے سے اطمینان کر لیا جائے گا کہ اس کے پاس کوئی عضو ایسا تو نہیں ہے، جس سے شاردا ایکٹ قسم کے جھگڑا پیدا ہونے کا امکان ہو۔ میں نے کہا مرشد یہ تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ چوروں، ڈاکوؤں اور پولیس کے خطرہ سے کس طور پر عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ فرمایا، یہ اندیشہ تو یقیناً رہے گا، لیکن میرا خیال ہے اسوقت تک تمام دنیا کی حکومت بالشوک اُصول کی پابند ہو جائے گی جس طور پر ہر مال و ملکیت کی مالک حکومت ہو گی، اسی طور پر انسانی اعضا بھی حکومت کے ملک ہوں گے۔ ممکن ہے ہر ہر محلہ میں دوزی خانہ کے ساتھ اعضا خانہ بھی ہوں، مقررہ وقت پر دو چار روٹیاں، کچھ سالن اور ایک عضو دیدیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ، میں نے کہا مرشد یہ تو بڑا پُر آشوب دور ہوگا، آپ کو اور مجھے کون پوچھے گا، فرمایا ہم لوگ رعایا نہیں حکومت ہونگے، میں نے کہا مرشد خدا تمہاری زبان مبارک کرے!

میں نے کہا مرشد، امراض کا علاج غذا سے تو بہت مفید ہوگا، لیکن کوئی ترکیب ایسی نہیں ہو سکتی کہ آپ کوئی نہایت مفید اور مجرب علاج جو نہایت ہی سستا ہو دریافت کر دیتے۔ فرمایا، سب سے مقوی اور مفرح چیز تو ٹھنڈا پانی ہے آپ کو تو معلوم ہے بعض مولویوں نے بعض خاص مواقعہ کے لئے وضو کر لینا نہایت مفید بتایا ہے، میں نے کہا اگر غلطی سے وضو کے بجائے کوئی غسل کرلے تو کیا ہو، فرمایا ظاہر ہے پھر غسل کرنے کی حاجت نہ ہوگی، میں نے کہا مرشد یہ سب جانے دیجئے۔ تکلف برطرف، یہ تو فرمایئے، بعض خاص امراض کے ازالہ کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔ کسی قدر ترش رو ہو کر فرمایا، خاص امراض کیا؟ میں نے کہا مرشد...... بس سمجھ جایئے۔ مثلاً خاص الخاص۔ بے اختیار اور تقریباً آپے سے باہر ہو کر فرمایا۔ وہ تو ظاہر ہے۔

ماراللّٰھم خاص الخاص!

اچھا، یہ تو صفحۂ معترضہ تھا۔ اصل حکایت مرشد کے افسردہ ہو گئی تھی، مرشد کے قول و فعل میں ایک طرح کی تلخی اور تُرش پیدا ہو گئی ہے لیکن تھوڑی سی صفائی اور صیقل کے بعد اصلی اور قدیم جوہر بہت جلد نکھر آتا ہے۔

مرشد کی شادی، کہا جاتا ہے، ایسے زمانہ میں ہوئی جب مرشد کو نہ سود ہضم کی پروا تھی اور نہ ہضم سوم کی تمنا۔ مدتوں فریضۂ سحری حق اللہ سمجھ کر ادا کرتے رہے نہ کہ حق العباد۔ آم کی فصلیں اور کالج کی تعطیلیں آتی رہیں اور گذرتی رہیں تاآنکہ مرشد نے مردم شماری کی رپورٹ میں تابڑ توڑ دو تین غلطیاں پیدا کیں، یہ سب کچھ ہوا لیکن مرشد کے سرپرست اور نگران جج صاحب فرخ آبادی رہے!

چنانچہ ایک عرصہ تک خالو صاحب کرتے پاجامے، جج صاحب روپے، کالج ڈگریاں اور بیوی بچے دیتی رہیں مرشد کے والدین اوائل طفولیت ہی میں داغ مفارقت دے چکے تھے، اس کے بعد پے بہ پے تین نوجوان، تعلیم یافتہ ہونہار اور معقول ترین بھائیوں نے رحلت کی جنکی ذہانت اور شرافت کالج میں ضرب المثل تھی۔ ایک دن شام کو گنگناتے ہوئے آئے اور فرمایا دونوں بچے بھی چل بسے! بایں ہمہ مرشد کی طبعی شگفتگی نے کبھی مرشد کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہاں تو تذکرہ تھا ام۔ اے۔ او کالج پر نان کوآپریشن کے حملہ کا۔ چنانچہ وہ دن بھی آیا، جس کا اشارہ صفحات ماقبل میں کہیں آچکا ہے، مرشد کو تحریک نان کوآپریشن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، بلکہ جس وقت ہمارا کالج اسکی زد میں آیا ہے مرشد جماعت منتظمین کے ایک طور پر دست راست تھے۔ میں اور مرشد دونوں برابر ان جلسوں اور ہنگاموں میں شریک ہوا کرتے تھے، جو اُن دنوں آتنا ہی عام تھے، جتنا اِن دنوں گرفتاریوں اور سزایابیاں۔ ہر جلسہ اور ہنگامہ صرف جلسہ اور ہنگامہ تک محدود رہتا تھا، اور اس سے ہم دونوں ایک طرح سے مسرور اور مطمئن تھے اور وہ رات اب بھی یاد آتی ہے جب میں اور مرشد فتنہ پرداز دل

کی شمع بے حاصل" پر صاحب باغ میں مسرور اور مطمئن، بیٹھے اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ صبح کالج تو جانا نہیں ہے پھر ناشتہ میں دلیا کے بجائے کھچڑی کیوں نہ ہو۔ ان دنوں کے جلسوں اور ہنگاموں کے ماخذ ابھی کوئی امر متیقن نہیں ہوا تھا کہ مولوی نصیر الدین علوی صاحب، گاتے گالی دیتے اور ہکلاتے ہوئے آ گئے۔ ان سب سے فارغ ہو کر یوں گویا ہوئے۔ بھئی صبح مجھے غسل کر کے مولانا محمد علی صاحب کی تقریر کا جواب سوچنا ہے، مرشد بول اٹھے مجھے بھی غسل کرنا ہے اور محمد علی صاحب کی تقریر کا جواب دینا ہے۔ نصیر صاحب نے فرمایا میں پہلے غسل کروں گا، مرشد نے کہا غسل تو پہلے میں کروں گا۔ بات طوالت پکڑتی جاتی تھی، نصیر صاحب ضرورت غسل کے ثبوت میں کوئی غیر شاعرانہ تقریر گلو گیر کرنے والے ہی تھے، اور مرشد کی طبیعت بھی کچھ موزوں ہونے لگی تھی کہ میں نے عرض کیا، آپ لوگ غسل کرنے پر اس درجہ آمادہ و نقض امن ہیں، لیکن پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہیئے کہ حق کس کا مرجح ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ بیچارے مولانا محمد علی، دو "بے غسلوں" کے درمیان بالکل معصوم ہیں، اس پر یہ قضیہ چھڑ گیا کہ کون پہلے اپنے وجوہ پیش کرے، میں نے آخر میں عرض کیا "گذشتہ را صلواۃ۔ آپ لوگ اس وقت آرام فرمائیں۔ کل صبح تک کی مہلت دیجاتی ہے۔ اگر اس درمیان میں کسی کو "حق غسل" پیدا ہوا تو خیر ورنہ کل صبح غسلخانہ آپ دونوں کا ہے!"

صبح ہوئی۔ آج کا دن اس سارے ہنگامہ کے سکرات کا تھا، اور یہ دن بخیر گذر جاتا تو آج مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دونوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ زندگی اور زندگی ہی نہیں بلکہ کارنامے بھی مختلف ہوتے، یونین میں جلسہ ہوا میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے، مولانا محمد علی صاحب نے تقریر کی اور بیٹھ گئے، مولانا شوکت علی صاحب نے تقریر شروع کی، دو پہر ہونیوالی تھی اور دونوں بھائی دو پہر کی گاڑی سے کہیں باہر جانیوالے تھے تقریروں اور انکے اثرات کے سیلاب کی آخری اور کمزور موجیں کنار ساحل سے ہم آغوش ہونیوالی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک پرسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر پڑھا۔

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را،

اور بیٹھ گئے، مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہے، میں دم بخود ہو گیا، اب جو دیکھتا ہوں تو تمام محفل، نعرۂ مجاہدین میں تبدیل ہو چکا تھا، ایک سیلاب تھا جو ساحلوں کو پاش پاش کر رہا تھا، ایک طوفان تھا جو نظم ہستی کو زیر و زبر کر رہا تھا، ایک ہولناک گونج تھی جس نے دنیا کی آوازوں کو ہضم کر لیا تھا یا غالب کے الفاظ میں۔

زمیں سے آسماں تک سنگ کا باب تھا

میں مرشد کو گھسیٹتا ہوا مجمع سے باہر لایا!

باہر نکل کر میں نے مرشد سے پوچھا، یہ کیا ہوا، فرمایا، رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا ہے، انجام

کی دعا کیجئے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا تھا، اُسے یوسف اور محمود کے سپرد کر دیجئے گا، کانگ کے کاغذات ہوں گے، انکو واپس کر دیجئےگا میں نے کہا مرشد آپ سے تو اس تحریک کے متعلق اکثر گفتگو رہی، اور آپ کچھ اس طریقۂ کار کے مؤید بھی نہ تھے پھر یہ کیا ہوا، مرشد نے فرمایا، تحریک غلط ہو یا صحیح اس کے بارہ میں کوئی شخص یقین اور صحت کے ساتھ حکم نہیں لگا سکتا۔ مجھے جس چیز نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ آخر میں کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڈھ نے ایک ایسی تحریک میں حصہ لیا جس میں صرف ہلاکت اور فلاکت تھی، مجھے تو یہ بتانا ہے کہ تحریک صحیح ہو یا غلط، فرزندان علی گڈھ رزم و بزم دونوں میں برابر کے شریک ہیں، رنگینی محفل ہو اور صدائے ناؤ نوش یا میدان جہاد اور نعرۂ تکبیر وہ دونوں کے لئے یکساں سرکجف ہیں۔ اجل سے ناآشنا رہکر علی گڈھ اپنی زندگی کا ثبوت کیونکر دے سکتا ہے، آپ میرے مزاحم نہ ہوں، پانسہ پھینکا جا چکا ہے، بازی بھی لگ چکی ہے، جبتک نتیجہ برآمد نہ ہو کسی کو میرے فعل پر کوئی حکم لگانے کا حق نہیں حاصل ہے، اچھا، خدا حافظ،

سلام علی نجد و اہل نجد

اچھا تو قصہ یہ تھا کہ مرشد پر افسردگی کا عالم طاری تھا میں نے دریافت کیا، مرشد، آخر کس سوچ میں پڑ گئے۔ فرمایا، اور یہ آپ پر کیسا اختلال طاری ہے، میں نے کہا، اختلال؟ اور یہ تو بتایئے اس فضا میں انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے، جس کو بطانوی فضا راس آتی ہو اسکو اس فضا سے کیوں شکایت ہو، میں نے کہا مرشد پہلے تو یہ بتانا ہوگا کہ یہ آپ کا فرمانا اللہ واسطے ہے یا محض پروپگنڈا!۔ اگر اللہ واسطے ہے تو تھوڑی دیر اور صبر کیجئے، ابھی دو چار اور بزرگ بھی اس ڈبہ میں موجود ہیں۔ اس قسم کے نمونے ان کی طرف سے پیش ہونیوالے ہی ہیں اور اگر محض پروپگنڈا ہے تو میں زنجیر کھینچتا ہوں۔ فرمایا، جانے بھی دیجئے۔ یہ تو کہتے نہیں بھوک لگی ہے اور دھمکی دیتے ہیں زنجیر کھینچ لینے کی۔ اور زنجیر کھینچ کر آپ میرا کر کیا لیں گے؟ مجھے تو سادھو سنت کی تحت میں ریلوے والے چھوڑ دینے پر مجبور ہوں گے۔ رہے آپ میں کہدوں گا یہ اوور ہالنگ (OVER HAULING) کے خوف سے آپریشن کرانے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا مرشد آپ تو ذاتیات پر اُتر آئے۔ فرمایا ذاتیات سے آپ اتنا خائف کیوں ہوتے ہیں اور کیوں صاحب کیا میرا بھوکا ہونا ذاتیات سے متعلق نہ تھا، جسکو آپ بالکل گول کر گئے تھے، یہ کہتے کہتے ایک ایسی آہ سرد کھینچی کہ دونوں شرعی مسلمان بھی چونک پڑے، جو مقابل کی نشست پر رونق افروز تھے، جن میں کے ایک حضرت وضو بنا رہے تھے اور دوسرے ناشتہ کھول رہے تھے۔ آہ ختم ہونے پر آئی تو فرمایا، اور کسی قدر بلند آواز سے کہ قرون اولےٰ کے مسلمان تو عرب کے بادیہ نشین تھے، جنکی مہمان نوازی دوست اور دشمن دونوں کے لئے یکساں تھی۔ میں نے کہا اور یہ دو بدو قسم کے بزرگ جو اس ڈبہ میں موجود ہیں، کیسے ہیں، فرمایا، اللہ جل شانہ نے قلب مومن کو اپنی دو انگلیوں کے درمیان رکھا ہے۔ نہیں معلوم کس وقت کیا ہو جائے۔ میں نے کہا آپ تو نان کوآپریٹر بھی ہیں۔ اور نمازی بھی۔ کچھ بتا سکتے ہیں، ان دو مومنین کے قلب کے ساتھ خدائی انگلیاں کیا سلوک کر رہی ہیں یا کرنے والی ہیں، فرمایا، دونوں نماز پڑھیں گے یا دونوں ناشتہ کھائیں گے۔

میں نے کہا مرشد یہ تو اللہ میاں اور اللہ والوں کی بات ہوئی۔ کیا آپ دنیاداروں کے نقطۂ نظر سے بتا سکتے ہیں کہ اسوقت ان کا نماز پڑھنا مفید ہوگا یا ناشتہ کھانا۔ فرمایا اگر ان دونوں نے کھانا کھانا شروع کیا تو نماز کی خیر نہیں اور نماز پڑھلی تو پھر کھانے کی خیر نہیں۔ میں نے کہا ان دونوں فعل میں کسکو مقدم اور کسکو موخر رکھنا ایک مومن کا فرض ہے، فرمایا: بھئی سنو، ایک حق اللہ ہے اور دوسرا زادالمسافرین۔ اور میاں، جانے بھی دو، دماغ چاٹ گئے،

بیچے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں!

میں نے کہا مرشد، آپ کو تو معلوم ہے۔ پہلے مالش اسی قسم کے فرسودہ مصرعے نہیں پڑھا کرتے، بھوک میں آداب مجلس بھی بھول گئے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، زادالمسافرین میرے ساتھ بھی ہے، مسکرائے، پھر فرمایا۔ تو آپ بھی عجیب شخص ہیں۔ پہلے ہی کہدیا ہوتا تو کیا نقصان ہوتا۔ آپ نے خواہ مخواہ دو مسلمانوں کے خلاف بدگمان کر دیا!

ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خرید لینے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لئے آزاد ہیں جس سے ڈبہ میں گندگی پھیلتی ہو یا بلوہ ہو جانے کا امکان ہو، ڈبہ میں داخل ہوں گے تو اس بدگمانی اور ارادہ کے ساتھ گویا تمام دوسرے مسافروں نے انکے حقوق راحت غصب کر لئے ہیں اور یہ ان کو آپریشن قسم کے مظلوم ہیں، یعنے ان کو اختیار ہے، یہ جتنا ظلم چاہیں کرلیں۔ دوسروں کو کوئی حق شکایت یا تدارک کا نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف دوسرے مسافر اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ان کو آپریشن کامیاب ہو یا ناکامیاب، نو وارد کی جان کی خیر نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی ایسی کر گزرتے ہیں، اور بعد میں ایسے گھل مل جاتے ہیں گویا برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں!

ہاں تو تذکرہ تھا ایک بزرگ کے "وضو بنانے" کا۔ اول تو جہاں تک دیکھا گیا ہے، وضو کرنے کا لوٹا اکثر ٹپکتا ہوتا ہے اور میلا بھی ہوتا ہے، میلا ہونا اور نہ ہونا تو قطعاً ایک شرعی مسئلہ ہے، یعنے جبتک کوئی چیز طاہر ہے اسوقت تک اسکے میلے ہونے نہ ہونے کا سوال غیر متعلق ہے۔ اگر کسی مولوی کو اس نظریہ سے اختلاف ہے تو اس کو اپنی تہمد میں منھ ڈال کر اس بیان کی اہمیت پر غور کرنا چاہیئے۔ محاورہ تو گریبان میں منھ ڈالنے کا ہے۔ لیکن اگر ضرورت شعری کی بنا پر اصول شعرگوئی سے انحراف کیا جاسکتا ہے تو پھر ضرورت واقعی کے خیال سے محاورہ سے انحراف کرنا بھی کوئی جرم نہیں ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مولوی کا تہمد شرعی اصول سے ہمیشہ طاہر ہوگی، لیکن حفظان صحت کے معیار سے اس کا معائنہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے اس میں کیمیاوی اور جراثیمی، دونوں اقسام کی "اشیا" بکثرت ملیں گی۔

چنانچہ وضو بنایا جا رہا ہے، غسل خانہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور وضو اس طور پر کیا جا رہا ہے کہ کچھ پانی غسلخانہ کے فرش پر گر رہا ہے اور کچھ اس سے باہر اور شاید دونوں کا مرکب جسم پر۔ "وضو بن گیا" اور اب اس فاتحانہ انداز سے نکلے ہوئے جیسے کوئی دیہاتی تھانیدار دفعہ ۵۴ کے ملزم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا ہو، پانی کے قطرے ادھر ادھر گر رہے ہیں۔

اس پر اگر کوئی معترض ہو تو پھر اس طور پر بگڑیں گے، اور آمادہ فساد ہوں گے گویا اسلام خطرہ میں ہے اور صرف یہی ایک مسلمان دجال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے باقی رہ گئے ہیں۔

گاڑی کان پور پہونچی، اتفاق سے یہ نماز کا وقت تھا۔ دونوں بزرگ گاڑی سے اتر پڑے، انکو دیکھکر بعض دوسرے مجاہدین بھی جھپٹے ہوئے آن پہونچے اور پلیٹ فارم سے نادیہ قائمہ بناتی ہوئی نماز باجماعت شروع ہو گئی، یہ بھی ایک عجیب سانحہ تھا کہ اسی دن کوئی بزرگ نان کوآپریشن وغیرہ کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے اور پلیٹ فارم سے گاڑی میں لائے جا رہے تھے۔ وہ ہنگامہ، ہجوم اور شور و غل تھا کہ ہر معقول شخص کو اپنی عزت و عافیت خطرہ میں نظر آتی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا اس وقت نماز باجماعت ادا نہ کرنے سے اسلام کس طور پر خطرہ میں تھا، میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میدانِ جنگ میں بھی نماز باجماعت ہوا کی ہے اور ہونی چاہیئے لیکن میں اسکو کبھی نہیں مان سکتا کہ اسوقت کانپور کے پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا اور پھر یہ بھی کیا ضرور ہے کہ نماز باجماعت صرف ایسے مقام پر ہو، جہاں ہجوم اور آدمیوں کی آمد و رفت کی کثرت ہو، اور ہر شخص کو جس میں مسلمان بھی شامل ہوں، راحت اور آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے میں دقت یا خطرہ ہو، پھر اس سوال کا کیا جواب ہے اگر اس ہنگامۂ رستخیز میں نماز ادا کی جا سکتی ہے تو پھر مسجد کے سامنے باجا بجنے پر مسلمان نماز ادا کرنے سے کیونکر قاصر رہتے ہیں۔

میں ابھی اسی پیچ و تاب میں مبتلا تھا، اور رہنما اور اناڑی ریفارمر ابتدا میں اسی قسم کی منھ زوری سے کام لیتا ہے اور بے ضرورت آمادۂ شہادت رہتا ہے۔ اپنے اس جوش و شدت کی داد لینے کی غرض سے میں مرشد کی طرف متوجہ ہوا، تو یہ دیکھکر کیسی کوفت ہوئی کہ مرشد پر غنودگی طاری ہے۔ کہاں تو میں، شہدا، مجاہدین اور مصلحین کی صف اول میں داخل ہونے کیلئے کیا کیا نہیں کر گذرا اور تھوڑی سی ہمت افزائی سے خدا جانے اور کیا نہ گذرتا، کہاں مرشد ہیں کہ اونگھ رہے ہیں۔ میں جھلّا پڑا، اور مرشد کو جھنجوڑ کر بولا، دیکھتے نہیں بھارت ماتا کے سپوت مہا بھارت مچا رہے ہیں، اسلامی مجاہدین کی صرف آخری صف میدانِ جنگ میں باقی رہ گئی ہے، یا قرونِ اولٰی کے مسلمان "محمود و ایاز" سمیت صف بند ہیں، یہ وقت سونے کا ہے، یا گورنمنٹ کو گالی دینے اور خود مر جانے کا۔ لاحول ولا قوۃ، مرشد نے آنکھ کھولدی، سامنے سے ایک خوانچہ والا گذر رہا تھا۔ اس سے کچھ دہی بڑے چکانے لگے۔ پوچھا کونسا اسٹیشن ہے، بڑا مجمع ہے کوئی بڑا ہی اسٹیشن ہوگا۔ اس نے کہا کانپور ہے، فرمایا ہیں وہ کانپور والی مسجد ہے، میں نے کہا یہ خطرہ آپ کو کیسے گذرا، فرمایا، کچھ نہیں۔ یہی پلیٹ فارم کے نمازیوں کو دیکھکر خیال آیا اور ہاں دیکھیے گا وہ ہمارے دوست بھی تو جماعت میں شامل ہیں، معلوم نہیں ان کے ناشتہ کا کیا حشر ہوا۔ میں نے کہا مرشد کھانے اور سونے دونوں سے نفرت۔ ذرا یہ تو بتاؤ اس وقت پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنیکی کیا ضرورت لاحق تھی۔

کہنے لگے بھئی، سنو، یہ نمازی اور تم دونوں حماقت میں مبتلا ہیں۔ نمازیوں کا تو یہ خیال ہے کہ جبتک نماز پڑھتے جائیں، اسوقت تک عقل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تم کو یہ مغالطہ ہے کہ جبتک عقل ہے اسوقت تک نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آپ ہر اس شخص کے پیچھے ڈنڈا لئے پھریں جو آپکے خیالات یا افعال کا مؤید

نہ ہو، ہر شخص جداگانہ طبیعت، جداگانہ مذاق اور جداگانہ مقاصد رکھتا ہے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ سب کے سب آپ کا اتباع کرنے لگیں۔ آپ کا شمار نہ تو آئمہ معصومین سے ہے اور نہ حکومت برطانیہ سے کہ آپ سے غلطی کا ارتکاب ناممکن ہو۔ پھر لوگ آپکے میلان ومذاق کے کیوں پیرو ہوں، بھلامانس وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے۔ ہم آہنگ کا لفظ میں نے نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے۔ یعنے یہ کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس کے وجود سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود بہرہ مند ہو۔ وہ جو خود باعث رحمت ہوتا ہو اسکو کسی دوسرے کے احسان، کرم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اسلام کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ میں نے کہا میں اسلام کے بارہ میں آپ سے استفادہ نہیں کرتا۔ میرا اعتراض تو اس قسم کے مسلمانوں سے ہے، جو ہر کام اس خیال و نیت سے کرتے ہیں کہ لوگ ان کو صرف مسلمان سمجھیں۔ فرمایا، مثلاً؟ میں نے کہا، اول تو یہی دیکھ لیجئے، اس پلیٹ فارم پر نماز باجماعت کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ آپ نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہوگا وہ اس تیور اور تبختر کے ساتھ "آمادۂ نماز" ہوں گے گویا اُن کے علاوہ سارے مسلمان جو اسوقت انکی اقتدا میں نماز نہ پڑھیں گے وہ دوزخی ہیں اور یہی نہیں بلکہ نماز میں یہ بزرگ اپنے "خاتمہ بخیر" ہونے کے بجائے شاید دوسروں کے جہنمی ہونیکی دعا پہلے مانگیں گے ــــ وہ بھی اُسی شاندار ذہنیت کے ساتھ جس سے ملت اسلامیہ ہندیہ گورنمنٹ عالیہ برطانیہ سے اپنے حقوق طلب کرتی ہے۔

چنانچہ یہ کچھ نماز ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بعض لوگ روزہ بھی اسی ذہنیت کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے روزہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شریف شخص نہ ان سے مل سکتا ہے اور نہ یہ خود کسی شخص سے شرافت کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ آپ شکایت کرینگے صاحب میں آپ سے ملنے گیا تھا معلوم ہوا کہ آپ سو رہے ہیں، فرمائیں گے، بھئی کیا کروں روزہ ہے آپ کہیں گے آپ نے فلاں کام کا وعدہ کیا تھا، اب تک پورا نہ کیا، فرمائیں گے۔ روزہ ہے۔ آپ نے خط کیوں نہیں بھجوایا، اور کپڑے کیوں میلے ہیں؟ جواب ملے گا، روزہ ہے، آپ ہنستے کیوں نہیں؟ روزہ ہے، آپ دوسروں کو کیوں نہیں ہنسنے دیتے؟ روزہ ہے! آپ روتے کیوں ہیں؟ روزہ ہے! اور دوسرے نہیں روتے تو بگڑتے کیوں ہیں؟ روزہ ہے! آپ انتقال کیوں نہیں فرماتے؟ تم جہنمی ہو!

مرشد نے فرمایا، بھئی، روزہ کا ذکر کرتے کرتے تو دماغ چاٹ گئے، لیکن تم کو معلوم بھی ہے۔ روزہ اور روزہ کے تذکرہ کا اثر معدہ پر کیسا پڑتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب اسمیں پہلے ہی سے خلا محض ہو۔ پہلے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو، اس کے بعد روزہ پر زیادہ صحت وسلامتی کے ساتھ بحث ہو سکے گی۔ چنانچہ کھانا نکالا گیا، مرشد نے پہلے کھانے کا جائزہ لیا اور ایک ذہنی اطمینان کے ساتھ پہلا لقمہ نذر دہن کیا اس کے بعد ہی ایک پورا گلاس پانی کا اسکی تعاقب میں روانہ کیا گیا، پھر فرمایا، آج کل فرائض مذہبیہ کا ادا کرنا لوگوں نے احسان کرنے کا مترادف سمجھ رکھا ہے، روزہ اس لئے نہیں رکھتے کہ روزہ رکھنا شعائر اسلامیہ میں سے ہے، یا اس قسم کی پابندیاں تنظیم حیات کی موجب ہوتی ہیں اور بجائے خود ممکن ہے

کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن انکا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نہایت مفید اور مستقل پڑتا ہے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا روزہ نہ رکھنے والوں کے خلاف ایک شدید جنگ ہے، یا خود اللہ میاں پر ایک احسانِ بیکراں، روزہ رکھنے والوں یا اس قسم کی کوئی اور پابندی اختیار کرنے والوں کی بالعموم یہ ذہنیت ہوتی ہے کہ ہم تو تکلیف اُٹھاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اُنکے ذہن و خیال کو خود اُنکے لئے جو چیز اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ اس صلہ میں اللہ میاں ہمارے لئے حوریں کیوں نہیں بھیجدیتے اور دنیا والے ہمارا جلوس کیوں نہیں نکالتے دوسری طرف روزہ نہ رکھنے والے ہیضہ میں کیوں نہیں مبتلا ہو جاتے یا جیل خانہ کیوں نہیں بھیجدئے جاتے!

میں نے کہا مرشد بالکل صحیح فرمایا، یہی ذہنیت آپکے علاوہ غالباً تمام ننان کوآپریٹروں کی بھی ہے یعنے یہ کہ ہم تو کھدر پہنتے ہیں اور جیلخانہ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ململ پہنتے ہیں اور یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں! مرشد نے فرمایا آخر مجھ پر اتنا احسان کیوں فرماتے ہیں، مجھے کیا کچھ کم غصہ آتا ہے کہ آپ لوگ گلفام بنے پھرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، مرشد، گلفام بننا کچھ اتنا زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے، جتنا لال یا سفید دیو کی ذہنیت کا حامل ہونا! مرشد یہ سنتے جا رہے تھے کہ یکایک ایک پورا شامی کباب منھ میں رکھا اور گلاس اُٹھا کر ایک ایسے لہجہ میں جس میں شوخی اور سنجیدگی دونوں ہم آہنگ تھیں فرمایا،

راجہ ہوں میں قوم کا اندر ہے میرا نام!

میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا، گھونگٹ، گندگی، اور گہنا۔ کم ذی روح ایسے ہوں گے جن پر سونے چاندی اور گندگی کا اتنا انبار ہو، اُن کو دیکھکر مجھے اکثر وہ تصویریں یاد آجاتی ہیں جو ٹائمس ویکلی کے (Times weekly) پہلے صفحہ پر نظر آتی ہیں، زیور کا منشاء اولین تو شاید ظاہری جسمانی آرائش رہی ہوگی، اس کے بعد ممکن ہے اس کا شمار دولت میں ہونے لگا ہو، لیکن اسمیں شک نہیں مارواڑیوں نے اسکو صرف دولت قرار دیدیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی عورتوں کو اُنھوں نے زیور کی باربرداری کا ایک اچھا جانور سمجھ رکھا ہے۔ مارواڑی عورتوں نے زیور کے منشاء اولین کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر اُن کا شمار زیور میں ہو سکتا ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ زیور کا ایسا بھدا اور بھونڈا نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

عورتیں اکثر رنگین کپڑوں کی شائق ہوتی ہیں، لیکن جہاں تک مارواڑی عورتوں کا تعلق ہے وہ صرف رنگین کپڑوں کی دلدادہ نہیں ہوتیں، بلکہ ان کو ایک طور پر رنگین گندگی کا بنڈل کہنا زیادہ موزوں ہے۔ گھونگٹ کا مصرف اگر صرف چہرہ کا چھپانا ہے تو اس میں مارواڑی عورتیں سب سے سبقت لیگئی ہیں۔ لیکن اُنکے گھونگٹ کے معنی یہ ہیں کہ جسم کے بقیہ حصے نقاب و حجاب سے بالکل بے نیاز ہوں، نہانا بھی شاید اُنکے فرائض جنسی میں شامل ہے، ریل کے سفر میں نہانے کی سہولتیں تو فراہم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان عورتوں یا ان کے مردوں نے خود نہانے میں اتنی سہولتیں پیدا کرلی ہیں کہ ریلوے کے حکام کو اس طرف توجہ کرنیکی شاید ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ جس کپڑے میں بیٹھی ہوں گی اُسی کے ساتھ پلیٹ فارم پر اُتر آئینگی۔

اور پانی والے مہراج، دو تین لٹیاں پانی کی سر پر ڈال دیں گے۔ اور یہ کافی ہے۔ اس کو غسل کرنا کیوں کہئے یہ تو خشک گندگی کو تر بنانا اور اسکو منتشر کرنے کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ اور پھر اس تر بتر کپڑے کے ساتھ ڈبے میں داخل ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جسپر اسمبلی میں بم کا گوڈ گرنا تعجب انگیز نہیں ہے۔

ان عورتوں کے ساتھ جتنے مرد دیکھے گئے ہیں انکے کیرکٹر کا ایک پہلو خاصا عبرت ناک ہے، اگر اتفاق سے دو تین مرد ساتھ ہوئے تو پھر یہ اپنی مارواڑی زبان میں گفتگو کا ایسا سلسلہ شروع کریں گے جو کبھی ختم نہ ہوگا، اور اس شور اور شدت کے ساتھ بولیں گے کہ آپ پر زندگی کی تمام راحتیں حرام ہو جائیں گی۔ یہی حالت بنگالیوں کی ہے، سفر میں ان کا محبوب ترین اور تنہا مشغلہ کھانا اور بکنا ہے۔ دنیا کی خرافات ترین اور کم سے کم داموں والی چیزیں کثیر ترین مقدار میں خریدیں گے اور کھائینگے۔ دو چار پیسہ سے زیادہ کی چیز نہیں خریدینگے اور بیچنے والے سے اس قدر حجت کرینگے گویا ہندوستان کی حکومت خود اختیاری پر نمائندگان برطانیہ سے ردو کد کر رہے ہیں۔ اگر ہر اسٹیشن پر گاڑی کے ٹہرنے کا وقت محدود نہ ہو تو مجھے یقین ہے ان لوگوں کی خرید فروخت ہمیشہ جرائم قابل دست اندازی پولس پر ختم ہو۔ گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو یہ کھانے کی چیز خریدینگے۔ چلتی رہے تو غسل خانہ میں اُصول حفظان صحت کی بحث و پڑیا شکست و ریخت میں مصروف ہوں گے اور ان دونوں سے فارغ ہوں تو ہمسفر ساتھیوں کی راحت میں خلل انداز ہوں گے۔ یعنے کھاتے ہوں گے، بکتے ہوں گے، یا بیڑی پیتے ہوں گے، یا ان سب کا نتیجہ خدا جانے اور کیا کیا کرتے ہوں گے۔

بنگالیوں، مارواڑیوں اور بنیوں میں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ یعنے اگر اُنکے ساتھ عورتیں یا بچے ہونگی تو یہ ہمیشہ عورتوں اور بچوں کی راحت کو اپنی راحت پر قربان کر دینگے۔ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ یہ اپنے سونے اور بیٹھنے کیلئے پہلے جگہ تلاش کر کے مخصوص کر لیگا۔ عورتیں اور بچے تنگ سے تنگ جگہ پر بیٹھے ہونگے۔ دھوپ اور ہوا سے انکو سخت تکلیف پہونچتی ہو گی لیکن مرد کو اسکی کوئی پروا نہیں، یہ سارے کپڑے اتار کر صرف دھوتی باندھ کر پوری سیٹ پر پڑ رہے گا۔ اور اسوقت تک پڑا رہے گا، جبتک اسکو پھر بھوک یا پاخانہ نہ لگے۔ ان کی دھوتی ستر پوشی کا اتنا کام نہیں دیتی جتنا موقعہ ستر کی نمائش اور نمایندگی کرتی ہے۔ ممکن ہے، کرشمۂ دامن دل میکشد کہ جا اینجا کا مردانہ مفہوم اسی قسم کی دہوتی ہو!

مارواڑی کو سوتا پا کر مرشد نے بھی ایک جھپکی لی، اور دونوں کو غافل پا کر ایک شرعی مسلمان نے کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی، اور اس زور و شور کے ساتھ کہ ایک چھوٹا شیر خوار بچہ جاگ پڑا اور اُس نے رونا چیخنا شروع کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مرشد بھی جاگ پڑے، اور اُٹھ کر بیٹھ گئے لیکن آنکھیں بند تھیں، اور بظاہر اس امر کا اندازہ لگا رہے تھے کہ اگر یہ سارا ہنگامہ بیداری کا نہیں بلکہ عالم خواب کا ہو تو ایک بار پھر لیٹ رہیں، لیکن اس ہنگامہ سے بنگالی مسافر کی بھوک اور بکواس کو تحریک ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے مرشد سے دریافت کیا کہ کیا وقت ہے اور اگلے اسٹیشن پر کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں، مرشد ابھی کچھ جواب نہ دینے پائے تھے، کہ مارواڑی بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، اُس نے سب سے پہلے بیوی کا جائزہ لیا اور اس خوف و اندیشہ کے ساتھ کہ کہیں ڈبہ میں چور تو نہیں

گھس آئے تھے، اور زیور پر حملہ تو نہیں ہوا، بیوی کو محفوظ اور بچے کو پاخانہ پھرتا پاکر پھر لیٹ رہا۔ مارواڑی عورت نے پاؤں کو اصلی معنوں میں قدمچہ بنا کر بچہ کو پاخانہ پھرایا، لوٹیا سے بالٹی میں سے پانی نکالا اور بچہ کو پاک اور سارے ڈبہ مع مولۂ مرشد و اشیاء منقولہ و غیر منقولہ، ذی روح و غیر ذی روح کو ناپاک کردیا، مرشد قریب ہی تھے۔ اس تمام ہنگامہ سے ایسا ہی مطمئن یا مسرور تھے، گویا مارواڑی عورت اور اس کا بچہ خود انکی بیوی اور بچہ تھے!

میں نے دریافت کیا، کیوں مرشد اگر سوراج مل گیا تو آپ ان بدعنوانیوں کا کیا علاج کرینگے۔ فرمایا، سوراج کچھ آپ کی یونیورسٹی ([illegible]) تو ہے نہیں کہ قوم کی ساری ضروریات کی کفیل ہونے کا دعوی کرسکے۔ میں نے کہا اگر سوراج ملنے پر بھی ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس میں سفر کرنا نہ آیا تو حیف ہے آپ پر اور آپ کے سوراج پر۔ فرمایا، ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس میں نہیں بلکہ تھرڈ کلاس میں ٹھکانے سے سفر کرنا آجائے تو پھر سوراج کی ضرورت بھی باقی نہ رہے۔ میں نے کہا جس قوم کو قضائے حاجت کا بھی سلیقہ نہ ہو، اس کا سوراج طلب کرنا کہاں تک روا ہے، فرمایا اور جو حکومت سو سال تک کسی قوم کی اخلاقی، تعلیمی، اور معاشرتی ضروریات کی کفیل رہنے کی دعویدار رہی ہو اور پھر اسکی رعایا کو قضائے حاجت کا سلیقہ نہ ہو، وہ خود حکومت کرنیکی کہاں تک اہل ہے۔ میں نے کہا مرشد، جہاں تک انگریز اور ہندوستانیوں کا تعلق ہے، موخرالذکر کی قضائے حاجت محض ایک اضطراری فعل ہے، اس لئے قابل معافی۔ قضائے حاجت تو ہندوستانیوں کے خمیر میں داخل ہوگیا ہے کلکٹر صاحب کا سامنا ہو اور ہندوستانی کو قضائے حاجت پر قدرت ہو، اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا ایک بنگالی دوسرے بنگالی کو دیکھ پائے اور خاموش رہے۔ یا آپ کی گاندھی ٹوپی دیکھکر مجھ کو پیچ و تاب نہ ہو۔ فرمایا، ہیٹ اور گاندھی کیپ پر پیچ و تاب کھانا بھی ایک مسئلہ ہے، جسپر کبھی غور فرما لیا کیجئے۔

پورب سے کالا کاجل سا بادل اٹھا۔ گھٹتا، جھومتا، پھنکارتا، بل کھاتا ہوا ——— جیسے انگریزوں کا کوئی ڈریڈ ناٹ کہیں پیغام صلح لئے جا رہا ہو ——— یا کسی چمارن پر جوانی چھا رہی ہو ——— اعوذ باللہ من شرور انفسنا ...... الخ

ممکن ہے بعض ثقات پر "چمارن" گراں گذرے، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس موقعہ پر یا تو "چمارن" اختیار کیجاتی یا پھر شعر

بہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

پھر انصاف شرط ہے اردو یا ہندوستانی شاعری میں اور وہ بھی ایک اردو ہی شاعر کی زبانی "کافر" کا مفہوم چمارن نہیں تو ادا کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر اس مسئلہ نے کبھی طوالت کھینچی تو میں یقیناً اپنی جوابدہی میں مسٹر چغتائی کو پیش کروں گا۔ کیونکہ مرشد کا بھی خیال ہے کہ اگر متذکرہ صدر شعر کو "نقش فریادی" کے سلسلہ میں کبھی مسٹر چغتائی نے پیش کیا تو وہ یقیناً کسی نوجوان چمارن کی ہوگی۔ اور مرشد نے مجھے اطمینان دلا دیا ہے، اور اسی بنا پر میں اڈیٹر صاحب نگار کو بھی یقین دلاتا ہوں کہ "نوجوان چمارن"

اُسوقت تک کبھی خطرناک نہیں ہے، جبتک اس کا سابقہ کسی "نوجوان چمار" سے نہ ہو، اور مجھے یقین ہے ناظرینِ نگار میں سے کوئی صاحب اس فضیلت کے دعویدار بھی نہ ہوں گے، بشرطیکہ وہ کوئی ممبر کونسل نہ ہوں!

شام ہونے لگی اور پانی برسنے لگا، میں نے کہا مرشد، ہندوستان کی برسات سے بھی زیادہ پُرکیف منظر آپ کی نظر سے گذرا ہے؟ کیسی گھٹا اُٹھی ہے، کیسی روح پرور ہوا ہے اور کتنی اچھی بارش ہوتی ہے۔ آپ تو بڑے جہانیاں جہاں گشت ہیں، کچھ سُنائیے۔ فرمایا،

بن بادل بجلی کہاں چمکی، بن، با،

اتنے میں ایک ٹکٹ کلکٹر داخل ہوا، مرشد لیٹ گئے۔ بقیہ نغمے حلق کے بجائے ناک سے برآمد ہو رہے تھے۔

اور میں بھی لکھتے لکھتے تھک گیا!

رشید احمد صدیقی (ایم اے) مسلم یونیورسٹی

کیا دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے ؟

(بہ سلسلۂ ماسبق)

گزشتہ مہینے کے نگار میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ دنیا میں مذہب کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی اور ملل اولین کے مذہبی عقائد، فی الحقیقت کیا چیز تھے، اور ان کے خیالات میں کس طرح تدریجی ارتقا ہوا۔

چونکہ مذاہب کا وجود، علی الخصوص ان مذاہب کا جو اپنے آپ کو اخلاق و معاشرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، قدرتاً متاثر ہوا کرتا ہے، وقت و ماحول سے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تمدن تو قوانین ارتقاء کے ماتحت ترقی کرے اور مذہب اپنے حال پر قائم رہے، کیونکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان مذہب کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مذہب خود کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک کیفیت و عرض ہے جو انسان پر اُس کی دماغی تربیت، تمدنی ماحول اور نظام اجتماعی کے ماتحت لاحق و طاری ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی مذہب یہ دعوے کرے کہ اسکی اولین شریعت ہمیشہ یکساں طور پر ہر زمانہ و ملک کی موافقت کر سکتی ہے تو اس سے زیادہ جھوٹ دنیا میں صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک وزنی چیز کو بلندی کیطرف پھینکیں اور کہیں کہ زمین اسکو اپنی طرف نہ کھینچے گی۔

خود انسان کی تاریخ پر آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے اُس پر لاکھوں برس کا وہ لامعلوم زمانہ گزرا جب اس میں اور ایک جانور میں قطعی کوئی فرق نہ تھا، اس کے بعد پانچ، چھ لاکھ سال کا وہ زمانہ آیا جب اس نے پتھر کے بھدے آلات بنانا سیکھے، پھر حجری عہد عتیق آیا جو تین چار ہزار سال تک قائم رہا، پھر مسیح سے ۲۰ ہزار سال قبل عہد حجری جدید شروع ہوا جو ۳½ ہزار سال قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس کے بعد عہد تاریخی شروع ہوا جسکی ارتقائی صورت موجودہ عہد تہذیب و تمدن ہے۔

انسان کے ان مختلف منازل ارتقاء میں، مذہب کے اندر جس جسطرح تبدیلیاں ہوئیں انکا ذکر ہم ماہ گزشتہ کے رسالہ میں کر چکے ہیں کہ اول اول مذہب کا خیال کس طرح صرف وہم و گمان پر قائم ہوا، اس کے بعد کیونکر مظاہر قدرت اور آثار فطرت کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اخلاق پر اُسکی بنیاد رکھ کر کس طرح ان مذاہب کو پیدا کیا گیا جنھیں الہامی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مختلف ممالک کے مذہبی معتقدات میں بہ ادنے اختلاف کسقدر مشارکت پائی جاتی ہے اور عقائد کی اشاعت کن اُصول کے ماتحت کی گئی۔ جبتک انسان کا مذہب کسی مرتب و مدون صورت میں نہیں آیا وہ بالکل ذاتی اور بیغرض

چیز تھا، لیکن اس کے بعد جب ایک مخصوص جماعت علم مذہب یا علم رسم و رواج جاننے والی پیدا ہو گئی تو اُس نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنایا اور اول وقت سے لیکر تا ایندم کوئی زمانہ، کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جو اس نوع کے کاذب مدعیان مذہب کا مجروح نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اس جماعت کا یہ اقتدار عرصہ تک قائم رہا، لیکن جب علوم وفنون کی ترقی ہوئی، عقول انسانی میں سمجھنے اور غور کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی، تو رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی ظاہر ہونے لگی، جس نے احکام مذاہب، معتقدات مذاہب پر غور کرنا شروع کیا، اور آہستہ آہستہ فقہ کے ساتھ علم کلام کی بھی بنیاد پڑی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔ اور جبتک ایک متنفس بھی مذہب کا ماننے والا موجود ہے۔ اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ علم کلام کی انتہا اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ مذہب سے انکار کر دیا جائے اور اسکی پابندیوں کو بالکل توڑ کر رکھ دیا جائے۔ وہم وخیال کی آپ کتنی ہی تاویل کرتے جائیے۔ وہم وخیال ہی رہیگا۔ اس لئے اس کا اختتام اسی طرح ممکن ہے کہ آپ وہم وخیال ہی سے گزر جائیں۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد قدیم کی قوموں میں اول اول بُت پرستی کس طرح شروع ہوئی اور متعدد بتوں کا وجود مٹ کر کیونکر صرف ایک بڑے بُت کی ہستی قائم ہوئی۔ یہ گویا سب سے پہلا خیال تھا جسے ہم ایک لحاظ سے توحید کہہ سکتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں بھی بہت کچھ مادیت پائی جاتی تھی، اس لئے فطرت انسانی مطمئن نہ تھی اور کبھی کبھی اس میں بغاوت کے آثار پائے جانے لگتے تھے، چنانچہ زردشت، کنفوشس اور بودھ انھیں لوگوں میں تھے جو مادیت سے علیحدہ ہو کر اپنے مذاہب کی بنیاد قائم کرنا چاہتے تھے، اور اسمیں کلام نہیں کہ اُسوقت زمانہ کے لحاظ سے جو کچھ اُنھوں نے کیا وہ بالکل وہی تھا جیسے آج کوئی معقول پسندی کے بناء پر تمام مذاہب کی ضرورت سے انکار کر دے۔

عہد آخر کے مذاہب میں سب سے اخیری مذہب جسکے بعد اسلام کا ظہور ہوا اور جس نے غیر معمولی وسعت اختیار کی عیسوی مذہب تھا، لیکن اُسکی جو حالت ہوئی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنیوالوں سے مخفی نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم غور سے اس کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے بہت کچھ سامانِ عبرت وبصیرت اس میں موجود ہے۔

میں نے اسوقت تک اسلام سے کوئی بحث نہیں کی اس پر سب سے اخیر میں بطور نتیجہ بحث کرکے بتاؤں گا کہ اس تمام تلاطم خیال میں سکون پیدا کرنے والا صرف اسلام ہی ہو سکتا تھا، لیکن وہ اسلام نہیں جو آجکل پایا جاتا ہے اور نہ وہ اسلامی تعلیمات جو مولویوں، فقیہوں اور محدثوں نے ہمیں بتائیں۔ بلکہ وہ تعلیم وتلقین جو خدا نے ظاہر کی، جو قرآن میں موجود ہے اور جو ایسی حقیقت وصداقت ہے کہ اگر اسکو سمجھ لیا جائے تو تمام انسانی تفرقے خواہ وہ تمدن ومذہب سے متعلق ہوں، یا سیاست واقتصاد سے فوراً مٹ سکتے ہیں۔ اور ساری دنیا ایک ہی مقصود کو سامنے رکھکر ایک ہی جادہ پر دست وبغل ہو کر گامزن ہو سکتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کو اس عیسوی مذہب کے ارتقاء وزوال کے مناظر دکھاؤں جو آج دنیا کی متمدن ترین اقوام کا معمول بتایا جاتا ہے، کیونکہ اس مذہب کی تاریخ کا بہت بڑا اثر اسلام پر پڑا ہے اور جو صورتیں کلیسا اصحاب کلیسا کے

انہدام کی وہاں پیدا ہوئیں، وہی اسلام کے لئے پیدا ہو رہی ہیں اور ان کا کامیاب ہونا یقینی ہے، اگر علمبرداران اسلام نے اب بھی موقعہ کی نزاکت کو محسوس نہ کیا۔ جس طرح تمام مذاہب کی ابتدائی حالت میں معلمین مذہب کا اقتدار رہا ہے اسی طرح مسیحیت میں بھی پادریوں کا اثر بہت قائم تھا، لیکن جب اُنھوں نے دین عیسوی کو رسم و رواج کی پابندیوں کا ایک طلسم بنادیا جیساکہ موجودہ اسلام میں پایا جاتا ہے تو لوگ رفتہ رفتہ اس سے گھبرانے لگے۔ اور سب سے پہلے لیوتھر اور کالوین نے ایک جدید اصلاح یافتہ مذہب "پروٹسٹانیت" (PROTESTANTISM) کے نام سے قائم کیا، لیکن چونکہ یہ اصلاح بھی پوری طرح دل کو نہ لگتی تھی اس لئے جب یورپ میں دورِ نہضت (RENAISSAUCE) شروع ہوا تو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں میں مذہبی عقائد ومسائل کی چھان بین بھی ہونے لگی اور اُنھیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ انجیل سے تعلق رکھتی ہیں نہ کلیسہ سے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روم میں عہد شہنشاہی کا خاتمہ ہوچکا تھا، اطالیہ سے یہ ذوق منتقل ہوکر رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان پہونچا، اور وہاں بھی اسی قسم کے مباحث ہونے لگے۔ یہ وقت وہ تھا جب انگلستان میں شکسپیر سے پہلے انگلستان کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس مارلو (MARLOWE) سروالٹر ریلے (WALTER RALEIGH) اور بہت سے دیگر روشن خیال لوگوں نے متشککین کا ایک کلب قائم کر رکھا تھا اور مذہبی اُمور پر بحث کیا کرتے تھے۔ جس وقت اطالیہ کی طرف سے ان خیالات کی تائید ہوئی تو تحقیق و تدقیق کا بازار زیادہ گرم ہوگیا۔ اور جو باتیں بائبل میں درج تھیں ان کا از روے درایت مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ اسوقت سیاح لوگ مختلف ممالک کا انکشاف عمل میں لارہے تھے، پردۂ اخفا سے ایسی ایسی نئی زمینیں برآمد ہو رہی تھیں جو مصنفین بائبل کے خواب میں بھی نہ آئی تھیں، دوسری طرف نگاہیں دوربینوں کے ذریعہ سے فلک الافلاک تک پہونچ رہی تھیں۔ اور آسمان کے متعلق تمام بائبلی معلومات لغو و مہمل ثابت ہو رہی تھیں۔

الغرض جدید معلومات کے سامنے مذہب کی قدیم معلومات پادر ہوا نظر آرہی تھیں اور پرانے معتقدات کا شیرازہ درہم برہم ہوا جاتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ جس چیز کو "الہامی" اور "ربانی" مذہب بتایا جاتا ہے وہ درحقیقت معمولی بلکہ ادنے دماغوں کے منتشر خیالات ہیں۔ اور رفتہ رفتہ مذہب کی وقعت اُن کے دلوں سے اسقدر محو ہوگئی کہ قومی و ملی اغراض کے مقابلہ میں بھی اس کو نظرانداز کیا جانے لگا۔

چند دنوں میں متشککین، لاادریئیں، اور معقولیئین (RATIONALISTS) کا ایک گروہ ہر ملک میں قائم ہوگیا، جنھوں نے آزادی کے ساتھ مذہب کے متعلق لکھنا شروع کردیا۔ سترھویں صدی کے وسط سے لیکر اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان میں بڑے بڑے زبردست لاادریہ مصنفین گذرے۔ جنمیں بہت زیادہ مشہور ہربرٹ (HERBERT) بلاؤنٹ (BLOUNT) ٹنڈیل (TINDEL) ٹولینڈ (TOLAND) لارڈ شیفٹسبری (SHAFTHSTEURY) لارڈ بولنگبروگ (BOLINGBROKE) کولنس (COLLINS) وغیرہ تھے۔ خشک مسیحیوں (BURITAUS) کا زمانہ گذر چکا تھا، ملک میں ہر جگہ آزادی ضمیر کا دور دورہ تھا اور پادریوں کے اخلاق اسقدر گر گئے تھے کہ کلیسہ کے اسقف حرامکاری کو عیب نہ سمجھتے تھے اور

امرا کی ناجائز اولادیں آسانی سے اسقف کا مرتبہ حاصل کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ کی ملکۂ انگلستان کیرولائن (CAROLINE) (۱۶۸۳ء ـــــ ۱۷۳۷ء) بھی اسقدر متشکک واقع ہوئی تھی کہ مرتے وقت اس نے کلیسہ کا توشہ لینے سے انکار کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ الغرض اس زمانہ کے بڑے بڑے مدبرین اور صاحبان علم وفضل معقولیت پسند تھے، یہ لوگ بجز خدا کے معجزہ و وحی وغیرہ کو نہیں مانتے تھے اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ قدیم کلیسہ کے معتقدین نے ان کا نام "فرد ملحد" رکھ دیا تھا۔ الغرض گذشتہ دو سو برس سے مخالفین مسیحیت کی ایک زبردست جماعت انگلستان میں چلی رہی ہے اور جسقدر تعلیم بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر اس جماعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پریس کی ایجاد اور ارزاں کتب کی اشاعت نے ہر جگہ مذہب کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جب اٹھارھویں صدی میں صنعت، حرفت و تجارت کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف امن وسکون قائم ہوا تو اشاعت علوم وفنون کے ساتھ "عقلیت" (RATIONALISM) کو بھی ترقی ہوئی۔ گیٹے (GAETHE) شلیگر (SHILLER) اور کانٹ (KANT) وغیرہ سیکڑوں شعرا اور فلسفی پیدا ہو گئے۔ جن کے دلنشین کلام اور شیوا بیانیوں نے عوام کے دل میں جگہ کی اور مذہبی روایات کی عمارت متزلزل ہو کر زمین پر آرہی۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی طرح فرانس میں بھی آزادی کا دور شروع ہوا۔ پروٹسٹنٹ جماعت کے قتل عام کے بعد فرقۂ یسوعی (JESUITS) ملک سے نکال دیا گیا تھا، لوگ مذہبی فرقوں کے جھگڑوں سے تنگ آگئے تھے اور ان کا دل مذہب کی طرف سے بیزار تھا۔ فلسفیوں نے جدید معلومات کی بناء پر بائبل اور مسیحیت پر حملے کرنا شروع کر دئے۔ اور اصحاب کلیسہ اسقدر برہم ہوئے کہ جب والٹیر (VOLTAIRE) نے اپنے "فلسفیانہ خطوط" (PHILOSOPHICAL LETTERS) شائع کئے تو اس کی جلد فراہم کر کے جلایا گیا۔ اور غریب والٹیر کو جان بچانے کے لئے ایک نواب کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقۂ اعلی کی رہی سہی وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئی۔

والٹیر کا ہمعصر روسو (ROUSSEAU) بھی موحد تھا۔ اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسیح کا حلۂ تقدس چاک کر کے پھینکدیا۔ اور لوگوں پر ثابت کیا کہ جس یسوع ناصری کو مسیحی دنیا خدا مان رہی ہے اس میں ذرہ بھر بھی الوہیت نہ تھی اور وہ محض ایک سیدھا سادہ پرہیزگار بندہ تھا۔ الغرض یہ عقیدہ تمام فرانس میں پھیل گیا۔ اور وہاں سے ہسپانیہ و جرمنی وغیرہ پہونچا اور اس طرح اکثر بلاد یوروپ کا مذہب "والٹیریت" ہو گیا۔ ہر جگہ درباروں اور بازاروں میں والٹیر کی تصانیف کا چرچا تھا۔ اور ملک کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اس کی کتابیں پڑھی جاتی ہوں۔

مسیحی مقتدایان دین نے والٹیر کو دجال (ANTI-CHRIST) بنایا اور جس قدر ہو سکا گالیاں دیں۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دنیا اسی دجال کی پیرو ہوتی گئی۔ اسی زمانہ میں یوروپ کا اہم ترین واقعہ انقلاب فرانس رونما ہوا۔ جس نے اگرچہ ملک کے نظام حکومت کو تہ وبالا کر دیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی آزادی اور تقویت پہونچائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس نے تین نہایت زبردست

اور سحر بیان اہل قلم طامس پین (THOMAS PAINE) روسو (RAUSSEAU) اور والٹیر (VOLTAIRE) پیدا کئے۔ یہ تینوں خدا پر ایمان رکھتے تھے لیکن وحی کے قائل نہ تھے۔

اس کے بعد یورپ میں "مشککین" (SCEPTICS) کی ایک جدید جماعت پیدا ہوئی جنھوں نے ایمان باللہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ یہ لوگ ملحد (ATHEISTS) یا مادئین (MATERIALISTS) کہلائے۔ اس جماعت میں بھی بڑے بڑے اہل قلم لوگ تھے۔ مثلاً دیدرو (DIDEROT) ہولباش (HOLBACH) قندورسے (CONDORCET) اور ہلویتیس (HELVETIUS) یہ لوگ فیلسوفوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور اُن کی قیادت میں مذہب کے خلاف بغاوت برابر بڑھتی رہی۔

یہ ریب و شک کوئی "ہوا کا رُخ" نہ تھا کہ مٹ جاتا۔ بلکہ توسیع علوم و فنون کے ساتھ اس میں زیادہ شدت و عمومیت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ فرانس کے "حکماء" کے تشکک پر گہرا علمی رنگ چڑھ گیا۔ اور فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ (DESCARTES) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جانوروں میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے "روح" (SOUL) کہا جا سکے۔ اسکے نزدیک ایک بندر یا عقاب کا جسم "مشین" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

علاوہ ازیں ڈیکارٹ نے دنیا کے سامنے ایک نظریہ ارتقاء یہ بھی پیش کیا کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگاں سدیم یا ذرات نور (NEBULA — COSMIC DUST) سے پیدا ہوئے ہیں اور اسطرح گویا ذات واجب الوجود کی ہستی کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ اٹھارہویں صدی کے اخیر تک اس تحریک میں علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا اور بائبل کی نکتہ چینی ایک علمی مشغلہ ہو گیا۔ یعنی لوگ اصل عبرانی بائبل کا بہت زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے لگے اور اس تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبرانی عہد نامۂ عتیق کا راز فاش ہو گیا۔ اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ قدیم صحف انبیاء بنی اسرائیل مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں۔ جن کو بہت کچھ تحریف و ترمیم کے بعد ایک جگہ مدون کر دیا گیا ہے۔ اور یہ کام مقتدایان دین یہود نے عیسیٰ سے چند صدی پیشتر کیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے بائبل کی تنقید اعلےٰ کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہم مختلف زمانوں کی اُردو یا فارسی زبانوں میں تفریق و تمیز کر سکتے ہیں۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ زبان ولی دکھنی کی ہے۔ یا میر کی۔ انشا کی ہے یا داغ و غالب کی اسی طرح جدید فن تنقید کے ذریعہ سے قدیم صحف بنی اسرائیل یا تالمود کے زمانۂ تصنیف کا یقین ہو جاتا ہے۔ جدید علوم خصوصاً نظریۂ ارتقاء نے توریت کے باب پیدائش کی بُری طرح دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور اب چونکہ آثار قدیمہ کے اکتشاف سے صحیح تاریخی معلومات حاصل ہو چکی ہے۔ اس لئے بائبل کی تاریخی نوعیت بھی خاک میں مل گئی ہے۔

اسی زمانہ میں فن تاریخ نے بھی علمی صورت اختیار کر لی۔ ہیوم (HUME) اور گبن (GIBBON) نے قدیم تاریخی روایات و حکایات کو معیار درایت پر کس کر ایسی تاریخیں لکھیں کہ اُن کے مقابلہ میں تمام قدیم تاریخیں داستانیں ہو کر رہ گئیں۔ خصوصاً گبن کی تاریخ کے ایک باب نے جو "عروج مسیحیت" پر ہے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس تحریک کو اور زیادہ

تقویت پہونچائی۔ گبن ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عالم البشری کی تاریخ اساطیر الاولین سے معریٰ کرکے لکھی۔ اور جس طرح مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لاپلیے (LAPLACE (1749-1827) اور جرمن فلسفی و ہیئت داں کانت (KANT (1724-1804) یہ نظریہ قائم کرکے کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگان "سدیم" یا "لطخات سحابیہ" یا "ذرات نور" (NEBULAE) کے ذریعے سے پیدا ہوئے ہیں کسی خالق السماء کی ضرورت باقی نہیں رکھی، اسی طرح گبن نے بھی ثابت کردیا کہ تاریخ انسانی میں بھی کسی خالق الارض کا ہاتھ نہیں ہے۔ الغرض جدید علم تاریخ نے تمام خرافی قصے صفحات تاریخ سے نکال کر پھینک دئے اور ثابت کردیا کہ تاریخ عالم کا نشو و نما اصول ارتقاء کے ماتحت ہوا ہے۔

جدید علم تاریخ کا ایک اثر دنیا پر اور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ دنیا قدیم یونانی و رومی تمدن و شائستگی کی مداح ہوگئی۔ اور ان کے قدیم علوم و فنون از سر نو زندہ ہوگئے۔ اب تک مسیحی دنیا قدیم یونانیوں اور رومیوں کو مشرک و بت پرست سمجھ کر سزاوار جہنم سمجھتی تھی۔ لیکن جدید علم تاریخ نے ثابت کردیا کہ عہد نامہ جدید یعنی مجموعہ اناجیل میں ایک بھی پاکیزہ خیال یا تعلیم ایسی نہیں ہے جو اقوال افلاطون (PLATO) یا حکمائے "رواقیین" (STOICS) کی تعلیمات میں موجود نہ ہو۔ اس انکشاف نے ارباب تشکیک کے ہاتھوں میں جدید حربہ دیدیا اور وہ اور بھی زیادہ قوی ہوگئے۔ اس کے بعد حفریات اثری (ARCHEOLOGICAL EXCAVATIONS) کا دور شروع ہوا۔ جب نپولین اعظم نے مصر فتح کرلیا تو یوروپ کے صدہا علماء مصر پہونچ گئے۔ اور انہوں نے آثار برآمد کرکے بائبل کی تاریخ اور روایات کو اور بھی زیادہ مشکوک کردیا۔ اسکے بعد جب حفریات بابل و نینوا سے دنیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ جب یہاں کے آثار برآمد ہوئے تو مٹی کی تختیوں اور منقوشات اشوریہ (CUNIFORMS) وغیرہ سے عجیب غریب تاریخی حالات معلوم ہوئے اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء بنی اسرائیل نے جو روایات و حکایات دنیا کے سامنے الہامی کہہ کر پیش کی تھیں وہ در حقیقت روایات بابل و نینوا کا مجموعہ ہیں جن کو مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد پیش کردیا گیا۔ بابل و نینوا میں جو روایات پانچ چھ ہزار برس پیشتر رائج تھیں وہی در حقیقت "اسرائیلیات" بن گئیں۔ تخلیق عالم، پیدائش آدم و حوا، جنت عدن۔ ہبوط آدم۔ طوفان نوح وغیرہ کی تمام اسرائیلی روایات لفظاً بہ لفظ بابلی روایات ہیں۔ ان انکشافات کے باعث قصص بائبل سے لوگوں کا ایمان اٹھ گیا اور وہ وحی و الہام کے بھی منکر ہوگئے۔ اور جب انہوں نے توریت کی کتاب پیدائش کے حالات کو علم طبقات الارض کی روشنی میں دیکھا تو وہ بائبل سے اور زیادہ بدگمان ہوگئے۔ کیونکہ یہ روایات قدیم بابل و نینوا میں اس وقت رائج تھیں۔ جب عبرانیوں کو لکھنا پڑھنا تک نہ آتا تھا۔

آثار قدیمہ کے ساتھ ہی ساتھ فلسفہ نے بھی لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ جب عقیدہ "الہیت" (DEISM) نے وحی و الہام کے عقیدہ کی بیخ و بنیاد کو متزلزل کردیا۔ تو لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہستی روح اور وجود باری تعالے کو منطقی دلائل کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے۔ کیونکہ جب تک ان دونوں کا وجود ثابت نہ ہو جائے وحی و الہام لاشے محض ٹھہرتے ہیں۔ یعنی وحی سے پہلے یہ ثابت کرنیکی ضرورت ہے کہ کوئی وحی بھیجنے والا موجود بھی ہے۔ الغرض فلسفیوں

نے جملہ اسباب و علل سامنے رکھ کر بحث کی۔ بہت سے دلائل غیر اطمینان بخش ثابت ہوئے اور اس طرح عقائدِ مذہبی کو اور زیادہ صدمہ پہونچا۔

وہ آخری چیز جس نے عقائدِ مذہبی پر ضرب کاری لگائی "سائنس" (SCIENCE) ہے مختلف علوم متداولہ نے ستاروں، پھولوں، پتھروں، جانوروں، اعضاءِ جسمانی، جوہر مادی، وغیرہ کی نسبت وہ رازہائے سربستہ منکشف کئے کہ دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ ہر شخص سائنس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا، علاوہ ازیں سائنس نے وہ مہندسی و کیمیاوی کارنامے پیش کئے کہ ان پر کسی شخص کو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لئے جب سائنس میدان میں آیا تو لوگ اسکی طرف اسقدر زیادہ مائل ہوئے کہ تاریخ یا فلسفہ کے بھی اتنے گرویدہ نہ ہوئے تھے۔ مذہب و سائنس میں آویزش اسوقت سے شروع ہوئی جب ڈارون (DARWIN) کی کتاب "مصدر انواع" (ORIGIN OF SPECIES) شائع ہوئی۔ ڈارون کا کمال یہ ہے کہ اس نے قانونِ ارتقاء کو اس خوش اسلوبی اور واقعاتی بنیاد پر پیش کیا کہ ہر شخص کی توجہ اس طرف مائل ہو گئی۔ پادریوں کو نظریہ ارتقاء سے اس لئے سخت مخالفت پیدا ہوئی کہ از روئے بائبل آدم کی پیدائش کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے انسان کے بنائے ہوئے وہ آلات حجری پیش کر دئے جو پندرہ بیس ہزار سال پیشتر کے بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بائبل کی طرف سے مینارِ بابل اور اختلاف السنہ کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ لیکن سائنس نے انیسویں صدی میں ایک جدید علم کی بنیاد ڈالی جسے عرفِ عام میں "علم الالسنہ" (PHILOLOGY) کہتے ہیں۔ اس علم نے تحقیق و تدقیق کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ سنسکرت، فارسی اور اکثر یورپین زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہیں گویا وہ سب ایک ہی قدیم زبان کی شاخیں ہیں۔ اور اس طرح بائبل کی روایت دربارہ اختلاف السنہ غلط قرار پاتی ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے نوح کے زمانہ میں تمام دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ اور دنیا کی آبادی کو صرف چھ ہزار سال گذرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے طبقات الارض کی مدد سے ثابت کر دیا کہ کرۂ زمین کی خشک سطح رفتہ رفتہ کروروں برس کے بعد بنی ہے اور زمین کی ساخت بھی قانونِ ارتقاء کے ماتحت ہوئی۔

بائبل کی پہلی آیت یہ ہے کہ ابتداء میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ لیکن فلکیات نے ثابت کر دیا کہ اجرامِ سماوی دفعتاً نہیں بنے۔ بلکہ قانونِ ارتقاء کے ماتحت رفتہ رفتہ سدیم یا ذراتِ نور سے بنے ہیں۔

الغرض موجودہ زمانہ میں انسان کے قلب و دماغ دونوں مذہب سے باغی ہو گئے ہیں۔ اور اب ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس کے زمین و آسمان بالکل نئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا۔ کہ اب نسلِ انسانی اور ہی کچھ ہو گئی ہے اس کی زندگی و معاشرت ملل سابقہ سے قطعی جداگانہ ہے، اس کے آئین و قوانین کی توضیع و تسوید عرش بریں پر نہیں ہوتی۔ اسکا دستور العمل لوحِ محفوظ سے نقل ہو کر نہیں آتا بلکہ انھیں کے دماغ ان کو سوچتے اور انھیں کے فاؤنٹن پن انھیں ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔

انسانی خیالات و معتقدات کی کایا پلٹ سب سے زیادہ ان انکشافات نے کی ہے جو فلکیات سے متعلق ہیں۔ اب یہ امر بھی متحقق ہو گیا ہے کہ کس ستارہ کی عمر کتنی ہے۔ اگر کُن فیکون کے ساتھ ہی تمام اجرام سماوی معرض ظہور میں آئے ہوتے تو خواہ وہ "سبع شداد" ہوتے یا نجوم لاتعد و لاتحصٰے ان سب کی عمریں برابر ہوتیں۔ لیکن سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مختلف ستاروں کی عمروں میں اربوں سال کا تفاوت ہے۔ اور بہت سے اجرام سماوی ایسے ہیں جو ہنوز سحابی یا سدیمی حالت میں ہیں۔ گویا ہماری کائنات ہی نئی ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور ہماری دنیاوی زندگی ابدی سلسلۂ حیات کی ایسی حقیر کڑی ہے، جس کے لئے سوال و جواب، میزان و صراط اور بہشت و دوزخ کا طول امل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب لکھنا پڑھنا صرف مقتدایان دین تک محدود تھا۔ مسلمانان ہند چھوٹی قوموں کو سوا پارہ سے زیادہ قرآن اور "راہ نجات" یا "صبح کا ستارہ" سے زیادہ فقہ نہیں پڑھنے دیتے تھے اور ہندوؤں کے نزدیک تو کسی شودر کے کانوں تک وید منتر کا پہونچنا بھی گناہ عظیم تھا۔ لیکن اب دنیا بدل گئی ہے۔ زمانہ اور ہے۔ اب کوئی گاؤں اور قصبہ اسکول سے خالی نہیں ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں درجنوں ہائی اسکول اور متعدد کالج نظر آتے ہیں۔ قدم قدم پر یونیورسٹیاں کھائی دیتی ہیں۔ کوئی قوم ایسی باقی نہیں جس نے اپنا جداگانہ ادارہ تعلیم قائم نہ کر لیا ہو۔ جگہ جگہ بڑے بڑے کتبخانے اور دار المطالعہ قائم ہیں ابتدائی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ اور چند سال بعد دنیا میں کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے گا۔ لاسلکی و ریڈیو نے زمین کی طنابیں کھینچکر فاصلۂ زمان و مکان کو محو کر دیا ہے اور ایک شخص دہلی یا لکھنؤ کے کسی مکان میں بیٹھکر، لندن۔ امریکہ و جاپان کی باتیں اسی طرح سُن سکتا ہے گویا اس کے سامنے کوئی شخص جلسہ میں تقریر کر رہا ہے۔ الغرض اب دنیا بہ لحاظ علم و فضل بہت دور پہونچ گئی ہے۔ اور ناممکن ہے کہ قدامت پرست مقتدایان دین کی حکومت عرصہ تک قائم رہے

پہلے برسوں میں ایک کتاب کی نقل ہوتی تھی۔ لیکن اب ایک دن میں لاکھوں نسخے تیار ہو سکتے ہیں علاوہ ازیں سلسلۂ نقل و حمل اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب دو ہفتہ کے اندر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ جاتی ہے۔

الغرض اب نئی زمین اور نیا آسمان ہے، ترکوں نے ادارۂ خلافت کو ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ وہ پانسو برس سے اس پر اپنی جانیں قربان کرتے چلے آتے تھے۔ ہندوستان میں جدید روح کے زیر اثر خود ہندوؤں نے بت شکنی شروع کر دی ہے اور پہلے جو پنڈت اور اونچی ذات کے ہندو شودر کے سایہ کو بھی ناپاک سمجھتے تھے اب وہ انھیں سے بغلگیر نظر آتے ہیں۔ چینیوں نے اپنی لمبی لمبی چوٹیاں کاٹ کر پھینکدی ہیں، اہل مصر اپنی معاشرتی، مذہبی اور سیاسی آزادی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ افریقہ کے حبشی بھی اب اس قدر روشن خیال ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی ملی حکومت علٰحدہ قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایران افغانستان جو اب تک مجتہدین اور ملاؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تباہ ہو رہے تھے اب رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں، ریاست میکسیکو کے لوگ مذہب سے اس قدر بیزار ہو گئے ہیں کہ وہ پادریوں کو نشانۂ بندوق بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور ہزاروں گرجا غیر آباد ہو کر مسمار ہوتے جا رہے ہیں۔

یقیناً یہ دنیا کا بالکل نیا دور ہے اور آج تک ایسا ذہنی انقلاب کرۂ ارض پر کبھی رونما نہ ہوا تھا۔ اور نہ اصلاح معاشرہ کا اس قدر زبردست جہاد اس سے قبل کبھی کیا گیا۔ اب مذہب کی جگہ "خدمت العباد" لیتی جاتی ہے اور ہزاروں قسم کے ادارے خدمت بنی نوع انسان کے لئے کھلتے جاتے ہیں۔ اب دنیا "دوزخ و جنت" کی حقیقت کو سمجھ گئی ہے۔ اب وہ "نفس مطمئن" کو اپنی جنت اور "ضمیر کی لعنت و ملامت" کو اپنا جہنم جانتی ہے۔ اب دنیا عبادت سے متنفر ہوتی جاتی ہے۔ وہ "عبادت" کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسے سلاطین مستبد کی خوشامد۔ الغرض یہ دنیا ایک نئی دنیا ہے۔ ایک انقلابی دنیا ہے۔ اور اس کے در و دیوار نعرہائے "انقلاب" سے گونج رہے ہیں (باقی)

نیاز

کیا آپ کو معلوم ہے کہ

ترجمہ تاریخ ادب اُردو چھپ کر تیار ہو گیا۔ جس سے زیادہ مکمل و جامع زبان اُردو کی کوئی تاریخ نہیں۔ تمام مشاہیر نظم و نثر کے تذکرے انکے کلام کے نمونے اور ستر کے قریب مشہور ادیبوں کی تصاویر معہ ایک زبردست انڈکس کے اسمیں شامل ہیں۔ بہت ضخیم ہر دو حصہ مجلد نہایت خوشخط چھپائی و کاغذ نہایت دیدہ زیب قیمت لعہ مترجم مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔

تذکرۃ الخواتین تمام شاعرہ عورتوں کی نہایت مختصر سوانحعمری اونکا کلام۔ حالات۔ ایرانی اور ہندوستانی دونوں جگہ کی صنف نازک کے کلام کا بیمثل و لاجواب مجموعہ۔ اس سے زیادہ مواد اس بارہ میں کسی تذکرہ نسواں میں نہ ملیگا۔ مولفہ مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی قیمت عہ چھپائی و کاغذ نہایت عمدہ

مذاہب الاسلام عجیب و غریب کتاب ہے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ یعنی اسلام میں جتنے مذہب اور جتنے فرقے اور جس فرقہ کے جو عقیدے اور رسمیں ہیں۔ جس فرقے کا جو بانی ہوا ہے وہ سب اس میں نہایت واضح طور پر درج کئے ہیں ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایک صفحہ پڑھکر بغیر ختم کئے کتاب کو چھوڑ دے۔ قیمت للعہ

دیوان خواجہ آتش اسمرتبہ اس دیوان کو نہایت عمدہ کاغذ پر بعد صحت و صفائی کے بعد چھاپا گیا ہے۔ قیمت عہ دیوان فوق ۱۲؎ دیوان غالب معہ اضافہ کلام جدید ۸؎ کلیات ناسخ بطرز جدید۔ عہ

دیوان خواجہ میر درد خواجہ میر درد کا ورد عاشقانہ کلام نہایت خوشخط معہ اعلیٰ رنگین خوشنما ٹائیٹل کے اسمیں ایک مقدمہ مولانا عبدالباری آسی کا شامل ہے جو حقیقتاً ایک لطیف اضافہ ہے۔ اسمیں خواجہ صاحب کے شاگردوں کے حالات و کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۱؎ منیجر نولکشور بک ڈپو لکھنؤ۔

اُپچ

نگار

ساری دنیا سے نرالی بات کہنے کا شوق، بعض لوگوں میں مرض کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ معمولی سی چیز کو اعجوبۂ روزگار بتانا، اور نہ صرف یہی بلکہ اُسے جملہ براہینِ منطقیہ اور دلائلِ فلسفیہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا، اُتنا ہی دشوار ہے جتنی کسی مسلم صداقت کی تکذیب ـــ مگر خدا کی وسیع دنیا میں خدا کی ایک مخلوق ایسی بھی ہے جو محض لطفِ مخالفت کے لئے، حقائق کو اکاذیب اور توہمات کو واقعات ثابت کرنے کی سعیِ لاحاصل میں، راتوں کی نیند کھو چکی ہے۔

قدرت کی اس عجیب و غریب جنس کی موجودگی کا علم تو مجھے بہت زمانے سے تھا لیکن کسی ایسے بزرگ سے، جو ان نادر خصوصیات کے جامع ہوں، اب تک شناسائی کا موقعہ میں ملا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کسی ذہنیت سے میں ڈرا کرتا تھا تو وہ یہی "کایا پلٹ" نقلِ ہیئت، یا بعض اوقات مسخِ صورت کو پسند کرنے والی ذہنیت تھی۔ میرا اپنی فطرت کے اعتبار سے کوئی انوکھا انسان نہیں ہوں، معمولی سی ترکیبِ جسمی، معمولی سے قوائے دماغی اور معمولی سے محسوساتِ قلب سے بڑھ کر نہ کبھی خود میں نے اپنے میں کسی چیز کا وجود تسلیم کیا نہ لوگوں نے مجھے یقین کرانے کی کوشش کی۔ پھر بالکل تقاضائے طبیعت ہے کہ میں اپنے قریب ایسے لوگوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتا جو انتہا پسندی، بیگانہ روی، حد سے بڑھے ہوئے استغناء، تمام دنیا سے جُدا اُسلوبِ فکر، سارے زمانے سے مختلف اندازِ کلام کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ تمام ملکوں اور تمام موسموں میں دن ہو، یا رات، صبح ہو، یا شام، دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں اور میرا یہ ایمان اس قدر "سخت و سنگین" ہے کہ جب کبھی کوئی ماہرِ ریاضی محض مجھے مرعوب کرنے کی خاطر، نہایت نازک اور ناقابلِ فہم حد تک دقیق طریقِ استدلال سے یہ بات ثابت کرتا ہے تو میں بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکتا ہوں ـــ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اُسکی فضیلت و علم کے احساس سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ ایک سادہ سی بات کو اسقدر پُرپیچ اور اُلجھے ہوئے طریقے سے ثابت کرنے کے لئے اتنا پریشان ہے۔ دو اور دو چار یقیناً ہوتے ہیں مگر اس کی کوئی دلیل نہیں، اگر ہے تو صرف اس قدر کہ یہ واقعہ ہے ناقابلِ انکار!

بہرحال ابتک یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اپنے حلقۂ احباب میں میرا کسی ایسے شخص سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ اسے اتفاق کہئے یا میری کوشش مگر ہوا یہی کہ میں ایسے لوگوں سے جو جدت طرازی کے نقاب میں حقائق کی سادگی کو مجروح کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، دور رہا۔

مگر آخر کار کل ساعتِ موعود آ ہی گئی! میں شام کے وقت اپنے ایک دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا نہایت دلچسپی

اور اطمینانِ خاطر کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ خادم نے اک ملاقاتی کارڈ لاکر میرے میزبان کے سامنے پیش کیا۔ وہ پہلے تو اس کارڈ کو دیکھ کر کچھ بیچین ہوئے، مجھے دیکھا، پھر کارڈ کو پڑھا، کچھ سوچا اور آخر کار مسکرا کر خادم سے کہا "یہاں لے آؤ"۔ خادم کے جانے کے بعد اُنھوں نے مجھے بتایا، کہ اُن کے اک بہت "عزیز اور مخلص" کرم فرما ابھی حال میں ہی ولایت کا حج کرکے تشریف لائے ہیں اور اسوقت وہی باہر موجود ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ نصیحت بھی کر دی کہ میں ہوشیار رہوں۔ وقت نہ تھا ورنہ میں اپنے دوست سے اس نیم شوخ اور نیم حریفانہ نگاہ کا سبب پوچھتا جو اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے مجھ پر ڈالی تھی، مگر میں اتنا ضرور سمجھ سکا کہ کوئی خطرہ قریب ہے اور حواس کو مجتمع کر لینا سخت ضروری۔

چنانچہ ان نووارد کا استقبال کیا گیا۔ میرے دوست نے مجھے اُن سے بہت سلیقہ سے متعارف کرایا اور میں نے اس غیر متوقع ملاقات پر اظہارِ مسرت کرنے میں مسابقت کی۔

میں ان "بازگشتگانِ دیارِ حبیب" کی صحبت میں جس لذت اور مسرت کا احساس کرتا ہوں وہ یقیناً ناقابل بیان ہے! کچھ تو اس لئے مجھے ان سے وابستگی ہے کہ ان حضرات کے دماغ اُس عملی قطعۂ زمین کی آب و ہوا کے اثر سے یکسر عملی بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح اگرچہ اپنی نزاکتِ حس پر یہ لوگ بہت زیادہ فخر نہ کر سکیں تاہم سب سے الگ چلنے کی وہ امنگ جو نیم تہذیب یافتگی نے اسقدر عام کر رکھی ہے، ان خشک مزاجوں میں مفقود ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی موجودگی مجھ جیسے مشرقی کے لئے دلچسپ نہ ہوتے ہوئے بھی پُرسکون ضرور ہوتی ہے۔ اور کچھ اس لئے بھی مجھے ان لوگوں سے عقیدت ہے کہ جس حسرتناک زبان میں یہ اُس "فردوسِ گمشدہ" کا ذکر کرتے ہیں، وہ مرثیہ اور قصیدہ، غزل اور مثنوی کا اک ایسا بیمثال مرکب ہوتا ہے۔ کہ تقریباً ہر مذاق کا شخص اُسکی داد دینے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے!

خیر۔۔ تو جہانتک ظاہری ہیئت اور وضع کا تعلق ہے مسٹر عاصم میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ آرائشِ لباس میں وہی نو غل، لئے دئیے رہنے کی وہی مخصوص عادت، حرکات و سکنات میں وہی دانستہ بے پروائی جو اس گروہ کی مشترکہ صفات ہیں ان میں بھی موجود تھیں اور یہ کافی وجہ تھی اس بات کی کہ میں اُنکی جانب سے مطمئن ہو جاتا۔ لیکن کچھ اپنے دوست کی نصیحت کے خیال سے، کچھ اُس غیر فطری فلسفیانہ چمک سے ڈر کر جو مسٹر عاصم کی آنکھوں میں مجھے نظر آئی میں خاموش تھا اور منتظر کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ دل میں بدگمانیاں، شکوک اور شبہات اک طوفان پیدا کر رہے تھے۔ یکایک مسٹر عاصم نے مجھ سے سوال کیا "کیا آپ واقعی مجھ سے ملکر بہت مسرور ہوئے ہیں؟ ابھی آپ نے فرمایا ہے!" سوال کی ندرت، طرز کی بیباکی، متکلم کی بے محل سنجیدگی نے مجھے مبہوت کیا برق زدہ سا کر دیا! میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا تحیر کبتک باقی رہا۔ مگر میں نے میزبان کے منھ سے یہ جملہ سُنا۔ "تو عاصم صاحب آپ کو اس میں کچھ شک بھی ہے؟" جس شوخ اور مجادلانہ انداز میں یہ سوال کیا گیا وہ اور بھی وحشت خیز تھا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔

"شک؟" عاصم نے بیباکی سے میرے دوست سے مخاطب ہو کر کہا "شک کیا معنی! مجھے یقین ہے کہ یہ

جملہ کہتے ہوئے آپ کے دوست کی مراد سوائے اس کے نہ کچھ تھی اور نہ ہو سکتی ہے کہ تعارف و ملاقات کے رسمی اصول کی پابندی کیجائے میں عادی ہوں کہ پابندیوں کے ایسے مظاہرے دیکھوں اور ضبط کروں۔ مگر ان غلط ساختہ آدابِ مجلسی کا مفہوم جہاں غلط بیانی ہوتی ہے میری قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے۔

"محبت اور الفت کی دنیا میں تو خیر میں سنتا ہوں، یہ نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے ملے اور غالباً فرطِ مسرت و انبساط سے اُس کا دماغ ماؤف اور عقل معطل ہو جائے۔ لیکن یہ شکل بہ حال اسوقت خارج از بحث ہے۔ پھر جب یہ صحیح ہے کہ کوئی ذی ہوش انسان کسی سے پہلی مرتبہ ملکر اسوقت تک خوش یا ناخوش نہیں ہو سکتا جبتک کہ اُسکے حالات سے فی الجملہ باخبری نہ رکھتا ہو، تو آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ وہ مجھ سے مل کر بہت مسرور ہوئے۔ یقیناً اک غلط بیانی ہے"

"میں جانتا ہوں کہ مشرق میں غلط بیانی بہت زمانے سے شاعری کا جزوِ لازم سمجھی جاتی رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں کے بہترین شاعر وہی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ دروغگوئی کو اک مستقل فنِ لطیف کی حیثیت سے پیش کیا۔ بہت ممکن ہے میں مشرقی ادب کی اس کمزوری کو نظرانداز کر دوں صرف اس لئے کہ ہر قوم کے ادب میں چند ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو دوسری اقوام کے ادب سے اُسے جُدا کرتی ہیں ہو سکتا ہے کہ یہی دروغگوئی مشرقی ادب کی انھی مابہ الامتیاز خصوصیات میں سے ہو مگر میرا عقیدہ ہے کہ شعر و ادب کے مختصر رقبہ سے باہر مشرق میں جھوٹ ہمیشہ ایک ناقابل عفو جرم سمجھا گیا ہے۔ اس کے برخلاف مغربی دنیا میں صداقت اور سچائی کی آئینہ دار اگر کوئی چیز ہے تو وہ وہاں کا ادب اور صرف ادب ہوتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے، کہ اک مصنف یا شاعر محض اظہار حق اور بیان واقعہ کی خاطر اپنی ادبی تحریرات کی شگفتگی اور اثر کو غارت کر دیتا ہے۔ ورڈزورتھ کو دنیا کی کوئی قوت، قبروں کے درمیانی فاصلوں اور ان کے گھنٹوں اور ایسی ہی فرسودہ مگر سچی باتوں پر شعر تصنیف کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ شعر بیرنگ ہوں تو ہوں غلط نہیں ہیں۔ مگر دنیا میں شاید ہی کوئی انکار کرے کہ مغرب کی عام زندگی میں جھوٹ اور غلط گوئی تقریباً ناقابل علاج حد تک سرایت کر چکی ہے۔ یہ وظیفۂ حیات اک جھوٹ کا محتاج ہے ہر فرضِ زندگی اک دروغ بیانی کے بغیر نامکمل! اس کی معمولی سی مثال لیجئے۔ جب آپ کسی اجنبی سے متعارف ہوں تو مغربی آداب کی رُو سے آپ پر لازم ہے کہ آپ خواستہ یا ناخواستہ اسپر اظہار مسرت کریں۔ آپ کا "اجتماعی ضمیر" آپ کو یہ بات کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ آپ اُس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ حالانکہ بیک وقت آپ کا "انفرادی ضمیر" اور خود اس شخص کا "انفرادی ضمیر" خوب جانتا ہے کہ اس میں بقدر یک ذرہ بھی سچائی نہیں۔ پھر بھی بشری نظام اخلاق کی قید و بند اُسے اُگلنے نہیں دیتی!

"مغرب نے بہت سے زہر مشرق کی رگوں میں اُتارے مگر سب سے زیادہ مُہلک، یہ سچائی اور جھوٹ کی طرف سے بے پرواہی کا زہر ہے جو تہذیب و شائستگی کے نام سے ہمارے حلق میں ڈالا جا رہا ہے! اور مشرق ہے کہ

ہر مغربی ادا، ہر مغربی طرز کی نقالی کو معراج کمال سمجھے ہوئے ہے!

"آپ خود سوچئے" یہ کہتے ہوئے عاصم نے میری طرف دیکھا مجھ سے ملے ہوئے ابھی آپ کو چند منٹ گذرے ہیں۔ غالباً آپ کو میرا پورا نام بھی نہیں معلوم۔ آپ کو کچھ خبر نہیں کہ میری طبیعت آپ کی افتادِ خیال سے کس قدر مخالف یا موافق ہے، آپ میرے نظریوں میرے اعتقادات سے قطعاً لاعلم ہیں مگر باایں ہمہ نہ واقفی، آپ بلا تامل، بغیر سوچے سمجھے، نہایت شد و مد کے ساتھ، اپنے نزدیک ایک حقیقت کبریٰ کا اعلان فرما رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ آپ کو مجھ سے مل کر بہت مسرت ہوئی! آپ کی لرزشِ آواز، اگر اس کی وجہ گھبراہٹ نہیں! آپ کا منکسرانہ تبسم، اگر یہ آپ کی عادت نہیں! آپ کی جھکی ہوئی نظریں، اگر یہ اظہار شرم نہیں۔ یقیناً آج کل کے شائستہ مطالبات ہیں میری جانب سے بھی اظہار مسرت کے لئے۔ مگر آپ مطمئن رہئیے میں اس مغربی جادو سے بچا ہوا ہوں اور سمجھ لیجئے کہ میں آپ کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کرونگا۔ جبتک مجھے اُسکی درستی کا وثوق نہ ہو جائے۔

"معاف کیجئے گا، میری عادت ہے کیا تو خاموش رہتا ہوں، یا بولتا ہوں تو پھر چپ نہیں ہوتا، جب تک میرا سامع، میرے دلائل کی مضبوطی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض تھک کر ہتیار نہ ڈالدے" میرے دوست کی طرف مخاطب ہو کر "چائے اور منگائیے یہ تو ٹھنڈی ہو چکی"۔

عاصم صاحب نے تقریر ختم کی تو میں نے سانس لیا۔ ہمارے میزبان نے گرم چائے منگائی اور اگرچہ شام کا باقی ماندہ حصہ نہایت دلچسپی سے کٹا مگر عاصم صاحب کا خوف میرے دل میں اب بھی باقی ہے میں وہاں بھی یہی سوچتا رہا اور تمام شب بھی اسی سوچ میں کٹی اور طے نہیں کر سکا، کہ عاصم کی گفتگو، جدت طرازی کا مظاہرہ تھی یا علالت دماغ کی علامت!

سخت غلطی کی، کم از کم وطن ضرور پوچھنا تھا! شاید کچھ پتہ چلتا

انیس احمد رشدی

تنقید ایک علم کی حیثیت سے دورِ حاضرہ کی پیداوار ہے ۔ یہ علم مغرب میں معراجِ کمال کو پہونچ چکا ہے، لیکن مشرقی زبانوں میں عموماً اور اُردو میں خصوصاً اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی مختصر اور ناکافی ہے۔ اول تو اردو کی عمر ہی کتنی ہے، پھر اس کے سرمایہ علوم و فنون کی کیا بساط؟ مزید برآں سیاسی تغیرات اور سماجی پراگندگی نے کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ اپنے علوم و معارف کو کھوٹا کھرا پرکھنے کے لئے ایک مستقل علم وضع کیا جائے

اُردو کے اہم عناصر ترکیبی تین ہیں :۔ عربی، فارسی، اور ہندوستانی زبانیں۔ لیکن بدقسمتی کہو یا جو کچھ سمجھو میرا دیانتدارانہ خیال یہ ہے کہ علمی حیثیت سے اُردو نے ہندوستانی علوم کے خزانوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا اور علمی خیالات اور اصطلاحات ایک حد تک عربی، پھر فارسی، اور سب کے بعد لیکن کافی مقدار میں مغربی زبانوں کی وساطت سے اُردو میں رُ د شناس ہوئے

عربی و فارسی جن ملکوں کی زبانیں ہیں اُن کے علوم و فنون خود ایک عرصہ دراز سے کس مپرسی اور جمود کی حالت میں پڑے ہوئے تھے اور سیاسی اختلال و علمی سرد بازاری نے انھیں ایک مدت سے موقع نہیں دیا کہ وہ ترقی کے میدان میں شریک مقابلہ ہو سکیں۔

ایک صبر آزما طویل سکوت اور خطرناک غفلت کے بعد اب کچھ عرصہ سے اِدھر ایران میں اُدھر مصر میں ہنگامۂ مغرب سے متاثر ہو کر علمی زندگی کے آثار نمودار ہو چکے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہاں روز بروز علمی ذخیرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اُن کا منتہٰ معارف ہنوز محدود ہے اور یہ ترقی ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہونچی ہے۔ جہاں پہونچکر قوموں کی ذہنی غلامی کی زنجیریں خود بخود ٹکڑے ٹکڑے ہو جایا کرتی ہیں

فارسی میں تو کہنا چاہیئے کہ علمی حیثیت سے تنقید کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ عربی کے قرونِ اولیٰ میں تنقید کا پتہ چلتا ہے مگر وہ زیادہ تر لغوی اور ادبی تنقید تک محدود تھی۔ اگر عربی سماج میں انتشار سرایت نہ کرتا اور اُسکے دارالعلوم بدستور ترقی پذیر رہتے تو بلاشبہ عربی میں تنقید موجودہ متمدن زبانوں کے دوش بدوش ارتقائی منازل طے کر چکی ہوتی۔ باقی رہیں مغربی زبانیں اور مغربی علوم و معارف تو ان سے استفادہ کا ابھی اُردو کو بہت کم موقع ملا ہے اور جو ذخیرہ منتقل ہو چکا ہے وہ ابھی اتنا کافی نہیں ہے جس پر تنقید جیسے وسیع و ہمہ گیر علم کی بنیاد رکھی جا سکے مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں اُ ۔ د میں علم تنقید روشناس نہ ہونیکے تین اسباب ہیں :۔

(۱) خود "اُردو" کی علمی بیمائیگی،

(۲) جن مشرقی زبانوں سے اُردو مستفید ہوئی اُنہیں علم تنقید کے متعلق کافی مواد موجود نہ ہونا۔ اور
(۳) مغربی زبانوں سے پورا پورا فائدہ حاصل نہ کر سکنا۔

یہ گزارش بھی بے محل نہ ہوگی کہ اُردو میں ادب و شاعری کے متعلق جو تنقیدی سرمایہ ہے اس سے ناواقف نہیں ہوں لیکن یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ "تنقید" کے وسیع اور ہمہ گیر مفہوم کے لحاظ سے یہ محدود سرمایہ، جو بیشتر سطحی ہے، علمی تشنگیٔ ذوق کو سیراب نہیں کر سکتا ——!

ذیل کا مضمون عربی سے لیا گیا ہے۔ ترجمہ کی ضروریات اور "مفہوم" کو "ہندوستانی" مانوس لباس میں پیش کرنے کی کوشش نے بقدر تبدیلیاں پیدا کر دیں کہ مضمون کو بمشکل ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اس لسانی زبان کے نقصان سے مجھے انکار نہیں۔ چونکہ موضوع بالکل نیا ہے اسلئے لغزشیں ہونا بھی اغلب ہے۔

علم تنقید میں اہل مغرب کی متعدد معرکتہ الآرا تصانیف ہیں۔ یہ علم اُن کی تاریخ میں قدامت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے تاہم موجودہ ترقی یافتہ شکل پیدا اسی وقت ہو سکا ہے جب صدیوں تک ارتقائی انقلابات کا تختۂ مشق بنا رہا۔ سب سے پہلے یونانیوں نے اس پر کتابیں لکھیں، ان سے رومیوں نے اخذ کیا اور رومیوں کے بعد یورپ نے موجودہ قوام نے اسوقت حاصل کیا جب قسطنطنیہ پر علم اسلام لہرایا اور یونانی علماء ترک وطن کر کے اٹالیہ چلے گئے۔ اطالیہ میں انہیں امراء و رؤساء کی دستگیری سے یہ موقع ملا کہ علوم و معارف کے ان خزانوں کو جو قدیم کتابوں کے بوسیدہ اوراق میں دفن ہو چکے تھے، دوبارہ منظرِ عام پر لائیں اور یہیں سے تمدن جدید کی بنیاد پڑتی ہے۔ یورپ بھی عرصہ دراز کی جہالت و مدہوشی کے بعد چونکا اور رفتہ رفتہ علوم و فنون کو ترقی ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ موجودہ حالت تک پہنچ گئے۔ انہی ترقی یافتہ علوم میں سے ایک "علم تنقید" بھی ہے۔

لیکن علم تنقید نے موجودہ مرتبہ اسوقت حاصل کیا ہے جب علمی روح کافی پھیل چکی تھی، علوم و فنون کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر ترقی کر چکے تھے، اور مسالک آراء میں اختلاف رونما ہو کر بہت سے گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ اس لئے تنقید کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی تاکہ صحیح و فاسد اور کھوٹے کھرے میں امتیاز کیا جا سکے، مثلاً اہل مغرب کے یہاں نظم کی بہت سی قسمیں ہیں جن کے پورے پورے استیعاب کے لئے ایک مستقل رسالہ درکار ہے۔ ان میں زیادہ اہم اور بڑی قسمیں تین ہیں: پہلی قسم میں وہ نظمیں شامل ہیں جو قصص سے متعلق ہیں، دوسری قسم میں راگ اور راگنیاں داخل ہیں، اور تیسری قسم میں تمثیلی نظمیں شمار کی جاتی ہیں۔ یہ تین بڑی قسمیں بہت سی ضمنی فروع پر پھیل جاتی ہیں۔ قصصی نظموں میں بعض محض تخیلی ہوتی ہیں جیسے ہومر کی الیڈ (ILIADE) بعض میں کوئی واقعہ نظم کیا جاتا ہے جیسے (LEGENDE DES SIECLES) تمثیلی نظموں کی دو مشہور قسمیں ہیں، یعنی

۱؎ "تمثیل"، یعنی ایکٹ کرنا۔ "تمثیلی" منسوب بہ تمثیل (مترجم)

ٹریجڈی (المیہ) اور کامیڈی (طربیہ) جیسے مولیئر کا بخیل" نظم کی دوسری اقسام بھی ہیں جنھیں اقسام ثانویہ (GENRES SECONDAIRES) کہتے ہیں۔ انمیں وہ حکایات بھی شامل ہیں جو حیوانات کی زبان سے بیان کی گئی ہیں (FABLE) جیسے کلیلہ و دمنہ اُردو میں مفصلہ بالا اقسام نظم میں سے صرف ایک دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے جدید علوم بھی بہت کم معرض بحث میں لائے گئے ہیں۔ اسی لئے ہمیں تنقید کی ضرورت کم پڑی اور ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اوس میں ترقی بھی نہ ہو سکی۔

علم تنقید فرانس میں اوج کمال تک پہنچ چکا ہے۔ اہل فرانس کی فطری نفاست پسندی، جدت نوازی نے اوسے اس کے موضوع کے ساتھ خاص مناسبت پیدا کر دی ہے کیونکہ وہ لوگ طبعاً ذہین، تیز فہم، نکتہ رس، اور خوش طبع ہوتے ہیں تنقید بھی تمام علوم کیطرح ارتقائی منازل طے کرتی رہی، اور خوش قسمتی سے اسے ہر زمانہ میں ایسے لوگ ملتے رہے جو پورے انہماک کے ساتھ اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ یہانتک کہ وہ ایک مستقل علم بن گیا اور اسکے لئے خاص اُصول و قواعد وضع ہو گئے جس شخص نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور عالم ادب میں تنقید کے اثرات کو غور سے دیکھا ہے وہ محسوس کر سکتا ہے کہ تنقید کو ان علوم و فنون کی ترقی میں کہانتک دخل ہے۔ جن کی جانب اوسکی عنان توجہ منعطف ہو گئی۔

اہل فرانس کو اس علم کے ساتھ خاص شغف ہے اور نقاد کو وہ غیر معمولی عظمت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ اہل قلم ناقدین کی رائے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے کیونکہ عام طور پر جمہور ان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اور نقاد انھیں جس رنگ میں چاہتے ہیں رنگ دیتے ہیں۔ ایک مورخ کا قول ہے کہ اُنیسویں صدی میں فرانس کا ترقی یافتہ طبقہ نوے فی صدی ٹین (TAINE) کا رہین منت ہے۔ ٹین ایک مشہور ماہر تنقید ہے اور اپنے زمانہ کے نوجوانوں پر اسکا غیر معمولی اثر تھا۔

فرانس میں ناقدین کے اقتدار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ مذکورہ بالا نقاد ٹین نے کسی رسالہ میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں نفسیاتی مباحث کے متعلق فرنچ ماہر نفسیات استندہال (STENDHAL) کی اصابت رائے کو بہت سراہا۔ اسوقت تک استندہال کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور جو لوگ اس سے واقف تھے یا جنھوں نے اسکی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا وہ بھی اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس مضمون کو شائع ہوئے دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ استندہال کی شہرت کے غلغلوں سے فضا گونج اُٹھی اور اُس کے تمام ہمعصر اس پر رشک کرنے لگے۔

ٹین کا دوسرا تنقیدی معجزہ فرنچ فلسفی اگسٹ کومٹ (AUGUST COMTE) کے واقعہ میں ظاہر ہوا۔ یہ فلسفی اپنے زمانہ میں معمولی طور پر مشہور تھا۔ لیکن اس نقاد نے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ اسے روشناس کرایا تو اسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور اطراف عالم میں اس کے نظریات کی دھوم مچ گئی۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مصنف نے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی حالانکہ وہ درحقیقت اس کا مستحق نہیں تھا۔ اسکے بعد اُسکی کوئی تصنیف شائع ہوئی جسے عام طور پر پسند کیا گیا اور اُسکی ہزاروں جلدیں طبع کرالی گئیں۔ اسوقت ایک نقاد اُٹھا اور

تصنیف پر ایسی سخت تنقید لکھدی، کہ اوسکی تمام قدر و منزلت خاک میں مل گئی، مصنف اور اُس کے ہوا خواہ منہ دیکھتے رہ گئے اور دنیا نے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا حتیٰ کہ اب کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔

قدیم علم تنقید

قدیم سے جس قوم میں علوم و فنون کو رواج حاصل ہوا اوس میں تنقید کا بھی وجود پایا جاتا ہے لیکن گذشتہ صدی سے پہلے اسے ایک باقاعدہ اور با اصول علم کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا ماضی بعید میں صرف قواعد لغوی کی پابندی اور متقدمین نے ہر ایک علم و فن کے لئے جو اُصول و شرائط متعین کر دیئے ہیں۔ اون سے تطبیق نیز اونکی تصانیف سے جو قوانین مستنبط ہو سکتے ہیں۔ اون پر عمل درآمد میں تنقید کا انحصار کر دیا گیا تھا۔ گویا انھیں معیار حسن خوبی تسلیم کر کے انکی پوری پوری اتباع لازمی قرار دیدی گئی تھی۔ وہ اُصول و قوانین ذوق سلیم اور فطرت صحیحہ سے حرف بحرف منطبق ہوتے تھے کیونکہ متقدمین فطرت سے قریب تر اور فضول تصنعات سے منزہ تھے ان کی بڑی غرض یہ ہوتی تھی کہ ہر چیز کی ہو بہو بے تکلف تصویر کھینچ کر رکھدیں۔ ان کے بعد جو لوگ عیش و عشرت اور زیادہ تہذیب و تمدن کے زمانہ میں پیدا ہوئے انھیں یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ مثلاً ہر زبان کے دور اول کے شعرا، جن کی عادتوں کو مصنوعی تمدن و معاشرت نے خراب نہیں کیا تھا اور جو حقیقت کا بے نقاب چہرہ بناوٹ اور تصنع کی تمام کدورتوں سے پاک صاف فطرت کے آئینہ میں مشاہدہ کرتے تھے، سیدھے سادھے الفاظ میں شعر لکھتے چلے جاتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ریشم پر موتی ڈھلک آیا، یا گلاب کا ایک تر و تازہ پھول ہری بھری ٹہنی پر رکھا ہوا اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اوس مبارک عہد میں یہ سادگی پسند کیجاتی اور جو لوگ اُنکے بعد آتے وہ اُن کے اشعار کو معیار حسن و خوبی تصور کرتے۔ ہومر کی الیڈ (ILIADE)، شعرائے جاہلیت کے معلقات، شاہنامۂ فردوسی، بوستانِ سعدی، اور میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔

اردو میں علم عروض فارسی کی وساطت سے عربی سے آیا ہے۔ جب ہم غور کرتے ہیں کہ عرب میں شعر کے یہ اوزان مخصوصہ کیونکر پیدا ہوئے تو اس سے بھی مذکورہ بالا نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ جرجی زیدان نے "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" کے جزو اول میں لکھا ہے:۔

> "ظن غالب یہ ہے کہ اوزان شعر دراصل صحرا میں اونٹوں کی چال کے زیر و بم سے پیدا ہوئے ہیں اور تقطیع کی بنیاد اونٹوں کے قدم پڑنے کے موافق رکھی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ اہل عرب نے شعر کو سب سے پہلے شتربانی کے لئے استعمال کیا ہے اُن کی اصطلاح میں "حدی" کہتے ہیں۔ گویا اس کی ایجاد ہی اسی لئے ہوئی ہے۔ کیونکہ عرب اپنے وقت کا زیادہ حصہ اونٹوں کے معاملات میں صرف کرتا ہے..... جب اُنھوں نے اوزان وضع کر لئے تو ان کا گانا چند مقررہ راگوں میں مخصوص ہو گیا اور اُنھوں نے ہر ایک راگ یا لحن کے لئے ایک خاص وزن متعین کر دیا۔ چنانچہ بعض اوزان کو مرثیہ گوئی کیلئے اور بعض کو رزمیہ شاعری کیلئے مخصوص کر دیا..... اسلام کے بعد تک ہر راگ کو کسی ایک وزن کے ساتھ تخصیص حاصل تھی۔ ہمارے خیال میں اس طرح عرب میں شاعری کی ابتدا ہوئی"۔

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ عربوں کو صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کیلئے وقت اور فرصت کی کمی نہ تھی، اس لئے اُنھوں نے غور کرتے کرتے بالآخر اپنے اشعار کے لئے اوزان پیدا کرلئے اور اپنی نظم کی اقسام متعین کرلیں۔ شعراء متاخرین نے قدماء کے صاف کئے ہوئے راستے پر چلنا کافی سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ تہذیب تمدن کے ہنگاموں میں مبتلا ہو کر مزید اوزان شعریہ کی ایجاد اُن کی استطاعت سے باہر بھی تھی کیونکہ وہ فطرت سے دور پڑ چکے تھے۔

جو قواعد متقدمین کے دور سے مستنبط ہیں ان پر عملدرآمد کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک قسم کے تمام آثار فنی میں تشابہ پیدا ہو گیا۔ اور مرتب شدہ کلام میں وحدت کی علامات نمایاں ہو گئیں۔ اگر یہ قیود اٹھ جائیں تو ہم کو ذریع ادب میں خاص حدبندی اور مقررہ شرائط کا پتہ نہ چلتا۔ فرض کیجیے کہ اگر شعراء اپنے کلام میں اوزان معروفہ اور قواعد معلومہ کی رعایت ملحوظ نہ رکھتے اور اُن میں سے ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا تو اوزان اسقدر کثیر التعداد ہو جاتے کہ نظم کو نثر سے امتیاز کرنا اور اُس سے لطف اندوز ہونا متعذر ہو جاتا۔ چونکہ اوزان شعریہ جس صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ذہن میں محفوظ ہو چکے ہیں، اس لئے اگر کسی نامانوس وزن کی نظم ہمارے سامنے پڑھی جائے تو ہمیں اس میں مزہ نہیں آ سکتا اگرچہ شاعر نے نفاست الفاظ اور نزاکتِ معانی کے لحاظ سے اُس میں اپنے حسن انتخاب کا پورا پورا ثبوت پیش کیا ہو۔

جدید علم تنقید

اُنیسویں صدی گزشتہ صدیوں سے انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں علمی روح کی تعمیم کے ساتھ ممتاز ہوتی ہے۔ اس صدی میں علوم و معارف نے ایک ایسا رخ اختیار کیا ہے جسے صحیح معنوں میں "تجدید" کہہ سکتے ہیں۔ علمی جستجو کے طفیل میں، جو مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے، علوم و معارف کی عمارت، جدید مضبوط بنیادوں پر تعمیر کی گئی اور قدیم طریقے کو پس پشت ڈال دیا گیا، جس میں صرف آثار سلف اور بزرگوں کے موروثی عقائد و نظریات پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ منقولات کو چھوڑ کر قدیم علوم و فنون ـــ اگر سب نہیں تو اکثر ـــ ارسطو کی تصانیف پر مبنی تھے جو قدیم سے ہر علم و فن کے لئے مرجع اعلیٰ بنی ہوئی تھیں، اور مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔ جب عصر جدید کی روشنی پھیلی اور تمام مختلف قوموں نے اپنی اپنی جگہ پر دقیانوسی قیود سے آزادی حاصل کرلی تو یہ علمی روح تمام علوم و معارف میں سرایت کر گئی اور اہل فکر و تدبر نے متقدمین کے غیر ضروری اقتدار سے انکار کر دیا۔ کیونکہ کورانہ تقلید علمی و مادی ترقی کے راستہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل ہوتی رہی تھی۔ قدامت پرستی کا طریقہ ترک کرنے کے بعد اُنھوں نے ایک جدید راستہ اختیار کیا جس میں تمام اغراض سے بالاتر ہو کر طلب حقیقت کے جذبہ نے اُن کی رہنمائی کی۔

اس کے بعد اُنھوں نے علوم کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے، انھیں ترتیب دینے، ان کی اُصولی و فروعی تقسیم کرنے، اور اُن میں باہمی مناسبت و ارتباط کی توضیح کرنے کی جانب توجہ کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی مستقل علوم پیدا ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موضوع کے لئے نامزد ہو گیا۔ مثلاً اجتماعی مباحث کو لے لو! قدیم زمانہ سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور اکثر لوگوں نے جماعتوں کے احوال، احکام اور خصائل سے بحث کی ہے لیکن وہ دوسرے مباحث کے

ذیل میں ان اُمور کا بھی تذکرہ کردیا کرتے تھے، یہاں تک کہ گزشتہ صدی میں ایک علم کی حیثیت سے "اجتماعیات" کی تدوین ہوئی، اس کے اغراض و مقاصد متعین کردئے گئے اور وہ بذاتہ ایک مستقل علم قرار پایا "علم الاجتماع" اس حیثیت سے ایک جدید علم ہے آخری چند صدیوں میں عموماً اور گزشتہ صدی میں خصوصاً علوم و فنون کی ترقی اور اُن کے موجودہ حالت تک پہونچنے میں علم تنقید کو بہت کچھ دخل ہے۔

تنقید موجودہ مرتبہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے کئی دور سے گزر چکی ہے۔ ہم آئندہ اوس کے ارتقائی منازل اور اُس کے متعلق مختلف آراء و نظریات کا تذکرہ کریں گے۔

تنقید آج ایک قائم بالذات اور مستقل علم ہے، اسے دوسرے علوم کے ساتھ نگرانی اور فیصلہ کے علاوہ کسی قسم کا علاقہ نہیں ہے، اس نگرانی و فیصلہ میں اوس کا طریق کار مخصوص و متعین ہے، جیسے بیان کیا جائے گا، اوس کے مقاصد میں تشریح، فیصلہ، اور ترتیب، شامل ہیں۔ وہ آثار فنی کے اُصول و اسباب سے بحث کرتا ہے، اُن کے جزئیات و کلیات کو مرتب کرتا ہے، اور اُن کی علمی تشریح کرتا ہے۔ لیکن وہ لبسا اوقات علم کی حدود سے نکل کر کبھی فلسفہ اور کبھی فنون لطیفہ (آرٹ)، کے میدانوں میں جا نکلتا ہے۔ اس لئے وہ ایک ہی وقت میں علم بھی ہے، فن بھی اور فلسفہ بھی! وہ علم ہونیکی حیثیت سے تشریح کرتا ہے، اسباب بیان کرتا ہے اور نتیجہ نکالتا ہے، فن ہونیکی حیثیت سے صحیح عملی اُصول کا استخراج کرتا ہے اور قابل اعتماد صنعتی راستوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے، اور فلسفہ ہونیکی حیثیت سے احکام نفسی، اسباب بعیدہ اور مخفی لگاؤ کا انکشاف مدنظر رکھتا ہے!!

کتابوں کی تنقید کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تصنیف سے، موضوع سے، مصنف اور ماحول کے ساتھ انکے علاقہ سے، اور اس باب میں مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں جو دوسری تصانیف شائع ہوئی ہوں اونکے ساتھ موازنہ سے بحث کی جائے۔ اوسکی یہ غرض نہیں ہوتی کہ خالص علمی نظریات کی دیکھ بھال کے درپے ہو۔ کیونکہ نقاد کے لئے لازمی نہیں کہ ہر ایک زیر تنقید موضوع کے متعلق ایک خاص رائے بھی رکھتا ہو۔ اُس کے لئے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کی علمی تاریخ کا ماہر ہو اور اوس کے متعلق مشہور آراء سے پوری واقفیت رکھتا ہو تاکہ اُسے کتابوں کے موازنہ اور ناظرین کے لئے اونکا مرتبہ بیان کرنے میں آسانی ہو۔ اور اسی بنیاد پر تاریخ آداب و علم تنقید کا رشتہ اتصال مضبوط ہوتا ہے۔

جدید علم تنقید کے اغراض

تنقید کی تین مشہور اغراض ہیں:-
تشریح، فیصلہ، اور ترتیب!

جو شخص کسی کتاب کی تنقید کرنا چاہے اوسے لازم ہے کہ سب سے پہلے کتاب کو سمجھے اور اس پر اچھی طرح عبور حاصل کرے، پھر اُسکی پوری پوری تشریح کرے تاکہ اسکے متعلق آسانی سے صحیح فیصلہ کرسکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم موضوع کی متعدد کتابیں اسکے پیش نظر ہوں تاکہ انکے اعتبار سے زیر تنقید کتاب کا مرتبہ قائم کیا جاسکے اور اس سے پہلے یا دوسرے یا

تیسرے درجہ میں رکھا جا سکے۔

ہم کہہ چکے ہیں قدیم زمانہ میں تنقید موضوع کتاب کی تفصیل، اوسکے مضامین کے بیان اور معانی، لغت او صرف و نحو کے لحاظ سے اُسکی جانچ پر ختم ہو جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ ظاہری اور سطحی معنی میں محصور تھی گویا ناظرین کی سمجھ بوجھ کو مقاصد بعیدہ اور وسیع تر توجیہات کے ادراک سے معذور سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج تنقید کا میدان اپنی ہمہ گیری اور عظمت کے لحاظ سے بہت وسیع ہو چکا ہے۔ علماء تنقید جدید کی اصطلاح میں صحیح تشریح کا مفہوم سطحی تفسیر کے علاوہ یہ ہے کہ تاریخ آداب میں زیر تنقید کتاب کے درجہ کی وضاحت کیجائے، اُس موضوع کے خاص قواعد کے رو سے اُسکی جانچ کیجائے جس عہد میں کتاب لکھی گئی ہے اوس کے ساتھ کتاب کا علاقہ بیان کیا جائے تصنیف اور مصنف کے مابین رابطہ تلاش کیا جائے اور مصنف کا ماحول جسمیں اوس نے زندگی گزاری ہو دریافت کیا جائے۔

سب سے پہلی چیز جس کا جاننا ضروری ہے وہ مصنف کی زندگی ہے۔ اس لئے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اوس کا وطن معلوم ہونا چاہیئے ـــــ اُسکی "فضائی" حالت معلوم ہونی چاہیئے ـــــ وہ قوم یا نسل معلوم ہونی چاہیئے جس سے اُس کا تعلق ہو ـــــ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ خاندان جس میں اُس نے پرورش پائی فارغ البال تھا یا تنگدست ؟ ـــــ کیا اُس کے بچپن کا زمانہ اطمینان سے گزرا؟ ـــــ عام طور پر اس کی زندگی کامیاب رہی یا ناکام ؟ ـــــ اُس کی خانگی تربیت کیونکر ہوئی ؟ اور اُس نے کہاں کہاں کن کن اُستادوں سے تعلیم حاصل کی ؟ ـــــ اُسکی عام معاشرت، محبت، پرہیزگاری اور زندگی کی تلخی یا خوشگواری کی کیا کیفیت رہی ؟ ـــــ کیا دوسرے ممالک کی بھی سیاحت کی ؟ ـــــ کیا تجربہ اور بصیرت سے بہرہ یاب تھا ؟

پھر اُس کے اخلاق و عادات اور صحت جسمانی کے حالات دریافت کرنے چاہئیں، کیونکہ آدمی کی صحت کا اثر نمایاں طور پر اُس کے اخلاق اور اُسکی تصانیف پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد جس علم یا فن کی تصنیف ہے اُس کے متعلق مصنف کی آرائے خصوصی کا امتحان کرے، اپنی تصانیف میں اس نے جو جدت صرف کی ہو اُسے دیکھے اور مصنف کی تصنیفات اس موضوع کی دوسری تصانیف سے جس حیثیت سے ممتاز ہوں اوس پر نظر ڈالے یہ اُمور مصنف کے تعارف، اُس کی تصنیف کی شرح اور دونوں کے درمیان رشتۂ اتصال کے ادراک میں اعانت کریں گے۔

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تصانیف سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے مصنف کے خصائل طبعی اور ذاتی اخلاق کی شہادت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً ریاض خیرآبادی کی "خمریات" محتاج تعارف نہیں ہیں حالانکہ شاعر نے تمام عمر میں ایک دفعہ بھی پینا تو درکنار، شراب کو چھوا تک نہ ہوگا۔ اسی طرح امیر مینائی کا "صنم خانہ" ناواقف کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے یہ دیوان منشی صاحب کی آخر عمر کی کمائی ہے اور ایسے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ جب مصنف کو تقویٰ و طہارت کے سوا خیالات فاسد کبھی پریشان نہ کرتے ہوں گے۔ پھر یوں بھی منشی صاحب فرشتہ صورت فرشتہ سیرت اور رامپور کے مفتی تھے۔

لیکن دیوان کھول کر دیکھیے تو وہ کچھ "گل افشانی" کی ہے کہ نوجوانوں کی جوانی کو شرماتی ہے۔ مولف اور تالیف کے اس تناقض سے مولف کی پختہ شخصیت اور مضبوط قوت ارادی کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے جذبات و خواہشات پر کتنا قابو تھا۔

مصنف کی زندگی سے واقفیت کے بعد اس کے ماحول، اوس زمانہ کے عام رجحان خیالات اور علوم و فنون کی حالت معلوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مصنف جو باتیں لکھتا ہے۔ ان میں اپنی جانب سے بہت کم کوئی نئی بات داخل کرتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر وہی خیالات و نظریات ہوتے ہیں جو اوس کے زمانہ میں اور اس کے معاصرین میں عام طور پر رائج ہوں، ہماری آرا و افکار ہمارے ماحول کا ایک جزء ہوتی ہیں۔ ان افکار کا عموماً غیر محسوس طریقہ سے ہوتا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اچھوتی بات کہہ رہے ہیں حالانکہ ہم صرف نقال ہوتے ہیں۔ رائے عامہ کی ایسی مثال ہے جیسے ہوا، جس میں بجائے خود ہر شخص سانس لیتا ہے۔

نقاد کے لئے یہ امر باقی رہ گیا کہ کتاب کو اس کے موضوع کے لحاظ سے پرکھے۔ اور اس باب میں جو تصانیف پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ اون سے موازنہ کرے۔ کبھی مصنف ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے جسے اس کے پہلے دوسرے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں، غرض وہی کہ دوسروں سے علیحدہ اچھوتی چیز پیش کرے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی پیروی اور اُنکے راستہ پر چلنا لابدی ہوتا ہے اگرچہ کسی قدر انحراف کرکے جدت پیدا کر دیجائے۔ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی کتاب ایک نئی کڑی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جو زنجیر میں بڑھا دی جائے۔ یہ کڑی بقیہ کڑیوں سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے اور یہ ایک طبعی امر ہے کیونکہ اختلاف اور تنوع انسانیت کے دوامی ارتقا کے لئے لازمی شرط ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موازنہ کے لزوم اور اس کے افادہ کے متعلق ایک مشہور اُصول بیان کر دیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ کل کی معرفت کے بغیر اجزا کی معرفت اور اجزا کی معرفت کے بغیر کل کی معرفت محال ہے"۔ نقاد کے لئے بہتر ہے کہ زیر تنقید کتاب کا اس موضوع کی دوسری تمام تصانیف سے موازنہ کرے، نہ صرف اس زبان کی تصانیف سے جس میں یہ کتاب ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کی تصانیف سے بھی، کیونکہ دنیا کی تمام اقوام کو انسانیت اور فکر کے روابط باہم مربوط کرتے ہیں اور ہر ایک قوم کے علوم بقیہ اقوام کے علوم پر اثر انداز ہوتے ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں۔

تشریح کے بعد فیصلہ اور ترتیب کا درجہ ہے۔ فیصلہ تشریح کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ حالات کا طبعی تسلسل فیصلہ کو خود بخود ظاہر کر دیتا ہے۔ فیصلہ کے درست اور منصفانہ ہونے کے لئے نقاد پر لازم ہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کو نظر انداز کر دے، اپنی پسند پر معقولیت کو مقدم رکھے اور تنقید میں صحیح قواعد و قوانین اور وہ اُصول پیش نظر رکھے جنھیں ذوق سلیم نے تنقید کے لئے بنا قرار دیا ہے، مثلاً اگر اسے تاریخ سے لگاؤ ہے تو محض اس وجہ سے ادب لطیف کا مضحکہ نہ اڑانا چاہیئے۔ اور اگر وہ ذوق کو پسند کرتا ہے تو غالب کی عظمت سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ آزاد تنقید نگار پر لازم ہے کہ جس مصنف پر تنقید کر رہا ہے اوس کے بجائے اپنے نفس کو فرض کرے تاکہ

اوس کے اخلاق، امتیازات اور دوسرے حالات کی جانچ کرسکے۔ اور تصور کرے کہ وہ خود "مصنف" ہے، اسی کی طرح تصنیف و تالیف میں مصروف ہے، اور اُسی کے ماحول، مسکن اور زمانہ میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسطرح وہ مصنف سے پوری طور پر واقف ہو جائے گا اور اُس کے متعلق ایسا فیصلہ کرے گا جسمیں اظہار حقیقت کے سوا اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہوگی۔ نقاد کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اقسام فنون میں سے کسی خاص فن کے ساتھ اسے کوئی شخصی خصوصیت نہ ہو، نہ تالیف کے طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کی جانب اس کا ذاتی رجحان پایا جائے۔ تاکہ وہ تنقید کے فرائض غیر جانبدارانہ طریقہ پر ادا کرسکے۔

فیصلہ سے ترتیب کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ ترتیب کا یہ مفہوم ہے کہ زیر تنقید کتاب کا فیصلہ کے بعد صحیح درجہ متعین کیا جائے۔ مثلاً تم سحر البیان، گلزار نسیم، اور زہر عشق، پڑھتے ہو اور مذاق سلیم تمہیں مشورہ دیتا ہے کہ مثنوی میر حسن کو پہلے درجہ میں، گلزار نسیم کو دوسرے درجہ میں اور زہر عشق کو تیسرے درجہ میں جگہ دو! ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ دوسری تصانیف کے مقابلہ میں زیر تنقید کتاب کا صحیح مرتبہ متعین ہو جاتا ہے کیونکہ حسن و قبح نسبتی اُمور ہیں، جب تم کہتے ہو کہ زید دراز قامت اور حامد پست قامت ہے تو یہ کہنا اوسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب تمہارے ذہن میں ایک متوسط القامت انسان کا تصور موجود ہو۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایسے موقع پر یوں کہا جائے کہ فلاں سے بہتر اور فلاں سے کمتر بس، کسی چیز کی پہچان صرف موازنہ کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اور موازنہ لازماً ترتیب تک پہنچا دیتا ہے، سحر البیان، گلزار نسیم، اور زہر عشق تینوں اچھی مثنویاں ہیں۔ لیکن تم نے سحر البیان کو گلزار نسیم پر اور گلزار نسیم کو زہر عشق پر ترجیح دی۔ اسی طرح اگر گلزار نسیم سے بہتر کوئی مثنوی اُردو میں موجود نہ ہوتی تو گلزار نسیم کو "اولیت حاصل ہو جاتی"!!

ہمیں تنقید کے احسانات کے متعلق چند مختصر الفاظ کہنا باقی ہیں۔ یہ احسان آداب و فنون پر نہیں ہے بلکہ ان میں حصہ لینے والوں اور اُن کے مطالعہ کرنیوالوں پر ہے۔

ہر وہ شخص جو کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے اچھے بُرے میں امتیاز نہیں کرسکتا جنھیں قدرت کی طرف سے قوت تمیز عطا ہوتی ہے وہ کم ہوتے ہیں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنھیں دوسرے ضروری مشاغل نقد و تبصرہ کا موقع نہیں دیتے اور وہ بذات خود بہتر و ناقص میں تفریق کرنے سے مجبور رہتے ہیں۔

مصنفین بھی بہت ہیں۔ اور اُن کی تصانیف بھی بکثرت ہیں۔ ہر سال ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جن میں سے بہت کم ہمارے مطالعہ میں آتی ہیں اور ان میں بھی بسا اوقات ایسی کتابوں سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں دیکھنا وقت ضائع کرنیکے مترادف ہے۔ ایسے موقعہ پر "تنقید" کا فرض ہے کہ وہ مفید کتابوں کو نمایاں کرے اور ان کے مطالعہ کی ترغیب دلائے۔ مطالعہ کرنیوالوں کو اس سے مفید اور بر وقت امداد حاصل ہوگی، کیونکہ اس کی وجہ سے ان تصانیف کی جانب رہنمائی ہوگی جو فائدہ مند ہوں اور پڑھنے والے کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی مولفِ کتاب بھی تنقید کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے لوگوں کی توجہ مصنف کی جانب منعطف ہو جاتی ہے اور اسے جائز شہرت جس کا وہ حقدار ہوتا ہے، حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اگر کتاب ردی اور بیکار ہے اور کسی قیمت کی مستحق نہیں ہے تو تنقید اسے اور اس کے مصنف کو گوشہ گمنامی میں دفن کر کے فنا کر دیتی ہے اور اس طرح حق و باطل کا فرق زیادہ نمایاں اور صاف ہو جاتا ہے ——!

منظور سروش (بھوپالی)

ایک حکیم مطب

(شوکت تھانوی کے ایک مضمون کا اقتباس کہیں کہیں سے)

مطب کا عام منظر میدانِ حشر کی طرح کا ہوتا ہے ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی بولیاں بولا کرتے ہیں اور حکیم یا ڈاکٹر دن بھر نسخہ لکھا کرتے ہیں اگر کوئی شخص اپنے علاج کے لئے نہیں، بلکہ مطب کی سیر کرنے کو مطب میں چلا جائے تو اس کو عجیب کیفیت نظر آئے گی۔ کچھ لوگ مریض کو کندھے سے لگائے ان کو بہلاتے اور چمکارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کچھ لوگ کراہتے اور کھانستے ہوئے اور ہانپتے دکھائی دیں گے۔ کچھ قندیل پر بیٹھے ہوئے کانپتے ہوں گے۔ کچھ لوگ قارورے کو اخبار سے بار بار لپیٹ رہے ہوں گے۔ کچھ پردہ دار ڈولیوں کے پاس انجانے سے کھڑے ہوں گے اور اس جد و جہد میں مصروف ہوں گے کہ آپ کی ہم حکیم صاحب کے سامنے پیش ہو جائیں۔ کسی طرف سے آواز آتی ہوگی "حکیم صاحب رات سے حالت اگر ابتر آیا" "کوئی کتنا ہوگا" "حکیم جی کھانسی دم نہیں لینے دیتی" اور جب سب ایکدم سے بولتے ہوں گے تو مختلف آوازیں آتی ہوں گی کہ رات سے بخار ہے، کمر میں درد ہے۔ متلی نہیں جاتی، اختلاج ہو گیا ہے، ہر گھونٹ تیار ہے، پیروں پر ورم ہے، بھوک نہیں لگتی۔ حکیم جی اے حکیم صاحب۔ حکیم جی۔ اے حکیم جی بابو جی بابو صاحب وغیرہ وغیرہ۔

اس تمام شور و غل میں حکیم صاحب نہایت اطمینان کے ساتھ ایک ایک مریض کو بلاتے جاتے ہیں۔ اور چاہے ٹانگ میں درد ہو یا حال سنانے والے کی بیوی بیمار ہو۔ مگر حکیم صاحب نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ ضرور بڑھاتے جاتے ہیں۔ نسخہ دیکھتے ہیں اور سوال شروع کرتے ہیں۔ کیا غذا ہوئی؟ نیند آئی؟ اب افاقہ ہے؟ لیپ لگایا تھا؟ غرارہ کیا تھا؟ اجابت ہوئی ہے قبض کے ساتھ ورم میں کمی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب پانے کے بعد اب اگر مریض آیا ہے تو پیٹ ضرور دیکھتے ہیں اور دریافت کرتے جاتے ہیں یہاں درد ہے؟ یہاں؟ اچھا یہاں؟ اور پھر دریافت فرماتے ہیں کہ قارورہ لائے؟ ان تمام باتوں کے بعد آپ پھر نسخہ دیکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی طرف نظر اٹھا کر فرماتے ہیں۔ لکھو نسخہ حبوب [illegible] اول بجوشند و عقب آں گل بنفشہ کشمیری، برگ گاؤزبان، پوست بیخ کاسنی، تخم خطمی، تخم خبازی، عناب ولایتی، سپستاں، گلوئے نیب تازہ، خاکسی، [illegible] در آب جوشانیدہ صاف نمودہ شربت بنفشہ حل کردہ نیم گرم بنوشند۔ "الحمد او مہر اُو دلی ہاد و قاروہ" حیرت ہے کہ نسخہ لکھنے والے نسخہ میں "الحمد او مہر اُو دلی ہاد و قاروہ" کیوں نہیں لکھ جاتے اسلئے کہ یہ فقرہ بالکل نسخہ کے ساتھ ساتھ بولا جاتا ہے۔

یہ مضمون مکمل اور متعدد اسی طرح کے دلچسپ مضامین موجِ تبسم میں درج ہیں جو نئی جلد میں شائع ہوئی ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت معہ محصول دو روپیہ۔

نوٹ۔ اگر کتاب پسند نہ ہو واپس کر کے دام لے لیجئے۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

باب المراسلۃ و المناظرۃ

(جناب خورشید حسن صاحب۔ اٹاوہ)

مذہب کے بارہ میں یہ آخر آپ کر کیا رہے ہیں۔ اور آپ کا مقصود کیا ہے۔ براہ کرم صاف و صریح الفاظ میں اپنا نصب العین تحریر فرمائیے۔

(نگار) میں مذہب کے باب میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا شاعرانہ جواب تو صرف یہ ہے کہ

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر مسجد ویران ہے تو یہ نتیجہ ہے اس حقیقت کا کہ اس میں دلکشی باقی نہیں رہی اور اس لئے ایک غیر دلچسپ، غیر افادی اور لایعنی چیز کی بربادی سے یہی فائدہ اُٹھانا چاہیئے کہ اس پر کسی دلچسپ و مفید مشغلہ کی بنیاد قائم کیجائے۔ جسے شاعر اپنی خاص زبان میں "خانۂ در کوئے ترسایاں" سے تعبیر کرتا ہے۔ نہ یہ کہ پھر اسی ویران چیز کو تعمیر کرکے ایک مستقل یادگار ویرانی کی قائم کردیجائے شاعر کفر و الحاد کا مرتکب ہوا ہو یا اس سے بھی زیادہ اور کسی سنگین جرم کا، اسکی تحقیق و تعین میرے مسلک سے علیحدہ ہے، لیکن میری طرف سے جو جواب آپ کے سوال کا ہو سکتا ہے اور جسے میں خلوت و جلوت، دونوں حالتوں میں پوری سنجیدگی و عزم راسخ کے ساتھ ہر جگہ ظاہر کر سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں کہ

"میں دنیا میں صرف انسانیت ہی کو انسان کا اخلاقی مسلک دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر مذاہب کا وجود میرے اس مقصود کے منافی ہے تو میں مذاہب کا انہدام چاہتا ہوں"

دنیا کا کوئی مذہب الہامی یا خدائی اس معنی میں نہیں ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے مختلف مذاہب کی تعین خود کی کیونکہ ایسا تسلیم کرنا خدا کو غرض و احتیاج کا پابند ثابت کرنا ہے، حالانکہ اُس کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔ خدا کو مطلقاً اس کی ضرورت نہیں کہ دنیا میں کوئی مذہب ہو۔ اور نہ انسان کا اخلاقی یا تمدنی عروج و زوال اس کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض انسانی دماغوں کی ساخت فطرت کی طرف سے ایسی مکمل و مہذب تھی کہ اُنھوں نے اجتماعی و اصلاحی اُصول قائم کئے اور انکو مذہب و شریعت قرار دیا، اس لئے اگر اس اعتبار سے مذاہب و شرائع کو الہامی یا مذہبی قرار دیا جائے کہ وہ ایک ایسے انسانوں کے بنائے

ہوئے ہیں۔ جو خدا کی طرف سے ایسا سوچنے والا دماغ لائے تھے، تو بیشک درست ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ خدا ایسا چاہتا چاہتا تھا اور اس کا مقصود یہی تھا کہ دنیا میں اوقات مختلفہ مختلف مذاہب پائے جائیں اور ان مذاہب کی تعلیمات خود اُس نے روح القدس یا جبرئیل کو بھیجکر القا کیں تو میں اسکو خدا کی توہین سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے جو تخیل خدا کا قائم ہوتا ہے وہ سخت سفیہانہ اور غیر الہانہ ہے۔

بہرحال تمام مذاہب عالم، ذہن انسانی کی پیداوار ہیں، جو وقت و ماحول کے زیر اثر مختلف خیالات و تدابیر کو پیش کرتے رہتے ہیں اس لئے مذاہب کا پیدا ہونا، تمدنی ضروریات کا نتیجۂ لازم ہے، جسے ملک و زمانہ کے لحاظ سے مختلف ہونا چاہیئے۔ زمانۂ وحشت کے مذاہب میں بھی اتنی ہی وحشت پائی جاتی تھی جتنی اُس عہد کے حالات کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھی۔ اور جب آہستہ آہستہ انسان نے تمدنی ترقی شروع کی تو مذہب میں بھی اس لحاظ سے بلندی پیدا ہونے لگی۔

ابراہیم و داؤد کا مذہب اُس وقت کے لئے موزوں رہا ہوگا، لیکن اب وہ بیکار ہے۔ موسیٰ و مسیح کی تعلیمات اُس زمانہ کے لئے مناسب رہی ہونگی، لیکن اب لوگ ان میں سینکڑوں تاریخی و علمی نقائص نکال رہے ہیں۔

جس وقت تک تاریخ و جغرافیہ کی محدود معلومات نے دنیا کو بہت تنگ و مختصر سمجھ رکھا تھا، جبتک فلکیات کے ناقص علم نے کائنات کا مفہوم صرف کرۂ ارض قرار دے رکھا تھا اور جس زمانہ تک شیوع حالات، اشاعت خیالات، نشر معلومات اور توسیع تمدن و تہذیب کے ذرائع عام نہ تھے۔ ایک محدود ملک و جماعت، ایک مختصر قوم و ملت کے لئے وہ سب کچھ صحیح و درست تھا جو ادیان سابقہ نے پیش کیا، لیکن اب جبکہ کائنات کا مفہوم بدل گیا ہے۔ علمی تحقیقات نے دنیا کے ہر گوشہ سے تاریکی کو محو کر دیا ہے، زمان و مکان کے معنے کچھ اور ہوگئے ہیں، برق و ہوا پر حاکمانہ اقتدار انسان کو حاصل ہوگیا ہے، عقل و ذہن کی موشگافیوں نے سینکڑوں جدید مظاہر و آثار قدرت کے سامنے کھول کر رکھدئے ہیں، اشاعت اطلاعات کے لحاظ سے فاصلہ و زمانہ کا وجود باقی نہیں رہا ہے، زمین کی طنابیں کھینچکر دنیا کا ہر انسان دوسرے انسان سے ہر وقت تبادلۂ خیالات کر سکتا ہے اور علوم و فنون کی ترقیوں نے انسان کو صحیح معنی میں نائب خدا ہونے کا منصب عطا کر دیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے زمانۂ "ہوش و گوش" میں قدیم مذاہب کے اُصول کیا کام دے سکتے ہیں۔ اور دنیا کیونکر ان پر کاربند ہو سکتی ہے۔

پہلے ایک مذہب کا مخاطبہ صرف ایک مخصوص ملک و جماعت سے ہوتا تھا، اب اس کو ساری دنیا سے واسطہ ہے، مختلف تہذیب و تمدن کے لوگوں سے علاقہ ہے، مختلف ذہن و دماغ رکھنے والوں سے تعلق ہے۔ اور مختلف ذوق و طبیعت کے انسانوں سے عہدہ برآ ہونا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اب وہی مذہب اصلاح تمدن و اخلاق کا دعوے کر سکتا ہے، جو بہت زیادہ روشن، باخبر، اور وسیع الخیال ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو تمام رسم و رواج سے علیحدہ ہو کر، تمام مادی ذرائع نمایش سے جدا ہو کر صرف انسانیت کو مسجود قرار دے

اور صرف اخلاق کے اُن اصول کی تعلیم دے، جن سے بہ حیثیت انسان ہونے کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔
جواب سوال یہ ہے کہ کیا اس غرض کے لئے کسی جدید مذہب کی ضرورت ہے، یا کوئی انھیں قدیم مذاہب میں سے اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کا جواب آپ کو ماہ آیندہ کے رسالہ میں ملے گا۔ جب میں نے مقالۂ جاریہ (مذہب کی ضرورت) کو ختم کر کے اس مسئلہ سے بحث کروں گا۔

باب الاستفسار

(بسلسلہ استفسار ماہ گذشتہ)

حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ

(نگار) جناب سید اکبر حسین صاحب نے گذشتہ ماہ میں چار سوال تاریخ ہند و سندھ کے متعلق کئے تھے، جن میں سے تین سوالوں کا جواب گذشتہ ستمبر کے رسالہ میں دیا جا چکا ہے۔ ایک سوال باقی رہ گیا تھا کہ:-

"اگر کوئی شخص حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا مطالعہ اصلی ماخذوں سے کرنا چاہے تو اسے کن کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے اور ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے"

چونکہ اس سوال کا جواب زیادہ تفصیل کا محتاج تھا اس لئے ماہ گذشتہ کے رسالہ میں اس طرف اعتنا نہ کر سکا تھا اب میں اس مسئلہ پر توجہ کرتا ہوں۔

سب سے پہلے عہد بابر سے قبل اسلامی ہند کی تاریخ کو مختلف حصوں اور زمانوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور پھر غور کرنا چاہئے کہ ہر زمانہ کی تاریخیں کب اور کیونکر لکھی گئیں اور ان کی تالیفی اہمیت کیا ہے۔

سب سے پہلے اس تقسیم کے لحاظ سے سندھ کو دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد خاندان غزنی اور غور کے زمانہ کو لیکن یہ تینوں عہد وہ تھے جنکو حکومت ہند سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی حکومت حقیقتاً غلاموں کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جن کے بعد خلجیوں، تغلقوں، سیدوں اور لودیوں کا زمانہ آیا۔ چونکہ آپ صرف حملۂ بابر تک کی تاریخوں سے بحث چاہتے ہیں۔ اس لئے اس کے معنے گویا یہ ہوئے کہ صرف لودیوں کے وقت تک کی تحقیق درکار ہے اور اس طرح گویا حکومت سندھ اور حملۂ غزنی و غور کو ملا کر کل آٹھ زمانوں یا خاندانوں سے بحث کرنا ہے جن کی ترتیب یہ ہونا چاہئے۔

(۱) سندھ (۲) عہد غزنی (۳) عہد غور (۴) عہد غلام (۵) عہد خلجی (۶) عہد تغلق (۷) عہد سید (۸) عہد لودی۔

اس میں شک نہیں کہ کسی زمانہ کی سب سے بہتر و معتبر تاریخ وہی سمجھی جاتی ہے جو اسی زمانہ میں لکھی گئی

ہو، اس کے بعد اس تالیف کا مرتبہ ہے جو قریب تر زمانہ میں تحریر ہوئی ہو۔ چنانچہ اسی طرح بعد زمانی سے کلیۃً ایک تاریخی کتاب کی اہمیت میں کمی ہوتی جاتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی زمانہ کی تاریخ بہت بعد کو لکھی گئی لیکن لکھنے والے نے اسقدر محنت وکاوش، تحقیق وتدقیق اور شرح وبسط سے کام لیا کہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی۔ اس لئے میں یہاں اسکی پابندی نہیں کرونگا کہ پہلے ان تاریخوں کو لوں جو پہلے لکھی گئی ہیں اور پھر اس کے بعد، دوسری تاریخوں کو جو بعد میں مرتب ہوئیں۔ بلکہ یکجائی طور پر بغیر کسی خاص ترتیب کے ان کتابوں کا ذکر کرونگا، جن سے کسی عہد کے تاریخی حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اُسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ کتاب کس حد تک قابل اعتبار ہے۔

۱۔ تاریخ سندھ سے بحث کرنیوالے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے

مروج الذہب (مسعودی)، اشکال البلاد (ابن حوقل)، فتوح البلدان (بلاذری)، چچ نامہ، تحفۃ الکرام، تاریخ معصومی، تاریخ طاہری، بیگلار نامہ اور ترخان نامہ

اول الذکر دو کتابیں عرب کے مشہور ماہرین جغرافیہ کی ہیں اور سندھ کے حالات خود انھوں نے دیکھکر قلمبند کئے تھے۔ مسعودی سنہ ۳۰۰ھ میں سندھ آیا جب دولت عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا، اور سندھ سے دربار خلافت کا اقتدار اُٹھ چکا تھا۔ اس کے تقریباً تیس سال بعد خلیفۃ المطیع باللہ کے عہد میں ابن حوقل ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے چشم دید حالات لکھے۔ بلاذری (صاحب فتوح البلدان) اگرچہ مسعودی اور ابن حوقل سے قدیم العہد تھا، لیکن یہ سندھ نہیں آیا۔ اس نے فتوحات سندھ کے حالات دوسری معتبر کتابوں سے نقل کئے اور کچھ زبانی روایات سے بھی۔ کیونکہ اسوقت ایسے لوگ بھی زندہ تھے جنھوں نے سندھ کی ابتدائی فتوحات کو دیکھا تھا، انھیں میں سے ایک شخص ابوالحسن علی بن محمد المدائینی تھا جس نے خود بلاذری سے مل کر تمام حالات بیان کئے۔ بلاذری نے منصور ابن حاتم اور اس کی تاریخ سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور ابن الکلبی کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس لئے بلاذری نے جو کچھ سندھ کے متعلق لکھا ہے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی یہ تاریخ (فتوح البلدان) تاریخ طبری سے پہلے کی چیز ہے اور عربی زبان کی نہایت قدیم تاریخوں میں شمار کیجاتی ہے۔

فتوحات محمد قاسم کے متعلق سب سے زیادہ معتبر کتاب وہ ہے جسے عام طور پر چچ نامہ کہتے ہیں (چچ، اس برہمن کا نام تھا جو عربوں کے حملہ کے وقت سندھ میں حکمراں تھا) اس کتاب کی ابتدا میں اس کا نام فتح نامہ بھی درج ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کو الفنسٹن اپنی کتاب میں تاریخ ہند وسندھ سے تعبیر کرتا ہے، اور جس کا نام نور الحق صاحب زبدۃ التواریخ اور مصنف طبقات اکبری نے منہاج المسالک بتایا ہے

اصل کتاب عربی میں تھی جسے محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصرالدین قباچہ کے عہد میں فارسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اس کو اسماعیل بن علیؓ سے ملی تھی جو عثمان ثقفی کی اولاد میں سے تھے۔ اس کتاب کا زمانۂ تصنیف

۱۳۶ھ سے قبل رہا ہوگا۔ کیونکہ اس میں شہر منصور کا ذکر نہیں ہے۔ جو ۱۳۶ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ اکثر بعد کے مورخین نے اسی کتاب سے فتوحات سندھ کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔

تحفۃ الکرام (مصنفہ علی شیر قانع) کی تیسری جلد میں بھی سندھ کی تاریخ پائی جاتی ہے۔ اس میں ابتدا ان برہمنوں کے حالات سے کی گئی ہے جو عربوں کے فتوحات سے قبل سندھ میں پائے جاتے تھے، اور فتوحات عرب کا حال بالکل چچ نامہ سے لیا ہے۔ اس کے بعد اُن سمرا اور سما خاندانوں کے گورنروں کا حال ہے جو فرمانروایانِ دہلی کی طرف سے مامور ہوئے تھے پھر قبائل ترخان اور ارغون کی تاریخ درج کی ہے اور زاں بعد گورنران تیموریہ و خاندان کلہوڑا کا حال لکھ کر نصف جلد میں تاریخ سندھ کو ختم کر دیا ہے، باقی نصف حصہ میں اس عہد کے مشائخ و سادات، اولیاء و علماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۱۸۰ھ میں مرتب ہوئی۔ لیکن اس کو جلال الدین سیوطی کی تحفۃ الکرام نہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔

تاریخ معصومی، سندھ کی تمام تاریخوں میں سب سے زیادہ مفصل تاریخ سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس میں عہد اکبری تک کی تاریخ سندھ پائی جاتی ہے۔ اس کا مصنف محمد معصوم کرمانی الاصل تھا، لیکن یہ خود بھکر میں پیدا ہوا تھا یہ کتاب اس نے ۱۰۰۶ء میں مرتب کی اور فتوحات عرب کے متعلق اپنا ماخذ صرف چچ نامہ کو قرار دیا۔ ابعد کے مورخین نے (مثلاً بدایونی حیدر رازی، صاحب مآثر الامرا، مصنف باغ مانی و مرآۃ دولت عباسی) اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

میر طاہر محمد بن سید حسین ساکن ٹھٹھا کی تاریخ طاہری میں عرب حکومت کا کوئی حال درج نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے چچ نامہ اور تاریخ معصومی کا بھی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اُس نے زیادہ تر ترخان خاندان کی مدح سرائی کی ہے جس سے خود اس کا خاندان وابستۂ ملازمت تھا۔

بیگ لار نامہ کے مصنف کا نام نامعلوم ہے، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ بیگ لر خاندان کا ملازم تھا۔ اس کتاب میں پہلے مختصراً عربی فتوحات سندھ کا بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر ارغون خاندان سے بحث کر کے عہد امیر قاسم (بیگ لار) کے واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

ترخان نامہ یا ارغون نامہ ایک ہی کتاب کا نام ہے۔ اس کا مصنف سید جمال ابن میر جلال الدین حسین شیرازی تھا۔ یہ کتاب ۱۰۶۵ھ کی تالیف ہے جس میں زیادہ تر ارغون اور ترخان خاندانوں کے حالات سے بحث کی گئی ہے تاریخ معصومی سے اسکی ترتیب میں بہت مدد لی گئی ہے۔

الغرض تاریخ سندھ کا مطالعہ کرتے وقت ان کتابوں کو نہ بھولنا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ مروج الذہب، اشکال البلاد، چچ نامہ اور تاریخ معصومی کہ یہ فی الحقیقت اصل ماخذ ہیں، سندھ کی تمام موجودہ تاریخوں کے۔

اس سلسلہ میں ایک کتاب کا ذکر میں بھول گیا جو خاص اہمیت رکھتی ہے اس کا نام کتاب المسالک والممالک ہے جو عام طور پر ابن خورداذبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے مختلف ممالک کی جغرافی تحقیقات کر کے ۲۵۰ھ سے قبل اس کو تصنیف کیا۔ اس میں بھی سندھ کی ابتدائی تاریخ اسلامی کے متعلق بعض نہایت دلچسپ و کارآمد معلومات ملتے ہیں۔

(باقی)

ابوریحان بیرونی

(جناب فضل الٰہی صاحب۔ہوشیار پور)

ابوریحان مشہور ریاضی داں اور فلسفی ہوا ہے اور اسی کے ساتھ لفظ بیرونی کی نسبت اس قدر عام و معروف ہے کہ گویا اس کے نام کا کوئی جزو اصلی ہے۔

بیرونی کے معنے بظاہر یہی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ کسی مقام بیرون کا رہنے والا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جگہ کہاں تھی؟ اور اب بھی ہے یا نہیں؟

(نگار) اس کا نام محمد بن احمد تھا، ابوریحان کنیت تھی، یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ بیرون کی نسبت سے بہت مشہور ہے۔ لیکن گفتگو اسی میں ہے کہ بیرون واقعی کوئی مقام تھا یا نہیں اور اگر نہیں تھا تو اس کو بیرونی کہنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

شہرزوری اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں لکھتا ہے کہ "وہ بیرون میں پیدا ہوا جو سندھ کا نہایت خوبصورت شہر ہے۔"

حاجی خلیفہ نے بھی اسی بیان کا تتبع کیا ہے اور ابوالفداء نے بھی ابوسعید کی اسناد سے یہی لکھا ہے۔

فرانسیسی مورخ ام۔ رینان (M. REIN AND ـــــ) نے بھی اس کو سندھی ظاہر کیا ہے۔ اس لئے اب قابل غور امر یہ ہے کہ بیرون سندھ میں کس جگہ تھا۔ جہاں اب حیدر آباد (سندھ) واقع ہے، اسی کے قریب ایک مقام نیرون یا نیرون کوٹ ضرور واقع ہے۔

چونکہ نیرون صرف ایک نقطہ کے فرق سے بیرون پڑھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ مورخین سے پڑھنے

میں غلطی ہو گئی ہو۔

اور کیسی نے شہر منصورہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے دریائے مہران کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ نیرون سے ہوتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ بہرحال بیرون کوئی مقام سندھ میں نہ تھا اور اگر ہوتا تو خود ابوریحان اپنے جغرافیۂ ہند میں ضرور اسکا ذکر کرتا۔

صمعانی نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ بیرونی فارسی لفظ ہے جس کے معنے ہیں "باہر کا" اور ہر وہ شخص جو پایۂ تخت سے باہر پیدا ہوتا تھا اُسے بیرونی کہتے تھے صمعانی نے اسے خوارزمی لکھا ہے اور بہت سے مورخین نے اسی بنا پر اس کا خوارزمی ہونا ظاہر کیا ہے۔

مسٹر رالنسن نے بھی خوارزم کا باشندہ ہونا ظاہر کیا ہے، جس کا ثبوت یہ دیا جاتا ہے کہ خوارزم کی تقویم شمسی بہت مکمل تھی اور ابوریحان اس سے بخوبی واقف تھا۔

مسٹر ساشا (ALBERUNI'S INDIA) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "محمود غزنوی کے عہد میں خوارزم مامونی خاندان کے زیر حکومت تھا اور ابوریحان اپنے وطن خوارزم میں فرمانروائے عہد کا مشیر تھا۔ جب محمود نے خوارزم کو فتح کیا تو مال غنیمت کے ساتھ بہت سے قیدی بھی لایا۔ ان قیدیوں میں سے ایک ابوریحان بھی تھا۔"

الغرض ان تمام بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرون کوئی مقام نہ تھا، بلکہ نیرون تھا اور اگر ابوریحان ہندوستان میں پیدا ہوا ہوگا تو نیرون ہی میں ہوا ہوگا۔ لیکن نیرون میں پیدا ہونے کی تردید اول تو اس طرح ہوتی ہے کہ خود ابوریحان نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اسکو اپنے جغرافیۂ ہند یا تحقیق الہند میں اس مسئلہ پر لکھنے کا کافی موقعہ حاصل تھا، دوسرے یہ کہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان اول اول اسوقت آیا جب محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کی حکومت تھی اس لئے اسکو خوارزمی ہی ماننا پڑے گا اور بیرونی کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ وہی قرار دیجائیگی جو صمعانی نے ظاہر کی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے:-

برگس (BRIGGS) نے تاریخ فرشتہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو بہت مشہور ہے۔ اس نے بجائے ابوریحان کے انوریحاں لکھدیا ہے۔ اس پر بعض مورخین صرف اظہار حیرت کر کے خاموش ہو گئے اور بعض نے برگس کا اعتبار کر کے وہی انوریحاں لکھدیا ہے، حالانکہ حقیقت اس غلطی کی یہ ہے کہ برگس نے ابوریحان کو انوریحان پڑھ لیا (کیونکہ نقطوں کا محل بدلجانے سے بہ آسانی یہ غلطی ہوسکتی ہے) اور بعد کو بعض مورخین اسی غلطی پر قائم رہے، اور بعض نے تنقید بھی کی تو اس کا الزام فرشتہ پر رکھا کہ اس نے کیسے انوریحاں لکھدیا، حالانکہ ان غریبوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ غلطی خود اُن کی ہے جنہوں نے ابوریحان کو انوریحان پڑھا نہ کہ فرشتہ کی۔

معلوم ہوتا ہے نقطوں کی غلطی ابوریحان کی قسمت ہی میں لکھدی گئی تھی کہ پہلے بیرون و نیرون کے مسئلہ

نزاع ہوا اور پھر ابو ریحان کو انو ریحان بنا دیا گیا۔

RHYTHM کا ترجمہ

(جناب شمس الدین خانصاحب۔ دہلی)

انگریزی لفظ (RHYTHM) کا ترجمہ کیا ہونا چاہیے اور (RHIME) کو کیا کہنا چاہیے۔؟

(نگار) (RHYTHM) اور (RHIME) دونوں غالباً یونانی لفظ (ARITHMOS) سے نکلے ہیں۔ اسی (ARITHMOS) سے (Arithmetic) بھی ہے، جسے علم الحساب کہتے ہیں۔ اس لئے ان سب الفاظ میں باقاعدگی، نظام، اور اصول مقررہ کا مفہوم پنہاں ہے۔ یعنی جس طرح (Arithmetic) (علم الحساب) میں ایک قاعدہ و نظام پایا جاتا ہے، اسی طرح (RHYME) اور (RHYTHM) میں بھی ہونا چاہئے۔

(RHYME) خالص فن شعر کی اصطلاح ہے، جسے قافیہ کہتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی نثر میں بھی اس کی پابندی کی جاتی ہے، اور اس صورت میں وہ نثر بھی مقفی کہلاتی ہے۔

(RHYTHM) کا ترجمہ بیشک دشوار ہے، کیونکہ یہ لفظ بہت وسیع المعنی ہے، اور جہاں جس حالت میں کوئی باقاعدہ نظام، کوئی مقررہ توقیت، کوئی اصولی حرکت یا جنبش پائی جائے، وہاں اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم میں، وقت، مکان، حرکت، ترتیب، آواز اور تجسیم سب شامل ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک مجسمہ آتا ہے، جس کے اعضاء بہت سڈول ہیں، تو ہم کہہ سکیں گے کہ اس کے اعضاء میں (RHYTHM) پایا جاتا ہے، جسے لفظ تناسب سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے اعضاء میں منظم جنبش ہوتی ہے تو ہم اس حرکت کو (RHYTHM) کہہ سکتے ہیں، جس کا نام رقص یا حرکات رقصیہ بھی ہے۔ اور اگر آواز میں باقاعدہ وقف و امتداد پایا جاتا ہے تو وہ بھی یہی ہے جس کا اصطلاحی نام موسیقی ہے۔ اور اگر اس آواز میں الفاظ ہیں تو وہ شعر ہے یا نثر مقفی۔

الغرض اس لفظ کا مفہوم بہت وسیع ہے اور مختلف محل کے لحاظ سے اس کے اصطلاحی نام بھی مختلف ہیں جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا۔ لیکن جہاں حد تک موسیقی کا تعلق ہے، اس کے لئے عربی میں ایک خاص لفظ ایقاع پایا جاتا ہے جس کی جمع ایقاعات آتی ہے۔ اور جب یورپ نے منجملہ دیگر علوم و فنون کے موسیقی کا فن بھی اہل عرب اور ان کی تصانیف سے حاصل کیا تو ایقاع

سے بھی اُنھوں نے فائدہ اُٹھایا (جسے ہندی میں تال سم کہتے ہیں) چنانچہ اُن کے یہاں موسیقی کی اصطلاحوں میں جو الفاظ (OCHETUS) (HOKETUS) یا (HOQUETUS) پائے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایقاعات کی لاطینی صورتیں ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت قرطبہ کی یونیورسٹی علوم وفنون کا مرکز بنی ہوئی تھی اور تمام یوروپ کے طلبہ کھنچکر وہاں آرہے تھے۔ اسی وقت دیگر علوم کی کتابوں کے ساتھ فارابی کی احصاء العلوم اور کتاب الموسیقی کا بھی ترجمہ یورپین زبانوں میں کیا گیا۔ اور وہیں سے ایقاع یا تال سم کی معلومات یوروپ نے حاصل کیں۔ اس فن کا سب سے پہلا ماہر عربوں میں جو بھی رہا ہو، لیکن تصنیفی حیثیت سے الخلیل الکندی سب کا پیش رو ہے، جس نے اس فن پر ایک مستقل تصنیف کتاب الایقاع کے نام سے تحریر کی۔ اسی سے غالباً فارابی نے اپنی کتاب الموسیقی میں اور ابن سینا نے اپنی تصنیف شفا میں استفادہ کیا اور ان کتابوں سے اہل یوروپ نے۔

اس بیان سے غالباً آپ کو لفظ (RHYTHM) کی وسعت معنی کا علم ہو گیا ہو گا، لیکن چونکہ ہر موقعہ ومحل کے لحاظ سے اسکے الگ الگ نام ہوگئے ہیں۔ اور ان سب کے لئے آپکی زبان میں الفاظ موجود ہیں، مثلاً ارتقاص، تناسب، موسیقی تال سم، قافیہ و سجع وغیرہ) اس لئے میری رائے میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ کوئی ایک لفظ ایسا ہونا چاہیئے، جو کم وبیش تمام محلات استعمال پر حاوی ہو تو میرے نزدیک وہ صرف لفظ تسجیع ہو سکتا ہے، جس کا مفہوم ہندی زبان کے ایک لفظ سبھاؤ سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔

برسات

(جناب جوشؔ ملیح آبادی)

فردوسِ عطا کی مجھے ساون کے مہینے، ایک گل رخ نسریں بدن و سروِ سہی نے
اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے
مینھ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
شالوں پہ اُدھر کاکلِ شبرنگ کی لہریں گردوں پہ اِدھر ابرِ خراماں کے سفینے
تھا یا تو یہ فرمان کہ اس سرد ہوا میں ہم منھ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے
یا شکوۂ پیہم تھا نزاکت کے لبوں پر طوفاں وہ اُٹھائے تھے مری بادہ کشی نے
تھا پیشِ نظر جسکے لئے ہجر میں برسوں مانگیں تھیں دعائیں مرے آغوش تہی نے

دل طعن سے ہر بار یہ دیتا تھا صدائیں اب آ ہے فلک اور یہ سامان بھی چھینے
کیا لطف خانی تھا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

اے جوشؔ ہر ایک سانس نسیمِ سحری تھی
جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

اڈیٹر نگار سترہ ۱۷ اکتوبر کی رات کو پشاور پہونچ جائیں گے اور جناب سردار احمد خان صاحب سول جج پشاور کے مہمان ہونگے یہاں ۵-۶ دن قیام کرنے کے بعد دیگر اضلاع سرحد میں تشریف لیجائیں گے۔ نومبر کے ہفتہ اول میں واپسی ہوگی

(منیجر نگار)

عورت

اے امینِ زندگی سرمایۂ آرامِ جاں
صنفِ نازک! روح پرور تیرا ہر انداز ہے
باعثِ تسکینِ دل ہے، تیری اُلفت کی نظر
شکوے سے ناآشنا تیرا لبِ تقریر ہے
تیری شوخی بھی حیا و شرم کی ہے ہم عناں
خودنمائی اور تصنع سے تجھے پرہیز ہے
اک گلِ تازہ بہارِ گلشنِ فطرت ہے تو،
تو قیودِ زندگی کی اک حسین زنجیر ہے
ہے نگاہِ لطف تیری چارۂ درد و الم
جنبشِ ابرو میں پنہاں تیری رازِ کائنات
ہے نگاہِ شرمگیں شرحِ زبانِ آرزو
گونجتے ہیں تیرے نغمے زندگی کے ساز میں
محو کردے غم کو جو دل سے وہ صحبت ہے تری
تو حوادث میں بھی قیدِ رنج سے آزاد ہے
تو صناعِ آرزو ہے تو امیدِ زندگی،
تیری شمعِ حسن سے روشن ہے بزمِ کائنات
تجھ سے ہے دنیا کی آبادی گھروں کی روشنی
تیرے جذباتِ محبت ہیں نہایت استوار
تیری عصمت مایۂ نازِ دلِ آگاہ ہے
قوتِ احساس ہے تیری نہایت بااثر
تجھ سے پوشیدہ نہیں رہتے غم و رنج و ملال،
تیری ہمدردی میں پنہاں لذتِ سوز و گداز
مختصر تیری صفت یہ ہے کہ بس عورت ہے تو

اے اولوالعزمی کے جذباتِ نہاں کی داستاں
مونسِ رنج و محن ہے، گو سراپا ناز ہے
اپنے ہمدم کے لئے ہے مرہمِ زخمِ جگر
تو جہانِ آب و گل میں صبر کی تصویر ہے
پیکرِ جذباتِ خودداری کی تو روحِ رواں
سادگی تیری خلوص افزا، محبت خیز ہے
سینکڑوں رنگینیاں جس میں ہیں وہ جنت ہے تو
محفلِ ہستی کی جیتی جاگتی تصویر ہے
جذب ہوتی ہے تبسم میں ترے دنیا کے غم
موجزن تیرے لبوں میں چشمۂ آبِ حیات
تیرا اندازِ تبسم ترجمانِ آرزو
کس قیامت کا ترنم ہے تری آواز میں
شادمانی جسکو کہتے ہیں وہ صورت ہے تری
جھونپڑے میں خشک روٹی پاکے بھی دل شاد ہے
تو ہے پیغامِ محبت تو نویدِ زندگی،
تجھ سے ہی تکمیل پایا مقصدِ سازِ حیات
تجھ سے ہے قوموں کی عزت تجھ سے رونق ملک کی
تیرے دامن کی ہوا ہے باغِ الفت کی بہار
تیری عفت نفسِ امارہ کی قرباں گاہ ہے
دل کے جذباتِ نہاں پڑھ لیتی ہے تیری نظر
چینِ پیشانی سے تو دل کا سمجھ لیتی ہے حال
تیری دلجوئی سکونِ خاطرِ غمگیں کا راز
اپنے بندوں کو خدا کی دی ہوئی نعمت ہے تو

میری دُنیا

عزیزوں سے جو کی چشمِ کرم کی آرزو میں نے ۔۔۔ عزیز ایسے جنھیں میں جان سے بڑھکر سمجھتا تھا
جو میری قوتِ دل کیلئے سامانِ نازش تھے ۔۔۔ میں اس دُنیا میں اپنا خاص حق جن پر سمجھتا تھا
محبت بن گئی تھی، جنکی، "رازِ زندگی"، میرا ۔۔۔ جنھیں میں چارہ فرمائے دلِ مضطر سمجھتا تھا
یہی اس خاکدانِ دہر کے کچھ منتشر ذرّے ۔۔۔ انھیں میں ، دلکشِ مہر و مہ و اختر سمجھتا تھا

تو دیکھا میکدہ "آسودۂ رنگیں تقالی تھا
مگر صہبا کی دلکش جھلکیوں سے جام خالی تھا

ہوئی احباب سے آخر امید اعتنا مجھ کو ۔۔۔ کہ یہ اس کشتِ زارِ ہستیِ دُنیا کا حاصل ہیں
اگر دُنیا کو "سفینہ" فرض کرلیں اور پھر دیکھیں ۔۔۔ تو احبابِ وفا احساس، اس صحیح رتِ دل ہیں
مگر او عالمِ امواج کی شورش کے دیوانے ۔۔۔ ترے دریا سکوں پروردۂ آغوشِ ساحل ہیں
نہ جا او بیخبر پھولوں کی رنگیں ماجرائی پہ ۔۔۔ کہ اجزائے خس و خاشاک بھی گلشن میں داخل ہیں

امیدیں نا امید کامیابی ہو گئیں آخر
اُمنگیں تھک کے آغوشِ سکوں میں سوگئیں آخر

یکایک مطربِ فطرت نے اپنا ارغنوں چھیڑا ۔۔۔ رگِ افسردۂ ہستی میں گویا روح دوڑا دی
ندا آئی کہ دیوانے اِدھر آ! جادواں ہوجا ۔۔۔ کسی نے پھر زمانہ کی حقیقت مجھکو سمجھا دی
مری خاطر خداوندِ جہاں آرائے فطرت نے ۔۔۔ زمانے سے جُدا دنیائے "نو" اک خلق فرما دی
دبی چنگاریاں پھر مشتعل ہونے لگیں دل میں ۔۔۔ فروغِ رنگ نے پھر آتشِ احساس بھڑکا دی
سکوتِ محفلِ شب نے تڑپ کی لذتیں بخشیں ۔۔۔ کبھی ہنگامۂ بزمِ سحر نے روح چہکا دی
گزرنا کامیونکا میرے دل میں ہو نہیں سکتا ۔۔۔ مجھے دُنیا میں جنت بخشدی یہ زندگی کیا دی
"فریبِ زندگی" سے زندگی کی رمز بینی میں ۔۔۔ جو گتھی پڑ گئی تھی ناخنِ فطرت نے سلجھا دی

سُن اے غافل! سرائے دہر نادانوں کی بستی ہے
یہ انسانوں کی دُنیا، چند بیجا نونکی بستی ہے

مرے احباب ہیں، شفاف نہریں، نرم رو موجیں
لطافت آشنا غنچے ہیں، کثیر رشتہ داروں میں

مرے چہرے سے موجیں گردِ غم کو پاک کرتی ہیں
رہا کرتا ہے رقصِ شادمانی آبشاروں میں

مجھے افسردگی سے آشنا ہونے نہیں دیتی
صباحت ہے کچھ ایسی پھول سے رخ ہیں، عذاروں میں

گراں ہوتا نہیں میری خوشی پہ اُن کو مٹانا
بوئے گل زیبِ گلستاں ہیں، وہ گُندھ جاتے ہیں ہاروں میں

مرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے
وہ لرزش سی جو رہتی ہے نمایاں شب کو تاروں میں

مرے کھوئے ہوئے احساس کو ہشیار کرتی ہے
وہ جنبش سی جو ہوتی ہے سحر کو شاخساروں میں

یہ کس نے روح کی گہرائیوں میں شورشیں بھر دیں
کوئی مطرب چھپا بیٹھا تھا، شاید نغمہ زاروں میں

رگِ گل، پختگی کی شان میں ہوتی ہے جب ظاہر
تو روحِ زندگانی دوڑنے لگتی ہے نظاروں میں

مری شام سکوں پروردہ میں نغموں کا خزانہ ہے
مری روشن سحر ہے، حسن کے آئینہ داروں میں

خزاں میرے چمن کی حد میں داخل ہو نہیں سکتی
کہ رنگِ جاوداں رکھا گیا ہے ان بہاروں میں

بس اب میں ہوں، یہ عشرت گاہ ہے، وارفتہ حالی ہے
مری دنیا غم و افکار کے جھگڑوں سے خالی ہے

علی اختر اختر

مزدور کی آواز

سازِ غمِ ماضی ہوں عکسِ رخِ فردا ہوں ،
محنت میری دولت ہے مزدور کا بیٹا ہوں

پلتی ہے میری قسمت تدبیر کے دامن میں ،
خوابیدہ ہیں امیدیں تقدیر کے دامن میں

مجھ سے ہوئی آبادی ویرانۂ ہستی کی
ہے خون مرا سرخی افسانۂ ہستی کی

دنیا میں کھلائے ہیں گلزارِ ارم میں نے
کعبہ میں اٹھائی ہے دیوارِ حرم میں نے

بیدار مری محنت ہر سازِ ترنم میں
نہروں کی روانی میں کلیوں کے تبسم میں

ہے کشتِ عمل تازہ محنت کے پسینے سے ،
ہنگامۂ دنیا ہے مزدور کے جینے سے

نافہم سمجھتے ہیں یہ امر ہے تقدیری
محنت کی جہاں سازی دولت کی جہانگیری

سکھلا دے اگر کوئی مزدور کو خودداری
پھر آپ ہی گھٹ جائے سرمایہ کی بیماری

ہو یوں نہ اگر جنبش بازوئے مشقت میں
رعشہ ابھی آ جائے اعضائے تجارت میں

ہیں میرے مٹانے کو سو طرح کی تدبیریں ،
قانون کے پھندے ہیں تہذیب کی زنجیریں

قانون کے ہاتھوں میں حربہ جو ہے مذہب کا
چلتا ہوا جادو ہے دنیائے مہذب کا ،

اک راز ہے پوشیدہ اس پردۂ رسوا میں
بنیاد شہنشاہی تعمیرِ کلیسا میں

برگشتہ ہوئی دنیا پیغام سے مذہب کے
الجھتے رہے سو فتنے اک نام سے مذہب کے

مذہب نے غریبوں سے سوزِ جگری چھینا
"تعلیمِ قناعت" دی "احساسِ خودی" چھینا

ہے روحِ عمل مردہ اس خوئے توکل سے
دوزخ ہے مری دنیا جنت کے تخیل سے

مستقبلِ زریں ہے اس خوابِ حقیقت میں
آیند و ذرا طاقت اس بازوئے محنت میں

دیوارِ ملوکیت تیشوں سے گرا دوں گا ،
اس کہنہ تمدن کی بنیاد ہلا دوں گا

معمار نئے ہوں گے تعمیر نئی ہوگی ،
جب خواب نیا ہوگا تعبیر نئی ہوگی

پہونچے گا وہاں طائرِ پروازِ خیالی کا ،
جو نقطۂ آخر ہے دنیا کی ترقی کا ،

پھل سرو میں آئے گا پھولوں سے بھرے ہونگے
صحرا بھی چمن ہوگا کانٹے بھی ہرے ہونگے

مذہب نہ سہی لیکن احساسِ وفا ہوگا
ہر سر میں خودی ہوگی ہر دل میں خدا ہوگا ۔

سوئی ہوئی طاقت کو اک روز جگائیں گے
اک دن اسی دنیا کو فردوس بنائیں گے

سمجھا ہے کبھی تم نے کیا راز ترقی ہے
مغرب کی نئی دُنیا کیوں جنتِ ارضی ہے

مقصد کی ظفرمندی موقوف ہے ہمت پر
تقدیر چمکتی ہے پیشانیٔ محنت پر

مغرب سے خزاں آئی مشرق کا چمن اُجڑا
گلچیں کے قدم آئے گلزارِ وطن اُجڑا

کانٹوں کا بیاباں ہے خاک اُڑتی ہے گلشن میں
پھولوں کا خزانہ ہے گلچینوں کے دامن میں

اے منتظرِ فردا اے نوحہ گرِ ماضی
ابتک ہے گلستاں میں رنگِ اثرِ ماضی،

ہے مطلعِ مشرق سے آثارِ سحر پیدا
محنت کی عرق ریزی کرتی ہے گہر پیدا

جو ابر کہ اُٹھا تھا فاران کی چوٹی پر
وہ آج برستا ہے مزدور کی کھیتی پر

تبت کے پہاڑوں پر توران کے صحراؤں میں
آئی ہے گھٹا گھر کر "بستانِ معلّا" میں

ہے جنبشِ بیداری ٹھہرے ہوئے پانی میں
ہنگامۂ طوفاں ہے گنگا کی روانی میں

فریادِ اسیراں سے جنبش ہوئی زنداں کو
سبزے نے بھی کروٹ لی مژدہ ہو گلستاں کو

اے ملک کے غمخوارو - اے قوم کے فریادی
مزدور کی بیداری ہے ملک کی آزادی

محنت کی ضرورت ہے بیکار ہیں تقریریں
دو مجھکو توانائی میں توڑ دوں زنجیریں

روٹھی ہوئی عظمت کو بھارت کی مناؤں گا
تم مجھکو جگا دو - میں قسمت کو جگا لوں گا

فریاد نہیں سنتے "اربابِ اثر" میری
اے جذبۂ خودداری" لے آکے خبر میری

تلخی کشِ محنت ہوں رد کردہ دنیا ہوں
مظلوم تمدن ہوں پروردہ صحرا ہوں

جمیل مظہری کاظمی

غزلیات

(افسر صدیقی امروہوی)

دور تک کوئی نشانِ جادۂ منزل نہیں
اب ہوا ثابت کہ جوشِ رہروی کامل نہیں

بار اٹھاتا عشق کا اتنی بساطِ دل نہیں
مہربانی ہے تمہاری میں کسی قابل نہیں

زندہ باد اے یادِ ایامِ گزشتہ زندہ باد
حال اچھا ہے مرا تشویشِ مستقبل نہیں

ضبطِ غم کا پاس غالب ہے خیالِ مرگ پر
جی رہا ہوں گو کہ لطفِ زندگی حاصل نہیں

رات بھر آتی ہے کانوں میں نوائے جانفزا
شکر ہے اللہ کا خاموش سازِ دل نہیں

آؤ چل کر طور کی مٹی میں پہونچیں روحِ عشق
غش ہوئے ہیں جب سے موسیٰ گرمیٔ محفل نہیں

رنگ بھرتا رہ گیا ہے حسرتوں کے خون سے
میں وہ تصویرِ وفا ہوں جو ابھی کامل نہیں

کشتیٔ دل کا خدا حافظ ہے بحرِ عشق میں
جا رہی ہے اس طرف کو جس طرف ساحل نہیں

اڑ رہی ہے رہروِ راہِ طلب سے دور دور
گردِ منزل بھی شریکِ زحمتِ منزل نہیں

رات کی خاموش تاریکی میں افسرؔ غور کر
چودھویں منزل سے پہلے ماہ کیوں کامل نہیں

طفیل احمد شمیمی

نہ سحر ساقی گلزار، نہ جامِ رنج گداز
دلِ غریب و پریشانیٔ دیارِ مجاز

دل آج زلزلۂ عشق سے ہے محشر ساز
اڑائے ساز کو پھرتی ہے ساز کی آواز

کہیں نہ محفلِ ہستی، نہ جلوہ ہائے مجاز
خیال پردۂ دل پر ہے محوِ نقش طراز

خدا دکھائے نہ پھر خواب ایسی جنت کا
نہ رقصِ شاہد و ساقی نہ بانگِ چنگ نواز

سکوت پردۂ گل سے سرودِ بلبل تک
طلسم ساز ہے ہر رنگ میں مری آواز

وہی ہے دستِ تصور کی نقش آرائی
وہی تخیلِ حسن اور رنگِ ناز و نیاز

پلا کے مے یہ تری کم نگاہیاں ساقی
کبھی تو عالمِ مستی میں چھیڑیں قصۂ راز

حریمِ دل میں ہے چھایا سکوتِ حسرت ریز
نہ اب وہ ناز کی رنگینیاں نہ جوشِ نیاز

بجائے دل کو کوئی کیا فریبِ ہستی سے
نظر کو ذوقِ تماشا، خیالِ شعبدہ باز

اُٹھا نوائے محبت پہ گام بے پروا
نہیں ہے وادیٔ دل میں کہیں نشیب و فراز

اس انجمن میں ہوں زندانیٔ خیال ہنوز
نہ آشنائے حقیقت، نہ نکتہ دانِ مجاز

بہ اعتبارِ فنا ہے کشش اس عالم کی
شرارِ گل سے چمن ہے فروغِ دیدہ نواز

طلسم خانۂ ہستی میں کیا غم و عشرت
بقدرِ وہم ہے اس دشت میں نشیب و فراز

وہی مناظرِ شام و سحر وہی محفل
ہنوز دہر ہے سرمست جرعۂ آغاز

فضائے گنبدِ ہستی وہی، وہی مطرب
کہاں تک آہ سنوں میں سُنی ہوئی آواز

طرب پذیر تغیر ہے خاطرِ انساں
اب اور نغمہ سے آباد کر یہ پردۂ ساز

(قیس شیروانی)

جب جوانی حسنِ فطرت بن گئی
سادگی خود زیب و زینت بن گئی

مسکرائے پھر وہ مجھ کو دیکھ کر
پھر مرے جینے کی صورت بن گئی

دیکھتی ہے آنکھ پھر نیرنگِ حسن
عشق پھر تصویرِ حیرت بن گئی

بڑھ گئی جب حد سے بیتابی مری
وجہ تسکینِ طبیعت بن گئی

کھل گئیں آنکھیں جو پی میں نے شراب
بے خودی چشمِ بصیرت بن گئی

جب پڑا ناکامیوں سے سابقہ
زندگی زنجیرِ حسرت بن گئی

ہو گیا دل بے نیازِ ہست و بود
بے کسی وجہِ فراغت بن گئی

درد کا آخر کوئی انجام ہے
بے کلی پیغامِ راحت بن گئی

پوچھتے کیا ہو نگاہِ لطف سے
بن گئی، جینے کی صورت بن گئی

ابتدا میں جس کو سمجھتے تھے کسک
بڑھتے بڑھتے دردِ الفت بن گئی

(نیّر آروی)

طاقت کہاں ہے ضبط کی بارِ دگر مجھے،
اے اضطرابِ شوق نہ لیجا اُدھر مجھے

اعدا کے روبرو یہ مرا حال ہائے ہائے،
اتنا نہ کر ذلیل تو اے چشمِ تر مجھے

یہ درد وہ نہیں ہے جو درماں پذیر ہو،
ہمدردین کے چھیڑ نہ اے چارہ گر مجھے

کیا کیا نہ شوق دید میں ناکامیاں ہوئیں
اب تو فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

سمجھوں گا میں فریب ہی اُسکو اگر کبھی
دیکھے نگاہ لطف سے وہ فتنہ گر مجھے

میں خود طریق عشق میں گُم کردہ راہ ہوں
کسواسطے بنائے کوئی راہبر مجھے

دامن پہ ہے نظر تری اور دل ہے چاک چاک
اب حاجت رفو نہیں اے بخیہ گر مجھے

دنیا کی بستیوں سے الگ ہو جہاں مقام
اے رہنمائے عشق تو لے چل ادھر مجھے

وہ دن گئے کہ دل میں تھا ہنگامۂ نشاط
اب حسرتوں کی بھی نہیں اپنی خبر مجھے،

کیا کیا نہ عاشقی کی بدولت ملے خطاب
کہتے ہیں لوگ نیّر آشفتہ سر مجھے

بسم اللہ

نگار

جلد   فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۰ء   شمارہ ۵

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ — نومبر ۱۹۳۲ء — شمارہ ۵

ملاحظات

میں آخرکار یکم نومبر کو پھر اُسی سرزمین فکر و آلام میں پہونچگیا، جہاں سے سولہ دن قبل اُس دیار دور افتادہ کی طرف روانہ ہوا تھا، جو حقیقی انسانیت کے بہت سے فراموش کردہ مناظر اب بھی اپنے سنگستانی دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔

سرحد جاکر وہاں کی زندگی، وہاں کی تہذیب، وہاں کی معاشرت اور سب سے زیادہ وہاں کی سیاسی کیفیات کے مطالعہ کرنے کا شوق عرصہ سے دل میں موجزن تھا اور ناشکری ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ باندازۂ شوق اس میں زیادہ ناکام آیا۔

میرا سفر یہاں سے اُس تاریخ کو شروع ہوا جب وہاں کی فضا میں سکون تھا، اور سیاسی مطلع گرد و غبار سے پاک، لیکن پشاور پہونچتے ہی مجھے یہ خبر سُنائی گئی کہ اب حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ امن و سکون کی صبح بعد میں کس قدر دیر میں پیدا ہو۔ کہنے والوں نے تو اس کا اظہار تاسف کے ساتھ کیا، لیکن میں اپنی جگہ مسرور تھا، کیونکہ سرحد کا سفر کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، اگر وہاں بھی اسی اطمینان و آئین زندگی سے واسطہ پڑے، جو بسا اوقات انسان کو تھکا کر کبھی کبھی جرم و معصیت پر بھی آمادہ کر دیتا ہے، چہ جائیکہ خطرے میں پڑنا، کہ میں تو اس کے اندر بہت سے حیات بخش لمحات اپنے لئے مستور پاتا ہوں۔

پھر یہ کہ میں نے اپنے دوران قیام میں وہاں کیا کیا دیکھا، کن کن تاثرات کو اپنے ساتھ لایا، یہ ایک مستقل بیان چاہتا ہے، جس کو میں آئندہ کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں، کیونکہ ممکن ہے مجھے اس سلسلہ میں بعض تصاویر کا دینا بھی ضروری

ہوجائے۔ اس کا ذکر میں نے صرف اس لئے کردیا کہ ناظرینِ نگار کو میری واپسی کا علم ہوجائے اور اُن احباب کو مایوسی، جو مجھے واپسی کے وقت مختلف مقامات پر روکنا چاہتے تھے۔ متعدد تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کسی متعین مقام کا عزم کرنے کے بعد راستہ میں کسی اور جگہ قطع سفر کرکے قیام کرنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔ اور میں آئندہ بھول کر بھی کوئی وعدہ ایسا نہ کرونگا کہ آخر کار معذرت کی ضرورت پڑے۔

اس سے قبل ناظرینِ نگار کو معلوم ہوچکا ہے کہ ہمارے صوبۂ متحدہ میں گورنمنٹ نے اُردو ہندی زبانوں کی خدمت کے لئے ایک اکاڈیمی قائم کی ہے اور خزانۂ حکومت سے سالانہ معقول امداد اس کو ملتی ہے، اس کا نظام کیا ہے، اور اکاڈیمی کیا تدابیر خدمت زبان کے لئے اختیار کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل یا اس پر تنقید کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں۔ فی الحال میں ایک اور مسئلہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ جسکو ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔

اکاڈیمی کے دستور اساسی و نظم عمل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک جدید ایسے لٹریچر کے ساتھ پیش کیا جائے جو ایک طرف حقیقی معنے میں اکاڈیمی کی شہرت و وقار کو قائم رکھنے والا ہو اور دوسری طرف واقعی خدمت زبان اس سے متعلق ہو۔ چنانچہ اب قیام اکاڈیمی کے تقریباً چار سال کے بعد یہ تحریک بروئے کار آرہی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء وہاں سے ہونیوالا ہے لیکن قبل اسکے کہ وہ جاری ہو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعد اشاعت، حدود تنقید کو تنگ کرنے کے لئے، قبل اشاعت ہی ان مشوروں کو پیش کردیا جائے، جو اپنی توقعات کے لحاظ سے ہم پیش کرسکتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ جب سے اُردو ہندی زبان کی تفریق و نزاع شروع ہوئی ہے، اسوقت سے ایک خاص جماعت اسباب فکر کی ایسی پیدا ہوگئی ہے جو ان دونوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنیکی مدعی ہے اور جہاں تک اُردو انشا کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اُسکو اس قدر سہل و آسان بنا دیا جائے کہ غیر مسلم یا غیر عربی و فارسی داں حضرات بھی بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تجویز یا نیت بظاہر نہایت خوشنما اور دلپذیر معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک نگاہ غائر اس تجویز میں چند در چند نقائص محسوس کرسکتی ہے۔ اچھا اب آیئے عملی نقطۂ نظر سے اس خیال کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ نتیجہ کس صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اگر اُردو انشا کو سہل بنایا جائے، یعنی عربی فارسی الفاظ ترک کرکے عوام کی نہایت ہی آسان زبان استعمال کیجائے، تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ اُردو میں جو کچھ لکھا جائے اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھا جائے جسے عوام کی ذہنیت کہتے ہیں۔ یعنی اُردو میں سوائے معمولی قصے کہانیوں، داستانوں، افسانوں اور بعض ابتدائی علوم کے مبادیات کے کسی اور سنجیدہ و دقیق، مبحث پر گفتگو نہ کیجائے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ اُردو بولنے اور لکھنے والی جماعت کو (جس میں عنصر غالب مسلمانوں کا سمجھا جاتا ہے) مطلقاً تربیت ذہن و دماغ کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو ہمیشہ سطحیات میں مبتلا رکھنا چاہئے۔

تاکہ وہ بدستور جاہل بنے رہیں۔ اور اُن میں دقیق مسائل پر سوچنے اور خود اپنے اندر ذہن خلاق پیدا کرنے کی اہلیت نہ پائی جائے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ میں اس نتیجہ پر کیونکر پہونچا، لیکن ادنیٰ تامل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خیال کی بلندی و دقت از خود زبان کو بلند و دقیق بنا دیتی ہے۔ اگر ہم زندگی کے نہایت معمولی روز کے واقعات بیان کریں تو آسان زبان کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم علم الحیات، نفسیات وغیرہ دیگر علوم دقیقہ سے بحث کریں گے۔ یا خود انشا کے اندر نازک خیالی اور بلندی تخیل سے کام لیکر زبان کو معانی جدیدہ، اور نکات نادرہ سے آشنا کرنا چاہیں گے تو زبان خود دشوار ہو جائے گی۔ اور ہم مجبور ہونگے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ان کے ترکیبی فقروں سے کام لیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر موضوع کے لئے ایک مخصوص زبان ہوا کرتی ہے، جو زبان ہم ایک افسانہ میں استعمال کرتے ہیں، کیا وہ نفسیات کے کسی مضمون کے لئے مناسب ہو سکتی ہے، کیا جس زبان میں ہم مذہبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک سیاسی خطیب کے لئے موزوں ہے۔ الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معانی و مطالب کے اشکال کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی اشکال بڑھتا ہے اور اس لئے یہ مشورہ دینا کہ اُردو کو نہایت سہل اور حد درجہ عوام پسند بنا دیا جائے۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ اسکو علمی بلند زبان بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس نوع کا مشورہ دینے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مسلمانوں کا ہے، جو فارسی عربی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا اور جس نے اپنے گہوارہ ہی میں انگریزی ماحول کو دیکھا دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے، جو اُردو زبان میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیا معنے یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اُردو رسم الخط قائم رہے۔ اگر ہندوؤں کی یہ ذہنیت صرف اس بنا پر ہوتی کہ اُن کو عربی فارسی سے قدرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ تو وہ زیادہ قابل الزام نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس تحریک میں سیاسی غرض پنہاں ہے۔ اور وہ ہندی کو ترقی دینے کیلئے جنگ کے ان تمام اصول سے کام لے رہے ہیں۔ جو حصول مدعا کے لئے کسی نہ کسی نہج سے مفید ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے زیادہ وقت نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ دس سال کے اندر ہندی لٹریچر نے جو صورت اختیار کی ہے، وہ ایک ایسی قوی شہادت ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو جماعت کے سامنے اردو زبان کو سہل بنانے کی کوشش میں دونوں جماعتوں کا اتحاد خیال و زبان مقصود ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ وہ ہندی میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے یعنی جس طرح وہ اردو کو عربی و فارسی کے الفاظ سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ ہندی کو بھی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے ناآشنا رکھتے، لیکن کس قدر حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنی زبان کی خصوصیات کو ترک کرکے اس کو ہندوستانی زبان بناؤ، لیکن دوسری طرف جس وقت ہندی زبان کا مسئلہ اُنکے سامنے آتا ہے۔ تو وہ کوئی دقیقہ اسکو دشوار بنانے کی کوشش میں نہیں اُٹھا رکھتے اور اسکو ہندوستانی زبان بنانے کے بجائے دیوبانی بنانے میں مطلقاً کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اول اول جس وقت اُردو ہندی کی نزاع شروع ہوئی تو دنیا کو بتایا گیا کہ یہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہے اور انشا کے لحاظ سے ہندی میں اُردو سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن بعد کو رفتہ رفتہ حجاب اُٹھتا گیا

اور یہ حقیقت آخر کار ظاہر ہو کر رہی کہ جس چیز کو صرف رسم الخط کا امتیاز کہا جاتا تھا، اس میں تینوں کا کھوٹ شامل تھا، اور وہ امتیاز حقیقتاً مذاہب کا اختلاف تھا، تمدن و معاشرت کا اختلاف تھا، اور اس عصبیت کا اختلاف تھا جو ایک مسلمان کے دل سے تو محو ہو سکتی ہے، لیکن ایک ہندو جو مسلمان کو ہندوستان کا غیر مستحق باشندہ سمجھتا ہے کبھی اس سے منفک نظر نہیں آ سکتا۔

پھر آج ہندی کے رسالوں کو اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کو سہل بنانے کا درس دینے والے، خود ہندی زبان کو مسلمانوں کے لئے کس درجہ ناقابل فہم معمہ بناتے جاتے ہیں۔ اور اُردو کے وہ معمولی الفاظ بھی جو حقیقتاً سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت رکھتے ہیں، کس طرح ترک کئے جا رہے ہیں۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ کیا صداقت اسی طرز عمل کی مقتضی ہے اور کیا دونوں قوموں کو متحد دیکھنے کی آرزو اسی طریق کار سے پوری ہو سکتی ہے۔

مجھ سے زیادہ دونوں قوموں کے اتحاد کا شاید ہی کوئی حامی ہو، لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اُس کے لئے دونوں قوموں کو اپنی زبان کی خصوصیات بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ بجائے اسکے اگر اس امر کی تبلیغ کیجائے کہ دونوں جماعتیں دونوں زبانوں کا اتنا علم حاصل کریں کہ وہ ایک دوسرے کے علوم سے مستفید ہو سکیں تو بیشک میں اسکو ایک نتیجہ خیز بات کہہ سکتا ہوں۔ اسکے کوئی معنی نہیں کہ ہندو جماعت اُردو کو تو تہی مایہ بنانے کی کوشش کرتی رہے اور ہندی کے باب میں وہ اس اصول کو ترک کر کے اختلاف زبان کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرتی جائے۔

ہندو جماعت میں اول تو اُردو کے انشا پرداز بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ فسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر اُنھوں نے جس قدر تغیر اپنی اُردو میں پیدا کر لیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسٹر پریم چند اُردو کے مشہور فسانہ نگار ہیں لیکن اب سے چند سال قبل کے افسانے اُن کے دیکھئے اور پھر اُن سے مقابلہ کیجئے اُن کے موجودہ افسانوں کا تو معلوم ہوگا کہ زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے ایک تغیر عظیم اُن میں پایا جاتا ہے، اور وہ ذہنیت جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ نولکشور پریس کی طرف سے جو اُردو کی ریڈریں تیار کی گئی ہیں اُن کو ملاحظہ کیجئے کہ مسٹر پریم چند نے کس بیدردی کے ساتھ اُردو کو ذبح کیا ہے اور خیال و زبان دونوں اعتبار سے اس میں کس قدر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اول اول جب یہ ریڈریں لکھی گئیں تو اُن کی زبان کافی سادہ تھی۔ لیکن تھی اُردو۔ مگر جب جناب پریم چند کے سامنے حک و اصلاح کیلئے آئیں تو اُنھوں نے کوئی دقیقہ انکی زبان کو مسخ کرنے کا اُٹھا نہ رکھا۔ یقیناً پریم چند صاحب اُردو میں فسانہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں لیکن انکو اُردو زبان کا ماہر یا صاحب نظر مصنف تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں، عربی فارسی ترکیبوں پر اسکی معنوی خوبی کا کسقدر انحصار ہے۔ اگر وہ عربی فارسی کے جاننے والے ہوتے، اگر وہ بجائے فسانوں کے علمی یا تنقیدی مضامین بھی لکھتے تو انکو معلوم ہوتا کہ اُردو کو کسی طرح عربی فارسی سے بے نیاز نہیں بنایا جا سکتا، جسطرح وہ خود اپنے ہندی مضامین کو سنسکرت کی ترکیبوں سے خالی نہیں کر سکتے۔ یہ میں نے اسلئے ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص جواب میں پریم چند صاحب کی انشا کو پیش کرے تو پہلے ہی سے اُسکو میرا جواب بطور دفع دخل معلوم ہو جائے۔

اس قدر تمہید و تفصیل کے بعد میں اب ہندوستانی اکاڈمی، اُسکے ممبران، اور رسالہ کے اڈیٹران سے خطاب کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکاڈمی کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ اُردو کا جاری ہونیوالا ہے، وہ کس ذہنیت کے ماتحت شائع ہوگا اور ملک و قوم کو اُسکی طرف سے کیا توقعات قائم کرنا چاہیئے۔

چونکہ خود مجھے بھی اکاڈیمی کے ممبر ہونیکی عزت حاصل ہو چکی ہے اور میں اس ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں جو زبان کے متعلق وہانکی فضا میں پائی جاتی ہے۔ اسلئے مجھے اندیشہ ہے کہ زیر تجویز رسالہ کہیں غلط اُصول پر نہ جاری کیا جائے اور مبادا وہ بھی سیاسی اغراض کا شکار ہو جائے۔ اس اندیشہ کی تصدیق اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مشیر و یار اُن تک سے بواسطہ جناب بشیر احمد صاحب علوی مجھ تک پہونچی ہے کہ اس رسالہ کا نام صرف ہندوستانی ہوگا اور اسپر بجائے سہ ماہی رسالہ کے "تہ ماہی رسالہ" درج کیا جائے گا (معلوم نہیں بنیے تہ ماہی لکھنے میں صحیح رسم خط استعمال کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ اسکو تماہی لکھیں) ۔ مجھے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ تجویز پروفیسر صدیقی صاحب کی ہے۔ میں پروفیسر صدیقی سے واقف نہیں ہوں اور غالباً میری طرح کوئی اور بھی اُنکی خدمت زبان کے کارناموں سے آگاہ نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر صدیقی کی طرف سے اس تجویز کا پیش ہونا محض اسوجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں) قوم کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی، جبکہ معلوم ہے کہ وہ اپنے مصالح مقامی کے لحاظ سے کبھی اسکی جراٴت نہ کر سکتے تھے کہ ارباب اکاڈیمی کے ہندو عنصر کے خلاف مزاج کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ مسلمان لاکھ بیوقوف سہی لیکن زمانہ نے اُن کو اتنا باخبر ضرور کر دیا ہے کہ وہ اس نوع کے تحریک و تجویز کی اہمیت اور اُسکی شاطرانہ چال کو نہ سمجھ سکیں۔

حکومت کی طرف سے اکاڈیمی کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف ترقی زبان کے لئے ملتی ہے اور اس مقصد کے تحت میں کوئی اور غرض شامل نہیں ہے۔ پھر اُصولاً صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُردو کی ترقی کیونکر ممکن ہے۔ اگر سہ ماہی کو تماہی کرنا علامت ترقی میں شامل ہے صرف اسوجہ سے کہ اسطرح فارسی لفظ سہ محو ہوتا ہے تو ہندی رسالہ میں بجائے کسی اور سنسکرت ترکیب کے سہ ماہی لکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہاں سے سنسکرت عنصر کم کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندی رسالہ میں تو وہ تمام اغلاق روا رکھا جائے جسکو یقیناً اکثر ہندو حضرات بھی نہیں پسند کر سکتے لیکن اُردو سے اُن معمولی عربی فارسی کی ترکیبوں کو بھی نکالدیا جائے جو ہندو زبانوں پر بھی عرصہ سے رائج چلی آتی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ وطن کے بجائے اردو میں جنم بھوم کیوں لکھا جائے، زیور کی جگہ بھوشن کو کیوں رائج کیا جائے، موسم و وقت کے بجائے سمے کا کیوں استعمال ہو۔ لیکن کی جگہ پرنتو کیوں لکھا جائے، کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ وطن، زیور، موسم، اور لیکن کا مفہوم نہیں جانتا اور روز کی زندگی میں وہ بجائے ان الفاظ کے جنم بھوم، بھوشن، سمے اور پرنتو کا استعمال کرتا ہے، پھر جب مقصود یہ ہے کہ زبان کو سہل الفہم بنایا جائے تو وہ الفاظ جاریہ کو قائم رکھنے سے حاصل ہوتا ہے یا اُن میں غیر مانوس تبدیلی کرنے سے؟ میں پوچھتا ہوں کہ سہ ماہی میں کیا خرابی یا اشکال ہے جو اُسکو تماہی بنایا جا رہا ہے اور اس سے مدعا کیا ہے؟

بہرحال میں ارباب اکاڈیمی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے ارباب نظم و نسق میں سے تماہی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بالکل علیحدہ کر دیں، کیونکہ یہ لوگ یقیناً اُردو کے بہی خواہ نہیں ہیں اور اسکو انھیں خصوصیات کے ساتھ جاری کریں جو اس کو عام سطح سے بلند کرنیوالی ہے۔ یقیناً اس میں عام سطحی افسانوں کے علاوہ علمی و تنقیدی مضامین بھی درج کئے جائینگے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی جو زبان ہوگی وہ کسیطرح تماہی کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی، اور اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا ضرورتاً و مجبوراً استعمال یقیناً ہوگا۔ پھر جب اس کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تو میں حیران ہوں کہ صرف سہ ماہی کو تماہی کر دینے سے جذبہ اصلاح کیونکر پورا ہو سکتا ہے البتہ اگر وہ اکاڈیمی کے رسالہ کو صرف بچوں کا کھیل اور ادنےٰ درجہ کے معمولی و سطحی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے کوئی واسطہ

نہیں، خواہ اسکا نام تباہی رکھیں یا ڑی ماسی پتر کا، البتہ اُسوقت یہ مطالبہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ کیا حکومت کی امداد کا مصرف صحیح یہی ہے اور کیا جو رقم اردو زبان کی ترقی کے لئے دیجا رہی ہے، اُس کو اسطرح فی الحقیقت ہندی زبان کی اُستواری میں صرف نہیں کیا جاتا

جو کچھ مینے عرض کیا وہ بالکل خلوص نیت لیکن پوری آزادی رائے کے ساتھ ظاہر کیا ہے، لیکن اگر اسکو عصبیت کے رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے، تو میں باوجود اپنی اس تمام حُریت رائے کے جو مذاہب مسالک اور ملل و اقوام کے باب میں ہر شخص پر ظاہر ہے اُسکو عصبیت تسلیم کرنے پر بھی آمادہ ہو جاؤں گا، اور کبھی اسکو گوارا نہ کرونگا کہ اردو زبان کو سیاسی اغراض کا نشانہ بنایا جائے اور اسکو ترقی دینے کے بجائے مسمار و منہدم کیا جائے۔

گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لئے تمام تمہیدی تیاریاں ہو رہی ہیں، اور ہندوستان کے سیاسی اضطراب کے انحطاط سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ جو فضا وہاں پیدا ہو رہی ہے وہ شاید یہاں کی حقیقی امیدوں کے خلاف نہیں ہے۔

اگر آزادی کامل کا مطالبہ "ہر گرش بگیر" کے اُصول پر صرف ڈومی نین ہوم رول کے حصول کو متعین کرنے کیلئے نہ تھا۔ تو ہمیں اسکی موت پر افسوس ہے، جبکہ آثار اوّل اوّل اسیوقت پیدا ہو چلے تھے جب مہاتما گاندھی نے گفتگوئے صلح کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

یہ امر بڑی حد تک یقینی ہے کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان کو ہوم رول دیئے جانیکی تجویز پاس ہو جائے گی، جو رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ تکمیل کی حد تک پہونچے گی۔ ہندوستان کی ماڈریٹ جماعت جسکو کانفرنس میں پوری نمایندگی حاصل ہے، اس عطیہ کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کرے گی۔ اور اسے قبول کرنا چاہیئے، لیکن میرا خیال ہے کہ آخر کار آزادی کامل کے طلبگار بھی اس سے انحراف نہ کرینگے اور جنگ زرگری کے اُصول پر تنہائی میں باہم گلبغلگیر ہو کر اپنی کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارکباد کہیں گے۔

رہ گیا مسلمانوں کا مسئلہ، سو وہ بھی ایسا زیادہ "عقدۂ مشکل" نہیں ہے۔ ہر قوم اپنا مستقبل خود بناتی ہے اور خود ہی بگاڑتی ہے۔ چونکہ ہندو مسلمان ابھی تک ایک قومیت کے قائل نہیں ہیں اور دونوں کے درمیان افتراق کا فاصلہ برابر بڑھتا ہی جارہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ دونوں قومیں اپنے مقاصد و اغراض بالکل جدا جدا رکھتی ہیں اور اسی خیال کے ماتحت دستور العمل بنا رہی ہیں؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ دونوں کے حالات پر غور کرو اور سمجھ لو کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ فطرت ہمدردی کے جذبے سے بالکل معرا ہے، اسوقت تک وہ خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ کر چکی ہے اور آیندہ اسی طرح کرتی رہیگی، اس لئے اگر ہندوستان کی بھی کوئی ضعیف قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جائے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔ مخصوص اسباب کے ماتحت مخصوص نتیجہ پیدا ہونا ضروری ہے خواہ وہ کتنے ہی زبردست الہامی مذہب کے پیرو ہونے کا مدعی کیوں نہ ہو

جنوری ۳۱ء کا نگار کیا ہوگا؟

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ اشاعت میں اس کا اظہار کیا جائیگا۔ چنانچہ آج ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنوری ۳۱ء کا نگار کیا چیز ہوگا اور اس کو نہ حاصل کرنا کس چیز کو ہاتھ سے دیدینا ہے۔

جنوری ۳۱ء کا نگار، رسالہ نہیں ہوگا، بلکہ کتاب ہوگا اور ایک ایسے موضوع پر جو اس سے قبل اُردو زبان میں آیا ہی نہیں جس طرح ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر ایک شخص کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں، اسی طرح آپ ایک شخص کے سوادِ خط کو دیکھ کر اسکی سیرت کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ فن بہت ترقی یافتہ فن ہے جسکی طرف ایشیا میں مطلق توجہ نہیں کی گئی۔

ہماری خواہش پر ایک صاحب نے جو اس فن کے ماہر ہیں اور عرصہ سے اس مسئلہ میں تحقیق و تفتیش کررہے تھے ایک کتاب مرتب کی ہے، جس میں اس فن کی تاریخ، اور اس کے اُصول و روح کے اقسام تحریر سے بحث کی ہے، اور مثالوں سے نمونوں سے دستخطوں سے بتایا گیا ہے کہ ہم ایک شخص کا خط دیکھکر کیونکر اس کی سیرت اور اس کے مستقبل کو معلوم کرسکتے ہیں۔ اس علم کا نام فراست التحریر ہے۔ اور اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو تکمیل کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک طویل فسانہ مولانا نیاز فتحپوری کا ہوگا جس کا عنوان یہ ہے:-

داستانِ حسن و عشق کا ورقِ خونیں

اور

جلوۂ بے محابا کی ایک قاتل رات

دوسرا افسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کا خواب و خیال کے عنوان سے ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک اور معرکۃ الآرا بحث علماء ہند کے اُن فتاویٰ پر ہوگی جو مولانا نیاز کے ایک استفتا پر اُن کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

وہ حضرات جن کا چندہ نگار کا ختم ہو رہا ہے (خواہ وہ نومبر میں ختم ہو یا دسمبر میں) خریدار رہنے کی صورت میں حسب ذیل رعایت کے مستحق ہونگے۔ تذکرۂ خندۂ گل۔ شاعر کا انجام نصف قیمت پر دیئے جائینگے اور "سائنس کے عجائب" مفت۔ اسی کے ساتھ رسالہ جن کے گزشتہ پرچے مارچ ۳۰ء سے آیندہ تک بجائے ۸ر فی پرچہ کے ۲ر فی پرچہ کے حساب سے دئے جائیں گے۔ جو حضرات یہ تمام چیزیں طلب کرینگے اُن سے محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

"مینیجر نگار"

قرآن کے لطائفِ ادبیہ

(مسلسل)

گنج قارون

گنج قارون کہ فرومی رود از قہر ہنوز
خوانده باشی تو کہ از غیرت درویشان است　(حافظ)

سورۂ قصص میں قارون کا واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، یہاں پر اس واقعہ کے تین اجزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، "گنج قارون" "فرومی رود از قہر" اور "از غیرت درویشاں" تینوں کے متعلق قرآن میں مفصلۂ ذیل آیات ہیں،

واٰتینٰہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء	اور ہمنے اسکو (قارون) اسقدر خزانے دئے تھے کہ انکی کنجیاں
بالعصبۃ اولی القوۃ	کئی کئی زور آور آدمیوں کو گرانبار کردیتی تھیں۔
فخسفنا بہ وبدارہ الارض	اور ہمنے اس قارون کو اور اسکے محلسرا کو زمین میں دھنسادیا
وابتغ فی ما اٰتاک اللہ الدار الاٰخرۃ	اور تجھکو خدا نے جتنا دیا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر
ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما	اور دنیا سے اپنا حصہ مت فراموش کر اور جس طرح خدا تعالےٰ
احسن اللہ الیک	نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی احسان کر۔

اب معنی میں کوئی پیچیدگی نہیں معلوم ہوتی، حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ فقیروں کی غیرت ایسی ہے، کہ گنج قارون زمین میں برابر دھنستا چلا جارہا ہے۔ ہرچند قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں کہ وہ ابھی تک دھنستا جاتا ہے، بلکہ صرف ماضی کا صیغہ "فخسفنا" استعمال ہوا ہے، لیکن عربی زبان میں صیغۂ ماضی حال اور استقبال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اگر علماء اسلامی روایات سے اسکی تصدیق کردیں کہ قارون ہنوز زمین میں دھنسا جارہا ہے، تو لفظ قرآن میں اسکی گنجائش موجود ہے، ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ متاخرین کا اضافہ ہے، اور حافظ صاحب نے اپنے شعر میں قرآنی واقعہ کو اسی عامیانہ وہم کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اعجاز موسوی

موسیٰ کے ساتھ خضرؑ کا واقعہ مستلزم ہے، اور شعرا نے اکثر کمالات موسیٰ کے سلسلہ میں خضر کا بھی تذکرہ کیا ہے، گرچونکہ میں "خضر" پر آئندہ پوری بحث کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اشعار کے اسی پہلو پر روشنی ڈالوں گا جس میں صرف موسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔

به هر قصبه ز آتش گل شاخ شگوفه　(جامی)　از جیب برون کرده چو موئے ید بیضا است

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا　(حافظ)　سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

خزیں از خامۂ تیز دشرش وادیٔ ایمن　(حزین)　تجلی طوری سازد نئے آتش نوا ہا را

جائے کہ برقص آید طور از "ارنی" گفتن　(حزین)　مستان لقا دانند بیہوشی موسیٰ را

جامی نے اپنی ایک غزل میں تسلسل مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے، گلگشت چمن اور نظارہ خیابان کا نہایت عمدہ نقشہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک طرف غنچہ نے برقع اُتار دیا ہے، تو دوسری طرف نرگس ہمہ تن چشم بنکر محو تماشا ہے، گلاب کی ہری ہری ٹہنیوں میں جو "سوزن زنگار" ہیں وہ گویا میرے دل سے وہ کانٹا نکال رہے ہیں جو غم سے میرے جگر میں ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔

تا گل تتق غنچہ ز رخسار کشا داست　نرگس ہمہ تن چشم شدہ بہر تماشاست
سبزہ کشد از سوزن زنگار گرفتہ　خارے کہ شکستہ ز غم اندر جگر ماست

غضب کا زور بیان ہے اسکے بعد فرماتے ہیں۔

بہر قصبے ز آتش گل شاخ شگوفہ　از جیب بروں کردہ چوں موئے ید بیضاست

یعنی شاخ شگوفہ، کھلے ہوئے (گلاب کے) پھولوں سے لپٹ رہی ہے، اور اسکا مقصد ہے کہ "آتش گل" سے کپڑے، شاخ شگوفہ کا گلاب کے پھولوں پر ہوا کے جھونکوں سے جھوم کر گرنا ایسا منظر پیش کر رہا ہے، جیسے موسیٰ کے ید بیضا کے مبارک بال گریبان سے نکلنے کے بعد فوراً چمک اوٹھے ہوں۔

یہاں پر اس لطیف خیال کے ساتھ جسے عمدہ سے عمدہ محاسن ادب کا جزو کہہ سکتے ہیں جامی نے قرآن کے بیان کردہ واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور تلمیح کے لئے قرآنی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، جب حضرت موسیٰ اپنی بیوی کے ساتھ وادیٔ ایمن میں پہونچے تو آگ کی ضرورت ہوئی۔

اذ راٰی نارًا فقال لاھلہ امکثوا انی	جبکہ انھوں نے ایک آگ دیکھی، سو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم
اٰنست نارًا لعلی اٰتیکم منھا بقبسٍ او	ٹھیرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمہارے
اجد علی النار ھدًی (طٰہٰ)	پاس کوئی شعلہ لاؤں، یا آگ کے پاس رستہ کا پتہ مجھکو ملجائے۔

مولانا جامی نے جو لفظ "قبس" اپنے شعر میں استعمال کیا ہے، وہ قرآن سے مستعار ہے، اور بالکل اسی معنی میں جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، یعنی گل بہ منزلہ آتش ہے، اور شاخ شگوفہ کو اس سے استفادہ کرتا ہے، اسی طرح جس طرح حضرت موسیٰ وادی ایمن میں آگ دیکھ کر "اتیکم منہا بقبس" فرماتے ہیں، دوسرے مصرعہ میں قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے، جن میں حضرت موسیٰ کے ید بیضا کا تذکرہ ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ واقعہ سورہ طٰہٰ، اور قصص میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء　　اور تم اپنا ہاتھ بغل میں دے لو، وہ بلا کسی عیب کے روشن ہو کر نکلے گا۔

دوسرے شعر (۲) میں حافظ نے جو تلمیح قرآنی پیش کیا ہے، وہ تاریخی اعتبار سے قابل جرح ہے۔

آں ہمہ شعبدہا عقل کہ می کرد آنجا　　سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

یعنی لطائف روحانیہ اور اعجازات ملکوتیہ کے نزدیک عقل کی رد و قدح وہی معنی رکھتی ہے، جو عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے سامنے سامری کی، قرآن مجید میں جہاں سامری کا بیان ہے وہاں عجلا جسدا لہ خوار آیا ہے اور اس نے اگر موسیٰ کی مخالفت کی تو یہی کہ انکی غیبت میں بنی اسرائیل سے بچھڑا کی پرستش کرائی، قد فتنا قومک من بعدک واضلہم السامری۔ ید بیضا اور موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون کے ساحروں نے البتہ شعبدے کئے تھے۔

قالوا ان ھذان لسحران یریدان ان یخرجکم	کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں، انکا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو سے
من ارضکم بسحرھما ویذھبا بطریقتکم	تمکو تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے عمدہ طریقہ کا دفتر ہی اٹھا دیں
المثلی + فاجمعوا کیدکم ثم ائتوا صفا	تو اب تم ملکر اپنی تدبیر کا انتظام کرو، اور صفیں آراستہ کرو،

اس کے بعد انکے شعبدے اور سیر نجات کا تذکرہ ہے۔ فاذا حبالہم وعصیہم یخیل الیہ من سحرہم انہا تسعیٰ (پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں انکی نظر بندی سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں، جیسے چلتی دوڑتی ہوں) تلمیح قرآنی سے انکار نہیں لیکن "سامری پیش عصا و ید بیضا شعبدہا می کرد" کا واقعہ قرآن میں نہیں، سامری کی مخالفت اور اس کا مردود بارگاہ نبوت ہونا اسوقت کا واقعہ ہے، جب حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے، ظاہر ہے کہ اس کے قبل آپ کو معجزات عصا و ید بیضا عطا ہو چکے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ "ید بیضا اور عصا" سے خود ذات موسوی مراد ہے، تو بھی کہا جاسکتا ہے، کہ موسیٰ کے مقابلہ میں سامری نے تو نیر نجات سحر دکھائے نہ تھے، اور ید بیضا اور عصا سے ذات موسوی مراد لینے پر بھی "ید بیضا اور عصا" سے "شعبدہ سامری" کو جدا نہیں کر سکتے۔

شیخ علی حزیں نے اپنے پہلے شعر میں قرآن مجید کے دو بیان کردہ واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، "درش وادی ایمن" اور "تجلی طرمی سازد" دو فقرے قابل تشریح ہیں۔

فلما اتیہا نودی من شاطئ الواد　　سو وہ جب اس آگ کے پاس پہونچے تو ان کو اسس میدان کے

الا یمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یاموسیٰ انا اللّٰہ رب العالمین (قصص) — داہنی جانب اس مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی میں اللہ رب العالمین ہوں،

یہ ہے سروش وادی ایمن،

فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا (اعراف) — پس انکے رب نے اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اسکے پرخچے اُڑا دئے اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر گئے،

اور یہ ہے "تجلی طور می سازد"۔

اب حزیں کے شعر کا معنی صاف ہے، فرماتے ہیں، میرے قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے، وہ گویا نطق الہامی ہے، اور اس گرانی الہام کے باعث میرا قلم طور کی طرح ٹوٹ رہا ہے "جعلہ دکا" یا میرا قلم طور کی طرح مہبط انوار الٰہی ہو رہا ہے۔

حزیں کے دوسرے شعر میں بھی دو فقرے قرآنی کے واقعات سے مستعار ہیں" طور از ارنی گفتن بر قص آید" اور "بیہوشی موسیٰ" موسیٰ نے کہا تھا رب ارنی انظر الیک لیکن تجلی کی تاب نہ لا سکے، اور بیہوش ہو گئے" خر موسیٰ صعقا" شعر کا مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب ایسا جمال بدیع رکھتا ہے کہ اگر اس کا پر تو طور پر پڑ جائے تو وہ بھی رقص میں آ جاوے، (یہ اشارہ ہے قرآنی آیت جعلہ دکا کی طرف) اور اُس کے جمال کا نظارہ کرنیوالے سمجھ جائیں کہ موسیٰ کی بیہوشی کی حقیقت کیا تھی؟

واقعات یوسفی

حضرت یوسف کے جزوی واقعات اس کثرت سے شعرائے فارس کے کلام میں پائے جاتے ہیں کہ اُن کے یکجا کرنے سے حضرت یوسف کی پوری زندگی مرتب ہو سکتی ہے، فارسی غزلیات کے اندر جو تلمیحات قرآنیہ پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر سورہ یوسف سے مستفاد ہیں۔

نہ یوسفے بہ سفر رفت از پدر گریاں — نہ در سفر بہ سعادت رسید ملک و ظفر (رومی)

کند بہ تخت عزت جا چو از تن جاں بروں آید — بہ شاہی میرسد یوسف چوں از زنداں بروں آید (حزیں)

مرا دل گفت گنج فقر داری در جہاں منگر — نعیم مصر دیدہ کس چہ باید قحط کنعانش (خاقانی)

من چو یعقوب ز بس گریہ شدم دیدہ سفید — آخر آں یوسف گم گشتہ بہ زنداں چونست (خسرو)

یعقوب را دو دیدہ ز حسرت سفید شد — آوازہ ز مصر بہ کنعاں نمی رسد (حافظ)

دیر می جنبد بشیر اے باد بر کنعاں گزر — مژدۂ پیراہن یوسف ببر یعقوب را (جامی)

چہ سود قافلہ مصر حسن یوسف — متاع عشق چو در کارواں کنعان است (جامی)

گریہ را ذوقست کاز تہمتے باعث نشست — ورنہ یوسف در گریباں است یعقوب مرا (عرفی)

بہ کنعاں چشم پاکے در سُراغ خویشتن دارد — نمی ماند بہ کف پیراہن یوسف زلیخا را (حزیں)

قرآن مجید میں جسطرح یوسف کی ابتدائے عمر سے عہد آخر تک کے حالات زندگی ایک جگہ مرقوم ہیں اسقدر

کسی پیغمبر کے حالات ترتیب وار نہیں ملتے، شعرائے فارس نے تقریباً قرآنی واقعات کے تمام اجزا کی طرف اشارے کئے ہیں، بھائیوں کے ساتھ جنگل میں جانا، قافلہ مصر، غلامی، فتنۂ عشق، زندان، آزادی، جاہ و مرتبت، قحط تمام واقعات فارسی شعرا کے یہاں غیر مربوط طریقہ سے غزلیات کے اندر ملتے ہیں، چنانچہ امثلہ بالاسے یہ نظریہ ثابت ہو جاتا ہے،

رومی اور حزین کے خیالات ایک ہی واقعہ پر مبنی ہیں، رومی کہتے ہیں کہ حضرت یوسف باپ سے روتے ہوئے جدا ہوئے تو حکومت پائی، اس لئے انسان کو چاہیئے کہ عالم مادہ سے عالم روح کا سفر اختیار کرے، حزیں کا بھی یہی مطلب ہے لیکن رومی کے پہلے اور حزیں کے دوسرے مصرعہ میں دو واقعات قرآنی کی طرف اشارہ ہے، رومی نے ابتدائے عمر کا واقعہ بیان کیا ہے، جب بھائیوں نے قافلہ مصر کے ہات یوسف کو بیچ ڈالا، وشروہ بثمن بخس دراهم معدودة حزین نے حیات یوسفی کے آخری دور کی طرف اشارہ کیا ہے، جب قید خانہ سے چھوٹ کر دربار شاہی میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے اور آخر میں بادشاہ ہو گئے۔ وقال الملك ائتوني به استخلصه لنفسي فلما كلمه، قال انك اليوم لدينا مكين امين - معنی کے اعتبار سے دونوں میں ایک ہی خیال واکیا گیا ہے، خاقانی نے بھی رومی سے ملتا ہوا خیال ظاہر کیا ہے۔ اور یہ یقیناً اسوقت کا کلام ہے، جب دربار سے تعلق ترک کر دیا تھا، کہتے ہیں کہ میرے دل میں گنج فقیری ہے، یعنی قناعت ہے، اس لئے مجھے دنیا میں تلاش مال و دولت کی ضرورت نہیں، اور میرے گنج فقر کی یہی مثال ہے۔ جیسے "نعیم مصر" کہ اسکے رہتے ہوئے اہل کنعان (برادران یوسف) قحط کی مصیبت میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے، یہ اشارہ ہے قرآن کی آیۃ "الا ترون انی اوفی الکیل وانا خیر المنزلین" کی طرف حضرت یوسف اپنے بھائیوں کو غلہ دیکر کہتے ہیں کہ اگلی مرتبہ آنا تو اپنے چھوٹے بھائی (ابن یامین) کو ساتھ لانا کیا نہیں دیکھتے کہ میں غلہ پورا دیتا ہوں، اور مہمان نواز ہوں، خسرو اور حافظ نے "وابیضت عینٰه من الحزن" کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ معانی میں اختلاف ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ حضرت یعقوب کی طرح میری آنکھیں سفید ہو گئیں، نہیں معلوم میرا محبوب جسکے فراق میں، میں نابینا ہو گیا قید خانہ میں کسطرح ہے، حافظ کہتے ہیں میری آنکھیں حضرت یعقوب کی طرح حسرت دیدار میں سفید ہو گئیں، لیکن تعجب ہے کہ یوسف مصر میں بادشاہ ہیں اور اسکی خبر کنعان میں نہیں پہونچتی، جامی نے پہلے شعر میں قرآن مجید کی آیۃ "فلما فصلت العیر قال ابوهم انی لاجد ریح یوسف" اور "فلما ان جاء البشیر القٰه علی وجهه فارتد بصیرا" کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت یوسف نے پیراہن دیکر بھائیوں کو بھیجا ہے۔ کہ باپ کو خوشخبری دیں لیکن انلوگوں کے پہونچنے سے قبل حضرت یعقوب فرماتے ہیں انی لاجد ریح یوسف مجھے حضرت یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ دوسرے شعر میں جامی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ "قافلۂ مصر" اسوجہ سے "حسن یوسفی" سے مستفید نہ ہو سکا، کہ عشق تو کنعان میں تھا یعنی اہل قافلہ حسن ظاہری کے محاسن جانتے تھے، اور یعقوب اوصاف باطنی سے واقف تھے، اس لئے "حسن یوسفی" سے "تاجران مصر" کے اندر کوئی عشقیہ کیفیت نہیں پیدا ہوئی، یہاں سے وہ معرکۃ الآرا مسئلہ طے پا سکتا ہے، کہ قرآن مجید

نے جمال یوسفی کو اعجاز کی صورت میں پیش کیا ہے یا نہیں، جامی کے اس شعر سے جمال یوسف کے متعلق وہ ہیجان پیدا کرنیکی بحث جو نگار میں شائع ہو چکی ہے، ایک حد تک پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے، چونکہ مولانا جامی کہتے ہیں کہ جمال یوسفی سے (جو عام سطح حسن سے بالاتر نہ تھا یا جسے اعجاز نہیں کہہ سکتے) عشق کی اثیری کیفیت کے فقدان کے باعث اہل قافلہ کو کوئی فائدہ نہ پہونچا یعنی مولانا جامی کے نزدیک حسن یوسف میں ایسا ظاہری بدرع نہ تھا، جسکے باعث قافلہ کو کوئی گہرا اثر ہوتا بلکہ اثر پذیری کے لئے "عشق کنعانی" یا بہ الفاظ دیگر حضرت یعقوب کے التہاب عشقیہ کی ضرورت بتاتے ہیں، جو یقیناً حسن صورت پر مبنی نہ تھا بلکہ حسن معنی پر مبنی تھا۔[۵۰]

عرفی کہتے ہیں مجھے رونے میں لذت ملتی ہے، اس لئے روتا ہوں، ورنہ یعقوب کی طرح میرا اپنے "یوسف" سے جدا نہیں ہوں، میرا یوسف میرے گریبان میں ہے۔ یہاں حضرت یعقوب پر ایک شاعرانہ تعریض بھی ہے وہ یہ کہ حضرت یعقوب ایک وقت فراق یوسفی میں "یا اسفی علی یوسف" (ہائے افسوس، یوسف) کہتے ہیں روتے روتے نابینا ہو جاتے ہیں، حتی تکون حرضا او تکون من الھالکین اور پھر اسی دورِ فراق میں "انی لاجد ریح یوسف" کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے انھیں غم و حزن میں لذت ملتی تھی، اس لئے روتے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ فراق یوسفی ہے۔ اگر یوسف سے فراق ہی تھا تو "بوئے یوسف" کہاں سے محسوس کر رہے ہیں، حزیں کہتے ہیں زلیخا کے ہاتھ میں پیراہن یوسف نہ آسکا اسکی وجہ یہ تھی کہ یعقوب کا فیض باطن انکی نگہبانی کر رہا تھا، واستبقا الباب وقدت قمیصہ من دبر (اور دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور زلیخا نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھاڑ ڈالا)

حضرت عیسیٰ کا احیائے موتی و مایدۂ سما

شعرا نے "دم مسیح" کی اثر آفرینیوں کا بہت کثرت سے تذکرہ کیا ہے، چنانچہ ذیل کے اشعار سے یہ خیال واضح ہوتا ہے۔

لبت بہ خندہ مرا می کشد چہ بد بختم ۔۔۔ کہ داد خوئے اجل بخت من مسیحا را (عرفی)

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل ۔۔۔ کشت ما را و دم عیسیٰ مریم با اوست (حافظ)

مرا چوں دعوت عیسیٰ است عید ہر زمانِ دل ۔۔۔ ولم قربان عید فقر و گنج گاؤ قربانش (خاقانی)

---

[۵۰] مولانا نیاز مدظلہ نے جمال یوسفی کا انکار کیا تھا تو صرف اس بناء پر کہ قرآن مجید نے اسے اعجاز نبوت کی صورت میں نہیں پیش کیا اور نہ جمالیات کسی الہامی مذہب کا موضوع ہو سکتی ہے، اس ضمن میں انھوں نے اس حدیث کی صحت کا انکار کر دیا تھا جس میں حسن یوسفی کے متعلق سرور کائنات نے اظہار خیال فرمایا ہے، مجھے (مولانا کے) اس آخری خیال سے اتفاق نہیں اور نہ مولانا کو اپنے نظریہ کی تائید میں اسکی ضرورت ہے، حسن یوسف کے متعلق صحیح حدیث ہے، لیکن بحث تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے اسے اس صورت میں نہیں پیش کیا جس صورت میں عام لوگوں نے خیال کر رکھا ہے، چنانچہ ایک مصری عالم ڈاکٹر زکی مبارک کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

عرفی اور حافظ کا خیال "احی الموتیٰ باذن اللہ" (آل عمران) پر مبنی ہے، (سورہ مایدہ میں اسکی تفصیل ہے) البتہ اسلوب بیان میں کچھ فرق ہے، عرفی کہتے ہیں میری بدبختی کی یہ انتہا ہو گئی کہ مسیح بھی میرے لئے باعث اجل بن رہا ہے، اس کا ایک متبسم سحر آفرین "میرا شیرازۂ حیات منتشر کرنے کے لئے کافی ہے، حافظ کے بیان میں بالکل سادگی ہے، وہ کہتے ہیں میرا محبوب دم مسیح رکھتا ہے، لیکن باوجود اس کے اس نے میری جان لی، یہ ایک عجیب نکتہ ہے، خاقانی کہتے ہیں کہ فقر کی عید سے میرے اندر ایک ایسا نشاط باطن موجود ہے، کہ میں ہمیشہ دعوت عیسیٰ کا لطف اٹھا رہا ہوں، اور ایسی عید پر "گنج گاؤ" بھی قربان ہے، خاقانی نے پہلے مصرعہ میں سورۂ مایدہ کی آیت ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا وآخرنا وآیۃ منک (اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائے کہ وہ ہمارے لئے یعنی جو ہم میں اول ہیں اور جو بعد ہیں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے، اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے) کی طرف اشارہ کیا ہے خاقانی کے شعر میں لفظ "عید" بھی قرآن سے مستعار ہے۔

میرے پاس کلیات خاقانی کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ ہے، جسکی تاریخ کتابت سے پتہ چلتا ہے، عہد ظفر میں لکھا گئی ہے، اس میں خاقانی کے تمام فارسی قصائد ہیں، مرقومہ بالا شعر کی شرح میں حاشیہ پر لکھا ہوا ہے،

"و گنج گاؤ آنست کہ مردے در بنی اسرائیل پوست گاؤ بہ دینار ہائے زر پر کردہ، بجائے گاؤ دادہ بود، کما قولہ تعالیٰ اذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ و بعضے گویند کہ "گنج گاؤ" آنست کہ فریدوں در اثنائے راہ در زمین کشت زار یافتہ بود۔"

شارح کا پہلا نظریہ کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتا، سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، مندرجہ بالا آیت سے واقعہ کی ابتدا ہوتی ہے، اور یہ مکیم آیتہ لعلکم تعقلون تک ختم ہوا ہے، فریدوں نے "گنج گاؤ" نہیں پایا تھا بلکہ کہا جاتا ہے کہ یہ جمشید کا خزانہ تھا اور زمین کے اندر سونے چاندی کے بیل بچھیڑے، اور قسم قسم کے جانور تھے، بہرام گور نے اسے پایا اور کل فقیروں کو بانٹ دیا! دوسرا نظریہ خاقانی کے فقرۂ "گنج گاؤ قربانش" سے بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے، قربان سے یہاں ذبح گاؤ مراد نہیں بلکہ وہی فقرا او رغربا کے درمیان میں تقسیم مراد ہے،

حالات خضر[۱] پر دینیاتی اور صنمیاتی نظر

فارسی شعرائے "خضر" کے متعلق بہت سی نکتہ سنجیاں کی ہیں چونکہ اسلامی دنیا میں بعض احادیث کی بنا پر سورۂ کہف کے ایک واقعہ کو خضر ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں فارسی شعرا کی تلمیحات قرآنیہ پر غور کرنے سے پہلے

---

[۱] "خضر" کی بحث نگار میں ایک مرتبہ آچکی ہے، اور حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کے باہمی نزاع کو فرمایان کی تاریخ بھی اسی مسئلہ سے شروع ہوئی، اور میں نے "شبیہ نیاز" (جو اخباری دنیا میں میری زندگی کا سب سے پہلا مضمون تھا) بقیہ صفحہ ۱۶ پر

ضروری ہے کہ خود خضر کی ہستی اور اُن سے متعلقہ واقعات پر تنقیدی روشنی ڈالی جائے، اس مسئلہ میں ہمارے سامنے علم و معارف، تحقیق و تنقید، واقعات و روایات کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔

اپنی موجودہ تحقیق کی بنا پر ہم حالات خضر پر، مذہبی ضمیاتی اور شاعرانہ تین پہلوؤں سے بحث کرسکتے ہیں، مذہبی عنوان کے ماتحت قرآن مجید، صحیح حدیث، صوفی ادبیات ہیں، سورہ کہف میں موسیٰؑ کے سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ مذکور ہے امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں اس واقعہ کو خضر اور موسیٰ کا واقعہ بتایا ہے، اور اسکی تائید میں بہت طویل حدیث روایت کی ہے، اسی طرح جامیؒ نے نفحات الانس میں احمد بن الحواری، اور ابوبکر کتانی کے سلسلہ میں متیسری اور چوتھی صدی کے افسانہ ہائے خضر کے متعلق بہت دل خوش کن باتیں لکھی ہیں، تاریخ فرشتہ میں بہ سلسلہ خسرو دہلوی خضر کا ایک دلچسپ واقعہ پایاجاتا ہے۔ اور جب ایک محقق کی نظر "انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس" کے اس نظریہ پر پڑتی ہے، کہ قدیم اسرائیلی ادبیات میں خضر کا وجود تھا اور اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے اعمال خضر کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں وہ جامی کے بیان کردہ واقعات سے خاص مماثلت رکھتے ہیں تو نتیجہ نکلتا ہے، کہ تصوف اسلام پر یہودیت کا بھی اثر پڑا ہے، یونانی، بابلی اور اسرائیلی ضمیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا میں خضر کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں انکے بعض اجزاء سکندر اعظم کے فسانہ میں ہیں، اور بعض

(بقیہ صفحہ ۱۵) اسی ذکی جھوک سے متاثر ہوکر لکھا تھا، اسمیں شک نہیں۔ مضمون لکھنے کی تحریک نگار بابت مارچ ۱۹۲۸ء کے اس نمبر سے ہوئی جس میں مولانا نیاز صاحب مدظلہ کی شبیہ شائع ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ میری اخباری زندگی اور مستقل مضمون نگاری، ہندوستان کے دو نامور، اور فاضل ادیبوں کے رد و احتجاج کی پیداوار ہے، جسکے لئے میں دونوں حضرات کا مرہون منت ہوں، لیکن ساتھ ہی حضرات علماء سے یہ شکایت کرنیکو جی ضرور چاہتا ہے کہ قوم کے نوجوانوں کی علمی ہمت افزائی میں وہ بہت بخل سے کام لیتے ہیں، اور بعض حضرات کے متعلق تو میرا خیال ہے، کہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی طالب العلم انکے نقش قدم پر چلکر ادیب یا فاضل بننے کی کوشش کرے، اس معاملہ میں ایک ہستی کے ساتھ میری عقیدت اور نیازمندی پرستش کی حد تک پہونچ گئی ہے یعنی مولانا نیاز صاحب نے جس وسعت قلبی، اور بزرگانہ اخلاص و عطوفت کیساتھ مجھے ادبی ذوق دلایا، وہ میری تمام زندگی کا واحد تجربہ ہے اور بعض اوقات یقیناً اصحاب جبہ و دستار کے مقابلہ میں حافظ کا یہ شعر پڑھ لینے کو جی چاہتا ہے ؎ بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن ؍ مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند ؎ بات میں بات نکلتی ہے، دراصل فٹ نوٹ میں لکھنا چاہتا تھا کہ نگار بابت جون و جولائی ۱۹۳۰ء کے نمبروں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا نیاز صاحب مدظلہ نے اب ایک دوسرا ادبی شگوفہ جو حضرات علماء کی اصطلاح میں مذہب اسلام پر ایک جدید حملہ کے مترادف ہے، یہ کھلایا ہے کہ قرآنی قصص کو تاریخی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ صاف یوں کہئیے قصص قرآنی کے تاریخی پہلو سے وہ انکار کرتے ہیں، یہ کوئی جدید اعتراض نہیں ڈاکٹر لسٹڈل نے "ماخذ قرآنیہ" قرآن کے اکثر بیان کردہ قصص کو افسانہ، حکایات، اور توہم و اساطیر بتایا ہے، میرے مخدوم مکرم جسوقت اس مسئلہ پر قلم اٹھائیں گے میں تفصیل سے مستشرقین کے اعتراضات قدیم، افسانوں کے تراجم، قرآنی قصص کی صحیح تاریخی پہلو پیش کرونگا۔ بحمد اللہ یہ مضمون میرے ذوق کی چیز بھی ہے، مجھے فخر ہے اور فخریہ کہتا بھی ہوں کہ "انشا" میں حضرت مولانا کے مخدوم میرے اُستاد ہیں، اس لئے اس معرکہ آرائی پر ناظرین نگار کو دعوت لطف نشاط ضرور دیجا سکتی ہے۔

حصّے "اسرائیلی اوہام واساطیر" میں پائے جاتے ہیں، جیمس کے قاموس المذہب والاخلاق (انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن اینڈ اتھکس) میں خضر کے متعلق ایک بسیط مقالہ ہے جس پر مینیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، اس کا ترجمہ وتلخیص ہدیۂ ناظرین ہے، مقالہ نگار، جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید "بابلی علم الاصنام والاوہام" اور "اسرائیلی ضعیات" سے بھی ہوتی ہے، جس کے نسخے ہمارے پیش نظر ہیں۔

حالات خضر پر بحث کرنیکے سلسلہ میں پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے اس پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے، اور مستشرقین یورپ نے اس ضمن میں قرآن مجید پر جو اعتراض کیا ہے، اس کی کہاں تک اصلیت ہے؟ سورۂ کہف کے آٹھویں رکوع میں سلسلۂ ذیل واقعات ملتے ہیں،

"اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں برابر چلا جاؤں گا، یہاں تک کہ اس موقعہ پر پہونچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں، یا یوں ہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا، پس جب وہ دونوں دو دریاؤں کے جمع ہونے کے موقعہ پر پہونچے، اس اپنی مچھلی کو دونو بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی، اور چلدی، پھر جب دونوں آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ، ہمکو تو اس سفر میں بڑی تکلیف پہونچی، خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھیرے تھے سو میں اس مچھلی کو بھول گیا۔ اور مجھکو شیطان ہی نے بھلا دیا، کہ میں اُسکا ذکر کرتا اور اس مچھلی نے دریا میں عجیب طور پر راہ لی، موسیٰ نے فرمایا کہ یہی وہ موقعہ ہے جسکی ہمکو تلاش تھی، سو دونو اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے لوٹے، سو اُنھوں نے میرے بندوں میں سے ایک خاص بندہ کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی، اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا، موسیٰ نے اُن سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے، اُسمیں سے آپ مجھکو بھی سکھلا دیں، ان بزرگ نے جواب دیا، آپ سے میرے ساتھ رہ کر صبر نہ ہو سکے گا، اور ایسے اُمور پر آپ کیسے صبر کر سکینگے جو آپ کے احاطۂ واقفیت سے باہر ہیں، موسیٰ نے فرمایا آپ مجھکو انشاء اللہ صابر پائیں گے، اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کرونگا، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں، جبتک کہ اس کے متعلق خود ہی ابتدا ذکر نہ کر دوں"

"پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے، تو ان بزرگ نے اس کشتی میں چھید کر دیا موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اسکے بیٹھنے والوں کو .... غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری بات کی ان بزرگ نے کہا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکیگا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے، اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اسکو مار ڈالا، موسیٰ کہنے لگے کہ آپ نے ایک بیگناہ جان کو بے کسی جان کے بدلے مار ڈالا، بیشک آپ نے بڑی بیجا حرکت کی، ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے

نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ نے فرمایا اگر اس مرتبہ کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق کچھ پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر کو پہونچ چکے ہیں، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گذر ہوا، تو وہاں کے باشندوں سے کھانے کو مانگا تو انھوں نے انکی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا، اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی، تو ان بزرگ نے اسکو سیدھا کر دیا، موسیٰ نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اُجرت ہی لے لیتے، ان بزرگ نے کہا، کہ یہ وقت ہماری اور آپکی علیحدگی کا ہے، میں ان چیزوں کی حقیقت بتائے دیتا ہوں، جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکے گا۔"

"وہ جو کشتی تھی سو وہ چند غریب آدمیوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، سو میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈالدوں، اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا، اور رہا وہ لڑکا سو اُس کے ماں باپ ایماندار تھے، سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈالدے، پس ہکو منظور ہوا کہ بجائے اس کے انکا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے، جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو، اور محبت کرنے میں اس سے بڑھکر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں ہیں اور اس دیوار کے نیچے اُن کا کچھ مال مدفون تھا، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہونچ جاویں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔"

بخاری کے اندر کتاب التفسیر میں تفصیل کے ساتھ قرآن کے اس واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، چونکہ حدیث میں چند باتوں کے سوا وہی باتیں مذکور ہیں جو قرآن میں ہیں، اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں، ہاں بعض وہ باتیں لکھدینا ضروری ہیں جن سے قرآن کے بعض اجمال کی تفصیل ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں خضر کا نام نہیں، صرف "عبدٌ من عبادنا" (میرے بندوں میں سے ایک بندہ) کہا گیا ہے، حدیث نے بتایا کہ یہ خضر تھے،

عن سعید ابن جبیر قال لابن عباس ان نوفا بکالی یزعم ان موسیٰ بنی اسرائیل لیس بموسیٰ الخضر فقال کذب عدو اللہ حدثنا ابی ابن کعب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قام موسیٰ خطیبًا فی بنی اسرائیل الخ

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ "نوف بکالی" کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے موسیٰ وہ نہیں ہیں جو خضر کے موسیٰ تھے، حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہم سے حضرت ابی ابن کعب نے بیان کیا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ نے فرمایا کہ موسیٰ بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تا آخر حدیث،

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ سے دریافت کیا کہ صفحہ ارض پر سب سے زیادہ کون علیم ہے آپ نے کہا میں، اس پر خدا نے ان کو سفر کرنے کی ہدایت کی، اور خضر سے ملایا جسکی تفصیل قرآن میں ہے، قرآن مجید میں صرف

عبدٌ من عبادنا ہے اور اس کے بعد اسکی ضمیر محذوف آئی ہے، لیکن حدیث میں مذکور ہے۔ کہ صاف طور پر آنحضرت نے "خضر" کا نام لیا ہے، مثلاً "قال لہ الخضر یا موسیٰ"۔ قرآن مجید میں کہیں "چشمۂ حیواں" کا تذکرہ نہیں، لیکن حدیث میں مروی ہے کہ موسیٰ کے خادم یوشع بن نون جنھیں انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار یونانی ضنیات کے حوالہ سے (Andreas) کا مبدا منہ بتاتا ہے، ایک چشمہ پر پہونچے تو یوشع بن نون کے ساتھ جو مچھلیاں تھیں ان پر پانی پڑا اور وہ زندہ ہو کر دریا میں داخل

قال و فی اصل الصخرۃ عین یقال لہا الحیاۃ لا یصیب من ماءِ ہا شیءٌ الا حی فاصاب الحوت من ماءِ تلک العین قال فتحرک وانسل من المکتل فدخل البحر۔

(امام بخاری نے عبادہ کی حدیث معلقاً بیان کردی ہے، پوری حاکم نے نقل کی ہے) اُنھوں (عبادہ) نے کہا کہ اس چٹان کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جسے لوگ "حیات" کہتے تھے، جس شے پر اس کا پانی پڑ جاتا زندہ ہو جاتی، پس اس چشمہ کا پانی ان مچھلیوں پر پڑ گیا، اُنھوں نے پس وہ حرکت کرنے لگیں اور جھولی سے کود کر دریا میں چلی گئیں،

قرآن مجید میں صرف مچھلی کے چلے جانے کا تذکرہ ہے۔

فلما بلغ مجمع بینہما نسیا حوتہما فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا۔

جب دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہونچے اس مچھلی کو دونوں بھول گئے، اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی،

ان واقعات کے مقابلہ میں "انسائیکلو پیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" کے ایک مقالہ کا حسب ذیل ترجمہ قابل غور ہے۔

"خضر" (سبز آدمی) ایک مسلمان ولی کا نام یا لقب ہے جو اہل اسلام کے عام خیال کے مطابق ہنوز زندہ ہیں، باوجود چند مساعی کے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کہ اس نام کی ابتدا کہاں سے ہوئی، لفظ "خضر" کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی ہو، لیکن یہ قطعی امر ہے، کہ خضر کی ہستی کے متعلق (جیسا خیال اسلام میں پایا جاتا ہے) کوئی واحد مخصوص ماخذ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مجموعہ ہے ان اوہام اور اساطیر کا، جو مختلف صورتوں میں ان ممالک اسلامیہ کے اندر مشہور تھے جن پر بعد میں مسلمانوں نے قبضہ کیا۔"

"یہ صحیح طور پر کہا جاتا ہے، کہ خضر (Mohammedan Syncretism)[سلہ] کی پیداوار ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خضر کا تمامتر وجود، باوجود اس کے کہ وہ جماعات اسلامیہ میں ایک معروف حیثیت رکھتے ہیں، محض غیر اسلامی عناصر پر مبنی ہے، اسلام کو اس سے یہی تعلق ہے کہ ان تمام متضاد روایات کو ایک مربوط

سلہ (Syncretism) کہتے ہیں ان افکار و عقائد کی جبا تاویل اور تطبیق کو یا ان مختلف جماعات کی یگانگت ثابت کرنے جو باہم متنازع ہیں۔

واقعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا ہے، یہاں پر افسانہ خضر کے پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرنا ممکن ہے، ہم لوگ مختصر طور پر ان ماخذ کا تذکرہ کریں گے، جہاں جہاں سے یہ فسانہ لیا گیا"

"عام طور سے اسلامی ادبیات اور بے شمار فارسی اشعار میں خضر کے متعلق اعتراف کیا گیا ہے، کہ انہوں نے آب حیات نوش کر کے غیر فانی زندگی حاصل کر لی، ایک قدیم اسلامی مورخ کے قطعی فیصلہ کے مطابق "خضر" ذوالقرنین (جو شامی عربی اصطلاح میں اسکندر اعظم کا خطاب ہے[۱]) کے وزیر تھے، جنہوں نے چشمہ حیواں کا پتہ لگا لیا، جسے انکے ولی نعمت نہ پا سکے، یہ واقعہ بلا ریب ہم لوگوں کی توجہ "چشمہ حیواں" کے اس قصہ کی طرف مبذول کراتا ہے، جو کہ "فسانہ سکندر یونانی" میں پایا جاتا ہے، اور جو ....

(Pseudo callis thenes) کے نام سے شروع ہوتا ہے، یہ کتاب ۳۰۰ء میں ختم ہوئی اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ "اسکندر ابدی زندگی حاصل کرنے کی امید میں چشمۂ حیوان کی تلاش کے لئے نکلا اتفاقاً اسکے باورچی کو (جو بعض روایات میں (Andreas) کے نام سے مشہور ہے) یہ چشمہ مل گیا، وہ ایک نمک آلود یا خشک مچھلی چشمہ میں دھو رہا تھا کہ یکایک مچھلی میں جان آگئی، اور وہ پانی میں غائب ہو گئی باورچی نے چشمہ سے پانی نوش کیا اور حیات سرمدی حاصل کر لی، اسکندر نے جب پھر چشمۂ حیواں کا پتہ نہ لگ سکا، حسد اور یاس میں باورچی کو مار ڈالنے کا فیصلہ کیا، لیکن چونکہ وہ ایک غیر فانی زندگی حاصل کر چکا تھا، اسکندر نے اسکے گلے میں ایک بڑا پتھر لٹکا کر اسے دریا میں پھینک دیا، جہاں وہ ایک "بحری شیطان" (Sea-Demon) ہو گیا۔"

یہ قصہ جو ابتداً ایک جداگانہ افسانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس حیثیت سے شامیوں میں مشہور ہوا اور انکی وساطت سے عربوں میں مقبول رہا، اس کا ایک پرتو قرآن میں پایا جاتا ہے، جس میں دوسرے ضمیاتی روایات کی طرح یہ بھی مرقوم ہے، اسلامی ماخذ سے پتہ چلتا ہے، کہ اسکندر کے باورچی جسنے نمک آلود مچھلی کے ذریعہ چشمہ حیوان کا پتہ لگایا "خضر" ہی ایک قیاس کے مطابق جسے چند علماء پیش کرتے ہیں (اور جو میرے نزدیک نا معتبر ہے) "خضر" اس بحری شیطان کا لقب ہے، جس میں اندریاز باورچی کو تشکل کر دیا گیا تھا جبکہ اسے سمندر میں ڈالا گیا۔[۲]

۱؎ یہ غلط "شامی عربی" اصطلاح ہے، ذوالقرنین سکندر بن فیلقوس یونانی کا لقب نہیں نہ قرآن میں وہ مراد ہے، بلکہ اس سے ایک یمنی سلطان مراد ہے، جو اپنے تاج میں ہلال کی شکل لگایا کرتا تھا، پیشانی پر اگر ہلال کی شکل بنائیں تو معلوم ہوگا کہ دو سینگ ایک اپنی جانب دوسری بائیں جانب ہو گئے ہیں، "دی سپرٹ آف اسلام" میں تو طویل بحث ہے۔

۲؎ مقالہ نگار حاشیہ میں لکھتا ہے کہ "چشمہ حیواں" کا قصہ (GLAUKES) ضمیات سے بھی ایک دلچسپ مماثلت رکھتا ہے، یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے (اور میں اسپر یقین رکھتا ہوں) کہ "خضر" اور (TLAUKOS) جو ہم معنی الفاظ میں وجود کے اعتبار سے بھی ایک ہی حیثیت رکھتے ہوں بعض لوگوں نے خضر کو (HASISATRA) کی تحریف قرار دی ہے جو گلگیمش (بابلی ضمیات کے ہیرو) کا مورث اعلیٰ تھا اور جسکے واقعات بابلی ضمیات میں ملتے ہیں۔

خضر کی دوسری تعیین پیغمبر ایلیا (ELIJAH) کی شخصیت میں کی جاتی ہے، یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ایلیا (ELIJAH) کے فرائض میں یہ داخل ہے، کہ وہ یہودیوں کی ہر تقریب میں حاضر رہتے ہیں۔ بہ شرطیکہ شراب کا ایک پیالہ اُنکے لئے بھی الگ رکھدیا جائے، (ELIJAH) کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ علما اور فضلا پر وحی کرتے ہیں، اور اُن کے قلوب میں انوار الہیہ ودیعت کرتے ہیں۔ اور یہودی قانون کے مختلف مسائل کا علم عطا کرتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ ان سے راہ اور ویرانہ میں ملاقات ہوتی ہے، عہد آخری کے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) "الہام ایلیا" (REVELATION OF ELIJAH) کا عام عقیدہ رکھتے تھے، اور انہیں بہتیرے افراد کا دعوی ہے کہ اُنکے صوفیانہ خیالات بلکہ اُنکی پوری کتاب اس پیغمبر کی ذاتی رفاقت کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کا ایک قصہ جسے گیارہویں صدی میں ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے۔ (لیکن چونکہ بلاشبہ بہت قدیم عہد کی چیز ہے) یہاں پر لکھدینا مناسب ہے، اس قصہ میں بیان کیا گیا ہے، کہ ایلیا (ELIJAH) تیسری صدی کے ایک ربی "ز... (RABBI)" کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور وہ بہت سے ایسے حادثات دکھاتے ہیں جو بظاہر عدل خداوندی کے خلاف ہیں۔ لیکن جب پیغمبر "ایلیا" اسکی تشریح کرتے ہیں تو وہی حادثات حکمت اور عدل الہیہ کا ایک تعجب انگیز نمونہ ثابت ہوتے ہیں یہ قصہ یا اس کے بعض ابتدائی اجزا نے قرآن میں داخلہ پایا "تلمود" کے "ربی" کی جگہ موسیٰ نے لی اور ایلیا (ELIJAH) کی جگہ ایک مجہول اور بے نام شخص "میرے بندوں میں سے ایک بندہ" نے پائی۔

محمدؐ کے زمانہ میں یہودی عقیدہ مشہور تھا، چونکہ "ایلیا" کی طرح خضر کی خاص صفت اُنکی ابدی زندگی ہے، اسلئے ان دونوں ہستیوں کو ایک قرار دینا بالکل تقاضائے فطرت تھا پس اسلامی علما اور فقہا حیرت انگیز طور سے متفق الرائے ہو کر ظاہر کرتے ہیں کہ "بندہ" سے جسکا تذکرہ قرآن میں ہے "خضر" کے سوا کوئی دوسری ہستی مراد نہیں"۔

یہ دو ضمیاتی افکار یعنی "چشمہ حیوان" اور "فسانہ ایلیا" جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ چیز اور مختلف ذہن اور مختلف ممالک کی پیداوار تھے، ایک مصنوعی اور پیچیدہ طریقہ سے قرآن کے اندر ایک ہی واقعہ کی صورت میں بیان کر دئے گئے اور صرف یہی نہیں کہ اسلامی علمائے دین قرآن کے اس بیان کردہ واقعہ کو ایک واحد مسلسل حقیقت تصور کرتے ہیں۔ بلکہ ان معلومات کا علم ہوتے ہوئے بھی جو حقیقت پس پردہ کا درجہ رکھتے ہیں مغربی علما بھی واقعہ کی یگانگت اور دو مختلف روایات کا واحد مسلسل واقعہ ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

ان دو واقعات کی مخلوط صورت کا یہ اثر ہوا کہ قدیم لا مذہب (PAGAN) قوموں میں خضر کے متعلق "بحری شیطان" جو عقیدہ تھا وہ مٹ گیا اسلام میں خضر کا تقدس کیا گیا اور بعض علمائے اسلام نے انھیں ولی اور پیغمبر، اور بعض نے فرشتہ ثابت کیا، مسلمان علمائے قصص و اساطیر نے خضر کو باورچی سے وزیر کے درجہ پر لا کھڑا کیا، اسمیں شک نہیں کہ مسلمان ابتداً (ELIJAH) اور خضر کی اساطیری قسم کی حیثیت میں کافی مماثلت پاتے تھے،

کیونکہ انکا خیال ہے کہ خضر کا اصلی نام ایلیا (ELIYAH) ہے جو یہودی (ELIJAH) کی تحریف ہے وہ یہودی جو اسلامی ممالک میں رہتے تھے ان دو اسماء کے باہمی تناسب معنوی کے قائل تھے، چونکہ جسکا نام (ELIJAH) ہوتا وہ خود کو "خضر" کہا کرتا، اور ترک آج بھی ہمارے پیغمبر کو "خضر لاس" (خضر الیاس) کہکر دونوں الفاظ کے ہم معنی ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

جو بات زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے، کہ "ایلیا" کی خصوصیات اور کمالات کو خضر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خضر کو ایلیا کی طرح ہر جگہ حاضر تیا پایا جاتا ہے، اور جب انکا نام لیا جاتا ہے، تو حاضر ہو جاتے ہیں، وہ حاجت کے وقت ایک مددگار اور صلاح کار ہوتے ہیں، وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ان کی رفاقت کے لائق ہوتے ہیں اور علم اسرار الٰہیہ سکھاتے ہیں، ایک حدیث کے مطابق وہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ کی تسلی کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہودیوں کے (KABBALISTS) کی طرح صوفیائے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی رفاقت کا شرف حاصل کرتے ہیں، بیشمار قصے مشہور ہیں کہ کس طرح خضر نے خاص خاص صوفیائے کرام کو اپنی تعلیم و تربیت سے مستفیض کیا اور عبادت و ریاضت کے طریقے بتائے، اور بہتیری کتابوں کے متعلق انکے مصنفین کا دعویٰ ہے کہ وہ خضر کی بلا واسطہ تعلیم کا نتیجہ ہیں خضر اور ایلیا کے قصوں میں اور بھی قریبی مماثلت یوں پائی جاتی ہے کہ جسطرح تصنیفات میں ایلیا کو (PHINEHAS) سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح اسلامی تصنیفات میں خضر کا بھی حال ہے، اور جس طرح مسلمان قصہ نگاروں کی کتاب میں خضر کو ایک بدوی کے بھیس میں پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح "تلمود" میں ایلیا کے متعلق بھی واقعات ملتے ہیں اور بھی اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں، جن سے دونوں واقعات کے تمثل اور...... یگانگت پر کافی روشنی پڑتی ہے،

اس وجہ سے کہ قرآن کے اندر ایلیا کا نام یونانی شامی زبان میں الیاس وارد ہوا ہے اور الیاسس کا واقعہ (POSHBIBCHICAL) سے زیادہ بائبلی رنگ میں پایا جاتا ہے، علمائے اسلام مجبور ہوئے کہ "خضر ایلیا" اور الیاسس کو دو ہستیاں تصور کریں، الیاس اور خضر کا ابتدائی کارنامہ اس عقیدہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جو مسلمانوں میں مسلم ہے، اور جس کی وضاحت قصص کی بے شمار روایات سے ہوتی ہے، چونکہ دونوں پیغمبروں پہ مسافروں کو انکے سفر میں مدد کرنیکی ذمہ داری ہے، اس لئے ایلیا "مکلف فی البر" (خشکی پر متعین ہیں اور...... خضر "مکلف فی البحر" (تری میں مدد کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں مفتوح قومیں اسلام کے اندر اپنی بعض تعلیم بھی ساتھ لائیں اس صورت سے اسلامی ممالک محروسہ میں "خضر" مختلف عقائد و اوہام کا مرکز قرار پا گیا، جہانتک ملک شام کا تعلق ہے "گرلش" اور "سی کلر" ...

کی تصنیفات سے خضر کے متعلق بعض اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ کرٹش کا بیان ہے، کہ اس نے سواحل شام پر خضر کے نام سے بہتیرے معابد (SANCTUARIES) دیکھے جہاں پر آج انکے (خضر) کے نام پر قربانیاں چڑہائی جاتی ہیں، اور جانور کا پہلا بچہ قربان کیا جاتا ہے، چنانچہ کرٹش کا بیان ہے کہ اس سے ایک مسلمان نے کہا کہ "خضر نزدیک ہیں اور خدا دور ہے" خضر کے ساتھ ایسی تعظیمی عقیدت (جسے عبادت سے تعبیر کر سکتے ہیں) کا واقعہ دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ قدیم سامی عقائد آج تک متداول ہیں، خصوصیت کے ساتھ قدیم "بابلی تاخر" تعلیم کی روح ہنوز باقی ہے،

اسلامی علمائے دین ہمیشہ اس افراط کے مخالف ہیں انھوں نے اس حدیث صحیح کے مطابق کہ "نبی صلعم کی وفات کے بعد خضر تشریف لائے" وجود خضر کو تو تسلیم کیا لیکن انھوں نے یہ بتایا کہ وہ آنحضرت کے معاصر تھے، اور آپکی وفات کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد انتقال کر گئے، لیکن یہ تعلیم چونکہ صوفیہ کے "اوہام خضر" کے مخالف تھی، اسلئے کامیاب نہ ہو سکی۔

انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کا اعتراض یہ ہے کہ خضر کے سلسلہ میں جو واقعات قرآن نے پیش کئے ہیں انھیں علم الاصنام کے وہ مختلف واقعات کی صناعانہ رنگینی بیان سے تعبیر کر سکتے ہیں، حالانکہ ہر شخص بادنےٰ تامل سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے موسیٰ اور انکے خادم کے سلسلہ میں مچھلی کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اُسکا ماخذ یونانی ضنمیات نہیں ہو سکتی، چونکہ یونانی علم الاصنام کی بنا پر "انڈریاز" کو آب حیوان پینے اور حیات جاوید حاصل کرنے پر اپنی ناکامی کے غضب میں اسکندر نے دریا میں ڈالدیا اور وہ ایک بحری شیطان ہو گیا، حالانکہ موسیٰ اور اُنکے خادم یوشع بن نون کے درمیان اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، صرف مچھلی کے غائب ہونے کے مسئلہ پر اگر قرآنی اور ضنمیاتی (یونانی) واقعہ میں یکرنگی پائی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا، کہ یونانی ضنمیات قرآنی واقعہ کا ماخذ ہے، اگر قرآن نے یہ بیان کیا ہوتا کہ موسیٰ نے یوشع بن نون کو مچھلی کے غائب ہونیکے غصہ میں دریا کے اندر ڈالدیا، تو البتہ ایک وجہ مماثلت تھی، کیونکہ اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ میں، اصل فسانہ "انڈریاز" کا "بحری شیطان" بننا ہے، نہ کہ مچھلی کا غائب ہو جانا اس لئے معلوم ہوا کہ قرآن نے موسیٰ اور یوشع کے جو واقعات بیان کئے ہیں انکو اسکندر اور انڈریاز کے افسانہ سے تعلق نہیں۔

البتہ اسرائیلی روایات سے مدد لیکر موسیٰ اور خضر کی مرافقت اور مکالمہ کے متعلق جو کچھ انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے وہ ایک حد تک قرآن کے بیان کردہ واقعات سے ملتا ہوا ہے، اور اسمیں جرح بھی نہیں چونکہ بہت سے اسرائیلی واقعات قرآن میں پائے جاتے ہیں، البتہ مقالہ نگار نے اسرائیلی واقعہ کو (POST BIBBICAL) بتایا جاتا ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے علم الاصنام میں یہ واقعات ملتے ہیں انکا یہ کوئی مذہبی عقیدہ نہیں بہرحال دماغ انسانی کی مجوبہ نوازیاں ہر قدیم واقعہ کے ساتھ مل کر حقیقت پر پردہ ڈالدیتی ہیں اور اس لئے آیندہ نسلیں درایت کے لحاظ سے انھیں نامعتبر خیال کر کے

یکسر وہم و افسانہ کہہ دیتے ہیں علم الاصنام والاوہام" (MYTHS OF LEGENDS) کے بیشتر افسانے حقیقتوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، خضر کا تعلق حقیقتوں سے ہے لیکن ضعیات نے ان پر اپنا گہرا اثر پیدا کر دیا ہے، خضر کو اسلامی ضعیات کے درجہ پر پہونچانے والے صوفی شعرا تھے، چنانچہ حضرت جامی حضرت احمد بن الحواری تیسری صدی کے ایک مشہور ولی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

احمد بن السماک بیمار تھے (احمد بن الحواری فرماتے ہیں) میں ایک نصرانی طبیب کے یہاں انکا قارورہ لیکر چلا تو راستہ میں ایک خوبصورت آدمی ملا، جو عمدہ اور خوشبودار لباس پہنے ہوئے تھے، اُنھوں نے فرمایا کہاں جاتے ہو میں نے کہا فلاں طبیب کے یہاں جاتا ہوں تاکہ ابن سماک کا قارورہ دکھاؤں، اُنھوں نے فرمایا، کہ سبحان اللہ خدا کے دوست کے علاج میں خدا کے دشمنوں سے مدد لیتے ہیں اس قارورہ کو زمین پر پٹک دو، اور ابن سماک سے کہو کہ جہاں درد ہے، اپنا ہاتھ رکھکر کہے بالحق انزلناہ وبالحق نزل پھر ایسا غائب ہو گئے کہ میں نے نہ دیکھا پس ابن سماک کے پاس میں آیا اور واقعہ بیان کیا، اُنھوں نے درد کی جگہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور جو کچھ اس آدمی نے سکھایا تھا کہا، اوسی وقت تندرست ہو گئے اور فرمایا "آن مرد خضر بود علیہ السلام"۔

اسی طرح ابو بکر کتانی (متوفی ۳۲۲ھ) کے سلسلہ میں افسانہ خضر کے بہت دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔

شیخ الاسلام گفت کہ وے صحبت دار خضر بود، وقتے خضر وے راگفت یا ابا بکر مہ مرداں ازیں طائفہ مرا می شناسند ومن ایشاں رامی شناسم اولے گفت کہ خضر گفت کہ در مسجد صفا بودم بہ یمن مردم بر عبد الرزاق حدیث می اشنند و در گوشہ مسجد جوانے بود سر در گریباں فرو بردہ، گفتم مردم بر ..... عبد الرزاق حدیث می خوانند و تو ایجا نشستہ چرا نہ روی وازوے حدیث شنوی گفت من اینجا از "رزاق" می شنوم تو مرا با عبد الرزاق می خوانی گفتم اگر راست می گوئی من کیم گفت خضر و سر در گریباں فرو برد"

یہ واقعات بالکل یہودیت سے ماخوذ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقرا نے یہودی صوفیہ (KABBALISTS) کی ہمنوائی میں یہ ضعف اعتقاد پیدا کر لیا ہے کیونکہ یہ تخیلات انسائیکلوپیڈیا کی تصریحات کے مطابق صوفیائے یہود میں مروج تھے۔

چونکہ ڈاکٹر نکلسن نے ثابت کر دیا ہے کہ ارتقائے تصوف میں یہودیت نے بھی حصہ لیا ہے، اس لئے بہت ممکن ہے، خضر کی رہبری تعلیم وغیرہ کے متعلق جو کچھ صوفی ادبیات میں پایا جاتا ہے، وہ یہودیت سے ماخوذ ہو۔

فارسی زبان کے اکثر ابتدائی شعرا خود صوفی تھے، اس لئے اُنھوں نے علم الاصنام کے وہ تمام افسانے اپنی شاعری میں منتقل کرنا شروع کئے جنکا اسلام کی مذہبی ادبیات سے چنداں تعلق نہیں، چنانچہ خاقانی کہتے ہیں۔

کسے کیں خضر معنی راست دامنگیر چون سی   کف موسی وآب خضر بینی در گریبانش

خاقانی کی زندگی کے دو اہم پہلو تمام مورخین نے بیان کئے ہیں چنانچہ تذکرہ دولت شاہ اور نفحات الانس جامی میں آپکے روحانی تقدس اور باطنی اوصاف کا اعتراف کیا گیا ہے، مولانا جامی لکھتے ہیں۔

ہرچند وے شاگرد فلکی شاعراست و بہ شعر شہرت تمام یافتہ چنیں گویند کہ ویرا در اطوار شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ (نفحات الانس)

اسی طرح صاحب صحف ابراہیم کا قول موازنہ عرفی و خاقانی (مطبوعہ نگار بابت دسمبر ۳۱ء) کے سلسلہ میں لکھا جا چکا جس سے آپکے ذوق صوفیانہ پر روشنی پڑتی ہے، لیکن خاقانی کی زندگی کا ایک تیسرا رخ سید نورالدین بن سید شریف الحسینی، المرعشی الشوستری نے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

طریقہ شیخ سنائی پیمودہ، الفتش مذہب حق اہل بیت بروح اعتقادی نگاشت اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکیم اسلم الباب ملت در جمیع مواطن جاری بودہ، بنیہ تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض از عقائد خود را، در قطعہ مشہور کہ مذکور خواہد شد، بہ طریق کنایت ادا نمودہ (مجالس المومنین قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری)

مصنف نے اسی طرح خواجہ سلمان ساوجی کو بھی مذہب باطنیہ (شیعہ) کا متبع بنایا ہے، حالانکہ انھوں نے جس کلام سے استدلال کیا ہے اسکی مثالیں اکثر شعرائے فارس کے یہاں ملتی ہیں اور اگر سیاسی فضا کی بنا پر خاقانی کو "تقیہ" کی ضرورت پڑی تھی، جسکی اصلیت ایک دراز کار قیاس کے سوا کچھ نہیں تو اسی طرح تمام شعراء کو بھی شیعی عقائد کا پابند اور تقیہ پر عامل کہا جا سکتا ہے، خیر یہ تو ایک خارجی بحث تھی۔

خاقانی نے اپنے شعر میں تصوف کے ایک خاص عمل "مراقبہ و مکاشفہ" کی تفصیل کی ہے، چنانچہ اسی ضمن میں یہ شعر بھی لکھا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے موسیٰ کی طرح اس "خضر معنی" کا دامن پکڑا تو کف موسیٰ (معجزہ ید بیضا) اور چشمہ حیواں اسکے گریبان میں نظر آوے گا، خاقانی کے خیال کا ایک جزو تو قرآنی روایت پر مبنی ہے، اور دوسر دہی علم الاصنام سے لیا گیا ہے، یعنی موسیٰ اور خضر کی مرافقت کا حال تو قرآن میں مذکور ہے، لیکن "آب خضر" تصوف کا وہ عقیدہ ہے جو ضمیات کا منت پذیر ہے،

خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

حجاب ظلمت ازاں بست آب خضر کہ گشت ز نظم حافظ دایں طبع ہچوں آب خجل

حافظ کہتے ہیں کہ میری طبیعت کے جوش و خروش اور نظم کی بلند پائگی نے چشمہ حیواں کو شرمندہ کر دیا ملوثہ اُس نے پردۂ ظلمات میں اپنا منہ چھپا لیا یہ خیال تو سراپا علم الاصنام سے لیا گیا ہے،

حضرت خسرو دہلوی کہتے ہیں

آگہی کے دلد دانا اسکندر تشنہ جگر خضر تنہا خوارہ کو با آب حیواں خوگرفت

مطلب یہ ہے کہ جناب خضر تو اکیلے اکیلے آب حیواں نوش فرمانے کے عادی ہو گئے ہیں اور ایسے کہ پردہ ظلمات ہی میں نشیمن اختیار کر لیا اب انھیں کیا پڑی ہے کہ بیچارے تشنہ کام اسکندر کی خبر لیں،

یہ صوفیہ کا وہ عقیدہ ہے جو علم الاصنام سے تصوف میں آیا اور پھر فارسی شعرا نے مختلف پیرایہ میں بیان کیا۔ شیخ علی حزیں لاہجی فرماتے ہیں۔

بخشید حیات تن اگر آب سکندر   دل زندگی از چشمہ حیوان تو یابد

یعنی اگر آب حیات سے جسم زندہ ہوتا ہے تو محبوب کے چشمہ حیواں سے روح اور قلب کو حیات ملتی ہے،

اسی طرح ملا نور الدین ظہوری ترشیزی فرماتے ہیں۔

در حلق خضر گشتہ گرہ آب حسرتے   دانستہ است مردنم از آرزوئے کیست

شعر کا مطلب یہ ہے کہ خضر نے آب حیات تو پی لیا لیکن وہ آب حسرت بن کر انکے حلق میں کھٹک رہا ہے، چونکہ کسی کی طلب و آرزو میں میرا مرنا وہ رشک سے دیکھ رہے ہیں، لیکن خود نہیں مر سکتے۔

دنیا جانتی ہے کہ خضر کو آب حیواں پلانے والا قرآن نہیں بلکہ وہ علم الاصنام ہے؛ اس لئے جناب ظہوری کی روح قبر میں بھی یہ سن کر بےچین ہو جاوے گی کہ حضرت جس (رقیب خضر) کو کسی شاہد رعنا کی محبت میں اپنا شریک مرگ بنانا نہیں چاہتے اور یہ لکھکر اپنے ہیجان رقابت کو تسکین دے رہے ہیں کہ وہ تو آب حیات پی کر اس دنیائے آب و گل میں مقید ہو گئے؛ وہ مدت ہوئی دنیا سے سفر کر کے استفادات روحانی حاصل کر چکے، کیونکہ قرآن انھیں دنیائے مادی کا مقید نہیں بتاتا اب رہی وہ حدیث جس میں وفات نبی صلعم کے وقت انھیں زندہ بتایا گیا ہے، تو یہ اصول حدیث کے مطابق بہت کچھ محل نظر ہے، علاوہ ازیں بخاری میں میری نظر سے یہ حدیث نہیں گزری، انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ناظرین کرام! میری اس تمام کاوکاو خامہ فرسائی کی اصل غرض یہ ہے کہ ہمارے ارباب وطن جن میں ادبی ذوق کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے، قرآن مجید کی طرف اس ادبی نقطۂ نظر سے ضرور توجہ کریں، ہندوستان میں آج کثیر تعداد نوجوان لکھنے والے موجود ہیں وہ اپنے مضامین میں ہیوم اور اسپنسر، شکسپیر اور ملٹن، اسکر وائیلڈ اور ہارڈی اور دوسرے مغربی ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے کلام اور نتائج فکر کے حوالے دیتے ہیں، لیکن انھیں دلچسپی نہیں ہے تو صرف قرآن مجید سے حالانکہ اس میں شعر و ادب کے محاسن، اقتصادیات و سیاسیات کے مسائل، اخلاق و تمدن کے قوانین، نفس و قیافہ کی باریکیاں موجود ہیں، الغرض ایک طرف قرآن میں مادہ کی کثافتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، تو دوسری طرف لطائف روحانیہ کے اجزا و تفصیلات معرض بحث میں لائے گئے ہیں، امثال بالا سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری کی تمام خصوصیات وہی سمجھ سکتا ہے، جو قرآن مجید سے باخبر ہو اور اس وقت جبکہ اردو کی ارتقا میں عربی و فارسی سے لفظی و معنوی

ذخائر منتقل کئے جارہے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے، ایک اردو زبان کا ادیب صحیح معنی میں قرآن کے مطالب پر نظر رکھے بغیر ادیب لبیب کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

ادبی جرائد و صحائف کا مطالعہ کرنیوالے حضرات، اگر صبح کے وقت نصف گھنٹہ یا پندرہ ہی منٹ قرآن مجید کی چند آیتیں با ترجمہ پڑھ لیں تو انکے ذوق ادب کو ایک نئی زندگی ہوجاوے گی، مسلمان قرآن مجید پڑھتے ہیں تو صرف برکت سمجھ کر، حالانکہ برکت جس انجوبہ کا نام ہے، وہ اس کے سوا دوسری بات نہیں کہ علم و معرفت میں ضیاء، اخلاق و تہذیب میں استواری، روح و جسم میں ایک تازگی پیدا ہوجائے، اور ہم جب تک دنیا میں رہیں، دنیا کی نظر میں باعزت رہیں، اور جب مریں ایک کیف اور روحانی نشاط کے ساتھ، دو اور روح کی انھیں وحشت پیمائیوں میں بدرقہ راہ کا نام قرآن ہے، اسئے جب ہم فلاسفہ اور شعرا کے حوالے دینے لگیں، جب ہم گوئٹے کے تغزل اور ڈینٹ (DANTE) کے صوفیانہ خیالات پر روشنی ڈالیں، جب ہم روسی اور یوروپی افسانے لکھ لکھکر قلوب میں درد و رقت یا عزم و ثبات کی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کریں، تو خدارا قرآن کے اس عالمگیر (UNIVERSAL) پیام و دعوت کا بھی خیال رکھیں تبیان لکل شیٔ قرآن میں ہماری اس دنیا کے آب و گل سے متعلق جتنی ضروریات ہیں سب پائی جاتی ہیں، اگر ایام نے مساعدت کی تو میں چھوٹے چھوٹے مضامین کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ ہم قرآن کے مطالعہ سے سیاسی اور ماہر اقتصادیات کیونکر بن سکتے ہیں؟ ہم اخلاق و معاشرت کا فلسفہ کیونکر حل کرسکتے ہیں، الغرض ہم روح اور مادہ کی کشمکش کے اندر دماغ انسانی میں پیدا ہونیوالے سوالات کا (جنہوں نے آج مختلف علوم کی صورت اختیار کرلی ہے) کیا جواب دے سکتے ہیں؟ کیا میں نوجوانان وطن سے ہم آہنگی کے ساتھ عمل پیرائی کی امید کرسکتا ہوں، بہرحال ؎

حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم،

عبدالمالک آروی

(نگار) ہمارے عزیز و فاضل دوست مولوی عبدالمالک صاحب کا مضمون ختم ہوگیا اور یقیناً اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اس کی ترتیب میں کافی کاوش جستجو سے کام لیا اور نگار شکرگذار ہے کہ بے منت و بے سوال و بے استحقاق" یہ مقالہ اس کو مرحمت فرمایا گیا۔

اول اول جب اس مضمون کے ابتدائی اجزا میرے پاس آئے اور عنوان کے لحاظ سے تمہیدی بحث کو طویل دیکھا تو کچھ مضطرب سا ہوا اور میں نے فاضل مضمون نگار کو لکھا کہ "میں تمہید کو دیکھکر کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ آپ سے عنوان بدلنے کی درخواست کروں" یعنی ابتدائی گفتگو کیوں اس مقصود سے دور ہے جو عنوان سے ظاہر کیا گیا ہے۔

اس کا جواب اُنھوں نے دیا جس کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ ممکن ہے تمہید کی وسعت سے انتشار خیال کا شبہ پیدا ہو، لیکن آیندہ اجزا مقصود سے بعید نہیں ہیں۔ لیکن میں نے اس مضمون کا تعارف کراتے ہوئے ملاحظات میں اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ مجھے نہیں معلوم، ابھی بحث میں اُنھوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت سے بہ حیثیت معجزہ اعتنا کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں اُنھیں مشورہ دوں گا کہ اسی سلسلہ میں اس موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

یہ لکھنے کے بعد میں خاموش رہا اور میں نے بدستور "قرآن کے لطائف ادبیہ" کے عنوان سے اس مضمون کا سلسلہ جاری رکھا اور غور کرتا رہا کہ دیکھوں قرآن کے لطائف ادبی کون کون سے لکھے جاتے ہیں اور شعرائے عرب وفارس کا ان سے استفادہ کیا معنی رکھتا ہے؟

(اس مضمون کا پورا عنوان یہ تھا "قرآن مجید کے لطائف ادبی اور شعرائے عرب وفارس کا استفادہ")

لیکن اب کہ یہ مضمون ختم ہو چکا ہے اور میں اس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے لطائف ادبی کا ابھی تک اس میں ذکر نہیں آیا اور شعرائے عرب وعجم کے استفادہ کی جو صورت فاضل مقالہ نگار نے بتائی ہے، اس کے لحاظ سے اسکا عنوان زیادہ سے زیادہ

"عرب وعجم کی شاعری میں تلمیحات قرآنی"

ہونا چاہیئے تھا، اور یقیناً اس عنوان کے لحاظ سے یہ مضمون بہت زیادہ قابل ستائش ہے۔

اس مضمون کے حصۂ اول میں مولوی عبد المالک صاحب نے عربی شاعری کے تین دور، اور نفس شاعری کے علو وتاثیر سے بحث کی ہے، اور اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حصہ میں میکڈانلڈ کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے کہانت کے انداز سے قرآن کے اسلوب بیان کو متاثر کرنے کی سعی کرتے ہوئے، وحی پیغمبرانہ اور الہام شاعرانہ کے فرق کو بیان کیا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے خوب لکھا ہے اور ممکن ہے کہ مولویوں کی اصطلاح میں ان کو اس کی جزائے خیر بھی ملے، لیکن افسوس ہے کہ وہ استدلال کے لحاظ سے نہ میکڈانلڈ کو ساکت کرنے والا ہے نہ کسی اور غیر مسلم کو۔ ضرورت تھی کہ مختلف مثالیں دیکر قرآن کی ادبیت کو "انداز کہانت" سے بلند وبرتر ثابت کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، کیونکہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور تاوقتیکہ کوئی شخص پہلے ہی سے قرآن پر ایمان نہ لے آئے، ان دونوں میں کوئی فرق وامتیاز محسوس نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے عبد المالک صاحب کو آخر کار اسی فرسودہ منقولی حجت سے کام لینا پڑا جو ایک مولوی کا سب سے بڑا لیکن نہایت ہی ضعیف حربہ ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے عربی شاعری کی خصوصیات کا بالاختصار ذکر کرتے ہوئے اس کی عشقیہ شاعری سے گفتگو کی ہے، اور پھر قرآن نے جو اخلاقی رنگ اس میں پیدا کیا اس کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ مذہبیات میں اخلاقی شاعری

عشقیہ شاعری سے کوئی بلند مرتبہ کی چیز ہوگی، لیکن ادبیات کے سلسلہ میں مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے۔

اس کے بعد "صور شعریہ" کے لحاظ سے قرآن کی بعض عبارتوں کو معیاری چیز ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا اور پھر شعرائے فارس کے کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ انھوں نے قرآنی قصص سے کتنی تلمیحات اپنے بیاں لیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے موسیٰ، عیسیٰ، قارون، سلیمان، یوسف، اور خضر وغیرہ کے افسانوں سے متعلق بعض شعرائے فارس کا کلام مثالاً پیش کیا ہے۔

میں یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کی تکرار کرتا ہوں کہ مولوی عبدالمالک صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی خوبی سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ ان کی کاوش اور محنت کو کسی طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کے لطائف ادبیہ کا کہیں ذکر نہیں آیا جسے عنوان کا جزو اول قرار دیا گیا تھا اور نہ یہ ثابت کیا گیا کہ اگر شعرائے عرب عجم نے تلمیحات قرآنی کو استعمال کیا تو اسے "استفادہ" کیوں کہا جائے، جبکہ محض ان تلمیحات کی وجہ سے رتبۂ شاعری بلند نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

اگر اسی سلسلہ میں، قرآن کی ادبیت کے متعلق کوئی گفتگو کروں تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ عام طور پر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کلام مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے، اور ہر چند یہ خیال مسلمانوں میں بہت بعد کو اُسوقت پیدا ہوا جب وہ اسلام کی تمام صحیح تعلیمات سے منحرف ہو کر محض رسم و رواج اور تفاخر بیجا میں مبتلا ہو گئے اور اسلام کی دوسری ہدایات کی طرح قرآن کی حقیقت سے بھی اعراض کر کے صرف اس کی فصاحت و بلاغت میں پھنس کر رہ گئے، لیکن چونکہ اب غلطی سے اس اعتقاد کو بھی داخل ایمان قرار دے لیا گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مختصراً اس غلطی کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔

تمام قرآن میں ایک جگہ بھی آپ کو ایسی آیت نہ ملے گی۔ جس میں فصاحت و بلاغت پر مخالفین سے معارضہ کیا گیا ہو، بلکہ میرے نزدیک اس کی تردید کی گئی ہے۔

اہل عرب ہر اُس کلام کو جس میں خوبصورت الفاظ، دلچسپ بندش، اور سلاست و لطافت پائی جاتی، شعر کہا کرتے تھے خواہ وہ نثر ہو یا نظم۔ اور چونکہ قرآن میں بھی ان کو وہی فصاحت و بلاغت نظر آتی تھی۔ جو دوسرے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے، اس لئے وہ قرآن کو بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن قرآن کے شعر و شاعری ہونے سے ہمیشہ انکار کیا گیا کیونکہ شعر کی بنیاد محض سطحی و مادی جذبات پر ہوتی ہے اور قرآن کا مقصود صرف تربیت اخلاق و تزکیۂ نفس و روح تھا جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ قرآن نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کو اہمیت دے کر اس کے اصل مقصود کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹائی جائے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ۔ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین ۔

یعنی ہم نے رسول کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ شاعری اس کے شایان شان ہے قرآن تو صرف نصیحت ہے اور کھلی ہوئی پند و وعظ کی کتاب۔

دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ نسبت شعری سے یوں انکار کیا گیا ہے:۔

والشعراء یتبعھم الغاؤن ۔ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۔

یعنی تم لوگ جو رسول کو شاعر کہتے ہو تو یہ نہیں سمجھتے کہ شاعروں کی تو ایک گمراہ جماعت ہے جو وہم و خیال کی دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہے اور اسی قسم کے لوگ انکا اتباع کرتے ہیں۔

کفار عرب کا قرآن کو نہ صرف شاعری بلکہ خیالات پریشاں کا مجموعہ کہنا خود کلام مجید سے ثابت ہے:۔

بل قالوا اضغاث احلام بل افتراہ بل ھو شاعر

لیکن اس کا جواب قرآن کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ

ما ھو بقول شاعر قلیلا ما تومنون و لا بقول کاھن قلیلا ما تذکرون

الغرض قرآن میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت کو کسی جگہ اہمیت نہیں دی گئی، بلکہ ان لوگوں کی مخالفت کی گئی، جو اس کو خصوصیات شعری کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔

وہ لوگ جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بھی معجزہ قرار دیتے ہیں، ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ کلام مجید میں متعدد بار کفار سے خطاب کیا گیا ہے کہ اگر ان کے امکان میں ہے تو ایک آدھ ہی سورۃ ایسی بنا کے لے آئیں۔ یعنی اُن کے نزدیک ایسا کہنا گویا فصاحت و بلاغت کے نقطۂ نظر سے ہے لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔

منجملہ ان آیات کے جن میں قرآن کا مثل پیش کرنے کا معارضہ کیا گیا ہے۔ چند یہ ہیں:۔

(۱) ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین

(اگر تمہیں قرآن کی صداقت کی طرف سے شک ہے تو ایک ہی سورۃ ایسی بنا لاؤ اور اپنے حمایتیوں کو بھی شریک کرو اگر تم سچے ہو۔)

(۲) ام یقولون افتراہ ۔ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

(اچھا اگر تم یہ کہتے ہو کہ قرآن من گھڑت چیز ہے تو دس سورتیں ایسی ہی گڑھی ہوئی تم بھی لے آؤ اور جس سے جی چاہے اس کام میں مدد لیلو)

(۳) قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھٰذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

(اگر تمام انس وجن جمع ہوجائیں کہ قرآن کا مثل بنا سکیں تو ان سے ممکن نہ ہوگا)

(۴) ام یقولون تقولہ بل لا یؤمنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین

(کیا لوگ کہتے ہیں کہ رسول نے اسکو خود گڑھا ہے، اچھا تو ان سے کہو کہ کوئی ایک ہی بات اسکی سی بنا لائیں اگر سچے ہیں)

ان تمام آیات کے دیکھنے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں کفار عرب کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے چیلنج دیا گیا تھا۔ اگر کوئی ایسا دعوے کرتا ہے تو میرے نزدیک وہ غلطی پر ہے کیونکہ خود ان آیات پر غور کرنے سے اس کی تردید ہوتی ہے، پہلی، دوسری اور چوتھی آیت میں چیلنج دینے کی صورت یہ ہے کہ

"اگر تم کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے یا تم اسکو من گھڑت چیز جانتے ہو"

تو اس کا جواب پیش کرو۔ اس انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفار عرب اسے انسانی کلام سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی سکہ ان کے قلب پر ایسا نہ جما تھا کہ وہ اسے کلام انسانی سے زیادہ کچھ اور سمجھتے، چنانچہ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ اس میں ہے کیا۔ لونشاء لقلنا مثل ہذا۔ ان ہذا الا اساطیر الاولین (سورہ انفال آیت ۳)

خدا نے ان کے اسی اعتراض کا جواب یہ دیا کہ جس نقطۂ نظر سے تم کلام مجید کو دیکھ رہے ہو وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت یا شاعرانہ انداز بیان قرآن کا مقصود نہیں ہے۔ جو چیز دیکھنے کی ہے وہ اس کا ہادیانہ و مرشدانہ پہلو ہے، اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر کسی کے امکان میں ہو تو ایسی جامع کتاب ہدایت، ایسی مکمل شریعت، اخلاق ایسا پاکیزہ، قانون تمدن اور ایسا کامل نظام جامعۂ انسانیت، پیش کرکے دکھاؤ۔

اگر فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معارضہ ہوتا تو تمام جن و انس سے خطاب کرنیکی ضرورت نہ تھی جیسا کہ آیت نمبر ۳، مندرجۂ بالا میں کیا گیا ہے۔ صرف یہ کہا جاتا کہ اگر دنیا کے تمام شعراء یا خطیب جمع ہوجائیں تو قرآن کا مثل پیدا نہیں کرسکتے۔

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو اسوقت تمام اہل عرب کی زبان تھی اور اس میں وہی الفاظ، وہی اسلوب بیان اور وہی ترکیبیں استعمال کی گئیں جو اسوقت عام طور پر رائج تھیں۔ اس لئے یہ دعوے کرنا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے اور اس کا مثل پیش نہیں کیا جاسکتا درست نہیں۔ کیونکہ جس طرح کلام مجید کے متعلق یہ دعوے کیا جاسکتا ہے اسی طرح دنیا کی اور کتابوں کے متعلق بھی یہی دعوے ہوسکتا ہے۔ اگر قرآن کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی جواب نہیں ہوسکتا، تو مہلہل، امرؤالقیس، ابوالقاسم حریری کے کلام کا بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ استحالۂ مثل کا مسئلہ تو اس قدر صاف ہے کہ دنیا میں کسی چیز کا بھی مثل پیش نہیں ہوسکتا، جو چیز اپنی جگہ ہے، بے مثل ہے اور وہ وہی رہے گی جو ہے۔

آج مسلمان خواہ کتنا ہی مضحکہ اڑائیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیلمہ کا بنایا ہوا قرآن فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کچھ کم تھا۔ کیا یہ اس کی سحر بیانی و فصاحت و بلاغت نہ تھی کہ عین عہد سعادت میں سینکڑوں قبائل اس کے اعجاز بیان سے مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر اگر محض شاعرانہ اعجاز بیان ہی قرآن کا دعوےٰ ہوتا تو وہ بھی آج مسیلمہ کذاب کے قرآن کی طرح فنا ہو گیا ہوتا، اگر آج مسیلمہ کے ماننے والے دنیا میں نہیں ہیں، تو اس کا سبب یہی ہے کہ اس کا صرف اعجاز فصاحت و بلاغت تھا اور اگر آج قرآن کے ماننے والے کروروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا معجزہ صرف اس کی اخلاقی تعلیم تھی۔

رسول بار بار شعر و شاعری سے اپنے آپ کو علیحدہ بتاتا ہے، شاعروں کی برائی کرتا ہے، کہیں ایک جگہ بھی فصاحت و بلاغت کا ذکر نہیں آتا۔ اور قرآن کی خصوصیت وہ صرف ہدایت، ذکریٰ، قول حق اور بصائر ظاہر کرتا ہے، لیکن مسلمان کہتا ہے: "جی نہیں، یہ تو آپ کا صرف شاعرانہ انکسار ہے"۔ اور اس کی شاعری کی بھی داد دیتا ہے، حالانکہ اس طرح مطلب اس درجہ پر کھینچ لے آتا ہے، جہاں سے اگر باسانی اس کو نیچے گرایا نہیں جا سکتا، تو دوسروں کو ضرور وہاں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور اس کے چند دن بعد تک، جب اسلام صحیح [illegible] ایک سادہ عملی مذہب تھا، کسی نے نہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ قرار دیا اور نہ اس لحاظ سے اس پر کوئی [illegible] دیا، وہ اس کی دلنشیں تعلیمات کو پڑھتے تھے اور اس کے گرویدہ ہو ہو کر مصروف سعی و اقدام ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد کو جب فتوحات اسلامی وسیع ہوئیں، مختلف ممالک کے لوگوں سے مل کر خیالات میں تبادلہ ہوا، امن و سکون سے بیٹھنے کے بعد فضول خیال آرائیوں کا موقع ملا، اور وہ قوت عمل مضمحل ہو گئی جس نے ان کو "اعلون فی الارض" بنا دیا تھا تو وہ [illegible] ہو گئے جو دنیائے الہام سے فروتر، صرف دنیائے ایجاد و اختراع اور عالم بحث و تاویل سے متعلق تھے۔ چونکہ اب ان کی عملی زندگی مفقود ہو چکی تھی اور اس کے پیش کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے اب اسباب تفاخر و تفوق فراہم کرنے میں سوا اس کے چارہ کار نہ تھا کہ وہ پھر اسی رطب و یابس کو لے لیں، جس کی علوم دنیا میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور نہ ہو گی۔ انھوں نے قرآن کے مفہوم کو پس پشت ڈال کر صرف اس کے الفاظ کو لے لیا۔

جنت و دوزخ کی مادی تحقیق شروع کر دی، معاد و آخرت کا اسرائیلی مفہوم لینے لگے، [illegible] میزان وغیرہ کے اساطیری معنے اختیار کئے، اور آخر کار یہاں تک سطح و قشر پر اتر آئے کہ قرآن کو شعر و شاعری سمجھ کر اس میں فصاحت و بلاغت کی جستجو کرنے لگے، زباندانی کے اصول اس سے مستنبط کرنے لگے، علم معانی و بیان، اور صرف و نحو کے قواعد کی بنیاد اس پر قائم ہونے لگی۔ پھر قرآن سے یہ دوری و استبعاد، اسلام سے یہ ہجر و فراق امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا ہی رہا اور عہد عباسیہ تک آ کر اس حد تک اسے پس پشت ڈال دیا گیا کہ ہارون الرشید ایسا صاحب علم و فضل، حامل عقل و فراست بادشاہ بھی اپنی سلطنت کے بقاء کے لئے قرآن کی آیات سے استفادہ نہیں کرتا، بلکہ فلکیات کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اگر آج ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد قرآن کا مصرف صرف یہ رہ گیا ہے کہ اُسے اطلس کے جزدان میں لپیٹ کر رکھدیا جائے، اور جب نکالا جائے تو اُس کو بوسہ دیکر اور ہاتھ کو اُس سے مس کرکے جسم پر پھیر لیا جائے، اس کے اوراق کی ہوا سے دفع مرض چاہا جائے، اُس کی آیتیں گھول گھول کر پلائی جائیں (کیونکہ ان کے نزدیک فیہ شفاء للناس سے شفاء امراض روحانی مراد نہیں ہے) اور گلے میں اُس کے لاکٹ بنا بنا کر ڈالے جائیں۔ تو حیرت نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ خیالات کا جو انحطاط اب سے بارہ صدی قبل پیدا ہوا تھا۔ اس کو اسی حد تک آ جانا چاہیئے تھا۔

ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک صاحب نے بھی اختتام مضمون پر یہ ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن کا مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے کم از کم آدھ گھنٹہ روزانہ کر لینا چاہیئے۔ یہ نتیجہ ہے اسی ذہنیت کا جو مسلمانوں میں عرصہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن میں سب کچھ موجود ہے، یہاں تک کہ اس میں شاعرانہ فصاحت و بلاغت اور لطائف ادبی بیا معجزہ کی حد تک پائے جاتے ہیں۔

خضر کے متعلق جو اظہار خیال اُنھوں نے کیا ہے وہ اسی طرح ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے، جس طرح اور اسرائیلی قصص جو کلام مجید میں پائے جاتے ہیں۔ عبدالمالک صاحب نے کسی جگہ فٹ نوٹ میں ظاہر کیا ہے کہ یہ بحث خاص انکے ذوق کی چیز ہے، اس لئے میں بہت ممنون ہوں گا اگر وہ ماخذ قرآن کے متعلق تمام ان اعتراضات کی طرف توجہ کریں جو اہل مغرب کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلے میں قلم اُٹھاؤں۔ کیوں نہ وہ خود اسکی ابتدا کریں اور مجھے صرف سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔

آخیر میں مجھے پھر یہ عرض کرنا ہے کہ اس تحریر سے میرا مقصود صرف قرآن کے ادبی پہلو کے متعلق ایک اصولی گفتگو کرنا تھا۔ امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اس کو کسی اور جذبہ پر محمول نہ کریں گے۔ کیونکہ میں ان کی تفتیش و تحقیق، ان کے ذوق علم و ادب کا معترف ہوں، اور اس وقت کا بھی منتظر ہوں، جب میرے انکے درمیان مذہب کے افہام و تفہیم کے متعلق جو چند اصولی اختلافات ہیں وہ دور ہو جائیں، اور مجھے ان کے سامنے دست ارادت پھیلانے میں تامل نہ ہو۔

نیاز

شعلہ زارِ الفت

(۱)

خفیف سی دُھند رامینی کے گرد و نواح کو گھیرے ہوئے تھی۔ پہاڑیوں کے پیچھے آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اُس کی زرد امن شعاعیں جنکی حرارت تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں پر پڑ رہی تھیں۔ فرانسیسکا، رامینی کے نواب کی بیوی اور محل کی زمینوں کو تک رہی تھی۔ اُس کی نگاہوں سے بے خیالی ٹپک رہی تھی۔ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پرانے خیالات، غیر ارادی طور پر اُسکے دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، جن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ اُسکی نظریں باغ کی ٹہنیوں پر پڑیں، پھر درختوں پر، اور پھر نرگس کے کنج پر چشمہ کے کنارے۔ اور بالآخر اُس کی نظریں زُہرہ کے مرمریں مجسمہ پر جمکر رہ گئیں جو چشمے کے وسط میں سنگ مرمر کے ایک خوبصورت چبوترے پر نصب تھا۔

" زُہرہ۔ اے میری مالکہ۔ میری دیوی، میں خدا کی نہیں تیری اور تیرے بیٹے کیوپڈ کی پرستار ہوں۔ پاؤلو نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ پاؤلو کے عشق نے مجھے تیرا غلام بنا دیا۔ تیری وجہ سے پاؤلو میرا پرستار ہے۔ اور کیوپڈ کی وجہ سے میں پاؤلو کی پرستار ہوں۔ اے زُہرہ تو ہمیشہ اپنا سایہ میرے سر پر قائم رکھ کہ پاؤلو مجھے چاہتا رہے۔ اور اے کیوپڈ تو اپنے چند اور شیریں تیر چلا کہ ہماری محبت ابدی محبت بن جائے "۔

ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اُسکے چہرے پر نورِ مسرت برس رہا تھا، جس میں خشوع و خضوع کی جھلک تھی۔ ایک کیف کے عالم میں اُس نے آنکھیں بند کر لیں، اُس نے محسوس کیا کہ یونانی صنم پرستوں کی دیوی زُہرہ اُسکے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہی ہے، اس لطیف تخیل سے اُسکی روح میں ایک لرزشِ مسرت طاری ہو گئی۔ اُس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم پیدا ہو گیا۔

اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی رفتہ رفتہ چھائی جا رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سیاہی مائل نظر آ رہی تھیں۔ ایک غلام شمعیں روشن کر رہا تھا۔

معاً اُسے اپنے شوہر کا خیال آ گیا۔ اُس شخص کا جسکے ساتھ اُس نے اپنی زندگی کے سات سال گذارے تھے۔ جو ہمیشہ اُس سے محبت کرتا رہا، جس نے ہمیشہ اپنے قوی بازوؤں میں اُسے اُٹھا کر بچوں کی طرح اُسے بہلایا۔ اُس کا شوہر یوحنا، رامینی کا نواب۔ جو سات سال تک اُسکی اُلفت کا مرکز رہا۔ اور وہ خود بھی اپنے شوہر کی الفت کا مرکز بنی رہی۔

اور اب بھی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی کہ وہ اپنے خاوند کو دھوکا دے کر ایک دوسرے سے محبت کر رہی تھی۔ دفعتاً اُسکی نظر پھر زہرہ کے مجسمے پر پڑی جو چشمے کے وسط میں ہاتھی دانت کی طرح چمک رہا تھا، اور اُس کے ساتھ ہی اُسے پاؤلو کا حسین چہرہ اور سچی روح یاد آ گئی۔

اُسے وہ شام یاد آ گئی جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ کشتی پر بیٹھی چاندنی رات میں جھیل کی سیر کر رہی تھی، ایک اجنبی ساحل پر آیا اور ایک دوسری کشتی پر سوار ہو کر جھیل کی سیر کرنے لگا۔ ایک مرتبہ اُسکی کشتی بہت قریب سے ہو کر نکلی، اجنبی سے اُسکی نگاہیں ملیں، اور معلوم نہیں کیوں شرم اور شوق کی ایک ملی جلی لہر اُس کے قلب میں دوڑ گئی، اُس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا، اور وہ اپنے شوہر سے باتیں کرنے لگی۔

پھر اُسے وہ دن یاد آ گیا جب اوسیڈ کے یہاں دعوت میں دوسری مرتبہ وہ اس اجنبی سے ملی، پہلی ملاقات اُسکے ذہن سے تقریباً رفع ہو چکی تھی۔ اوسیڈ نے اجنبی کا تعارف اُس سے اور اُس کے شوہر سے کرایا، اُس کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاؤلو —— یہی اجنبی کا نام تھا —— کے حرکات و سکنات میں ایک دلکشی سی ہے۔ دلکشی نہیں —— اُس کا قلب زیادہ سے زیادہ یہ اعتراف کر سکا کہ صرف دلچسپی۔

اجنبی —— اب وہ اجنبی نہیں پاؤلو تھا —— اُس کے شوہر سے بہت بے تکلف ہو گیا۔ اور کئی بار وہ اُن کے گھر آ بھی آیا۔ نواب پوچنا، اُسکو اپنا معتبر دوست سمجھنے لگا۔

پھر وہ دن اُس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے، جن میں پاؤلو سے اُسکی واقفیت بڑھتی گئی۔ پاؤلو کی اندرونی خوبیاں، اُسکی صداقتِ قلب، اُسکا گداز دل اُس پر رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگا وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ گویا اُس پر ایک سحر سا ہو رہا ہے۔ لیکن اس خیال کو اُس نے دل کی ایک کمزوری سمجھ کر نکال دیا۔

پھر اُسے وہ وقت یاد آ گیا، کہ جب شمعوں کی روشنی میں بیٹھا ہوا، پاؤلو کوئی گیت گا رہا تھا۔ شمع کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے شمعوں کے نہ جانے میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُسکی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جو راز محبت کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ چمک جذبۂ محبت کی نہ تھی بلکہ ایک لطیف احساسِ الفت کی۔ اُسکی نظریں، پاؤلو کے چہرے پر پڑیں اور وہ شرما گئی، حجاب اور جھینپ سے اُس کا سر جھکنے لگا۔ اُس کا شوہر نواب پوچنا آج روم گیا ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں اکیلے تھے۔ اُس اضطراب اور جھینپ نے جو فرانسیسکا پر طاری تھی۔ پاؤلو پر بھی اثر کیا اُس نے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر تک ایک خاموشی سی طاری رہی۔ فرانسیسکا نے اس ناگوار خاموشی کو محسوس کیا اور پاؤلو سے کچھ اور گانے کی فرمائش کی، پاؤلو اب تک اپنے اضطراب پر قابو نہ پا چکا تھا، تاہم اُس نے سارنگی اٹھائی اور ایک تمنا لطیف نغمۂ محبت گانا شروع کیا۔

پاؤلو بیخودی میں گاتا رہا۔ فرانسیسکا پر ایک حجاب آمیز اضطراب طاری ہو گیا۔ تاہم اُس کو موسیقی کے اثر کا

اپنے دل سے اعتراف کرنا ہی پڑا۔

فرانسیسکا کے چہرے پر شرم اور بے چینی کے اثر سے سُرخی چھا گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ گویا وہ انگاروں پر بیٹھی ہے۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اُٹھ کر چلی جائے اور پھر کبھی اُس شخص سے نہ ملے، مگر وہ بیٹھی رہی۔ شاید اُس میں اُٹھ کے جانے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے چہرے سے غصّہ، شرم، بے چینی اور تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پاؤلو نے اُس کی طرف دیکھا، اور اپنی اس لغزش پر جو محض اظہارِ الفت کا ایک ذریعہ تھا، اپنے دل میں ایک ملامت محسوس کی۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ ایک عورت کو جسے اپنے شوہر سے محبت تھی، جسکی ازدواجی زندگی مسرت سے لبریز تھی، اپنی محبت کی داستان سُنا کر کشمکش اور تکلیف میں مبتلا کرے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنے اس جذبے کو اپنے دل ہی میں دفن کئے رہتا۔ یہاں سے کہیں اور چلا جاتا۔ اُس نے گھٹنے ٹیک کر فرانسیسکا سے معافی مانگی اور اس کا اقرار کیا کہ یہ اُس کے دل کی ایک بے جا لغزش ہے۔ اب کبھی وہ اس سے نہ ملے گا۔ اور اٹلی سے ہجرت کر کے قرطاجنہ یا مصر چلا جائے گا۔

فرانسیسکا کو اُس کا معافی مانگنا یاد آ گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک مظلومیت سی برس رہی تھی۔ جیسے کوئی گنہگار رحم کی التجا کر رہا ہو۔ اس کی مظلومیت کی اداؤں نے اُسے بے قابو کر دیا اور انجام سے بےخبر ہو کر اُس نے پاؤلو کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور اُس کے لبوں پر محبت کے اقرار کا پہلا نشان ثبت کر دیا۔

فرانسیسکا کو وہ گھڑی یاد آ گئی۔ جو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب کی گھڑی تھی۔ جس نے اُسے ایک نئی زندگی ایک نئی لذت اور ایک نئے گناہ سے آشنا کیا۔

"میں رات کا کھانا نہ کھاؤں گی۔ پاؤلو کے سوا کسی اور سے نہ ملوں گی .... تم جا کر سو جاؤ سُنا آرلینڈز"

یہ الفاظ اُس نے اپنے حبشی غلام سے کہے جو شمعیں روشن کر رہا تھا۔ یوحنا آج ہی کسی شہر کو گیا ہوا تھا اور کل سہ پہر سے پیشتر اُس کے واپس آنے کی اُمید نہ تھی۔

(۲)

باغ میں سنگِ مرمر کی نشستگاہ پر پاؤلو اور فرانسیسکا دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرانسیسکا کا ایک ہاتھ پاؤلو کے گلے میں حمائل تھا۔ نرگس کا کنج ان دونوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ رات کالی تاریک تھی۔

چشمے کا پانی چمک رہا تھا۔

وینس کا سفید بت دمک رہا تھا۔

دونوں محبت کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میٹھی محبت بھری باتیں جو ہزاروں بار دُہرائی جا چکی ہیں۔ دونوں گویا ایک بہشتِ خیال میں تھے۔ جہاں تک اس دنیا کی فکروں کی رسائی نہیں۔ پاؤلو جھکا اور فرانسیسکا کے نازک لبوں کو چوم لیا۔ نرگس کے کنج میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں نے مُڑ کر دیکھا۔ رات کی تاریکی میں سیاہ لبادے میں

پوحنا کا پُرخشم چہرہ نظر آرہا تھا۔ اُسکی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے ایک قدم ان دونوں کی طرف بڑھایا اُسکے ہر ہر عضو سے عزم، استقلال، حوصلہ، اور بہادری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے دونوں کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، شرم، ندامت، ذلت، بیوفائی کا احساس تلخ دونوں کو لرزا رہا تھا۔

"فرانسیسکا۔ بدبخت بے وفا عورت۔ تو جانتی ہے تیرا انجام کیا ہے؟" نہایت خشمگیں آواز میں پوحنا نے یہ لفظ ادا کئے اور ایک تیز خنجر تاریکی میں چمکتا ہوا نظر آیا۔

خوف کی ایک تیز لہر فرانسیسکا کے قلب کو دھڑکا گئی۔ وہ پاؤلو سے لپٹ گئی اور دونوں کے لب پیوست ہو گئے۔ ہوا میں خنجر دو مرتبہ چمکا اور دو لاشیں زمین پر تڑپنے لگے۔

(۳)

تخیل کے پر لگائے ہوئے، اطالیہ کا سب سے بڑا شاعر ڈانٹے، دوزخ کے دوسرے طبقہ میں داخل ہوا۔ عالمِ بالا کی سیر میں ورجل، اُس کا رہنما تھا۔

کلیوپیٹرا ملی، وادیٔ نیل کی ملکہ، اور اپنا افسانۂ محبت سنا گیا۔

پھر ہیلن ملی، وہ لڑائی کی دیوی جس نے یونان اور ٹروجن میں سالہا سال تک خونریزی کرائی۔ اور اُس نے بھی اپنی محبت کی کہانی سنائی۔

دوزخ کا دوسرا طبقہ گنہگار عاشقوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہاں خاکدانِ ارضی کے شاعر نے بہت سے چاہنے والوں کو دیکھا۔

اسی شعلہ زارِ الفت میں فرانسیسکا بھی تھی۔ اور اس کا عاشق پاؤلو بھی۔

اور اُس نے بھی اپنا افسانۂ الفت ڈانٹے کو سنایا۔

"میں نے پاؤلو کی محبت میں اپنے شوہر کو چھوڑا، خدا کو چھوڑا، دنیا کو چھوڑا اور محبت صرف محبت کو اختیار کیا۔ شوہر نے مجھے قتل کیا۔ خدا نے مجھے دوزخ میں ڈلوا دیا۔ مگر محبت نے اب بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ یہ شعلہ زارِ جہنم میرے لئے فردوسِ الفت ہے۔"

وہ آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی، چاروں طرف آگ ہی آگ۔ جس کی حدت، اطالیہ کا شاعر اپنے تخیل کے لبادے کے باوجود بھی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ شعلہ زارِ جہنم ہمارے لئے فردوسِ الفت ہے۔"

یہ کہکر جہنم کے زہرہ گداز شعلوں میں فرانسیسکا نے پاؤلو کا بوسہ لیا۔ اور اطالوی شاعر نے دھڑکتے ہوئے

قلب سے دیکھا کہ جہنم کی آگ بھی، اُن کی محبت کے شعلوں کے سامنے ہیچ تھی۔ جس محبت کے شعلے اُن کو فنا کر چکے تھے، اُسی محبت نے اُنھیں حیاتِ جاودانی بھی عطا کی تھی۔

ڈانٹے کا سر چکرانے لگا۔ اور اگر ورجل اُس کا بازو پکڑ نہ لیتا تو شاید وہ رحم کے جذبے سے بیہوش ہو جاتا۔ دلوں میں محبت کا بیج بونے والی ہستی نے شاعر کو حکم دیا کہ اس بدنام محبت کا راز آشکارا کرے بہت سے لوگ اس راز کو صحیح سمجھیں گے۔

اور بہت سے لوگ غلط۔

اور بہت کم رازِ محبت کو صرف راز ہی سمجھیں گے۔

عزیز احمد

سودیشی ریل

(شوکت تھانوی کے ایک مضمون کا اقتباس کہیں کہیں سے)

ہمارے ایسے آدمی کے لئے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اُس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہونچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابو جی! کانپور کا سکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیدیجئے۔"

بابو جی نے بجائے اسکے کہ ٹکٹ دیدیتے پہلے تو ہم کو گھورا۔ پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے:۔

"ایک بات کہدیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں۔ اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا۔

"جناب سنئے تین روپے ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجئے۔" اب تو مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا "جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے، مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے۔ کانپور کا سکنڈ کلاس"!

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا "جناب والا میں بہرا نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے ہے۔ مگر اسی کے تین روپے ہوئے۔ کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔"

میں۔ "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنے کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا۔"

بابو۔ "کل کی بات کل کے ساتھ۔ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے۔"

میں۔ "یہ کہیئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

بابو۔ "لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دیجئے۔ اور ٹکٹ لے لیجئے۔"

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے اگر گاڑی چھوٹ گئی تو مصیبت آ گئی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچکر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا مجھکو جاتا ہوا دیکھکر مجھکو بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

کیا دُنیا کو مذہب کی ضرورت ہے؟

(بہ سلسلۂ سابق)

گزشتہ دو ماہ کی اشاعتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی، اور عہد حاضر میں اسکے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں؟ اس پر قیاس کر کے مستقبل کے لئے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے، اعتقادی و ذہنی اعتبار سے بھی محو ہو جائے گا۔ اور ایک زمانہ آنیوالا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا جس طرح آج "سکونِ زمین و حرکت افلاک" کے نظریۂ قدیم کو دیکھا جاتا ہے، یا جس طرح ایک ماہر آثار قدیمہ پُرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں، انکا تفصیلی ذکر ماہ گذشتہ کے نگار میں آ چکا ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے، مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے اور بدقسمتی سے مذہب کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو انکا مقابلہ کر کے اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔

علوم و فنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہونچا وہ "قانونِ ارتقاء" کی تحقیق تھی، اس نے نہ صرف مذہب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کر کے رکھدیا، بلکہ خود مذہب کے اندر اسی اصول ارتقاء کے ماتحت تغیر و تبدل کا ہونا فطری اقتضاء قرار پایا۔ اور جو لوگ قدامت پرستی کو اصل مذہب سمجھتے تھے، خود ان کے ایمان متزلزل ہو گئے اور انھوں نے بھی اس اُصول کی صداقت مان کر مذہبی معتقدات میں تغیر و تبدل کو گوارا کیا۔

چونکہ مذہب کی بنا صرف یقین پر ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات و تجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دیجاتی اور انسانی ضمیر ان پر مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب و حکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے اس کی مذہبیت کو جدا نہیں کر سکتے تھے، تو بربنائے اس استبداد کے جو شخصی حکومتوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، جبراً بزورِ شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا اور قوت و عسکریت سے علم و حکمت کی تبلیغ اور آزادیٔ فکر و ضمیر کو محو کیا جاتا تھا، چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں

اس نوع کے سینکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ فرعوات مذہب کے خلاف جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کو قید و بند میں ڈالا گیا، دار پر کھینچا گیا، جلایا گیا، اور جس طرح ممکن ہوا حریت فکر و رائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے، ایران، کریٹ اور مصر والوں سے علوم و فنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا، اور انھوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیزیں ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل و حواس سے کام لیکر کس نتیجہ پر پہونچنا چاہئیے، تو وہ جہاں بھی گئے اس خیال کو ساتھ لے گئے اور چونکہ یہ تاریخی صداقت ہے کہ جب کسی قوم میں آزادی اور تحقیق کی جستجو بڑھتی ہے تو مذہب کا انحطاط ہونے لگتا ہے، اس لئے اہل مذاہب نے ان کو ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جب وہ ایتھنز (Athens) پہونچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا۔ تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی اور زیادہ شدید پائی۔ یہاں تک کہ انکساغورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قائم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخر کار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ایتھنز کے فلاسفر کا دعوےٰ تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ غریب سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان نہ لیجا سکا۔

اس کے کئی صدی بعد اسکندریہ میں جسے یونانی مصری شہر کہنا چاہئیے، زیادہ موافق حالات کے ماتحت علم و عقل کی کارگاہ قائم ہوئی، ہر چند یہاں تے مذاہب پائے جاتے تھے کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے بچاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا یا اور لوگوں نے کافی توجہ کی اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی، مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور نئے مذہب مسیحیت نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے آخری چراغ (Hypatia)[1] کو بھی گل کرکے رکھدیا۔ پہلا ایک ہزار سال کا زمانہ جو (Thales)[2] سے شروع ہو کر (Hypatia) پر ختم ہوتا ہے، علم و مذہب کی جنگ کا نہایت اہم زمانہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ جس مذہب نے عقل کی مخالفت کی وہ عیسوی مذہب تھا۔

---

[1] Hypatia اسکندریہ کے ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کی لڑکی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے آخیر میں پیدا ہوئی۔ اس کی ذہانت و دانائی کے سبب اسکندریہ میں اسکا خاص اثر تھا اور مشرق کے تمام حصوں سے طلبہ آآکر اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نے فلسفۂ اشراقیین اور فلسفۂ ارسطو کو ملا کر ایک جدید فلسفۂ انتخابیت (Eclecticism) پیدا کیا تھا۔ یہ فلکیات اور علوم ریاضی کی بڑی ماہر تھی۔ آخر کار وہاں کے اسقف اعظم نے بعض وحشی راہبوں کو متعین کیا جو اسے گاڑی سے کھینچکر کنیسہ میں لے گئے اور وہاں عریاں کرکے اس کے کوڑے مارے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے جلا دیا۔

[2] (Thales) یونان کا نہایت قدیم فلاسفر تھا جو مسیح سے سات سو سال قبل پایا جاتا تھا۔ کہاجاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا یونانی تھا جس نے تخلیق کائنات پر بحث کی۔ اور بتایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے۔
(کل شئ حی من الماء)!

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلمتکدوں میں نہ چمک سکی۔ ہر چند علم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانہ میں کس کو ان کے تلاش کی جرات ہو سکتی تھی۔

آخر کار اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے عرب کے وحشیوں میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس نے بعد کو دمشق و بغداد میں گہوارۂ علم و حکمت کی صورت اختیار کی اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی، یونانی، ایرانی اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے اور مذہب اسلام نے ان کی اشاعت کو گوارا کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن خلفاء امراء، و سلاطین اسلام نے پوری ہمدردی و اعانت سے کام لیا۔ دمشق و بغداد سے منتقل ہو کر یہ تہذیب شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہونچی اور وہاں علوم و فنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم و تصانیف کو اٹلی، فرانس اور انگلستان لے گئے، پھر چونکہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے، اس لئے یہاں سے بھی چشمۂ علم یوروپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔ لیکن کلیسہ نے جس قدر اس کی مخالفت کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ بیکن کو اپنی آدھی زندگی زندان کلیسہ میں بسر کرنا پڑی۔ البرٹ گربرٹ کو کلیسہ کی اسقفِ اعظم کی خدمت دیکر خاموش کیا گیا، کوپرنکس نے فیثا غورس کے اصول کی تصدیق کا اسوقت تک اعلان نہیں کیا جب تک وہ عذاب استنطاق (INQUISITION) کی دسترس سے باہر نہیں ہو گیا۔ آرنلڈ کا ایک مجرم کی طرح جا بجا تعاقب کیا گیا، جین ڈی روکیوٹا لیڈ نے زنداں میں جان دی۔ سکو اسکولی اور برونو جلائے گئے۔ گلیلو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا اور دسا لیس مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ لیکن چونکہ دنیا میں عقل و حکمت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کا نشہ ایسا نہیں جو آسانی سے اُتر جائے۔ اس لئے باوصف کلیسہ کی شدید ترین مخالفت کے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ جب مذہب میں ضعف ہوا تو اتنی رعایت اہل علم کے ساتھ روا رکھی جانے لگی کہ کیمیا، طبیعیات و فلکیات کی تعلیم پر انکا آگ میں جلایا جانا بند ہو گیا۔

جب انیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم و حکمت کے انشعابات نے ساری دنیا پر اپنا اثر ڈالنا شروع کیا، تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بُت ٹوٹا اور عقیدت نے توریت و انجیل میں تاریخی، آثاری، علمی، اخلاقی، ہزاروں قسم کے نقائص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکالدیا۔ اور اب پہلی دفعہ ارباب علم و فن نے اطمینان سے بیٹھ کر سمجھا کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی، اسکی تاریخ کیا ہے؟ مذہب کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی الہامی حیثیت کس مکر و فریب کا نام ہے۔ اور یہ آزادی خیال رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اب گفتگو بائبل کے الہامی و غیر الہامی ہونے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بائبل ایسی لغو و مہمل کتاب کو کیوں مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اور یہ کہ آیا مسیح کا حقیقتاً کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔

جو لوگ بائبل کو مدارس سے خارج کرنا چاہتے ہیں اُنھوں نے حسب ذیل دلائل پیش کئے ہیں:-

(۱) اگر بائبل الہامی ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہوا۔ لیکن اب کسی ملک کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی ضرورت

نہیں کہ بچوں کے معصوم دلوں میں تعصبات مذہبی پیدا کئے جائیں۔ اگر بائبل الہامی نہیں بلکہ انسان کی تصنیف ہے تو اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں ہے۔ اور اسکو پڑھانا بچوں کا وقت ضائع کرنا ہے۔

(۲) بائبل دو ہزار برس قبل کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور وہ زمانہ انسان کے عالم طفولیت کا تھا۔ اب انسان جوان ہے لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کی سی باتیں جوانوں کو پڑھائی جائیں۔

(۳) بائبل خود کوئی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ صحائف ہے۔ جو مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے۔ علاوہ ازیں ان میں بھی فرق ہے۔ یعنی عبرانی بائبل ۲۹ صحائف پر مشتمل ہے۔ انگریزی پروٹسٹنٹ بائبل میں صرف ۳۶ صحائف ہیں۔ رومن کیتھولک بائبل میں ان سب کے علاوہ ایک صحیفہ موسوم بہ "ابو قریفہ" (APOCRYPHA) اور بھی ہے۔ اس طرح سب ملا کر ۷۰ صحائف ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون سا مجموعہ صحیح ہے۔ لہذا ایسی مشتبہ کتاب کا پڑھانا مضرت رساں ہے۔

(۴) اصلی بائبل عبرانی زبان میں تھی۔ رائج الوقت بائبلیں اس کا ترجمہ ہیں۔ ترجمہ میں معانی اکثر بدل جاتے ہیں لہذا اگر بائبل پڑھی جائے تو اصل پڑھی جائے۔ ترجمہ کا پڑھانا فضول ہے۔ اور چونکہ اسکول کا ہر بچہ عبرانی نہیں پڑھ سکتا اور نہ ایک مردہ زبان کے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ لہذا بائبل کے ترجمہ کا درس موقوف کیا جائے۔

(۵) بائبل میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو علوم و اکتشافات جدیدہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہذا غلط کتاب کا بچوں کو پڑھانا ان کے ذہنی رجحانات کو تباہ کرنا ہے۔

(۶) بائبل کے مختلف صحیفے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصے کہانیاں بھی ہیں۔ ڈرامے بھی ہیں، روایات بھی ہیں، خرافات بھی ہیں، اور تھوڑی سی تاریخ بھی ہے۔ اور یہ سب مختلف زبانوں کی تصانیف بھی ہیں، لیکن پڑھاتے وقت بچوں کو انکی نسبت کچھ نہیں بتایا جا سکتا، اس لئے ایسی بھونڈی کتاب کی تعلیم میں وقت کا ضائع کرنا ہے۔

(۷) بائبل میں بہت سے معجزات درج ہیں۔ جو از روئے سائنس خلاف فطرت ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بچوں میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ جو عقل و دماغ کے لئے مضر ہے۔

(۸) سائنس نام ہے عقل منظم اور دانش مرتب کا۔ لیکن بائبل نام ہے خلاف عقل باتوں کے مجموعہ کا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عقلی پر بے عقلی کو کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

(۹) بائبل مجموعہ اضداد ہے۔ اور اس لئے وہ کوئی اخلاقی تعلیم بھی صحیح معنے میں نہیں دے سکتی۔

(۱۰) بائبل، ملوکیت اور مشرقی ظلم و استبداد سکھاتی ہے۔ مثلاً "خدا سے ڈرو بادشاہ کی عزت کرو" اور دنیا اب ملوکیت و استبداد کے اصول کو قائم نہیں رکھ سکتی۔

(۱۱) بائبل عورت کو ذلیل بتاتی ہے۔ حالانکہ از روئے انصاف مرد و عورت دونوں کا درجہ مساوی ہونا لازم ہے۔

(۱۲) بائبل جنگ کی تعلیم دیتی ہے۔ حالانکہ دنیا کو امن و صلح کی ضرورت ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونے کے چند در چند اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی علوم و فنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں، دوسرے یہ کہ دنیا سے ملوکیت و استبداد کی رسم اٹھی اور اصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا گیا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے۔ اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل عمل ہے۔ وہی یورپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے بھی حجاب نہ کیا تھا آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو جاہل محض اور بائبل کو مجموعہ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن تین رات تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے، اور ہنستے ہیں، وہ علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو اتنا علم دنیا اور قدرت کا حاصل نہ تھا جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے نہ علم انجیات سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبیعیات سے، نہ فلکیات کا علم انھیں حاصل تھا، نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اس کا یہ حال ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کر سکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

فرض کیجئے گزشتہ جنگ کے موقع پر مسیح اتحادیوں کی جنگی کونسل کے موقعہ پر موجود ہیں، اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں "اپنے دشمن سے محبت کرو۔" دریافت کیا جاتا ہے "کیا ایسے دشمن سے محبت کی جا سکتی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح حالت میں ہو کر گھر تباہ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے"۔ وہ فرماتے ہیں "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔" پھر پوچھا جاتا ہے کہ "دشمن کے تمام مظالم کا کیا علاج ہے"۔ مسیح جواب دیتے ہیں "جو تم سے نفرت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھلائی کرو، ان کے لئے دعائے خیر مانگو جو تم سے برا سلوک کرتے ہیں"۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی باتیں ہیں اور اگر مسیح واقعی جنگی کونسل میں شریک ہو کر یہی تلقین کرتے تو انکے ساتھ وہی سلوک نہ ہوتا جو کسی وقت یہودیوں اور اہل رومہ نے کیا تھا۔ یقیناً ہوتا کیونکہ مسیح کی یہ تلقین اخلاق آج بہ لحاظ سیاست و تجارت، تمدن و معاشرت، ایسی لغو و ناقابل عمل تعلیم ہے کہ اس سے زیادہ ناقص ذہن انسانی میں کوئی اور بات آ ہی نہیں سکتی۔

مسیح کہتے ہیں کہ "اگر کبھی ایک حقیر سی چڑیا بھی مر کر زمین پر گرتی ہے تو آسمانی باپ کا دل دکھ جاتا ہے"۔ لیکن اگر واقعی کوئی آسمانی باپ ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیوں نہیں وہ ان تمام مظالم کو روکتا جو حقیر چڑیا کیا معنی بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

مسیح کا ارشاد ہے کہ "آسمانی باپ سر کے تمام بالوں کا شمار رکھتا ہے"۔ لیکن ایک سائنس داں دریافت کر سکتا ہے کہ کیا وہ آسمانی باپ اُن خوردبینی خلایا کا بھی شمار رکھتا ہے، جو رحم کے اندر خدا معلوم کسی مقدس راہب کی تعمیر میں مصروف ہیں یا کسی قزاق و رہزن کی آفرینش میں۔

مسیح فرماتے ہیں :- "ایک باپ اپنے بیٹے کو روٹی دینے پر بھی قادر نہیں ہے، یہ آسمانی باپ ہی کا کام ہے جو مانگنے والوں کو دیتا ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہے" لیکن آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مرنے والے کی ماں یا بیوی کی دعا اس کی جان بچانے میں مقبول ہوئی ہو، یا کوئی بڑے سے بڑا راہب، مولوی یا ملی اس کا دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنی دعا سے رائفل کی گولی کو راستہ میں روک لے گا۔ اب وہ زمانہ ہے جب دنیا اس حقیقت کو جان گئی ہے کہ اگر ہمارا رومال کثیف ہے تو اُسے ایک پیسہ کا صابن ہی صاف کر سکتا ہے اور اگر سارے زمانہ کے اولیائے کرام اپنی تمام عمر محض دعا کی مدد سے اس کو صاف اور اُجلا کرنے کی کوشش میں صرف کر دیں تو کامیاب نہ ہوں گے۔

مسیح کہتے ہیں "آسمانی باپ کتنا مہربان ہے جو اچھے بُرے دونوں پر پانی برساتا ہے" حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے، اگر واقعی پانی کا برسانا اسی آسمانی باپ کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنے اس اختیار کو کسقدر بے اصولی سے استعمال کرتا ہے کہ جہاں ضرورت نہیں وہاں تو وہ سیلاب کے سیلاب برپا کر دیتا ہے اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں گرتا اور ہزاروں لاکھوں انسان قحط سے مر جاتے ہیں۔

مسیح کا نظریہ عفو و درگزر کے باب میں "سات ستر مرتبہ" ہے یعنی ۴۹۰ بار۔ انگلستان کا وزیر حربیہ مسیح سے پوچھتا ہے کہ "ہم ایک جرمن آبدوز کشتی کے کپتان کو جس نے ایک اسپتالی جہاز ڈبو دیا ہے کتنی مرتبہ معاف کریں" جواب ملتا ہے "جب تک وہ ۴۹۰ اسپتالی جہاز نہ ڈبو چکے۔ ایک حاکم عدالت دریافت کرتا ہے کہ "ایک شخص کو جو اپنی بیوی کو بے قصور چھوڑ رہا ہے اور اُس کے معاش کا کفیل نہیں ہوتا کتنی مرتبہ معاف کرکے رہا کریں۔ وہی ۴۹۰ مرتبہ" مسیح کہتے ہیں "ہاں"

وزیر حربیہ اور مجسٹریٹ دونوں یہ جواب سن کر اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں کہ "مسیح تو یونہی کہا کرتے ہیں، تم تو اس جرمن آبدوز کے کپتان کو فوراً گولی سے مار دو اور اس شخص کو جیل میں بند کر دو جب تک ۳۰ پونڈ ماہوار بطور معاش اپنی بیوی کو دیتے رہنے کی ضمانت نہ داخل کرے"

الغرض جس حد تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے۔ مسیحیت کا وجود دنیا میں باقی نہیں رہا، اور نہ موجودہ علمی تمدنی ترقیوں کے زمانہ میں اس کے باقی رہنے کی کوئی صورت تھی۔ اسوقت یورپ و امریکہ کا اپنے آپ کو مسیحی یا عیسائی کہنا حقیقتاً ایک قومی یا نسلی تعین سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور نہ دنیا میں کوئی مذہب باقی رہ سکتا ہے اگر وہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں، اگر اس کی تعلیمات اس قدر وسیع جامع او حاوی ہیں کہ ترقی ذہن و خیال کی رفتار کا ساتھ دے سکیں تو بیشک اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے، ورنہ اس کے قائم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب ان تمام تمہیدی بیانات کے بعد آئیے مذہب اسلام پر غور کریں کہ اسکی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعوے کرنا کہ وہ مذہبی دنیا میں آخری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد محمد کی سیرت کہاں دونوں میں

اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیاری ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی، لوگوں نے اسلام کے مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور یہ کہ اس میں حشو و زوائد کا اضافہ کب اور کن اسباب کے ماتحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں، مذہب کے مفہوم کو متعین کرلینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ضرورت اس کی فطرت کے اقتضا سے پیدا ہوئی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی حاجت نہیں، ابتدائے آفرینش سے لیکر اسوقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں ہماری مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری چیز ہے اور وہ محض اس لئے کہ انسان بالطبع تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام سب کچھ منحصر ہے، کسی اعتقادی قانون پر یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے۔ بلکہ فطری اقتضاء ہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین مذہب ہونے کی علامت اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو، یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جسقدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے۔ یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر تنقید کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اچھا تو آئے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھکر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی ہے، یہ ہیں:۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ ولا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم۔ یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے، اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ جو قانون نظام عالم کا اس نے بنا دیا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی وہ مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر حادی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔

"مذہب اسلام فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے اور اس بام ترقی تک پہونچانے والا ہے جو انسان کے تمام قوائے کامنہ کو بروئے کار لانے کے بعد بآسانی حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ ترقی کے اصول کیا ہیں؟ یعنی اسی کلیہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا کہ جو اصول نظام عالم اور ارتقاء کا قدرت نے مقرر کردیا ہے اس میں کبھی

تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، اور ایک انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ سعی و کوشش سے کام لیکر ترقی کی راہیں پیدا کرے۔ اسی حد کو خدا نے میں آیات محکمات کہا ہے، کسی جگہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا سے تعبیر کیا ہے، کبھی بصائر للناس بتایا ہے اور کبھی حبل اللہ سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس امر کو سمجھ کر کاربند ہوا اور اگر اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ (ایک شخص کو اتنا ملے گا جتنی وہ کوشش کرے گا)، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ترقی کی صورت کیا ہوگی، ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کر لیا اور انھوں نے اس پر کاربند ہو کر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دیں گے۔ کرۂ ارض کا وارث کر دیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا کہ اس سے زیادہ عملی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی اور نہ آئندہ اس میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے، لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جا رہا ہے اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھیے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں، وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے؟ حالانکہ اس مفہوم کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جبکہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکاں دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ اس سے مقصود وہ مفہوم ہے جو لفظ کُل سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، اسی لئے میرے نزدیک اگر خدا کا کوئی موزوں و مناسب نام ہو سکتا ہے تو وہ صرف کُل ہے اور اسی کو اسم اعظم قرار دینا چاہیئے۔ یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبہ شرک پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر شرک سمجھی جاتی ہیں، داخل شرک ہو سکتی ہیں۔

خدا کو کُل سمجھنا، یعنی اس کو تمام کائنات کا محیط اعظم، دائرۂ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی، عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا، یہی مفہوم ہے اسلام کی توحید کا اور یہی مدعا ہے صوفیہ کی وحدت الوجود کا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صوفیہ نے وحدت الوجود کو خوارق عادات اور کرامات فوق العادت کی بنیاد قرار دے کر اپنے آپ کو عضو بیکار بنا لیا اور سائنس نے اس کُل کو مظاہر جزئیات سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح معنے میں علم "خلیفۃ اللہی" بلند کیا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بت پرستی کرتا ہے، تو وہ شرک میں مبتلا ہے، کیونکہ بت پرستی حقیقتاً اسی کُل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام

کاموں کا انحصار حقیقتاً انھیں پتھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کی تعیین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ ہوئی ہے کہ اس کو دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا۔ جو خوش بھی ہو سکتا ہے اور برہم بھی، حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا اگر کوئی شخص عمر بھر خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا، اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ ہی میں پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا، اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے متعدد خداؤں کی قائل ہے، تو وہ صرف اسی وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے، درست نہیں۔ البتہ اگر اس کی بت پرستی یا شرک اُسے اوہام باطلہ میں مبتلا کر کے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں، جو خدا کو واحد یا کل ماننے کی حالت میں سعی و عمل، کاوش و جستجو، اقدام و ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اس کی برہمی یہی ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و حقیر ہیں۔ اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہیئے اگر تم مومن ہو) اسلام کی تعلیم ہے اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور اس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ پڑھتا رہے، لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا رہتے ہوئے، سوائے مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہیں کرتا تو کیا ایسے انسان کو اُن مومنین میں شامل کر سکتے ہیں جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبہ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہے، تو اس توحید کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے۔ بلکہ اُس کو محیط کل باور کیا جائے، اصول فطرت کا مطالعہ کیا جائے، عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے، اجتہاد و عمل کو معمول بنایا جائے، دماغی و ذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کر لیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں بیان ہوتا ہے کہ

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک

لآیات لقوم یتفکرون ؁

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر، تامل و تدبر، سعی و کاوش سے کام لو۔ چیز دیکھو کہ کیا چیز ہے جس کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے، کیا جہاں وہ تمہارا یہ آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا۔ پانی، ہوا، آگ، بجلی، بادل، فضا، روشنی، حرارت، ہوا کے پرند، زمین کے چوپائے، پہاڑوں کے معدنیات پانی کے موجودات، الغرض دنیا میں کوئی چیز، کوئی کیفیت، کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو آج انسان کے اقتدار سے باہر ہو، لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہے صرف قرآن کے تعلیمات پر عمل کرنے کا، اور اس لئے ہر وہ جماعت جو اس کی عامل ہے، مسلمان کہلائے گی خواہ وہ مسیح کی اولاد میں سے ہو، یا رام و لچھمن کی ذریات میں سے اور

جو اس پر عامل نہیں ہے، وہ یقیناً کافر، مشرک اور غیر مسلم کہلائے گی۔ خواہ وہ آل فاطمہ ہی سے کیوں نہ نسبت رکھے۔ یہ ہے قرآن کا فیصلۂ آخرین جو اس نے ایک مسلم و کافر کی تفریق و امتیاز کے متعلق سب کو سنا دیا ہے، اور جس میں کبھی کبھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو سکتی، خواہ انسانی ذہن و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے، ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت درس کا یہی احاطۂ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی، عبادات کی تعلیم، اصلاح و تقدس کا درس غور و تامل کی ہدایت، تفکر و تدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اسی ایک اصول ترقی پر منحصر ہے، اور کسی جگہ رسمی، ظاہری، بےمعنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت عمل کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے، زکوٰۃ میں بھی وہ تعاون و ہمدردی کا سبق ہے، حج میں بھی وحدت عمل مقصود ہے، اور جہاد نفس و مال اسی محنت و جفاکشی، اسی ایثار و قربانی کی تعلیم ہے، جو اساس ارتقاء اور بنیاد اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہنچا وہ ڈارون کا اصول ارتقاء (EVOLUTION) تھا، لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو، ابو نصر محمد فارابی تھا اور ڈارون سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ، (حکماء اسلام) ہی تھے، جنھوں نے اصول ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر و الحاد کہیں اور قدیم حکماء اسلام کو کافر و ملحد کے خطاب سے یاد کریں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ آج چونکہ ڈارون کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے، علماء کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں، حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندان اسلام ہی کو حاصل ہے، اور قرآن میں خود جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

۱- ربنا الذی اعطی کل شئ خلقہ ثم ہدیٰ۔

(میرا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا۔)

کیا ڈارون کے اصول تنازع کا کوئی دوسرا مفہوم ہے۔

۲- لیس للانسان ماسعی - رفع بعضکم فوق درجات۔

کیا تنازع للبقا اور صلاحیت کے لحاظ سے، مختلف درجات قیام کی تعیین اور بقاء اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا کلام مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین، قانتین وغیرہ کے جو سینکڑوں الفاظ آئے ہیں، وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۴۔ ھوالذی انشاءکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع۔

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (PROTON) بھی کہتے ہیں، کوئی دوسری چیز ہے۔ کیا مستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقا کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے، جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو۔ اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم وحکمت کے اس محکم ترین نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے، تمام وہ مسائل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں، اور ایسے مستحکم ومضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلندترین نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد بھی ان میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطاطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اس نے ان اجرام کو کل فلک یسبحون کہکر یہ بتایا کہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کوپرنکی نظام قائم ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا، پھر ایک زمانہ کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگان کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے، حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ والشمس تجری لمستقر لھا۔ اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسائل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعوےٰ غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب وتمدن ہے، سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا، اور زندگی کو یکسر اضطراب عمل ثابت کرنیوالا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد نہ خوافیات پر ہے نہ صنمیات پر، نہ جس کا انحصار اساطیرالاولین کے ماننے پر ہے نہ کسی مخصوص رسم ورواج اور طریق عبادت ونمایش پر، اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں آئے ہو تو کائنات پر غور کرو، مظاہر قدرت کا مطالعہ کرکے اپنی اُن قوتوں کو بروئے کار لاؤ، جو تمہارے اندر ودلیعت کردی گئی ہیں، نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو اور اپنی سعی وکوشش سے دنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص اس اصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اُصول پر کاربند کہلائے گا خواہ وہ کسی رنگ ونسل کا ہو اور جو اس پر عامل نہیں ہے اُس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں، خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اسکو جنا ہو۔

نماز اصولاً درس اجتماع ہے، زکوٰۃ اصولاً جذبۂ تعاون ہے، روزہ اصولاً حسیات لطیف کی بیداری ہے، اور حج
ت و انسانیت کا احساس وسیع پیمانہ پر۔ اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد
ب کئے جائیں۔ تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہ تمام قواعد وضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں۔ اور انسانی
شرت کو اسلوب بلند پر لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قوانین مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال و اختلاف
ال کے امکانات کو دور کرکے ہیئت اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور
، کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا۔ اور اس میں زمانہ و ملک کے لحاظ سے تبدیلی کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسکو
ے علمائے کرام نے نہیں سمجھا اور یہی مسئلہ میرے ان کے درمیان استخوان جنگ بنا ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ وہ کہتے
کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا، مقررہ قواعد کے ماتحت روزہ رکھنے کا متعین مقدار سے
تھ زکوٰۃ ادا کرنے کا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدے اصل چیز نہیں ہیں بلکہ ہر زمانہ کے لحاظ سے بدلجانے کی چیزیں ہیں
لئے نہ ان پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی۔ بلکہ اگر آج ترقی تمدن ضروریات
شرت، اقتصاد و مشاغل یا کسی اور مصلحت کی بنا پر جس کی رعایت ہماری دنیوی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ فقہ کو بدل ڈالنا
ل عبادات میں تغیر و تبدل کر دینا، ضابطۂ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا، مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہئے اور یہی اولین
ہے، ایک ذی شعور عالم دین کا۔ ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا۔ اور ہر اس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم
آشنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف مذہب ہوگی، اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تو دعویٰ بالکل غلط ہوگا،
لہ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ، حنفی فقہ، شافعی فقہ کی تفریق کیوں ہوتی۔ اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر
ہوتیں، قرون اولےٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا، اجتہادات و قیاسات میں اختلاف کیوں ہوتا اور اقوال آئمہ
مدین میں اس قدر اصولی اختلافات کیسے پیدا ہوتا کہ آج یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ رسول اللہ واقعی ہاتھ باندھکر
پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد وہ مسائل نہیں ہوا کرتے جن میں لوگوں کے اختلاف کو گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ
س مذہب صرف وہ مقصود ہوتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، پھر مذہب اسلام
ساسی اصول صرف ایک ہے، جسے قرآن میں ہر جگہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا میں اخوت عامہ و انسانیت کے رشتہ کو مضبوط
۔ اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر اس سے کسی کو اختلاف ہو تو بیشک ہم کہیں گے کہ وہ اسلام سے خارج ہے
انیت سے علیحدہ ہے، لیکن جبتک کوئی شخص اس اصول تعلیم کو مانتا ہے اور اس پر عامل ہے اسوقت تک کسی کو حق حاصل
ں ہے کہ وہ اسے دائرۂ مذہب سے خارج کر دے، خواہ وہ نماز کا عادی ہو، یا نہ ہو، روزہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ یہ درست

ہے۔ کہ قرآن میں ان شعائر اسلامی کی پابندی کا ذکر موجود ہے۔ لیکن صرف ایک مختص الوقت و مختص المقام قانون کی حیثیت سے اور آج اگر ضرورت ہو تو ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کلام مجید کی عظمت کو اس سے صدمہ پہونچنے کا اندیشہ

حقیقت سے ہٹ کر فروع کو اصل قرار دینے کی داستان بہت طویل ہے اور اگر اس کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی۔ لیکن بعد کو اس میں اور اضافے ہوتے گئے گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا۔ صراط مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں الجھتے گئے، یہاں تک کہ آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا۔ اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسوم و رواج، اوہام باطلہ، عقاید سخیفہ، مفروضات [illegible] اور مزعومات کا ذخیرہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا۔ اور چونکہ گمراہی شدید ہے، ضلالت سخت ہے، اور اسلام کا درس اولین ما سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اس لئے اب جو صحیح بات بتائی جاتی ہے تو اس کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے اور عرصہ تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

اسلام درحقیقت نام تھا صرف اتحاد امت کا، نفسی و مالی جہاد کا، سعی و عمل کا، مکارم اخلاق کا، سیر فی الارض کا۔ اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو، جہاد سے جی چرانے کو، محنت و کوشش سے منحرف ہونے کو، اخلاق سے ہٹ جانے، اور پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو۔ لیکن اب اسلام ہے نام صرف تسبیح و عمامہ کا، جبہ و دستار کا، رسمی نماز ادا کر لینے کا، اور سر منڈا کر رسماً و تقلیداً حرم کے طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے۔ اگر آج میں کسی مولوی سے فلسفۂ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے کافر، ملحد، فاسق و فاجر کہکر نکال دیتا ہے۔

بہرحال دنیا میں مذہب کی ضرورت یقیناً ہے، کیونکہ جامعۂ بشری اس کا محتاج ہے، اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عائد کر سکے۔ وہ مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اسلام ہے، جس کی آغوش ساری دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات فطری ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد غالباً یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ دنیا میں پائیدار قوت کونسی ہو سکتی ہے۔ وہ جو اپنی تنگ نظری سے خود اپنے افراد کو بھی علحدہ کر رہی ہے۔ یا وہ جو ساری دنیا کو دعوت عمل دے کر ایک مرکز پر ایک غرض مشترک کے ساتھ جمع کرنا چاہتی ہے۔

ایک چتا میں دو شعلے

آفتاب غروب نہ ہوا تھا، لیکن آسمان پر اتنا گہرا بادل چھایا ہوا تھا کہ اندھیرا کافی ہو گیا تھا، اور تیز ہوا کی وجہ سے گرد وغبار اٹ گیا تھا جس نے اور بھی رہی سہی روشنی محو کر دی تھی، عین اُسوقت راج کشور اپنی نوعروس کو لئے ہوئے مع اپنے چند عزیزوں کے کشتی پر دگیا گھاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز ہونے لگی اور دفعتاً اس زور کی آندھی اور بارش شروع ہوئی کہ ملاحوں کے حواس گم ہو گئے اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا یعنی کشتی اُلٹ گئی۔

ایک گھنٹہ کے بعد بادل برس کے نکل گیا۔ ہوا بھی تھم گئی۔ آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ چاند چمک رہا تھا اور اسکی نکھری ہوئی شفاف روشنی گنگا کی پرسکوت سطح پر مچل رہی تھی۔ راج کشور کو جب ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو بھیگے ہوئے کپڑوں میں ریت پر پڑا پایا۔ متوحش نگاہوں سے اُس نے چاروں طرف دیکھا کشتی کا اُلٹنا یاد آتے ہی اُسے چکر سا آ گیا۔ اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب اوسان کچھ بجا ہوئے تو بے اختیار اِدھر اُدھر مضطرب ہو کر دیکھنے لگا۔ اس خیال سے کہ معلوم نہیں اُس کے ہمراہیوں کا کیا حشر ہوا؟ اپنے باپ کا جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ خیال آتے ہی وہ بلبلا کر رونے لگا۔ اسی طرح اُسے اپنی نئی دلہن کا جسے اس نے ابھی دیکھا بھی نہ تھا خیال آیا۔ وحشت میں وہ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا کہ ناگاہ چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ کوئی چیز سُرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ وہ امید و بیم کے ساتھ اس طرف بڑھا۔ دیکھا کہ کوئی لڑکی عروسی کے کپڑے پہنے بھیگی ہوئی خوف کے مارے سمٹی جا رہی ہے۔ لڑکی اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اور سہم گئی اور اپنی سُرخ چادر اپنے چاروں طرف لپیٹ لی۔ راج کشور کو یہ سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے۔ وہ بے اختیار بول اُٹھا:

"پرماتما نے تم کو بھی میری طرح بچا لیا" لڑکی خاموش رہی۔ بلکہ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ راج کشور نے کہا:

"میں تمہارا بدنصیب شوہر ہوں۔ اب اس مصیبت میں شرم و حیا فضول ہے۔ تم کو اور لوگوں کی بھی کچھ خبر ہے"

"جی نہیں" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

راج کشور کا جی پھر اُمنڈنے لگا۔ اس جگہ کی مایوس کن تنہائی سے اس کا دم اُلجھ رہا تھا۔ آخر کار وہ رو دیگا۔ اور اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ لڑکی کے بھی اس سانحہ سے ہوش و حواس صحیح نہ تھے۔ راج کشور کو روتا دیکھ کر وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راج کشور سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ایک بے لبسی کے انداز میں اپنی آغوش اُسکے سامنے کر دی۔

اور جب صبح ہوئی تو آفتاب کی سنہری کرنیں دو معصوم ہستیوں پر پڑ رہی تھیں۔ جو دنیا و مافیہا سے بے خبر جھکتے ہوئے ریت پر غافل پڑی تھیں۔

راج کشور کی آنکھ پہلے کھلی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے ماحول کو محسوس کر کے وہ پھر پریشان ہو گیا۔ اشنان کر کے لڑکی کو بھی جگایا۔ وہ بیچاری بھی اسی طرح بدحواس تھی۔ راج کشور نے اسکو تسلی دی۔ اور پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟" "کسوم" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ راج کشور "کسوم" کو وہیں چھوڑ کر بہت دور دور تک سر مار آیا۔ لیکن اس کے ہمراہیوں کا نشان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسوم کے پاس واپس آ کر اپنی ناکامی کا حال بتلایا۔ دونوں پریشان تھے کہ کیا کریں۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک ملاح اپنی کشتی کھیتا جا رہا ہے۔ راج کشور نے اُسے پکارا جب وہ کنارے آیا تو دونوں کشتی پر سوار ہو گئے اور چند گھنٹوں کے بعد دیگھا گھاٹ پہونچ گئے۔

راج کشور کا اب کوئی قریب کا عزیز باقی نہ رہا تھا۔ وہ وکالت کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس کے باپ کے ایک قدیم ملنے والے منشی برج نرائن پنشنر ہیڈ ماسٹر کلکتہ میں مستقل طور پر رہتے تھے۔ راج کشور نے ان کو اپنے والد کی اچانک موت کی خبر دی مگر شادی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ انھوں نے اس کو کلکتہ بلا لیا۔ اس نے وہیں کرایہ پر ایک مکان لے کر پریکٹس شروع کر دی۔ ذہانت اور سخت جفاکشی کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں معقول آمدنی ہونے لگی۔ اب اس نے کسوم کو بھی وہیں بلا لیا۔ لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ بابو برج نرائن سے اس نے اس کو مخفی رکھا۔ چھ مہینے ہنسی خوشی سے گذر گئے کسوم کی صرف یہ کوشش تھی کہ وہ راج کشور کو خوش رکھ سکے۔ راج کشور بھی اس کی بھولی بھالی اداؤں کا جو معصومیت اور اخلاص سے لبریز ہوتی تھیں۔ پہروں مزہ لیا کرتا۔ ایک روز باتوں باتوں میں راج کشور نے پوچھا۔ کسوم تم کو اپنا گھر تو بہت نہیں یاد آتا۔ شادی کے بعد سے وہاں کی کوئی خبر بھی نہیں معلوم ہوئی۔ تم وہاں جانا تو نہیں چاہتیں۔ کسوم مسکرا کر بولی۔ میرا وہاں کون ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب میں بہت کمسن تھی تو گاؤں میں ایک نہایت خوفناک طاعون پھیلا۔ اور اسی میں مبتلا ہو کر میرے ماں باپ دونوں مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت جی مہراج نے جو میرے پڑوس میں رہتے تھے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر اب تک جیسی گذری اس کے خیال سے جی کانپنے لگتا ہے۔ گھر میں ہر شخص ذلیل نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پنڈت جی کی بیوی اور لڑکیاں مجھ سے بہت بری طرح پیش آتی تھیں۔ مہراج میرا خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ باہر کے آدمی ان کو کیا معلوم کہ گھر کے اندر کیا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ شادی کس بے ترتیبی سے ہوئی۔

کسوم کی زبان سے یہ باتیں سن کر راج کشور کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس لڑکی سے اُس کی شادی ہوئی تھی اُس کے ماموں جل گاؤں کے کاشتکار تھے اور وہی اُس کے سرپرست تھے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا تمہارے گاؤں کا نام کیا تھا؟" اب کیا تم کو اتنا بھی یاد نہیں؟" کسوم راج کشور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی" شادی سے

پہلے آخر تم بھی تو ایک ہفتہ اپنے دوست کے یہاں ٹھہرے تھے۔ کیا کرن پور میں یاد نہیں رہا" راج کشور سخت پریشان ہو گیا۔ کچھ اور گفتگو کے بعد اسے قطعی طور پر یہ معلوم ہو گیا۔ کہ کسوم وہ لڑکی نہیں۔ جس کے ساتھ جل گاؤں میں اس کا بیاہ ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس کا اظہار کسی طرح کسوم پر نہ ہونے دیا۔ وہ پریشان تھا کہ کیا کرے۔ یہ بات نہایت نازک تھی۔ کسوم کے اصل شوہر نہ ہونے کی حیثیت سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا راج کشور ہرگز گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ یہ کسی طرح ممکن تھا کہ کسوم کو جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

راج کشور جب سے کلکتہ آیا تھا۔ اپنے پیشہ میں بہت منہمک تھا۔ لیکن فرصت کے وقت وہ کبھی کبھی منشی برج نرائن کے یہاں بھی ہو آتا تھا۔ اور جب سے کسوم کا اصلی حال معلوم ہوا تھا۔ برج نرائن کے یہاں اسے ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

کنول برج نرائن کی تنہا اولاد تھی۔ اور جب سے ان کا جوان لڑکا مر چکا تھا۔ اُن کی تمام امیدیں صرف کنول کی خوشی سے وابستہ تھیں۔ کنول نے سال گزشتہ ایف۔ اے درجہ اول میں پاس کیا تھا۔ اور اس تعلیم نے کنول میں ایک مغربی رنگ پیدا کر کے اس کے اچھوتے حسن کو اپنی جگہ پر مکمل کر دیا تھا۔ کنول جب اپنے بالوں میں متعدد جگہ نشیب و فراز پیدا کر کے ان کو سنوارتی۔ اپنی باریک ساری جس میں سے اُس کے کندن جیسے بدن کی روشنی چھنتی تھی زیب تن کرتی۔ اپنے خوشنما انگریزی وضع کے جوتے پہنتی۔ اور اس طرح جب وہ اپنی بغل میں کتاب دبائے۔ اسکول کی گاڑی کی طرف جو روزانہ صبح کے وقت سڑک پر اس کا انتظار کرتی تھی چلتی تو صدہا نگاہیں بے اختیار بچھ جاتیں اور وہ ایک فاتحانہ استغنا سے جلدی جلدی چل کر گاڑی میں ہو لیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک مخلوق اپنی حسرتیں اس کے پاؤں کے نیچے ڈالدے اور وہ اُنھیں ہنس کر لاپرواہی سے ٹھکرا دے۔ اگر وہ کسی ایسے مرد کو دیکھتی جس کی نظروں میں اس کو دیکھ کر التجا کا رنگ نہ آ جاتا۔ تو اس کے حسن کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔ راج کشور کا روز روز کا آنا جانا رنگ لا کر رہا۔ اس کی سنجیدہ طبیعت، اس کی شائستہ گفتگو اور پھر اسکی رعنائی۔ یہ سب باتیں ایسی نہ تھیں کہ کنول اس سے متاثر نہ ہوتی۔ راج کشور بھی کنول کے احساس کو سمجھ گیا تھا اور سمجھ کر خوش تھا۔ کنول کی نکتہ سنجی، اس کی ذہانت، اس کی اعلےٰ تعلیم اور اس تعلیم کے اثر سے اس کی اداؤں کی دلفریبی ایسی باتیں نہ تھیں کہ راج کشور داد نہ دیتا۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ کسوم اس کے عمیق حسیات کے مطالعہ سے قطعی نابلد ہے۔ اور اسکی فراست و ذہانت کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ داد دے سکتی ہے۔ یہ تھی وہ رکاوٹ جو کسوم کا حال معلوم ہونے کے بعد اس میں اور راج کشور میں پیدا ہو گئی تھی۔ برج نرائن صاحب کے کہنے سے کنول اپنے درس فلسفہ کا کوئی مسئلہ جس میں اُس کو کچھ شبہ ہوتا۔ راج کشور کے سامنے لاتی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ راج کشور کی ذرا سی تنقید سے اس کی پوری تشفی نہ ہو گئی ہو۔ راج کشور کا یہ معمول ہو گیا کہ بلاناغہ شام کی چائے برج نرائن صاحب کے یہاں پیا کرتا۔ اتفاق سے اگر راج کشور کو دیر ہو جاتی

تو کنول کو الجھن ہونے لگتی۔ اور وہ اگر اسی درمیان میں آجاتا تو کنول خوشی سے اچھل پڑتی۔ اس کا چہرہ چمکنے لگتا۔ اور راجکشور کو اس انتظار کرانے کے جرمانہ میں ایک پیالی چائے زیادہ پینی پڑتی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو اس پیالی میں سرور محسوس نہ ہوتا تھا۔

راج کشور جب گھر آتا تو پریشان رہتا۔ اس کی جان عجیب کشمکش میں تھی۔ کسوم اس تغیر کی وجہ بالکل نہ سمجھی۔ راج کشور سے اگلے التفات کے لئے وہ ترسا کرتی۔ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔ ایک روز راج کشور نے کہا:۔

"کسوم میں دن بھر کچہری میں رہتا ہوں۔ تمہاری طبیعت نہیں گھبراتی۔ تمہیں پڑھنے کا شوق نہیں؟"

"اچھا مجھے پڑھا دیجئے؟" کسوم نے لجاتے ہوئے کہا۔

"تم خود دیکھتی ہو کہ مجھے کہاں فرصت رہتی ہے؟ دن بھر موکلوں میں پھنسا رہتا ہوں۔ میں تمہارا داخلہ کسی سکول میں کرا دوں؟"

"میں اسکول میں پڑھوں گی۔ مجھ سے اتنی لڑکیوں کے بیچ میں کیسے جایا جائے گا؟"

راج کشور کا لہجہ اب زیادہ سنجیدہ تھا۔ اور کیوں اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ دیکھو بڑے بڑے شریفوں کی لڑکیاں اسکول پڑھنے جاتی ہیں۔ چار لڑکیوں کے ساتھ رہو گی، تو بہت سی اچھی باتیں آپ سے آپ آجائیں گی۔ کسوم! علم بڑی دولت ہے۔ بغیر علم کے آدمی نہ تو اپنا برا بھلا سمجھتا ہے اور نہ اپنے ماتا پتا کو پہچان سکتا ہے۔ میں تمہارا داخلہ اسکول میں کرا دوں اور تم وہیں بورڈنگ میں رہا کرنا۔ بغیر بورڈنگ میں رہے آدمی کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں!

"جیسی آپ کی مرضی۔" کسوم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن جب راج کشور باہر چلا گیا تو اس خیال سے کہ اسے بورڈنگ میں راج کشور سے بالکل علیحدہ رہنا پڑے گا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چھ مہینے کسوم کو اسکول میں پڑھتے ہوئے ہو گئے۔ اس درمیان میں راج کشور اس کے پاس صرف دو مرتبہ گیا۔ وہ بھی اس کی فیس وغیرہ جمع کرنے کے لئے اور ان میں جو گفتگو ہوئی وہ صرف کسوم کی تعلیم کے متعلق۔ کسوم آخر کب تک سینہ پر سل رکھ کر اپنے دل کو بہلاتی۔ اس کا ننھا سا دل اس سخت امتحان کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ آخر وہ کمرہ بند کر کے اپنی موجودہ حالت پر بیٹھی غور کیا کرتی۔ اکثر اس کا اضطراب غالب آتا اور وہ یہ سوچ کر اپنا دل بہلا لیتی کہ راج کشور مجھ سے میری جہالت کی وجہ سے برگشتہ رہتا ہے۔ اب گرمیوں کی تعطیل میں۔ میں خوب پڑھ کر اس کے پاس جاؤں گی۔ تو وہ پہلے کی طرح مجھ سے پھر خوش رہا کرے گا۔ اس خیال سے وہ خوب جی لگا کر پڑھنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالانہ امتحان میں اسکو دو درجوں کی ترقی دی گئی۔ دو چار روز کی تعطیل جب ہوتی تو اس کی ہجولیاں اس کو چھیڑتیں۔ کہ تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتیں؟

وکیل صاحب تم کو بلاتے کیوں نہیں۔ کسوم یہ کہکر ان کو ٹالدیتی:۔
"میں خود نہیں جاتی۔ کتابوں میں جو مجھے لطف آتا ہے وہ کہیں نہیں آتا۔" اس پر لڑکیاں اسے بہت دق کرتیں۔ ان کے سامنے تو وہ بظاہر بہت خوش رہتی۔ لیکن اس کے دل میں نہایت ہی تکلیف دہ خلش پیدا ہوتی۔ اور جب وہ تنہا رہجاتی تو خدا معلوم کیسے کیسے وہم اس کے دل میں گزرتے۔
گرمیوں کی تعطیل کو صرف دو ہفتہ رہ گئے ہیں۔ ساری لڑکیاں گھر جانے کی خوشی میں پھولی نہیں سماتیں۔ کسوم نے بیٹھے بیٹھے ایک خط راج کشور کے نام لکھکر ڈالا۔

پران ناتھ!
ڈرتی ہوں کہ آپ میری اس محبت پر ناراض نہ ہوجائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ آپ میرے ہاتھ کا خط دیکھکر خوش بھی ہوں گے۔ لڑکیوں نے اپنے بھائی بہنوں کے لئے کروشیا کے بہت سے تحفے تیار کئے ہیں، میں نے بھی آپ کے لئے بہت سی اچھی اچھی چیزیں بنائی ہیں۔ جب آؤں گی تو آپ کے قدموں پر رکھوں گی۔ آپ میرے لئے خرچ بہت زیادہ بھیجتے تھے۔ میں نے اس میں سے بہت سا روپیہ جمع کرلیا ہے۔ لیکن اس کو میں آپکو واپس نہ دوں گی۔ میں نے انکے لئے ایک بہت اچھا استعمال سوچا ہے۔ جب آپ ملیں گے تو بتاؤں گی۔

آپ کی داسی

راج کشور برج نرائن کے یہاں سے واپس ہی ہوا تھا کہ ڈاکیہ نے اس کو کسوم کا خط لاکر دیا۔ پڑھکر اسے واقعی خوشی ہوئی۔ لیکن رنج بھی کم نہ ہوا۔ اس کو اپنے اندر ایک کھٹک محسوس ہوئی جس میں لطف کا ایک پہلو مزدہ تھا لیکن کلفتیں زیادہ تھیں۔ جس قدر اس نے سوچا گتھیاں زیادہ پڑتی گئیں۔ پریشان ہوکر وہ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ آخرکار وہ گھر سے نکلا اور اسکول کی طرف چلدیا۔ راستہ میں کئی دفعہ اس کے پاؤں نے اس کو جواب دیدیا۔ اس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہونے لگی۔ اور وہ ٹھٹکا کہ گھر واپس جائے۔ لیکن وہ طاقت جو اسکو اسکول لیجانا چاہتی تھی۔ غالب آئی اور وہ اسکول کے احاطہ میں داخل ہوکر سیدھا ہیڈ مسٹرس کے دفتر میں پہونچا۔ اور ملاقاتی کارڈ بھیجکر باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو دور سے چند لڑکیاں اسکول سے بورڈنگ کی طرف جاتی دکھائی دیں۔ اس نے دیکھا کہ ان میں ایک کسوم ہے۔
راج کشور کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخرکار راج کشور نے اس خیال سے کہ کسوم اس کو پہچان نہ لے اپنے منھ پر رومال ڈال لیا۔ اتنے میں آدمی نے آکر کہا کہ ہیڈ مسٹرس آپ کو سلام کہتی ہیں۔
راج کشور ہیڈ ماسٹرس کے دفتر میں اپنی حالت سنبھال کر پہنچا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" ہیڈ مسٹرس نے کہا۔

"کسوم کو میں گرمیوں کی تعطیل بھر آپ کی زیر نگرانی بورڈنگ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں" راج کشور نے رُک رُک کر کہا۔

"تعطیل میں سب لڑکیاں اپنے گھر چلی جائیں گی۔ پڑھائی بھی بند ہو جائے گی۔ کسوم یہاں بیکار۔ تنہا کیسے رہے گی۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ کیونکر گوارا ہو گا کہ سال بھر کے بعد تعطیل میں بھی وہ آپ سے علحدہ رہے۔"

"کیا کروں؟ کچھ مجبوریاں اسوقت ایسی ہیں کہ اور کوئی چارہ نہیں۔"

"اچھا جیسی آپ کی مرضی۔ میں کسوم کے متعلق ضروری انتظام کردوں گی۔"

اس کے بعد راج کشور گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ برج نرائن صاحب کا آدمی آیا تھا۔

راج کشور کو اول تو ان الجھنوں نے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دوسرے وہ تھک بھی بہت گیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اس وقت وہاں نہ جائے۔ لیکن یک بہ یک اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اور بغیر کسی ارادہ کے گھر سے نکل پڑا۔ اس نے غور کرنا چاہا کہ وہ آخر کیوں اس درجہ بدحواس ہے۔ لیکن دماغ اس کو جواب دے رہا تھا۔

برج نرائن صاحب باہر بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "راج کشور آج تم نے بڑی راہ دکھائی۔ ہم لوگ کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں، کنول کو آج حرارت ہے" راج کشور خاموش دیوار کی آڑ لئے کھڑا رہا۔ برج نرائن کی سمجھ میں نہ آیا کہ خلاف معمول یہ حالت راج کشور کی کیوں ہے؟ پوچھا "کیوں تم آج ایسے متوحش کیوں نظر آتے ہو۔ اندر چلو۔ تم ایسے کھڑے ہو جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔" راج کشور چونک پڑا اور بولا "کوئی خاص بات نہیں۔ طبیعت ذرا آج بھاری ہے۔ چلئے اندر تشریف لے چلئے" کنول۔ ایک مسہری پر پڑی تھی۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ برج نرائن نے پوچھا "کیسی طبیعت ہے۔ ٹمپریچر کیا ہے؟" کنول کا چہرہ بخار کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ گالوں کی گلابی رنگت تپ کی گرمی سے ایک دل آویز سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بالوں سے چھپی ہوئی فراخ پیشانی پر کہیں کہیں پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد راجکشور ایک کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔ کنول کو تعجب تھا کہ وہ کیوں اس قدر خاموش اور کھویا ہوا سا ہے۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو رہی۔ رات چونکہ کافی گذر چکی تھی۔ راج کشور عذر کر کے گھر واپس آیا۔ کھانا نہیں کھایا۔ اور کپڑے اُتار کر لیٹ گیا۔

اُسوقت دو تصویریں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ایک کسوم کی تھی۔ دوسری کنول کی۔ اور اس خیال سے کہ وہ کسے چھوڑے اسے اختلاج ہونے لگا تھا۔ ایک طرف کنول کی ادائیں۔ اس کے خوبصورت خد و خال۔ اس کی آنکھوں کی مقناطیسی شراب دوسری طرف کسوم کی خیالی تصویر نظریں جھکائے ملتجی تھی کہ مجھے اپنے اوپر سے نثار ہو جانے کی اجازت دو۔ اس کی نگاہیں سرنگوں تھیں لیکن ان سے ایک پاکیزہ شفاف روشنی چھن رہی تھی۔ اس کی فراخ پیشانی آرائشوں سے بری تھی۔ لیکن

اس کے خوبصورت بالوں کا فطری تموج احساسات میں ایک جذبۂ شوق پیدا کر رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ لیکن اُسکے گلابی ہونٹ ایک دوسرے سے کچھ ایسی نرمی سے متصل تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ اب کھل کھلا کر ہنسنے ہی والی ہے۔

راج کشور کو کسی فیصلہ پر پہونچنا سخت دشوار تھا۔ ایک سخت اضطراب کی حالت میں لبۂ　　کروٹیں لیتا رہا اور دیر تک اسے نیند نہ آئی۔

راج کشور کی جب آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانیوں کے بجائے ایک خود فراموشی کا رنگ تھا۔ شاید شب کی کاوشوں کے بعد راج کشور کسی فیصلہ پر پہونچ گیا تھا۔ چائے پی کر بہج نرائن صاحب کے یہاں پہونچا۔ کنول کی حالت بدستور تھی۔ بلکہ تپ اور شدید ہو گئی تھی۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے وہ کچہری بھی نہیں گیا، اور دن بھر نہایت انہاک سے کنول کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ ڈاکٹر نے ہر دو گھنٹہ کے بعد دوا پلانے کے لئے کہا تھا۔ راج کشور ہمہ تن اضطراب بنا ہوا گھڑی کی ٹک ٹک پر کان لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ جب بڑی سوئی بارہ کے قریب ہوتی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے اٹھتا۔ غلبۂ شوق سے اس پر ایک سخت ارتعاش طاری ہوتا۔ اور وہ اسی طرح کانپتا ہوا کہہ اٹھتا: "کنول دوا پی لو۔"
کنول دو روز کے بخار سے بہت نحیف ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کو اٹھانے میں راج کشور کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ جس کے بعد دوا کا چمچہ راج کشور اُس کے منہ کے سامنے کر دیتا اور وہ اُسے آنکھ بند کر کے پی جاتی۔ آیا کنول واقعی اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بغیر راج کشور کی مدد کے نہ اٹھ سکتی۔ اور اپنی نیم باز آنکھوں سے گھڑی کی طرف صرف اس لئے دیکھتی تھی کہ اسکو وقت پر دوا پینے کا بہت خیال تھا۔ اس پر تنقید کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دوا پی لینے کے بعد اپنی مدھ بھری آنکھیں راج کشور کی طرف متشکرانہ انداز سے پھیر دیتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ راج کشور اس مقابلہ کی تاب لا سکتا تھا۔ وہ ایک غیر محسوس سوز سے پگھلنے لگتا اور یہ محسوس کرتا کہ اس کی روح کو کنول کی آنکھوں کے گلابی ڈورے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جذبات کی ان کشاکش میں دو بیتاب ہستیاں پھر گھڑی کی طرف متوجہ ہو کر دوسرے گھنٹہ کے انتظار میں کھو جاتیں۔

راج کشور کے رات دن کا حصہ کنول کی تیمارداری میں صرف ہونے لگا۔ کام پر بھی وہ برائے نام ہی جاتا لیکن ایک ماہ گذر گیا اور کنول کی طبیعت روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ جون جون کنول کی علالت پیچیدہ ہوتی جاتی تھی۔ راج کشور کا دل اس خیال سے بیٹھا جاتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ ایک روز کچہری سے واپس آ کر وہ کمرہ کے اندر اسی ادھیڑبن میں بیٹھا تھا کہ دروازہ کے سامنے زنانہ اسکول کی گاڑی آئی اور ہیڈ مسٹرس معہ کسوم کے اُس میں سے اتری۔ راج کشور نے جو نظر اٹھائی تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ اُس نے اپنی گھبراہٹ کو حتی الوسع چھپاتے ہوئے نہایت تپاک سے ہیڈ مسٹرس کو سلام کیا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ہیڈ مسٹرس نے ایک سنجیدگی سے جس میں ذرا ترشی ضرور ملی تھی۔ راج کشور سے بولیں: "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ تعطیل میں تمام لڑکیاں اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ اور اس حالت میں کسوم کو اکیلے رہنے میں بڑی مصیبت کا سامنا ہو گا۔

چنانچہ اسکول میں تعطیل ہو گئی ہے۔ اور جبوقت سے کسوم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ تعطیل میں بھی دہیں رہے گی برابر رو رہی ہے۔ اس لئے کوئی چارہ نہ تھا بجز اسکے کہ آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔" راج کشور نے بہ ہزار دقت اپنے حواس اکٹھا کر کے کچھ منتشر الفاظ میں ہیڈ مسٹرس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اسکول واپس گئیں۔

روتے روتے کسوم کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا لیکن باایں ہمہ کسوم اب وہ کسوم نہ تھی جو ایک سال پہلے اسکول میں داخل ہونے کے وقت تھی۔ اسکول کی لڑکیوں کی صحبت اور تعلیم کے اثر سے اسکی نشست و برخاست میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ اس کی وضع اس کی گفتگو، اس کی سفاک سنجیدگی جس میں اس کے فطری البیلے پن کی جھلک اب بھی موجود تھی۔ ان باتوں نے اگر راج کشور کو کچھ دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسوم نے کس قدر جلد اسکول اور تعلیم کا اچھا اثر قبول کر لیا۔ لیکن کسوم کی فطری سادگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور اب بھی وہ حجاب عصمت کی پتلی تھی۔

راج کشور بہت رک کر بولا: "کسوم میں نے تم کو بورڈنگ میں چھوڑ دینے کا اس لئے ارادہ کیا تھا کہ ایک تو میرا ارادہ کچھ دنوں کے لئے مینی تال جانے کا ہے۔ دوسرے مجھے یہ خیال ہوا کہ تعطیل میں تم ہیڈ مسٹرس کے ساتھ رہکر اپنی تعلیم میں خوب ترقی کر سکو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئیں؟"

کسوم کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے بولی: "گنہگار ہوں!" یہ کہنے کے بعد بڑے بڑے موتی آہستہ آہستہ اسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ راج کشور نے اسے بہت سمجھایا، تسلی دی، اسکول کے حالات پوچھے، کچھ سبق وغیرہ سنا اور شام کو ٹہلنے کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔ کسوم کا دل شک کرنے کے لئے تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ راج کشور کے تسلی دینے سے اسے اطمینان ہو گیا اور وہ خوش ہو گئی۔ راج کشور جب رات کو برج نرائن کے یہاں سے واپس آیا تو کسوم نے خوشی خوشی اپنی دستکاری کے نمونے راج کشور کو دکھلائے۔ اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ لیکن راج کشور صبح کا گیا ہوا سہ پہر کو آتا۔ اور شام کو جاتا تو بہت رات گئے واپس ہوتا۔ کسوم کب تک دل کو مغالطہ دے کر خاموش رکھتی۔ آخر انسان تھی۔ اور اس سے قبل معلوم نہیں کتنے صدمے اٹھا چکی تھی۔ راج کشور کسوم کی معصوم باتوں کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن کنول کا خیال اس کو ایک لمحہ کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔ اب پھر وہ کسوم کی طرف سے لاپرواہ رہنے لگا: اور وہ اس کی باتوں کے لطف سے محروم رہنے لگی۔ وہ بھی کبتک اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا رکھتی۔ آخر کار اس کو ایک جانسوز خلش، ایک جلا دینے والی سوزش بیتاب رکھنے لگی۔ وہ پہروں اداس بیٹھی رہتی۔

کنول کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ راج کشور پر کنول کے عشق کا جنون پوری قوت کے ساتھ مسلط تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کسوم سے فی الحال پیچھا چھڑا لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بغیر کنول کی تیمارداری یکسوئی کے

ساتھ نہیں ہو سکتی۔ بکسر میں اس کے ایک ملاقاتی تھے۔ اس نے ان کو ایک بار گی لکھ دیا کہ میں فلاں روز آرہا ہوں اور کسوم کو کچھ دنوں کے لئے تمہارے یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ کسوم سے اس نے ایک مقدمہ کے سلسلے میں باہر جانے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا یہاں اتنے بڑے شہر میں تنہا رہنا مناسب نہیں۔ میں تم کو بکسر میں اپنے ایک دوست کے مکان پر پہونچا دوں گا۔ ان کی بی بی بہت خوش اخلاق ہیں۔ تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔ اور پھر ایک ماہ کے اندر آکر میں تمہیں واپس لے آؤں گا۔

کسوم کا دل تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ اس نے کہا "جیسی آپ کی خوشی" چنانچہ اُسکے تیسرے روز راج کشور مع کسوم کے بکسر بابو نول کشور کے یہاں پہنچ گیا۔ نول کشور نہایت سادہ مزاج شریف انسان تھے۔ راج کشور کے ساتھ وکالت پاس کی تھی۔ اسی پیشہ سے وہاں روپئے پیدا کرکے عزت و آبرو سے زندگی گزار رہے تھے۔ راج کشور کے آنے سے بہت خوش ہوئے راج کشور نے جب واپس جانے کا ارادہ کیا تو نول کشور صاحب نے قسم کھا کر کہدیا کہ ایک ہفتہ تک وہ کوئی ایسی بات نہیں سنیں گے۔ راج کشور نہایت گھبرایا۔ کیونکہ کی خدمت سے ایک ہفتہ کی غیر حاضری ایک ایسی بات تھی کہ راج کشور گھبرا گیا اور اس کی پریشانی اس حد تک پہونچ گئی کہ نول کشور بھی بغیر کہے ہوئے نہ رہ سکے کہ "راج کشور یہ آخر تمہاری کیا حالت ہے؟" راج کشور نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر نول کشور نے ایک نہ سُنی۔ راج کشور نے یہ ہفتہ کسی طرح گزارا۔ یہ اسی کا دل جانتا تھا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ تمام جھگڑا ہی نہ پاک کر دیا جائے۔ یہ طے کرکے وہ خط لکھنے بیٹھ گیا:

"پیاری کسوم!

مجھے نہیں معلوم کہ مجھ کو تمہیں اس طرح خطاب کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟ تم کو میری کشیدگی سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور جس غلط فہمی میں تم قدرت کی ستم ظریفی سے مبتلا ہو۔ اس لحاظ سے تم کو جو شکایت بھی میری جانب سے ہو بجا ہے۔ مجھے خود تعجب ہے کہ آخر میں نے تم کو کیوں اب تک حقیقت سے ناآشنا رکھا۔ تم کو شاید یاد ہوگا کہ ہماری باہمی علیحدگی کی وہ تاریخ ہے۔ جب میں نے تم سے تمہارے میکے کے متعلق کچھ سوالات کئے تھے۔ مگر اس انکشاف سے صدمہ ضرور ہوگا اور ایسا شدید جس کا برداشت کرنا تمہارے لئے سخت دشوار ہوگا۔ لیکن اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم کو واقعات سے آگاہ کر دیا جائے۔ لو کسوم میں وہ کہے دیتا ہوں جس کے کہنے کی اب تک نہ تاب تھی نہ ہمت۔ سنو! اُس روز کی باتوں سے مجھے یہ معلوم کرکے ایک خفقان سا ہونے لگا کہ تم میری بیوی نہیں ہو۔ میری اور تمہاری دونوں کی کشتی غالباً طوفان سے اُلٹ گئی تھی۔ اور چونکہ نہ میں نے اپنی بیوی کی شکل دیکھی تھی اور نہ تم نے اپنے شوہر کی۔ ہلوگوں کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی ہیں۔ لیکن تم نے جو واقعات بتلائے اُنہوں نے مجھے سراسیمہ کر دیا غالباً میری کشتی سے میری بیاہی ہوئی بیوی اور تمہاری کشتی سے تمہارے شوہر دونوں مع تمام لوگوں کے غرق ہو گئے۔ ان واقعات کو معلوم کرکے تم کو مجھ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ مجھے اپنا ہر حال میں ہمدرد سمجھو۔ میں تم کو دنیا میں بے یار و مددگار

نہیں چھوڑ سکتا۔ میں خود تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب کیا ہو؟

تمہارا مخلص
راج کشور

خط لکھنے کو تو لکھ گیا لیکن راج کشور کسوم کی طبیعت سے خوب واقف تھا وہ جانتا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتے ہی سر پر خاک ڈال کر کہیں نکل جائے گی۔ اور دوبارہ صورت دکھانا اسکی غیرت ہرگز گوارا نہ کرے گی۔ راج کشور کنول کی رعنائیوں میں کچھ اس طرح پھنسا ہوا تھا۔ کہ اس کو شاید اس کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن کنول کی علالت اگر خوفناک نہیں تو کم از کم اندیشہ کی حالت تک تو پہنچ ہی گئی تھی۔ یہ سوچ کر وہ کانپ اٹھتا تھا کہ اگر کنول جانبر نہ ہو سکی تو پھر کیا ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ وہ اپنے تمام جسم میں ایک ہلاک کن کپکپی محسوس کرنے لگتا۔ اور تمام دنیا اس کو تاریک نظر آتی۔ ہاں اس حالت میں کسوم کے خیال سے اسے تسکین نہیں تو کم از کم ایک خفیف سی گرمی تو آہی جاتی تھی۔

کسوم پھر بھی وہی کسوم تھی۔ جسکی ایک ایک ادا پر راج کشور قربان ہوا کرتا تھا۔ جب وہ پھولوں کا ہار بنا کر اسے پہناتی اور محبت سے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیتی تو اسے یہ معلوم ہوا کرتا تھا کہ مقصد حیات کی انتہا یہی ہے۔ اس کی معصوم نگاہیں۔ اسکی جان بخش ادائیں۔ اس کی معصوم مسکراہٹ۔ یہ ایسی باتیں نہ تھیں کہ ایک انسان کی حیات کو متاثر نہ کر دیتیں اور واقعہ یہ ہے کہ کسوم اور کنول میں وہی فرق تھا جو چاند کی روح افزا خنکی اور آفتاب کی گرم کرنوں میں ہوتا ہے۔

ان خیالات میں کھویا ہوا راج کشور معلوم نہیں کب تک سرمارا کرتا کہ ملازم نے آکر کہا کہ کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ راج کشور گھبرا کر اٹھا۔ اس نے یہ طے کر لیا کہ فی الحال کسوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور واقعہ سے وہ بدستور بے خبر رہے۔ اس خیال سے اس نے اس خط کو مروڑ کر دیوار کی ایک دراز میں ڈال دیا۔ اور ایک ہفتہ بھر رہ کر کلکتہ واپس چلا گیا۔

بکسر جاتے وقت راج کشور نے برج نرائن سے یہ کہلا دیا تھا کہ ایک سخت ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں دو روز کی معذرت چاہتا ہوں اور کنول یہ سن کر سر و پڑ گئی تھی۔ راج کشور کی وجہ سے اس کو اپنی علالت کا بہت کم احساس ہوتا تھا۔ اور اب یہ معلوم کر کے کہ دو روز تک راج کشور نہیں آئے گا۔ اس کو خفقان سا ہونے لگا۔ وہ رات بھر شدید درد میں پڑی رہی۔ برج نرائن کی یہ حالت تھی کہ رات میں کئی بار دوڑ دوڑ پڑے۔ صبح کچھ حالت سنبھلی۔ کنول کی بیماری کی خبر سن کر اسکی پرانی ہیڈ مسٹرس اسکو دیکھنے آئیں۔ کچھ دیر تک تاسف کرتی رہیں۔ پھر باتوں باتوں میں بولیں: "کنول مجھے تو تمہاری علالت کی خبر صرف کل شام کو معلوم ہوئی۔ ابھی چند روز ہوئے کہ میں بابو راج کشور کے یہاں جا رہی تھی۔ تمہارے ہی مکان کے سامنے سے گذری۔ لیکن کیا معلوم تھا، خیال ہوا کہ رک کر ملاقات ہی کر لوں لیکن کام جلدی کا تھا۔ علاوہ اسکے راج کشور کی بی بی بھی میرے ساتھ تھیں۔" کنول چونک گئی۔ گھبرا کر پوچھا: "آپ کس راج کشور کا ذکر کر رہی ہیں؟" انھوں

نے کہا: "وہی راج کشور بابو وکیل جو یہاں سے تھوڑی دور رہتے ہیں۔ یہیں ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کی بی بی جیجر اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ تعطیل میں اس کو بورڈنگ ہی میں رکھیں۔ لیکن لڑکی اس بُری طرح پریشان ہوئی کہ مجبوراً اسکو راج کشور بابو کے پاس پہنچا آئی۔" کنول کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اُس کے سینہ پر زور سے گھونسہ مار دیا ہو۔ اُس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ٹھوکر دے رہی تھی۔ پھر اُس پر اتنی سخت چوٹ۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ ہیڈ مسٹرس گھبرا گئیں۔ برج نرائن کو تو گویا وہ بیچارے یوں ہی بدحواس تھے۔ کنول کی یہ حالت دیکھکر اور بھی ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ہیڈ مسٹرس نے کہا: "میرے ایک ملاقاتی ڈاکٹر شیام نرائن ہیں، جنھوں نے یہیں سے ڈاکٹری پاس کی ہے۔ اور کچھ دنوں سے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ آج کل یہاں بغرض تفریح آئے ہوئے ہیں۔ نہایت ہوشیار آدمی ہیں اور اخلاق نہایت اچھا ہے۔ میں ان کو بلا لاؤں۔ کنول کا علاج وہی کریں گے۔ آپ کو بہت جلد فائدہ محسوس ہوگا۔"

برج نرائن بابو نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "میرے تو حواس بجا نہیں ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیے کیجئے۔"

ہیڈ مسٹرس گھنٹہ بھر کے بعد ڈاکٹر شیام نرائن کو لیکے آئیں۔ شیام نرائن صاحب ابھی نوجوان آدمی تھے۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور چوڑی پیشانی سے انکی فطری سنجیدگی اور شرافت کا پتہ چلتا تھا۔

کنول ابتک بیہوش تھی۔ شیام نرائن کی گھنٹہ بھر کی کوششوں کے بعد کنول نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اس کی وحشت کی وہی حالت رہی۔ بارہا اس کو یہ خیال آیا کہ اس نے ایک پریشان خواب دیکھا ہے۔ لیکن واقعات کو دیکھکر وہ پھر مایوس ہو جاتی۔ اس کے جذبات میں سخت تلاطم تھا۔ راج کشور کا اس کو اتنے دنوں مغالطہ میں رکھنا ایسا امر تھا کہ اُس کی غیور طبیعت اس کو برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ رہ رہکر وہ غصہ اور رنج سے کانپ اُٹھتی۔ اسی اُدھیڑبن میں اُس پر پھر ایک نیمخوابی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

شیام نرائن نے کہا مرض سخت ہے۔ اور شدید گرمی کی وجہ سے کلکتہ میں رہکر علاج مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ دو روز کے بعد جب کنول کی حالت کچھ سنبھلی تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ دنوں کے لئے سب لوگ نینی تال چلے جائیں۔ راج کشور کا خیال کنول کو بار بار ستا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ راج کشور نے اس کی امیدوں کو اسطرح برباد کیا وہ غصہ اور انتقام کی آگ سے بھڑکنے لگتی۔ برج نرائن کو بھی ہیڈ مسٹرس کی زبانی یہ واقعہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ راج کشور نے اس کا حال کیوں اُن سے اتنے دنوں پوشیدہ رکھا۔ شیام نرائن کی ہمدردی، اس کی دلکش جوانی اور قابلیت نے بہت جلد کنول کی آنکھوں میں اسکو ایک امتیازی حیثیت دیدی۔ کنول کی بیمار لیکن فاتحانہ آنکھوں سے متاثر نہ ہوتا کیا معنی۔ چنانچہ برج نرائن بابو کے اصرار سے وہ بھی نینی تال چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

راج کشور نے معلوم نہیں کسطرح ایک ہفتہ بکسر میں گذارا۔ خدا خدا کر کے کلکتہ واپس آیا۔ اور اس خوف کیساتھ

جو ضمیر کی ملامت کی وجہ سے آدمی میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا ڈرتا برج نرائن کے یہاں پہنچا۔ لیکن مکان کو مقفل پاکے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سو سو وسوسے دل میں آئے اور گذر گئے۔ پڑوس میں برج نرائن بابو کے ایک ملاقاتی رہتے تھے۔ راج کشور انکے پاس انتہائی سراسیمگی کی حالت میں پہنچا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک نوجوان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا تھا۔ ان کی رائے سے وہ لوگ نینی تال گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کے ساتھ گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی۔ نوجوان ڈاکٹر کا علاج شروع ہوتے ہی نینی تال جانا اور پھر ان کا بھی ساتھ جانا۔ راج کشور کو سینکڑوں وسوسے ہوئے پوچھا آپ ان ڈاکٹر صاحب کو جانتے ہیں؟ کیسے آدمی ہیں۔ شادی شدہ ہیں یا نہیں۔

"جی ہاں یہ ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کو ایک زمانہ سے جانتا ہوں۔ اُنھوں نے ڈاکٹری کلکتہ ہی سے پاس کی ہے بنارس میں پریکٹس کرتے ہیں۔ عمر قریب چھبیس سال کی ہوگی۔ ان کی شادی کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ ازدواجی زندگی کے قائل ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مرضی سے ایک غریب لڑکی سے شادی کی تھی۔ مگر شادی کے بعد ہی لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وہ شادی کے نام سے گھبراتے ہیں"

ان جوابات سے راج کشور کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی پریشان و مایوس گھر آیا۔ ملازم نے کہا۔ برج نرائن بابو کا ملازم روز آتا تھا۔ آخری روز یہ خط دے گیا ہے۔ اور کہا کہ اس کو صرف راج کشور بابو ہی کو دینا۔ راج کشور نے خط اسطرح لیا کہ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ لفافہ پر کنول کی نازک انگلیوں سے لکھا تھا۔ بابو راج کشور۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کانپتے ہوئے اُس نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔

ڈیئر راج کشور بابو۔ تسلیم

اپنی پرانی ہیڈ مسٹریس سے مجھے دلچسپ اور عجیب باتیں معلوم ہوئیں۔ اسکی کیا شکایت کہ آپ نے نہیں معلوم کن ارادوں سے میرے سچے جذبات کو آلۂ تفریح بنانا پسند کیا۔ ہاں اس کی شکایت ضرور ہے کہ آپ ایسے وقت ہم لوگوں سے یکایک علیحدہ ہو گئے جب پتاجی کو میری بیماری کی وجہ سے آپ کی سخت ضرورت تھی۔ ہم لوگ تبدیل آب و ہوا اور علاج کی غرض سے نینی تال جا رہے ہیں۔ اگر میں سخت جان زندہ رہی تو دو ماہ کے بعد واپسی ہوگی۔ اسوقت امید ہے کہ نیاز حاصل ہو۔

آپ کی مخلص

کنول

خط کو پڑھ کر جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ قابل عبرت تھی۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ کسم کے دل دکھانے کا بدلا اس کو ملنا شروع ہو گیا ہے، اس کا دل پھنکا جا رہا تھا، جیسے کسی بہت پیاسے آدمی کے منھ تک پانی لا کر علیحدہ کر لیا جائے اور وہ پیاس کی تکلیف سے لوٹنے لگے۔ راج کشور کو اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ دُنیا اس کے لئے تاریک ہو گئی اور اُس کو ایک ایک لمحہ کٹنا دشوار ہو گیا۔ دنیا کی تمام نظر فریبیاں اسے بے معنی نظر آنے لگیں، اور وہ ایک نیم غشی کی حالت

میں پلنگ پر پڑ گیا۔

کسوم کبسر میں زندگی سے بیزار ایک جانکاہ استقلال کے ساتھ زندگی کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ نول کشور کی بی بی نے اس کے دل لبھانے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اس کا کلیجہ اندر ہی اندر پھنکا جا رہا ہے۔ کسوم دن بھر اکیلے کمرہ میں پڑی رہتی۔ اصرار کرنے سے دو چار نوالے کھا لیتی۔ وہ دن بدن زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گلاب سے رخسار زعفرانی ہو گئے تھے۔ آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتیں۔ رات بھر اس کو نیند نہ آتی۔ اکثر پلنگ سے اٹھ کر وہ گھنٹوں ٹہلا کرتی۔ اور جب ضبط نہ ہو سکتا تو رو پڑتی۔ اسکو اپنا کوئی بھی دنیا بھر میں نہ نظر آتا تھا۔ اکثر تاروں بھری رات میں آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی: "اے پرماتما کیا میں یوں ہی ہمیشہ کے کڑھنے کیلئے پیدا کی گئی ہوں۔ جب سے دنیا میں آئی۔ مصیبت جھیلا کی۔ ان کا ساتھ ہوا۔ چار دن چین سے گزرے۔ خیال ہوا اب دن بھلے آئے ہیں۔ لیکن وہ تو میں پیدا کی گئی ہوں مصیبت جھیلنے کے لئے۔ پھر جب حالت یہی ہے۔ تو آخر مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ ہزاروں شخص جو جینے کے آرزومند ہیں۔ جنکی ذات سے سینکڑوں امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ تو اس آسانی سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میری دن رات کی یہ دعا کیوں قبول نہیں ہوتی۔ میں دنیا کے لئے ایک بار ہوں فضول۔ میری موت پر کوئی رونے پیٹنے والا نہیں۔ میری ذات سے کسی کو ذرہ بھر کا فائدہ نہیں۔ پھر آخر میرے زندہ رکھنے میں قدرت کو کیا دلچسپی ہے۔ قدرت کو بھی میری کلفتوں میں مزہ آتا ہے۔ کیا اس سفاک کھیل کے لئے ایک میری ہی نامراد جان تھی۔ پرماتما کسی طرح اس جانکنی سے نجات دے۔ آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ لیکن تو نے کبھی میری آہوں کی شنوائی نہ کی۔ میری تلخ کامیاں آزمائش کی حد سے کب کی گزر چکی ہیں مجھے اس بے رحم دنیا سے رہائی عطا کر۔"

ایک روز شام کے وقت وہ حسب معمول اداس بیٹھی تھی کہ دیوار کی درز میں ایک کاغذ لپٹا ہوا ملا۔ یہ وہی خط تھا جو راج کشور نے کسوم کو دینے کے لئے لکھا تھا اور پھر کچھ سوچ کر ڈال دیا تھا۔ کسوم نے جب اسے کھولا تو سخت تعجب ہوا کہ خط اسی کے نام کا ہے اور تحریر راج کشور کی۔ پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے اس طرح تڑپ اٹھی جیسے جلتا ہوا یا کسی سکھ پر نمک چھڑک دیا جائے اور وہ تڑپ اٹھے۔ خط پڑھکر کچھ دیر کے لئے تو وہ دیوانی سی ہو گئی۔ کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی اٹھکر بھاگتی۔ خیر سے اسوقت کوئی اس کے پاس نہ تھا۔ خط کو پھر پڑھا۔ ایک ایک جملہ اسکے دل پر زہر کے بجھے ہوئے نشتر چبھو رہا تھا۔ اس کو اپنی ذات سے شرم آنے لگی۔ رہ رہ کر اسکے کلیجہ میں ایک ٹیس اٹھتی اور وہ بلبلا اٹھتی۔ آخر کار اپنی بے کسی اور مجبوری پر منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ معلوم نہیں کبتک وہ اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہاتی اگر ملازمہ اس کا کھانا رکھنے نہ آتی۔ کسوم نے گھبرا کر آنسو پونچھے۔ اور اخفائے راز کے لئے کسی طرح کچھ نوالے حلق سے نیچے اتارے۔ اسے یہ خوف تھا کہ اگر کھانا نہ کھائے گی تو نول کشور کی بی بی آکر اصرار کرینگی۔ اور ممکن ہے ان کے سامنے وہ ضبط نہ کر سکے۔ ماما کے برتن لیجانے کے بعد وہ کچھ دیر تک غور کرتی رہی

اور پھر آہستہ آہستہ یوں بولی کہ "پتاجی میں اگر اب بھی زندہ رہوں تو بے حیائی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اب تک میں اپنے کو صرف بدقسمت ہی سمجھتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں ناپاک بھی ہوں۔ میری بے شرم اور بدنصیب ذات سے دنیا جتنی جلد خالی ہو اچھا ہے۔" اتنے میں گھڑیال نے بارہ بجائے۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ اور اسطرح جیسے سب کچھ پہلے سے سوچ چکی تھی۔ کاغذ کے دو ٹکڑوں پر چند سطریں لکھیں اور دبے پاؤں جاکر اسکو نول کشور صاحب کی بی بی کے سرہانے رکھ آئی۔ اس کے بعد اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ چاروں طرف ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر چپکے سے دروازہ کھولا۔ اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف چل دی۔ کسوم کے طرز عمل میں بجائے بے چینی یا کلفت کے اب سکون اور استقلال کے آثار تھے۔ وہ کوئی مستقل ارادہ کر چکی تھی جس کے اثر سے وہ اب ان عارضی تکالیف سے بے خبر ہو چلی تھی۔ اسے دور سے ریل کا رنگین سنگل نظر آیا۔ اور وہ رات کے سناٹے میں اس عمیق قرمزی رنگ کو دیر تک دیکھتی رہی۔ وہ ایک طرف بے اختیار بڑھی۔ وہاں پہونچ کر معلوم نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اسٹیشن کی طرف بڑھی۔ پلیٹ فارم پر کچھ آدمی گاڑی کے انتظار میں اونگھ رہے تھے۔ وہ ایک کنارے بیٹھ کر اپنے تاریک ماحول پر غور کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی سنسناتی ہوئی چلی آئی۔ مسافر چڑھنے اُترنے لگے کسوم بھی ایک غیر ارادی طور سے اُٹھی اور ایک خالی ڈبہ میں بیٹھ گئی۔ سیٹی ہوئی اور گاڑی ٹکبسر اسٹیشن سے آہستہ آہستہ چل دی۔ چاندنی رات تھی۔ چھٹکے ہوئے تارے جھلملا جھلملا کر ایک مبہم اشارے سے کسوم کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔ رات کی فطری تاریکی میں بھی ہمدردی اور آشنائی کی جھلک نظر آرہی تھی۔ کسوم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے اور قدرت کے درمیان کے تمام حجابات ایکبارگی اُٹھ گئے ہیں۔ اور اس نہ طے ہونیوالی راہ کی منزلیں اُس نے سر کر لی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اُسکو یہ معلوم ہونے لگا کہ اسکی روح اس وقت کے مناظر قدرت میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ خود اوپر سے تاروں کے ساتھ دنیا والوں پر ایک حقارت کی نگاہ ڈال رہی ہے۔ تخیلات کی اس مسرور کن جولانگاہ میں وہ معلوم نہیں کبتک محو رہتی۔ کہ گاڑی مغل سرائے اسٹیشن پر رُکی۔ اور قلیوں نے پکارنا شروع کیا۔ کاشی کے جانے والے۔ کاشی کے جانیوالے۔ یہاں اتر پڑیں۔ کاشی کے متبرک نام پر کسوم چونک پڑی۔ اسے خیال ہوا کہ زندگی کا آخری دور ختم کرنیکے لئے کاشی گھاٹ سے بہتر کون مقام ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے وہ گاڑی سے اُتری اور ایک قلی سے کاشی جانیوالی گاڑی کو پوچھکر اسمیں جا بیٹھی۔ اس کے ہر انداز میں ایک اطمینان اور استغنا تھا۔ شاید وہ ایک تہورانہ جذبہ میں رنج و غم کے حدود سے گزر چکی تھی۔

کاشی پہونچکر کسوم سیدھے اُس متبرک دریا کے کنارے پہنچی جس نے بنارس کو ہندوستان کے شہروں میں ایک امتیازی حیثیت دیدی ہے۔

(باقی)

عبدالسلام فاروقی۔ بی۔ اے

خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

یادش بخیر، خواجہ آتش کی عظمت میرے دل میں ایک عرصہ سے ہے اور ساتھ ہی اسکی خواہش بھی کہ اگر علاوہ ان متداول تذکروں کے کہیں سے انکے صحیح و مفصل حالات مل سکیں تو ان کو ترتیب دیکر پیش کروں۔ کیونکہ ایک تو آتش اور ناسخ کے زمانہ کے حالات زیادہ تر پردۂ خفا میں ہیں۔ چنانچہ ناسخ کے والد، خاندان کا حال، ناسخ اور آتش کی پیدائش کا زمانہ، یہ اور ایسی ہی اکثر باتیں آج تک صحیح صحیح لوگوں کو نہ معلوم ہو سکیں۔ دوسرے عام تذکروں میں جو حالات خواجہ صاحب کے ملتے ہیں چونکہ ان کا ماخذ بیشتر بلکہ تمامتر۔ محمد حسین آزاد کا تذکرۂ "آب حیات" ہے، اس لئے بجائے تسکین بخشنے کے اور زیادہ بے اطمینانی دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خواجہ موصوف کے حالات کا ایک ایسا متضاد مجموعہ سامنے آتا ہے جس پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گل رعنا اور آب بقا ضرور ظلماتِ ادبیات میں خضر راہ بنتے ہیں مگر پھر افسوس ہے کہ اُن کے مصنفوں کو ذرا پہلے کا زمانہ نہیں مل سکا اور مؤخر الذکر مبسوط نہیں!

میں نے اس تلاش میں مختلف تذکرے[۵۱] پڑھے بہت سی کتابیں دیکھیں اور بہت کچھ سرگردانی کے بعد ایک گونہ تسلی حاصل کر چکا تھا کہ مرزا جعفر علی خاں اثر کا مضمون بہ عنوان "خواجہ آتش" رسالہ زمانہ کی اکتوبر اور نومبر ۲۹ء کی اشاعتوں میں نکلا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ چلو مجھ سے زیادہ اہل شخص نے جو روشن خیال۔ سخن سنج اور تنقید کا علمبردار بھی ہے۔ جب اس مبحث پر قلم اُٹھایا ہے تو یقیناً تنگ نظری، جنبہ داری، تعارضِ حالات اور نادرستی روایات کو دور کر کے ایک عمدہ اور قابل ایراد و اضافہ چیز منظرِ عام پر لائے گا۔ میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں نے نہایت پُرشوق ہاتھوں سے اُسے لیا اور بیتاب نگاہوں سے پڑھا۔ لیکن پڑھنے کے بعد توقعات غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ اُن کی حیثیت صرف ایک جامعِ ناقل کی ہے۔ ناقد بلند

---

۵۱ جن میں ایک تذکرۂ "خازن الشعرا" قلمی قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے اور زبان فارسی میں اجملی خاندان کے اردو اور فارسی شعرا کا تذکرہ ہے اسکے مصنف مولانا شاہ سید علی کبیر عرف میر جان تھے۔ میں نے اسکا اصل نسخہ بخط مصنف، حکیم سید شاہ نذیر احمد صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ یہ ایک فاضل شخص ہیں۔ جو مصنف تذکرہ کے نواسے ہیں۔ اور موجودہ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد کے والد ہیں۔ اگرچہ اس کتاب سے مجھے اس سے زیادہ مدد نہ مل سکی کہ مصنف تذکرہ کے چھوٹے بھائی سید محمد کبیر صاحب رضا اجملی قدری تخلص بھی خواجہ آتش کے شاگرد تھے لیکن اسکی زیارت بھی ہونا اتفاق [illegible] ہم کو نہیں [illegible] شاہ صاحب اسکی [illegible] بے نیاز۔ اسکا ذکر صاحب گل رعنا نے بھی ایک جگہ کیا ہے

اور صاحبِ بصیرت مورخ کی حیثیت وہ نہیں رکھتے۔ وہ آزاد کی ذہنیت اور مشن کی تائید اور تقلید تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی تنقید کا حوصلہ اور تردید کی ہمت نہیں کر سکتے۔

نادرستیٔ بیان صاحبِ آبِ حیات "یا نمی والنست یا دانستہ اخفا کردہ است"

چونکہ میرے نتیجۂ تلاش و تحقیق سے مرزا صاحب کا مضمون یا نظریہ جُداگانہ ہی نہیں بلکہ مخالف تھا۔ اس لئے اس مضمون میں کہیں کہیں اسکا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عنوان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ میں بھی ان کی سوانح عمری لکھ دیتا۔ لیکن یہ تطویلِ محض ہو گی۔ اور اسلئے تحصیلِ حاصل۔ قدرِ مشترک اور عام مسلّم حالات کو چھوڑ کر کہ وہ آبحیات۔ گلِ رعنا۔ آبِ بقا میں درج ہیں۔ چند نئے حالات و نتائج جو میری تلاش و تحقیق میں آئے اُن کے حوالہ قلم کرتا ہوں

سنہ ولادت گلشنِ بیخار۔ گلِ رعنا۔ آبحیات۔ خمخانہ جاوید اور سخن شعرا اس باب میں ساکت ہیں۔ آبِ بقا (مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی) میں صفحہ (۹) پر درج ہے۔" اسی اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند آصف الدولہ کی شادی کی۔ ...... یہ واقعہ سنہ ۱۷۶۸ء کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش[۱] کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔

اگرچہ اثر صاحب نے خواجہ صاحب کے حالات میں اور خصوصًا زمانۂ ولادتِ خواجہ کا تعین و اندازہ کرنے میں "آبِ بقا" ہی سے استفادہ کیا ہے مگر خدا جانے کیسے بلا دلیل سنہ ولادت "تقریبًا سنہ ۱۷۷۴ء" لکھا ہے"۔ لیکن آبِ بقا کی روایت، بعض حالات کے ملانے سے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) آبِ بقا میں صفحہ ۱۳ پر ہے:۔ "جب میر تقی میر کا انتقال کا ہوا (سنہ ۱۲۲۵ھ میں) تو آتش اکتالیس برس کے تھے"۔ گویا سنہ ولادت سنہ ۱۱۸۴ھ ہے۔

(۲) آبِ بقا صفحہ (۹) پر ہے:۔ "آتش اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی نامکمل تھی کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شورہ پشت ہو گئے۔ ...... اس جوہر کے قدردان، فیض آباد میں نواب میر محمد تقی ترقی تھے۔ جو آتش کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے۔ انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے"۔ (صفحہ ۲۵۹ پر گلِ رعنا میں بھی تقریبًا یہی ہے سوا ناسخ کی ہمراہی کے)

(۳) آبِ بقا صفحہ ۱۴ پر ہے:۔ "آتش نے ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مار کر رونے لگے"۔ ... کہنے لگے:۔ "میاں ..... ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدت تک ہم نوالہ ہم پیالہ رہے"۔

(۴) ناسخ کا لکھنؤ آنا سنہ ۱۱۹۱ھ میں ثابت ہوتا ہے نواب میر محمد تقی ترقی کے ہمراہ۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ یہ پہلے پہل کا آنا تھا، کیونکہ لکھنؤ سے ناسخ کا واپس فیض آباد جانا اور دوبارہ لکھنؤ آنا کہیں سے معلوم نہیں ہوتا۔ اچھا اور ناسخ لکھنؤ آئے اُسوقت جب بقول آزاد لکھنؤ "دار الخلافہ" ہوا یا بقول خواجہ عشرت، جب آصف الدولہ نے سنہ ۱۱۸۸ھ لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا

[۱] قاموس المشاہیر میں خواجہ آتش کے والد کا نام خواجہ علی محسن چھپا ہے۔ سراج

اس کے دو چار سال کے بعد۔ (آب بقا صفحہ ۱۲)

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش بھی ناسخ کے ساتھ پہلے فیض آباد میں مدتوں ایک نواب کے نوکر رہے پھر ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ اب یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ آتش ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوں اور ۱۱۹۱ھ میں سات ہی برس کے سن میں بانکوں میں نوکر بھی ہو گئے ہوں اور لکھنؤ آئے ہوں۔ حالانکہ آتش کے حالات میں تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ "باپ کے مرنے کے وقت اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم نامکمل تھی"۔ ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی موت کے وقت انکی عمر (کم سے کم) گیارہ بارہ برس کی رہی ہوگی اور میر تقی کی نوکری اور لکھنؤ آنیکے وقت انکی عمر (کم سے کم) پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ پھر اگر ۱۱۹۱ھ اُن کا آنا ناسخ کے ہمراہ صحیح مانا جائے تو سوا اسکے چارہ ہی کیا ہے کہ ان کی عمر "اسی یا اسی" برس سے (جیسا آب بقا میں ہے) کچھ زیادہ مانا جائے اور سنہ ولادت کو ۱۱۸۴ھ سے کچھ پہلے کیونکہ غالباً سنہ وفات متفق علیہ ہے یعنی ۱۲۶۳ھ

یہیں ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آتش کی عمر، میر تقی میر کی وفات کے وقت اکتالیس برس کی یا کچھ زیادہ تھی تو میر صاحب نے اپنے نکات الشعرا میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر صاحب نے یہ کتاب اپنے شباب کے زمانہ میں دلی میں لکھی تھی اور خواجہ صاحب کی شہرت بعد میں ہوئی۔

آتش اور دلی

آزاد نے خواجہ کے نام کے ساتھ فیض آباد تک کا نام تو لکھا نہیں، دلی تو پھر بھی دور رہی۔ لکھتے ہیں:- "باپ دلی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جاکر سکونت اختیار کی"۔ اب اس مجمل جملہ سے خواہ یہ سمجھ لیجئے کہ باپ ہی نے دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی (اور یہ صریحاً غلط ہے) خواہ یہ نتیجہ نکال لیجئے کہ خواجہ آتش لکھنؤ میں جاکر رہ پڑے (فیض آباد کا ذکر ندارد) آب بقا اور گل رعنا میں ہے کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور مرزا تقی کے ساتھ لکھنؤ گئے"۔ لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آتش بھی کبھی دلی گئے تھے یا نہیں۔

ہمکو کلیاتِ آتش - ردیف نون میں ایک غزل ملتی ہے۔ "اُلجھا ہے دل بتوں کے گیسوئے پرشکن میں" الخ ان اشعار کو پڑھیئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچپن کی مشق اور ابتدائی کلام ہے۔ ذیل کے اشعار کسی کہنہ مشق اور ذی رتبہ شاعر کے منہ پہ نہیں کھلتے۔

سنبل سے بال اُس نے جس روز سو سُنڈالے	کنگھی دوا کی خاطر ملنے لگی جپن میں
عطر گلاب مل کر حلقہ میں یار بیٹھا	بلبل پکڑنے آیا صبا و انجمن میں
تُرکِ فلک ہی ہے نہاں۔ ظاہر ہے ترک اپنا	عاقل جو ہو وہ کر لے تمیز مرد و زن میں
اُسکو دکھا کے تونے اُس پر جو تیر جوڑا	پھر دس رہی لڑائی شیر اور گرگدن میں۔ وغیرہ

اسی غزل میں ایک شعر ہے:-

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہمارے	نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نور تن میں

غور کیجئے دہلی کی تخصیص "ہمارے" کے لفظ کے ساتھ کیا بتاتی ہے اور "اپنے اکبر" کا لہجہ کس امر پر روشنی ڈالتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آتش اکبر شاہ ثانی[۱] بادشاہ دہلی اور خود شہر دہلی کی تعریف میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر دہلی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم ہیچ ہے۔ اور ہمارے بادشاہ اکبر ثانی کے دربار میں نو آسمان مصاحب ہیں جو نورتن اکبری کا جواب ہیں۔ صاف طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آتش دلی میں پیدا ہوئے اور وہاں کچھ مدت تک رہے۔ کیونکہ یہ میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ آتش مرحوم کے حالات کچھ صاف صاف نہیں ملتے۔ لیکن اتنا تو اس شعر سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش چاہے فیض آباد میں پیدا ہوئے ہوں مگر وہ دلی بھی گئے اور رہے ہیں۔ اور آبائی وطن کو خود بھی دیکھ کر یہ غزل وہاں کہی ہے اور گو وہ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے مگر ایک شاعر بلند سے قبل بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے فیض آباد یا لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ غزل کہی ہو۔ لیکن میرے خیال میں اگر آتش دلی نہ گئے ہوتے تو "اپنے اکبر" اور "ہماری دلی" جیسے تحتی لہجہ میں تعریف نہ کرتے آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ مجھے اعتراف ہے کہ یہ میرا ایک احتمال و قیاس ہے جس کی تائید شاید آئندہ کسی انکشاف و تحقیق میں ہو سکے۔ اسوقت اپنی تائید میں دو باتیں کہہ سکتا ہوں :-

(۱) گل رعنا صفحہ ۳۶۲ و ۳۶۴ پر ہے : "آتش کی غزلوں میں دلی کے ٹھیٹ الفاظ مثلاً اکھڑیاں۔ زور۔ بل بے۔ میرے شامل۔ ہماریاں وغیرہ زیادہ ملتے ہیں عجب نہیں یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو۔"

(۲) آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کے اکثر اشعار ضائع ہو گئے۔ ممکن ہے ضائع شدہ غزلوں میں اور باتیں بھی دلی کی بابت رہی ہوں۔

اُستادی نزاع

آزاد نے اس بحث کو بہت آب و رنگ دیکر لکھا ہے۔ اس سے بظاہر اُسکی دو غرضیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) آتش کو چونکہ آزاد شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسلئے اُسے ایک سُنی اُستاد مصحفی سے لڑا دینا چاہا اور باور کیجئے کہ اگر ان کو اس قسم کی کوئی اور بات مل جاتی تو وہ انشا اور مصحفی کا سا معرکہ آتش اور مصحفی کے درمیان پیدا کر دیتے۔

(۲) آزاد، جو وطناً دہلوی اور مذہباً لکھنوی تھے۔ جہاں لکھنؤ پرستی میں لکھنؤ کو "دارالخلافہ" جیسے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ وہ اس فکر میں بھی ہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دلی کی زبان کی تقلید سے آزاد کر دکھائیں۔ اور اس خیال میں جان اُسوقت تک نہیں پڑ سکتی تھی۔ جبتک آتش و ناسخ کو (جن سے لکھنوی زبان کی عمارت قائم سمجھی جاتی ہے) کس طرح مصحفی سے الگ نہ کر لیا جائے۔ ناسخ کو تو اُس نے صاف الگ کر دکھایا پھر آتش تو اُن کے لئے اُس نے ذیل کا قصہ تصنیف کیا۔

آزاد کے الفاظ یہ ہیں :- (آبحیات تذکرہ آتش صفحہ ۳۸۰)

"کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا جو شاگردانِ الٰہی ہیں۔ ہمیشہ اپنے اُستادوں کے ساتھ انکی بگڑتی ہی چلی آئی۔

---

[۱] ابو نصر معین الدین اکبر شاہ ثانی شعاع تخلص ابن شاہ عالم ۱۱۷۳ھ میں پیدا ہوئے ۱۸۰۶ء میں بادشاہ بنے اور ۳۱ سال سلطنت کر کے ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گئے (قاموس المشاہیر)

چنانچہ اُن کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُن میں حق کس کی طرف تھا۔ آج اصل حقیقت ... کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے۔ مگر جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اُسکی حکایت یہ سُنی گئی کہ ......"

اس کے بعد وہی بگڑا، کفن بگڑا کے مشاعرہ کا قصہ لکھا ہے کہ آتش نے اپنے اشعار اُستادوں کو سُنا کر کچھ تعلّی کی مصحفی نے انکے شعروں کے جواب میں دو شعر کہہ کر ایک لڑکے سے پڑھوا دئے۔ جب مشاعرہ میں ان اشعار کی داد ملی تو آتش کو شبہ ہوا اور اُستاد سے بگڑ کر کہا کہ "یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منھ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکالتا۔ مگر مصحفی کے یہ اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے (ہمنے آزاد کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ طول ہو جاتا اسکا خلاصہ لکھدیا)

خواجہ آتش کی سپاہیانہ وضع اور اُس پر آزاد کی رنگین اور دلفریب طرزِ تحریر۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہرگز قابلِ حیرت نہیں کہ یہ روایت شہرت پا گئی اور بعد میں مقلدین تذکرہ نویسوں نے (الا ما شاء اللہ) اسکو اپنے یہاں نقل و درج بھی کر دیا۔ لیکن عقل دور رس اس پر حسب ذیل تنقیحیں قائم کرتی ہے:-

(۱) ہمارے سامنے گل رعنا موجود ہے وہ اس خصوص میں ساکت ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو صاحب گلِ رعنا جنھوں نے آتش کی موت کا حال بالکل آزاد ہی کے الفاظ میں لکھدیا ہے۔ ضرور اسکو اپنی کتاب میں لکھتے۔

(۲) شعر الہند میں بھی یہ روایت نہیں ہے۔

(۳) تذکرہ آب بقا میں آتش کے حالات، آب حیات سے بہت زائد لکھے ہیں۔ وہ اس مشاعرہ کا ذکر بایں الفاظ کرتے ہیں (صفحہ ۱۶) "تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں ......

خواجہ سرا کے ہاں مشاعرہ ہوا، جلن بگڑا، کفن بگڑا، اس میں بھی پالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ کی غزل کمزور رہی۔"

خواجہ عشرت، لکھنوی ہیں اور رشاد بیرو میر کے شاگرد۔ اُردو زبان کی خدمت، تاریخ نویسی، لغت نویسی، قواعد نویسی سے ایک مدت سے کرتے چلے آتے ہیں۔ اور اگرچہ اُنھوں نے ناسخ و آتش کا زمانہ نہیں پایا مگر پرانوں کی آنکھیں دیکھیں اور قصّے سُنے ہیں ——— خود تلاش و تحقیق اور تفتیش و جستجو کا مادّہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کو لکھنؤ کے حالات کا (گو وہ ماضی ہی کیوں نہ ہوں) بمقابلہ آزاد کے (جو غالباً لاہور میں آب حیات لکھنے بیٹھے تھے۔) زیادہ اور صحیح تر معلوم ہونیکے موقعے حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بہ لحاظ مقدار و مواد اور کیا بلحاظ اعتبار و استناد اُنکے ہاں خواجہ آتش کے زیادہ حالات ہیں۔ وہ اس خاص مشاعرہ کا موقعہ اور محل تک بتا رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو لکھنؤ جیسے مقام پر خواجہ عشرت جیسے جوئندہ کو اس روایت کا ملنا ناممکن نہ ہونا چاہئے۔ اچھا روایت نہ ملنے کو بھی جانے دیجئے۔ خواجہ عشرت نے آبحیات کے بعد اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ وہ بھی مثل دیگر تذکرہ نویسوں کے اس کو اپنے یہاں نقل کرسکتے تھے مگر نہیں نقل کرتے۔ آخر کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے اس روایت میں اصلیت کا شائبہ نہیں پایا، اس لئے اسے اعتبار و استناد کے پایہ سے ساقط سمجھا۔ پھر ذرا غور تو کیجئے (نہاں کے مانند آں رازے کزو سازند محفلہا) بھری محفل مشاعرہ میں

جب یہ گفتگو پیش آئی تھی تو ناممکن ہی ہے کہ لوگوں میں مشہور نہ ہوتی اور خواجہ عشرت کو یہ روایت کسی طریق سے نہ پہونچ سکتی اور آزاد کو لاہور میں پہونچ جاتی!

(۳) آتش ایک صلح کل اور بقول آزاد "سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے، ان اوصاف کے آدمی پر تو یہ بات کچھ کھلتی نہیں کہ ذراسی بات پر اُستاد سے سرِ مجلس بگڑ بیٹھے۔ شاگرد کی تعلیوں پر اُستادوں نے اکثر اسطرح کی در پردہ تنبیہیں کی ہیں۔ اور سعادتمند شاگرد ہمیشہ اُس سے متنبہ اور شرمندہ ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نے جو رویہ آتش کا پیش کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آتش کو سعادت مندی چھو نہیں گئی تھی اور نیک نفسی اور حیا کا اس میں نام ونشان نہ تھا۔ وہ اس استاد کی مطلق قدر نہ کرسکا۔ جو میر تقی کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔

(۴) جو آزاد کہتے ہیں کہ مصحفی کے اشعار آتش کے اشعار سے کمزور تھے۔ اس صورت میں آتش کا رویہ کتنا مذموم نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے کمزور اشعار کو اپنے ایک اُستاد بھائی کے منھ سے سُنکر تاب نہ لاسکے اور سیدھے استاد سے جاکر لڑمرے۔

(۵) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آزاد کو آتش کا ایک مسلم الثبوت اُستاد سے بگاڑ دکھانا تھا تو اُصولاً کوئی مستند روایت بیان کرتے یا راوی کا ذکر کرتے۔ لیکن اس طرز تاریخ نویسی اور اس عقل وفہم کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایسی مبہم روایت کو یوں تحریر فرماتے ہیں "مگر جہاں سے معلوم کھلا بگڑ ہی اسکی حکایت یہ سُنی گئی ہے" اسے سبحان اللہ یہ تو حال تھا نفس روایت کا۔ اب آزاد ہیں کہ اسکو تائید و تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ان مرعوب کُن اور احتمال انگیز الفاظ سے کہ "خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پہ قائم ہوئی ہوگی اور حق کس کی طرف جارہا ہوگا، آج اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پہ کھلنی مشکل ہے"۔ اللہ اکبر! جب یہ مشتبہات روایت بیان کرتے وقت خود ہی پیدا کردئے جائیں تو کیوں نہ یقین کرلینے کو جی چاہے۔ اور کیوں نہ کسی آئندہ زمانہ میں کوئی صاحب اتنی گنجائش پاکر اُٹھ کھڑے ہوں کہ "جی ہاں اب معلوم ہوا۔ وہ جزئیات یہ ہیں۔ اور حق آتش کی طرف تھا"، پھر یہ کہ "اصل حقیقت کھلنی مشکل ہے مگر صاحب بصیرت اور صاحب فراست ناقد کے نزدیک آسان ہے۔

مذہب مذہب کی بحث دیکھکر جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونگے۔ ہمیں اُن کا پورا علم واحساس ہے۔ پھر بھی ہم اس بحث کو چھیڑتے ہیں۔ محض اس مقصد سے کہ ایک شخص کے کلام کو پڑھ کر اور تذکروں میں اُسکے حالات دیکھکر جو صحیح نتیجہ نکلتا ہو اُسکو ظاہر کیا جائے۔ بنابریں اگر مجھے آتش کے تشیع مفروضہ سے انکار ہو تو اسکی وجہ تنگ نظری یا کسی مشہور شاعر کو شیعہ نہ دیکھ سکنا" نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ درآنحالیکہ ہم عرفی وقاآنی۔ امیس و دبیر۔ سودا و ناسخ کو مشہور اور پھر شیعہ جانتے اور مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ آتش جیسے ننگ نوش، رند و آزاد اس قابل بھی نہ تھے کہ اُن کو خلاف واقع طور پر محض زبردستی کھینچ تانی سے سُنی ثابت کیا جائے نہ تسنن کو اس سے چار چاند لگ جائیں گے نہ تشیع میں کوئی ٹبہ لگ جائیگا نہ ہم اس بارہ میں اوروں کی طرح تاویلات بارد اور تحریفات رکیکہ کام میں لائیں گے۔ بلکہ جو کچھ ازروئے تحقیق ثابت ہوگا اُسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

آزاد نے اس بیان کو بڑی ترکیب سے لکھا تھا۔ مرزا اثر صاحب نے نہ صرف اسکی تائید کر دی بلکہ اسکے سوا ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یعنی اُس نے تو گول لفظوں میں لکھا اثر صاحب نے اس سے نتیجہ نکال کر صاف صاف لکھ دیا کہ وہ شیعہ تھا حالانکہ کوئی تذکرہ حتیٰ کہ خود آزاد بھی مرزا صاحب کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

آزاد و اثر صاحبان کی طرز تحریر اور انداز طبع کو دیکھکر حیران ہوں کہ تذکرہ نویسوں اور خاصکر اپنے یہاں کے تذکرہ نویسوں کو اس روش کی داد دوں یا فریاد کروں کہ یکے بعد دیگرے صدہا شعرا کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں، مگر مذہب کا حال تفصیلی تو درکنار، کنایہ اشارہ تک اُسکی جانب نہیں کرتے اور نہیں کرنا چاہتے۔ معلوم نہیں یہ اُنکی فراخدلی اور رواداری تھی، یا بےخبری اور لاعلمی، بہرحال شریعت سیرت نگاری اور مذہب ادبیات کا یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا جو اُن سے سرزد ہوا اور میں سچ کہتا ہوں کہ انقلاب زمانہ کا دیوتا اُنکو اس گناہ پر بغیر سزا دیئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اُسکی سزا وہ ہے جو دوسرے لوگ موقع پاکر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اب صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے آکر بنیادی اینٹ رکھدی دوسرے نے بنیاد بھر دی تیسرے نے پوری عمارت اُس پر بنا کھڑی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس بارہ میں "اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کھلنی مشکل ہے" اور اگر آج بعض رسالے اور مضامین نہ شائع ہوئے ہوتے تو یقیناً ہمکو روز روشن میں رات کی تاریکی، چاند، ستارے سب کچھ دکھائے اور منوائے جا سکتے تھے اور اسوقت سوا ماننے کے اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ بہرحال آتش کی شیعیت کے ذیل میں اتنی باتیں بیان کیجاتی ہیں:۔

(۱) آزاد نے آبحیات صفحہ ۲۸۷ تذکرہ آتش میں ایک بات بہت پردہ پردہ میں لکھی ہے کہ "۱۲۶۴ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خوردسال تھے اُنکی بھی سرپرستی وہی کرتے رہے"۔

میر دوست علی خلیل آتش کے شاگرد تھے۔ اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ آزاد کا مطلب غالباً یہ ہے کہ چونکہ ایک شیعہ نے تجہیز و تکفین کی لہذا آتش کی موت اور دفن و کفن وغیرہ امور شیعوں کی طرح ہوئے اور آتش شیعہ تھا۔

(۲) آبحیات میں صفحہ ۲۸۳ پر ایک روایت سے آتش کو شیعہ گردانا جاتا ہے "خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقہ سنت و جماعت سے تھا اُس نے ویسی ہی نماز سکھا دی اور یہ کہدیا کہ اُستاد! عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کر کے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل انکے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضرباش تھے۔ ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا، بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ "اُستاد آپ کا مذہب کیا ہے؟" فرمایا "شیعہ"۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟ اُنھوں نے کہا "کہ نماز سنیّ کی"۔ فرمایا کہ "بھئی میں کیا جانوں فلاں شخص سے میں نے کہا تھا اُس نے جو سکھا دی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی

دو دو نمازیں ہیں"۔ "اسی دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے"۔

(۳) اثر صاحب نے اکتوبر کے زمانہ میں لکھا ہے "مذہب شیعہ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں غزل"۔ (اسکے بعد وہ غزل لاتحف ایدل اور شاہ نجف ایدل والی نقل کی جس کے مقطع میں یہ مصرعہ بھی ہے "شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف ایدل")

لیکن اسکے جوابات لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کراؤں۔

(۱) ہم نے آجتک یہی سُنا تھا اور نہ صرف ہم بلکہ ایک دنیا اسکو جانتی ہے، کہ شیعوں کے ہاں تصوف کوئی چیز نہیں۔ درویشی۔ کشف و کرامت۔ پیری و مریدی۔ فیضِ باطنی۔ صفائے قلب وغیرہ ان کے نزدیک ڈھکوسلے ہیں اور الفاظِ بے معنی۔ یہی میں نے اپنے سابق مضمون "میرزا غالب کے مذہب" میں مختصراً لکھا تھا۔ لیکن ضرورت ہے کہ آج ذرا تفصیل سے اس پر اظہارِ خیال کروں۔

سوال یہ ہے کہ شیعیت و تصوف میں تضاد ہے یا نہیں اگر تضاد ہے تو ان دونوں کا اجتماع کیا معنی اور اگر توافق ہے تو خدارا مجھے بتلائیے کہ صوفیوں کو بُرا کہنا کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ چمنستانِ لکھنؤ کا ایک بلبل یوں نغمہ سنج ہوتا ہے۔

این کلامِ صوفیانِ شوم نیست مثنوی مولوی روم نیست ؎

صوفی اندر باغ چوں ہو ہو کند فاختہ برحالِ او کُوکُو کند ؎

(۲) شیعوں اور سنیوں میں بلحاظ عقائد تھوڑا ہی سا فرق ہے۔ اسلئے ہر سنی کو نہایت آسانی سے شیعہ کہا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کچھ آج ہی نہیں قرونِ اولےٰ اور وسطیٰ میں بھی مشاہیر کا مذہب و عقیدہ مخفی یا کم از کم مشتبہ کرنیکی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔ روایتیں گھڑی گئیں۔ الحاقی اشعار اور جعلی رسالے شائع کئے گئے، شاہ عبد العزیز صاحب اپنے رسالہ "تحفہ" میں لکھتے ہیں کہ شیعہ ہمیشہ در پردہ اس کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مطلب اُن کا یہ ہوتا ہے کہ آج نہ سہی تو سو پچاس برس کے بعد لوگوں کو اس کے ذریعہ سے غلط راہ پر ڈالا جاسکے۔ شاہ صاحب نے مثالیں لکھی ہیں کہ ابن قتیبہ (سنی حنفی) کی کتاب "المعارف" کے مقابلہ میں ایک شیعہ قتیبہ نے بھی المعارف کتاب لکھی۔ ایک کتاب "سر العالمین" امام غزالی کے نام سے لکھی گئی۔ تاریخ طبری اصل کمیاب ہے۔ اس کا مصنف سنی تھا۔ ایک شیعہ نے اس کے ترجمہ اور اختصار میں خاصی آمیزش کردی اور آج وہی پائی جاتی ہے"۔ اسی طرح خواجہ حافظ کے نام سے الحاقی غزلیں اور قصیدے ان کے دیوان میں داخل کئے گئے سعدیؔ و رومؔ کو تشیع سے منسوب کیا گیا۔ شاہ عبد العزیز صاحب کے نام سے "سر الشہادتین" لکھدی گئی۔ یہی صورت غالب میر۔ آتش کے بارہ میں بھی پیش آئی ہے اور آناً در پردہ یہ کام کرگئے ہیں۔

باقی آیندہ

سراج الحق

باب الاستفسار

تاریخ اسلامی ہند کے اصلی ماخذ

(بہ سلسلۂ سابق)

(نگار) اسلامی تاریخ ہند کے اصل ماخذوں کے متعلق جو گفتگو گزشتہ ماہ کے رسالہ میں شروع ہوئی تھی، وہ صرف سندھ تک پہونچکر ختم ہو گئی تھی۔ آج کی صحبت میں، حملۂ غزنوی کے وقت سے حملۂ تیمور تک کی تاریخوں سے بحث کرتا ہوں لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں بعض کتابیں ایسی بھی نظر آئیں گی۔ جو حملۂ تیمور کے بہت بعد لکھی گئیں، لیکن ان کا ذکر اس لئے ناگزیر تھا کہ اُن میں بھی شروع سے مسلمانوں کے حملے اور اُن کے قیام سلطنت ہند کے واقعات درج ہیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں تمام وہ کتابیں نظر آئیں گی جو تاریخ اسلامی ہند کے غالب حصہ کو محیط ہیں۔ اور جن سے نہ صرف حملۂ تیمور تک کے حالات بلکہ بہت بعد کے واقعات بھی ہو سکتے ہیں۔

چونکہ تاریخ ترتیب کے لحاظ سے ان کتابوں کے ذکر میں تقدم و تاخر زحمت طلب معلوم ہوا، اس لئے ردیف دار ان کی فہرست دیکر مختصراً اُن کا ذکر کئے دیتا ہوں۔ پہلے بہ پابندی ردیف فہرست ملاحظہ ہو:-

(۱) تاریخ آل سبکتگین (۲) تاریخ الفی (۳) تاریخ گزیدہ (۴) تاریخ فرشتہ (۵) تاریخ یمینی (۶) تاج المآثر (۷) تاریخ علائی (۸) تاریخ وصاف (۹) تاریخ حقی (۱۰) تاریخ خان جہاں لودی (۱۱) تاریخ مبارک شاہی (۱۲) تاریخ داؤدی (۱۳) تاریخ سلاطین افاغنہ (۱۴) تاریخ کامل ابن اثیر (۱۵) جوامع الحکایات (۱۶) حبیب السیر (۱۷) روضۃ الصفا (۱۸) زینت المجالس (۱۹) سفرنامہ ابن بطوطہ (۲۰) طبقات اکبری (۲۱) طبقات ناصری (۲۲) ظفرنامہ (۲۳) فیروز شاہی برنی (۲۴) فیروز شاہی سراج عفیف (۲۵) فتوحات فیروز شاہی (۲۶) مآثر رحیمی (۲۷) مرآۃ مسعودی (۲۸) مسالک الابصار (۲۹) مطلع سعدین (۳۰) منتخب التواریخ (۳۱) ملفوظات تیموری (۳۲) نگارستان (۳۳) واقعات مشتاقی۔

۱۔ "تاریخ آل سبکتگین" کو تاریخ بیہقی اور مجلدات بیہقی بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے مولف کا نام ابو الفضل

بن الحسن البیہقی تھا۔ یہ تاریخ تقریباً ناپید ہے۔ اور چند اجزاء اس کے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ میر خوند نے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ اسکی تیس جلدیں تھیں۔ تاریخ گزیدہ میں بھی اس کتاب کا حوالہ پایا جاتا ہے اور ضیا برنی و ابوالفضل نے امام بیہقی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس شہاب کا وجود باقی تھا۔ فرشتہ نے بھی محمود غزنوی کے حالات میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس نے خود غالباً اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ محمود کے حالات لکھنے میں اتنی خامیاں باقی نہ رہتیں۔ خاندان غزنوی کے حالات میں اس سے زیادہ جامع و مکمل تاریخ کوئی نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب میں فرخ زاد جمال الدولہ یعنی سنہ ۴۵۱ھ تک کے حالات پائے جاتے ہیں۔ چونکہ خود اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۴۰۲ھ میں اس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس لئے اگر اسی عمر سے اس نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس نے محمود غزنوی کے حالات سے ابتدا کی تھی کیونکہ محمود نے سنہ ۳۸۸ھ سے سنہ ۴۲۱ھ تک حکومت کی۔

تاریخ وصاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے امیر ناصر الدین سبکتگین کے حالات میں ایک اور کتاب تاریخ ناصری کے نام سے بھی لکھی تھی۔ مگر ممکن ہے کہ یہ تاریخ کوئی علیحدہ کتاب نہ ہو، بلکہ صرف حالات سبکتگین کے حصہ کا نام تاریخ ناصری رکھدیا ہو، جیسا محمود کے حالات کا حصہ اس نے تاج الفتوح کے نام سے موسوم کیا تھا، جیسا کہ قصائد عنصری سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ تاریخ الفی۔ عربی میں الف ہزار کو کہتے ہیں۔ اس کا نام تاریخ الفی اس لئے قرار پایا کہ جب سنہ ۱۰۰۰ھ ختم ہوا تو اکبر نے حکم دیا کہ آج کے دن تک کے تمام شاہان اسلام کا مفصل حال درج کیا جائے اور اس کا نام تاریخ الفی رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ واقعات رحلت نبوی کے بعد سے لکھے جائیں اور سنین کے ذکر میں بجائے ہجرت کے لفظ رحلت لکھا جائے۔

اس خدمت کے لئے سات آدمی مامور ہوئے، پہلا سال نقیب خاں کو سپرد کیا گیا، دوسرا شاہ فتح اللہ کو، اسیطرح حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، مرزا نظام الدین احمد اور ملا عبدالقادر بدایونی کو۔ جب ۳۵ سال کے حالات مرتب ہوگئے تو حکیم ابوالفتح کی سفارش سے یہ کام ملا احمد کے سپرد کیا گیا۔ جب چنگیز خاں تک کے حالات وہ دو جلدوں میں ختم کر چکا تو مرزا فولاد نے اسے لاہور کی ایک گلی میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سنہ ۹۹۷ھ تک کے حالات آصف خاں نے مرتب کئے۔

تاریخ الفی اس میں شک نہیں کہ عہد اکبری کی بہترین تصانیف میں سے ہے، لیکن چونکہ اس کی ترتیب مختلف ذوق و خیال کے ماتحت ہوئی ہے، اس لئے کہیں کہیں اصل واقعات میں تحریف بھی کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے چونکہ وہ فسانہ کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے واقعات کا استقصا بھی اس میں دشوار ہے۔ حیدرآباد [illegible]

کے کتب خانوں میں اس کے ناتمام نسخے موجود ہیں۔

۳۔ تاریخ گزیدہ ۷۳۰ھ میں مرتب ہوئی اس کا مولف حمداللہ بن ابوبکر بن حمد بن نصر مستوفی قزوینی تھا۔ یہ رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین (وزیر) کا سکرٹیری تھا اور اسی کے نام سے یہ کتاب منسوب ہے۔

اس کتاب کا شمار مشرق کی بہترین تاریخوں میں ہے۔ اس کتاب کے ماخذ یہ ہیں:۔ تاریخ طبری۔ تاریخ کامل ابن اثیر، نظام التواریخ بیضاوی، زبدۃ التواریخ، جمال الدین کاشی، اور جہاں کشا جوینی۔

۴۔ تاریخ فرشتہ　عام طور پر ہندوستان کی بہترین تاریخ تسلیم کیجاتی ہے۔ اس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ بمقام استرآباد ۹۶۰ھ میں پیدا ہوا۔ بعض نے تاریخ پیدائش ۱۵۵۰ء بتائی ہے۔ اس کا باپ غلام علی ہندو شاہ مرتضےٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر پہونچا اور حضور رس ہو گیا۔ محمد قاسم اُسوقت کمسن تھا۔ جب غلام علی مر گیا۔ تو محمد قاسم کو اس کی جگہ دربار میں ملی۔ جب میران حسین فرمانروائے احمد نگر قتل کیا گیا تو محمد قاسم کو بھی بھاگنا پڑا اور بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ نے تاریخ دکن کی ترتیب پر مامور کیا۔ ۱۶۰۶ء میں تاریخ مرتب ہو گئی، لیکن اس کے بعد وہ ہمیشہ اس کی صحت و ترمیم کرتا رہا۔ برگس (BRIGGS) کا خیال ہے کہ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا، حالانکہ ۱۶۲۳ء تک کے واقعات اس کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ فرشتہ کا نام، ابراہیم عادل شاہ کے نام کی رعایت سے گلشن ابراہیمی یا تاریخ ابراہیمی رکھا گیا۔ اور بعد کو جب ابراہیم نے پایۂ تخت نورس بنایا تو اس کی یادگار میں اس کا دوسرا نام نورس نامہ بھی قرار پایا۔

دکن کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے۔ یہ تاریخ نہایت عمدہ ہے لیکن کہیں کہیں مذہبی عصبیت ضرور نمایاں ہو گئی ہے۔

۵۔ تاریخ یمینی۔ اس کا مصنف ابو النصر محمد ابن محمد الجبار العتبی تھا، اس کا خاندان سامانی بادشاہوں کے عہد میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا اور یہ خود محمود غزنوی کا سکرٹیری تھا۔ اس نے سبکتگین کے پورے حالات اور محمود کے واقعات سلطنت ۴۱۰ھ تک درج کئے ہیں۔

یہ کتاب ادبی نقطۂ نظر سے بھی خاص چیز خیال کی جاتی ہے۔ فارسی میں بھی اس کے متعدد ترجمے ہوئے سب سے پہلے ترجمہ ۵۸۲ھ میں ہوا تھا اور دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی نے کیا۔ جو مختلف کتب خانوں میں نظر آتا ہے۔

۶۔ تاج المآثر۔ قطب الدین ایبک کے حالات معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ تھا جس سے مورخین مابعد نے کام لیا۔ اور بقول ہمیر" اگر حسن نظامی (مولف تاج المآثر) قطب الدین کے حالات نہ لکھتا تو آج یہ بھی گمنام حالت میں رہتا۔

اس کے مؤلف کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔ تاج المآثر کے دیباچہ میں اُس نے اپنا نام حسن نظامی لکھا ہے۔ میر خوند نے اس کا پورا نام صدرالدین محمد بن حسن نظامی تحریر کیا ہے۔ ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں یہی نام درج کیا ہے۔

ہمیر یر گستاں نے اسے باشندۂ لاہور ظاہر کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہ نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ وہلی پہونچکر وہ شرف الملک قاضی شہر سے ملا اور چند دن بعد ۶۰۲ھ میں یہ تاریخ لکھنا شروع کی۔ اسی سال شہاب الدین محمد غوری کا انتقال ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جسوقت اُس نے اس تاریخ کی ابتدا کی، محمد غوری زندہ تھا، اور اسی لئے اسکے نام سے یہ کتاب منسوب کی گئی۔

ہمیر لکھتا ہے کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی۔ اور اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین فرمانروائے لاہور سے منسوب کیا۔

ہمیر نے محمد کو محمد بن سام لاہوری سمجھا، حالانکہ اس سے مراد محمد غوری تھی۔ اس لئے ہمیر کی یہ تحقیق بھی غلط ہے۔

اس تاریخ کی ابتدا ۵۸۸ھ سے شروع ہوتی ہے۔ جب محمد غوری اپنی شکست تھانیسر کا انتقام لینے کے لئے حملۂ ہند کی طیاریاں کر رہا تھا۔ عام طور پر جو نسخے اس کتاب کے ملتے ہیں ان میں ۶۱۴ھ (قطب الدین ایبک کے سات سال بعد) تک کے حالات درج ہیں۔ لیکن بعض نسخوں میں ۶۲۶ھ (شمس الدین التمش کے زمانہ) تک کے حالات پائے جاتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کے جو حالات اس میں پائے جاتے ہیں، وہ غیر اہم بھی ہیں اور کم بھی۔ اس تصنیف کی حیثیت تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع کی وجہ سے زیادہ تر ادبی ہے جس سے اسکی مورخانہ اہمیت کو صدمہ پہونچتا ہے۔

۷۔ تاریخ علائی۔ اس کا دوسرا نام خزائن الفتوح بھی ہے۔ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے جس میں عہد علاؤالدین خلجی کے ابتدائی دورمیانی حالات درج ہیں۔

علاوہ اس کے دو کتابیں تاریخ کی انھوں نے اور لکھی تھیں۔ ایک تاج الفتوح (سلطان جلال الدین عہد حکومت کا اول دو سال کی تاریخ) اور دوسری تغلق نامہ (جسمیں غیاث الدین تغلق کے حالات درج تھے۔

۸۔ تاریخ وصاف۔ اس کا اصل نام "تزجیۃ الاخبار و تجزیۃ الآثار" ہے۔ عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی المعروف بہ وصاف اس کا مصنف تھا۔ شعبان ۶۹۹ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور اسوقت پہلی چار جلدیں شائع بھی ہوگئیں کیونکہ رشید الدین نے اپنی مشہور کتاب جامع التواریخ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ایک جلد اور لکھی جس میں ۷۲۸ھ تک کے واقعات درج کئے۔ اس کتاب میں اُس عہد سے ترتیب واقعات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جب تاریخ جہاں کشا کی ترتیب ختم ہوئی۔ یعنی منگو خاں کے انتقال اور قبلائی خاں کی ـــــ تخت نشینی سے اسکی

ابتدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب مغلوں کی نہایت معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ تیسری اور چوتھی جلد میں اُس نے ہندوستان کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُس نے بہت کاوش سے کام لیا ہے۔

۹۔ تاریخ حقی۔ اس کے مولف مولانا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی تھے۔ اس میں سلاطین غلام سے لیکر اکبر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۰۵ھ میں مرتب ہوئی جب اکبر کی تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا۔

مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھکر پیدا ہوا۔ چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات درج تھے اس لئے بعد کے حالات اُنھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ سام سلطان بہادر گجراتی) سے مدد لیکر لکھے اور بہلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی۔ اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن بادشاہوں کا بھی حال لکھنا چاہئیے جن کو ضیاء برنی چھوڑ گیا ہے۔ اس غرض سے اُنھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخرالدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بہلول لودی سے لیکر عہد اکبری تک کے حالات اُنھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے۔

اُنھوں نے سلاطین بنگال۔ جونپور۔ مانڈو۔ دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں، لیکن نہایت مجمل۔

یہ کتاب بہت کمیاب ہے، اور ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے اور ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں۔

۱۰۔ تاریخ خان جہاں لودی۔ اسی کتاب کا دوسرا نام مخزن افاغنہ بھی ہے۔ جن لوگوں نے مخزن افاغنہ کو علحدہ کتاب سمجھا ہے۔ ان دونوں میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ جب مخزن افاغنہ پر دوبارہ نظر ثانی کی تو وہ تاریخ خان جہاں لودی بن گئی (خان جہاں، جہانگیر کا مشہور سپہ سالار تھا۔) جہانگیر کے بھی مختصر حالات اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کا مصنف نعمت اللہ دربار جہانگیر کا وقائع نویس تھا۔ اس کا باپ خواجہ حبیب اللہ ہراتی تھا۔ اس کتاب کی ترتیب ۱۰۲۱ھ میں ختم ہوئی۔

۱۱۔ تاریخ مبارک شاہی۔ اس کا مصنف یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی تھا۔ چونکہ مصنف کا مقصود مبارک شاہ ثانی (سید خاندان کے حکمراں) کے مفصل حالات درج کرنا تھا۔ اس لئے اسکا نام اسنے تاریخ مبارک شاہی رکھا۔ اس کی ابتدا محمد سام (غوری) کے زمانہ سے ہوتی ہے اور جو قلمی نسخہ اس کا دستیاب ہوا ہے۔ اس میں صرف ۸۵۲ھ تک کے حالات درج ہیں (جو سلطان سید محمد کی حکومت کا درمیانی زمانہ تھا) اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کے بعد اُس نے کس عہد کے حالات لکھے تھے۔

فیروز شاہ تک کے حالات اس نے دوسری تاریخوں کی مدد سے لکھے ہیں۔ اور بعد کے واقعات اس نے

معتبر روایات اور اپنے مشاہدہ کی بناء پر تحریر کئے ہیں۔ اُس نے خود اپنا کوئی حال نہیں لکھا۔ اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کیا تھا اور دربار مبارک شاہ سے اسے کیا تعلق تھا۔

سید خاندان کی تاریخ اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اور نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں، ہندو شاہ نے فرشتہ میں اور ملا عبدالقادر نے اپنی منتخب التواریخ میں اس سے بہت مدد لی ہے۔

۱۲۔ تاریخ داؤدی۔ اس کا مصنف عبداللہ تھا۔ غالباً عہد جہانگیر کے اولیں سال تخت نشینی میں مرتب کی گئی۔ بہلول لودی سے ابتدا کی ہے اور داؤد شاہ پر اس کا اختتام ہوا ہے۔ ضبط واقعات کے لحاظ سے اس کتاب کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے، لیکن سلاطین افاغنہ کے خصائل و عادات پر بہت کافی روشنی اس میں ڈالی گئی ہے۔ اس کے مصنف نے اپنے حالات نہیں لکھے اور نہ تاریخ ترتیب کا پتہ چلتا ہے۔

۱۳۔ تاریخ سلاطین افاغنہ۔ اس کا مصنف احمد یادگار تھا، جو شاہان سُور کا دیرینہ خادم تھا۔ داؤد شاہ کے حکم سے اُس نے یہ تاریخ لکھی، جس میں بہلول لودی کے وقت سے ابتدا کی گئی، اور ہیمو کے واقعۂ قتل پر اس کا اختتام ہوا۔ اس کی صحیح تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن چونکہ داؤد شاہ کے حکم سے اس کی ترتیب ہوئی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ۹۸۲ھ سے قبل مرتب ہوئی ہوگی۔ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب زیادہ اہم نہیں ہے۔

۱۴۔ تاریخ کامل ابن اثیر۔ عربی کی بہت مشہور تاریخ ہے۔ اور تقریباً ہر شخص اس سے واقف ہے۔ زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے متعلق۔ غزنوی و غوری سلاطین کا حال اس نے بہت خوبی سے درج کیا ہے۔

حبیب السیر کا مصنف لکھتا ہے کہ اس کا ترجمہ تیمور کے بیٹے میران شاہ کے حکم سے نجم الدین نزاری نے (جو میران شاہ کا کاتب خصوصی تھا۔) فارسی میں کیا تھا۔

۱۵۔ جوامع الحکایات۔ اس کا پورا نام "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" ہے۔ اس کا مصنف نورالدین محمد عوفی تھا (وہی عوفی جس کا تذکرہ لباب الالباب، مسٹر براؤن نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا)

یہ کتاب نظام الملک محمد (وزیر التمش) کے نام سے منسوب ہے۔ اسی کتاب میں صرف ان تاریخی حکایات کو جمع کیا گیا ہے۔ جن سے شاہان اسلام کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف نے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے، اُن کے نام یہ ہیں:-

تاریخ یمینی، تاریخ ناصری، تاریخ ملوک عجم، مجمع الامثال، عین الاخبار، شرف النبی، فرج بعد الشدت، خلق الانسان، اخبار امکہ وغیرہ۔

۱۶۔ حبیب السیر۔ خوندمیر کی دوسری تاریخ ہے۔ اس سے قبل وہ خلاصۃ الاخبار لکھ چکا تھا، لیکن چونکہ وہ مجمل تھی، اس لئے اس نے دوسری مفصل تاریخ حبیب السیر کے نام سے لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب

کی ترتیب میں روضۃ الصفا سے کافی مدد لی گئی ہے۔ لیکن بعض ایسے خاندانوں کا بھی حال اس میں درج ہے جو روضۃ الصفا میں نہیں ہیں۔ ۹۲۷ھ میں اس کی ترتیب شروع ہوئی تھی۔ اختتام کی صحیح تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔ تاہم بعض نسخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳۵ھ میں ختم ہوئی۔ اس کا مکمل نسخہ اس وقت کہیں نہیں ملتا۔ منتشر اجزا مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۱۷۔ روضۃ الصفا۔ اس کتاب کا پورا نام یہ ہے:۔ "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء" اس کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود۔ زیادہ تر میر خاوند اور میر خوند کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ ۸۳۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۹۰۲ھ میں انتقال کیا۔ میر علی شیر (سلطان حسین شاہ ایران کا وزیر) اس کا سرپرست تھا اور اسی کے زمانہ میں اس نے یہ تاریخ مرتب کی۔

روضۃ الصفا نہایت معتبر تاریخ ہے اور بعد کے مورخین نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور حاجی خلیفہ کی تاریخ تو بالکل اسی کا اقتباس ہے۔

۱۸۔ زینت المجالس۔ اس کی تاریخ تالیف ۱۰۰۴ھ ہے۔ اس کے مولف کا نام مجد الدین محمد الحسنی تھا۔ لیکن عام طور پر مجدی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مختلف قصص و حکایات کا مجموعہ ہے اور تاریخی اہمیت سے معرّا۔

۱۹۔ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ بہت مشہور کتاب ہے۔ ابن بطوطہ ۷۳۴ھ میں بعہد سلطان محمد تغلق آیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں سلطان محمد تغلق کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے ہیں۔

۲۰۔ طبقات اکبری۔ اس کا صحیح نام طبقاتِ اکبر شاہی ہے اور مصنف کے نام کی رعایت سے تاریخ نظامی بھی کہتے ہیں۔ اس کا مصنف خواجہ نظام الدین احمد خواجہ مقیم ہروی (بابر کا ندیم و مصاحب) تھا۔ خواجہ نظام الدین عہد اکبری کے بہت ممتاز لوگوں میں تھا۔ صوبہ گجرات میں بخشی گری کے عہدہ پر بھی ممتاز رہا اور خود مختلف جنگوں میں حصہ لیا۔ ۱۰۰۲ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

یہ کتاب ہندوستان کی نہایت مشہور و مستند تاریخوں میں سے ہے اور بعد کے تمام مورخین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

۲۱۔ طبقات ناصری۔ یہ کتاب ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ۱۵ سال تک کے حالات اس میں درج کئے گئے ہیں۔ اس کے مصنف کا نام منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی تھا اور عام طور پر منہاج السراج کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۶۲۴ھ میں غور سے سندھ اور ملتان آیا اور اوچ میں دار العلوم فیروزی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دوسرے سال سلطان شمس الدین التمش کے حضور میں باریاب ہوا۔ محاصرہ گوالیار کے وقت وہ یہاں کے محکمۂ قضا کا صدر اعظم بنایا گیا۔ بہرام شاہ کے عہد میں وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔

اس کے بعد ۶۴۳ھ میں ناصریہ دارالعلوم کا مہتمم اعلے مقرر ہوا۔ ناصرالدین محمود کے عہد میں اسکی بڑی عزت ہوئی۔ ہندوستان کی نہایت معتبر تاریخوں میں اسکا شمار ہوتا ہے۔

۲۲۔ ظفرنامہ۔ اس کا مصنف شرف الدین یزدی تھا۔ اس کا انتقال ۸۵۰ھ میں ہوا۔ اس کتاب میں بالکل تیمور کے حالات درج ہیں۔ اور میر خوند کے نزدیک اس کا شمار بہترین تاریخوں میں ہے۔ یہ کتاب ۸۲۷ھ میں لکھی گئی اور ملفوظات تیموری سے اس کی تحریر میں اسقدر مدد لی گئی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ظفرنامہ ملفوظات تیموری کی دوسری صورت ہے۔

۲۳۔ فیروز شاہی برنی۔ ضیاءالدین برنی کی بہت مشہور تاریخ ہے۔ یہ کتاب طبقات ناصری کے بعد لکھی گئی۔ اس میں غیاث الدین بلبن سے لیکر فیروز شاہ تغلق تک کے حالات درج ہیں۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہ کتاب مرتب کی گئی تھی۔ اس لئے اس کے نام سے منسوب کی گئی۔ ہرچند خود فیروز شاہ کے حالات اس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کتاب میں مسلسل واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے۔ تاہم اس حیثیت سے کہ سوائے اس کے اور کوئی کتاب اس عہد کی تاریخ کی نہ تھی۔ اس کی بہت قدر کی گئی۔ ضیاء برنی امیر خسرو کے مزار کے قریب ہی دہلی میں مدفون ہوا۔

۲۴۔ فیروز شاہی سراج عفیف۔ فیروز شاہ کے حالات میں اس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اسمیں اس کے آئین جہانداری، رعایا کے حالات اور نظم ونسق سے بھی بحث کی ہے۔ شمس سراج عفیف (اس کا مصنف) ابوہر کا رہنے والا تھا (فیروز شاہ کی ماں بھی اسی گاؤں کی تھی) عفیف کا دادا ابوہر میں وصولی خراج کا افسر تھا یہ کتاب تقریباً نایاب ہے۔ لوہارو کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اور الیٹ نے اس سے فایدہ اٹھایا تھا۔

۲۵۔ فتوحات فیروز شاہی۔ اس کتاب میں خود فیروز شاہ نے اپنے حالات، اور اپنے زمانہ کی اصلاحات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ہرچند مختصر ہے، لیکن معلومات کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ فیروز آباد کی جامع مسجد میں فیروز شاہ نے ایک ہشت پہل گنبد بنوایا تھا، اور اس کے ہر پہلو پر اس کتاب کا ایک باب نقش کرا دیا تھا اس کا ایک قلمی نسخہ مسٹر ٹامس کے پاس ۱۱۳۹ھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ جس سے الیٹ نے فائدہ اٹھایا۔

۲۶۔ مآثر رحیمی۔ اس کا مصنف محمد عبدالباقی الرحیمی النہاوندی تھا، یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں سے تھا اور عبدالرحیم خانخاناں کے متوسلین خصوصی میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس تاریخ میں سلاطین دہلی کی تاریخ کے ساتھ عہد اکبری کے امراء وملوک کے حالات بہت تفصیل سے درج کئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ

عبدالرحیم خانخاناں کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض نے اُس کو خانخاناں ہی کی سیرت قرار دیدیا اور اسی کے نام سے منسوب ہے۔

۲۷۔ مرآۃ مسعودی۔ اس کے مصنف کا نام عبدالرحمٰن چشتی تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کتاب مرتب ہوئی۔ اس میں سپہ سالار مسعود غازی کے حالات بہت ہیں۔ تاریخی حیثیت اس کتاب کی کچھ نہیں ہے۔

۲۸۔ مسالک الابصار۔ شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی کی تصنیف ہے جو ۶۹۷ھ میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ میں بمقام دمشق مرا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کی ۲۰ جلدیں تھیں اور محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرائع سے فراہم کرکے لکھے تھے۔ یہ کتاب نایاب ہے۔

۲۹۔ مطلع السعدین۔ اس کتاب کا پورا نام "مطلع السعدین و مجمع البحرین" ہے۔ مصنف کا نام کمال الدین عبدالرزاق بن جلال الدین اسحاق السمرقندی تھا۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں تیمور کے مفصل حالات ہیں اور دوسری جلد میں اولاد تیمور کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کمیاب ہے۔

اس کا تعلق شاہ رخ کے دربار سے تھا اور اس کو شاہ بیجاپور کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۸۱۶ھ میں پیدا ہوا اور ۸۸۷ھ میں وفات پائی۔

۳۰۔ منتخب التواریخ۔ اس کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔ اس کو تاریخ بدایونی بھی کہتے ہیں اس کتاب میں عہد غزنوی سے لیکر اکبر کے ۴۰ سال تک کے واقعات درج کئے ہیں۔ عہد اکبری کی یہ مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ اکبر کے درباریوں سے اسے نفرت تھی اور نہایت متعصب سنی تھا۔ اس لئے اسکی بیجا نکتہ چینیوں نے کتاب کو پایۂ اعتبار سے گرادیا ہے۔

ملا عبدالقادر بڑا فاضل شخص تھا اور اسنے متعدد عربی اور سنسکرت کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی تھیں۔

۳۱۔ ملفوظات تیموری۔ اس کا دوسرا نام تزک تیموری بھی ہے۔ خود تیمور اس کا مصنف ہے۔ یہ ترکی زبان میں تھی جسے ابوطالب حسینی نے فارسی میں ترجمہ کرکے شاہجہاں سے منسوب کیا۔ تاریخ کے لحاظ سے اس کتاب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

۳۲۔ نگارستان۔ مجموعہ ہے مختلف حکمران خاندانوں کے متعلق مختلف قصص و حکایات کا۔ اس کا مصنف احمد بن محمد بن عبدالغفور الغفاری القزوینی تھا۔ نگارستان اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۹۵۹ھ میں لکھی گئی تھی۔

۳۳۔ واقعات شتاقی اسکا مولف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۹۸۹ھ میں مرا۔ یہ شخص بہت بڑا سیاح تھا۔ فارسی میں مشتاق تخلص کرتا تھا اور ہندی میں راجن۔ اس کتاب میں سلطان بہلول

لودہی کے وقت سے ابتدا کی گئی ہے۔ اور سلسلہ وار عہد اکبری تک کے حالات لکھ کر، شیر شاہ، اسلام شاہ، محمود علی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے۔

آپ کے استفسار کا جواب تو مکمل ہو گیا، لیکن جی چاہتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ کتب پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ جس کو میں کسی آئندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

کہکشاں کے اُسطرف

علم الافلاک یا علم ہیئت حقیقتاً بہت مشکل علم ہے اور جب دقت نظر سے کام لیا جاتا ہے تو اسکی مشکلات اور زیادہ بڑھجاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس علم کی بنیاد ریاضی اور طبیعیت کے دقیق ترین قوانین پر رکھی گئی ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ یہی وہ سب سے پہلا وہ علم ہے جس کے قواعد کو انسان نے ابتدا میں مقرر کیا۔ اور یہی وہ دقیق ترین علم ہے۔ جہاں انسانی معارف جا کر ملتے ہیں، اور یہی وہ پیچیدہ اور دشوار علم ہے، جس کے حقائق و معارف کے انکشاف میں بڑے بڑے علمائے فن مصروف بحث و تحقیق ہیں۔ ذیل کی سطروں میں فلکیات کی ایک تازہ بحث درج کیجاتی ہے جو کائنات کی وسعت اور اس کے خالق کی عظمت کو پوری طرح ظاہر کرتی ہے۔ علماء فلک کو تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ فضا میں بہت سے عالم ہیں اور انمیں کی ہر دنیا وسعت اور عظمت کے لحاظ سے اس کہکشاں کے مانند ہے جس پر ہمارا نظام شمسی چل رہا ہے، علامہ آئنسٹین ماہر فلکیات کا خیال ہے کہ فضا کی غیر معمولی وسعت میں تقریباً ایک ارب دنیائیں موجود ہیں۔ اب قادر اعظم کی قدرت پر غور کرو اور دیکھو کہ اُس کے مقابلہ میں ہماری دُنیا کتنی چھوٹی ہے؟

قدماء کو یہ معلوم تھا کہ قبۂ فلک میں آفتاب، ماہتاب اور تاروں کے علاوہ دوسرے اجرام بھی ہیں، جن لوگوں نے صاف اور بے غبار راتوں میں آسمانی حالات کا مطالعہ کیا تھا، ان کو کوکبۂ جبار اور کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کے قریب وہ روشن اور درخشاں ابر کے سے ٹکڑے نظر آتے تھے۔ جن کو آج سدیم سے تعبیر کیا جاتا ہے، علامہ ابوالحسن صوفی مشہور ماہر فلکیات لکھتے ہیں کہ میں نے مراۃ المسلسلہ کی سدیم کو دیکھا ہے، علامہ کی زبان میں سدیم کا نام "لطخۂ سحابیہ" ہے، ممدوح نے جہاں کہیں بھی ان حقائق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لطخہ یا سحابی جیسے کلمات استعمال کئے ہیں، لیکن بایں ہمہ ان اجرام کی واقعی حقیقت اُسوقت تک فہم انسانی کے نزدیک ایک راز سربستہ اور عقدہ لاینحل رہی جب تک کہ ٹیلیسکوپ (دوربین) ایجاد نہ ہوئی۔

گلیلیو نے سب سے پہلے دوربین کا سہرا ایجاد کی، اور اس کی وساطت سے کہکشاں کا مطالعہ کیا تو اس کو یہ ثابت ہوا کہ وہ حقیقت میں تاروں کا مجموعہ ہے، اور اس مجموعہ کے تارے غیر معمولی بُعد کی وجہ سے آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حتی کہ ہر تارے کا علیحدہ علیحدہ دیکھنا ہمارے لئے قطعاً متعذر رہے۔ اس کے بعد سترہویں صدی کے آخر میں سر نیوٹن نے دوربین عاکس ایجاد کی، اسی دوربین کے ڈیڑھ سو برس بعد پھر بڑی بڑی دوربینیں ایجاد کی گئیں لارڈ روس نے انھی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سے تحقیقات کی تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ سدیم، جو کوکبۂ سلاقین میں ہے۔

ایک مضبوط ٹلسکوپ سے دیکھنے پر حلزونی شکل میں کواکب متنظمہ کا ایک مجموعہ دکھائی دیتی ہے' موصوف کے اس انکشاف کے بعد سدیم کی تحقیقات کا درس منقطع ہوگیا اور جدید سدیم کے انکشاف کی بحث چھڑ گئی، اسوقت سدیم جدیدہ کا انکشاف، علماء فلکیات کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جاتا ہے، چنانچہ اسوقت تک ماہرین فن کی پیہم کوششوں سے سینکڑوں سدیم منکشف ہو چکے ہیں۔

ابھی علماء فن، سدیم کی اس کافی مقدار کا انکشاف نہ کر چکے تھے کہ خود ان میں سدیم کی حقیقت کے اندر اختلاف شروع ہوگیا، کہ کیا یہ تاروں کا کوئی مجموعہ ہے، جو اپنی غیر معمولی بُعد کے باعث بادل کی شکل میں نظر آتا ہے؟ اور پھر جب کسی قوی ٹلسکوپ سے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے تو اسکے واقعی اجزاء دکھائی دیتے ہیں؟ یا وہ ایسے غیوم (ابر) ہیں جو آس پاس کے ستاروں کی روشنی سے روشن ہیں؟ یا وہ ملتہب گیسیں ہیں جو فضا کے اندر بکھری ہوئی ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں سر ولیم ہگنز نے یہ ثابت کیا کہ :- "بعض سدیم دراصل بہت سے تاروں کا مجموعہ ہیں، لیکن غیر معمولی بعد کی وجہ سے وہ صرف چند تارے دکھائی دیتے ہیں۔ اور بعض فی الحقیقت ملتہب گیسوں کی ایک سحابی چادر ہیں، اور اُنکے خطوط نور، ان گیسوں کے خطوط کے مماثل ہیں، جو اپنی غیر معمولی حرارت کے باعث دوسری گیسوں سے ممتاز ہیں۔

وہ گیسیں، جن سے سدیم بنتے ہیں، جب حرارت اور حدت کی انتہائی درجہ پر پہونچ جاتی ہیں تو ان سے شعاعیں نکلتی ہیں ماہرین طبقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ :- سدیم میں ہیڈروجن اور ہلیوم کے عناصر بہت کافی اور کاربون اور نائٹروجن کے بہت کم ہیں، اسکے علاوہ ایک ایسا عنصر بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کا مثل عناصر ارض میں کہیں نہیں ملتا، اس جدید عنصر کا نام ماہرین فن نے نبولیم رکھا ہے۔

لیکن ہر سدیم یکساں نہیں ہے، بعض سدیم اس نور سے منور ہوتے ہیں، جو فضا کے اندر دوسرے ستاروں سے پیدا ہو کر اس پر منعکس ہوتا ہے، اور بعض سدیم چند اپنی طرف آنیوالے کواکب سے نور کا اقتباس کرتے ہیں۔ علامہ برنار امریکی نے محض تحقیقات سدیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، موصوف آج کی گھڑی تک ۱۰۰ انئی سدیموں کا سراغ لگانے میں بالکل کامیاب ہو چکے ہیں۔

جو اجرام سماویہ سدیم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک ملتہب گیسوں کے غیوم، دوسرے سدیم لولبیہ وغیرہ، اور یہ سدیمیں زیادہ تر نجوم کے چھوٹے بڑے مجموعے ہیں، جو غیر معمولی دوری کے سبب پر کالۂ ابر کی شکل میں نظر آتے ہیں،

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سدیم لولبیہ نجوم کے مجموعے ہیں اور چاروں طرف سے ہمارے آفتاب کو محیط ہیں، لیکن جب رصد و تصویر اور حل طبعی کے آلات زیادہ مکمل ہو گئے تو علماء فن کو یہ معلوم ہوا کہ سدیم اپنے غیر معمولی وسعت کے سبب ہمارے نظام شمسی کے ساتھ قیاس نہیں کی جا سکتیں، بلکہ سدیم کا ہر تارہ ہمارے مجرہ (کہکشاں) کے مانند خود ایک مستقل عالم ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ فضا کے اندر ہزار سدیم لولبیہ ہیں۔ اور ہر ایک کی وسعت ہمارے مجرہ کی وسعت کے برابر ہے۔ اور ہر سدیم الگ الگ واقع ہے، کوئی کسی کے ضمن میں نہیں ہے امریکہ کے مشہور علماء فلک ان کو عوالم جزری کے نام سے موسوم کرتے ہیں،

اس حیثیت سے بھی سدیم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو ہمارے مجرہ کے اندر داخل ہیں، دوسرے وہ جو اس سے خارج ہیں، حقیقت میں ہمارا مجرہ سدیم غازیہ اور نجوم متفرقہ کا ایک مجموعۂ عظیمہ ہے، یہ مجرہ ان سینکڑوں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو آنکھوں سے

اتے ہیں، اور ان ہزاروں کواکب پر بھی مشتمل ہے جو ٹلسکوپ (دوربین) سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان لاکھوں کواکب پر بھی مشتمل ہے
ھی فوٹوگرافی آلہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

مرصدِ مجرہ کے تمام معروف وسائلِ رصد کی وساطت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مجرّہ عدسی شکل کا ایک قرص ہے جس کے قطر کا
تقریباً ہزار برس نوری اور جس کا سمک (عرض) بیس ہزار برس نوری ہے، اور ہمارا نظام شمسی تقریباً اسی کے وسط میں واقع ہے اور
قرص کی فضا میں تقریباً ۳۰ ہزار ملین تارے مختلف مسافتوں پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن غیر معمولی دوری کی وجہ سے وہ طرّہ سحابیہ کے مانند
تے ہیں، کوکبۂ رامی اور کوکبۂ ہرقل میں اس قسم کے بادل اکثر دیکھے جاتے ہیں۔

جو سدیمین، مجرہ کے باہر ہیں، وہ اصل میں، کنار نجوم غازیہ ہیں جو مجرہ کے باہر فضا میں اسی طرح بکھری ہوئی ہیں جس طرح ناپید
دروں میں جزائر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، جن سرگرم علماء نے ان سدیم کے درس و تحقیق پر توجہ کی، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ
امریکی جبل ولسن کی رصدگاہ کا نامور عالم ہے، موصوف نے مجلّہ الاسٹرو فزکس (علم الفلک الطبیعی) میں ایک مضمون شائع کیا ہے،
میں آپ نے چار سو سدیم کے متعلق بحث کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، اس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ :-

" ان سدیموں میں بعض غیر منتظم شکل کی سدیم ہیں، یعنی ان کی کوئی خاص قیاسی شکل نہیں ہے، اور ان میں سب سے زیادہ مشہور
سدیم ہے جو غیوم مجلان کے نام سے پہچانی جاتی ہے، اور کرۂ جنوبی کے وسط میں (اتنی قریب) نظر آتی ہے۔ کہ مدراس کا دیکھنے والا بادی النظر
یہ سمجھتا ہے کہ وہ گویا "درب لبنان" کا ایک جزو ہے، حالانکہ واقع میں وہ اس سے بہت زیادہ دور ہے۔ باقی وہ سدیم جن کی ایک مخصوص شکل ہے، ان غیر منتظمۃ الشکل
یم بہت تعداد میں زیادہ ہیں۔ اور ان سدیموں کا بیشتر حصہ یا تو اہلیلجی شکل کا ہے یا لولبی شکل کا! اسپکٹرسکوپ کے ذریعہ اہلیلجی سدیم کے نور کی جو تحلیل کی
تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ ایک حد بعید تک ہمارے مجرہ کے مماثل ہے۔ اور مجرہ ہی کے مانند نجوم کا ایک مجموعہ ہے، نجوم کی فرداً فرداً تصویر کشی غیر معمولی بعد کے باعث متعذر او محال ہے
تحقیقات سے ثابت ہوا کہ بعض سدیم ما اہلیلجی شکل سے لولبی شکل کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ اور بعض سدیم لولبیہ میں مخصوص نشانات ظاہر ہو ہو کر غائب ہو جاتے ہیں، علاوہ ان سدیموں میں
رہا کرتی ہیں۔ ماہرین فن نے ان سدم کے ابعاد کا قیاس کیا تو ثابت ہوا کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کبیر کا بعد تقریباً ۹۰۰ ہزار برس نوری ہے اور وہ سدیم جو
کبۂ مثلث میں ہے وہ بھی تقریباً اتنی ہی دور ہے، علاوہ ازیں ہزاروں سدم لولبیہ ہیں جو بیسوں ہزار برس کی دوری پر واقع ہیں۔ استاذ ہبل اور استاذ جلی کی تحقیقات
یہ معلوم ہوا کہ کوکبۂ شعر برنیکی اور کوکبۂ سنبلہ کی سمت میں ایک ایسی سدیم ہے جس کا بعد ۱۰۰ ملین نوری برس سے کم نہیں ہے۔

ان فضائی سدم کی حرکت کی معرفت کے لئے اسپکٹراسکوپ کا استعمال کیا گیا تو ظاہر ہوا کہ مراۃ المسلسلہ کی سدیم ۳۰۰ کیلو میٹر فی منٹ
رفتار سے ہمارے مجرہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور اکثر سدم لولبیہ ۲۰۰۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔

ان سدموں کی جرم کی واقعی معرفت کیلئے باحثین فن نے جو طریقے ایجاد کئے ہیں، وہ اسقدر مشکل ہیں کہ اس مقام پر انکو بسط سے بیان
ا ازبس دشوار ہے اسلئے ہم انکی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن ان طریقوں کے تطبیق سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کوکبۂ مراۃ المسلسلہ کی سدیم کا جرم ہمارے
تاب کے جرم کے دو ہزار ملین گنے کے برابر ہے۔ اور یہ سدیم ۱۷ ملین برس کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی ہے۔ حالانکہ ہماری زمین ہر چوبیس
نٹہ کے بعد ایک مرتبہ گردش کرتی رہتی ہے۔

بدر اصلاحی

مطبوعاتِ موصولہ

تلاشِ حق

"مہاتما گاندھی کی آپ بیتی" جو اُنکے گجراتی اخبار اور ینگ انڈیا میں مسلسل شائع ہو چکی ہے، اسقدر مشہور چیز ہے کہ اِس کا تعارف کرانا بے معنی سی بات ہے۔ انگریزی میں اس کی اشاعت کتابی صورت میں میکملن کمپنی نے کی ہے۔ اور اب تلاشِ حق کے نام سے اس کا اُردو ترجمہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔

جس طرح اصلی کتاب تعارف کی محتاج نہیں، اسی طرح ترجمہ کے متعلق اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں کیونکہ جس پایہ کی کتاب تھی اُسی مرتبہ کا مترجم اُسے ملا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔ وہ لوگ جو مہاتما گاندھی کی سیرت، موجودہ سیاسیات کی تاریخ، اور حقگوئی کی بہترین مثال دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عہد حاضر کے سب سے بڑے انسان کے خیالات ہیں۔ قابلِ غور و مطالعہ ہیں۔

مضامینِ فرحت

مرزا فرحت اللہ بیگ ملک کے اُن انشاپردازوں میں سے ہیں، جن کے متعلق دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ ان کے مضامین میں زبان و انشاء کا لُطف ہلکے ہلکے مزاح کے ساتھ ملا ہوا اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ ہر طبقہ میں اُس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئیے۔

کتاب زیرِ تنقید ان کے مضامین کا دوسرا حصہ ہے جس میں پہلا مضمون وہی ہے جو نگار کے ظرف نمبر میں پھول والوں کی سیر پر اُنھوں نے لکھا تھا۔ اس کے بعد بارہ مضمون اور ہیں جو مختلف عنوانوں پر لکھے گئے ہیں، لیکن حکیم آغا جان عیش پر جو مقالہ تحریر ہوا ہے وہ کاوش و تحقیق اور تنقید صحیح کا سب سے پاکیزہ نمونہ ہے۔ الغرض وہ لوگ جو دہلی کی زبان اور اس کے چٹخاروں کے ساتھ ساتھ کچھ کام کی باتیں بھی سننا چاہتے ہیں، اُن کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہئیے، جو نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں خود مصنف سے ہوم ڈپارٹمنٹ حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

قدیم افسانے

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا ہے جس کا پہلا حصہ "قدیم افسانے" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس میں قدیم مصری، یونانی، رومی، ہندی، ایرانی اور عربی مختصر افسانوں کا اقتباس ہے، جسے مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے نے کیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کے ۱۲ حصے اور ہوں گے، جو مختلف حضرات کے مرتب کئے ہونگے۔ چودہواں حصہ اُردو افسانوں کا ہوگا اور

یہ بھی جناب سروری کے اقتباس کا نتیجہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کے مفید و کار آمد ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ کی اس خدمت سے زبان سے انکار کی گنجائش کہاں؟ البتہ بحث اسمیں ضرور آ کر پڑے گی کہ جن افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ حقیقتاً اس کے مستحق تھے یا نہیں اور جن کو چھوڑ دیا گیا ہے، ان میں سے کون کون انتخاب کے قابل تھے۔ لیکن اس نزاع سے اصل تجویز کی افادیت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا اور اگر اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کو پس و پیش ہو، تو کبھی کوئی کام اس قسم کا انجام نہیں پاسکتا۔ یہ کتاب ایک روپیہ میں مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

حافظ شیراز

اس کتاب میں مولوی سید یوشع بی۔ اے نے جو متوسلین دکن میں سے ہیں، حافظ کی شاعری پر خود اُس کے شعروں سے مدد لیکر تنقید کی ہے۔ یعنی اُنھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حافظ خود اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا۔ یہ مقالہ اسلوب بیان و ندرت گفتگو کے لحاظ سے اچھا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے ناقص۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اسکی تکمیل کی طرف زیادہ توجہ کیجائیگی۔ اسکو بھی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے اور قیمت ۱۲؎ ہے۔

بغاوت عرب اور لارنس

مشرق ادنیٰ کی موجودہ سیاسیات کی اہمیت سے کرنل لارنس کی مشہور ہستی کو جتنا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کرنل لارنس نے کس کس طریق پر اور کن کن تدابیر سے وہاں کی سیاسیات کا رُخ بدلا اور اُس کی ایک ہستی نے سرزمین عرب میں کیسے کیسے انقلاب برپا کئے۔ مولوی چراغ حسن صاحب حسرت نے اس کتاب شریف حسین کی بغاوت کے اسباب اور کرنل لارنس کے کارناموں سے ایسی دلچسپ اور محققانہ گفتگو کی ہے کہ مشکل ہی سے کسی ایک جگہ یہ تمام معلومات نظر آسکتی ہیں۔ اسمیں تمام وہ جاسوسیاں لارنس کی ظاہر کی ہیں جو عراق میں اسکے کین جو سقوط بغداد کا باعث ہوئیں اور آخر کار جنھوں نے ترک و عرب کے درمیان اختلاف و عناد کی آہنی دیوار قائم کر دی۔ کتاب مجلد معہ چند تصاویر کے شائع کی گئی ہے اور ایک روپیہ میں اُردو کتب خانہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

انجیل و قرآن کا مطالعہ

تکور علاقۂ بنگلور میں ایک صاحب محمد عبد اللہ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ "مثیل انبیاء بنی اسرائیل" بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب بشارت خداوندی کی بناء پر تحریر فرمائی ہے۔

اس کتاب کا موضوع اُسکے نام سے ظاہر ہے۔ اور ۸؍ میں غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

روزنامچہ مقدس

اخبار نیر اعظم مرادآباد کے ایڈیٹر و پروپرائٹر نے حال ہی میں بسلسلۂ حج زیارت و عتبات عالیات کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ اس سیر و سیاحت کے تمام حالات اُنھوں نے روزنامچہ مقدس کے نام سے شائع کئے ہیں۔ مینے اس روزنامچہ کو پڑھا اور دلچسپ و مفید پایا۔ بہت لوگوں نے اس قسم کے سفرنامے لکھے ہیں جنمیں سے بعض کو امتیازی درجہ حاصل ہوا اور یقیناً حق تلفی ہوگی اگر روزنامچہ مقدس کو انھیں امتیازی سفرناموں میں جگہ نہ دیجائے۔

یہ مقدس کتاب عہ میں دفتر نیر اعظم مرادآباد سے مل سکتی ہے۔

دنیا کی حور جناب کوثر چاند پوری کا ایک افسانہ ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۹۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اسکا موضوع معاشری اصلاح ہے اور مجھے دیکھکر مسرت ہوئی کہ جناب کوثر اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، زبان صاف و سلیس، پلاٹ دلکش اور اسلوب بیان اچھا ہے۔ قیمت دس آنے۔ ملنے کا پتہ جناب حکیم کوثر چاند پوری۔ بیگم گنج۔ ریاست بھوپال۔

پیمانۂ محبت جناب ہمدم کے مجموعۂ غزلیات پر شاید اس سے پہلے نگار میں ذکر آچکا ہے۔ یہ تصنیف بھی آپ ہی کی ہے جسمیں غالب کی چند غزلوں کی تضمین کی ہے اور کچھ غزلیں اور رباعیاں اپنی بھی آخر میں شامل کر دی ہیں۔ جناب ہمدم کا ذوق تغزل پاکیزہ ہے اور اُن کی شاعری کا عنصر غالب جذبات نگاری ہے۔ یہ پیمانہ ایک روپیہ میں دفتر اخبار ملت کے کراچی سے ملسکتا ہے جسکی ادارت آجکل جناب ہمدم ہی کے ہاتھ میں ہے۔

باب الانعام مولوی انعام الرحمٰن صاحب سہارنپوری نے ایک رسالہ اس نام سے لکھا ہے جسمیں بعض اخلاقی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسمیں سفید بال اُکھاڑنے اور ازار کا پائنچہ دراز رکھنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ رسالہ اسی قدیم مولوی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اخلاق کو صرف نظریہ کی حد تک رائج کرنا چاہتی ہے اور کام کی باتوں سے زیادہ بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند کرتی ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۱۰؍ رکھی ہے۔ جو بہت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ۔ پیرجی انعام الرحمٰن کٹرہ دینا بیگ خاں بازار لال کنواں دہلی ہے۔

تعلیم الرحمان یہ بھی جناب انعام الرحمٰن صاحب تالیف ہے۔ جسے باب الانعام کا دوسرا حصہ کہنا چاہئے۔ اسمیں بھی معمولی مسائل درج ہیں اور وہی انداز بیان ہے جو کسی وقت کیمیائے سعادت سے شروع ہوا تھا اور بعد کو عملنامے تو زنامہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی قیمت اور زیادہ۔ یعنی ۱۲؍ رکھی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ وہی ہے۔

الجہاد فی الاسلام مولوی ابو الاعلےٰ صاحب مودودی۔ اعزازی رکن دارالمصنفین اس کتاب کے مصنف ہیں۔ متفقہ طور پر سبنے اس کتاب کو اسکے موضوع کے لحاظ سے بہت جامع و مکمل تصنیف قرار دیا ہے۔

جہاد تاریخ اسلام کا نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے اور مخالفین نے جس جس رنگ سے اسکو پیش کیا ہے۔ وہ بھی اہل نظر سے مخفی نہیں۔ لیکن مولوی ابو الاعلےٰ صاحب نے اس کتاب میں تاریخ و مذہب، اقتصاد و معاشرت، نفسیات و سیاسیات ہر لحاظ سے نہایت مکمل بحث اس موضوع پر کی ہے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ پر ایسی جامع تصنیف اردو کیا معنے کسی اور زبان میں بھی نہ تھی۔ یہ کتاب شاید دو روپیہ میں مولوی ابو الخیر صاحب مودودی رکن دار الترجمہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

ڈراما ضحاک پنجاب اردو اکاڈیمی کی پہلی کتاب ہے، جسے ملک کے مشہور ادیب اختر شیرانی نے اردو منتقل کیا ہے۔ میں نے جا بجا سے اسکو دیکھا اور ترجمہ کو بہت شگفتہ و دلچسپ پایا۔ یہ اکاڈیمی میاں محمد اسلم خاں صاحب ایم۔ اے (کنٹب)، بیرسٹرایٹ لا کی نگرانی میں قائم کی گئی ہے، جو رائل سوسائٹی آف آرٹس کے فیلو بھی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے فاضل شخص کی نگرانی میں جو یورپ کی کئی زبانوں کا ماہر ہے اکاڈیمی قابل قدر خدمات انجام دے گی۔

اس کتاب کا حجم ۱۸۲ صفحات کا ہے۔ طباعت کتابت معمولی ہے۔ اور قیمت عہ مقرر کی گئی ہے۔

حسیات

(اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی)

کر گئی مست ہوائے سحر و شام مجھے
ہو گیا رنگِ شفق بادۂ گلفام مجھے

خواہشِ حور نے زاہد کو کہیں کا نہ رکھا
لے گئی تا لبِ کوثر طلبِ جام مجھے

ہے قیامت میں یہ خورشید قیامت کا طلوع
یا کوئی دیکھنے آیا ہے لبِ بام مجھے،

مثلِ سیماب سکوں ہی مری فطرت میں نہیں
تم بھی چاہو تو میسر نہ ہو آرام مجھے،

ہو گیا باغ کا ہر ذرہ شناسائے رموز
ہر کلی دینے لگی ہے ترا پیغام مجھے

ان کے الطاف نے تو اور بھی بیتاب کیا
ہو گئے وصل کے دن ہجر کے ایام مجھے،

صورتِ نخلِ ارم قامتِ سرکش ہے نظیر
موجِ تسنیم ہے آبِ دمِ صمصام مجھے،

بیانِ حسن

(کوکب شاہجہاں پوری)

دل نے اگر کیا کبھی حوصلۂ بیانِ حسن
شعلۂ آہ بن گیا سرخیٔ داستانِ حسن

سجدۂ شیخ خود نما موجبِ داغِ ناصیہ
نقشِ سجودِ عشق ہے زینتِ آستانِ حسن

جرأتِ دل کا راز ہے ہمتِ عشق میں نہاں
ورنہ کہاں میں خستہ جاں لائقِ امتحانِ حسن

دیر و حرم کے شوق میں محو ہیں شیخ و برہمن
میری جبینِ عشق ہے اور ہے آستانِ حسن

عشق کے سارے حوصلے ختم ہوئے اک آہ پر
تیرِ قضا سے کم نہ تھا غمزۂ جاں ستانِ حسن

بہرِ نظارہ چاہیے چشم حقیقت آشنا
خاک کے ذرہ ذرہ سے جلوہ نما ہے شانِ حسن

پوچھیے مستِ عشق سے کیفیتِ مئے الست
عالمِ عقل و ہوش میں کون ہے رازدانِ حسن

سوز و گدازِ عشق بھی کتنا کرشمہ ساز ہے
ذرۂ خاک بن گیا کوکبِ آسمانِ حسن،

رباعیات آسی

گو دورِ سرور و خرمی ہے ساقی فانی ہے خوشی تو کیا خوشی ہے ساقی
جس جام سے تو پلا رہا ہے مجھ کو جانے کتنوں نے اس سے پی ہے ساقی

رونے پہ کہیں نہ چشم حیرت آ جائے سامان قرار پہ نہ آفت آ جائے
فردا پہ نہ رکھیئے اپنے دیدار کی شرط ممکن ہے کہ آج ہی قیامت آ جائے

چھوڑی ہوئی خو کو چھوڑتا ہوں میں ابھی ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑتا ہوں میں ابھی
پیمانہ مری طرف بڑھا دے ساقی پیمانۂ صبر توڑتا ہوں میں ابھی

اے واعظِ خوش بیان مجھے تنگ نہ کر باتوں کا ترے نہیں مگر دل پہ اثر
آئیوالا نہ کوئی جانے والا پھر کس سے سُنی بہشت و دوزخ کی خبر

اس سمت ہے کعبہ اسطرف ہے مندر تسبیح اِدھر ہے اور زنار اُدھر
اے بیخبر مآل سیرِ ہستی جانا ہے کسی طرف تو جا دیر نہ کر

بیکار ہیں واعظوں کی یہ سب باتیں ہیں مکر و فریب کی یہ ساری گھاتیں
روزِ محشر کا خوف کیا ہے آسی ایسی تو گزار دیں ہیں لاکھوں راتیں

وہ دولت و مرتبت کہاں سے آئے وہ ثروت و مقدرت کہاں سے آئے
دیدے شراب ؟ بجا ہے مگر پیمانۂ معرفت کہاں سے آئے

آسی

غزلیات

(احمد علی خاں شاد عارفی رامپوری)

حسن جتنا تجھے ذوقِ ستم آرائی دے
عشق اُتنا ہی مجھے درسِ شکیبائی دے

مطمئن ہو کے میں انجامِ محبت سوچوں
ہاں اگر دردِ جگر رُخصتِ تنہائی دے

نہ یہ مطلب ہے کہ ہو قدرِ نیازِ اُلفت
نہ یہ منشا ہے کوئی اجرِ جبیں سائی دے

دل کو عنوانِ محبت پہ تصدق کر کے
اور کیا نذر تجھے تیرا تمنائی دے

یہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کعبہ ہے یہ دیر
ان میں تو مجھکو نظر آئے وہ بینائی دے

قتل میرا تجھے آسان ہے لیکن قاتل
تیری شہرت نہ تجھے مژدۂ رُسوائی دے

لُطف یہ ہے نہ کسی کا وہ شناسا نکلے
ذرہ ذرہ جسے پیغامِ شناسائی دے

شاد بے شبہ میں اُس آنکھ کا دیوانہ ہوں
جان جب آنکھ پہ ہر آہوئے صحرائی دے

طور پر جلوہ دکھایا بُت کدہ میں دِل مجھے
مدعا یہ ہے کہیں تسکین ہو حاصل مجھے

آبلہ پائی نہ دے ایسے میں تکلیفِ قیام
وقت کم ہے اور جانا ہے کئی منزل مجھے

چاہتا ہوں اور نہیں پاتا سُکونِ اضطراب
ڈھونڈھتا ہوں اور نہیں ملتا نشاطِ دل مجھے

اے نگاہِ یاس تو ہی ترجمانِ درد بن
کہہ رہے ہیں وہ سُناؤ داستانِ دل مجھے

میں تمہارے سنگِ در کو چھوڑنے والا نہ تھا
تم نے کب سمجھا کسی لائق کسی قابل مجھے

اور بڑھتی جا رہی ہے ہمت مشکل پسند
ہاں سُناؤ داستانِ دوریٔ منزل مجھے

دیکھتا ہوں جب کہیں بھی گرمئ بزمِ نشاط
یاد آجاتا ہے وہ ہنگامۂ محفل مجھے

شاد یہ مشق تصور نے صفائی قلب کی
صاف آتا ہے نظر اس بُت کا اک اک تل مجھے

غزلیات

عشق رامپوری

وہ تو اپنی پرسشِ تیغِ نظر دیکھا کئے
کون کہتا ہے مرا زخمِ جگر دیکھا کئے

سامنے اونکے نہ آیا کچھ ہمیں بنکر جواب
اُن کا منہ حیرت سے ہر ہر بات پر دیکھا کئے

اونکو نخوت بھی ادھر لب بند رعبِ حسن ست
وہ ہماری اور ہم اونکی نظر دیکھا کئے

اب سرِ محفل نہیں معلوم کس امید پر
چُپکے چُپکے ہم نگاہِ فتنہ گر دیکھا کئے

جھوٹ ہی سے کچھ قرارِ دل ہوا اس امید پر
ہم فریبِ گفتگوئے نامہ بر دیکھا کئے

وقتِ آخر یاس کی تصویر تھا بیمارِ غم
دم بخود بیٹھے ہوئے سب چارہ گر دیکھا کئے

عشق کیا امید وعدہ تھی کہ جسپر رات بھر
ٹکٹکی باندھے ہوئے ہم سوئے در دیکھا کئے

شاد صابری

سعیِ لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں
وائے بدبختی کہ علم دورئ منزل نہیں

ذوقِ بیتابی کے قابل کوئی اہلِ دل نہیں
دل بہت لیکن کسی میں جذبہ کامل نہیں

جلوۂ تاباں کا اک موہوم سا خاکہ ہو نہیں
جلوہ گر مجھ میں نقوشِ ہستیٔ باطل نہیں

پوچھتی ہیں عشق سے اکثر مری مایوسیاں
اے تموجِ خیز دریا، کیا ترا ساحل نہیں

جستجوئے منزلِ مقصود میں ہوں گامزن
ہمسفر تو جسکو سمجھا وہ مری منزل نہیں

حسن میں موجود ہے پیرایۂ دلبستگی
قابلِ عنواں مگر ارمانِ اہلِ دل نہیں

ہر تموجِ دامنِ ساحل نظر آیا مجھے
جب ہوا ظاہر کہ بحرِ عشق کا ساحل نہیں

منزلِ مقصود ہے ہر منزلِ راہِ طلب
دامنِ رہبر پہ داغِ حسرتِ منزل نہیں

ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق — واقفِ معنی نہیں جو آپ سے غافل نہیں

شاد تھک کر بیٹھنے کا قصد جب میں نے کیا
شوق نے بڑھ کر ندا دی یہ مری منزل نہیں

خلیق فیض آبادی

دلِ بیتاب مدت سے رہینِ یاسِ حرماں تھا — خبر کیا تھی انھیں پردوں میں تو بھی آکے پنہاں تھا
غلط سمجھا تھا میں تیرِ نگاہِ ناز کو قاتل — مجھے بسمل کیا جس نے وہ خود میرا ہی ارماں تھا
نگاہیں جھک گئیں اُن کی جو میری عرضِ حسرت پر — مجھے محسوس ہوتا تھا کہ گویا میں پشیماں تھا

خلیق غمزدہ کو چھیڑ کر کیا پا گیا ظالم!
کہ وہ ہر رنگ میں خود ہی مثالِ شمعِ سوزاں تھا

جگر بسوانی

جب میں کہتا ہوں نہیں مجھ پہ عنایت تیری — یہ صدا کان میں آتی ہے کہ قسمت تیری
ہم کو دھوکا یہی ہوتا ہے کہ بیدار ہیں ہم — دیکھتے ہیں جو کبھی خواب میں صورت تیری
دوست کا دوست ہے کیوں ہم اُسے دشمن سمجھیں — آج کل جس پہ زیادہ ہے عنایت تیری
دیکھ لے تجھکو تو جینا ہو خوشی سے دشوار — جسکی آنکھوں میں پھرا کرتی ہو صورت تیری
دل پہ بڑھتے گئے جتنے ستم و جور و جفا — دل میں بڑھتی گئی اتنی ہی محبت تیری
سامنا ہو گیا جب ہوش ہوئے گم اپنے — ہم نے جی بھر کے نہ دیکھی کبھی صورت تیری
دل خمِ زلف میں ہے یا تری مٹھی میں ہے — کچھ بتاتی نہیں چتون کی شرارت تیری
ہم کو ہر نقش میں تیرا ہی نشاں ملتا ہے — شکل کوئی ہو نظر آتی ہے صورت تیری
آخری آہ نے افشا کیا رازِ اُلفت — عمر بھر ہم نے چھپائی تھی محبت تیری
اپنے بیمار سے وہ پوچھ رہے ہیں ہنس کر — آج کیا حال ہے کیسی ہے طبیعت تیری
دلِ بیتاب شبِ غم ہو تیری عمر دراز — اب رفاقت مری تو کر میں رفاقت تیری

وہ یہاں توبہ کا جگر میکدے والوں میں کہاں
ایک چلو میں بدل جاتی ہے نیت تیری

باسط بسوانی

دمِ آخر تجھے اے رشکِ مسیحا دیکھا
دیکھا بیمارِ محبت نے مگر کیا دیکھا

جان پر کھیل کے پھر آنکھ لڑائی تم سے
تم نے آئے ہوئے دل کا یہ تقاضا دیکھا

کنجِ زنداں میں خبر موسمِ گل کی پاکر
ہم نے حسرت سے بہت جانبِ صحرا دیکھا

کام آتا نہیں ہنگامِ مصیبت کوئی
اُس نے منھ پھیر لیا جسکو شناسا دیکھا

جانبِ در بھی نظر۔ جان حزیں ہونٹوں پر
مرنیوالے نے بہت آپ کا رستہ دیکھا

آپ سے کیا کہیں۔ کچھ یاد ہے کچھ بھول گئے
خواب تھا۔ عہدِ جوانی بھی۔ اُسے کیا دیکھا

قیس و فرہاد ہوں یا وامق و باسط کوئی
کوچۂ عشق میں دیکھا جسے رسوا دیکھا

کیا آپ کو معلوم ہی کہ

ترجمہ تاریخ ادب اُردو

چھپ کر تیار ہوگیا جس سے زیادہ مکمل اور جامع زبان اُردو کی کوئی تاریخ نہیں۔ تمام مشاہیر نظم و نثر کے تذکرے اونکے کلام کے نمونے اور تقریباً کے قریب مشہور ادیبوں کی تصاویر مع ایک زبردست انڈکس کے اس میں شامل ہیں۔ بہت ضخیم ہے۔ دو حصہ مجلد نہایت خوشخط چھپائی و کاغذ نہایت دیدہ زیب قیمت (لعہ) مترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔

تذکرۃ الخواتین تمام شاعرہ عورتوں کی نہایت مختصر سوانحعمری اونکا کلام۔ حالات۔ ایرانی اور ہندوستانی دونوں جگہ کی صنف نازک کے کلام کا بے مثل اور لاجواب مجموعہ۔ اس سے زیادہ مواد اس بارہ میں کسی تذکرہ نسواں میں نہ ملیگا۔ مولفہ مصور درد مولوی عبدالباری صاحب آسی قیمت عہ چھپائی و کاغذ نہایت عمدہ۔

مذاہب الاسلام عجیب و غریب کتاب ہے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ یعنی اسلام میں جتنے مذہب اور جتنے فرقے اور جس فرقے کے جو عقیدے اور رسمیں ہیں جس فرقے کا جو بانی ہوا ہے۔ وہ سب اس میں نہایت واضح طور پر درج کئے ہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی ایک صفحہ پڑھ کر بغیر ختم کئے کتاب کو چھوڑ دے۔ قیمت (للعہ)

دیوان خواجہ میر درد خواجہ میر درد کا درد و اثر بھرا کلام نہایت خوشخط مع اعلےٰ رنگین خوشنما ٹائٹل کے اس میں ایک مقدمہ مولانا عبدالباری آسی کا شامل ہے جو حقیقتاً ایک لطیف اضافہ ہے اوس میں خواجہ صاحب کے شاگردوں کے حالات و کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت (۱۲ر)

دیوان خواجہ آتش اس مرتبہ اس دیوان کو نہایت عمدہ کاغذ پر بعد صحت و صفائی کے بعد چھاپا گیا ہو۔ قیمت عہ
دیوان ذوق ۱۲ر دیوان غالب مع اضافہ کلام جدید ۱ہر کلیات ناسخ [illegible]

مینجر نولکشور پریس صیغہ بکڈپو لکھنؤ

بسم اللہ

اعلانات صفحہ ۷ نگار وصفحہ ۱ ملاحظہ ہو

جلد ۱۸ فہرست مضامین ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء شمارہ (۶)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ء شمار (۶)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہم ہندوستانی اکاڈیمی کے "تاہی رسالہ" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اردو کی خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ زبان

سادگی پر جسکے مٹ جانیکی حسرت دلمیں ہے

بعض ناحق کوش اور رمز نا شناس حضرات کی دوستی سے کس قدر خطرہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو اکاڈیمی کے وجود اور اُس کے برکات سے بھی بحث کیجائے گی۔ ہرچند ہم اس وعدہ کی تکمیل کے لئے ابھی تیار نہیں، لیکن چونکہ اکاڈیمی کی گزشتہ سہ سالہ یا آستالہ رپورٹ (انگریزی میں) شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہونچ گئی ہے، اس لئے ضمناً و ایجازاً ایک سرسری نگاہ اس پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

یہ رپورٹ اوسط تقطیع کے ۱۲ صفحات پر شائع ہوئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ ایک ناواقف الحال شخص اسکو دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے وہ وہی ہے۔ جو اکاڈیمی کے ارباب نظم ونسق دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں، لیکن ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنیوالے کو زیادہ مستحق مبارکباد سمجھتے، اگر وہ اس کی ترتیب کو "خلوتیان راز" کے لئے بھی محل تنقید و نظر ہونے سے محفوظ رکھ سکتا۔

اس رپورٹ کا تقریباً نصف حصہ تو اس بیان پر مشتمل ہے کہ اکاڈیمی کا وجود کیونکر عمل میں آیا، صوبہ کی حکومت نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا، کون کون ممبر نامزد ہوئے، لائحہ عمل کیا مرتب کیا گیا، کتنے جلسے ہوئے ان میں کیسی کیسی شاندار اور وزنی تجویزیں پیش ہوئیں، وغیرہ وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جہاں تک الفاظ و ترتیب الفاظ کا تعلق ہے یا جس حد تک اغراض مقاصد کا بیان ہو سکتا ہے، اس حصہ میں ایک جگہ بھی حذف و اضافہ یا ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے بعد کا حصہ جس میں واقعات و عمل، اعداد و شمار کا بیان ہے، ہم کو بعض بعض مقامات میں کچھ ایسے خلا ضرور نظر آتے ہیں جہاں نگاہ پہونچکر خود بخود رک جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تفصیل سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔

میں اسوقت رپورٹ کے اس حصہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا جسکا تعلق تجربۂ ماضی سے ہے اور نہ ان بعض کمیٹیوں کے اندرونی تار و پود کا ذکر کروں گا جنھوں نے بعض بالکل غیر مستحق کتابوں کو انعام دینے کے لئے حد درجہ جابجدستی سے کام لیا، بلکہ صرف یہ دیکھوں گا کہ آئندہ جو کچھ وہاں ہونیوالا ہے، اس سے اردو زبان یا اردو کے اہل قلم حضرات کو کسقدر فائدہ پہونچنے کی توقع کیجاتی ہے

اکاڈیمی کے ممبر ہونیکی حیثیت سے میرا تین سال کا گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ محض پانسو روپیہ انعام کی توقع پر کوئی اچھی کتاب جو اکاڈیمی کے شایان شان ہو، نہ کبھی مرتب کیجا سکتی ہے اور نہ حصول انعام کے لئے پیش ہو سکتی ہے۔ اس کا سبب خواہ زر انعام کی کمی ہو یا کچھ اور بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس سے غالباً اکاڈیمی کے دیگر ممبران اور صدر و سکرٹیری کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ہندی کے شعبہ میں یہ شکایت محسوس نہ کیجاتی ہو لیکن شعبۂ اردو کا تو یہ ایک تجربہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کامیابی کی صورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اکاڈیمی خود ایک شعبۂ تصنیف و تراجم قائم کرے یا ایسے لوگوں سے جو حقیقی معنے میں اس کے اہل ہیں معقول معاوضہ دیکر منتخب کتابیں ترجمہ کرائے یا خاص خاص موضوع کی تصانیف حاصل کرے۔

رپورٹ زیر بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور ترجمہ و تالیف کے لئے بعض حضرات کا انتخاب بھی عمل میں آیا ہے، لیکن کس حسن تدبیر کے ساتھ، کس اصول تقسیم کی بناء پر اور کس لطف و مصلحت کوشی کو لئے ہوئے؟ اس کا ذکر غالب عرصہ ہوا اس طرح کر گیا ہے کہ

دہر بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبت من
ہمی نماید و در انجمن فسردہ ریزد

سب سے پہلے مجھے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ ترجمہ کے لئے صرف انگریزی زبان کی کتابوں، اور ان میں بھی گالسوردی کے ڈراموں کو کیوں پسند کیا گیا۔ کیا اردو یا ہندی زبان کی ترقی کی بنیاد صرف ڈراموں ہی سے استوار ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف انگریزی کے عہد حاضر کے ڈراموں سے۔

اگر غیر زبانوں کی ادبیات ہی سے اردو یا ہندی کی نجات ممکن ہے اور وہ ادبیات سنسکرت و عربی میں نہیں پائے جاتے یا جو کچھ ان سے لینا تھا وہ لیا جا چکا ہے، تو میں دریافت کروں گا کہ فرانسیسی زبان کے تمثیل نگاروں میں سے کیورسے (Curel) برنشائن (Bernstein) اور ٹرسٹا برنارڈ (Tristan Bernard) کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اطالوی ڈرامہ نویسوں میں سے ڈانٹزیو (D'Annunzio) کی طرف کیوں توجہ مائل نہ ہوئی، کیا لطافت خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے کوئی دوسری نظیر ایسی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر آپ دور حاضر کے کچھ زمانہ قبل چلے جائیں تو کیا روسی لٹریچر میں سے پشکن (Pushkin) کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا جو فن ڈرامہ نگاری میں اپنا ہمسر نہ رکھتا تھا یا اس کے بعد داستفسکی (Dostoievsky) تورگنیف (Turgeniev) طالسطائی (Tolstoy) چیکف (Chekhov) اور گورکی (Gorky) کو نظر انداز کر سکتے ہیں جنہوں نے واقعہ نگاری کی دنیا میں ایک الہامی انقلاب پیدا کر دیا اور جن کے مقابل مغربی ممالک میں کوئی ملک لٹریچر میں واقعیت (Realism) پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بہرحال میں اصولاً اس کا مخالف ہوں کہ اردو یا ہندی میں سب سے پہلے غیر زبانوں کے ادبیات منتقل ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کم از کم اردو کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبیات میں وہ اس قدر فروتر نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے اور اگر کوئی کمی بھی ہے تو چنداں قابل لحاظ نہیں۔ کیونکہ اسوقت ضرورت اس کو علمی زبان بنانے کی ہے۔ اور جو روپیہ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے ترجمہ میں بیکار صرف کیا جاتا ہے اسے زیادہ کام کی باتوں میں صرف ہونا چاہئے۔

اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے چار منتخب ڈراموں میں سے تین ڈرامے اردو ترجمہ کے لئے منشی دیا نرائن نگم کے سپرد کئے گئے ہیں اور ایک جگت موہن لال صاحب رواں کو مرحمت ہوا ہے۔ اگر مترجموں کا یہ انتخاب صرف اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں، تو ہم حیران ہیں کہ ان دونوں حضرات میں وہ کونسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستان کی ۷ کروڑ مسلمان آبادی میں سے کسی میں نظر نہیں آتیں۔ اگر کسی اردو رسالہ کا اتنی مدت تک نکالتے رہنا کہ اس کا جوبلی نمبر شائع ہو سکے، کافی اہلیت گالسوردی کے ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کی پیدا کر سکتا ہے یا نظموں کا ایک دیوان شائع کر دینا بڑا استحقاق گالسوردی کے ساتھ اردو میں انصاف کرنے کا قرار دیا جا سکتا ہے تو منشی دیا نرائن نگم اور جگت موہن لال رواں سے باندازہ دو جوبلی و بہ مقیاس چار دواوین زیادہ مستحق حضرات مسلمانوں میں بھی نکل سکتے تھے، اگر ادنیٰ سعی و کاوش سے کاوش سے کام لیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اردو کی خدمت کے لئے کوئی ایک شخص بھی اکاڈیمی کے ارباب نظم و نسق کو مسلمانوں میں ایسا نظر نہ آیا جو گالسوردی کے ترجمہ کرنے کا اہل ہوتا۔ معلوم نہیں اس مسئلہ میں ہم کو اپنے یہاں افراد قابل کے فقدان پر ماتم کرنا چاہئے، یا اس ذہنیت کی داد دینا چاہئے جو آنکھوں میں خاک جھونکنے کی حد تک بھی اپنی عصبیت کی سکون بخشی کی تدابیر سے کبھی شرم نہیں کرتی۔

یقیناً مسٹر دیا نرائن نگم ایک اُردو رسالہ کے اڈیٹر ہیں اور اگر زمانہ کے گزشتہ چند سال کے لٹریچر کو نظر انداز کر دیا جائے جو فی المعنی ہندو معاشرت و تاریخ، ہندو تہذیب و سیاست ہی کی تبلیغ و خدمت میں شمار کیا جائے گا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک حد تک اُردو کی کچھ خدمت بھی انجام دی ہے، اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ منشی جگت موہن لال رواں کا مجموعۂ نظم بہت پاکیزہ چیز ہے، لیکن ان حضرات کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اکاڈیمی رسالۂ زمانہ کی مستقل امداد کر دیتی یا رواں صاحب کو اُنکے دیوان پر اسی طرح انعام دیدیتی، جس طرح صفی کی مثنوی اور عروج کے مرثیہ کو دیا گیا ہے، لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ ڈراموں کا ترجمہ اُن کے سپرد کر کے غریب گالسورذی اور اُردو دونوں کو کشمکش میں مبتلا کیا جاتا۔

جیسا کہ میں گزشتہ ماہ کے رسالہ میں عرض کر چکا ہوں، اُردو زبان میں مہارت تامہ یا بصیرت کاملہ ہندوؤں میں کسی طرح پیدا ہو ہی نہیں سکتی، جس طرح ایک مسلمان ہندی زبان میں کبھی اس کے ماہر ہونے کا دعوٰے نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُردو زبان پر اسی شخص کو پورا عبور حاصل ہو سکتا ہے جو عربی فارسی کا "قدر ضرورت" سے زیادہ مطالعہ کر چکا ہو، جس طرح ہندی کے صاحب نظر ہونے کے لئے سنسکرت یا ہندی بھاشا کا علم ضروری ہے۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم رہی ہندوؤں کو یا تو مجبوراً یا اس ذوق کے لحاظ سے جو عام طور پر اسوقت پیدا ہو گیا تھا، فارسی حاصل کرنا پڑتی تھی، کیونکہ دربار و دفتر کی وہی زبان تھی لیکن جس زمانہ میں اُردو کا رواج ہوا وہ دور حکومت برطانیہ کے آغاز کا تھا۔ جب اُردو سے زیادہ انگریزی جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جنہوں نے فارسی و عربی کا مطالعہ بقدر ضرورت محض مجبوری کی بناء پر کیا تھا۔ اب انگریزی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کچھ عرصہ میں فارسی عربی کا تھوڑا بہت ذوق جو ان میں چلا آرہا تھا رفتہ رفتہ فنا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجبوری میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا پڑا۔ اور اُن کو بھی انگریزی کی طرف مائل ہونا ضروری ہو گیا، لیکن وہ عربی فارسی سے نابلد نہ رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا مذہبی، تاریخی، قومی، معاشرتی، اخلاقی و ادبی لٹریچر سب انھیں زبانوں میں تھا اور سب سے پہلے حروف شناسی کے بعد ہی جو کتابیں اُنکے سامنے رکھی جاتی تھیں، وہ عربی فارسی کی ہوتی تھیں۔ بلکہ اِس وقت تک اکثر خاندانوں میں یہی رواج چلا آتا ہے

اس لئے وہ شخص جس نے اُردو زبان کا کچھ بھی غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے جاننے کا مدعی وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف عربی فارسی کا جاننے والا ہو۔ بلکہ اُس کے اندر ایک صحیح ذوق ان زبانوں کا پایا جاتا ہو اور وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیت سے اس فرق کو سمجھ سکتا ہو جو بہ ادنے تغیر اعراب و لہجہ ایک لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اسی لفظ تماہی کو لے لیجئے۔ جو اصطلاح اُردو کے سلسلہ میں اکاڈیمی کی سب سے پہلی اُپج ہے۔ ان لوگوں نے سہ ماہی میں سے لفظ سہ کا ترجمہ بالاختصار ت یا تے تو کر دیا لیکن غریب یہ نہ سمجھ سکے کہ اُردو زبان میں سہ ماہی اور تماہی دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیئے۔ اُردو میں چھ ماہی کا استعمال ہوتا ہے، لیکن صرف اُن مراسم کے لئے جو ایک

شخص کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ادا کئے جاتے ہیں۔ کبھی یہ لفظ اس مفہوم سے ہٹکر استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے ؎

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی کی
میری چھ ماہی سال میں دو بار

اس لئے اگر تماہی کا استعمال ہو سکتا ہے (حالانکہ اسوقت تک کہیں نہیں دیکھا گیا) تو اسی قسم کے مفہوم میں جو چھ ماہی کا ہے۔ اور قیاس کی بناء پر وہی مفہوم اس کا متعین ہو سکتا ہے۔ پس اسی سے اندازہ کیجئے کہ محض ذرا سی ناواقفیت زبان کی وجہ سے اکاڈیمی کے "تماہی رسالہ" کا مفہوم کس قدر مضحک۔ مہمل (اور شاید "شگون بد" بھی) ہو کر رہ گیا۔

یہی سبب ہے کہ آج ہندوؤں میں بہتر سے بہتر اردو نظم و نثر لکھنے والا ایسا نہیں ہے جس کی تحریروں میں زبان، محاورہ و لغت کی غلطیاں نہ پائی جائیں، چہ جائیکہ منشی دیا نرائن نگم یا جگت موہن لال صاحب کہ ان بیچاروں نے تو کبھی اپنی زباندانی یا قدرت انشاء کا دعوے بھی نہیں کیا، اور نہ حقیقتاً اُن کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی کارنامہ موجود ہے، جو انھیں کسی تاویل بعید ہی کے بعد کسی اُردو ترجمہ یا تالیف کا مستحق قرار دے سکے انتخاب کرنیوالی کمیٹی کی جسارت پر اتنی حیرت نہیں ہے۔ جس قدر خود ان حضرات کے "تسلیم و رضا" پر۔ اگر ان کا نام بغیر ان کی خواہش و تمنا کے اس خدمت کے لئے تجویز کیا گیا تھا تو خود اُن کو اپنی اہلیت دیکھ کر اس سے انکار کر دینا چاہئے تھا۔ کیونکہ اُردو سے عدم واقفیت کسی ناقابلیت کا اظہار تو ہے نہیں کہ اس کو گوارا نہ کیا جا سکے۔ اور اگر ہو تو بھی کیا ایسی ناقابلیت باعث فخر نہیں، جس میں لارڈ اروِن، وزیر ہند، بلکہ خود ملک معظم برابر کے شریک ہیں۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے ڈراما (Skin game) کا اردو ترجمہ جو منشی جگت موہن لال صاحب نے کیا ہے، شائع ہو گیا ہے۔ لیکن اسوقت تک غالباً ریویو کے لئے کہیں نہیں بھیجا گیا اگر کسی وقت مجھے مل گیا تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکوں گا۔

رپورٹ زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکاڈیمی نے حسب ذیل علوم و فنون کی تصانیف کا بھی اہتمام کیا ہے:۔

(۱) فلکیات Astronomy — (۲) جغرافیہ طبعی Physical Geography
(۳) ارتقاء Evolution — (۴) برقیات Electricity
(۵) اجتماعیات Sociology — (۶) اکتشافات علمیہ عصریہ Modern Scientific discoveries
(۷) حیات اجتماعیہ حیوانیہ Social life in animals
(۸) ماکولات Food.
(۹) فلاحت البساتین Horticulture — (۱۰) اجمالیات حکیہ Outlines of Science
(۱۱) فلاحت Agriculture

ان گیارہ علوم میں سے صرف چار (۵ و ۶ و ۸ و ۱۱) پر چار کتابیں اُردو کے لئے تجویز ہوئی ہیں

اور سات ہندی کے لئے۔ اس تقسیم و عدم توازن کے لئے اگر کوئی سبب موجود تھا تو اس کو ظاہر کرنا چاہئے تھا۔ کیا جن علوم پر اُردو کتابیں تصنیف نہیں کرائی جا رہی ہیں، وہ اُردو میں پہلے سے موجود ہیں۔ اور کیا جن علوم پر ہندی کی تصانیف پیش نظر ہیں۔ وہ ہندی میں پہلے نہیں پائے جاتے تھے؟

اسی کے ساتھ مصنفین کے نام کو چھپایا گیا ہے، حالانکہ ضرورت اظہار کی تھی تاکہ ان کی اہلیت کے لحاظ سے ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا۔ اگر یہ اخفا اتفاقی فروگذاشت نہیں ہے، تو اردو کے ارباب علم و فضل کو مطمئن رہنا چاہئے، کہ ان میں سے کسی کو ان علوم پر کسی تصنیف مرتب کرنے کی زحمت نہیں دیجائیگی۔

علاوہ متذکرہ بالا علوم و فنون کے اور مباحث پر بھی اکاڈمی کے ممبران نے تصانیف مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کے لئے جو فہرست مصنفین و مؤلفین کی مرتب ہوئی ہے وہ بھی اکاڈمی کا راز ہے جس کا اظہار رپورٹ میں نہیں کیا گیا۔

حالانکہ اس کا اظہار کم از کم اس خیال سے ضروری تھا کہ لوگ اس کو ضمیر کی عدم جرأت یا اخلاقی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

ان مباحث میں سے افراد تاریخ ہند کے سلسلہ میں (تین ہندوؤں کے مقابلہ میں) صرف ایک محمد تغلق مسلمانوں میں قابل ذکر سمجھا گیا ہے، اسی طرح لٹریچر میں چار ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف دو (غالب و انیس) کو لیا گیا ہے۔ اور ابطال اقوام عالم میں سے صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کو۔ اس کے علاوہ تاریخ و فلسفہ وغیرہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔

میں حیران ہوں کہ وہ کون سے (Members of the Academy) تھے، اور وہ (other Scholars) کس گوش و ہوش کے تھے، جنھوں نے نہ صرف انتخاب علوم بلکہ اُن کے ماتحت انتخاب مباحث میں اس قدر بے اصولی، پریشاں خیالی، غیر موزونی اور محاورۂ عوام میں "بے تکے پن" سے کام لیا۔

سنہ ۲۹-۳۰ میں اکاڈمی نے صرف ایک مسودہ "ویلی کرسان رکمنی ری" اشاعت کے لئے پسند کیا۔ معلوم نہیں اور مخطوطات موصول ہوئے یا نہیں، اگر ہوئے تو کتنے اور کس کس موضوع پر اور ان میں سے صرف رکمنی والے مسودہ کو پسند کرنے کے کیا اسباب تھے؟ ان تمام اُمور کی طرف سے رپورٹ کے مرتب کرنے والے نے بہت بامعنی سکوت اختیار کیا ہے۔

ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کی سالانہ رپورٹ اکاڈمی کے اسکالروں نے کانفرنس میں پڑھی تھی، اسی طرح اور مضامین اس موقعہ پر پڑھے گئے تھے، لیکن وہ ابتک شائع نہیں کئے گئے، رپورٹ میں ان کی اشاعت کا سرسری وعدہ کرکے ٹالدیا گیا ہے۔

شائع شدہ کتابوں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے، سات کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ پریس میں ہیں، چھپاعت

کے لئے تیار ظاہر کی گئی ہیں۔ اور آٹھ نظر ثانی کی منزل سے گزری ہوئی ہیں۔ لیکن رپورٹ کے مرتب نے نہ اندکس کی صورت میں نہ اصل رپورٹ میں کہیں ان کتابوں کی فہرست دی۔ اور نہ بعید ترین اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے کہ وہ کس زبان و موضوع کی ہیں۔

اسی طرح رپورٹ میں تکمیل کے ساتھ کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ لکچر دینے والوں کو کیا رقم دی گئی، انعام پانیوالے اور مترجمین کون کون تھے اور کس کو کیا دیا گیا۔ اگر رپورٹ کے تسلسل میں اس کے بیان سے خرابی پیدا ہونے کا اندلیشہ تھا تو انڈکس کی صورت میں اس تفصیل کو ظاہر کرنا چاہئیے تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قابل افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال کے اندر جو جو لکچر دئے گئے ان میں سے سوائے بعض کے ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئے۔ یا اگر شائع ہوئے تو ان پر ارباب صحافت کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا گیا۔ لائبریری کے متعلق جو روپیہ صرف کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہونا چاہئیے کہ اردو کتابوں پر کس قدر رقم خرچ کی گئی۔ اور ہندی کتابوں پر کتنی؟ اور ۲۰۶ ہندی کتابوں کے مقابلہ اردو کی کتابیں کیوں صرف ۱۹۲۶ فراہم ہو سکیں۔

الغرض یہ رپورٹ اپنی ترتیب و تفصیل کے لحاظ سے بہت ناکمل ہے اور باوجود کوشش اخفاء کے بعض امور میں جو کہیں کہیں "ترشح" ہو گیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ "ظرف" کس چیز سے لبریز تھا؟

میں اخیر میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور جس کی اہمیت سے کوئی تعلیم یافتہ ہندو بے خبر نہیں، صرف رواداری چاہتا ہے، لیکن خیر رواداری تو بڑی چیز ہے، مسلمانوں کو اُن کی زندگی کے ان حقوق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے؛ جو ان کے عمران و تمدن کے اجزاء ترکیبی ہیں۔

ایک طرف ہندو حضرات سیاسیات و قومیات میں مسلمانوں اپنے ساتھ ملے رہنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں۔ "بھارت ماتا" کے حقوق بھی دونوں جماعتوں پر یکساں ثابت کئے جاتے ہیں، لیکن جب ان جذبات وطنیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے، جب اس دعوائے بلند بانگ کے بعد اعمال و افعال پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مکر و فریب ہے خدع و ریا ہے، اور ہندو جماعت ابتک مسلمانوں کے وجود، مسلمانوں کی معاشرت، مسلمانوں کی تہذیب، یہانتک کہ مسلمانوں کی زبان و انشاء کو بھی "آریہ ورت" کی "پوتر" فضا میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

دنیا کو معلوم ہے کہ میں کانگریس کے مقاصد و اغراض کا بہت بڑا حامی ہوں اور میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہی بتایا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ابنائے وطن کے ساتھ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کرو اور مذہبیت کو بالکل علحدہ رکھو۔ کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذاہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، غرض مشترک اور مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ (بقیہ ملاحظات کیلئے صفحہ ۹۳ ملاحظہ ہو)

مشرقی ادبیات و فنون پر ایک اجمالی نظر

تمہید مغربی تمدنی و ادبی ترقی کے مطالعہ کے بعد اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم مشرقی ادبیات و تمدن کا بغور مطالعہ کریں، اور تقابل کے بعد یہ دیکھیں کہ ہم میں کیا خامیاں ہیں اور وہ کون سے موانع ہیں جنھوں نے ہمیں ترقی سے روک رکھا ہے، اور یہ کہ وہ موانع فطری ہیں یا عارضی۔

مشرقی ذہنیت پر ہمیشہ سے قدامت پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام نادرست نہیں ہے۔ اور نیا مذہب ہو یا نیا تمدن، اسکو سب الحاد و کفر ہی نظر آئے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ ذہنیت مذہبی غلو کا نتیجہ ہے۔ اور سر ڈینی سن راس قدامت پرستی کو مشرق کی آب وہوا پر محمول کرتے ہیں، لیکن میں اس کا بھی قائل نہیں، جب میں دیکھتا ہوں کہ اس وسیع براعظم میں ہر قسم کی آب وہوا کی "نیابت کاملہ" موجود ہے۔

ہم نے اپنی نکبت و بدبختی کا راز صرف یہ سمجھا ہے کہ ہم پر ابتدا سے مستبد سلاطین کا تسلط رہا، اسلام نے اپنی مختصر تیس سال کی زندگی میں اس استبداد کو مٹانے کی کوشش بلیغ کی، وقتی مذہبی جوش کچھ دنوں کے لئے ذہنیت پر غالب ہوتا دکھائی دیا، لیکن جب عجم سے ربط و ضبط پیدا ہوا تو وہ ساری پرانی کیفیتیں پھر عود کر آئیں۔

ممکن ہے کہ آپ میرے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں، اس لئے کہ استبداد حکومت کو ملکی ادبیات و فنون سے بظاہر کوئی تعلق محسوس نہیں ہوتا، لیکن جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی زندگی کے تمام شعبے اور اُن کی ترقی، تنزل کی ذمہ داریاں سب حکومت پر منحصر ہیں۔

قدامت پرستی، غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، آزاد خیالی، حریت و مساوات ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، آپ شاعری ہی کو لے لیجئے۔ جب تک اُمرا و سلاطین کی جابرانہ حکومت قائم رہی، شاعری و ہرزہ گوئی میں کوئی فرق نہ تھا۔ ثنا و صفت میں جو قصائد لکھے جاتے تھے وہ شاعرانہ ذہنیت کا بدترین نمونہ تھے، بادشاہوں کی عیاشیوں نے غزل کا طرز بھی بالکل بدل دیا اور شاعری جذبات عالیہ سے معرا ہو کر رکیک جذبات کے برانگیختہ کرنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔

ابتدائی دورِ اسلامی میں سلطنت و مذہب کا حقیقی افتراق ممکن نہ ہوا۔ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے بعد سیاسی اغراض اس امر کے مقتضی تھے کہ مذہب و حکومت متحد رکھے جائیں، کیونکہ مذہبیت کا اثر سب پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لئے

اقتدار زمانہ نے بادشاہ کو ایک مذہبی حیثیت دیدی۔ لیکن چونکہ فرمانروا خود مذہب سے اکثر ناواقف ہوتے تھے، اس لئے علماء کرام کو اپنا بنایا گیا تاکہ وہ اثر قائم رہے۔ ان "مولویوں" کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا، ایک طرف شاہانہ قدر و منزلت اور دوسری طرف عوام پر اقتدار، دونوں باتیں حاصل تھیں۔ اس "امتزاج" نے ایک ایسی مذہبی فضا قائم کردی کہ ہر فعل کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا، اور ہر وہ عمل ناجائز سمجھا گیا، جس میں ذرہ برابر بھی اسکی اہلیت تھی کہ وہ خیالات میں وسعت پیدا کرکے مذہبی غلامی سے دماغ کو آزاد کردے گا۔ قرآن کا ترجمہ ناجائز قرار پایا صرف اس لئے کہ عوام حصول علم کے بعد اون مطالب کی طرف کبھی بھی توجہ نہ کریں گے۔ جو صرف اس لئے اختراع کئے گئے تھے کہ توہم پرستی و جہالت میں مبتلا ہوکر وہ ہر مسئلہ کے سامنے سر اطاعت خم کریں۔

عربی و ایرانی ادبیات سے قطع نظر کرکے آپ صرف ہندوستان کو لے لیجئے۔ آٹھ سو برس کے وسیع دوران حکومت میں مسلمانوں نے جتنی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے نصف مذہب کے فروعی مسائل پر ہیں (دینے کم سے کم سو کتابیں صرف اس مبحث پر دیکھی ہیں کہ سورہ فاتحہ میں "ضالین" کا ض، ذ، کے مخرج سے ادا کیا جائے یا محض عن کی صورت میں ادا ہو، باقی نصف میں چالیس فیصدی شاعری پر ہیں، اور دس قصص و حکایات پر ہزار دو ہزار میں کہیں دو ایک کتاب واقعی خالص ادب و فن پر ہوتی ہے۔ اس ماحول میں ادبی ترقی جو ہو سکتی تھی، ظاہر ہے۔ جو حال ہندوستان کا تھا وہی کم و بیش ایران و عرب کا بھی تھا۔

ہندی مسلمانوں کی اس بدقسمتی میں ہندو بھی شریک رہے۔ مولویوں کی طرح پنڈتوں نے بھی "وسعت نظر" کے خلاف علم جہاد بلند کردیا۔ پیشہ کی تقسیم نے پنڈتوں کی اعانت کی اور انکا اقتدار و اثر مولویوں سے بھی زیادہ قائم رہا۔

یہ تو ادبیات کا حشر ہوا۔ اب فنون عام تمدن کو لیجئے۔ فنون لطیفہ، (مصوری، موسیقی وغیرہ) کے متعلق تو خیر ناجائز ہونیکا فتویٰ صادر ہو ہی چکا تھا، رہ گئی صنعت و حرفت سو اس کو معاشرتی اُصول نے مذموم قرار دیدیا۔ حالانکہ اسلام نے کبھی بھی وہ غلامی جائز نہیں قرار دی تھی۔ جسے لوگوں نے رواج دے رکھا تھا۔ بہرنوع اس مذموم رواج نے غلاموں کو فرودِ پیشہ جماعت بنادیا، غلام مزدوریاں کرتے، تجارت کرتے، پارچہ بافی کرتے، غرض تمام صنعت و حرفت جس میں محنت شاقہ کو دخل ہوتا وہ غلاموں سے لے لی جاتیں۔ غلامی اور مزدوری میں رفتہ رفتہ ایک ایسی مناسبت پیدا ہوئی کہ عام مسلم ذہنیت نے خود مزدوری محنت کو مذموم سمجھنا شروع کردیا۔ یہی وہ کج ذہنیت ہے جو مسلمانوں کی (خواہ وہ ایرانی ہو یا ہندوستانی یا عربی) موجودہ تخریب کی ذمہ دار ہے۔

اس معاملہ میں بھی ہندوؤں نے ہماری کسی حد تک "شرکت غم" کی۔ مسلمانوں کی اس غفلت سے اونھوں نے فائدہ ضرور اُٹھایا، لیکن پھر بھی اوس حد تک نہیں جس حد تک اونکو مواقع حاصل تھے۔ پیشہ کی تقسیم نے قومیت کا پہلو اختیار کرلیا اور صدیوں تک قوم کے ہونہار نوجوان اون پیشوں کے حصول سے محترز رہے، جنکا اونکو شوق تھا، یا جس میں اون کا فطری میلان اونکو کامیاب بنا سکتا تھا۔

موجودہ دور انقلاب نے البتہ مشرق میں ایک بیداری پیدا کر دی ہے۔ اب ہمیں اپنی خامیاں محسوس ہو رہی ہیں اور اس لئے ممکن ہے کہ ہم اون کا ازالہ بھی بآسانی کر سکیں گے۔

مذکورہ ذیل مضمون میں نے عربی، ایرانی، ہندوستانی اور چینی ادبی و فنی حالات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ یوں تو ایشیا کا ہر ملک ایک خاص تمدن و تہذیب رکھتا ہے، لیکن یہ چار ممالک اپنی تاریخی روایات کی بناء پر ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اسی لئے میں نے انکا تذکرہ مناسب و ضروری سمجھا۔

عرب

یہ مسئلہ اب مسلمات کی حد تک پہونچ گیا ہے کہ آب و ہوا اور ملکی فضا سے ایک ملک کے ذوق ادب و شوق تمدن کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اور وہی تمدن ملک میں قائم رہ سکتا ہے جو اوس کی فضا کے مطابق ہو، اگر بیرونی اثرات نے اپنی قوت سے ایک اجنبی تمدن کو ملک پر مسلط کرنا چاہا بھی تو اوسکو نقش بر آب سے زیادہ وقعت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ عرب کی قدیم و موجودہ تاریخ اس دعوے کے لئے کافی ثبوت بہم پہونچا رہی ہے۔

واقعات کے اعتبار سے آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔

(۱) قبل از اسلام۔　　(۲) بعد از اسلام

لیکن اصول تاریخ کے لحاظ سے عرب کی تاریخ کسی تقسیم کی متحمل نہیں۔ تاریخ سنوات اور واقعات پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو آپ قوم کی ذہنیت کا پتہ چلاتے ہیں۔ اگر عرب ذہنیت میں کوئی تغیر بعد از اسلام پیدا ہوا ہو تب البتہ آپ عرب کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ آپ اپنے پیش نظر ملک کا حسب ذیل نقشہ رکھیں۔

"ایک وسیع صحرا۔ جابجا اونچے اونچے ٹیلے۔ کوسوں پانی کا نام نہیں، شجر کے عوض حجر، نسیم و شمیم کی جگہ سموم و تند ہوا، آبادی کا کوسوں پتہ نہیں۔ دہوپ کی وہ شدت کہ میدان قیامت کو شرم آئے اوس پر طرہ یہ کہ ہر چہار طرف بلند پہاڑیاں، کہیں کہیں نخلستان اور چشمۂ آب"۔

جس ملک کی فضا کا یہ عالم ہو وہاں کے باشندوں کی ذہنیت و شوق تمدن کا آپ خود اندازہ کر لیں۔ ایسی آب و ہوا صرف مذہبی ذہنیت کی ترتیب میں معین ہو سکتی تھی، چنانچہ یہی سبب ہے کہ عرب ہی تمام ادیان عالم کا منبع اور مخزن رہا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ چین نے ترقی کی اور اوس کی تمدنی ترقی کے اثرات دنیا میں پھیلے، وہ بھی دن آئے جب ہندوستان کو عروج نصیب ہوا، اور اوس کے تمدن و تہذیب کی لہریں ایران و مصر و یونان تک پہونچیں، وہ بھی ایک دور تھا، جب مصری تمدن سے دنیا مستفیض ہو رہی تھی، لیکن عرب نے اگر کوئی شے دنیا کو دی تو وہ صرف مذہب تھا ممکن ہے کہ ایک مذہب کا دلدادہ مذہب کو حاصل حیات سمجھکر اوسی پر قناعت کرلے، لیکن مذہب ذریعہ ہے، مقصود نہیں مسلمانوں کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری صرف اس خیال پر منحصر رہی کہ اُنھوں نے مذہبی اعتقادات و عملیات کو مقصود بالذات سمجھا،

بقول انڈری سرویر (فرانسیسی مصنف اسلام اور مسلمانوں کی ذہنیت) "عرب تمدن، کوئی شے نہیں اسلامی تمدن بے شک ایک چیز ہے" اس کا خیال صرف اس امر پر مبنی ہے کہ عرب نے قبل از اسلام یا بعد از اسلام کوئی تمدن دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ ہاں جب مسلمانوں نے ایران و مصر و ہندوستان فتح کئے، محکوم اقوام کے تمدن اختیار کئے اور اُس پر اضافے کئے، اوسوقت اونھوں نے ایک ثانوی تمدن کی بنا ڈالی جو اسلامی تمدن کے نام سے موسوم ہے۔

قبل از اسلام

تمدن اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہے، قبل از اسلام عرب بیرونی اثرات کا آماجگاہ رہا، اور بعد از اسلام خود عربوں نے اپنے ملک سے نکل کر دنیا میں قدم رکھا، چونکہ اسلام تخیل و ذہنیت کا شرع سے مخالف تھا، اس لئے فاتح عربوں نے مفتوحہ ممالک کے تمدن کو خود عرب میں لیجاکر رائج نہیں کیا۔

ابتدائی دور میں بھی جبکہ خود عرب دوسرے ممالک و اقوام کا رہگذار تھا، اوس نے کوئی تمدن دوسروں سے اخذ نہیں کیا، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ عرب کی غیر زرخیز حالت نے کسی فاتح قوم کو اُس کی جانب توجہ کا موقع نہیں یا اگر سیاسی اغراض سے جنگ ہوئی بھی تو وہ صرف جدال و قتال تک محدود رہی، نہ ملک میں کوئی مستقل تسلط رہا اور نہ کوئی تمدنی ترویج ہوئی۔ دوسرا سبب خود عربوں کی آزادانہ ذہنیت تھی، جس نے کسی حکومت کو گوارا نہ کیا، یا تو ملک تاجروں کا رہگذر رہا یا خود عربوں نے باربردارانہ تجارت اختیار کی۔ دونوں صورتوں میں کوئی بھی مستقل صورت حصول تمدن کی پیدا نہ ہوسکی۔ مکہ والوں میں تاجرانہ ذہنیت ضرور تھی۔ لیکن بوجہ کم مائیگی صرف وہ باربرداری ہی تک محدود رہی۔

قدیم تاریخ میں سوائے عرب کے کوئی ملک ایسا نہیں تھا، جسکو تجارتی رہگذر کہا جاسکے، چین، ہندوستان اور ایران ایک طرف، دوسری طرف مصر، ایشیائی کوچک، یونان و اطالیہ ان ممالک کو زمانۂ قدیم میں جو تجارتی اہمیت حاصل تھی وہ ظاہر ہے۔ تمام تجارتی مال کی درآمد برآمد کا راستہ عرب تھا، مگر لطف یہ ہے کہ پھر بھی عربوں نے ان ممالک کے تمدنی اثرات سے خود کو محفوظ رکھا۔ عرب میں بیرونی اثرات کے ذرائع حسب ذیل تھے:۔

(۱) مصریوں نے سرحدی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا اور معدنیات کی دریافت کے لئے ملک کے اکثر حصوں میں پھیل گئے تھے۔

(۲) ۲۷۰۰ سال قبل مسیح سارگن نے شمالی مصر میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، جس میں شام کا کل حصہ شامل تھا، سارگن کے لڑکے رموش نے کل جزیرۃ العرب پر اپنا اقتدار جمالیا۔

(۳) ۷۱۵ سال قبل از مسیح اسیریا کے بادشاہ سارگون نے عرب پر حملہ کیا اس لئے کہ بدوی قبائل تجارت میں حائل ہوتے تھے۔

(۴) ۵۵۲ سال قبل مسیح بنونیدس سلطان بابل نے بھی ملک عرب فتح کیا۔

(۵) بدوی قبائل اپنی لوٹ مار کی عادت سے باز نہیں آتے تھے اور تجارت کا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اسلئے مجبوراً مصر و بابل و ایران وغیرہ کے سلاطین نے عربوں سے عہدنامے کئے اور وقتاً فوقتاً نذریں پیش کیں۔

(۶) بار بردار بدوی عرب کے سرحدی حصہ میں جاکر آباد ہوئے، جس سے اُنکو دوسری قوموں کے ساتھ ربط وضبط کا موقع ملا۔

(۷) یہود، عیسائی اور گبر کثیر تعداد میں ملک کے مختلف حصوں میں آباد تھے، اور عیسائی مبلغین نے ملک کے تمام گوشوں میں پھیکر اپنے مذہب کی ترویج شروع کر دی تھی۔

بعد از اسلام

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تخیل وطنیت کا سرے سے مخالف تھا، اس لئے فاتحین نے ہر موکہ ملک میں سکونت اختیار کرلی اور اپنے وطن کو بھول بیٹھے، دوسرا سبب خود مذہب اسلام کی تشاؤم پسندی تھی۔ خود قرآن نے کبھی بھی تشاؤم کی تعلیم نہیں دی، لیکن عربی ذہنیت نے اُسے اپنا کر لیا۔ تصویری وعکاسی معصیت قرار پائی۔ جاہ وحشم معاصی میں شامل ہوگئے۔ خوش پوشی۔ خلاف شریعت ثابت کر دی گئی۔ غرض اسلام بانئ اسلام کے مقاصد سے مختلف ایک بدوی خزاں رسیدہ ذہنیت کا جولان گاہ بن گیا۔

چونکہ ہمارا مبحث صرف عرب ہے، اس لئے ہم مسلمانوں کے عجمی ذوق ادب سے بحث نہیں کرنا چاہتے، مگر شاید اس قدر ذکر غیر مفید بھی نہ ہو کہ خلافت فاروقیہ کے بعد شیرازۂ اسلام میں جو انتشار پیدا ہوا اوس نے عربی سطوت وجبروت کا خاتمہ کر دیا۔ بنو امیہ نے سرزمین مکہ و مدینہ سے علٰحدگی اختیار کی۔ بنی عباس نے بھی خاص گہوارۂ اسلام سے بے اعتنائی برتی۔ ترکوں نے اپنے دور حکومت میں اوسے محض سیادت اسلامیہ کا ذریعہ سمجھا، اور مسلمان سلاطین نے سرزمین عرب کو کبھی متمدن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بس جو کچھ اوس سے تعلق تھا وہ مذہبی عقیدت تھی۔ سال کے دس دن دنیائے اسلام کا کثیر گروہ زیارت وحج کے لئے جمع ہو جاتا۔ یہاں بھی وہی غلطی قائم رہی۔ ارکان حج مقصود سمجھے گئے، جنکا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد چندے اوسکی حالت مراسم ورواج سے زیادہ نہیں رہ گئی۔

بعد جنگ عظیم انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے قومی تحریک کا احیاء کر دیا۔ لیکن پھر بھی عرب ذہنیت پر اندر مذہب غالب ہے کہ ابن سعود نے اس دور میں بھی کافی قدامت پرستی کا ثبوت دیا۔

ادبیات

فنون کا یہ حال رہا، اب ادبیات کو لیجئے، عربی زبان دنیا کی بہترین زبانوں میں سمجھی جاتی ہے۔ میرا یہ خیال کسی عصبیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ سرڈینی سن راس ایسے مستشرقین کا خیال بھی یہی ہے۔

قبل از اسلام کسی عربی کتاب کا پتہ نہیں ملتا۔ ادبیات محض شاعری و گفتگو تک محدود تھے۔ سبع معلقات ہی ایک ایسا مجموعہ تھا۔ جس سے ہم قبل از اسلام عربی ذوق ادب کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ عربوں کو اپنی زبان دانی و تقریر یہ

ناز تھا، چنانچہ وہ ماورائے عرب کو عجم (گونگا) کے نام سے یاد کرتے تھے۔
بعثت اسلام کے بعد سب سے پہلی کتاب جس کے تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ کلام اللہ تھا خلفائے راشدین کا یہ احسان ہے کہ اونھوں نے اسکو جمع کر کے محفوظ کر لیا۔

عربی ادبیات عجمی دماغ کی ممنون منت رہیں۔ الا ما شاء اللہ خود عربوں نے کبھی کوئی ادبی ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔ آپ تمام تر مشہور عربی تصانیف کو عجمی دماغ کا نتیجہ پائیں گے۔ میرے خیال میں اس کا بھی وہی سبب ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی سلاطین اسلام کی خاص سرزمین عرب سے بے اعتنائی۔

اگر اس ریگستان میں کوئی نخلستان ہے تو وہ صرف عربی شاعری۔ عربی شاعری دنیا کی بہترین شاعری میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک طرف تو عربی شاعری میں عجمی نسائیت مفقود ہے، بدوی طرز معاشرت نے عورتوں سے بھی نسائیت غائب کر دی تھی چہ جائیکہ مرد۔ تمدن کی سادگی نے خیالات میں سادگی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ ہر شے کو فطری نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے نہ فکر معیشت تھی۔ اور نہ خیالات میں غامضانہ بلندی۔

دنیا محبت کو انسانی کمزوری سمجھتی ہے، لیکن عرب ذہنیت نے اس کو دیگر اعلےٰ جذبات کے پہلو بہ پہلو جگہ دیا آب دہوا۔ قد و قامت نے کبھی بھی محبوبیت کو نزاکت کا مرادف نہیں سمجھا۔ عرب ذہنیت نے عقد و مناکحت کو معاہدہ و پیمان سے زیادہ کبھی وقعت نہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے عورتوں کو کبھی منجملہ "اسباب لطافت" نہیں جانا ان کے نزدیک "اسباب ضرورت" میں شامل تھی۔ اور اس تخیل نے شاعری میں ایک گونہ خشونت ضرور پیدا کر دی۔

ایران

ایران کی ادبی و تمدنی تاریخ تین بڑے حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) قبل از اسلام　(۲) بعد از اسلام ——— ۱۹۱۴ء تک　(۳) موجودہ انقلاب

قبل از اسلام

تاریخ قدیم میں ایرانی تمدن کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ برخلاف عرب کے ایرانی ذہنیت تمدنی اثرات قبول کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتی ہے۔ خوشگوار موسم، زرخیز زمین، قدرتی چشموں کی فراوانی، غرض فطرت نے ایران کو وہ قدرتی فوقیت دی ہے، جو ایشیاء کے کسی ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اہل یونان و اہالیان روم کے تعلقات و روابط نے مغربی حکمت و فلسفہ کو ملک میں رائج کر رکھا تھا۔ زردشت نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ عقل کے خواہ کتنا ہی منافی کیوں نہ ہو لیکن تہذیب و تمدن کا مانع نہ تھا اسلام کی طرح زردوشتی اصول مذہب نے کبھی "ہمہ گیری" کا ارادہ نہیں کیا۔ اوس نے تو صرف تزکیہ نفس کے ذرائع بتائے اور دنیاوی معاملات کو انسانی ضروریات پر منحصر رکھا۔ اس مذہبی آزادی نے ایرانیوں کو کبھی مذہب کا غلام نہیں بننے دیا

عرب سرحدی ملک تھا، لیکن وہاں کیا تھا جسکو وہ حاصل کرتے، یونان و بابل کی سلطنتیں گو فاصلہ پر تھیں، لیکن جنگی و تجارتی تعلقات نے ایران کو کسب تمدن کے کافی مواقع بہم کردئے۔ اشوک کے زمانہ میں ہندوستان سے بھی سیاسی و اقتصادی تعلقات کے قیام کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ جنگی اسلحہ بیشتر ہندوستان ہی سے بنکر جاتے۔ دارا اور بہرام کے دور سلطنت میں شاہانہ جاہ وحشم کو بیحد عروج نصیب ہوا۔ ساسان نقش کی بہم رسانی نے فنون لطیفہ کی جانب توجہ دلائی، فن موسیقی نے ترقی کی اور آلات ترنم ایجاد ہوئے۔ دارا کے دربار میں متعدد ماہران موسیقی کا مجمع رہتا۔ بہرام گور کے زمانہ میں مصوری نے خاص ترقی کی۔ ظروف پر نقش و نگار بنائے جاتے۔ تجارتی و جنگی تعلقات نے یونانی اثرات کو عمارتوں میں قبول کیا، مگر ایرانی کبھی بھی اچھے معمار ثابت نہیں ہوئے۔ شراب سازی ایرانیوں کی مخصوص تجارت تھی۔ ہندوستان اور مصر کے وسط میں ہونے کی باعث یہ تجارتی رہگذر بھی تھا۔ ایرانی سلاطین نے اکثر عرب پر تسلط و اقتدار کی خواہش کی لیکن فتوحات کے بعد بھی کبھی پُر امن تسلط قائم نہ رہ سکا۔

بعد از اسلام

جس وقت رسول عربی نے دنیا میں قدم رکھا اوسوقت ایران میں نوشیروان عادل کی حکومت تھی۔ نوشیرواں نے اپنی تمامتر توجہ عدالتی نظم و نسق پر مبذول رکھی۔ پُر امن زندگی نے عوام میں متمدن اثرات پیدا کردئے تھے۔ لیکن اوس نے کوئی خاص صورت اختیار نہیں کی تھی۔

خلیفہ دوم کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ اسلام کی ترویج و تبلیغ نے سارا قدیم تمدن فنا کردیا، مذہبی غلو نے تمام فنون لطیفہ کو خاک میں ملادیا۔ تصویریں ضائع کردی گئیں، منقش قالین جلادئے گئے، زرتشتی قدیم ادبیات بسبب اس کے کہ وہ اسلام کے منافی تھیں، نذر آتش کردی گئیں۔ مگر یہ صورت صرف سو ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی۔ ایرانیوں سے زیادہ دنیا میں کوئی قوم تمدن کے حصول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایرانی ذہنیت کا اندازہ آپ صرف ان اشعار سے کرسکتے ہیں۔

(۱) زمانہ تو باتو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز،

(۲) باہمیں مرداں بہ باید ساخت،

ایرانی اپنے کو ہر نئے ماحول کے مطابق بنالیتا ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ ضرور ہوا۔ لیکن جب مسلمانوں کو اقتدار نصیب ہوا تو ایرانیوں نے بظاہر اپنے کو عربوں سے زیادہ مذہب کا وفادار ثابت کیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں وہ وسیع سلطنت اسلامیہ کا ایک جزو تھا۔ مامون نے ۲۰۵ھ میں صوبہ خراسان کی حکومت طاہر کو تفویض کی۔ طاہر آزاد خیال تھا، اوس نے رعایا کو پوری مذہبی آزادی عطا کی، ایرانیوں نے اپنے سابقہ تمدنی و ادبی روایات کے احیاء میں کوششیں شروع کردیں۔ مدارس کا اجراء ہوا۔ مختلف ممالک سے حکماء و اہل علم طلب کئے گئے۔ نکو بار (دپائے تخت) میں ایک عظیم رصدگاہ بنائی گئی۔

فتح اسلامی کے بعد ایرانیوں نے سب سے پہلی کوشش ۸۷۲ء میں اس امر کی کی کہ عربی اقتدار کو ملک سے ختم کر دیں۔ دو سو برس کے اندر قدیم ایرانی مذہب تو ضرور فنا ہو گیا۔ لیکن ایرانی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ یعقوب نے ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالی۔ جلال الدین ملک شاہ (۱۰۷۰-۱۰۹۲) کے زمانہ سلطنت میں تمامی فنون لطیفہ کے احیاء کی کوششیں کی گئیں۔ اور ایرانی تمدن ایک بار اور زندہ کر دیا گیا۔

نقاشی و مصوری نے ایک نئی صورت اختیار کی جو گو مذہب کے تابع تو نہ تھی۔ لیکن مذہب کے خلاف بھی نہیں سمجھی گئی۔ قرآن و دیگر کتب مذہبی کے اوراق پر مطلا نقش و نگار بنائے جانے لگے۔ رزمی و بزمی قصص کے واقعات کی تصویریں بھی بننی شروع ہو گئیں۔ بہرام اور اُس کی محبوبہ فتنہ کی تصویر ایک قومی حیثیت رکھتی ہے۔ قالین اور جائے نماز پر نقش و نگار بھی بنتے تھے۔ موخرالذکر پر خانۂ کعبہ یا مسجد نبوی کی تصویر ہوتی تھی۔ اور اول الذکر پر ساقی و محبوبہ و جام کا پُرلطف امتزاج۔ ایرانیوں کو موسیقی سے شغف تھا۔ ابتدائی اسلامی فتوحات نے اس کو بھی معصیت قرار دے دیا تھا لیکن گیارھویں و بارھویں صدی میں ایرانی دربار ماہرین موسیقی کا آماجگاہ تھا۔ میرے خیال میں اسلامی تاریخ میں یہ پہلا دور تھا جب کنیزوں کو گانا اور ناچنا سکھایا گیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ رواج عام ہو گیا اور شرفا کی عورتیں بھی موسیقی سیکھتیں اور اپنے شوہروں کو اس سے مسرور کرتیں۔

بغداد و خراسان و شیراز کا یہ عام رواج تھا کہ چار بجے شام کو جب مرد اپنے اپنے کاموں سے گھر کو واپس آتے تو انکی عورتیں نہا دھو کر اچھے اچھے کپڑے زیب تن کئے ہوئے انکا خیر مقدم کرتیں۔ بعد غسل و طعام ملکۂ خانہ سامان سرود لیکر بیٹھ جاتی اور اپنے شوہر کے دل کو خوش کرتی۔ گیارھویں صدی میں اس طرز معاشرت نے اس درجہ رواج حاصل کیا کہ ایک سیاح نے لکھا ہے کہ جب وہ بغداد کی گلیوں میں گذر رہا تھا۔ تو اس نے صدہا مکانوں سے رقص و سرود کی روح افزا آوازیں سنیں۔ اس رواج نے زنان بازاری کو بالکل مفقود کر دیا تھا۔ مرد خواہ کتنا ہی بدطینت کیوں نہ ہو۔ کبھی بھی وہ بیرونی دلچسپیوں کو پسند نہیں کرتا، جبتک کہ وہ دلچسپیاں اسکے گھر میں خود مفقود نہ ہوں۔

زبان

شیرینی میں کوئی زبان فارسی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، خود زبان میں ایک شاعرانہ موسیقی ہے، ترکیب اضافت نے اختصار کی وہ لطافت پیدا کر دی ہے جس کی مثال کسی زبان میں بھی نہیں ملسکتی۔

اسلامی فتوحات سے قبل ایرانی زبان ایک گونہ خالص تھی، غیر زبان کے صرف وہی الفاظ مستعمل تھے۔ جس کا مرادف ملکی زبان میں موجود نہ تھا۔ زبان میں گو سادگی تھی لیکن لطافت سے معرا تھی۔ زردشتی لٹریچر ملک میں رائج تھا اور قرآن کی طرح وہی زبان کے اعتبار سے مستند بھی سمجھا جاتا تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایرانی ذہنیت میں قبول اثر کا مادہ بیحد ہے۔ عربی فتوحات کے بعد زبان میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ قدیم ایرانی زبان تقریباً مفقود ہو گئی، کسی زبان میں بھی آپ کو غیر زبان کے اس قدر الفاظ نہ ملیں گے۔

جس قدر آپ فارسی میں عربی کے الفاظ پائیں گے۔
مغربی اقوام کے تعلقات نے ایک دوسری کروٹ بدلی، اوس وقت آپ فارسی زبان میں دس فی صدی الفاظ انگریزی، روسی اور فرانسیسی پائیں گے۔

شاعری وادبیات

ایرانیوں نے شاعری عربوں سے سیکھی، چنانچہ فارسی عروض عربی عروض ہے، قواعد کی سہولت، زبان کی شیرینی، علم عروض کی آسانی، ایرانیوں کی لطیف ذہنیت، ملک کی خوشگوار فضا، اتنے اسباب فارسی شاعری کو پُر لطف بنانے کے لئے کم نہ تھے۔ حکمت وفلسفہ وتاریخ میں فارسی تصانیف کم نہیں ہیں، لیکن شاید یہ میرا بیان غلط نہ ہو کہ فارسی ادبیات میں شاعرانہ کلام کا جزو نسبتاً زائد ہے۔
قرآنی تعلیم سے بے اعتنائی نے مسلمانوں میں تصوف کا عام مذاق پیدا کر دیا، لیکن عربی "واقعہ پسند" ذہنیت نے اسکو کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ایرانی فضا تصوف کی پرورش کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوئی، چنانچہ آپ کو فارسی سے زیادہ کسی اسلامی زبان میں اسقدر صوفیانہ لٹریچر دستیاب نہ ہو۔ جلال الدین رومی کی مثنوی نے دنیا میں جو وقعت حاصل کی ہے وہ محتاج ثبوت نہیں، صوفی شعراء میں حافظ کا نام اگر نہ لیا جائے تو ظلم ہوگا۔ حافظ نے نئے اُصول شاعری کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اتباع آجتک قائم ہے۔

دورِ جدید

ایران کا دورِ جدید نہایت امید افزا ہے۔ صنعت وفنون کی جانب ملک کو خاص توجہ ہے اس دور کی خصوصیت مغربی اتباع ہے، لیکن تقلید نہیں، رضا شاہ کی ذی ہوش آنکھیں ایشیائی ذہنیت کا اچھی طرح مطالعہ کر چکی ہیں۔ امان اللہ کے تلخ تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ایشیا ابھی مذہبی روایات قدیمہ کا جوا اپنی گردنوں سے علحدہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔
ادبیات نے بھی طبائع کے ساتھ رنگ بدلا۔ اب نہ وہ حافظ کا رنگ ہے اور نہ قاآنی وخاقانی کا طرز، مغربی اثرات نے شاعری سے مصنوعی لطافت کو فنا کر دیا۔ قصیدوں کی جگہ قومی نظمیں ہیں۔ غزلیات کی جگہ اخلاقی وجذبات افزا قطعات ہیں۔

ہندوستان

ہندوستانی ادبیات وفنون کی تشریح مشکل امر ہے، اس لئے کہ انکی ترتیب تدوین میں صرف ہندو مذہب اور ہندو قوم ہی کی کارفرمائی نہ تھی۔ بلکہ بودھ اور اسلام نے بھی اپنا کافی اثر ڈالا، بودھ مذہب کا ماخذ چونکہ ہندو مذہب ہے، اس لئے اُن کی ذہنیت میں بھی کوئی امتیاز وتفاوت پیدا نہ ہوسکا۔ باقی رہا اسلام اور مسلمان سو اسکا دخل ہندوستانی تاریخ میں اس قدر تاخیر کے ساتھ ہوا کہ اصل ہندو ذوق ادب بالکل غیر متاثر رہا۔ یہاں تک کہ آپ ہندوؤں کی ادبیات وفنون کی تاریخ اس طرح بھی ترتیب دے سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کا نام بھی اوس سلسلہ میں نہ آئے۔ مذہب کی متضاد مخالفت نے ذہنیت کو اسدرجہ علحدہ رکھا ہے کہ دونوں میں ایک بین فرق نظر آتا ہے، گو موجودہ مضمون

کو میں صرف ہندوؤں کی ادبی و فنی تاریخ پر محدود کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اسلامی اثرات کو نظر انداز کرنا کسی قدر نامناسب و ناموزوں ہے۔

سندھ و شمالی و مشرقی حصۂ ہند میں جو کھنڈر دستیاب ہوئے ہیں، اون سے ہندوستان کی تین ہزار برس قبل مسیح کی تاریخ و تمدن کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ سکندر اعظم کی فتوحات سے قبل بھی ہندوستان اور مصر و بابل کے درمیان تمدنی و معاشرتی تعلقات قائم تھے۔ سکندر کی فتوحات سے قبل کی عمارتیں، مندر اور عبادت گاہ یونانی و مصری اُصول تعمیر کا پتہ دیتی ہیں۔ پہاڑیوں پر ایسے مندر بھی موجود ہیں، جو ایک مسلّم پتھر کے بنائے ہیں۔ اور تمامی نقوش، در و دیوار۔ اوسی سے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ خود اون پہاڑیوں پر وہ پتھر نایاب ہے۔ اتنے بڑے اور جسیم پتھر کا وہاں پہونچانا عجیب حیرتناک واقعہ ہے۔

ہندوستان کی موسمی تبدیلیاں۔ آب و ہوا۔ برسات کا پُر لطف موسم۔ غرض ان مجموعی اثرات نے ہندوستانی ذہنیت کو فلسفیانہ بنا دیا۔ دنیا کی کسی قوم میں اس درجہ غامض فلسفہ ملنا مشکل ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں میں یہ ذہنیت کسبی ہوتی ہے۔ لیکن قطرت نے یہاں وہبی بنا دی ہے، مگر یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس فلسفہ میں تشاؤم کا عنصر غالب ہے۔ رامائن و وید تفاؤل سے مالامال ہیں۔ لیکن ہندو فلسفہ میں تشاؤم ہے، ماہرین فن نے اس ذہنیت کے جو وجوہ بیان کئے ہیں۔ میں اون سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں تناسخ کا اعتقاد اس تشاؤم کا ذمہ دار ہے، مرنا اور جینا، پھر مرنا اور پھر جینا اس خیال و اعتقاد نے زندگی کے مطمح نظر کو گو غامض بنا دیا لیکن علویت غائب ہوگی۔ اور یہ علویت ہی ہے جو تفاؤل پیدا کرتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی ہم آہنگی کو ہمیشہ مجبور کرتی ہے کہ ہم دنیا اور اوسکے تمام شعبہ جات کو حقیر سمجھیں۔

ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم خالص ادبیات کو مسرت انگیز پاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم اس طرح کا انسانی فلسفہ پیش نہیں کر سکتی۔ ایک ہندو عورت عجیب غریب شے ہے۔ مرد کے نقطۂ نظر سے وہ محبت کا مجسمہ ہے۔ فرمانبرداری اور اطاعت کا ہیولے ہے۔ وحدت مناکحت نے گو محبت کو معین بنا دیا ہے، لیکن یہ جبر ایک پُر لطف چیز ہے، رام جی اور سیتا جی کا واقعہ جو بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہو لیکن رامائن نے اُس کو جس طرح پیش کیا ہے، اوس سے عجیب و غریب پُر لطف نکات حل ہوتے ہیں۔ میری رائے میں یہ کتاب ہندو فلسفۂ نسائیت کی بہترین تشریح پیش کرتی ہے، رام جی جرات و ایثار کا مجسمہ ہیں سیتا جی عفت و راستی کا ایک پیکر ہیں، راون ظلم و بدی کا ایک نمونہ ہے۔ ہر چند والمیک نے رام جی اور راون کو اخلاقی تقابل سے ایک ممتاز حیثیت دی ہے، اور سیتا جی کے مقابلہ میں کوئی کیرکٹر پیش نہیں کیا ہے، مگر میری نظروں میں یہ قصہ سیتا جی کو ممتاز ترین جگہ دیتا ہے۔

رامائن سے کوئی موزوں اقتباس پیش کرنا مشکل ہے۔ اس لئے میں بھگوت گیتا سے چند سطریں ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ ہندو فلسفہ کا بہترین اندازہ کر سکتے ہیں۔

"انسان کے تسلسل خیالات سے اُلفت پیدا ہوتی ہے، اُلفت سے محبت اور محبت سے غصہ، غصہ کا نتیجہ پریشانی اور پریشانی کا انجام انتشار خیال۔ جہاں خیالات منتشر ہوئے، عقل میں فتور آیا اور جب عقل جاتی رہی تو انسان ایک گم کردہ راہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔
لیکن جس نے اپنے خیالات سلیم کا سلسلہ قائم رکھا اور جو غصہ و نفرت سے محترز رہا اور نفس پر قابو رکھا وہ بہت جلد روشن دماغ ہو جائے گا جس شخص نے اپنی نفسانیت کو پس پشت ڈال کر زندگی بسر کی اوس کو اطمینان میسر ہوا۔"

قصص و حکایات ہندوستانی ادب کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے، کلیلہ و دمنہ دنیائے قصص میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کتاب کا فارسی و عربی میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے، گو حیوانات اس قصہ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان سے نہایت نتیجہ خیز سبق ملتا ہے، اُصول جہانبانی معاشری قواعد، تمدنی ضوابط غرض یہ کتاب ہندو اصول سیاست کی بہترین توضیح ہے۔

طب میں ہندوؤں نے کافی دسترس حاصل کی۔ کشتہ ہندو حکما کی ایجاد ہے، چونکہ تمدن و تہذیب کے ابتدائی مدارج تھے، اس لئے طریقہ علاج بھی معمولی تھا۔ علاوہ کشتہ جات کے جڑی بوٹیوں سے علاج ہوتا تھا۔ ہندو حکما نے ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کی تھیں۔ جن کو آج یورپ بھی اپنی کیمیاوی ترکیب سے دریافت نہ کر سکا۔ میرے علم میں یہ واقعہ ہے کہ ایک ہندو فقیر صرف ایک دن کوئی جنگلی بوٹی کھا لیا کرتا تھا اور ایک ماہ تک نہ اوسکو بھوک لگتی تھی اور نہ پیاس۔

مسلمان بہ حیثیت فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے، بجز مذہب کے اون کے ساتھ نہ کوئی تمدن تھا اور نہ کوئی فلسفہ۔ آٹھویں صدی میں جب اونھوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو اوس وقت تک خود اُنکی قوت عمل میں اضمحلال آ چلا تھا عجمی آب و ہوا نے ایران ہی میں ان کا سارا خلوص و جوش ضبط کر لیا تھا۔ اب تو صرف ملک گیری کی ہوس تھی۔ نہ مذہب کی ترویج کا خیال تھا اور نہ اصول زندگی کی تبلیغ کا دھیان۔

ہندوؤں نے مسلمانوں سے ترک موالات اختیار کی جسکے باعث وہ بالکل محفوظ رہے، شمالی ہندوستان میں فارسی علم ادب نے ہندوؤں کو ضرور متوجہ کر لیا، مگر سوائے اس کے اور کوئی اثر مسلمانوں کا ہندوؤں پر نہ پڑ سکا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا خیال ایک مناظرہ کی صورت پیدا کر دے۔ لیکن میں بے خوف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں نے اپنی آٹھ سو سال کی حکومت میں کوئی تہذیب و تمدن ہندوستان کو عطا نہیں کیا، بجز چند پرانی عمارتوں کے اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ یہاں کبھی ہم حکمراں تھے بھی۔ تاج محل اور اکبر شاہ کے مقبرے، کسی گذری ہوئی حکومت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ پھر نہ صرف یہ ہوا بلکہ ہم نے وہ بھی کھو دیا جو ہم لے کر آئے تھے۔ ہندوؤں کی جاذب قومیت نے مسلمانوں کو فنا کر دیا، حکومت محض طاقت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اوس کے پس پشت تمدنی اخلاقی قوت ہونا چاہیئے، یہی سبب ہے کہ

جبتک مسلمانوں میں عسکریت قائم رہی وہ حکومت کرسکے۔ اور جیسے وہ فنا ہوئی تو یہ بھی فنا ہو گئے۔

انگریزوں کی حکومت نے ہندوؤں کی طرح کروٹ بدلی۔ ہند و تہذیب و تمدن کا یہ تیسرا دور، دور اول سے زیادہ شاندار ہے اور ہوگا۔ ابتدائی مراحل پر بریت تو موجودہ تمدن نے دور کرئے اب جو نکھار ہے وہ غضب کا ہے۔ "ہندوؤں کی اخلاقی تاریخ" میں میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ہونہار قوم قابل رشک و تقلید ہے۔

ہندی عام ملک کی زبان ہو رہی ہے، ہندی میں گزشتہ سال بجز بنگالی کے سب سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں چونکہ بنگال میں انگریزی تمدن کے آثار سب سے پہلے نمایاں ہوئے اور بنگالیوں نے سب سے پہلے انگریزی تمدن اختیار کیا اس لئے قدرتاً اوس نے ہند و قوم کی ادبی و فنی رہنمائی میں کافی حصہ لیا۔ بنگالی زبان اسوقت ملک کی مایۂ ناز زبان ہے شعر و شاعری، حکمت و سائنس غرض تمامی اصناف علوم کا کافی سرمایہ اس زبان میں موجود ہے۔ اخبارات و جرائد بالکل مغربی اُصول پر مدون ہوتے ہیں۔ رسائل میں عالمانہ و ناقدانہ مضامین تحریر ہوتے ہیں، ندرت و جدت، تحقیق و تنقید اون کا طرۂ امتیاز ہے۔

اول تو ہندی و سنسکرت شاعری ابتدا ہی سے فطرتی مناظر سے مملو تھی، لیکن مغربی مذاق نے اوس میں لطافت پیدا کر دی۔ قومی و فلسفیانہ نظمیں، اخلاقی و معاشرتی ڈرامے صدہا کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اور قوم میں رائج ہیں رابندرا ناتھ ٹیگور نے تو ایک خاص مدرسۂ شاعری کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس نے مغرب کو بھی متحیر کر رکھا ہے۔

چینی

دنیا کی متعدد واہم ایجادات چین سے منسوب ہیں۔ تاریخ سے مصری تمدن کا پتہ چار ہزار برس قبل مسیح تک چلتا ہے۔ اس خیال و اعتبار سے چینی تمدن نسبتاً جدید ضرور ہے، مگر مصری تاریخ مسلسل نہیں کہی جاسکتی۔ برخلاف اوس کے ہمارے سامنے صحیح چینی حالات ۲۵۰۰ سال قبل مسیح تک کے موجود ہیں۔ چین کے بادشاہ و حکمران اپنی حکومت کے صحیح حالات کا قلمی ذخیرہ رکھتے تھے، شاید اسکی مثال آپ کو کسی اور ملک میں نہیں ملے گی۔ یہی سبب ہے کہ گو دوسرے ملکوں کے حالات ہزارہا سال قبل مسیح کے دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اون کو وہ صداقت نصیب نہیں

دنیا میں چینی زبان سے زیادہ کوئی زبان تعجب خیز نہیں۔ اوسکی پہلی خصوصیت اوس کا طرز تحریر ہے۔ ابتدائی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں کے یہاں کوئی حروف کتابت نہ تھے۔ اشارات سے آواز و معنی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ اشارات تصویری شکلوں میں ہوتے۔ وہ جس چیز کا نام لکھنا چاہتے اوسی کی تصویر بناتے۔ تصویر کی مماثلت سے مفہوم کا اندازہ اشیا کا مفہوم تو آسان تھا، مگر لطف یہ ہے کہ صنعت کا بھی وہ اسی طرح اظہار کرتے۔ اعداد کا اظہار لکیروں سے کیا جاتا ایسے مفہوم جو تصویروں سے ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً "روشنی" وغیرہ ان کا مفہوم دو نشانات کو ملا کر ادا کیا جاتا تھا چاند سورج کی تصویروں کا امتزاج "روشنی" کا مفہوم ادا کرتا۔

"خوشی" زچہ و بچہ کی نشانیوں سے ظاہر ہوتی۔ "امن و صلح" ظاہر کرنا ہوتا تو عورت کی نشانی کو چھت کے

دکھاتے۔ حق و صداقت کا اظہار انسان "واحد ایک" سے کرتے۔

میں ان نشانات سے چینیوں کی اخلاقی زندگی کے متعلق ایک نہایت لطیف نتیجہ اخذ کرسکا ہوں، چینیوں کی متاہلانہ زندگی نہایت خوشگوار رہی ہوگی۔ اس لئے کہ زچہ و بچہ کی یکجائی اونکے لئے خوشی کی مرادف تھی۔ اسی طرح اون کے نزدیک عورت کا تخیل فساد آمیز نہ رہا ہوگا، آج کل ہندوستان میں ایک ضرب المثل رائج ہے، جو گو ٹھیک ہے، لیکن اس سے ہندوستانی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے "زن، زمین، زر، یہ جھگڑے کا گھر" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہندوستانی ذہنیت عورت کو کن نظروں سے دیکھتی ہے، اس خیال کا اثر عورت و مرد دونوں کی اخلاقی زندگی پر پڑتا ہے۔ چینیوں کی صداقت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کا "واحد القول" ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

چینی زبان کی دوسری خصوصیت اس کا لب و لہجہ ہے ایک ہی لفظ مختلف لہجہ و تلفظ میں مختلف معنی رکھتا ہے اس سے گو اونکی زبان کی کم مایگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن دوسری طرف اون کی زبان سے "حسن اجمال" بھی مترشح ہوتا ہے ایک لفظ "فینگ" کو لے لیجئے۔ یائے معروف کے ساتھ اوس کے معنی "مکان" کے ہیں۔ یائے مجہول کے ساتھ "کاتنے" کے ہیں، اور "یی" کو اگر کھینچکر پڑھیے تو اوسکے معنی "آزاد کرنا" ہے۔

چینیوں کی تیسری خصوصیت اون کا "ذوق حسن" ہے، آپ اونکی ہر صنعت و حرفت میں تناسب حسن اور استقلال پائیں گے۔ ہزارہا سال قبل از مسیح کے مٹی کے برتنوں پر بھی جو نقش و نگار پائے جاتے ہیں، اون سے بھی ذوق حسن کا پتہ چلتا ہے، ڈنی سن راس مشہور مستشرق کا خیال ہے کہ چینی مذموم و بدنما صنعت کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، آپ چینی تعمیرات میں کبھی بھی ناموزونیت اور خشونت نہ پائیں گے۔ اور اوس پر لطف یہ ہے کہ وہ پائداری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں، دیوار چین، چینیوں کی مستحکم و مستقل طبیعت کا ایک نمونہ ہے، اون کی عبادتگاہیں اکثر چوبی ہوتی ہیں، لیکن جب کبھی وہ سنگ مرمر کا استعمال کرتے ہیں تو نہایت قابل تعریف ہوتا ہے۔

سکندر اعظم نے جب ہندوستان فتح کیا، تو یونانی اصول نقاشی کا ملک میں رواج ہوا اور یہاں سے بدھ مذہب کے مبلغین و معتقدین نے چین میں جاکر اوسکو رواج دیا۔ اس طرح چین کے اصول نقاشی میں یونان کی خوبیت اور ہندوستان کی مشرقیت کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔

چین کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں بھی نقش و نگار کا مذاق پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا، سیاہ و آبی رنگ آمیزی کا معلاج عام تھا، وہ کبھی کبھی ریشمی کپڑوں پر بھی نقش و نگار بناتے تھے۔ چینی اصول نقاشی کی کلید "صوری اثرات" ہیں، ناظرانہ حقیقت کے بجائے اون سے شاعرانہ تجویز مترشح ہوتی ہے تصویر میں عکس و سایہ کا نام نہیں۔ متقدمین میں جن سے زیادہ خوشنما تصویر چراگاہ کی آج تک کسی نے نہیں بنائی۔ پہاڑ اور ابر کی تصویروں میں مصنوعی اثرات کو زیادہ دخل ہوتا تھا۔

وہ چراگاہ کی تصویروں کو مسلسل کئی قطعات میں دکھاتے۔ ایسی تصویروں کو لکڑی میں لپیٹ کر کھلے ہوئے صندوق میں رکھتے، اور لکڑی کے ایک کنارہ کو گھماتے، اس طرح تصویر کا ہر قطعہ رفتہ رفتہ نظروں کے سامنے آتا جاتا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ سینما کی ایجاد کا پہلا زینہ ہے۔

چینی اپنے مورث و آباؤ اجداد کی روحوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اون کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بھی مُردوں کی روحیں خاندان کی عملی زندگی میں دخیل رہتی ہیں۔ ہر گھر میں ایک صندوق ہوتا ہے، جس میں روحوں کا قیام خیال کیا جاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر عمدہ عمدہ کھانے اوس صندوق کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

ہندؤں کے اصول حیات چینیوں کے فلسفۂ زلیست سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندو فلسفہ کے دلدادہ ہیں لیکن چینیوں کو علم اخلاق میں بے حد شغف ہے، کنفوشیس کے اُصول مذہب سے غیر متعلق ہیں۔ چینیوں کی سیاسی و اخلاقی زندگی دونوں علم اخلاق پر مبنی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف چینی ذہنیت بیحد قدامت پسند ہے۔ وہ کبھی بیرونی اگرد و پیش سے خود کو مطابق نہیں بنا سکتے۔

انیسویں صدی کی ابتداء تک چینی ذخیرہ ادبیات کا کوئی ملک مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ نجوم، جغرافیہ، علم الابدان وغیرہ وغیرہ تمام علوم پر اونکی نہایت عالمانہ تصنیفات موجود ہیں۔

پندرہویں صدی میں حکومت کی ایماء سے گیارہ ہزار جلدوں میں ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہوئی۔ ہر جلد دو نسخوں میں مرتب کی گئی۔ ہر جلد کا ایک نسخہ سولھویں صدی میں نظر آتش کردیا گیا۔ دوسرے نسخہ جات ہاکسر کے غدر تک پیکنگ میں موجود تھے۔ اسوقت صرف سو جلدیں موجود ہیں بقیہ سب ضائع ہوگئیں۔

جیسا میں عرض کرچکا ہوں، آپ چینیوں کے ہر شعبۂ زندگی میں علم الاخلاق کی تبلیغ کا اثر پائیں گے۔ اونکا ہر ادیب ناصح ہے، اور اونکا ہر شاعر واعظ۔ اس میں شبہ نہیں کہ چینی ادبیات موجودہ اُصول تنقید کا بار نہیں اُٹھا سکتے باایں ہمہ چین میں چند ایسے شاعر گزرے ہیں جنکا کلام کسی طرح غیر موثر نہیں سمجھا جاسکتا۔

زمانۂ قدیم سے چینیوں کو شاعری سے شغف ہے، علم عروض کے اُصول گو دقیق ہیں، لیکن چینی شاعری انکو سکون طلب زندگی اور مطمئن ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔

دورِ جدید

زمانہ کے انقلاب نے چینیوں کی بھی آنکھیں کھول دی ہیں۔ تین چوتھائی ملک افیون کا عادی تھا مگر چینی حکومت نے افیون کی درآمد قطعی بند کردی۔ بیرونی حریت کے اثرات کلیتًا نابود ہوگئے، لیکن ابھی تک ملک کو وہ اطمینان حاصل نہیں ہے، جس کی عافیت پرور آغوش ادبیات و فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہے قومی ترقی کی ابتداء و انتہا دونوں شاعری سے ہوتی ہے، چونکہ صحیح جذبات ترقی کے پیش خیمہ ہیں اور شاعری جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے قومی ترقی کے ابتدائی مراحل میں شاعرانہ تخیل بیحد معین ہوتی ہے۔ بسا اوقات

یہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ چینیوں نے خواب غفلت سے جو کروٹ لی تو اونھیں اپنی کمزوریاں محسوس ہوئیں۔ اور انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اون کی بدبختیوں کی تمامتر ذمہ داری استبدادی حکومت پر ہے، چنانچہ اونھوں نے سب سے پہلے اس کو فنا کیا، اور جب جمہوریت قائم ہو گئی تو ذہنیت بھی بدلنے لگی۔ چنانچہ موجودہ ذہنیت کا اندازہ مذکورہ ذیل کلام سے ہوگا:۔

(۱) غلامی کا دوسرا نام موت ہے۔ زندگی و آزادی مرادف الفاظ ہیں۔ اے موت تو آ۔ اور مجھے غلامی سے نجات دے۔ اس لئے کہ تیری نیش زنیاں حکومت کے پیہم مظالم سے کم نہیں۔ آ۔ اور جلد آ۔

(۲) اے قوم پرستو! اگر تم حصول ذرائع میں متحد نہیں ہو سکتے تو نہ ہو، لیکن خدا کے لئے مقاصد کا اختلاف نہ اختیار کرو، اس لئے کہ اختلاف مقصد موت کا پیش خیمہ ہے۔

(۳) زندگی صرف شجاعانہ زندگی کا نام ہے، فطرتی طرز موت ہے اگر تم ہلاک ہوئے تو وہ طرز موت عامیانہ ہے اگر تم نے اسوقت معین کو اپنی شجاعت سے پہلے بلا لیا تو تم خاصان خدا میں ہو۔

سید یامین ہاشمی ایم۔ اے

ایک چتا میں دو شعلے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صبح صادق کا وقت تھا۔ اسوقت گھاٹ کے کنارے کچھ عجیب منظر ہوتا ہے، صبح بنارس سے کون ناواقف ہے شہر کی معزز عورتیں اسی وقت اشنان کرنے آتی ہیں۔ اور فارغ ہو کر اندھیرے سے گھروں کو واپس جاتی ہیں۔ کسوم نے اُن موجوں کو جو گھاٹ کی سیڑھیوں سے ٹکرا رہی تھیں پیار کے انداز سے دیکھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر بو "اے میرے پیدا کرنیوالے تو خوب جانتا ہے کہ میری کلفتیں برداشت کی حد سے بڑھ گئی ہیں...... کبھی نہ ختم ہونیوالی تلخیوں نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔ اور پھر اس آخری چوٹ نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں رکھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ جا بوجھکر میں نے آج تک کوئی کام تیرے حکم کے خلاف نہیں کیا۔ لیکن اگر بھولے سے کوئی لغزش ہوئی ہو تو اے پرماتما اُسے معاف کر دے۔ میں تیرے حضور میں خود آ رہی ہوں، اپنے کرم کے صدقے میں مجھے وہاں آرام دینا۔"

کسوم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی آخری سیڑھی تک پہونچی۔ اور قریب تھا کہ وہ پانی میں کود کر دنیا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے کہ ایک بوڑھی عورت نے جو اُس کی تمام باتیں کھڑی سُن رہی تھی اس کی کمر کو پوری طاقت سے پکڑ لیا۔ کسوم نے چھڑانے کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو لجاجت سے کہا کہ پرماتما کے لئے مجھے مرنے سے نہ روکو۔"

بوڑھی عورت نے شفقت سے کہا:۔ "بیٹی تیری عمر اس قابل نہیں کہ تو ایسے ارادہ پر عمل جائے۔ ابھی دنیا کو تیری ضرورت ہے اور مجھ کو دنیا کی۔ جس پرماتما نے تجھے دکھ دیا ہے وہی آرام بھی دے گا۔"

بوڑھی عورت کی گفتگو میں اس قدر صداقت و متانت تھی کہ ناچار کسوم کو اپنے ارادوں سے باز آنا پڑا۔ گھاٹ سے کسوم کو الگ لیجا کر تسلی تشفی دی اور پوچھا "بیٹی تیرا گھر کہاں ہے؟" کسوم نے سسکتے ہوئے کہا کہ "اس دنیا میں کوئی نہیں۔" بوڑھی عورت جو بشرے سے شریف و معزز معلوم ہوتی تھی۔ بہت خوش ہوئی۔ بولی "بیٹی تو میرے ساتھ چل مجھے خدا نے کوئی لڑکی نہیں دی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے اپنی لڑکی کی طرح جانوں گی۔" عورت کی چتون سے شرافت ظاہر ہو رہی تھی کہ کسوم نے ساتھ ہونے میں کوئی تامل نہ کیا۔ اگرچہ اسکو کوئی خوشی اس سے نہیں ہوئی۔ بو

عورت جسکو لوگ ماتا جی کہتے تھے۔ کسوم سے بہت محبت اور پیار سے پیش آتی۔ یہاں تک کہ کسوم کا غم ایک حد تک غلط ہوگیا۔ ماتا جی ایک روز غیر معمولی طور پر خوش نظر آرہی تھیں۔ کسوم نے پوچھا تو کہا کہ "تیرے بھائی جو کچھ دنوں کے لئے کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہیں سے نینی تال چلے گئے تھے۔ ان کا خط آیا ہے اسی ہفتہ میں آنیوالے ہیں"۔

نینی تال پہنچتے ہی کنول کو افاقہ ہونے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ اس قابل ہوگئی کہ شیام نرائن کے ساتھ پہاڑوں اور چشموں کی سیر کرنے جایا کرتی۔ شیام نرائن کنول کی بلا کی ذہانت اُس کی طباعی اُس کے انداز گفتگو کو قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھنے لگا تھا۔ لیکن کنول کی خلش کی کوئی انتہا نہ رہتی جب وہ دیکھتی کہ شیام نرائن پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہے۔ جب وہ دونوں چہل قدمی کے لئے جاتے ہوئے کسی آبشار کے قریب یا گھاٹی میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتے اور کنول ایک سنجیدہ سکون کے ساتھ اپنی تمام دلآویزیوں کو صرف کرتی۔ تو شیام نرائن اپنی معمولی بے نیازی سے کنول کی طرف دیکھتا اور کنول کی کرشمہ سازیوں کو ایک ناقابل برداشت ٹھیس لگتی۔

شکست کا خیال کبھی کنول کے دماغ میں آیا ہی نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اپنے نہایت معمولی حربہ سے وہ ہر طاقت کو نیچا دکھا سکتی ہے۔ لیکن شیام نرائن کی مستقل خودداری نے اس کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کر رکھا تھا اور ان کی اسی مستقل مزاجی سے جہاں اسکی فطرت کو چوٹ پہنچتی تھی وہیں اس کو ایک مسرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ وہ اکثر نفسیات کی نازک بحثیں چھیڑ کر شیام نرائن کے حسیات کا امتحان لیا کرتی۔ جہاں تک ہوتا ان مباحثوں میں شیام نرائن ایک سنجیدہ اختصار سے کام لیتا جس سے کنول کی گرمیاں اور بڑھ جاتیں۔

ایک روز شیام نرائن برج نرائن بابو کے پاس تنہا بیٹھا تھا باتوں باتوں میں ایک مختصر سی تمہید کے بعد اس نے اسکی درخواست کی کہ برج نرائن بابو کنول کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیدیں۔ برج نرائن بابو راج کشور سے مایوس ہو چکے تھے۔ پھر شیام نرائن کی شرافت اور لیاقت بھی بخوبی دیکھ اور سُن چکے تھے۔ بولے کنول اگر راضی ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں۔

شام کو شیام نرائن اور کنول حسب معمول ٹہلنے کے لئے گئے۔ ایک گھاٹی پر جو ایک غیر معمولی بلندی پر واقع تھی دونوں نے چڑھنا شروع کیا۔ کنول ہنوز کمزور تھی۔ چنانچہ شیام نرائن نے اس کو اپنا ہاتھ دیدیا جس کی مدد سے کنول گھاٹی تک چڑھ گئی۔

گھاٹی خود ہی بہت دلکش تھی اور اسکے چاروں طرف کے مناظر بھی حد درجہ فرحت بخش تھے۔ آبشار اپنی سیمیں چادر سے دامن کوہ کو مالا مال کر رہی تھی، پانی کے کنارے سبزہ بہاؤ کے زور سے ہر لحظہ جنبش میں آجاتا تھا۔ کنول نے تیز بہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے دنیا میں کسی شے کو قرار نہیں۔ آبشار کا شفاف پانی جو حد درجہ دلکش ہے ایک نامعلوم جستجو میں ہمیشہ سرگرداں ہے۔" شیام نرائن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں کنول زندگی کے لطف کا راز جستجو اور کاوش ہے دنیا پر اگر جمود کا غلبہ ہو جائے۔ تو ہماری تمام امنگیں سرد پڑ جائیں۔ ہماری طبند آرزوئیں پست ہو جائیں۔ ہماری سرگرمیاں سرد ہو جائیں اور دلچسپی ایک فضول شے ہو جائے۔" کہتے کہتے شیام نرائن یک بیک خاموش ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد بولا۔ "کنول کچھ واقعات کی بنا پر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس چند روزہ زندگی کو تنہا رہ کر گزار دوں گا۔ لیکن کچھ دنوں سے یہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنا قدرت کے خلاف ایک بغاوت ہے، جس کے لئے میں کسی طرح تیار نہیں۔ ایسی حالت میں کیا تم میری رفیق زندگی بننا پسند کرو گی" کنول سکتہ میں آگئی۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ شیام نرائن کی ذات کو تمام ہستی سے بالاتر سمجھنے لگی تھی۔ اس کے سامنے وہ اپنی تمام فاتحانہ ادائیں بھول جاتی۔ کنول کا چہرہ ایک فوری جذبہ سے سُرخ ہو گیا۔ اور وہ عرق عرق ہو گئی۔ شیام نرائن نے یہ دیکھکر کہا "کنول اگر میں نے یہ کہکر تم کو تکلیف پہونچائی ہے تو اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو۔" کنول نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کی زبان خشک ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شیام نرائن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیام نرائن کنول کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "میں نے تمہارے پتاجی سے اس کے لئے کہا تھا۔ ان کو کوئی انکار نہیں۔ ہاں بشرطیکہ تم راضی ہو۔" شیام نرائن نے کنول کو زیادہ دیر تک اس ہیجان میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھکر اسکا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ "چلو واپس چلیں"۔

بنارس میں سالانہ اشنان کا میلہ ہونیوالا تھا۔ کنول اب بالکل تندرست ہو گئی تھی۔ شیام نرائن کے اصرار سے میلہ میں شریک ہونے کے لئے وہ دونوں بھی تیار ہو گئے، اور سب لوگ اسطرح بنارس آگئے۔

باوجود شیام نرائن کے اصرار کے برج نرائن بابو دریا کے کنارے ایک مکان کرایہ پر لیکر میلہ کا انتظار کرنے لگے۔ طے یہ پایا کہ میلہ کے بعد کنول اور شیام نرائن کی شادی کر دیجائے۔

نول کشور کی بی بی جو صبح کو اُٹھیں تو اپنے سرہانے دو خط پڑے پائے۔ ایک تو بند تھا اور دوسرا کھُلا ہوا تھا۔ اسپر یہ عبارت لکھی تھی:-

"پیاری بہن۔ یہ حد درجہ کی بداخلاقی ہے کہ آپ کی بے انتہا عنایات اور اخلاص کا شکریہ ادا کئے بغیر یوں یک بیک آپ سے جدا ہو جاؤں۔ لیکن قدرت کے کرشمے انوکھے ہیں۔ پس آپ یہ یقین کر لیں کہ میری مجبوری اسکی ذمہ دار ہے۔ جب وکیل صاحب کلکتہ سے آئیں تو دوسرا خط ان کو صرف اُنھیں کو دیدیجیگا۔"

"کسوم"

نول کشور کی بی بی گھبرائی ہوئی کسوم کے کمرہ میں گئیں۔ سب چیزیں بدستور پائیں۔ کسوم البتہ نہیں تھی وکیل صاحب

کو بلا کر سب حال سنایا۔ وکیل صاحب بیچارے پریشان ہو گئے دو پہر تک بیکار تلاش کرنیکے بعد راج کشور کو ذیل کا تار دیا۔
"جس قدر جلد ممکن ہو بکسر آؤ"

کنول کا خط ملنے کے بعد جو کیفیت راج کشور کی ہوئی وہ عجیب تھی۔ معلوم نہیں وہ خیالات کے کن دشوار گذار مراحل کو طے کر رہا تھا کہ ہر وقت اس کا چہرہ تمتایا رہتا، اور اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے، کنول کے لئے اس نے کس کس طرح اپنے ضمیر کا خون کیا تھا۔ حقیقت سے کسوم کو نا آشنا رکھنا یا انکشاف حقیقت کرکے دوبارہ اس سے جائز طور پر رشتہ نہ قائم کرنا اس کا جابرہ وہ کنول کو تصور کرتا تھا۔ اس کے اسطرح کھو جانے سے راج کشور کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عنصر جس سے اس کے جذبات میں گرمی اور حرارت پیدا ہوتی تھی اس سے یکبارگی چھین لیا گیا ہے۔

ان خیالات کا سلسلہ جب ختم ہوتا تو اُس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوتی۔ اور اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح کسوم کی ذات سے ہوتا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ اس کی بے پرواہی نے کسوم کے دل کا بُری طرح خون کیا ہے اس کا ضمیر کسوم کی پاک زندگی کے تباہ کرنے پر اسکو بے انتہا نفرین کرتا۔ اس کو بعض وقت یہ بھی خیال ہوتا کہ اب اگر تمام یکسوئی کے ساتھ بھی کسوم کی دلدہی کیجائے جب بھی اس کی کلفتوں کی تلافی ممکن نہیں۔ بہرحال وہ قریب قریب طے کر چکا تھا کہ جو کچھ بھی ہو کسوم سے صرف کنول کا واقعہ محفوظ رکھتے ہوئے تمام حقیقت بیان کردیجائے، اور پھر اگر کسوم راضی ہو جائے جسکی اُسے امید بھی تو وہ کنول کا خیال دل سے نکال کر کسی طرح یہ چند روزہ زندگی گذار دے۔ اب جو اسکو یہ تار ملا تو اس کے دل سے یہ آواز آنے لگی کہ ہو نہ ہو کسوم بھی اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی۔ وہ صدور یہ سراسیمہ بکسر پہنچا۔ بابو نول کشور نے جو کسوم کے یک بیک غائب ہو جانے کا حال اس سے بتلایا تو وہ سر دپڑ گیا۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ دنیا کی تمام ہستیاں اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ احساس اُس کے لئے سوہان روح تھا کہ اس دنیا کی ایک انتہائی پاک اور معصوم ہستی کا خون اُس کی گردن پر ہے۔ مواخذہ کے خیال سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے شمار خوفناک اور کریہہ المنظر شکلیں دکھلائی دے رہی تھیں، جو ایک طنز یہ ہنسی سے اس کو اپنی طرف آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور کچھ دیر کے لئے اس کی ایسی کیفیت ہو گئی کہ نول کشور بابو سہم گئے۔ لوگوں نے سر پر برف رکھا شربت کے قطرے حلق سے اُتارے۔ بارے کچھ دیر کے بعد راج کشور کی طبیعت قدرے سنبھلی تو نول کشور نے کسوم کا خط جو راج کشور کے نام کا تھا لاکر دیا۔ راج کشور نے ایک سرد ہیجان کے ساتھ لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"راج کشور بابو۔

آپ نے جو خط میرے لئے لکھا تھا وہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آج میرے ہاتھ پڑ گیا۔ ایسی حالت میں مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ممکن ہے کہ میں آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہوں۔ اس لئے اُن تمام کلفتوں کی جو میری وجہ سے آپکو خواہ مخواہ برداشت کرنا پڑیں۔ معافی چاہتی ہوں۔ چونکہ اپنے تاریک مستقبل سے قطعی ناآشنا ہوں میں نہیں

کہہ سکتی کہ کہاں جا رہی ہوں؟ آپ میری جستجو کی کوشش نہ کیجئے گا۔ "کسوم"

راج کشور پر متواتر کچھ اسطرح صدمے گذرے کہ وہ متوحش ہو کے رہگیا، وہ جسقدر اپنی حالت پر غور کرتا اُسکو اپنے آپ سے نفرت ہوتی جاتی۔ اس کے جانگداز احساسات عمیق تر ہوتے جاتے۔ اسکو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی روح ایک عمیق ترین غار میں جا پڑی ہے۔ جہاں سے وہ واپس نہیں آسکتی۔ رہ رہ کر اُس کے کلیجہ سے دھواں سا اُٹھتا، اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ اُسے بکسر میں حد درجہ کی وحشت ہونے لگی۔ گھبرا کر وہ کلکتہ واپس گیا۔ لیکن چونکہ سکون وہ کھو چکا تھا۔ اس لئے اُس کی کلفتیں بڑھتی گئیں اور اس کی صحت بھی بُری طرح برباد ہونے لگی۔

شیام نرائن اور کنول کو بنارس آئے ہوئے دو ہفتہ ہو گئے۔ کسوم کے متعلق ماتا جی نے ایک مجمل سا حال شیام نرائن کو بتلا دیا۔ جستجو کرنا شیام نرائن کی عادت کے خلاف تھا۔ اس لئے اُس نے اور کچھ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن باوجود ازادی غفلت کے شیام نرائن یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کسوم کی معصوم نگاہوں میں کسی بالاتر عالم کا راز پنہاں ہے۔

کنول بھی کسوم کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی لینے لگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسکو کسوم سے کوئی اخلاص تھا یا کیا، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ شیام نرائن کی غیر حاضری میں دیر تک کسوم کے ساتھ بیٹھی رہتی۔ کنول کلکتہ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی۔ لیکن سیدھی سادھی کسوم کے سامنے وہ اپنی تمام قابلیت بھول جاتی۔ کسوم کو وہ قدرت کی تکمیلات کا ایک بیش بہا نمونہ سمجھنے لگی تھی۔ اور اُس کو اس کا اعتراف تھا کہ کسوم کے پاک جذبات کا جواب دینے سے اس کا تمام علم قاصر تھا اُس کو کسوم کو دیکھ کر یہ حقیقت اُس پر واضح ہو گئی تھی کہ وسعت دماغی یا کمال تمدن نسائیت کا اصل مدعا نہیں۔ بلکہ عورت کی کبھی نہ فتح ہونے والی قوت جس کے ایک معمولی کرشمہ سے وہ دنیا کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ ان تمام تحصیلات سے بالاتر ہے۔ کسوم کنول کی فطرت سے گھبراتی ضرور تھی، مگر اس کا خمیر محبت اور اخلاص سے تھا۔ کنول کے اتحاد کو وہ ٹھکرا نہ سکی۔ اور ان دو متضاد ہستیوں میں ایک بہناپا قائم ہو گیا۔ کنول اکثر کسوم کا حال پوچھتی، مگر وہ یہ کہکر ٹال دیتی کہ "سُن کر کیا کرو گی؟"

ایک روز کنول اس پر تُل گئی کہ جو کچھ بھی ہو وہ سُن کے رہیگی۔ کسوم نے حیلہ حوالہ کیا تو کنول نے رنجیدہ ہو کر کہا "بہن تمہارا کچھ قصور نہیں یہ میری فطرت کا قصور ہے کہ میں اعتبار کے قابل نہیں"۔ یہ کہکر کنول کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسوم سے کنول کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بولی "یہ تو میں تکو چھیڑنے کے لئے کہتی تھی۔ کنول سنو۔ مگر تمہارا کمزور دل ملول ہو جائے گا"۔ یہ کہکر کسوم نے آنکھیں زمین سے گڑا لیں۔ اور اجمالاً اپنی بیتی۔ عہد طفولیت، شادی، طوفان۔ راج کشور سے سابقہ۔ پھر راج کشور کا حقیقت سے آشنا ہو کر اس سے کچھ دنوں کنارہ کش رہنا، لیکن اس کو

وعدہ رکھنا۔ پھر اس کا اسکول میں داخل ہونا۔ بکھر آنا۔ وہاں اتفاقیہ راج کشور کی تحریر کے ملنے کے بعد کاشی آنا اور ماتاجی کا اس کو مرنے سے روک کر گھر لانا ـــــ سب بتلا دیا۔ یاد ماضی نے کسوم کا غم تازہ کر دیا۔ اور کچھ دیر تک وہ سسک سسک کر زار و قطار روتی رہی۔ کنول بہت متاثر ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسوم کو تسلی تشفی دلائے۔ لیکن اس کے منہ سے ایک حرف نہ نکل سکا، اور وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُٹھی اور خدا حافظ کہکر اپنے گھر چلدی۔

کنول نے کسوم کے بیان سے اتنا گہرا اثر لیا تھا کہ شام کو جب شیام نرائن کے ساتھ وہ ٹہلنے گئی تو بالکل خاموش تھی۔ شیام نرائن نے کہا "تم بہت مضمحل معلوم ہوتی ہو۔ گھر چلو تم کو کچھ دوا دوں؟" کنول کو دوا تو پینی تھی نہیں، لیکن جب شیام نرائن گھر چلنے کے لئے واپس ہوا تو وہ اُس کے ساتھ غیر ارادی طور پہ ہو گئی۔ گھر پہنچکر کنول نے کہا "کہ میں اچھی ہوں۔ دوا کی ضرورت نہیں"۔

کنول نے کہا "یہاں گرمی ہے آؤ کوٹھے پر چلیں"۔ اپنی درد بھری داستان دوہرانے کے بعد کسوم کچھ ایسی مضمحل ہو گئی کہ وہ ماتاجی سے یہ کہکر کہ طبیعت بھاری ہے۔ کوٹھے پر برآمدہ میں ایک چارپائی ڈال کر پڑ رہی وہ اسیطرح ایک نیم غنودگی کی کیفیت میں پڑی تھی۔ کہ کنول اور شیام نرائن آئے اور کسوم سے بے خبر کمرہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد کنول نے پوچھا آپ نے شادی کے متعلق میری رضامندی دریافت فرماتے ہوئے یہ کہا تھا کہ آپ نے بعض اسباب کی بناء پر شادی کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کیا بات تھی؟ جس نے آپ کو میری صنف سے اس قدر مایوس کر دیا تھا"۔ شیام نرائن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"کنول مایوس ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اب تم نے پوچھا ہے تو سُن لو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنیکے بعد میرا ارادہ ہوا کہ کلکتہ ہی میں کچھ دنوں کسی پرانے ڈاکٹر کے ساتھ مشق کروں۔ جس ڈاکٹر کے ساتھ میں نے اپنی مشق شروع کی اُنکے پاس میرے ہی ساتھ کے ایک اور ڈاکٹر شیو کمار مشق کے لئے آیا کرتے تھے۔ انکا مکان پٹنہ کے قریب ایک موضع کرن پور میں تھا۔" کرن پور" کنول چونکی۔ صبح کو وہ کسوم سے سُن چکی تھی کہ اس کا وطن کرن پور تھا۔ شیام نرائن نے کہا "ہاں کرن پور میں تھا۔ ایک مرتبہ شیو کمار بہت اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ازدواج کے مسئلہ پر مجھے اور شیو کمار سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ اس کے لئے شادی کے پیغامات آ چکے تھے، لیکن اُس نے کسی کا صاف جواب دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ شادی ایسی جگہ کرے۔ جہاں سے معقول رقم ہاتھ لگے۔ میں ہمیشہ اُس کے اس خیال سے جھگڑتا رہا۔ چنانچہ کرن پور جانے پر چونکہ بیکاری تھی۔ اس مسئلہ پر اکثر گفتگو رہا کرتی۔ میں یہ کہا کرتا تھا کہ شادی سوسائٹی کا ایک اصول ہے، اور ہر اصول اسلئے وضع ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو۔ اور اس طرح ازدواج کا نصب العین سوسائٹی کے بگڑتے ہوئے افراد کی زندگی کو سنبھالنا ہے۔ ایک ہونہار اور لائق جوان ہونے کی حیثیت سے تمہارا یہ فرض ہے کہ تم اپنی شریک زندگی کے لئے

اُس فرد کو انتخاب کرو جس کی حالت اسکی محتاج ہو کہ تمہاری مدد سے اس کی زندگی ٹھکانے لگ جائے۔ اس طرح تم سوسائٹی کے ایک فرد کو ظاہری بربادی اور باطنی ہلاکت سے بچا کر ازدواج کا مقصد پورا کروگے۔ اگر تم نے بر خلاف اس کے اپنے لئے ایک ایسا انتخاب کیا جس سے تم کو ہر قسم کے دنیاوی فائدے کی امید ہے تو تم اُس فرد کی حق تلفی کروگے جسکی حالت تمہاری امداد کی محتاج تھی۔ اور اس طرح تم سوسائٹی کے دو افراد کی زندگی برباد کرنیکے ذمہ دار ہوگے۔ شیو کمار اگر ازدواج میں یہ مقصد جو میں کہہ رہا ہوں نہ پنہاں ہوتا تو میں اس کو ہرگز ایک پاک رشتہ نہ تصور کرتا بلکہ یا تو اسے ایک جذبۂ شہوانی کہتا۔ یا خود غرضی اور دنائت "

ایک روز دوران گفتگو میں شیو کمار نے کہا کہ آپ بڑے رفارمر بنتے ہیں۔ دوسرے کی زندگی درست کرنیکا بڑا خیال ہے۔ پڑوس میں ایک نہایت شریف خاندان کی لڑکی پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ اُس کے والدین بچپن ہی میں مر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پنڈت جی کے یہاں رہتی ہے۔ لڑکی بیچاری میں نے سنا نہایت خوبصورت اور نیک ہے لیکن پنڈتائن اور اُن کی لڑکیوں نے اس کی جان مصیبت میں کر رکھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اکثر کہتی ہے کہ میں اپنی جان دیدوں گی۔ لوگ اُس کی پیاری پیاری صورت اور سیدھے پن پر بہت ترس کھاتے ہیں۔ لیکن کوئی اُس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔

آپ اگر سوسائٹی کے ایک فرد کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں، تو اس سے شادی کر لیجئے۔ پھر میں سمجھوں کہ جو تم کہتے ہو اس میں کچھ خلوص بھی ہے۔

میں نے کہا:- شیو کمار میں جو کچھ کہتا ہوں اُس کو اپنے دل کے ہر ہر گوشہ میں صداقت اور اخلاص کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ اگر واقعی میری وجہ سے ایک غریب لڑکی کی زندگی ٹھکانے لگ جائے تو میں سمجھونگا کہ مقصد حیات پورا ہو گیا۔" مختصر یہ کہ شیو کمار کے ذریعہ سے بات طے ہو گئی اور اُسی ہفتہ کے اندر سیدھے سادے طریقہ سے میری اس لڑکی کے ساتھ شادی ہو گئی۔ شادی کے دوسرے ہی روز باوجود شیو کمار کے اصرار کے میں مع اپنی بیوی کے کلکتہ آنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پنڈت جی نے بھی مان لیا۔ راستہ میں کچھ دور کے لئے کشتی کا سفر تھا۔ ہم لوگ جب کشتی سے جا رہے تھے۔ ایک تیز سخت طوفان اُٹھا اور ملاحوں کی باوجود سخت احتیاط کے کشتی اُلٹ گئی۔

مجھے جو ہوش آیا تو میں پانی کے کنارے پڑا تھا۔ لیکن کسی اور کا پتہ نہ تھا۔ میں نے بہت سر مارا۔ لیکن اُس لڑکی کا جسکی میں نے صورت تک نہیں دیکھی تھی نشان تک نہ ملا۔ تھک کر کلکتہ چلا آیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ حتی الامکان اب شادی نہیں کروں گا۔ میرے دل پر بہت دنوں ایک بوجھ سا رہا۔ مگر تمہاری ملاقات میری زندگی ایک نئے ولولے سے معمور ہو گئی اور بالآخر مجھے اپنے ارادہ سے واپس ہونا پڑا۔" شیام نرائن نے کنول کی صورت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا وہ زار وقطار رو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ خیر تو ہے تم اسقدر پریشان کیوں ہو گئیں۔ کنول نے اس خیال سے

کہ شیام نرائن کو کوئی شبہ ہو جائے کہکر ٹالدیا۔ کہ طبیعت آج مضمحل سی تھی۔ تمہارے افسانہ نے بڑا اثر کیا۔" حقیقت یہ تھی کہ کنول یہ معلوم کر کے سراسیمہ ہو گئی کہ شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی جسے وہ مردہ تصور کر چکا ہے کسوم ہے۔ اور کسوم جو پڑی ہوئی شیام نرائن کی باتیں سُن رہی تھی یہ معلوم کر کے ایک سکتہ میں آگئی کہ اس کا اصل شوہر شیام نرائن ہے۔

نیرنگ کدۂ ہستی کا یہ دوسرا کھیل تھا اور کسوم میں اتنا دم باقی نہ رہگیا تھا کہ وہ اس کے کھیلنے کی تاب لاتی۔ اسے زہر آلود بھول بھلیاں سے وہ گھبرا اُٹھی تھی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ اس کشمکش سے آزاد ہونے کے لئے اسکی روح سخت بیتاب ہے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ زمانہ نے اس کو اس قابل نہ رکھا تھا کہ شیام نرائن کی ہمدم بننے کی وہ جراٴت کرتی۔ اس کو اس کا قلق تھا کہ اس نے اپنے واقعات کیوں کنول کے گوشگزار کر دئے۔ وہ ایک غیر معلوم حالت میں جان دینا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ اگر کنول سے اس نے یہ حال نہ کہا ہوتا تو ماتا جی کی زندگی تک کم از کم وہ وہاں سے علیحدہ ہونے کی کوشش نہ کرتی۔ اور یہ سوچکر کلیجہ پر صبر کی سِل رکھ لیتی۔ کہ گرچہ اُس کا شوہر اُس کی دسترس سے باہر ہے لیکن قسمت نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے لیکن اب صورت حال دگرگوں تھی۔ وہ کنول کی فطرت سے واقف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کنول اس سے کنول ہو کر نہ ملے گی۔ بلکہ شیام نرائن کی بی بی اور اُس کی رقیب ہو کر اور پھر معلوم نہیں وہ کیا کرے؟ اور اس کا اثر کسوم کی زندگی پر کیا ہو؟ اس جانسوز کشمکش میں کسوم نے تارے گِن گِن کر رات گذار دی۔ صبح ہوئی تو اسکے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔

کنول کی حالت نازک تھی۔ وہ شیام نرائن سے بخوشی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ کسوم کے ہوتے ہوئے اُسے شیام نرائن پر کوئی حق حاصل نہیں ہے لرز جاتی۔

تین روز ہو گئے اور کنول شیام نرائن کے مکان پر نہ آئی۔ شیام نرائن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ تیسرے روز وہ کنول کے پاس خود گیا۔ کنول کے برتاؤ میں کوئی خاص فرق نہ تھا ہاں وہ ایک حد تک مضمحل ضرور تھی۔ دو دن ٹہلتے گئے۔ تو شیام نرائن نے جو ایک خاص بات محسوس کی وہ کنول کی نگاہوں کا سنجیدہ استفسار تھا۔

صبح سے کاشی کا سالانہ اشنان شروع ہونیوالا تھا۔ ماتا جی بہت خوش تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد شیام نرائن دولھا بننے والا تھا۔ وہ نہایت سرگرمی سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ کسوم بھی کلیجہ پر پتھر رکھکر ان کے ساتھ کاموں میں مشغول تھی۔ اس کا مستقبل صرف خوفناک طور پر تاریک ہی نہیں بلکہ حد درجہ متوحش کن تھا۔ برداشت کی تمام طاقتیں اس کی سلب ہو چکی تھیں۔ اسکی وہی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی انتہائے رنج میں بالکل بے حس ہو جائے۔ فطری طور پر ایسی حالت میں اس کا طرز عمل قطعی غیر ارادی تھا۔ ماتا جی کسوم کی اس کیفیت سے متاثر ضرور تھیں لیکن ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

ماتا جی نے کسوم اور شیام نرائن سے کہدیا تھا کہ سویرے سو رہیں۔ کیونکہ اشنان کے لئے رات رہے

اُٹھنا پڑے گا۔ کسوم پلنگ پر پڑی اپنی مصیبت کی گھڑیاں گن رہی تھی کہ ماتا جی نے اس سے پکار کر کہا کہ گھاٹ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔

گاڑی میں اتفاق سے ایک طرف ماتا جی اور خادمہ بیٹھ گئی۔ دوسری طرف شیام نرائن اور مجبوراً کسوم کو ساتھ بیٹھنا پڑا۔ اسوقت کسوم کا اضطرار اُس کے لئے ہلاک کن ثابت ہو رہا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ گاڑی کسی چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اور وہ اس مجبوری سے نجات پائے۔ گاڑی چلتے چلتے ہچکولے لیتی اور شیام نرائن کا بدن کسوم سے مس ہوتا جس سے کسوم کے تمام بدن میں ایک جانسوز سنسنی پیدا ہونے لگتی۔ گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔ شیام نرائن ایک بار اُٹھا تاکہ سر نکال کر دیکھے کہ گھاٹ کتنی دور رہ گیا ہے۔ اُٹھتے وقت اتفاق سے اس نے اپنا ہاتھ کسوم کے شانوں پر رکھدیا۔ کسوم کے حسیات کی ہلچل آخری درجہ تک پہونچ گئی۔

گاڑی گھاٹ پر پہنچ گئی۔ برج نرائن اور کنول پہلے سے منتظر تھے۔ کسوم کنول سے آنکھ چار کرتے ہی اس طرح زرد پڑ گئی کہ اسکو چھپانے کے لئے تمام طاقت صرف کرنی پڑی۔ کنول بھی کسوم کو دیکھکر بے اختیار جھجک سی گئی۔

گھاٹ پر بہت ہجوم تھا۔ ملک کے ہر حصہ سے لوگ اس مقدس دریا کے کنارے اور خاص کر اس موقعہ پر جب اسکی برکت دونی ہو جاتی ہے اپنے گناہ دھونے آتے ہیں۔ آفتاب نکلنے سے پہلے یہ لوگ اشنان سے فارغ ہو کر گھر واپس ہو گئے اشنان کے بعد باوجود انکار کے کسوم کو وہی ساری پہننی پڑی جو ماتا جی نے اُس کے لئے اُسی روز کے واسطے تیار کی تھی۔ کسوم مضمحل ضرور تھی۔ لیکن اس کے اس اضمحلال میں بھی ایک غیر معلوم لطافت ایک غیر محسوس کیف تھا۔ اس کا ارغوانی رنگ ایک حد تک زعفران کی رنگت لئے ہوئے تھا۔ اس کی عنابی ساری کا عکس اس کے چہرے کی سپیدی سے مل مل کر خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس کی پلکیں قدرتی طور پر بہت لانبی تھیں۔ لیکن آج انتہائے رنج سے وہ ان کو اس طرح جھکائے تھی۔ کہ بات کرتے وقت بھی اس کی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتیں۔

اشنان سے واپسی میں کئی مرتبہ شیام نرائن کی آنکھیں کسوم سے چار ہو گئیں۔ کسوم تو عرق عرق ہو جاتی۔ لیکن شیام نرائن ہکا بکا ہو کر رہجاتا۔

گھاٹ سے واپس ہوتے ہی ماتا جی کو خفیف سی حرارت ہو گئی اور شام تک ان کو کافی تیز بخار ہو گیا۔ صبح تک بخار اسقدر بڑھ گیا کہ شیام نرائن گھبرا گیا۔ اور یہ معلوم کرکے بہت پریشان ہوا کہ انکو مہلک قسم کا بخار آ گیا ہے۔

ماتا جی کی حالت نازک ہو تی گئی۔ کسوم کا کلیجہ اس درد سے پھٹا جا رہا تھا کہ زندگی بھر میں اس کو ایک ہمدرد ملا تھا۔ اُسے بھی قدرت اُس سے چھینا چاہتی ہے۔ وہ انتہائے خلوص انہماک سے ماتا جی کی تیمارداری میں مشغول تھی۔ رات رات بھر پلنگ سے سر لگائے یہ دیکھتی رہتی کہ خدانخواستہ ماتا جی کا دم تو نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ لیکن اسکے

باوجودیکہ گھر کا کام جو تمام اُسکی ذمہ داری پر تھا اس قرینہ اور جانفشانی سے کرتی رہی کہ ماتاجی کی علالت سے گھر کے کام کاج میں رتی بھر کا فرق نہ آیا۔ دن رات میں شاید وہ کسی وقت آرام نہ کرتی تھی۔ کسوم واقعہ یہ ہے کہ ایک ہندوستانی بیوی کی صحیح مثال پیش کر رہی تھی۔ شیام نرائن سے نہ رہا گیا وہ ایک دن اُس نے کہا: "کسوم تم کسی وقت آرام نہیں کرتیں اگر خدا نخواستہ تمھاری بھی طبیعت ناساز ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟" کسوم خاموش رہی۔ کنول کسوم کی جانفشانیوں کی داد دل سے دے رہی تھی۔ اسکو یہ معلوم ہو گیا کہ صرف تعلیم و معاشرتی تہذیب انسان کا کمال نہیں۔ بلکہ وہ چیز جو انسان کو تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا درد دل اور بے غرضی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کسوم سے بہت پیچھے پاتی وہ کسوم کو ایک معصوم اور دیوی فرشتہ خیال کرنے لگی اور اس کی حق تلفی کے خیال سے اس کو جانکنی سی ہونے لگتی۔

ایک شام کنول ماتاجی کو دیکھنے آئی۔ ماتاجی پر ایک نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ کسوم پلنگ کے پاس بیٹھی تھی۔ کنول کو آتا دیکھکر نہایت خندہ پیشانی سے بلا کر اپنے قریب بٹھلایا۔ کسوم واقعی ماتاجی کی بیماری میں اسقدر منہمک تھی کہ وہ اپنی رسوائیاں ایک حد تک بھول گئی تھی۔ لیکن کنول کو دیکھکر وہ پھر تازہ ہو جاتیں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ کنول کی جانب سے رقابت کا خیال اس کے دل میں بغض کا خیال پیدا کرتا ہو۔ وہ ان منزلوں سے اپنے خیال میں گذر چکی تھی۔ اس نے کنول کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا: "کنول اب تم نے یہاں آنا کیوں اسقدر کم کر دیا۔ اسوقت جب ماتاجی کی حالت نازک ہے سخت نگہبانی کی ضرورت ہے۔ اور میں اپنی جہالت سے بجائے کام بنانے کے بگاڑ دیتی ہوں۔ کیا رسوم کی پابندی میں تم ابھی اس گھر سے اجنبیت قائم رکھنا چاہتی ہو؟"

وہ کسوم کی اس قربانی پر جسے وہ ہنس ہنس کر کر رہی تھی تصویر حیرت بنکر رہ گئی۔ کسوم کے منھ سے وہ اسٹونسن اور گوئٹے کا فلسفہ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کے فطری جذبات کسقدر پاکیزہ ہیں۔ کسوم کی یہ خوبیاں کنول کی زندگی کے نئے اوراق اُلٹ رہی تھیں۔ اور اُسے یقین ہو گیا کہ کسوم کے جائز حق پر قابو پا کر وہ کبھی خوشی کا ایک سانس نہیں لے سکتی۔ اور جب کسوم نے پھر چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ کاش ماتاجی اُسوقت بیمار پڑتیں جب تم اس گھر میں مستقل طور پر آجاتیں۔ تو کنول اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی جوش سے سُرخ ہو رہا تھا۔ "کسوم! میں غاصب ہو کر اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ تمکو خدا تمہارا گھر مبارک کرے۔ تمکو معلوم ہے کہ تم شیام نرائن کی کھوئی ہوئی بیوی کسوم ہو۔" یہ تھے وہ الفاظ جو کنول کانپتی ہوئی آواز سے ادا کر کے کسوم کو ایک ساکت بت کی طرح چھوڑ کر چلی گئی۔

شیام نرائن کے مکان سے نکلکر کنول نے سواری کا انتظار نہ کیا اور پیدل ساحل کی سڑک سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ اُس نے ایک بوجھ اپنے ضمیر سے اُتار دیا۔ یکایک اُس کے قریب ایک گاڑی آکر رُکی۔ اُس نے جو سر اُٹھا کر دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ راج کشور اس گاڑی پر تنہا بیٹھا تھا۔ اُس نے بلا کسی تصنع کے کنول سے کہا: "اگر کوئی حرج نہ ہو تو گاڑی پر آجائیے۔ میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔" کنول ایسی کھو گئی تھی کہ وہ بغیر کسی ارادے

کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اور کچھ دیر تک اس کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کس ماحول میں ہے؟ آخر راج کشور بولا۔
"کنول تم اسقدر مجھ سے اجنبی کیوں ہو گئیں۔ اگر تم کو میرے قصور کا علم ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں کسقدر مجبور اور بےبس تھا۔ خیر گذری ہوئی باتوں کو جانے دو۔ میں نے تم کو کسوم اور ڈاکٹر شیام نرائن صاحب کے ساتھ گھاٹ پاشنان کے پہلے روز دیکھا تھا۔ میں نے اپنی موجودگی کا علم تم کو اس لئے نہیں ہونے دیا کہ میں تمہارے پُر سرور لمحات کو تلخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تاریخ تو مقرر ہو چکی تھی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی" کنول اب اپنے ہوش میں آگئی تھی۔ وہ راج کشور کی اس بے تعلقی اور استقلال پر متعجب تھی۔ جس بات سے اُسکے دل کو ایک حرکت ہوئی وہ یہ تھی کہ راج کشور زرد اور نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی حالت دیکھکر کسوم نے آسانی سے سمجھ لیا کہ اس کو دق ہو گئی ہے۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو جمع کرکے بولی: "ڈاکٹر صاحب سے اس لئے شادی نہیں ہو سکتی کہ ان کی بیوی موجود ہے۔ گرچہ ابھی اس کا علم ان کو نہیں۔ لیکن میں اس حق تلفی کو گوارا نہیں کرونگی۔"

راج کشور کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گیا۔ گرم گرم آنسوؤں کے قطرہ کنول کے ہاتھ پر گرے، وہ چونک پڑی اور حسرت سے راج کشور کی صورت دیکھنے لگی۔ راج کشور نے کہا "اور ڈاکٹر کی اصلی بیوی کسوم ہے؟" کنول نے سر ہلایا۔ اتنے میں راج کشور کا مکان آگیا وہ اُتر پڑا اور گاڑی والے سے یہ ہدایت کرکے کہ کنول کو اُس کے مکان پہنچا دے۔ کنول سے خدا حافظ کہتا ہوا چھڑی کا سہارا لیتا ہوا مکان کے اندر چلا گیا۔

اس واقعہ کو دو ہفتہ گذر گئے ہیں۔ ماتاجی اچھی ہو گئی ہیں۔ ضعف باقی رہ گیا ہے۔ ان کو کسوم سے پہلے جو انہاک تھا وہ ایک مستقل محبت مادرانہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور جس خلوص سے اب بھی کسوم اُن کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی اُس پر بعض وقت ماتاجی کو شرم آنے لگتی۔

شیام نرائن کو کنول کی اندنوں کی بے تعلقی بہت گراں گذر رہی تھی۔ وہ دو ہفتہ سے ماتاجی کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ شام کے وقت شیام نرائن کمرہ میں بیٹھا اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ کہ ایک ایسی لڑکی جو دور سے اس قدر یگانہ ہو کیونکر اُس کو خوش رکھ سکتی ہے۔ یکایک دروازہ کھلا اور کنول خاموش آکر بیٹھ گئی۔ شیام نرائن نے رسمی مزاج پُرسی کی۔ کنول نے کہا زندہ ہوں۔ اور پھر نہایت سنجیدگی سے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا: "ڈاکٹر صاحب آپ کو میری اندنوں کی کج خلقی بہت ناگوار گذر رہی ہوگی۔ لیکن واقعات کی بناء پر مجبور تھی۔ بات یہ ہے کہ آپ کی جائز بیوی کی موجودگی میں چونکہ آپ کو علم نہیں مجھے آپ سے کسی ایسے قسم کی امید وابستہ کرنا میری ایک دنائت ہوتی۔ اور اُس نے کسوم کی پوری سرگذشت شروع سے اخیر تک حرف بحرف سُنادی۔ اس سلسلہ میں اُس نے نہایت صفائی سے اپنا اور راج کشور کا تعلق بھی بیان کر دیا۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اپنی کج خلقی سے جو واقعی فطرت سے مجھ میں ودیعت ہوئی ہے آپ بھی اپنی طرف سے اسلئے بے رخی پیدا کر رہی تھی کہ آپ اس واقعہ کے سننے کے لئے تیار ہو جائیں۔ آپ کی چونکہ میں دل سے عزت

کرتی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو میرے چھٹنے کا زیادہ غم ہو اور اپنی قابل پرستش فرشتہ خصلت بیوی کے واپس ملنے کی آپ کو خوشی نہ ہو۔ میں نے کسوم کو بھی حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔"

شیام نرائن انتہائی سنجیدگی سے شروع سے لیکر اخیر تک بیٹھا رہا۔ اپنے اوپر اُس نے اسقدر قابو رکھا کہ کنول کو دیکھکر تعجب ہوا۔ کنول کے چلے جانیکے بعد شیام نرائن نے اپنا سر میز پر ڈالدیا اور دو گھنٹہ اسی طرح معلوم نہیں کن استغراق میں پڑا رہا۔ وہ اُٹھا تو اُس کا تمام جسم اسطرح پسینہ سے بھیگا تھا۔ جیسے کسی نے گھڑوں پانی ڈالدیا ہو۔ وہ نہاکر سیدھا اندر گیا۔ اور کھانا کیلئے کمرہ میں چلا گیا۔ اتفاق سے کام کرنیوالی اُس روز سویرے چلی گئی تھی۔ ناچار کھانا کسوم ہی کو لانا پڑا۔ کھانا لیکر وہ شیام نرائن کے سامنے آئی۔ لیکن اس طرح کہ مجسم ارتعاش تھی۔

شیام نرائن نے اُسکی اس کیفیت کو دیکھا اور جب وہ کھانا رکھکر واپس ہو رہی تھی تو شیام نرائن اس کا ہاتھ پکڑکر بولا:۔ "کسوم مجھ سے کیسی شرم"؟ کسوم پر جیسی بجلی گر گئی ہو۔ وہ سمجھ گئی کہ کنول نے تمام حال شیام نرائن سے کہدیا۔ اور کانپ کر فرش پر گر گئی۔

کسوم کو جب ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا سر شیام نرائن کی آغوش میں ہے۔ کسوم نے یہ کہکر اُٹھنے کی کوشش کی کہ "مجھے چھوڑ دو میرا ماضی بہت سیاہ ہے"۔ لیکن اُسے اُٹھنے نہیں دیا گیا۔ "تاریک ماضی کو بھول جاؤ۔ تم بالکل بے قصور ہو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم مجسمہ ہو معصومیت کی"۔ کسوم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی اور کہنا چاہا لیکن نہ تو وہ اُٹھ پائی اور نہ کچھ کہہ پائی۔ اُسکے منہ پر شیام نرائن نے مہر لگادی اور کسوم عرق عرق ہو گئی۔

راج کشور کی حالت کلکتہ میں روز بروز خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کسی دریا کے قریب کچھ دنوں کے لئے چلے جاؤ۔ راج کشور نے بنارس کو منتخب کیا۔ وہ اپنے ضمیر کی شب و روز کی نفرین سے عاجز ہو کر مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اوس نے سمجھا کہ شاید اس مقدس مقام کی برکت سے اس کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ اور موت جس کو وہ سمجھ رہا تھا کہ دور نہیں ہے ایسے وقت آئے گی۔ جب اُس کی اندرونی کلفتیں محو ہو چکی ہوں گی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ معصوم اور شریف کسوم کے دل دکھانے سے یہ سب آفتیں اس پر آئی ہیں۔ اب وہ کسوم کے خیال کی دل سے عزت کرتا۔ اس کا وہ اسطرح احترام کرتا جیسے کسی دیوی کا۔ جہاں تک ممکن ہو وہ کسوم کے خیال کو دل میں نہ آنے دیتا۔ ہاں اتنی تمنا ضرور تھی کہ اگر کسوم مل جائے تو اُس کے قدم چوم کر اُس سے معافی کی آرزو کرے۔ لیکن کنول کا خیال۔ اس کو وہ اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ روز بروز اور مستحکم ہوتا گیا۔ لیکن اب اس سوز و گداز کو وہ مادیات کی تنگ اور کثیف حدود سے بالاتر لیجانا چاہتا تھا۔ اس حدتک کہ کنول کے خیال کو کنول کی شخصیت سے کوئی تعلق نہ رہے۔ اور اسکی پرستش وہ اس پاک مندر میں کرے جہاں کائنات کی کسی شے اور کسی دوسرے خیال کا گذر نہ ہو۔

اُس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کنول اسکو اب کس حیثیت میں ملیگی۔ لیکن اب اس کو اس سے ملنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کنول کی پرستش صرف اسلئے کرتا تھا کہ وہ کنول تھی۔

وہ حد درجہ لاغر ہو گیا تھا۔ اسے تپ بھی رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے اسکے خیال کے مطابق اسکو دق بتلا دیا۔ اور یہ کہا کہ کسی اندرونی صدمہ کیوجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حقیقت کو خوش رکھنے کی کوشش بہت ضروری ہے۔ لیکن راج کشور کا یہ ایمان تھا کہ کوئی طاقت اسکو کنول کے خیال سے جدا نہیں کر سکتی۔ بنارس آکر اُس نے شیام نرائن کا علاج یونہی لوگوں کے کہنے سے شروع کر دیا۔ وہاں کنول کے متعلق اسکو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لیکن وہ ہمیشہ محتاط رہا کہ اسکا قدم نہ پھیلے۔ اور اس خیال سے کہ شاید کنول سے ملاقات ہو جائے اور پھر معلوم نہیں کیا ہو۔ اُس نے ڈاکٹر شیام نرائن کے مطب میں آنا چھوڑ دیا جب ضرورت ہوتی تو خود انکو اپنے یہاں بلا لیتا۔ اُس نے اشنان کے روز کنول کو دیکھا۔ لیکن کسوم کو دیکھکر کنول کے دیکھنے کی تمام مسرتیں پامال ہو گئیں۔ اپنی تمام روحانیت کو وہ سیاہ تصور کرنے لگا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ ایک معصوم زندگی کے برباد کرنیکا وہ ذمہ دار ہے۔ اور یہ ایسا داغ ہے جو مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ اس کے بعد سے اسکی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اتفاق سے جو کنول سے ملاقات ہو گئی تو گرچہ اُسکے سامنے اُس نے بلا کا استقلال دکھلایا۔ لیکن اس کے بعد اسکے باقی ماندہ خون کے قطرے بھی نہایت تیزی سے جل کر سوکھنے لگے۔ اس خیال سے ایک قسم کا اطمینان ہو گیا تھا کہ کنول کا دامن ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ دیا جا چکا ہے۔ جس کے بعد وہ اُس سے قریب تر ہونے کی کوشش کرے گا بھی تو بیکار۔ لیکن اب جو اُس نے سنا کہ صورت حال یوں ہے تو اُسکی بےتابیاں پھر بڑھ گئیں۔ ہاں اس خیال سے اُسے ضرور سکون ہوتا تھا کہ کسوم کی زندگی اب شاید ٹھکانے لگ جائے۔

دوسرے روز شام کو شیام نرائن جو راج کشور کو دیکھنے آیا تو اُس کے انداز میں کچھ ایسا تغیر تھا کہ راجکشور سمجھ گیا کہ کنول نے تمام واقعات اس سے کہدئے ہیں۔ شیام نرائن جب واپس جانے لگا تو راج کشور نے اپنے قریب بٹھا کر اُس سے کہا: "ڈاکٹر صاحب یہ تو جناب کو معلوم ہے کہ میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کسی وقت اپنے ساتھ کسوم کو لیتے آویں۔ شیام نرائن کچھ دیر خاموش رہا اور پھر یہ کہکر چلا گیا کہ آپ اطمینان رکھئے میں کل اپنے ساتھ کسوم کو ضرور لیتا آؤں گا۔

دوسرے روز شیام نرائن کسوم کو لیکر راج کشور کے مکان گیا۔ کسوم سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ راستے میں اُس نے پوچھا تو کہدیا کہ تم کو ایک ایسی جگہ لے چل رہا ہوں جہاں تم کو تعجب اور خوشی دونوں ہوگی۔ راج کشور پلنگ پر پڑا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ شیام نرائن کسوم کو اپنے بازو میں لئے کمرہ میں داخل ہوا اور کسوم کو راج کشور کے سامنے چھوڑ کر خود آہستہ سے باہر چلا گیا۔ کسوم نے جو سامنے راج کشور کو دیکھا تو یہ محسوس کیا کہ اُس کا تمام جسم پتھر کا ہوا

چاہا ہے۔" راج کشور بہت نحیف ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اسکو تیز تپ چڑھی ہوئی تھی۔ تمام قوت یکجا کرکے وہ اُٹھا اور کسوم کے سامنے دو زانو ہو کر سر اُس کے پاؤں پر ڈالدیا۔ کسوم نے اب محسوس کیا کہ وہ ہنوز پتھر کی نہیں ہوئی۔ راج کشور کی ہچکی بندھی تھی آواز پر قابو پاکر بولا "کسوم! کیا تم مجھے کبھی نہیں معاف کر سکتیں۔ دیکھو اپنے کئے کی سزا بہت اچھی طرح پا رہا ہوں۔ میرا وقت آچکا ہے۔ میں چند دنوں یا چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ کسوم! کیا تمہارا معصوم دل یہ گوارا کرے گا کہ میں اسی طرح پھنکتا سسکتا جان دوں۔ کیا مجھے معاف کرکے تم اس سکون کو جسے میں کھو چکا ہوں واپس نہ بخشوگی۔ کسوم میں موت کا بہت خوشی سے خیر مقدم کرونگا۔ اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل کو خون کرنے کا مواخذہ مجھ سے نہ ہوگا۔ للہ کسوم بولو۔"

کسوم کا دل درد آشنا تھا۔ وہ بے التفاتی جانتی ہی نہ تھی۔ راج کشور کی یہ بے لسی اور اُس کی قابل رحم حالت دیکھ کر بلبلا کر رونے لگی۔ اور بولی:-

"راج کشور بابو آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ قطعی بے خطا ہیں۔ اگر آپ کی کوئی غلطی تھی بھی تو اسکا اب کوئی ذکر نہیں کیونکہ خدا نے وہ دن گذار دئے۔ آپ اس قدر مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ اگر آپ کی تشفی اتنے سے نہیں ہوتی تو میں اپنے پیدا کرنیوالے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو میں نہایت صاف دل سے معاف کرتی ہوں اور وہ بھی معاف کرے۔"

راج کشور کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا: "کسوم! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔" یہ لکر اُس نے پہلے کسوم کے پاؤں پھر ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ اور شیام نرائن کو اندر آنیکی آواز دی۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو کسوم جیسی بیوی پر فخر کرنا چاہئیے۔ یہ زمانہ کی بہت ستائی ہیں۔ آپ اُنکی قدر خود پہچان گئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے آپ ان کی جتنی بھی دلداری کیجئے کم ہے۔" راج کشور اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ دروازہ کھلا اور کنول اور برج نرائن بابو داخل ہوئے۔ برج نرائن بابو اندر آتے ہی بول اُٹھے "کیوں راج کشور تم اتنے دنوں سے بنارس میں ہو لیکن تم نے ہم لوگوں کو بیخبر رکھا۔"

راج کشور نے پہلے ان کا مزاج پوچھا اور کہا "غلطی تو ضرور ہوئی لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ میں ان منزلوں سے گذر چکا ہوں۔ جہاں کسی قسم کی تیمارداری مفید ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو پریشان کرنا فضول تھا۔" "نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" برج نرائن بابو نے کرسی قریب کرتے ہوئے کہا اور شام تک راج کشور کو سب لوگ تسلی تشفی دیتے رہے۔ راج کشور بالکل خاموش بیٹھا اُن لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ مغرب کے بعد سب لوگ واپس گئے۔

راج کشور کی حالت رات کے پچھلے پہر سے بہت بگڑنے لگی۔ صبح ہوتے ہوتے اُس کے نوکر نے کنول کے مکان پر پہونچکر آواز دی۔ کنول سو رہی تھی۔ دروازہ کھولا۔ آدمی نے کہا کہ راج کشور صاحب کا آخری وقت ہے۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کنول بالکل اسی حالت میں اس کے ساتھ ہو گئی۔ پہونچی تو واقعی راج کشور دم توڑ رہا تھا۔ کنول کو دیکھتے ہی ایک برقی طاقت نے

آخری مرتبہ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔ بولا "پیاری..... کنول...... تم آگئیں" کنول کی ہچکی بندھ گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ راج کشور آخری سانس لیتا۔ آپس میں کچھ آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ کنول پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ اور راج کشور کی جان اس حالت میں نکلی کہ کنول کا سر اُس کے سینہ پر تھا۔

عجیب حسرتناک موت تھی۔ دوپہر تک لاش گھاٹ پر لائی گئی۔ کسوم شیام نرائن و برج نرائن بھی ساتھ تھے مذہبی رسمیں ادا ہوئیں۔ اب آخری منزل یعنی لاش کو جلانا باقی رہ گیا۔ اور اس سوال پر کہ آگ پہلے کون دے۔ کنول آگے بڑھی اس طرح کہ اسکے لمبے لمبے بال کھلے تھے۔ خوبصورت پاؤں میں برہنہ تھے پیاری پیاری آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو نہایت فراوانی سے بہہ بہہ کر اُس کے خشک رخساروں کو دھو رہے تھے۔ شیام نرائن نے کہا: "کسوم تم کو بھی آگ دینا چاہیئے" کسوم بھی آہستہ سے آگے آئی۔ اور ان دونوں لڑکیوں نے ایک ساتھ آگ دی۔ اس طرح کہ کسوم اضمحلال مجسم تھی اور کنول یکسر پیکرِ اضطراب۔

(ماخوذ از ٹیگور)

عبد السّلام فاروقی بی۔ اے

خواجہ آتش کے متعلق کچھ جدید تحقیق و تفتیش

بسلسلۂ ماسبق

اب وجوہ تشیع کے جوابات سنئے۔

۱۔ آزاد کی پہلی روایت کا حال یہ ہے کہ (الف) آتش کے ایک ہی لڑکا تھا۔ خواجہ محمد علی جوش نامی، کوئی لڑکی نہ تھی۔ (آب بقا صفحہ ۱۰ اور گل رعنا صفحہ ۲۶۰)

۲۔ آتش کی بیوی آتش کی زندگی ہی میں مرگئی تھی۔ آب بقا صفحہ ۱۳ پر ہے کہ جب آتش نابینا ہوگئے تو محمد علی جوش کی شادی ایک باہمت ہندو شاگرد کے اصرار اور خرچ سے آتش نے کی۔ جوش سہرا پہن کر آتش کے پاس گئے تو آتش رو دئے۔ لوگوں نے کہا: "اس وقت آپ روتے کیوں ہیں؟" کہنے لگے "اس کی ماں مرگئی ورنہ وہ اس کو سہرا پہنے دیکھ کر خوش ہوتی۔ میں نابینا ہوں دیکھ نہیں سکتا۔"

۳۔ آتش کی وفات کے وقت اُن کا بیٹا جوش شادی شدہ جوان تھا نہ کہ خورد سال۔ (گل رعنا صفحہ ۲۶۰ بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔)

دیکھئے آزاد نے ایک سانس میں کتنے جھوٹ بولے۔ بیوی اور بیٹی کا بعد وفات آتش کا زندہ رہنا غلط۔ لڑکے کا خورد سال ہونا غلط۔ جس فقرہ میں اتنی باتیں خلاف واقعہ ہوں تو کیونکر اُس کے اس حصہ کو صحیح مانا جاسکتا ہے کہ ایک شیعہ نے آتش کی تجہیز و تکفین کی اور اس سے ان کی موت پر شیعی موت کا اطلاق ہوسکے۔ کیونکہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ایک جوان بیٹے نے تجہیز و تکفین نہ کی ہو بلکہ ایک غیر نے کی ہو۔

۴۔ آب بقا میں صفحہ ۱۳ پر خلیل کی سعادتمندی کا ذکر ضرور ان الفاظ میں ہے کہ "آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی۔ میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کرتے تھے۔" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس نے شیعی تجہیز و تکفین بھی کی ہو۔ بات فقط اتنی ہی تھی کہ خلیل نے آتش کی زندگی اور بڑھاپے میں خدمت کی۔ آزاد نے اس پر اتنا حاشیہ چڑھا کر یہ افسانہ بنا دیا۔

۵۔ آب بقا میں ناسخ کا مذہب۔ انکی قبر کی شکل (کہ وہ حسب دستور اہل تشیع زمین سے ملی ہوئی ہے) تو درج ہے مگر آتش کے بارہ میں کچھ درج نہیں۔ سوا اس کے کہ گھر ہی میں دفن ہوئے۔

۲۔ میر انیس کی روایت۔ راوی کا نام پڑھ کر ناظرین شاید مرعوب ہو جائیں اور آزاد کی چال بھی یہی تھی بقول غالب:

ع غازیاں ہمراہ خویش آورد ازبہر جہاد ✦ تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

لیکن میر انیس کی شہرت و عظمت صرف مرثیہ گوئی کی بنا پر ہے روایت۔ ثقاہت۔ تاسخ میں تو ان کا کوئی پایہ نہیں۔ ان حیثیتوں سے وہ ایک عام شخص تھے۔ اب روایت پر تھوڑی ہی سی درایت کی نظر ڈالنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میر انیس کی اس روایت کا وجود آب حیات سے باہر بھی کہیں ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔

آتش کے خاندان میں تسنن اور تصوف متوارث تھا اور راباعن جد پیری مریدی کا طریقہ چلا آتا تھا۔ خود آتش اُس باپ کی گود میں پلا تھا جس کی بابت سب تذکرہ نویس متفق اللفظ ہیں کہ فقیر سالک تھا۔ پھر باپ کے انتقال کے وقت تک آتش اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اور باپ اُسوقت مرا ہے جب "آتش ابھی اچھی طرح جوان نہیں ہونے پائے تھے اور تعلیم ناکمل تھی"۔

کیوں صاحب! وہ کونسا مسلمانوں کا اور خاصکر درویشوں کا گھرانہ ہوگا جس کا بچہ بچپن سے اپنے بزرگوں کو نمازیں پڑھتے نہ دیکھے گا؟ اور اس کو نماز نہ سکھائی جائے گی؟ اور اچھی طرح جوان ہونے کی عمر تک بھی دہ جانے گا کہ ہم شیعہ ہیں یا سنی۔ اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور سنیوں کے ہاں ہاتھ باندھ کر؟ خود ہمارے گھر میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی جاتی ہے یا ہاتھ کھول کر؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکا آوارہ ہو تو خود نماز کا پابند نہ ہو۔ لیکن ہر مسلم کا بچہ نماز کی ہیئت اور دونوں نمازوں کا فرق جانتا ہے۔

۳۔ کیا آپ ایسے شیعہ کا تصور کر سکتے ہیں کہ عقائد سے تو اتنا باخبر ہو کہ بقول اثر صاحب یہ مصرعہ کہہ جائے کہ:۔

شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف ملا

لیکن اعمال سے اتنا ناواقف ہو کہ دونوں نمازوں کا فرق جانے نہ شیعہ نماز اُسکو آئے؟

(۴) لکھنؤ میں آتش و ناسخ کا زمانہ، شیعیت اور مذہبیت کے سخت جوش کا زمانہ تھا۔ ناسخ صاحب آخر شیعہ ہو ہی گئے آتش ایسے جوش کے زمانہ میں ہرگز شیعہ نماز اور دونوں نمازوں کے فرق سے بیخبر نہیں رہ سکتے تھے؟

(۵) بقول آزاد "میر دوست علی خلیل شاگرد خاص تھے اور خلوت وجلوت کے حاضر باش۔ آتش کو جب اپنا مذہب شیعہ معلوم تھا تو کیوں نہ اپنے شیعہ شاگرد خاص اور خلوت وجلوت کے حاضر باش ہی سے نماز سیکھ لی۔

(۶) میر دوست علی خلیل شیعہ تھا۔ پھر اُن کے اُستاد آتش کی اتنی بیخبری کے کیا معنے؟

(۷) آتش جو بقول اثر صاحب ایسی غزل کہے اور خلیل ہر وقت اُسکی مصاحبت میں بھی رہیں۔ اُس کو اپنا شیعہ ہونا معلوم بھی ہو پھر بھی آتش نماز پڑھتا ہے تو سنیوں ہی کی؟ کسقدر حیرتناک امر ہے؟

(۸) آزاد نے کیا خوب فقرہ سوچکر لکھا ہے کہ "شاگرد نے کہہ دیا کہ استاد! عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی"۔ شاید آزاد نے اس لئے لکھا کہ اہل سنت کے یہاں کھلم کھلا جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ انکے یہاں کوئی مخفی عبادت نہیں نہ وہ کسی کو کسی مخفی عبادت کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ فرضی نماز سکھانے میں اُس شاگرد کی کون سی مصلحت تھی؟

کہ اس نے عبادت چھپانے کو کہا۔ غرض یہ ثابت ہے کہ بچپن میں نہیں عمر کی پختگی میں آتش نے سنیوں کی نماز پڑھی۔ اس امر کو اس سے ملائیے کہ آتش سنی اور صوفی باپ کے یہاں پلے تھے۔ انھوں نے سنیوں کی نمازیں دیکھی تھیں۔ تصوف کے اُن مدارج اور نکات سے آگاہ تھے جنکی تفصیل اثر صاحب نے کی ہے۔ نیز آتش اس کے قائل تھے کہ رند مشرب ہوں مجھکو کیا ہو کے + مذہب میں جو اختلاف ہو۔ نتیجہ صاف یہ نکلتا ہے کہ آزاد ہوں یا انیس سب نے اس معاملہ میں غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر فی الحقیقت میر انیس نے یہ روایت بیان نہیں کی تھی بلکہ یہ بھی آزاد کی صنعت تھی تو اس کے ذمہ دار بھی آزاد اور اس کا وبال بھی آزاد ہی کے سر۔

۳۔ آتش کے بعض اشعار۔ مرزا صاحب کی پیش کردہ غزل اوپر لکھ آیا ہوں اور اگر مجھے بھی اُس کے ایسے ہی شعا کی جمع و تلاش مقصود ہو تو چند اور اشعار اُسکی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

قسم اول۔ (الف) لاتحف اید الی والی غزل۔

(ب) دیوان دوم کی پہلی غزل = دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا۔

(ج) دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو + یہ مشت خاک ہو کے کربلا کی خاک پیدا۔ (صفحہ ۹)

(د) آتش کی التجا ہے یہی تم سے یا علی + صدمہ ہو نہ فشار لحد کے عذاب کا۔ (صفحہ ۲۴)

(ہ) آتش غم حسین میں رو، ہنس ہا ہی کیا + سطریں کی سطر نامۂ عصیاں سے دور ہوں۔ (صفحہ ۱۰۹)

(و) ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر + مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا (صفحہ ۲۱۲)

(ز) پیروی پیشوا کی لازم ہے + روسیہ منکر امامت کا (صفحہ ۲۲۱)

(ح) دستِ علی کی ضرب کا جنبش میں ہے اثر + ان ابروؤں میں معجزہ ہے ذوالفقار کا (صفحہ ۷۰)

قسم دوم:۔ (الف) سر سے حاضر منقبت میں تامل ہو گیا + مدح حیدر میں کیت خامہ لدل ہو گیا۔

(ب) خوں ریز جس قدر کہ ہو اُس سے عجب نہیں + آتش فراق یار پدر ہے یزید کا (صفحہ ۱۴۱)

(ج) اک سال میں دس دن بھی جسے غم نہیں ہوتا + وہ شہر ہے جس میں کہ محرم نہیں ہوتا (صفحہ ۲۲۱)

(د) یا علی کلکر بت پندار توڑنا چاہیئے + نفس امارہ کی گردن کو مروڑ نا چاہیئے (صفحہ ۲۵۰)

ظاہر ہے کہ مجھے قسم دوم کے اشعار کا تو جواب دینا نہیں ہے۔ ان میں محض کوئی نام آگیا ہے اور اُن سے کوئی شیعی عقیدہ کھلا ہوا نہیں ظاہر ہوتا بلکہ الف اور ج کے اشعار اگر ایک سنی لکھنؤ میں بیٹھ کر کہے تو تعجب کا مقام نہیں (ب) میں غم فراق کو یزید سے بڑھ کر سمجھنا اور ابروؤں کو ذوالفقار کا اثر ماننا محض تشبیہی انداز بیان ہے اور نکتہ آفرینی۔ یا علیؑ کلکر بت توڑنا اس میں صریح اشارا ہے اس حدیث کی طرف جس میں ذکر ہے کہ رسول اکرم صلعم نے حضرت علیؑ کو بت اور اوپر قبر توڑنے پر مامور

کیا تھا۔ اس قسم کے بیانات تو سنیوں کے ہاں بھی ہیں۔ اور عام ہیں مثلاً

(الف) ذوق کی پہلی غزل کے یہ مصرعے ۱۔ امحبت اہل بیتِ مصطفےٰ کی نور بر حق ہے ۲۔ کہیں شاہ نجف کے عشق میں دل مبتلا ڈوبا تھا ۳۔ غم آل نبی سے وائے ہر اشک نم میرا۔ حالانکہ ذوق مسلّم طور پر سنی تھے۔

(ب) سید محمد مبین الدین صاحب مبین مچھلی شہری نے (جو سنی حنفی اور داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں ہیں) ۱۳۱۰ھ میں شیعوں کی ایک مجلس میں تعریف جناب امیرؑ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا ایک مصرعہ مجھے اس وقت یاد ہے۔ ع

وہی علیؑ کہ جو تھے خاتم خلافتِ خاص

(ج) اور کسی دوسرے کی مثال کیوں دوں۔ خود مجھ پر ایک زمانہ حبّ علیؑ کے جوش کا ایسا گزرا ہے کہ جب میں نے مقبول احمد دہلوی کی تفسیر کے رد میں اپنی تفسیر "فبہت الذی کفر" لکھی جو پبلک میں شائع ہو چکی ہے۔ اُس کے دیباچہ میں میں نے لکھا تھا کہ محبت علیؑ میں مجھکو وہ شغف اور غلو حاصل ہے کہ میں فضیلت شیخین کو بدعت اور ایک امرِ خارج از امورِ دین سمجھتا ہوں" لیکن ان سب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اور یہ سب لوگ بھی شیعہ ہو گئے۔ رہے دوسرے قسم کے اشعار تو

(۱) مجھے سرے سے اسی میں شک ہے کہ یہ اشعار آتش کے ہیں کیونکہ حسب تمہید نمبر ۱ سعدی و روم پر تشیع کا اتہام حافظ کے نام سے الحاقی غزل اور قصائد۔ فردوسی کے نام سے ہجو محمود میں الحاقی اشعار۔ کتابوں اور تصنیفوں میں تحریف جب ہمارے سامنے ہے تو آتش کے کلام میں الحاقی اشعار کا ہونا کون سی بڑی بات تھی۔ آتش کا دوسرا دیوان تتمہ ہے جو انکی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے۔ اس لئے اس میں کافی موقع الحاق کا تھا۔ چنانچہ ہمکو پہلی ہی غزل بلا مقطع کے پانچ شعر کی ملتی ہے غالباً پنجتن کی رعایت سے اور اس میں شروع سے آخر تک ہر شعر میں شیعیت بھری ہے۔ پہلا دیوان اگرچہ اُن کی زندگی ہی میں طبع اور شائع ہو چکا تھا لیکن اُس میں بھی الحاقی اشعار بیچ بیچ میں داخل کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش جو صاحب تھے وہ شیعہ ہی تھے اور آتش جیسے بے ننگ و نشن رند اور لاابالی شاعر سے غالباً اس بیدار مغزی اور باخبری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اُس نے اپنے نام سے شائع شدہ دیوان کی ہر جگہ سے تنقیح اور جانچ کر لی ہو۔

(۲) آتش کے حالات و صفات، اطوار و اشعار آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے ایک حد تک آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان اوصاف کے آدمی سے ہم کو کس کس قسم کی باتوں کی توقع ہو سکتی ہے۔ وہ زیادہ تر توراثت کے تصوف کہنے پر زیادہ مائل نظر آتا ہے یا لکھنؤ کی فضا سے متاثر ہوتا ہے تو اس حد تک کہ کنگھی چوٹی۔ مرمر کرتی کے اشعار بھی کہہ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ غزل کے مطالبات اور خصوصیات سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ غزل، غزل ہے نہ کہ مرثیہ و سلام۔ تغزل میں فرقہ وارانہ عقائد اور سخت لہجہ اور تبرے کی گنجائش کہاں؟ چونکہ اس سے سخت تنگ نظری ٹپکتی ہے۔ اس لئے عموماً اساتذہ اور ثقہ لوگ اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ آتش جس کے بارہ میں اہل نظر کا خیال ہے کہ غالب سے کسی طرح تغزل کی بلند پروازیوں میں کم نہ تھا، ہرگز اس کلیہ سے بیخبر اور اس اُصولِ اخلاق سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ تنگ نظر اور فرومایہ شعرا ایسا کر سکتے ہیں۔

(۳) مسلمان صاحبِ دیوان شعرا کا طریقہ یہ رہا ہے کہ برکت کے خیال سے شروع میں حمد و نعت (اور اگر شیعہ ہو تو) منقبت ضرور رکھتے ہیں۔ آتش کے پہلے دیوان میں سوائے حمد و معرفت کے شروع کے سات آٹھ صفحات تک کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ آتش کیسا شیعہ تھا اپنی زندگی میں شائع ہونے والے دیوان میں نہ نعت کہی نہ منقبت۔ اور منقبت کہی تو وہ ردیف "لام" میں جا چھپی۔

(۴) کسی شیعی شاعر کا بھی یہ رویہ دیکھا نہیں گیا کہ شروع کی منقبت کے علاوہ غزل کے ہر شعر میں ایک ہی عقیدے کا اظہار ہو۔ ایک مذہب کی تبلیغ ہو۔ آتش ہی نے اپنے دیوان صفحہ ۲۴۴ پر ایک مطلع لکھا ہے۔ (ورد زباں جنابِ محمدؐ کا نام ہے۔ قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے) بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غزل نعتیہ ہے۔ مگر سوا اس شعر کے اور ایک شعر بھی نعت میں نہیں۔ اور یہ بات اُسی مذکورہ اصول کے ماتحت ہے کہ ہر شعر میں کسی عقیدے کا اظہار معیوب ہے۔

(۵) اسی نعتیہ مطلع کے بعد ایک موقع منقبت کے ذکر کا تھا مگر آتش کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی۔

(۶) پھر کیا ایک واقعی شیعہ شاعر کے ہاں شیعیت کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ پوری پوری غزلوں میں اور ہر شعر میں (جو منقبت کی جگہ شروع میں نہ لکھی گئی ہوں) اپنے عقیدے کا اظہار کرے اور "شیطان کے نطفہ الخ" جیسے سخت اور گندہ لہجہ میں اپنا مذہب دکھائے؟ اور خاصکر آتش جیسے بھولے بھالے۔ صوفی کے ہاں؟

کیا اب بھی ان اشعار کے الحاقی ہونے میں کسی کو کچھ شبہ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کسی اور نے اُس کی غزل کو ردیف "لام" میں اس لئے لکھا کہ اس پر آتش کی یا دوسروں کی نظر جلد نہ پڑے؟ پھر اگر یہ اشعار آتش کے ہوتے تو محمد حسین آزاد (جو مذہب کو مشتبہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور نانا دادی کی پوچ روایات تک اسی مقصد سے گڑھتے ہیں) کیوں نہ تذکرہ آتش میں کوئی غزل یا کوئی شعر ایسا نقل کر دیتے؟ حالانکہ اس نے آبحیات میں تصریح کر دی ہے کہ آتش کے دو دادین اُس کی نظر سے گذرے ہیں۔ اگر اُس کو یہ اشعار مل جاتے تو کیوں نہ وہ آتش کا مذہب صاف صاف شیعہ لکھ جاتا۔ حالانکہ آزاد وہی ہیں جنھوں نے غالب کو "منصور فرقہ اسد اللّٰہیان منم" سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو نصیری کہا ہے اور خوب خوب مزے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آتش جیسے اُستاد کے ہاں زبان کی یہ غلطیاں بھی مل سکیں گی؟

(الف) پیروی پیشوا کی لازم ہے۔ رو سیہ منکر امامت کا۔ دوسرے مصرعہ میں اُس نے کہا ہے "منکر امامت کا رو سیہ (ہو)" لیکن اس میں یا تو "کا" زائد ہے اسکی جگہ "ہے یا ہو" ہونا چاہئے۔ اور یا محاورہ میں ناجائز تصرف کیا ہے اس لئے کہ محاورہ یوں ہے۔ "اس کا منہ کالا" یا "اُس کا رو سیاہ" لیکن "اُس کا رو سیہ" درست نہیں۔

(ب) دعائے آتش خستہ یہی ہے روزِ محشر کو = اس میں "کو" حشو محض ہے۔

(ج) دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا = اس میں تعقید لفظی ہے اور مکروہ۔

بہرحال روز روشن کی طرح یہ بات نظر آرہی ہے کہ یہ سب "آزاد کے کسی اہل مانہ" کی ایک ایجاد ہے۔ لیکن وہ اسکو بھول گیا کہ اس شدت و غلو، اس جوش و کثرت، اس لہجہ و طریقہ سے اور شبہ پیدا ہو جائے گا اور جب آتش جیسے بھولے بھالے

اور تصوف گو سادہ مزاج شخص کے منہ پر یہ اشعار نہ کھلیں گے تو پڑھنے والے صاف معلوم کر لیں گے کہ یہ جعل الحاق ہے۔

یہاں تک تو جوابات تھے اُن شکوک کے جو پیدا کئے گئے یا پیدا کئے جا سکتے تھے۔ آتش کے تسنن کے بارہ میں۔ اب مختصراً اسکے وجوہ تسنن بیان کرتا ہوں۔

(۱) آتش صوفی اور سنی باپ کا بیٹا تھا۔ خود تصوف گو تھا۔ سیدھا اور بھولا تھا اور مذہبوں کے جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ یہ اوصاف بجائے خود اُس کے شیعہ ہونے سے ابا کرتے ہیں۔

(۲) اُس زمانہ میں بادشاہ کے تشیع کا اثر رعایا پر بہت تھا۔ اور اکثر لوگ تبدیل مذہب کر کے شیعہ ہو جاتے تھے مگر صرف وہی جن کو دربار میں رسائی کا شوق اور مال و جاہ کا لالچ تھا۔

چنانچہ شیخ امام بخش ناسخ کو یہ شرف نصیب ہوا کہ بقول آزاد پہلے مذہب سنت و جماعت رکھتے تھے پھر شیعہ ہو گئے۔ ان کی زندگی تمام تر سیاسی چالوں میں گذری اور دنیا طلبی کے ذرائع ان کو اچھے حاصل تھے۔ لیکن آتش کو دربار سے تعلق اور امرا بادشاہ کے ہاں رسائی کا شوق نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کا خلعت واپس کر دیا۔ اور ایک رئیس شاگرد سے ملتے ہوئے روپے لوٹا دیئے۔ وہ متوکل قانع و عزلت گزیں تھا۔ ایسے شخص پر اس وقت کی آب و ہوا کا اثر نہ پڑ سکتا تھا نہ پڑا۔

(۳) کسی تذکرہ نویس نے آتش کو شیعہ نہیں لکھا یہاں تک کہ آزاد نے بھی نہ آتش کے تبدیل مذہب کا ذکر کیا نہ صاف طور سے اُس کو شیعہ لکھا۔ رہا اثر صاحب کا لکھنا تو انھوں نے یہ روش اختیار کی ہے کہ دوسرے لوگ جعلی روایات اور الحاق سے جو بنیادی اینٹ رکھ گئے تھے۔ اس پر پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ بنیاد ہی پانی پر تھی۔

(۴) آتش نے ایک دفعہ مرزا دبیر کے مرثیہ پر صاف کہدیا کہ "یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان"۔ اور ایک شیعہ مرثیہ جیسی مذہبی چیز پر ایسی سخت طنز نہیں کر سکتا۔

ہر چند کہ اس مضمون میں ابتک مرزا اثر صاحب کے مضمون پر استطراداً کچھ نقد و بحث آ چکی ہے لیکن بعض اور باتیں بھی اُنکے مضمون میں ایسی ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کیجا سکتیں۔

۱۔ مرزا صاحب غالباً بے خیالی میں ایک ایسی بات لکھ گئے ہیں جس پر اطلاع ہونے کے بعد یقیناً اُن کو اس سے اختلاف ہوگا۔ اور وہ یہ کہ عام شعرائے لکھنؤ کا کلام تصوف سے خالی ہے۔ لیکن کیا اثر صاحب براہ کرم بتائیں گے کہ تصوف روح جان تغزل۔ خمیر تغزل۔ بلکہ تمام تغزل ہوتا ہے اُس، کے لکھنؤ میں نہ ہونے کی کیا وجہ تھی یا ہو سکتی ہے؟ کیا اس کا جواب سوائے اس کے اور بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں شیعیت کا زور تھا اس لئے تصوف کا چرچا نہ تھا یعنی سرزمین لکھنؤ: مفتی محمد عباس جیسی ہستیاں تو پیدا کر سکتی تھی جو یہ کہہ سکے کہ (ایں کلام صوفیان شوم منیت الخ) لیکن خواجہ میر درد، میر سوز، مرزا مظہر، شاہ ولی شاہ حاتم، میر اور غالب اور آخر آخر میں آتش جیسے مقدس وجود نہ پیدا کر سکی۔

۲۔ مرزا صاحب نے آتش کے مضمون میں آب بقا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابتدا مضمون ہی میں حوالہ ہو

لیکن خاص موضوع پر وہ آزاد کی تقلید کر گئے ہیں۔ "فسانہ کیا" "بہانہ کیا" والے مشاعرے کے ذکر میں آب حیات نے لکھا تھا کہ نواب نے دوسرا خلعت آتش کو دے کر رخصت کیا۔ یہی مرزا صاحب بھی نقل کر گئے۔ حالانکہ آب بقا میں ہے کہ آتش نے خلعت لینے سے انکار کیا بلکہ اُسے بھی ناسخ ہی کو دلوا دیا اور خود شاہی گداگری پر قناعت کی۔ آتش جیسا متوکل شخص اور وہ معرکہ خاص کہ ناسخ نے دشمنی ہم چشمگی برتی اور طرح کی اطلاع صرف ایک روز قبل آتش کو دی۔ اس صورت میں آتش کا خلعت قبول کر لینا۔ آتش کو کچھ اعلےٰ ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ آب بقا کی روایت سے اس کی عالی ہمتی۔ سیر چشمی۔ اور صبر و توکل کا نہایت اعلےٰ نمونہ نظر آتا ہے۔

اگر اثر صاحب کوئی جامع اور محققانہ مضمون لکھ رہے تھے تو یا تو اپنے ممدوح کی بابت عالی ہمتی کی روایت لکھتے جس سے اس کی شخصیت بلند معلوم ہو۔ یا پھر اُصولاً دونوں روایتیں جمع کر دیتے۔ لیکن آخر یہ راز کیا ہے کہ کوئی مضمون تلاش و جستجو سے بھی لکھا جائے تو ایک مشہور و مسلم کذاب وافسانہ گو مورخ کی تقلید تو کیجائے اور دوسرے مورخ کو یوں نذر تغافل کیا جائے گویا اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اگر آب بقا بروئے کار نہ آیا ہوتا یا اثر صاحب نے اس سے استفادہ نہ کیا ہوتا تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن وضعداری اور آزاد پرستی کم سے کم اتنی تو ہو کہ آنکھ بند کر کے اس کو امام بنایا جاتا ہے۔

سلسلۂ سخن میں لکھنا پڑتا ہے کہ آب حیات ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جا سکے۔ اس کی دروغ نویسی اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ مرزا عسکری صاحب (مترجم تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ) کو دیباچہ ترجمہ تاریخ ادب اردو میں لکھنا پڑا کہ اُس نے افسانہ نویسی کی ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ اس نے کہیں کہیں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور یہ تنقیدیں جو برابر نکلتی آ رہی ہیں لازمہ اور خمیازہ ہیں۔ ان غلطیوں کا جو آزاد نے آبحیات میں کی ہیں۔

۳۔ مرزا صاحب نے اُستاد سے نزاع والی روایت بھی جس کی حقیقت آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ آبحیات سے نقل کر دی۔ تنقیدی نظر نہ ہونے کے علاوہ مرزا صاحب یہ بھی تو نہیں درج کرتے کہ اور تذکرہ نویسوں کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں تاکہ پڑھنے والوں کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ آزاد اس روایت میں منفرد ہیں۔ پھر جو درجہ اُس کا قائم ہو سکتا وہ اپنے دل میں اس روایت کا قائم کرتے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مرزا صاحب کو آتش کے حالات میں تلاش و تحقیق یعنی ریسرچ کرنا نہیں تھا اور درایت و تنقید کی بجائے تقلید منظور تھی تو پھر مضمون کی ضرورت ہی کیا تھی؟

۴۔ مرزا صاحب نے بھی وہی آزاد کا سا یقین و اطمینان پیدا کر کے مذہب کی بابت لکھدیا کہ "شیعہ تھا" گویا مسلّم ہے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ حضور یہ دو ٹوک فیصلہ کسی اور نے بھی کیا ہے جو آپ نے جلدی سے لکھ دیا؟ تو شاید جواب آسان نہ ہو۔ آزاد ہی کو دیکھئے، وہ دادین دیکھ چکا ہے مگر تشیع ریز اشعار نہیں لکھتا۔ اس کا دل خود چاہتا ہے کہ لکھنؤ کے دور تشیع کے ایک نامی شاعر کو شیعہ کر دکھائے مگر کوئی بات نہیں ملتی ناچار ایک پوچ روایت گڑھتا ہے اور زور پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے شخص کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے کہ جو کچھ راست و دروغ ہو بر گردن راوی" مگر وہ بھی کر ور ثابت ہو، پھر کوئی تذکرہ نویس ایسکو شیعہ نہیں لکھتا یہ جناب

نے کیسے فیصلہ صادر کر دیا۔ کسی عدالت پر بھی تو اتنی جلد حکم نہیں لگایا جاتا۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب اور مرزا صاحب کی دلی پریشانی وہاں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں یہ پُر لطف جملہ لکھا ہے " وہ ایک آزاد شاعر تھا اور رباشناؤں ان حالتوں کے سبب وہ کسی مذہبی عقیدے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھول جاتا تھا کہ اُس کا مذہب کیا ہے"۔ واہ کیا خوب استنثار کیا ہے۔ آٹے سے بال نکالنا اسے کہتے ہیں لیکن اب بھی نتیجہ صاف یہی نظر آ رہا ہے کہ مرزا صاحب پیش بندی کرتا اور ایک گنجائش نکالنا چاہتے ہیں اور جس طرح آزاد اور لعذ المشاعرہ کے پیدا کردہ شبہوں اور موقعوں سے مرزا صاحب نے فائدہ اُٹھایا ویسے ہی مرزا صاحب کی تحریر سے کسی دوسرے کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ ملے۔

۵۔ مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں جہاں آتش کے اشعار کی تقسیم کی ہے۔ وہاں مسئلہ " رویت " کا عنوان قائم کر کے یہ تین شعر لکھے ہیں۔

(الف) بوئے گل آتش کہیں ہوتی ہے محبوس نظر ؎ اقرار ہے روز روشن یار کے دیدار کا۔

مرزا صاحب نے اس پر نوٹ لکھا ہے " دیدار اسکی معرفت دل سے ہے۔ آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں"۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو مسئلہ رویت کے عقیدے پر شاعر کی رائے سمجھا۔ حالانکہ صاف نظر آ رہا ہے وہ مضمون آفرینی کے طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ نہیں تو اس کی معرفت دل سے ہمیں حاصل ہے۔ پھر دیدار کا انحصار صرف روز محشر پر ہم کیوں مانیں۔ روز محشر پر دیدار کا انحصار ہے تو اقرار معلوم ہوتا ہے۔

(ب) گرے گی برق جمال اس کی بند آنکھوں کو ؎ وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا۔

مرزا صاحب کا نوٹ اس پر یہ ہے کہ دیدار اس لئے بھی محال ہے کہ اُس نے یہ شعر کہا۔ افسوس ہے کہ مرزا صاحب نے اس کو تو عقیدہ رویت پر اظہار خیال سمجھا (حالانکہ اس میں محشر کا ذکر ہے نہ اس کا اشارہ حتیٰ کہ انجمن سے بھی محشر مراد نہیں) لیکن آگے خود ہی (مقام حیرت) کے عنوان سے ایک شعر لکھا ہے۔ جو ٹھیک اسی مضمون و مفہوم کا ہے۔ اس سے عقیدہ رویت پر اظہار خیال نہیں سمجھتے۔ وہ شعر یہ ہے: " اُٹھا ادھر نقاب تو پردے پڑے اُدھر ؎ آنکھوں کو بند جلوہ دیدار نے کیا "

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئیے کہ آنکھیں جلوہ دیکھنے کے بعد بند ہوں گی نہ کہ دیکھنے سے قبل۔ پس دیدار اور لقائے وعدہ دیدار تو ہو گیا۔ رہا آنکھوں کا بند ہو جانا تو یہ اُس کے حسن کا کمال ہے اور اپنے ظرف کی کمی۔

(ج) اُٹھ چکا روز قیامت روئے قاتل سے نقاب ؎ روز محشر تک کے تیر کی منزل نہ ہو۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ رویت کا محال ہونا اس میں بھی دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس شعر کے بارے میں ہم کو مرزا صاحب کے خیالات نہ معلوم ہو سکے کہ دوسرے مصرعہ کا مطلب اُنھوں نے کیا سمجھا ہے۔ اس لئے کچھ لکھنا ذرا بے موقعہ ہے۔

ان اشعار کے مطلب و معنی کی طرح مختصراً اشارہ کیا جا چکا۔ لیکن مرزا صاحب کے اس جملے نے " تصوف میں مسئلہ رویت مختلف فیہ ہے " ہم کو بہت دیر تک غرق حیرت رکھا۔

مرزا صاحب نے "تصوف میں رویت کا انکار" کہیں سے سُن لیا ہوگا۔ اس لئے اس استدلال سے کام لیا بندہ نواز! صوفیوں کے ہاں نفس رویت خداوندی سے انکار نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ صوفی جو خدا کا طالب ہوتا ہے۔ کس منھ سے دیدار محبوب کا انکار کرے گا؟ بلکہ اختلاف اس امر میں ہے کہ یہاں اس دنیا میں اس جسم خاکی کے ساتھ ان آنکھوں سے بھی دیدار ہوسکے گا یا نہیں؟ اس میں بعض قائل ہیں۔ ہوسکتا ہے اور بعض منکر۔ یہی اختلاف اسلام کے بعض فرق ظاہرہ میں بھی ہے اور معتزلہ نے اس سے صاف انکار کیا ہے (عقائد نسفی میں اسکی پوری بحث موجود ہے)

ایک صوفی کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔" ؎ بقرآں ہم بنا و ردہ است ایماں زاہد اعمیٰ ٭ اگر دیدار اینجا نیست آخر جلوہ گاہے کو"؟ لیکن اس میں رویت کا جو پہلو بیان ہوا ہے۔ ظاہر ہے۔ لیجئے یہ تھا مطلب رویت سے اختلاف کا جسے جناب اثر صاحب جیسے اہل قلم نے واقف کارانہ انداز میں اس شد و مد سے لکھا ہے۔

——— سراج الحق مچھلی شہری

جبریہ شادی

(ڈرامہ)

فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کا ایک شاہکار

افراد ڈرامہ

(۱) سنارل:۔ ڈورمین کا ہونیوالا خاوند
(۲) ڈورمین:۔ ایلکانسٹر کی بیٹی
(۳) ایلکانسٹر:۔ ڈورمین کا باپ
(۴) ایلیڈاس:۔ ڈورمین کا مشہور شمشیرزن بھائی
(۵) جیرونیمو:۔ سنارل کا دوست
(۶) پنکریس:۔ ایک فلسفی
(۷) مارفوریس:۔ ایک اور فلسفی
(۸) لائیکاٹ:۔ ڈورمین کا عاشق
(۹) ملازم وغیرہ جیسی عورتیں

سنارل (پس پردہ ملازم سے)

س۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔ گھر کا خیال رکھنا۔ اور اگر کوئی روپے دینے آئے تو مجھے فوراً مسٹر جیرونیمو کے مکان پر اطلاع دینا۔ اور اگر کوئی روپیہ لینے آئے تو اُس سے کہدینا کہ میں یہاں نہیں ہوں۔ اور نہ آج واپس آؤں گا۔

جیرونیمو۔ (سنارل کے آخری الفاظ سنکر) اچھی پیش بینی ہے

س۔ آہ جیرونیمو خوب پہونچے۔ میں تو تمہارے ہی گھر جارہا تھا۔

ج۔ کیوں خیر تو ہے؟

س۔ تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

ج۔ بڑی خوشی سے۔ میرا خیال ہے: ہم یہاں اچھی طرح سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

س۔ تو پھر بیٹھ جاؤ۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ اور میں کوئی کام دوستوں کے مشورہ بغیر نہیں کرنا چاہتا۔

ج۔ میں ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اس کام کے لئے منتخب کیا۔ اچھا بتاؤ کیا بات ہے؟

س۔ مگر سب سے پہلے میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خوشامد درامد کی ضرورت نہیں تم مجھے صحیح صحیح رائے دینا۔

ج۔ ایسا ہی ہوگا۔

س۔ قسم کھاؤ۔

ج۔ تمہاری قسم۔ اچھا تو اب معاملہ بتاؤ۔
س۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ میں شادی کروں یا نہ کروں؟
ج۔ کون؟ تم
س۔ ہاں میں۔ تمہارا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟
ج۔ مگر پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔
س۔ کیا؟
ج۔ تمہارے خیال میں تمہاری عمر کتنی ہے؟
س۔ میری۔
ج۔ ہاں۔
س۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔
ج۔ سنا ہے تم باون یا ترپن سال کے ہوگے۔
س۔ کون؟ میں! یہ نہیں ہو سکتا۔
ج۔ بہر حال میں تمہیں حسب وعدہ یہ رائے دیتا ہوں کہ تم شادی کرنے کے ناقابل ہو۔ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا۔ کہ اس جنون کو سر سے نکال دو۔ اگر تم اتنے عرصہ تک آزاد رہنے کے بعد اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لوگے تم جیسا بدقسمت انسان دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔
س۔ اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرنیکا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔ اور میں اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کسی لیت و لعل سے کام نہیں لوں گا۔
ج۔ خیر یہ معاملہ اور ہے۔ مجھے تو تم نے یہ نہیں بتایا تھا۔
س۔ میں اُس لڑکی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اور دل سے چاہتا ہوں۔
ج۔ تم اُسے دل سے چاہتے ہو؟
س۔ بے شک اور میں نے اُس کے باپ سے بھی پوچھ لیا ہے۔
ج۔ باپ سے بھی؟
س۔ ہاں۔ آج شام کو شادی ہونیوالی ہے۔ اس کا تصفیہ ہو چکا ہے۔
ج۔ تو پھر شادی کرو۔ میں اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔
س۔ مگر جیرو ویو تمہارا خیال ہے کہ میں ارادہ فسخ کر دوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں شادی کرنیکے ناقابل ہوں؟ میری عمر کو چھوڑو۔ واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھو کہ وہ کیا ہیں؟ کیا کوئی سی سالہ آدمی مجھ سے زیادہ توانا و تندرست ہے؟ کیا میرے اعضاء و حواس باقاعدہ کام نہیں کرتے؟
ج۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں غلطی پر تھا۔ ضرور شادی کرو اس سے بہتر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔
س۔ پہلے میں شادی کرنے کے خلاف تھا۔ مگر اب میری رائے بدل چکی ہے۔ اور میرے پاس اس کے لئے متعدد دلائل ہیں۔ بیوی کی معیت سے حصول مسرت کے علاوہ جو بڑا فائدہ پہونچنے کی توقع ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری نسل باقی رہیگی۔ جو بصورت دیگر معدوم ہو جائے گی۔
ج۔ بے شک یہ خیال بہت اچھا ہے۔ اور میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ جلد از جلد شادی کر لو۔
س۔ سچ مچ؟ کیا تم یہ مشورہ دیتے ہو؟
ج۔ یقیناً اس سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے؟
س۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم ایک مخلص دوست کی طرح مجھے مشورہ دے رہے ہو۔
ج۔ مگر تم شادی کس عورت سے کرنا چاہتے ہو؟
س۔ ڈوریمن سے۔

ج۔ وہ خوش پوش اور خوش باش نوجوان سی لڑکی۔

س۔ ہاں وہی۔

ج۔ ایلکا نسٹر کی بیٹی؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ مشہور شمشیر زن ایلیڈ اس کی بہن؟

س۔ ہاں، وہی۔

ج۔ خوب!

س۔ کیوں تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھا رشتہ ہے۔ ضرور شادی کر لو۔

س۔ کیا میں نے اچھا انتخاب نہیں کیا؟

ج۔ بے شک۔ مگر جلدی کرو۔

س۔ میں تم سے یہ سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ اور تمہیں آج شام کو برات میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔

ج۔ شکریہ میں ضرور آؤں گا۔

س۔ روز بخیر۔

ج۔ (ایک طرف) نوجوان ڈورمین! ایلکا نسٹر کی بیٹی۔ اور سنارل سے شادی۔ جو ابھی صرف اکاون سال کا ہے۔ اچھا رشتہ ہے! کیا ہی اچھا رشتہ ہے! (دہراتے ہوئے چلا جاتا ہے)

سنارل (تنہا)

یہ شادی یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ کیونکہ جو بھی مجھ سے اس کے متعلق سنتا ہے۔ ہنستا ہے۔ اخاہ! میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں۔

ڈورمین

ڈورمین (ملازم سے) دیکھو گاڑی کا خیال رکھنا۔

سنارل (ایک طرف ڈورمین کو دیکھ کر) وہ میری مالکہ آپہونچی۔ کتنی دلربا ہے؟ کیا شان ہے؟ کس رعنائی سے چل رہی ہے۔ اسے دیکھ کر کس کا جی شادی کرنے کو نہ چاہے گا۔ (استقبال کرتے ہوئے) تم کہاں جا رہی ہو؟

ڈ۔ میں کچھ خریدنے جا رہی ہوں۔

س۔ کیا تم اس شادی پر خوش ہو؟ . . . . میرا تو خیال ہے ہم بہت لطف سے زندگی بسر کرینگے۔ مجھے تم پر ہر ایک طرح کا حق حاصل ہوگا۔ اور تم میری ہر ایک خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھو گی۔

ڈ۔ میں بہت خوش ہوں، کیونکہ میرا باپ مجھے بہت بُری حالت میں رکھتا ہے۔ میں اپنی آزادی کے لئے آج تک اپنے باپ سے لڑتی رہی ہوں۔ میری بہت خواہش تھی کہ مجھے جلد از جلد کوئی خاوند ملجائے۔ تاکہ آزاد ہو کر اس کے پاس جو چاہوں کروں سو خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آج سے ہمہ تن مسرت و انبساط ہوں۔ اور وقت کا بہترین مصرف دنیاوی آسائشوں کا حصول سمجھوں۔ چونکہ تم عالی نسب اور نئی روشنی کے آدمی ہو۔ اس لئے تم یہ کبھی نہیں چاہو گے کہ میں چمگادڑوں، اور الوؤں کی طرح مکان کی چاردیواری میں محصور رہوں۔ تنہائی مجھے کاٹنے دوڑتی ہے۔ میرا دل۔ کلب تھیٹر اور رقص گاہوں میں خوب لگتا ہے، تم میری جیسی بیوی پا کر بہت خوش ہو گے۔ ہم میں کسی طرح کے جھگڑے نہیں ہونگے نہ تم میری نقل و حرکت پر معترض ہو گے۔ نہ مجھے تم سے کسی طرح کا تعرض ہوگا۔ الغرض ہم اس طرح رہیں گے گویا موجودہ زمانہ کی روش سے پوری طرح واقف ہیں۔ مگر کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے نظر آتے ہو۔

س۔ میرے سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈ۔ آج کل یہ مرض عام ہے۔ مگر ہماری شادی یہ درد سر رفع کر دیگی۔ اچھا روز بخیر۔ میں ایک اچھا سا سایہ خریدنا چاہتی ہوں۔ اور ان چیتھڑوں کو پھینک دوں گی۔ میں آج تمام ضروری چیزیں خرید لوں گی۔ اور بل تمہیں بھجوا دوں گی۔

جیرونیمو اور سنارل

جیرونیمو۔ آہ سنارل۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں آج ایک جوہری سے ملا تھا۔ اور اُس کے پاس ایک نہایت قیمتی ہیرا ہے جو تم اپنی ہونیوالی بیوی کو شادی کے موقعہ پر تحفہ کے طور پر دے سکتے ہو۔

س۔ ابھی رہنے دو کوئی جلدی نہیں۔

ج۔ کیوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ کل والا شوق کہاں گیا؟

س۔ اصل بات یہ ہے کہ میں چند گذشتہ لمحوں سے بہت پریشان ہوں۔ آگے بڑھنے سے پیشتر میں اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہے۔ کہ بعض دفعہ خواب ہمارے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہیں میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک جہاز میں ہوں۔ اور جہاز بھنور میں.........

ج۔ سنارل مجھے ایک کام ہے۔ اس لئے میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں خواب کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ تمہارے پڑوسی حکیم اور فلسفی ہیں۔ اُن سے اس کی تعبیر دریافت کر لو۔

س (تنہا) یہ درست ہے۔ مجھے ان لوگوں سے مشورہ لینا چاہئیے۔

پینکریس (ایک فلسفی) کسی سے پس پردہ بول رہا ہے اور سنارل کو نہیں دیکھتا۔

پ۔ جاؤ تم بہت گستاخ ہو اور علوم و فنون سے قطعاً بے بہرہ ہو۔

س۔ خوب! میں بر وقت پہونچا۔

پ۔ (سنارل کو نہ دیکھتے ہوئے) میرے پاس اس دعوے کی تائید میں زبردست شواہد ہیں۔ میں ارسطو کی کتابوں سے ثابت کروں گا کہ تم جاہل مطلق ہو۔

س۔ کسی سے لڑ رہا ہے (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (حسب سابق) تم بحث کرنا چاہتے ہو۔ اور منطق کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔

س۔ اُسے غصے میں دکھائی بھی نہیں دیتا (پینکریس سے) جناب!

پ۔ (حسب سابق) یہ مسئلہ تمام فلسفہ میں ناقص تسلیم کیا گیا ہے۔

س۔ کسی نے بہت برافروختہ کر دیا ہے (پینکریس سے) میں کہتا ہوں۔

پ۔ (حسب سابق) غلط ہے اور بالکل غلط ہے۔

س۔ قبلہ ذرا ادھر تو آیئے۔

پ۔ فرمایئے۔

س۔ کیا میں.........؟

پ۔ (دوبارہ لڑتے ہوئے) تم جانتے ہو یہ کونسا مسئلہ ہے یہ مسئلہ قیاس ہے۔

س۔ میں.........؟

پ۔ (حسب سابق) کبریٰ غلط ہے۔ اور صغرا معمولی۔ اور نتیجہ مضحکہ خیز۔

س۔ میں.........

پ۔ (مثل سابق) میں موت کو تمہاری بات کے قبول کرنے پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور میں اپنی رائے پر آخری دم تک قائم رہوں گا۔

س۔ کیا میں..........

پ۔ ہاں۔ میں اس مسئلہ کی تادمِ آخر تردید کروں گا۔

س۔ ارسطو صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس قدر آتش زیر پا کیوں ہیں؟

پ۔ نہایت معقول وجہ ہے۔

س۔ مگر کیا ہے؟

پ۔ ایک جاہل ایک غلط مسئلہ پر مصر ہے۔

س۔ مگر وہ ہے کیا؟

پ۔ آہ مسٹر سنارل۔ آج کل ہر ایک چیز کی قلب ماہیت ہو چکی ہے۔ دنیا نقائص سے مملو ہو رہی ہے۔ حکومت کے منصفوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے غلط مسئلہ کو سن کر ڈوب مریں۔ جو کہ میں تم سے بیان کرتا ہوں۔

س۔ صاحب بتایئے تو وہ کیا ہے؟

پ۔ کیا یہ قابلِ نفرین نہیں کہ عوام الناس کے روبرو "ٹوپی کی صورت" کہا جاتا ہے۔

س۔ کیسے؟

پ۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہمیں ٹوپی کی وضع کہنی چاہیئے۔ نہ کہ ٹوپی کی صورت۔ کیونکہ صورت، اور وضع میں فرق ہے کہ صورت ہمیشہ جاندار چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور وضع، بیجان چیزوں کیلئے۔ چنانچہ حکیم ارسطو نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

س۔ (ایک طرف) گھاس کھا گیا ہے (پینکریس سے) قبلہ اتنی زیادہ غور نہ کیجیئے۔ میں..........

پ۔ مجھے اس قدر رنج ہے کہ میں یہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔؟

س۔ صورت، وضع اور ٹوپی کو ایک طرف رہنے دیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

پ۔ گستاخ آدمی!

س۔ صاحب خاموش رہیئے اور..........

پ۔ جاہل مطلق۔

س۔ توبہ خدایا! میں..........

پ۔ کتنا احمق ہے۔ کہ اس پر اصرار کرتا ہے۔

س۔ وہ جھک مارتا ہے۔ میں..........

پ۔ ارسطو نے اسے واضح طور پر لکھا ہے۔

س۔ یہ صحیح ہے۔ میں..........

پ۔ ایک طویل بیان لکھا ہے۔

س۔ آپ کا خیال درست ہے (اس طرف جاکر جہاں سے پینکریس داخل ہوا تھا)

تم بیوقوف ہو گدھے ہو کہ ایک حکیم سے بحث کرتے ہو۔

اچھا تو یہ کام ختم ہو گیا۔ اب ذرا میری طرف توجہ کیجیے۔ میں آپ سے ایک مسئلہ میں مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی خوبصورت اور باسلیقہ ہے۔ اور مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔ اُس کے باپ نے بھی اجازت دیدی ہے مگر میں کچھ ایسا ہی سا خائف ہوں۔ آپ چونکہ حکیم ہیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیئے؟

پ۔ ٹوپی کی صورت کہنے کے بجائے گدھا بن جانا اچھا ہے۔

س۔ (ایک طرف) خدا تمہیں غارت کرے (پینکریس سے) قبلہ میں دو گھنٹے سے آپ سے مخاطب ہوں۔ اور آپ توجہ نہیں

کرتے۔ ذرا ایک لمحہ میری بات تو سنیئے۔

پ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے غصہ نے مغلوب کر لیا تھا۔

س۔ اچھا تو اب غصہ کو تھوک دیجئے۔ اور ذرا میری عرض سنیئے۔

پ۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

س۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں........

پ۔ اور تم کون سی زبان استعمال کرو گے؟

س۔ کون سی زبان؟

پ۔ ہاں۔

س۔ زبان تو میں وہی استعمال کروں گا۔ جو میرے منہ میں ہے۔ کسی پڑوسی کی تو نہیں مانگ لاؤں گا۔

پ۔ میں کہتا ہوں۔ کس زبان کے محاورے اور اصطلاحات استعمال کرو گے۔

س۔ اوہ! تو یہ علیحدہ بات ہے۔

پ۔ کیا تم مجھ سے اطالوی زبان میں گفتگو کرو گے؟

س۔ نہیں۔

پ۔ اسپینی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ انگریزی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ جرمنی؟

س۔ نہیں۔

پ یونانی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ لاطینی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ سریانی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ ترکی؟

س۔ نہیں۔

پ۔ عربی؟

س۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی۔ فرانسیسی

پ۔ اچھا فرانسیسی

س۔ جی ہاں۔

پ۔ تو میرے دوسرے کان کی طرف چلے جاؤ۔ کیونکہ یہ کان صرف السنۂ علیہ کے لئے وقف ہے۔ اور دوسرا کان گنوار زبانوں کے لئے..........

س۔ معاملہ یہ ہے۔ کہ میں ایک خوبصورت اور باسلیقہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں اُسکے باپ نے اجازت دیدی مگر.......

پ۔ (سنارل کی نہ سنتے ہوئے) انسان کو گویائی خیالات کا اظہار کرنے کیلئے دی گئی ہے۔ اور جس طرح خیالات چیزوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ خیالات کے نمایندے ہوتے ہیں (سنارل بیتابی سے فلسفی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) مگر وہ بدستور بولنے لگتا ہے۔ جبکہ ہاتھ ہٹا دیا جاتا ہے۔ (اور یہ عمل کئی بار دھرایا جاتا ہے) اس لئے تم مجھ سے اُن الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو۔ جو تمہارے خیالات کے بہترین نمایندے ہوں۔

س۔ (فلسفی کو مکان کے اندر ڈھکیل کر دروازہ بند کر دیتا ہے) خدا اس مجنون سے سمجھے۔

پ (مکان کے اندر) گفتگو جذبات کا آئینہ ہے۔ یعنی دل کی ترجمان اور ضمیر کا عکس (کھڑکی کھول کر [illegible]

وہ آئینہ ہے۔ جو عیاں طور پر ہمارے اندرونی۔ ذاتی اور صحیح جذبات کا صادق عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ تم کو عقل ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے تم کیوں صحیح الفاظ کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے؟

س۔ میں تو یہی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر تم تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔

پ۔ میں سنتا ہوں۔ کہو۔

س۔ تو میں کہتا ہوں کہ ....

پ۔ مگر ذرا مختصر کہنا۔

س۔ ایسا ہی ہوگا۔

پ۔ اور واضح طور پر۔

س۔ اوہ! جناب!

پ۔ تمام گفتگو کو ایک مجمل بیان کی صورت میں بیان کرو۔

س۔ میں ......

پ۔ کسی طرح کا ابہام وغیرہ نہیں ہونا چاہیئے (سنارل غصے میں پنکریس کے سر پر پتھر مارنے کیلئے اٹھاتا ہے) ہیں یہ کیا؟ تم اپنا مطلب بیان کرنیکی بجائے غصہ سے مغلوب ہو رہے ہو۔ تم تو اُس گدھے سے بھی بڑھے ہوئے ہو، جو ٹوپی کی صورت، کہتا تھا۔ میں یہ ثابت کروں گا۔ اور معتبر کتابوں سے ثابت کرسکتا ہوں کہ تم حیوان مطلق ہو۔ اور میں حکیم پنکریس۔

س۔ کسقدر بک بک کرتا ہے؟

پ۔ (نیچے اُتر کر) عالم اور فاضل!

س۔ اور کیا؟

پ۔ ایک لائق اور قابل ہستی (جاتے ہوئے) تمام اخلاقی سیاسی اور طبیعی علوم کا ماہر (مڑتے ہوئے) ایک فاضل اور فاضل ترین شخصیت (جاتے ہوئے) وہ شخصیت جسے تاریخ۔ قواعد۔ شاعری۔ ریاضی۔ اور علم ہیئت پر کامل عبور ہے۔

سنارل (تنہا)

خدا غارت کرے ان عالموں کو۔ جو کسی کی بات نہیں سنتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ان کا پیشوا ارسطو صرف باتیں بنانی جانتا تھا۔ مجھے اب کسی اور سے ملنا چاہیئے۔ جو اس سے زیادہ عقل رکھتا ہو۔

مارفوریس (ایک اور فلسفی)

مسٹر سنارل تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

س۔ مجھے آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ اور میں اسی لیئے آیا ہوں (ایک طرف) یہ اچھا آدمی ہے۔ کسی کی بات تو سنتا ہے۔

م۔ مسٹر سنارل مہربانی فرما کر اپنی طرز گفتگو کو بدلیئے۔ ہمارا فلسفہ ہم کو کسی امر کے متعلق فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ فیصلہ کو ہمیشہ معلق رکھا جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیئے۔ کہ میں آیا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آیا ہوں۔

س۔ معلوم ہوتا ہے؟

م۔ ہاں۔

س۔ بے شک معلوم تو ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہی ہوا ہے۔

م۔ یہ ضروری نہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ جو کام ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں وہ دراصل ہوتے نہیں۔

س۔ یہ کیسے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ میں آیا ہوں۔

م۔ یہ مشکوک ہے۔ ہمیں ہر ایک بات پر گمان نہ کرنا چاہیئے۔

س۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور کیا آپ مجھ سے نہیں

بول رہے ہو؟

م۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں ہو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

س۔ یہ کیا مذاق ہے۔ یہ میں ہوں اور وہ آپ اور معلوم ہوتا ہے، کہاں سے آگیا۔ اس بحث کو چھوڑیئے۔ اور اصل معاملہ سنئے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

م۔ مجھے اس کا علم نہیں۔

س۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔

م۔ ایسا ہی ہوگا۔

س۔ جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نوجوان اور خوبصورت ہے۔

م۔ ہو سکتا ہے۔

س۔ مجھے شادی کرنی چاہیئے یا نہیں؟

م۔ تمہاری مرضی۔

س۔ (ایک طرف) یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔ (مخاطب ہو کر) قبلہ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں۔ کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں یا نہ کروں؟

م۔ جیسا موقعہ ہو۔

س۔ کیا یہ بُرا فعل ہوگا؟

م۔ خدا جانے۔

س۔ ٹھیک طرح جواب دیجئے۔

م۔ میرا ارادہ یہی ہے۔

س۔ مجھے لڑکی سے بیحد محبت ہے۔

م۔ ہوگی۔

س۔ اُس کے باپ نے اجازت دیدی ہے۔

م۔ اُس نے ایسا کیا ہوگا؟

س۔ مگر میں شادی کرنے سے خائف ہوں۔

م۔ ہو گے۔

س۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

م۔ یہ ناممکن نہیں۔

س۔ مگر آپ اگر میری جگہ پر ہوتے۔ تو کیا کرتے؟

م۔ میں نہیں کہہ سکتا

س۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

م۔ جو تمہارا جی چاہے۔

س۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

م۔ میں اس سے بری ہوں۔

س۔ خدا تم سے سمجھے۔

م۔ ایسا تو ہوگا ہی۔

س۔ (ایک طرف) کمبخت میں تجھے ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ (اُسے مارتا ہے)

م۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

س۔ یہ تمہاری خرافات کا نتیجہ ہے۔ اور اب میری تسلی ہو گئی ہے۔

م۔ تم بڑے پاجی ہو۔ جو مجھ جیسے حکیم کو یوں پیٹتے ہو۔

س۔ ذرا طرز تکلم درست کرو۔ ہمیں ہر ایک امر پہ گمان کرنا چاہیئے۔ یہ نہ کہو کہ میں نے تمہیں پیٹا ہے۔ بلکہ یہ کہو کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں پیٹا ہے۔

م۔ میں تمہارے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کروں گا۔

س- میں اس سے بری ہوں۔
م- میرے بدن پر ضربات کے نشانات ہیں۔
س- ایسا ہی ہوگا۔
م- ہمیں معلوم ہے کہ یہ تمہاری حرکت ہے۔
س- یہ ناممکن نہیں۔
م- میں تمہارے خلاف سمن جاری کرواؤں گا۔
س- مجھے اس کا علم نہیں۔
م- اور تم ماخوذ ہو جاؤ گے۔
س- ایسا تو ہوگا ہی۔
م- اچھا دیکھو تو (چلا جاتا ہے)

سنارل (تنہا)

اب کیا ہوگا؟ ان حیوانوں سے تو کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ مجھ جیسا بدبخت انسان بھی کوئی نہ ہوگا۔ میں اب تک بدستور پریشان ہوں۔ آہ یہ گنوار عورتیں آ رہی ہیں۔ شاید ان سے مجھے پتہ چلے۔

(دو جپسی عورتیں ناچتی اور گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

س- یہ کتنی خوش ہیں۔ کیوں۔ تم مجھے کچھ میری قسمت کے متعلق بتا سکتی ہو۔

ایک عورت۔ جناب ہم دونوں بتائیں گے۔

دوسری عورت۔ ہمیں اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ اور چاندی کا شگون کرو۔ اور ہم تمہیں سب کچھ بتائیں گے؟

س- یہ لو میرے دونوں ہاتھ اور چاندی۔
نمبر ا۔ تمہاری صحت بڑی اچھی ہے۔
نمبر ۲۔ تم کچھ بننے والے ہو۔
نمبر ا۔ تمہاری شادی عنقریب ہونے والی ہے۔
نمبر ۲۔ تمہیں ایک خوبصورت بیوی ملے گی۔
نمبر ا۔ ایسی بیوی جسے ہر ایک چاہے گا۔
نمبر ۲۔ وہ بیوی جو تمہارے بہت سے دوست بنائیگی۔
نمبر ا۔ وہ بیوی جو تمہارے گھر بہت کچھ لائیگی۔
نمبر ۲۔ وہ بیوی جو بہت نامور ہوگی۔
نمبر ا۔ وہ بیوی جو تمہاری ہر جگہ عزت کرائے گی۔
س- یہ ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ۔ کسی طرح کا خطرہ تو نہیں:
نمبر ا۔ خطرہ!
س- ہاں۔
نمبر ۲۔ خطرہ!
س- ہاں۔ کسی طرح کے فریب کا تو احتمال نہیں (وہ ناچتی اور گاتی ہیں) یہ کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب نہیں۔ جلدی کرو۔ مجھے بتاؤ۔ کہ میری بیوی مجھے کوئی فریب تو نہیں دیگی۔
نمبر ۲۔ تمہیں؟
س- ہاں۔ مجھے۔

(گاتی ہوئی چلی جاتی ہیں)

سنارل (تنہا)

پس اب کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں رہا کہ میں منجم سے جا کر پوچھوں۔ اب اس کے پاس جاؤں گا۔

ڈورمین (لائکاسٹ)

سنارل (پس پردہ)

ل- کیوں پیاری ڈورمین تمہاری سچ مچ یہی مرضی ہے۔
ڈ- بالکل۔
ل- تم ضرور شادی کرو گی۔
ڈ- ضرور۔

ل۔ اور تمہاری برات شام کو آنیوالی ہے۔

ڈ۔ آج شام کو۔

ل۔ مگر ظالم عورت کیا تم میری محبت اور اپنے وعدوں کو بھول چکی ہو؟

ڈ۔ نہیں تو مجھے اب بھی تم سے وہی الفت ہے۔ اور یہ شادی اس میں حارج نہیں ہو سکتی۔ میں اس آدمی سے محبت کی وجہ سے شادی نہیں کر رہی۔ میں غریب ہوں۔ تم بھی غریب ہو۔ اور دولت کسی نہ کسی طرح سے پیدا کرنی چاہیئے۔ جب موقعہ مل رہا ہے۔ تو اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جاوے اس بڈھے کھوسٹ سے عنقریب نجات مل جائے گی۔ کیونکہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے (سنارل کو دیکھ کر) اخاہ پیارے ہم تمہارے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اور تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔

ل۔ کیا یہی صاحب ہیں؟

ڈ۔ ہاں یہی صاحب ہیں۔ جو مجھ سے شادی کرنیوالے ہیں۔

ل۔ صاحب میری مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایسی عورت سے شادی کرنیوالے ہیں۔

سنارل (تنہا)

تو اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مجھے اس رشتہ سے گلوخلاصی کرانی ہوگی۔ گو میرا کافی روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کوشش کرنی ہوگی کہ رشتہ منقطع ہو جائے۔

(ایلکانسٹر کے دروازہ پر جا کر کھٹکھٹاتا ہے)

ا۔ آؤ۔ خوش آمدید۔

س۔ جناب میں۔

ا۔ کیا تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو

س۔ ہاں۔ جناب۔

ا۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟

س۔ مسٹر ایلکانسٹر یہ صحیح ہے کہ میں نے آپ سے آپ کی لڑکی کے لئے درخواست کی تھی۔ جو آپ نے منظور بھی کرلی تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہے۔ اس لئے رشتہ غیر موزوں ہوگا۔

ا۔ میری لڑکی تمہیں بہت پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔

س۔ میرا مزاج بہت غیر مستقل ہے۔ جو آپ کی لڑکی کیلئے تکلیف دہ ہوگا۔

ا۔ میری لڑکی مرنجان مرنج ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اچھی طرح بسر کرے گی۔

س۔ میں جسمانی لحاظ سے بھی کمزور ہوں۔

ا۔ کوئی حرج نہیں۔ شریف بیوی خاوند کا ہر حالت میں ساتھ دیتی ہے۔

س۔ تو پھر مجھے صاف طور پر کہنا پڑے گا۔ کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔

ا۔ یقیناً تم مذاق کر رہے ہو۔ میں اپنا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا۔

س۔ آپ تو وعدہ کو نہیں توڑ رہے ....

ا۔ کبھی نہیں۔ چونکہ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لئے تمہارا حق سب سے افضل سمجھتا ہوں۔

س۔ (ایک طرف) ارے کمبخت۔

ا۔ دیکھو میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے۔ اور اب اگر مجھ سے شہزادہ بھی درخواست کرے۔ تو میں تمہیں ترجیح دوں گا۔

س۔ میں آپ کی عزت افزائی کا ممنون ہوں۔ مگر میں
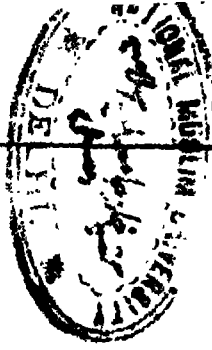
یہ شادی نہیں کر سکتا۔

ا۔ شادی نہیں کر سکتے؟

س۔ نہیں۔

ا۔ مگر کیوں نہیں؟

س۔ کیوں؟ کیونکہ میں اپنے آپ کو شادی کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسرے میں اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں کی تقلید کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے شادی نہیں کی تھی۔

ا۔ خیر یہ ہر ایک کا اپنا مذاق ہے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ چونکہ تم اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اس لئے میں دیکھتا ہوں کہ اس کے متعلق کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں ابھی آتا ہوں۔

سنارل (تنہا)

اب راہ راست پر آرہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بہت تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔ میں وہ قدم اُٹھانیوالا تھا جو بہت مضر ثابت ہوتا۔ اب اُس کا بیٹا آرہا ہے۔ شاید کوئی جواب لایا ہے۔ الیڈاس! (نہایت نرمی سے) جناب آپ کا خادم۔

س۔ جناب میں خود آپ کا خادم ہوں۔

ایل۔ میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ رشتہ واپس لینا چاہتے ہیں۔

س۔ ہاں جناب مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر......

ایل۔ اوہ! اس میں کوئی حرج نہیں۔

س۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میری خواہش........

ایل۔ خیر اسے جانے دیجئے۔ یہ لیجئے (سنارل کو دو تلواریں دیتا ہے) ان میں سے ایک لے لیجئے۔

س۔ ان میں سے ایک تلوار؟

ایل۔ ہاں۔ بشرطیکہ آپ پسند کریں۔

س۔ کس لئے؟

ایل۔ جناب چونکہ آپ میری بہن سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے یہ کرنا ہوگا۔

س۔ یہ کیا؟

ایل۔ دوسرے لوگ آپ سے بے طرح لڑتے۔ مگر ہم سب کام باقاعدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آیئے ایک دوسرے کا گلا کاٹیں۔

س۔ یہ بہت بُرا ہے۔

ایل۔ مگر آپ کو کرنا ہوگا۔

س۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر میرا گلا کٹنے کے قابل نہیں (ایک طرف) دیکھئے۔ یہ ایک اور گدھے سے پالا پڑا ہے۔

ایل۔ مگر جناب یہ ہو کر رہے گا۔

س۔ نہیں صاحب مجھے یہ منظور نہیں۔

ایل۔ جلدی کیجئے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔

س۔ مگر میں یہ کام نہیں کر سکتا۔

ایل۔ تو آپ لڑینگے نہیں؟

س۔ نہیں بالکل نہیں۔

ایل۔ (بید سے سنارل کو پیٹتا ہے) آپ شکایت نہیں کر سکتے یہاں ہر ایک کام باقاعدہ ہوتا ہے۔ اگر آپ تلوار نہیں اُٹھاتے تو آپ کو پٹنا ہوگا۔

س۔ (ایک طرف) عجیب احمق سے پالا پڑا ہے۔

ایل۔ (دوبارہ تلوار دیتے ہوئے) آیئے مردانگی کا ثبوت دیجئے بہتر اس کے کہ میں آپ کے کان کھینچوں۔

س۔ کیا؟ تم نے واقعی تہیہ کر لیا ہے؟
ایل۔ جناب میں کسی کو مجبور نہیں کرتا یا آپ کو شادی کرنی ہوگی اور یا تلوار چلانی پڑے گی۔
س۔ جناب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا غلام و نوکر میں سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔
ایل۔ واقعی؟
س۔ واقعی!
ایل۔ معاف فرمائیں..... (دو بارہ پیٹتے ہوئے)
س۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔
ایل۔ جناب میں آپ سے یہ سلوک کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو یونہی پیٹتا چلا جاؤں گا۔ حتیٰ کہ آپ شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں۔
س۔ تو میں شادی کرنے کیلئے تیار ہوں۔ میں ضرور شادی کروں گا۔
ایل۔ میں یہ دیکھکر بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کے حواس کا اختلال درست ہو گیا ہے۔ یقین جانئیے میرے ڈیڈی کی بہت عزت ہے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔ میں باپ کو بلاتا ہوں۔
(باہر جا کر باپ کو بلاتا ہے)
ایل۔ اباجان۔ یہ صاحب اب شادی کرنے پر رضامند ہیں وہ یہ تہیہ کر چکے ہیں۔
ایلکالنسٹر۔ جناب یہ لیجئے۔ اس کا ہاتھ۔ اب یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اور میں اس بلا سے نجات پا چکا ہوں۔ آئیے نغمۂ شادی گائیں۔
(گاتا)

نسیم رضوانی

چند دن پشاور میں

تھے
عبرت و بصیرت کے چند لمحات زریں

سنتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتۂ رحمت ہوتا ہے جو اُس کے لئے اسباب خیر فراہم کرتا رہتا ہے۔ اور ایک فرشتۂ شر (شیطان) ہوتا ہے جو انسان کو تباہیوں کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے۔ مجھے خیر اپنے اس دوسرے محترم رفیق کا تو علم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ اور کہاں نہیں؟ لیکن اپنے ایک اول الذکر فرشتہ کا حال ضرور معلوم ہے جو ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتا ہے اور جس کا نام اخوند فیض محمد ہے۔ یوں تو میری اور اخوند صاحب کی قابل ذکر شناسائی اول اول اس وقت ہوئی تھی جب میں زمیندار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں (غالباً ۱۹۱۶ء) شامل تھا۔ لیکن حقیقی تعلق کی تاریخ اب سے نو سال قبل اجراء نگار کے وقت سے شروع ہوتی ہے، جب میں بھوپال میں تھا اور وہ اپنے وطن ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔۔۔ پھر اس کو میری کشش صادق کہئے یا انکا شوق فراواں کہ یہ بُعد مکانی بھی ایک بار مٹ کر رہا۔ اور اُنھوں نے از راہِ کرم بھوپال تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور آخر کار یہ فرشتہ بالکل اسی طرح میرے سامنے مجسم آگیا جس طرح بالتشبیہ دحیۂ کلبی کی صورت میں رسول کو نظر آیا تھا۔

شروع سے اس وقت تک جناب اخوند صاحب نگار اور اُس کے مقاصد کے ساتھ جسقدر دلچسپی لے رہے ہیں اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن مختصراً اس قدر بیان ضروری ہے کہ صوبۂ سرحد میں نگار کی مقبولیت انھیں کی ممنون کرم ہے اور انھیں کے لطف وخلوص نے اس کا ایک وسیع حلقہ وہاں کے ارباب علم وادب اور اصحاب جاہ وثروت میں پیدا کیا۔ رہا یہ امر کہ وہ اسقدر

سلہ اخوند صاحب کے اسلاف کا وطن صوبۂ قندہار ہے اور آپ کے جد اعظم اخوند فضل علی فاروقی وہاں قاضی القضاۃ اور شاہزادگان کے معلم و اتالیق تھے۔ لیکن بعد کو سیاسی حالات کے بناء پر قندہار چھوڑنا پڑا اور نواب شیر محمد خاں فرمانروائے ڈیرہ اسماعیل خاں نے انکو وزارت کا عہدہ تفویض کیا۔ بعد کو جب ڈیرہ اسماعیل خاں پر برطانیہ کا تسلط ہوا تو یہ خاندان ریاست بہاولپور سے متوسل ہو گیا لیکن وطنی تعلقات وہیں رہے۔ چنانچہ ہمارے اخوند صاحب بھی ڈیرہ اسماعیل خاں میں رہتے ہیں اور خاندانی عظمت و وقار کو قائم رکھتے ہوئے۔ حد درجہ ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رافت وشفقت سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ اس کا سبب (اگر واقعی نگار اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی صاحب ذوق کو اپنا بنالے) سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خصوصیت کے ساتھ ویسے ہی بد ذوق واقع ہوئے ہیں جیسا میں اور میرا نگار۔

گزشتہ اگست میں غالباً اسی قسم کی کوئی علمی یا ادبی صحبت پشاور میں برپا تھی کہ اخوند صاحب نے پھر اپنی "ملکوتیت" سے کام لے کر میرا اور نگار کا ذکر شروع کر دیا اور مذہب کے باب میں میرے مقالات وخیالات پیش کرکے ایسی گرمی محفل پیدا کر دی کہ آغاز اکتوبر میں مجھ کو وہاں دعوت دئے جانے کی تجویز آخر کار طے کرنا پڑی۔ اکتوبر کی تعین ایک تو اس لحاظ سے تھی کہ موسم خوشگوار ہوگا، دوسرے اس سبب سے کہ اگست میں وہاں کی سیاسی فضا بھی اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔

مجھ کو اطلاع اس وقت ملی جب میں ستمبر میں کشمیر جانے کے لئے اپنا پروگرام مرتب کر چکا تھا، اور یہ ممکن نہ تھا کہ میں ستمبر میں کشمیر رہوں اور اکتوبر میں پشاور۔ کیونکہ اتنا طویل زمانہ اپنے مستقر سے باہر رہ کر بسر کرنا کاروبار کے انتظامی حالات کے لحاظ سے محال تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ سوچنے پر مجبور رہا کہ آیا "سیہ چشمان کشمیری" زیادہ قابل ترجیح چیز ہیں یا "کلہ پوشان افغانی"۔ لیکن چونکہ کشمیر کی سیاحت اس سے قبل کر چکا تھا، اس لئے مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ اور میں نے اطلاع دیدی کہ

کیست آں جانے بتابد سر ز فرمان شما

لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں کے سیاسی کوائف درست نہ تھے۔ اور اس لئے معناً میرا یہ سفر منحصر تھا۔ اس توقع پر کہ اکتوبر تک وہاں کے حالات اعتدال پذیر ہو جائیں گے۔ گو کسی قدر میں اس فلسفۂ اعتدال کے خلاف تھا۔ تاہم قضیۂ بر سرزمین "طے کرنیوالوں کے مصالح کے خلاف میں کیا کہہ سکتا تھا۔

آخر کار شروع اکتوبر تک میرے امن پسند دوستوں کے نقطۂ نظر سے وہاں امن ہو گیا اور تار کے ذریعہ سے ادھر ادھر دعوت کے توثیق وقبول کا مرحلہ طے ہو کر میں ۱۶ اکتوبر کو یہاں سے روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ بھی قدرت کی عجیب کارفرمائی تھی کہ ایک ہفتہ قبل جب مجھے تار بھیجا گیا تو وہاں کامل امن وسکون تھا۔ لیکن میرے پہونچتے پہونچتے دفعتاً صورت حالات بالکل بدل گئی اور پہلے سے بہت زیادہ خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ پہلا شگون نیک تھا جس کا کچھ علم تو پہلے ہی اخبارات کے ذریعہ سے ہو گیا تھا اور پوری طرح اس وقت جب میں ۱۷ کی رات کو دس بجے پشاور چھاؤنی اسٹیشن پر پہونچا اور سب سے پہلے پلیٹ فارم پر رسم خیر مقدم ادا کرنے کے بعد یہی خبر مجھکو سنائی گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر سے جو مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کے چھپانے میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ میں احباب کے اس اظہار تاسف کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ نہ ہو سکا، اور اس لئے ممکن ہے کہ انھوں نے میری بے حسی کا کچھ اندازہ کر لیا ہو۔

بہرحال گاڑی رات کو کچھ نا وقت پہونچی، لیکن جناب سردار احمد خاں صاحب سول جج پشاور، جناب خان بہادر رسالدار مغل باز خاں صاحب (جو پہلے چیف کمشنر صوبۂ سرحد کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور اب قبائلی سیاسیات کے مدیر و مہتمم ہیں) جناب رائے بہادر لالہ دینا ناتھ صاحب گیریزن انجنیئر، جناب دیوان شیو چرن لال صاحب افسر خزانہ اور جناب اخوند فیض صاحب نے (جو محض میری وجہ سے تقریباً ایک ہفتہ قبل یہاں تشریف لے آئے تھے) اسٹیشن پر میری پذیرائی کی زحمت گوارا فرمائی اور اس طرح میں اس نئی سرزمین کے نئے انسانوں کی پُرخلوص معیت میں جناب سردار احمد خاں صاحب کے بنگلہ پر پہونچا، جہاں میرا قیام تجویز کیا گیا تھا۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی نئی جگہ پہونچنے سے قبل وہاں کی جغرافی، تمدنی و عمرانی حالت کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیتا ہے، اور پھر وہاں پہونچنے کے بعد اپنے قیاسات کو حقیقتوں سے موازنہ کر کے دیکھتا ہے کہ اس کے تصور نے کتنی غلطیاں کی تھیں، پھر اکثر و بیشتر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قائم کئے ہوئے نقوش ایک ایک کر کے سب محو کر دینے پڑتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے نقوش کو دینی پڑتی ہے جو کہ توقع کے لحاظ سے کبھی کم اور کبھی زیادہ دلکش ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ کو ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس حیثیت سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا قصہ مختصر یہ کہ پشاور کو میں نے ویسا ہی پایا جیسا سمجھ چکا تھا اور بہت کم اپنی پیش بینیوں میں مجھے اصلاح کرنا پڑی۔

پشاور اور صوبۂ پشاور کے ساتھ میری دلچسپی نہ وہاں کی آبادی سے متعلق تھی جو حکومت برطانیہ کے زیر اثر اپنی تمام آزادانہ خصوصیات کو عرصہ ہوا محو کر چکی ہے، اور نہ وہاں کی خوش گوار آب و ہوا سے کہ اس لحاظ سے بہتر مقامات میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بلکہ وہ متعلق تھی صرف اس خیال سے کہ اس کے جوار میں کچھ قومیں اب بھی ایسی آباد ہیں جو صحیح معنے میں آزادی کی لذت سے آشنا ہیں، اور جو باوصف حد درجہ بے سر و سامانی کے، علم و حکمت کی تمام ہلاکت باریوں اور خارا شگافیوں کا مقابلہ کرنے میں کبھی اپنے آپ کو درماندہ و عاجز نہیں پاتیں۔ پھر اسی کے ساتھ یہ خیال کہ پشاور آخری حد ہے، حکومت برطانیہ کے فیوض و برکات کی اور اس کے بعد ہی دنیا کا وہ مشہور ترین درۂ خیبر شروع ہو جاتا ہے جو تاریخ نوع انسانی سے لیکر اس وقت تک بے شمار واقعات انقلاب و حوادث اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، بہت زیادہ معاون تھا میرے شوق کی فراوانی میں جو اس وقت تک بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا تھا۔

پشاور، حدود پشاور فی الحقیقت نام ہے اس وسیع وادی کا جو ہمالیہ کے دامن میں کسی وقت بحر آسا جھیل کی صورت رکھتی تھی۔ لیکن اب بقول غالب "بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا" اس نے خشک ہو کر اپنے بیابان میں ایک وقت غیر معلوم سے اس انسانی آبادی کو جگہ دے رکھی ہے۔ جسے اگر صوبۂ سرحد کا قلب و دماغ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہیں صوبہ کے فرمانروا کا نشیمن ہے۔ اور اسی مقام سے صوبہ کے اکثر وہ افراد متعلق ہیں جو دولت و امارت، جاہ و ثروت یا تعلیم و سیاست کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر چند میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر کسی وقت ہندوستان کے دوسرے

صوبوں کی طرح اس صوبہ کو بھی نظم و نسق کے خود مختارانہ اختیارات تفویض کئے گئے، تو اس کا امتیاز اس صوبہ کی آبادی کے کس جذبہ کو دیا جائے گا۔ آیا وہ جو موجودہ حالات سیاست کے ماتحت وہاں کے علمبرداران حریت اور اپنی جانوں کی قربانیاں کرنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوا ہے، یا وہ جو صدر جہ امن و سکون کے ساتھ سر عبدالقیوم خاں کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے "دیار محبوب" کی طرف لے گیا ہے۔

صوبہ سرحد کے تقریباً تمام اضلاع کو ہمالیہ اپنے نیم قوسی دائرہ کی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اور اس لئے اس صوبہ کی سیاسیات اُن آزاد قبائل کی وجہ سے جو ہندوستان اور کابل کے درمیان ان پہاڑوں کے غاروں اور دروں میں آباد ہیں۔ زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ اور ہونا چاہئے۔ کیونکہ اندرون ملک میں حکومت کا واسطہ ایک طرف ان تعلیم یافتہ، متمدن و مہذب لوگوں سے ہے جو اپنے جذبات کے اظہار میں صرف زبان و قلم کو جنبش میں لا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف تعلق اُن جاہلوں اور وحشیوں سے ہے۔ جنھوں نے تمام آئینِ انسانیت میں سے صرف ایک یہ اصول اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے کہ شاہد آزادی کے لئے جان ہدیۂ اولین نذر ہے جو انسان کی طرف سے پیش کیا جا سکتی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف وہ جماعت ہے جو اپنے عرض حال کے لئے

مائیم و سرشکے کہ چکیدن نہ تواند،

سے زیادہ کوئی اور تعبیر و تفسیر نہیں رکھتی تو دوسری طرف وہ گروہ ہے جس کے جنون کو

دستے کہ بجز جامہ دریدن نہ شناسد

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر اگر ان دونوں کے فرق و امتیاز کو دیکھنا ہے تو سرحد جائیے اور اس حزم و احتیاط، اس نظم و اہتمام کو دیکھئے جو برطانیہ ایسی عظیم المرتبت حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ میدانوں میں، دروں میں، پہاڑوں پر، سڑکیں ہیں، ریلیں ہیں، فوجیں ہیں، توپ خانے ہیں، ہوائی جہاز ہیں، پھٹنے والے بم ہیں، خاردار تاروں کے حصار ہیں، نعائم و لذائذ کے انبار ہیں، اور ہر وہ چیز ہے، جو اس دور علم و حکمت میں قدرت کے سامنے چیلنج کے طور پر پیش کیا جا سکتی ہے؟ اور کس کے مقابلہ میں؟ ان چند ہزار وحشی و خانماں برباد نفوس کے مقابلہ میں، جن کی زندگیاں ناہموار غاروں میں، پتھروں کی چٹانوں پر بسر ہو گئی ہیں، جو برفباری کی صعوبتوں، گرمی کے شدائد کا مقابلہ صرف اپنے جسم کی عریانی سے کرتے ہیں، جو علم و حکمت کی ترقیوں سے بالکل بیخبر ہیں۔ اور جن کا آزوقۂ جنگ سوائے اُن دو خشک روٹیوں یا چند مٹھی آٹے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جسے اُن کی مائیں، بہنیں اور بیویاں آخری ہدیۂ محبت کی صورت میں اُن کی جھولی میں ڈال کر خدا کے سپرد کر دیتی ہیں۔

جس وقت میں وہاں پہونچا تو حکومت اور آفریدی جماعت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو چکی تھی، جرگوں کی طیاریاں ہو رہی تھیں اور جمرود میں دونوں فریق کے نمایندوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ نزاع یہ تھی کہ برطانیہ کی فوجیں کھجوری میدان

تک بڑھ گئی تھیں۔ جو قبائلی علاقہ میں شامل ہے اور آفریدی جماعت اس مداخلت کے خلاف برہم تھی۔ اس طرف سے اس اقدام و مداخلت کا سبب یہ بیان کیا جاتا تھا کہ چونکہ انھوں نے گذشتہ اگست میں پشاور تک اپنی تاخت کو بڑھا دیا تھا۔ اس لئے بتیا کے لئے پشاور کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے فوجوں کو آگے بڑھا دینا اور کھجوری میدان پر قبضہ کرلینا ضروری ہے۔ اس کا جواب آفریدیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ حکومت نے سیاسی مظاہرات پر جو سلوک اہل پشاور کے ساتھ کیا تھا اُس کا اقتضاء یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے، اُن کا حال دریافت کرتے اور اگر اس سلسلہ میں بعض غیر ذمہ دار نوجوانوں کی طرف سے حملہ یا تاخت کی صورت پیدا ہو گئی تو اس کا ذمہ دار تمام قبیلہ یا جماعت کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رہا یہ امر کہ آیندہ کیلئے امن و سکون کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے تو اس کے لئے ہمارا وہ مطالبہ موجود ہے جو لاکھوں کی تعداد میں حکومت کی طرف سے سڑکوں کے معاوضہ میں دیا جاتا ہے اور جس کو عہد شکنی کی صورت میں ہر وقت ضبط کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے اور گفتگوئے مصالحت اس شرط سے ہو سکتی ہے کہ پہلے اُن فوجوں کو ہٹا لیا جائے جو کھجوری میدان میں آکر ہمارے حصۂ زمین پر قابض ہو گئی ہیں۔

آفریدیوں کے نمایندوں سے حکومت کا پولیٹکل اسٹاف جس میں ہمارے محترم دوست خان بہادر رسالدار[1] مغل باز خاں درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے تھے، مصروفِ گفتگو تھا، اور ہمارے رسالدار صاحب جو قدرت کی طرف سے نہایت سوچنے والا، فلسفیانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اپنی تمام قوت اس کوشش میں صرف کر رہے تھے کہ آفریدی جماعت اپنا سر اُس قوت سے نہ ٹکرائے جو اُن کے مقابلہ میں ایک کوہِ گراں کی حیثیت رکھتی ہے، چیف کمشنر، وائسرائے اور وزیر ہند کے درمیان لاسلکی رابطۂ گفتگو ہر وقت جاری تھا، فوجیں اپنی طیاریوں میں مصروف تھیں۔ شہر کی آبادی نتیجہ کی منتظر تھی، اور ہر زبان روز ایک نئی پیشین گوئی بیان کر رہی تھی کہ صورتیں بن بن کر بگڑیں، فضا صاف ہو ہو کر ابر آلود ہوئی اور آخر کار آفریدیوں کی جاہل و وحشی قوم نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا کہ:-

"اگر اتنی زبردست سلطنت کا ہم ایسے خستہ جانوروں کے مقابلہ میں آنا باعثِ ننگ نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس چیلنج کو اپنے لئے باعثِ فخر نہ سمجھیں۔ کیونکہ قوت کی طرف سے ترکِ رواداری گویا ضعیف کو دعوتِ قربانی دیدینا ہے۔ پھر جب خانماں بربادی یقینی ہے اور جان دینا اٹل، تو پس و پیش کیسا؟ اسلئے آپ کھجوری میدان پر شوق سے قبضہ کر لیجئے لیکن کم از کم یہ حق ہمیں ضرور حاصل ہونا چاہیئے کہ سپرد کرنے سے قبل ایک بار ہمکو اسکو اپنے سیلابِ خون سے رنگین بنا کر ہمیشہ کے لئے خیرباد کہیں"۔

پشاور سے تقریباً ۶ میل جانب مغرب و جنوب حکومتِ ہند کے حدود ختم ہو کر قبائل کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے

---

[1] رسالدار صاحب موصوف خود بھی آفریدی ہیں۔ اور بڑا زبردست اثر اس جماعت پر رکھتے ہیں۔

جیسے دس میل سے لیکر بیس میل تک کا وسیع و ہموار حصہ وادی سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور وہ پیچ در پیچ بلندیاں نظر آتی ہیں، جن کے اندر ایبٹ آباد سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خاں تک ایک نیم دائرہ کی صورت میں اقوام سوات و بنیر، مہمند، آفریدی، اورک زئی، وزیری اور محسود آباد ہیں اور جن میں کسی نہ کسی ایک قوم کا صوبہ سرحد کی حکومت سے برسر پرخاش رہنا ضروری ہے۔ کھجوری میدان اس سے قبل حقیقتاً آفریدیوں کے قبضہ میں تھا، اور اس کو، زیادہ تر چراگاہ کی صورت سے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ آفریدی قوم ایک ہجرت کرنیوالی قوم ہے جو برفباری کے زمانہ میں پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان میں آ جاتی ہے اور پشاور و حدود پشاور میں مزدوری کر کے زندگی بسر کرتی ہے، اس لئے وہ کھجوری میدان کو اپنی سرمائی قیام گاہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ کہ اس کو برطانیہ کے فوجی قبضہ میں دیدیں۔ الغرض میرے سامنے ہی جرگے ختم ہو گئے۔ اور حکومت برطانیہ کی طرف سے اُن کو چند گھنٹوں کا نوٹس دیدیا گیا کہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو محفوظ مقامات میں لیجائیں ورنہ ہوائی جہازوں کی تاخت سے اُن کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ اس کے بعد وہ تیراہ چلے گئے جو خاص ان کا مرکز ہے اور ہر چند اس کے بعد کبھی کبھی رات کو توپوں اور بندوقوں کی آوازیں دونوں فریق کے درمیان گفتگوئے مصالحت کے انقطاع سے مجھے خبردار کرتی رہیں لیکن کوئی قابل ذکر مقابلہ یا تصادم نہیں ہوا، گو پشاور میں روزانہ عجیب غریب مبالغہ آمیز خبریں مشہور ہوتی تھیں، جو فوجوں کی نقل و حرکت اور حفاظت پشاور کے انتظامات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے نزدیک قابل یقین بھی ہوتی تھیں۔

آفریدی قوم اس وقت تقریباً ۱۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں کم از کم ۴۰ ہزار ایسے افراد ہیں جو پوری عسکری قوت کے ساتھ میدان میں آ سکتے ہیں۔ رائفلوں اور کارتوسوں کی ان کے پاس کمی نہیں۔ قدر انداز ی انکا فطری جوہر ہے جب ہر آفریدی بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، جان لینا اور دیدینا اُن کے نزدیک ایسا ہی فطری تقاضہ ہے جیسے مطالعۂ کتاب کے وقت اس کے اوراق اُلٹتے رہنا۔ قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ صحیح معنے میں ہرقلس کی اولاد ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور چٹانوں پر وہ اس طرح آسانی کے ساتھ دوڑتے پھرتے ہیں گویا نشیب و فراز کا کوئی مفہوم ہی انکے یہاں نہیں ہے، جنگ کے دوران میں وہ اکثر شبخونوں سے کام لیتے ہیں، اور جس وقت دست بدست لڑائی ہوتی ہے تو خود اپنے سینہ کے اندر فریق ثانی کی سنگینوں کو تیر اکر خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور اُس کو بھی ہلاک کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم ان صفات و خصوصیات کی چاروں طرف دروں، پہاڑوں، خندقوں اور غاروں میں پھیلی ہوگی تو اس کی مخالفت کس درجہ امن شکن ثابت ہوگی، اور ایک ایسی سلطنت کو جو صلح و جنگ دونوں حالتوں میں ایک خاص اسلوب و آئین کی پابند ہے کس قدر گھبرانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ شخص جو پشاور سے لنڈی خانہ تک گیا ہو دیکھ سکتا ہے کہ درۂ خیبر کے استحکامات کتنے زبردست ہیں اور صرف ۲۷ میل تک ریل لیجانے میں جو ۳۲ سرنگوں میں سے گزر کر گئی ہے چودہ کروڑ روپیہ صرف کر دینا کوئی بے معنی بات نہیں ہو سکتی۔ جگہ جگہ پہاڑوں پر قلعوں کے استحکامات ریل کے ساتھ ساتھ سڑک کی تعمیر

ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جالیہ کی بلندی پر چلی گئی ہے، بلند چوٹیوں تک فوجوں کے لئے بجلی کی روشنی اور آب رسانی کا وافر انتظام، درۂ خیبر کے دونوں طرف مسلح خاصہ داروں کا قیام، جگہ جگہ بلندیوں پر اوٹ پوسٹ اور تمام استحکامات کا باہم گرلاسلکی سے مربوط ہونا، یہ وہ تمام مناظر ہیں، جس سے اگر ایک طرف برطانیہ قوم کی حزم و احتیاط، خوبی نظم و اہتمام پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف درۂ خیبر کی اہمیت و عظمت بھی سامنے آجاتی ہے کہ باوجود ان تمام احتیاطوں اور پیش بینیوں کے ابھی مقابل کے لئے سینکڑوں ہزاروں مواقع اس کے اندر ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر وہ تمام ترقی یافتہ آلات حرب سے آراستہ ہوں تو حکومت کے یہ تمام استحکامات تسبیح عنکبوت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان درۂ خیبر دیکھنے کے بعد ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ جس قوم کے پاس یہ قدرتی ذریعۂ دفاع موجود ہو اور جو حکومت اس پر اقتدار کامل حاصل کرلے وہ نصف ایشیا کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

یہی وہ درہ ہے جس سے عہد قبل تاریخ میں قدیم آریہ قوم وسط ایشیا سے ہندوستان آئی، یہی وہ مقام مرد رہ ہے جس سے اسکندر کی فوجیں گزر کر ٹکسیلا تک آئیں، یہی وہ تاریخ عالم کا اہم ترین راستہ ہے جس نے تیمور، بابر، محمود، اور تمام سلاطین غزنانہ وافاغنہ کی فوجوں کو اپنی آغوش میں جگہ دی۔ تاریخ ماضی کے اوراق ایک ایک کرکے میری نگاہوں کے سامنے آرہے تھے، درۂ خیبر کی ایک ایک چٹان زبان حال سے افسانۂ ماضی دہرا رہی تھی، اور جمرود کے وسیع میدان کا ایک ایک ذرہ بتا رہا تھا کہ یہی وہ وادی ہے جہاں اس سے قبل ملوک قدیم کی فوجیں درہ کی صعوبتوں سے گزرنے کے بعد رات کو اپنی خستگی دور کیا کرتی تھیں۔

میں اسی خیال میں مستغرق تھا کہ سامنے کابل کا ایک قافلہ نظر آیا۔ جو وہاں کی مختلف قسم کی پیداوار اونٹوں و خچروں پر لادے ہوئے اسی وادی جمرود سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ اس سنگلاخ درہ کو پیادہ پا طے کرکے آرہے تھے، لیکن نہ چہروں پر اضمحلال تھا، نہ اعضا میں خستگی کا نشان، حسین و جمیل عورتیں جن میں بعض بہت نازک تھیں، اس استواری قدم کے ساتھ چل رہی تھیں، جو ہمارے یہاں مردوں کا بھی حصہ نہیں، چھوٹے چھوٹے بچے جو گرد آلود پھول کی طرح نظر آرہے تھے اس طرح گزر رہے تھے گویا وہ ابھی ابھی کھیلنے کو باہر نکلے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھا جو بہت ہی نازک تھی اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہ زیادہ خستہ ہو چکی ہے، لیکن اس کے چہرہ کی شگفتگی کہہ رہی تھی کہ اگر وہ خستہ ہے تو بھی اس خستگی سے مسرور ہے۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو ایک آزاد قوم کے فلاکت زدہ افراد میں بھی پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آب و ہوا میں خشک نان جویں سے پیدا ہونے والا ایک قطرۂ خون کہیں زیادہ قیمتی و اہم ہے تولید دم کی اس زیادتی سے

سلہ خاصہ دار اس بے ضابطہ آفریدی فوج کا نام ہے جو حکومت کی مشاہرہ یاب ہے اور جس کے سپرد درہ کی حفاظت ہے خاصہ داروں کے علاوہ آفریدی جماعت کے متعدد سردار و خوانین بھی حکومت کی طرف سے معقول مشاہرہ پاتے ہیں جنکو ملک کہتے ہیں اور یہی لوگ انکے نمائندوں کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہیں۔

جس کے لئے غلاموں کے ذرہ جسم میں ہر سال نشتر فصاد چبھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قافلہ جمرود کی کاروانسرائے پر رات کو قیام کرے گا، اور صبح کو پشاور میں اپنا مال فروخت کر کے پھر واپس آجائے گا۔ خدا جانے کتنی قومیں اس سنگستان کی ایسی ہیں جو وقت نامعلوم سے اسی طرح مرحلۂ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور جن کی حیات عبارت ہے اُس رات سے جس میں وہ تھک کر چٹانوں پر یا فرش زمین پر بیہوش سو جاتے ہیں۔ یا اُس دن سے جس کا مفہوم اُن کے یہاں "بر بندید محملہا" سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، علم و حکمت، دولت و امارت کتنا ہی سامان آسائش و تن پروری کا کیوں نہ فراہم کرلے لیکن روح جس کے لئے تڑپ سکتی ہے وہ یہی وحشت ہے، جو فطرت کی سادہ لیکن پُر از آب و رنگ آغوش میں حقیقی درس حریتِ آزادی کا دیتی ہے۔

چونکہ گفتگوئے صلح کے انقطاع کے بعد ہر وقت آفریدیوں کے تاخت کا امکان تھا اور درہ سڑکیں جوان کے علاقوں سے ہو کر گزرتی ہیں خطرناک ہو گئی تھیں، اس لئے پشاور سے کوہاٹ جانیوالی سڑک زیادہ مخدوش ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ سڑک خاص اُس درہ سے ہو کر گزرتی ہے جو تیراہ سے قریب تر ہے اور جس پر امن شکنی کے زیادہ امکانات تھے اس لئے میزبان عزیز جناب سردار احمد خاں صاحب متامل تھے کہ میں اُس سڑک سے گزروں، لیکن جب اُنھوں نے مجھے زیادہ بیتاب پایا تو درہ کے ایک آفریدی ملک کو طلب کر کے مجھے ان کے سپرد کیا اور اُنھوں نے ایک غیر یقینی وعدہ (کیونکہ جو وعدہ انشاءاللہ کے ساتھ شروع ہو وہ ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے) مجھکو صحیح و سلامت واپس لانے کا کر کے مجھے اپنے ساتھ موٹر پر لے لیا، جناب اخوند فضل محمد صاحب فاروقی بھی میرے ساتھ تھے۔ ہرچند ملک صاحب کی معیت جو اپنے علاقہ تک سڑک اور درہ کی حفاظت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں اور جن کے پاس ہر وقت ایک پستول مع درجنوں کارتوسوں کے آتش فشانی کے لئے تیار رہتا ہے، کافی اطمینان بخش بات تھی، لیکن میرا اطمینان ان میں سے کسی چیز سے متعلق نہ تھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت اطمینان یا امن و سکون کا سوال بھی میرے سامنے نہ تھا تو زیادہ موزوں ہوگا۔

پشاور سے چل کر ۵۔۶ میل کے بعد حدود برطانیہ ختم ہو گئے اور اسی کے ساتھ وہ مناظر عسکری بھی اوجھل ہو گئے جو فوجی چوکیوں اور خیمہ زن فوجوں کی صورت میں سڑک پر اور میدانوں میں نظر آرہے تھے۔ اب میں ایک آزاد علاقہ میں تھا۔ اُس فضا میں تھا جو اس وقت تک غلامی کی سانس سے زہر آلود نہیں ہوئی تھی۔ میدان میں سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے، چراگاہیں تھیں، جابجا آفریدیوں کے گاؤں تھے، اُن کی حسین عورتیں تھیں، ان کے معصوم بچے تھے اور وہ خود تھے۔ جن کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی ایک منٹ کے لئے کبھی ان سے جدا نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہیں غور سے ہمیں دیکھتی تھیں لیکن ملک صاحب کو دیکھ کر جو آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مطمئن ہو جاتی تھیں۔ میدان ختم ہونے کے بعد وہ درہ شروع ہوا جس میں اس وقت تک خدا جانے کتنے واقعات قتل و خونریزی کے جذبہ انتقام فرو کرنے کے لئے ہو چکے ہیں اور ایک گھنٹہ کے

اندر ہم ملک صاحب کے گاؤں میں پہونچ گئے، جہاں صرف ایک اُنھیں کا مکان عمران و تمدن کا پتہ دینے والا تھا۔ ملک صاحب نے مجھے دکھایا کہ کس طرح یہاں ہر ہر گھر رائفل بنانے کا مستقل کارخانہ ہے، اور یہ کہ اُن کی تیار کی ہوئی رائفلیں کس قدر نفیس ہوتی ہیں۔ ایک تیار رائفل میرے سامنے لائی گئی تو میں دیکھکر حیران رہگیا اور کسی طرح باور کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ یہ ولایتی نہیں ہے۔ درہ کوہاٹ کے سڑک پر جتنے گاؤں ہیں سب آفریدی علاقہ کے ہیں، اور ان سب میں رات دن سوائے رائفل سازی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، کہیں نالیں بن رہی ہیں، کسی جگہ ان پر پالش ہو رہی ہے، کہیں اجکٹر (EJECTOR) تیار ہو رہا ہے، اور کسی جگہ کُندے بن رہے ہیں، الغرض جس مکان کو جاکر دیکھئے، وہاں سوائے اس مشغلہ کے اور کچھ نہ پائے گا اور ہر ہاتھ مظاہرۂ شجاعت کی امداد میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصروف کار نظر آئے گا۔

اس گاؤں میں ایک مدرسہ بھی ہے جہاں اُردو کی تعلیم ہوتی ہے، ملک صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کا ایک چھوٹا بچہ موجود تھا۔ میں نے کتاب منگوا کر اُس کا سبق سُنا اور اُسکی پشتو بولنے والی زبان سے اردو کے ٹوٹے ٹوٹے لفظ سُن کر عجیب لطف آیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح پشاور سے لنڈی خانہ تک جوار کے گاؤں والوں کو اخلاقی طور پر ممنون کرنے کے لئے کسی سڑک کا کرایہ آج کل نہیں لیا جاتا، اسی طرح یہاں کا مدرس بھی حکومت سے تنخواہ پاتا ہے۔ جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ حکومت ہند صلح و آشتی کا ہر ممکن طریقہ اس قوم کے ساتھ استعمال کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس قوم کی وحشت کا وہی عالم ہے اور اس کی آزادی کا کسی قیمت پر بھی خریدا جانا ممکن نہیں۔

ان کی عورتوں میں پردہ برائے نام ہے اور وہ نہایت آزادی سے باہر نکل کر اپنے کاموں میں مصروف دیکھی جاتی ہیں۔ ان کا لباس سیاہ دوپٹہ اور سیاہ شلوار ہے جو ان کی دیہقانی خاک آلود زندگی کے لحاظ سے غالباً زیادہ موزوں ہے ممکن ہے اس انتخاب میں کوئی جمالیاتی پہلو بھی اُن کے سُرخ و سفید رنگ کے لحاظ سے پنہاں ہو۔

میرے پروگرام میں کوہاٹ، بنوں، اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا جانا بھی شامل تھا، لیکن کچھ تو سیاسی اضطراب کی وجہ سے احباب نے مخالفت کی اور کچھ اس وجہ سے کہ سردار محمد نواز خانصاحب بھی یہیں خیبر ایجنسی میں رسالدار مغل باز خانصاحب کی ... کے لئے طلب کرلئے گئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ کوہاٹ اور بنوں کی سیاحت بغیر ان کی موجودگی کے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ ہر چند مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ پروگرام کی اس تبدیلی سے میں نہ ملک خدا بخش صاحب گورنمنٹ پلیڈر ڈیرہ جات سے مل سکا اور نہ نواب زادہ سردار اسد اللہ خانصاحب رئیس کلاچی سے، اسی طرح نہ مولوی نور بخش صاحب بی اے وکیل ڈیرہ اسماعیل خاں کی زیارت ہو سکی اور نہ کوہاٹ کے دیگر احباب کی جن سے بہت قدیم غائبانہ تعارف مجھے حاصل ہے، لیکن شکر ہے کہ اس ذوق داشت یا نامساعدت بخت کی تلافی ایک حد تک یوں ہو گئی کہ سردار محمد نواز خانصاحب اتفاق سے پشاور آ گئے اور ... اس ہستی کا شرف دید و ملازمت حاصل ہو گیا، جو تمام صوبہ سرحد میں اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے گو

کی حیثیت رکھتی ہے۔

چودہ دن کے قیام پشاور میں جن حضرات نے غایت لطف و کرم سے کام لے کر میرے مطالعہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان وجود جناب نواب سردوست محمد خاں صاحب رئیس کامل کا ہے، انھوں نے مجھے یہ دیکھنے کا موقعہ دیا کہ رؤسائے پشاور کس فراخدلی کس علوئے حوصلہ سے دعوت کرتے ہیں۔ نواب صاحب ممدوح یہاں کی وہ مخصوص ہستی ہیں جن پر حکومت و پبلک دونوں کا کامل اعتماد ہے اور جن کے علوئے اخلاق سے ہر شخص متاثر ہے۔ افسوس ہے کہ نواب صاحب کی علالت مزاج کی وجہ سے زیادہ موقع تبادلۂ خیالات کا نہیں ملا۔ ایک دن رئیس موضع ٹیکی کے یہاں بھی تقریب شادی کے موقعہ پر شرکت ضیافت کی فرصت نصیب ہوئی اور اس طرح مجھے یہاں کے گاؤں اور وہاں کی معاشرت غیر عمرانی دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ پشاور بڑا شہر ہے، تجارت کی وجہ سے دولتمند بھی ہے، مسلمانوں کی حالت اچھی ہے، لیکن حفظان صحت کی طرف سے محکمۂ بلدہ کو مطلق توجہ نہیں۔ کیسا اچھا شہر، کسقدر عمدہ آب ہوا کتنی دلکش آبادی، لیکن گندگی اس قدر۔ یہ ہے نتیجہ اس نظم و آئین کا جس نے اتنے عرصہ تک اس صوبہ کو خود مختارانہ حقوق سے علحدہ رکھا، اور یہاں کے دماغوں میں اصلاح و تنظیم کی اہلیت پیدا نہ ہونے دی۔

اسلامیہ کالج میں بھی دوبار جانے کا اتفاق ہوا اور قریشی صاحب (اسسٹنٹ سکریٹری) کے ساتھ بھی چند لمحے یہاں کی خوش گوار و صحت بخش ہوا میں صرف کرنے کی توفیق میسر آئی۔ کالج آبادی سے تقریباً ۲ میل دور واقع ہے اور اپنے نظم و اہتمام تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اچھی شہرت رکھتا ہے۔

میں جسوقت لکھنؤ سے روانہ ہوا تو موسم گرم تھا، لیکن پشاور پہونچتے پہونچتے کافی سرد ہوگیا اور اخیر اکتوبر تک اتنی سردی ہوگئی کہ آج ۲۰ نومبر تک بھی یہاں اس کا پتہ نہیں۔ موسم کی دلکشی کے لحاظ سے میں لنڈی خانہ کا وہ ایک دن مشکل سے فراموش کرسکوں گا۔ جب ٹھیک دوپہر کو بلند چوٹیوں سے آئی ہوئی خنک ہوا ہلکے سے ترشح کے ساتھ جسم کے اندر پیوست ہوئی جارہی تھی اور میں اس کا مقابلہ کرنے کی خواہش بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔ میں دیر تک پہاڑ کے ایک غار میں جو غالباً کسی وقت کسی انسان کا مسکن رہا ہوگا اور بہت بلندی پر واقع تھا بیٹھا رہا اور چاروں طرف سنسان منظر کا خاموش مطالعہ کرتا رہا۔

جن حضرات نے میری پذیرائی کی تھی، انھیں نے ۳۰ کی رات کو مجھے رخصت کیا اور ۳۱ کو بہت صبح میں پشاور سے روانہ ہوکر یکم نومبر کو لکھنؤ پہونچ گیا۔ میں اپنے جذبات منت پذیر کا تفصیلی بیان

مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ نہ وہ حضرات اس کو پسند کرتے ہیں جن سے وہ متعلق ہیں، اور نہ میں زیادہ چنیں وچناں کا عادی ہوں، لیکن اس قدر عرض کردینا ضروری ہے کہ ان احباب کے لطف و کرم نے میرے اندر یہ خواہش ابھی سے پیدا کردی ہے کہ آیندہ موسم بہار میں اسی وحشی سرزمین میں چند دن اپنی زندگی کی پھر بسر کروں، جس کی وحشت پر علم و تہذیب کے ہزاروں دن قربان ہیں۔

نگار کا نیا سال
اور
ناظرین نگار

(۱) یہ پرچہ اٹھارویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور آیندہ پرچہ جنوری ۳۱ء کا تقریباً دو چند ضخامت کا ہوگا جسکی خوبی کا اندازہ صرف اسی سے ہوسکتا ہے کہ اس میں آپ کو ایک مستقل کتاب فراست التحریر پر ملیگی جس میں ایک شخص کے صرف سواد خط کو دیکھکر اسکی سیرت اور اُسکے مستقبل پر آپ سانی سے حکم لگاسکینگے اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے۔ علاوہ اسکے حضرت نیاز کا ایک نہایت معرکۃ الآرا افسانہ "داستان حسن و عشق کا ورق خونیں" اور مجنون گورکھپوری کا ایک بالکل نیا افسانہ "خواب و خیال" شائع ہوگا۔ اسی کے ساتھ ایک دور حد درجہ دلچسپ بحث علماء ہند کے اُن فتاویٰ پر ہوگی جو مولانا نیاز کے استفسار و استفتاء پر انکی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

اس لئے ظاہر ہے کہ آپ ایسے مفید و دلکش مجموعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیوں نہ آپ نگار کا چندہ نئے سال کا پہلے ہی سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں اور وی پی کے فضول مصارف سے بچیں۔

مینیجر نگار

سید سلیمان ندوی کیطرف سے جواب

کسی صاحب نے ماہ اکتوبر کے رسالہ نگار میں بعنوان "مولانا سید سلیمان ندوی اس کا جواب دیں کہ کیا واقعی احادیث کی کوئی دینی قیمت ہے؟"

ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں اپنے آپ کو عامل بالقرآن ظاہر کرتے ہوئے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ دعوے کیا ہے کہ:۔

احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں اور حدیثوں کو ہم دینی حجت نہیں مانتے

احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم نہ کرنیکی جسقدر وجوہ بیان کئے ہیں ان سب کا لب لباب یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"بخاری یا مسلم سے روایت کرنے میں لازم تھا کہ اس روایت کے دو شاہد عادل ہوتے پھر وہ راوی جس سے روایت کرتا ہے اُسکے بھی دو گواہ معتبر درکار تھے اس اصول کے مطابق آپ کے پاس ایک حدیث بھی ہے راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی پھر وہ دعوی کرتا ہے کہ اس سے اسکو فلاں نے بیان کیا۔"

اس گمراہ کن مضمون کی حقیقت سے مسلمانوں کو تنبیہ کر دینا چونکہ ہر ایک سچے عامل بالقرآن کا فرض ہے اس لئے اسی اصول مخترعہ کو کہ جسے حق اور ناحق کے امتیاز کا معیار مقرر کیا ہے پیش نظر رکھتے ہوئے اوسکے ادعائے تاسد اکی حقیقت سے مسلمانوں کو مطلع کرتا ہوں کہ حفظ ایمان کا ذریعہ ہو۔ اس منکر حدیث کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا قرآن کو خالص دین قرار دینا اور اپنے متعلق عامل بالقرآن ہونے کا دعوے کرنا بچند وجوہ بالکل غلط اور مغالطہ سے خالی نہیں ہے۔ پہلے یہ کہ احادیث شریفہ کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر قرآن پر عمل دشوار اور غیر ممکن ہے۔

دوسرے یہ کہ جب اُس کے اُصول مخترعہ کے اعتبار سے احادیث دینی حجت نہیں بن سکیں تو بعینہ یہی سوال قرآن پاک کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اسکو دعوی ہے اگر وہی قرآن ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا تو اس قرآن پر عمل کرنے والوں کو احادیث کو دینی حجت تسلیم کرنا لازمی اور فرض ہے۔ اس لئے کہ اس قرآن کا رسول اللہ پر نازل ہونے کا علم اور یقین اسکو

یا تو قول رسولؐ یا قول صحابی سے یا خود خداوند جل وعلا کے قول سے حاصل ہوا ہے۔ اگر قول رسول علیہ السلام سے حاصل ہے تو حدیثیں دینی حجت ہوئیں اور اگر قول صحابہ سے حاصل ہے تو اقوال صحابہ بھی دینی حجت ہوئے اور اگر قول خداوند جل وعلا سے حاصل ہے تو اس قول خداوندی کی تصدیق کہ واقعی یہ قول خداوندی ہے رسولؐ کے قول سے ہونی لازمی اور ضروری ہے۔ اس لئے کہ قرآن پاک کی جن آیتوں میں خداوند جل وعلا نے رسول اللہ کو اپنا رسول اور ان پر قرآن کے نازل ہونیکو بیان کیا ہے۔ درحقیقت ان آیتوں کو خدا نے رسول اللہؐ کے ادعائے رسالت اور اس دعوے کی کہ خدا نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے اثبات اور استشہاد میں نازل کی ہیں۔ تو پہلے یہ ثابت ہو جانا ضروری ہے کہ رسولؐ نے اپنے متعلق خدا کے رسولؐ اور اپنے اوپر قرآن کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ واقعی رسولؐ کا ادعائے رسالت اور اپنے اوپر خدا کی طرف سے نزول قرآن کا دعویٰ صحیح ہے اگر ایسا نہ ہو تو بہت بڑا اعتراض یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول تو یہ دعوے کرتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور مجھ پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے مگر جس کے رسولؐ ہونے کا اور اپنے اوپر جسکے کلام کے نزول کا مدعی ہے۔ اسکی طرف سے رسولؐ کے دعوے کے ثبوت کی کوئی حجت نہیں۔ اسی طرح قرآن کا تو دعویٰ ہے کہ خدا نے مجھکو اپنے فلاں رسولؐ پر نازل کیا ہے اگر قرآن کے اس دعوے کی تصدیق اس رسول کے قول سے نہ ہو تو قرآن کا اپنے دعوے میں جھوٹا ہونا لازم آئیگا۔ غرضکہ قرآن کے اس دعوے کی کہ مجھکو خدا نے فلاں رسول پر نازل کیا ہے یا خود خداوند جل وعلا کے اس دعوے کی کہ میں نے یہ قرآن اپنے فلاں رسول پر نازل کیا ہے۔ تصدیق اور ثبوت اس رسولؐ کے قول سے ضروری ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کے منزل من اللہ اور منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی تصدیق اور ثبوت قول رسولؐ سے لازمی اور ضروری ہے اگر قرآن پاک کی تمام آیتوں کے منزل من اللہ اور منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کی تصدیق اور ثبوت قول رسول ضروری اور لازمی نہیں ہے تو نعوذ باللہ قرآن پاک کا مرتبہ طلسم ہوشربا کے دفتر سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے اور جو لوگ کہ قرآن کی تحریف کے مواقع کے متلاشی رسول اللہ کے وقت سے لیکر آج تک ہیں ان لوگوں کو کھلا ہوا میدان مل جاتا۔ جسطرح چاہتے نظم قرآن میں اپنی ریشہ دوانی کرکے اپنے دل کے حوصلے نکال لیتے۔ پس جبکہ قرآن کے کلام خداوندی ہونے اور اس پر ایمان رکھنے کا دارومدار رسول ہی کے قول پر ہے تو اب اقوال رسول یعنے احادیث کو دینی حجت نہ ماننے والے منکرین قرآن ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لہذا اسی اہل بالقرآن کے مدعی کے لئے احادیث کے دینی حجت ہونے کو تسلیم کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ مگر چونکہ یہ احادیث [illegible] اس کے اصول فن کے اعتبار سے ناقابل حجت ہیں۔ تو کم ازکم اپنا ہی ایمان درست کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ جس قرآن کے حامل ہونے کا مجھکو دعویٰ ہے یہ وہی قرآن ہے جو رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے ایک ہی ایسی روایت پیش کریں جسے ایک دوسرے سے دو شاہد عادل کے سامنے روایت کرتے ہوئے اپنی سلسلۂ روایت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچایا ہو۔ ورنہ اس حامل بالقرآن پر ایک ایسی چیز کا ایمان رکھنے [illegible]

قرآن ہونیکے اعتقاد رکھنے کا الزام عائد ہوگا جس کا قرآن ہونا ظنی اور غیر یقینی ہے۔ اور اگر وہ قرآن جس پر عامل ہونے کا اُسکو دعویٰ ہے منزل علی رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے تو اس کا احادیث کے دینی حجت ہونے کو نہ تسلیم کرنیکا دعویٰ بالکل صحیح اور درست ہے۔

تیسری یہ کہ کل قرآن پاک کا نزول بہ یک وقت نہیں ہوا ہے بلکہ حالات اور واقعات کے بموجب اس کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور اسکے اندر جسقدر احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مجمل۔ بعض محکم۔ بعض متشابہات بعض ناسخ بعض منسوخ۔ بعض ماؤل۔ بعض مفسر ہیں اگر یہ مدعی عمل بالقرآن احکامات کو دینی بات سمجھتا ہے اور اپنے اصول مخترعہ کے بموجب احادیث مدونہ فی الکتب کو واقعی دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے تو ان احکامات قرآنیہ کے سمجھنے کا اس کے پاس کونسا ذریعہ ہے اگر کوئی ایسا مدعی عمل بالقرآن جو احادیث کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتا ہے حسب ارشاد قرآنی اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھنے کے لئے جائے۔ تو اس کو کیسے معلوم ہوگا کہ مکروہات اور دن کے اندر کون کون وقت نماز پڑھنی چاہیئے اور کون وقت کتنی رکعتیں نماز فرض ہیں اور کتنی واجب صحت نماز کے لئے کیا کیا شرائط ہیں۔ ارکان نماز میں سے کون کون ارکان فرض ہیں اور کون کون واجب۔ پس ان تمام دینی باتوں کا معلوم کرنا احادیث کو بغیر دینی حجت تسلیم کئے غیر ممکن اور محال ہے اس لئے کہ قرآن پاک نے مسائل جزئیہ کو نہیں بیان کیا ہے ممکن ہے کہ کسی منکر حدیث کے ذہن میں یہ آئے کہ جب قرآن نے نماز کا حکم دیا ہے تو نماز کے متعلق جسقدر مسائل جزئیہ ہیں قرآن کے اسی کلیہ اقیموا الصلوات کے اندر داخل ہیں اور رسول نے قولاً اور فعلاً اسی کلیہ کی تفصیل کردی ہے تو اندریں صورت بھی اولاً اس کو حدیث کے دینی حجت ہونیکو تسلیم کرنا پڑے گا اور ثانیاً قول رسول کو۔ جو غیر قرآن ہے قرآن ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔

احادیث کے دینی حجت ہونے کو منکرین ہی کی شان میں آیت شریفہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ دین کی جس قدر باتیں خدا نے اپنے رسول کو بتلائیں اور رسول نے ان دینی باتوں کی اشاعت فرمائی دو قسم ہیں ایک تو۔ وہ باتیں ہیں کہ خدا نے بمعرفت جبرئیل وحی بھیجکر بتلائیں اور متلوا فی القرآن ہیں۔ دوسری قسم کی وہ باتیں ہیں کہ خدا نے دوسرے فرشتہ کی معرفت سے وحی بھیجکر یا بلا واسطہ کسی فرشتہ کے خود خدا نے رسول پر وحی بھیجکر یا جبرئیل کی معرفت وحی بھیجکر بتلائیں مگر متلو فی القرآن نہیں ہے۔ وہ دینی باتیں جو وحی کی پہلے قسم سے متعلق ہیں قرآن کہلاتا ہے اور جن باتوں کو وحی کے دوسرے قسم سے تعلق ہے قول رسول اور حدیث کہلاتی ہیں۔ اگر منکرین حدیث اسی آیت شریفہ پر نظر غور ڈالکر سمجھیں تو خود انکو با حسن وجوہ معلوم ہو جائے گا کہ درحقیقت احادیث کی واقعی دینی قیمت ہے اور حدیثیں دینی حجت ہیں۔ اور مدعی عمل بالقرآن کے لئے حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کرنا اور سمجھنا لازمی ہے۔ اور اس منکر حدیث نے۔ حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے انکار میں جو یہ بیان کیا ہے کہ:۔

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کے لئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے۔ اطیعوا اللہ و

اطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ کہتے ہیں کہ بیشک حدیثیں تسلیم نہ کیجائیں رسول کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسکے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کے ساتھ ساتھ امرائے اسلام کی بھی اطاعت کا بھی حکم ہے آپ نے احادیث رسول کے دفاتر تو تیار کر لئے۔ لیکن امرائے اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا اون کی احادیث کے ان کی اتباع کیونکر ہو سکتی ہے؟

درحقیقت ان پر حجت ہے۔ اس لئے کہ اطاعت رسول حسب ارشاد قرآنی۔ جب فرض ہے تو رسول کے افعال اور اقوال کے مطابق اپنے افعال اور اقوال کو درست کرنا ضروری ہے اور قرآن نے کل افعال اور اقوال رسول کو۔ بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ اگر معمولی غور و فکر سے یہ منکر حدیث کام لے تو۔ خود ان کو حدیثوں کے دینی حجت ہونے کا اقرار کرنا پڑے اس لئے کہ جس طرح اطاعت رسول حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر غیر ممکن اور محال ہے۔ اسی طرح اطاعت الٰہی بھی حدیثوں کو دینی حجت سمجھے بغیر غیر ممکن ہے اور ان تمام لوگوں کا جو صحیح معنی کے ساتھ مدعی عمل بالقرآن ہیں یہی مذہب ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے انکی احادیث کے مجموعے بنائے جائیں عقل سلیم کا کام نہیں ہے امرائے اسلام کی اطاعت کے لئے ان کی حدیثوں کے مجموعے بنانے کی ضرورت درحقیقت انہی عامل بالقرآن کو ہے جو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکے منکر ہیں۔ اور جو عامل بالقرآن احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکے معتقد ہیں انکو امرائے اسلام کی احادیث کی کیا ضرورت ہے رسول نے خود تمام باتوں کو بالتفصیل بیان فرما دیا ہے۔ مگر منکر احادیث کے پاس قرآن کے اس حکم پر عمل کرنیکا کون سا ذریعہ ہے۔ اولی الامر سے کون امرائے اسلام مراد ہیں۔ اور ان کی اطاعت کا کیا مطلب ہے اگر یہ منکر حدیث احادیث کے دینی حجت ہونے کا انکار نہیں کرتا تو آیات قرآنیہ کے معنی اور مطالب میں تحریف کی جرات نہیں کر سکتا فاعتبروا ولا تکن من الذین ضلوا فاضلوا۔

اب اس منکر حدیث کے تحقیقی جواب کو بھی ملاحظہ فرمادیں لکھتا ہے:۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت بھی کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جسکی اتباع وہ خود کرتا ہے اس کی پیروی کی جائے۔

اگر درحقیقت یہ منکر حدیث اطاعت رسول کو فرض سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا تو حدیثوں کے دینی حجت ہونیکا انکار ہرگز نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جب یہ خود کہہ رہا ہے کہ رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جس کی اتباع وہ خود کرتا ہے اسکی پیروی کی جائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کی اتباع جس طرح سے رسول نے کی ہے کرنیکا نام اتباع رسول ہے۔ اگر کسی نے۔ قرآن کی اتباع بعینہ جسطرح کہ رسول نے کی ہے نہیں کی تو وہ شخص متبع قرآن نہیں کہلا سکتا ہے پس اتباع قرآن کے لئے حدیثوں کے دینی حجت ہونے میں بھی اب کلام کی گنجائش نہیں ہے اس لئے

یہ معلوم کرنا کہ رسول نے قرآن پاک کی کس آیت کا کیا مطلب سمجھا اور اس پر کس طرح عمل کیا ہے متبعین قرآن کے لئے ضروری ہے بغیر اسکے قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنا ضلالت اور خارج عن الاسلام ہونے کا پیش خیمہ اور اپنے کو خدا کا دشمن بنانا ہے۔

علاوہ بریں اس منکر حدیث کے علمی معلومات کا عجب یہ حال ہے کہ قرآن پاک کے آسان سے آسان لفظوں کے بھی صحیح معنی سمجھنا اس کے لئے محال ہے تو۔ اپنی علمی لیاقت سے قرآن پاک کی ان آیتوں کو کہ جس کے متعلق خود خدا کا ارشاد ہے ہو الذی انزل علیک الکتب منہ ایات محکمات ہن ام الکتب و اخر متشابہات فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولو الالباب حدیثوں کو دینی حجت تسلیم کئے بغیر کیا سمجھ سکتا ہے۔ بالخصوص اس منکر حدیث کی جیسی علمی حالت ہے خود آیت شریفہ ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم کے ترجمہ میں اپنے سے ظاہر کر دی ہے۔ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتا ہے۔

بعض لوگ حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں۔

جب اس منکر حدیث کو لہو الحدیث اور مطلق حدیث۔ اور حدیث رسول کے معنی اور اُسکے درمیان فرق و امتیاز کی طاقت نہیں تو۔ ایسے شخص کا حدیثوں کے دینی حجت ہونے کو تسلیم نہیں کرنا اپنے سے اپنے کو چاہ ضلالت میں ڈھکیلنا نہیں ہے تو اور کیا اور مشیر دیانت اور تقویٰ کا یہ حال کہ محض اپنے ادعائے باطل کو ثابت کرنے کیلئے قرآن کے لفظ اور معنی میں تحریف کرنے میں۔ نہ خداوند قہار کی قہاریت اور نہ قرآن پاک کی عظمت اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کا خیال ہے۔ احادیث رسول کے دینی حجت ہونیکو نہیں تسلیم کرنیکی اثبات میں اس آیت شریفہ کو پیش کرنا اور لہو الحدیث کا معنی۔ حدیث رسول مراد لینا۔ اور اوس پر عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرنا۔ اس منکر حدیث کی ایمانی حالت کا بے مثل خاکہ ہے۔ خدا اور اوسکے رسول اور خدا کے کلام کی عظمت اور راہبیت کو پیش نظر رکھکر ایمان سے کام لے کر اس آیت شریفہ کے ترجمہ لکھتے وقت کم از کم قرآن پاک کے کسی آسان سے آسان اُردو ترجمہ کو دیکھ لیتا تاکہ من فسر القران برائہ فلیتبوا مقعدہ فی النار کے وعید سے تو محفوظ رہتا۔ رسول کی احادیث کے مشغلہ کا خریدار ہونا ایمان اور سعادت مندی کا وسیلہ ہے۔ ہاں یہی منکر حدیث اور انہیں کے جیسے لوگوں کے جھوٹ موٹ اور مزخرفات سے ایمانداروں کو دور رہنے کی ہدایت اور تاکید اس آیت شریفہ میں کی گئی ہے۔ اور بتلا دیا ہے کہ یہ منکر حدیث عامل بالقرآن ہونیکے جھوٹ دعویٰ کرنے والا جو جھوٹ اور من گڑھت باتوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو گمراہ کرنیکی کوشش کر رہا ہے۔ گمراہ اور جاہل ہے۔ محمد یوسف رشیدی

نگار۔ یہ نمونہ ہے مولویوں کی مربوط و مدلل تحریروں کا جو کبھی کبھی ہمیں موصول ہو جاتی ہیں۔ اگر سارا مضمون پڑھنے کے بعد آپ کسی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو بھی الہامی نہ کہیں کیونکہ جس طرح کلام مجید بغیر احادیث کی مدد کے نہیں سمجھ سکتے اسیطرح یہ مضمون بھی عام فہم انسانی سے اسقدر بلند ہے کہ جب تک خود اسکا لکھنے والا آکر نہ سمجھائے کوئی مفہوم پیدا کرنا مشکل ہے

باب الاستفسار

نفس و روح

(جناب سید علی متقی صاحب۔ حیدر آباد)

کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ نفس انسانی و روح میں کوئی فرق ہے اور اگر کوئی فرق نہیں ہے تو کلام مجید میں روح اور نفس کا علحدہ علحدہ ذکر کیوں آیا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں علحدہ ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ یعنی مرنیکے بعد نفس باقی رہتا ہے یا روح

موت کے بعد بقاء روح کی صورت کیا ہے اور کلام مجید میں جو روح انسانی کی حقیقت "قل الروح من امر ربی" کہکر بتائی گئی ہے وہ نفس انسانی سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ الغرض میں نفس و روح کا فرق اور بقاء روح کی بابت آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) آپ کا استفسار بہت دلچسپ لیکن بہت تفصیل کا محتاج ہے اگر میں اس مسئلہ میں تمام اکابر کے خیالات پیش کروں۔ لیکن چونکہ میں کسی اور کی رائے سے استناد نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ خود اپنی رائے اس باب میں ظاہر کروں گا، اس لئے غالباً زیادہ شرح و بسط کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ آپ کے سوالات کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھوں گا اور عمومی طور سے اس مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال کرونگا کہ آپ کے سوالات کا جواب کسی نہ کسی طرح آجائے خواہ ترتیب کچھ ہو۔

قرآن میں نفس و روح دونوں لفظ آئے ہیں، لیکن قبل اس کے کہ قرآنی مفہوم سے بحث کیجائے ان دونوں الفاظ کے لغوی معنی معلوم ہو جانا چاہیئے۔

لغتاً نفس عربی زبان میں مونث و مذکر دونوں مستعمل ہوتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جب وہ مونث استعمال ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے معنے روح یا جان کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ خرجت نفسہ روح یا جان نکلنے کے محل پر بولتے ہیں اور جب وہ مذکر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ذات یا شخص ہوتی ہے۔ نفس کے معنے متعدد ارادہ کے بھی

آتے ہیں، خون کے معنے میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور جسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح عظمت، ہمت، اور رائے کا مفہوم بھی اس لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے،

روح کے معنے عربی میں اس چیز یا کیفیت کے ہیں جس سے حیات قائم رہتی ہے اور وحی و الہام کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

یعنی لغوی لحاظ سے نفس کا لفظ زیادہ وسیع المعنی ہے جس میں روح کے معنے بھی شامل ہیں اور لفظ روح سے وہ تمام معنے ظاہر نہیں کئے جاتے جو نفس کے ماتحت ہم نے ابھی ظاہر کئے۔

اب قرآن کو دیکھئے کہ اس میں یہ دونوں الفاظ کہاں اور کن معنے میں استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے جہانتک غور کیا ہے کلام مجید میں لفظ نفس (باوجود اس کے کہ وہ مونث استعمال ہوا ہے) ہر جگہ ذات، ضمیر، حیثیت اصلی، جوہر اور نوع کے معنے میں آیا ہے اور لفظ روح الہام و وحی، فراست و ذکاوت، قوت استعداد یا استعداد ترقی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن میں کسی جگہ نہ لفظ نفس بول کر اور نہ لفظ روح کہ کر وہ روح مراد لی گئی ہے، جس کے متعلق بقاء یا عدم بقاء کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ گویا قرآن اس باب میں بالکل ساکت ہے اور اس نے اس روح سے مطلق بحث نہیں کی جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا (پیدا کیا تم کو ایک نفس یعنی ایک نوع سے اور پھر اس سے جوڑے پیدا کئے) میرے نزدیک اس جگہ نفس واحدۃ سے مراد کوئی مخصوص ذات یا ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہاں نفس سے مراد کوئی خاص ذات یا شخص ہستی ہوتی تو اس کا استعمال مذکر صورت میں ہوتا اور اس کی صفت واحدۃ کی بجائے واحد آتی۔ وہ مفسرین جو اس سے مراد آدم و حوا لیتے ہیں، میرے نزدیک غلطی پر ہیں، کیونکہ کلام مجید نے آدم و حوا کی انجیلی روایت کی بہ حیثیت واقعہ ہونے کے کہیں تصدیق نہیں کی، بلکہ اس کو صرف استعارہ و تشبیہ کے مفہوم میں ظاہر کیا ہے۔

سورہ الفجر میں ارشاد ہوتا ہے "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ (اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف مائل ہو اس حال میں کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے خوش ہے) اس جگہ نفس کے معنی ضمیر (CONSCIENCE) کے لئے گئے ہیں۔ نہ کہ روح کے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جو میں نے بیان کیا۔ کیونکہ اس سورۃ میں بدکاروں اور نیکوکاروں کے انجام سے بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ نیکی کے انجام کی مکمل ترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ انسان کا ضمیر مطمئن ہو کر حقیقی مسرت سے وابستہ ہو جس کو ارجعی الی ربک سے ظاہر کیا گیا ہے۔

لفظ نفس کا ضمیر کے معنے میں مستعمل ہونا سورۂ القیامہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں ولا اقسم بالنفس

اللوامہ کہکر نفس لوامہ سے ملامت ضمیر مراد لی گئی ہے۔ سورۃ الشمس میں بھی ونفس وما سواھا سے ضمیر انسانی مراد ہے جس کی تصدیق بعد کی آیت فالھمھا فجورھا وتقواہا سے ہوتی ہے۔

اب لفظ روح کے متعلق غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں کسی جگہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ وانہ لتنزیل رب العالمین۔ نزل بہ روح الامین۔ یہاں روح الامین سے وحی و الہام مراد ہے۔

سورۃ السجدہ میں خلقت انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ یہاں لفظ روح سے استعداد ترقی و ملکۂ ارتقاء مراد ہے۔ عیسیٰ کے بیان میں جہاں جہاں نفخ روح کا ذکر ہے، اس سے مقصود وہی استعداد مراد ہے جو انسان میں اخلاق بلند و تزکیۂ نفس کا باعث ہوتی ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ کلام مجید میں لفظ روح، عام متعارف روح کے معنے میں نہیں آیا ہے سورۃ النحل اور سورۃ المومن کی ان آیات سے ہوتا ہے:۔

(۱) ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی ملکۂ قبول وحی و الہام ہر شخص میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس کو اللہ چاہتا ہے عنایت کرتا ہے)

(۲) یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے اس میں یہ روح یا استعداد پیدا کر دیتا ہے)

اگر روح سے مراد وہی انسانی روح ہوتی تو یہ نہ کہا جاتا کہ "جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے"۔ کیونکہ وہ روح تو ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ایک آیت ہے:۔ یسئلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی (یعنی تجھ سے لوگ روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ سو کہدو کہ روح میرے خدا کے حکم سے ہے) عام طور پر سب نے یہی سمجھا ہے کہ اس آیت میں روح انسانی سے بحث کی گئی ہے اور روح کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک روح انسانی کا ذکر اس جگہ بھی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہاں بھی روح سے مراد وحی و الہام ہے۔ اس کا ثبوت خود اس آیت کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد ہی یہ آیتیں نظر آتی ہیں۔ ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا .... قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

ان آیتوں سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ رسول سے لوگوں نے روح انسانی کے متعلق نہیں دریافت کیا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ "تم جو قرآن کی بابت کہا کرتے ہو کہ روح الامین اس کو لاتا ہے، اس کو خدا نازل کرتا ہے، الہام ربانی ہے، القاء خداوندی ہے، سو اس کی حقیقت کیا ہے یعنی تم نے جو اس کا نام روح رکھا ہے سو اس کی اصلیت کیا ہے۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے، اس کے حکم سے ہوتا ہے، جسکو تم نہیں سمجھ سکتے۔

ظاہر ہے کہ اگر اس آیت سے مراد روح انسانی ہوتی تو فوراً ہی اسکے بعد قرآن اور وحی کے ذکر کا کوئی موقعہ نہ تھا قرآن اور وحی کے ذکر ہی سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی نہیں ہے۔ بلکہ قبول وحی و الہام کا ملکہ مقصود ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہاں روح سے مراد روح انسانی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو من امر ربی کہکر کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا گیا اور جسطرح دنیا کے اور تمام مظاہر و آثار کو حکم ربانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے اسیطرح روح کے متعلق بھی کہدیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ روح کا مسئلہ جس قدر اول دن دقیق تھا، اسی قدر آج بھی ہے، اور ہمیشہ رہیگا، کیونکہ اسکی بنیاد اگر مفروضات پر نہیں تو قیاسات پر ضرور ہے اور چونکہ یہ قیاسات ہماری اسی دنیاوی زندگی کے مراحل و منازل، تاثرات و کیفیات کو دیکھکر قائم کئے گئے ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ معرض بحث میں رہیں گے اور کسی پر درجہ یقین کے حد تک اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یقین کی کوئی صورت ہے تو صرف یہ کہ ہم مرنے کے بعد تمام کارگاہ کو اسی دنیا کی طرح تصور کریں لیکن ایسا تصور کرنیکے کیا وجوہ ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی سوائے قیاسات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

متقدمین و متاخرین نے سینکڑوں کتابیں اس ایک مسئلہ روح پر تصنیف کر ڈالی ہیں، اور اگر ہم پہلے ہی سے یہ یقین کرلیں کہ اُن کے لکھنے والے یکسر حقیقت نگار ہیں، تو بیشک اس اعتقاد کی بناء پر ہم انھیں صحیح سمجھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ اس اعتقاد سے خالی الذہن ہوکر یہ معلوم کرنا چاہیں کہ انھوں نے اپنے نظریات اس مسئلہ میں کیونکر قائم کئے، اُن کی علمی توجیہ کیا ہو سکتی ہے، اور ہم کیوں ان کو باور کریں، تو اس کا جواب اُن کی کتابیں کیا معنے اگر وہ خود زندہ ہوکر سامنے آجائیں، تو کوئی نہیں دے سکتے۔

بقاء روح کا خیال جیسا کہ ہم نے اپنے مضمون "مذہب کی ضرورت" میں بیان کیا ہے، بہت قدیم چیز ہے اور ابتداء آفرینش سے وہم و خیال کی صورت میں اسکا وجود چلا آتا ہے، کیونکہ انسان کے جذبۂ محبت کا بھی اقتضاء یہی تھا کہ جو محبوب ہستیاں اس سے جدا ہو چکی ہیں ان کی یاد قائم کرنے کے لئے کسی حقیقی تصور کو پیدا کرے اور جذبۂ خوف کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جو مسلط یا حکمراں ہستیاں گزر چکی ہیں، ان سے ڈرتے رہنے کے لئے اُن کے اثرات کو قائم و محفوظ سمجھے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھکر انسان نے بقاء روح کا عقیدہ پیدا کیا اور جب مذاہب اخلاقی کی بنیاد پڑی تو مصلحین و قائدین مذہب نے انسان کے اس قدیم خیال سے فائدہ اُٹھاکر معاد کی صورت پیدا کی جس میں نہ صرف روح انسانی بلکہ اُس کے جسم کا بھی

مبتلائے عذاب، مستحقِ ثواب ہونا ظاہر کیا، اور چونکہ انسان صرف انھیں باتوں سے متاثر ہو سکتا ہے جن کا اسکو تجربہ ہوتا رہتا ہے
اس لئے عذاب و ثواب کی صورتیں بھی وہی بیان کی گئیں جن سے ہم اس دنیائے آب و گل میں متاذی یا مسرور ہوتے ہیں۔

الغرض بقاءِ روح کا مسئلہ علمی دنیا کا کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دورِ جہل و تاریکی کا عقیدہ ہے
جس سے اہلِ مذہب نے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسلماتِ عالم اور حقائقِ ثابتہ میں داخل کر دیا، درآنحالیکہ اس کی بنیاد محض
وہم و خیال پر قائم ہوئی اور آج بھی کوئی علمی یا اخلاقی سبب اسکو حقیقت ثابت کرنے کیلئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سلسلہ میں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ چونکہ انبیائے کرام علمِ لدنی رکھتے تھے اور ان کو براہ راست اس مصدرِ فیضِ
علم سے معلومات حاصل ہوتی تھیں، جسے خدا کہتے ہیں، اس لئے ان کی تعلیمات کو صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس
میں وہی اعتقاد کی روح کام کر رہی ہے۔ علمِ لدنی یا علمِ وحی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ جب وہ کسی امر کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے
تھے تو فوراً آنکھ بند کرتے ہی ان پر تمام حالات منکشف ہو جاتے تھے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ فطرت کی طرف سے وہ اچھا
سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے اور جس حد تک درستیٔ اخلاق یا نظامِ تمدن کا تعلق ہے وہ اپنے وقت و زمانہ کے لحاظ سے
اچھا قانون بنانے والے، اور بہتر تعلیمات پیش کرنیوالے تھے، علومِ دنیا، یا حقائقِ اشیاء سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اور
نہ ان امور سے بحث کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ اگر انھوں نے بقاءِ روح کے خیال کو شائع کر کے معاد کا یقین لوگوں کو
دلایا تو اس لحاظ سے بالکل صحیح و درست سمجھا جائے گا کہ اس سے درستیٔ اخلاق پر اثر پڑا، لیکن جس وقت محض حقیقت کے
لحاظ سے اس پر گفتگو کی جائے گی، تو ہم اس کے ماننے پر صرف اس لئے مجبور نہ ہونگے کہ فلاں پیغمبر یا فلاں ولی نے ایسا بیان کیا ہے
بلکہ ہم یہ معلوم کرنیکے مستحق ہوں گے کہ ہم اسے کیوں ایسا کہیں اور اس کے صحیح سمجھنے کے لئے کیا دلائل ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ بقاءِ روح کے قائل ہیں ان کی سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اس کے قائل نہ ہونگے
تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ خدا نے یہ سب کچھ عبث پیدا کیا۔ حالانکہ اس سے زیادہ کمزور دلیل کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسکو عبث کہنا
بھی اپنے ہی اُصولِ حیات و معاشرت کے لحاظ سے ہے کہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ لیکن
جس وقت آپ خلاق و آفریدگار کی بے نیازیوں پر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ جس کا مشغلہ ہی ہر وقت بنانا بگاڑنا ہو، جو ہمیشہ
دنیائیں پیدا کر کے فنا کرتا رہتا ہے، وہ نتیجہ، عبث، وجہ، سبب اور علت کی دنیا سے بالکل بے نیاز ہے اور اگر وہ انسان کو
فنا کرنیکے بعد بالکل کالعدم کر دے اور کوئی چیز از قسم روح یا نفس اس کی یادگار باقی نہ رکھے تو اس میں کونسا استحالۂ عقلی پایا
جاتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

وہ شخص جو بقاءِ روح یا قیامِ معاد کا قائل ہے وہ ایسے مفروضات و مباحث کا سلسلہ قائم کر دیتا ہے۔ جو کبھی ختم
ہونیوالے نہیں اور ذہنِ انسانی کو مشوش کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر روح قائم ہے تو اس کے قیام کی کیا صورت ہے، زمان و مکان
سے اس کا تعلق ہوگا یا نہیں، جسم سے علیحدہ رہنے کی حالت میں اس کے تاثرات کی کیا کیفیت ہوگی؟ پھر [illegible] اگر بہ معنی [illegible]

تو اس کے یہ معنے ہیں کہ اسکو خدا کا ہمسر بنا دیا گیا۔ اگر خلود نہ ہوگا تو پھر اس بقار کے بعد فنا کیوں اور کیسی؟ عذاب و ثواب سے کیا فائدہ ہے جبکہ وہ بارہ اس روح کو دنیائے عمل میں لوٹ کر آنا نہیں ہے، کیوں ہم ہاویہ، فردوس، پل صراط، میزان، حور و قصور، کوثر و سلسبیل، حساب کتاب وغیرہ کو صحیح باور کریں، کون سے عقلی دلائل انکے وجود میں پیش کئے جا سکتے ہیں، اگر ان سے انکار کیا جائے تو خدا کا کیا نقصان ہوتا ہے، اُس پر کیا الزام آتا ہے۔ الغرض اسیطرح کے ہزاروں مسائل و مباحث ایسے پیدا ہو جاتے ہیں، نہ جنکو آجتک حل کیا گیا اور نہ آیندہ ممکن ہے۔ لیکن دوسرا شخص جو بقار روح کا قائل نہیں اور مرنیکے بعد نسیًا منسیًا کا ماننے والا ہے، وہ ان تمام مباحث کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے اور کوئی اعتراض ایسکے اس عقیدہ پر عقل کی طرف سے وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہانتک قدرت خداوندی کا تعلق ہے، اس صورت میں اسکا ظہور زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور کائنات کی وسعت، عالم تخلیق کی بے پایانی کو دیکھتے ہوئے یہی عقیدہ زیادہ قرین عقل و انصاف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ خلق و فنا کا سلسلہ اسیطرح ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جن مخلوقات کو وہ فنا کر دے، انکے کسی اثر یا کسی جزو یا کسی کیفیت و تاثر کو باقی رکھے۔ اس کا کام یہی ہے کہ جسکو مٹا دیتا ہے، بالکل محو کر دیتا ہے، اور اسے کوئی غرض نہیں کہ اس کا سلسلہ پھر کسی صورت سے قائم رکھے۔

یہ ہیں دونوں صورتیں بقار روح اور عدم بقار روح کے ماننے کی۔ اسلئے ایک مجھ سے کیا دریافت کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اگر آپ بقار روح کے خیال کو ضروری سمجھتے ہیں اور آپ کا اطمینان نفس اسی طرح ہوتا ہے تو مانئے اور اگر نہیں ہوتا تو بیشک انکار کر دیجئے کیونکہ عذاب و ثواب جس چیز کا نام ہے اسکو ہم بغیر بقار روح تسلیم کئے ہوئے بھی اس دنیا میں متعین کر سکتے ہیں جو زیادہ قریب الفہم اور کار آمد بات ہے۔

اس سلسلہ میں یوروپ کے موجودہ روحانئین اور انکی تحقیقات کا ذکر فضول ہے، کیونکہ اس وقت تک کوئی ثبوت انکی طرف سے بقار روح کا پیش نہیں کیا گیا اور جو واقعات و حالات بیان کئے جاتے ہیں اول تو ان میں اکثر مکر و فریب ہے اور بعض ایسے ہیں جو نتیجہ ہیں خود اپنے فکر و اعتقاد کا، اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

اس کو بھی پڑھ لیجئے

(۱) جن حضرات کا چندہ ختم ہو رہا ہے انکو ایک مطبوعہ تحریر سرخ کاغذ پر اس رسالہ کے اندر ملیگی اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ ۲۰ جنوری تک اپنا سالانہ چندہ روانہ کر دیں ورنہ ۲۰ جنوری سے دی پی کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ ایک مطبوعہ کارڈ بھی اس کے ساتھ ہی ملیگا۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب سے کم از کم دو جدید خریدار پیدا کر کے نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔

(۲) نگار کے ہر خریدار کو اس کا چندہ نئے سال کا وصول ہونے پر حسب ذیل کتابیں نصف قیمت پر ملیں گی۔

تذکرۂ خندۂ گل بجائے ۸ کے دو روپیہ میں۔ شاعر کا انجام بجائے ۱۰ کے ۵ میں۔ نگارستان جدید اڈیشن بجائے ۳ کے ۱۲ میں۔ شہاب کی سرگذشت جدید اڈیشن بجائے (عہ) کے ۱۲ میں۔ جن کے گذشتہ پرچے بجائے ۱ فی پرچہ کے ۲ میں۔ ادو بسا لکن کے عجائب مفت جو صاحب یہ تمام کتابیں طلب کرینگے ان سے محصولڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔

"مینیجر نگار"

"شاعر"

خاک پر کھینچا گیا نقش طلسم رنگ و بُو،
بند تھا سینے کی خلوت میں جمالِ آرزو
کیف غم کے نغموں سے تھا محروم سازِ گفتگو
بزم کو تھی، اک دلِ رمز آشنا کی جستجو،

حُسن نے اسرار کے پردوں کو جنبش دی نہ تھی،
جلوۂ خوابیدۂ ہستی نے کروٹ لی نہ تھی،

پھول کے اوراق تھے نا آشنائے آبِ رنگ
خندۂ اصنام سے تھی بیخبر ترکیبِ سنگ
رہنِ ترکش تھے جگر میں ڈوبنے والے خدنگ
گم دلوں کی وسعتِ خاموش میں تھی ہر اُمنگ

اُنگلیاں مطرب کی پیہم دوڑتی تھیں ساز پر
کچھ مگر خود رفتگی سی تھی نوائے راز پر

دہر میں انوار کی ایسی گھٹا چھائی نہ تھی،
محفلِ ہنگامۂ اسرار تنہائی نہ تھی،
مسکراتی صبح میں یہ "بادہ پیمائی" نہ تھی
شام کی اس درجہ کیف انگیز انگڑائی نہ تھی،

روح کی خلوت میں دخل بیخودی ہوتا نہ تھا
سینۂ بربط میں نغموں کا لہو دوڑا نہ تھا

ناگہاں! امواجِ ناپیدا میں اک جنبش ہوئی
کان میں فطرت کے نغموں کی صدا آنیلگی
مسکرا کر رازِ دل کہنے لگی نو رس کلی،
پھول نے چھیڑی نشاط انگیز میٹھی راگنی

برق گزری خرمنِ غفلت سے لہراتی ہوئی
روح کو بیداریوں کا راز سمجھاتی ہوئی

خود بخود اُٹھنے لگا، روئے حقیقت سے نقاب
ہو گئے خلوت سرائے حسن کے باطل، حجاب
چھڑ گئے، ہر سمت اٹھلاتی ہواؤں کے رباب
دلمیں گھر کرنیلگا، سلمائے گیتی کا شباب

جلوۂ نو سے ہوئی، ترتیبِ رنگِ صبح و شام
کر دیا آخر ادا، شاعر نے فطرت کا پیام

کون شاعر! جس نے پہچانا طلسمِ ہست و بود — کون شاعر! جس کے منت کش ہیں اسبابِ نمود
کون شاعر! جس نے کھولے عقدۂ راز وجود — کون شاعر! شمع بزم جلوہ آرائے شہود

جس کی ہستی دستبرد موت سے آزاد ہے
جس کی دنیا سرمدی انوار سے آباد ہے

جس کے ہر ذرے میں ہے خورشید عرفاں کی جھلک — جس کی ارض محترم سے جھک کے ملتا ہے فلک
دردِ عالم کا مداوا، جس کے سینے کی کسک، — انجمن افروز، جس کے شعلۂ غم کی لپک

قصر باطن کو تجلی زار کرنے کے لئے
داغ دل، شاعر کے بڑھتے ہیں ابھرنے کے لئے

جس کی محفل ہے، طرب گاہ عروسِ نو بہار — جس کی خاکِ آستاں ہے صد گلستاں در کنار
فکر شاعر، اس فضائے نور میں ہے گرم کار — گنگناتے ہیں، جہاں خورشید و مہ کے آبشار

صبح، اس کی روح کی، اک جنبشِ بیدار ہے
شام، اس کے ساز کا، اک نغمۂ سرشار ہے

اے کہ تو ہے عظمتِ شاعر سے منکر، بے خبر، — دیکھ کچھ کتنی ہے تیری ہستیٔ نا معتبر
سطح کے جلووں سے ہے الجھی ہوئی تیری نظر — بلکہ شاعر مطمئن ہوتی ہے تہ میں ڈوب کر

روح کی آواز ہے، بیدار کن الہام ہے!
شعر کیا ہے؟ فطرتِ آزاد کا پیغام ہے!

فکر شاعر گلشنِ فطرت سے جب چنتی ہے پھول — پھوٹتا ہے جن سے پیہم جلوۂ حسنِ قبول
بیخبر اٹھتے ہیں، انکی بو سے اوہام فضول — ان سے بنتے ہیں، ترے علمی ترانوں کے اصول

نغمۂ شاعر، کہ شبنم ہے گلستاں کے لئے،
اک چراغِ علم و عرفاں ہے دبستاں کے لئے،

پستیوں میں تیری منزل اور بلند اسکا مقام — ذرۂ بے نور تو، وہ مہر و مہ سے ہمکلام
تلخ تیری گفتگو، اور دلنشیں اس کا پیام — تو سراپا حزن، وہ غمگینوں میں شاد کام

بابِ فطرت اس پہ وا، نا آشنا تیری نظر
تو گرفتارِ فریب اس کو حقیقت کی خبر

شوخ! کیا تو بھی سمجھتا ہے، مزاجِ رنگ و بو، — تجھ سے بھی غنچے سنا کرتے ہیں محوِ گفتگو

ذرّہ ذرّہ ہے ترا، آئینہ دارِ جستجو،   بزمِ فطرت میں ہے روشن تیری شمعِ آرزو

تیرے سینے میں بھی دل ہے، اک ہجومِ اضطراب

لذتِ غم، تجھکو بھی رکھتی ہے کیا محرومِ خواب

تو بھی مہکاتا ہے، روحوں میں محبت کے شرار   بیکسی کے دل میں چونکاتا ہے طوفانِ وقار،

کرسکا ہے، تو بھی خوابیدہ حسوں کو ہوشیار   اِک گھڑی شاعر کی، ناداں! تیری عمرِ بیشمار،

موت کی وادی میں ہے آباد تیری کائنات

سُن! کہ شاعر تجھکو سمجھاتا ہے اسرارِ حیات،

آفتاب اُبھرا ہے، جامِ صبح چھلکائے ہوئے   روئے گردوں پر، مگر بادل بھی ہیں چھائے ہوئے

شعر کیا ہیں، کچھ حسیں جلوے ہیں شرمائے ہوئے   چند نغمے، دل سے لب تک ٹوٹ کر آئے ہوئے

تجھکو کیا معلوم، ان کی تہ میں کیا اسرار ہیں

سینۂ شاعر میں کتنے جلوۂ بیدار ہیں

شمع جب خاموش عہدِ حال کی ہو جائے گی،   نسلِ آئندہ نئی تہذیب لیکر آئے گی،

عقدۂ گیسوئے دوراں، بزمِ نو سُلجھائے گی،   "قصۂ پیشیں" ہماری داستاں کہلائے گی،

قصرِ عہدِ حال، آنسو کی طرح بہ جائے گا،

بارگاہِ عصر، شاعر کا چمن رہ جائے گا،

تجھکو ہے، جس مشعلِ حکمت پہ ناداں یہ غرور   ہے وہی بجھتی ہوئی، اک شمعِ شاعر کے حضور

تیری ہر جنبش میں ہے، بیدار امکانِ قصور   شعر ہے، لیکن تجلی گاہِ تکمیلِ شعور

تو جہاں اس وقت تک محوِ حجاب راز ہے،

شاعر اُس طورِ حقیقت پر بلند پرواز ہے

جب ازل میں کیگئی، تقسیمِ انعام و عطا،   مُسکرائے پھول، عطر افشاں ہوئی موجِ صبا

شب نے سر پر ڈال لی، نجمیں تاروں کی ردا   صبح نے بڑھکر حریمِ حسن کو وا کر دیا،

بزم کو سونپ دیا، پیکِ فنا کو اہتمام

فرقِ شاعر پہ، مگر رکھا گیا، تاجِ دوام

علی اختر

"طرۂ گل"

حسنِ برق افگن، پھر اُس میں جلوۂ "شانِ نمو"
"انعکاسِ صبح" سے ظاہر خیابانِ نمو،

نازِ کامل کیلئے "مہرِ شہادت" بے گماں،
"گل کدوں کی رُخ" تھی فرقِ مسرت پر عیاں،

ابروؤں کی "جنبشیں" وجہ نشاطِ آرزو"
اور خاموشی لب غیرت دہ "صد گفتگو"

زلف کے حلقوں میں "استغنا" کی جلوہ ریزیاں
سر بسر پیچ و خم میں "اہتزاز انگیزیاں"

اُسکی آرائش سے پیدا "فطرتِ آسودگی"
اُسکی "بیرنگی" سے حیرانِ خلقتِ آسودگی

اُس کی لہروں میں "تموج" عالمِ انوار کا
اُسکی "لغزش" میں تماشا نشۂ میخوار کا

"چھیڑ" اس کی باعثِ تنظیمِ اجزائے چمن
"لرزشِ انداز"، اس کی لرزشِ بادِ ختن

سیف دوشیِ مژہ "پیغام" کیفِ مستقل
"رقص" ہستیِ نظر جس سے بطِ مے بھی خجل

حبب اُٹھائے "چشمِ کافر" سے پلک اپنی نقاب
سامنے آئیں وہ "ساغر" جن میں ہو کہنہ شراب

اُن کی "مے پاشی" میں پنہاں نازشِ ہر نازنیں
اور اُنکی برہمی "بیداریِ" حسنِ حزیں

اُنکی خندہ ریزیاں، "صبحِ نیاز" عاشقی
اُنکی حسرت خیزیاں "شامِ گدازِ عاشقی"

پھول سے عارض دمِ "زینت" جوابِ گلکدہ
یا کنول کی پنکھڑی جیسے "شبابِ ملکدہ"

دید کی ہر آرزو پر رونما "صدہا حجاب"
"چشمِ وارفتہ"، اسیرِ حلقۂ صد پیچ و تاب

بجلیوں کا ایک طوفاں خندۂ لب سے عیاں
لطفِ حسنِ لبستگی رنگِ بہارِ بے خزاں

نغمہ ہائے دلنشیں صوتِ تکلم پر فدا
ہلکا ہلکا سا "تبسم"، داستانِ "جاں دلربا"

فرطِ خاموشی پہ "وارفتہ" تماشائے نظر
نازِ رو پوشی، بہارِ عیش، ماموںِ اثر

اسقدر دل کش لطافت گردنِ بلور کی
لوٹ جسکی تمکنت پر، برق، کوہِ طور کی

یعنی اک خورشید طلعت بلکہ رشکِ آفتاب
جسمیں وہ رعنائیاں، جن سے "عبارت" "شباب"

بوستاں کی سیر سے واپس جو آئی نازنیں
"غسلِ شبنم" دیکے لائی چند گلہائے حسیں

اور ان کے گوندھنے میں یوں ہوئی پھر نغمہ زن:-

"جلوۂ فطرت کہوں یا تم کو کہلائے چمن"
"شب کو "ارواحِ معطر" کے لئے آرامگاہ"
"صبح کو نکہت فشاں کیا کیا برائے انتباہ"
"تازگی گُل میں پنہاں فطرتی وہ دام ہے"
"جسنے کی اس پر توجہ، وہ اسیرِ و رام ہے"
"پھول جو مرجھا گئے، تو ہار بھی مرجھائے گا"
"وہ" نہ پائیں گے اسے تازہ تو دل کملائے گا"
"مجھ سے وہ روٹھیں مرے اللہ، تیری شان ہے"
"یا غرورِ عشق کی یہ انتہائی آن ہے"
"خیر سے سہنے پڑے ہیں عشق میں ظلم و ستم"
"ہر نفس کی کیفیت کرتی ہے مجھ کو تازہ دم"
"وہ "خفا مجھ سے اگر ہیں تو مجھے پروا نہیں"
"کیا مرے پھولوں میں پنہاں "سحر کی دنیا" نہیں"
"کیوں ہو چپ پھولو؟ بتاؤ مجھ پہ کب ہوگا کرم؟"
"کعبۂ دل میں مرے آئیگا کب میرا صنم"
"اشکِ حسرت میری آنکھوں سے اگر بہ جائیگا"
"ناممکل "یہ طلسمِ آرزو" رہ جائے گا"!!

"روحِ گُل" بولی یہ سُن کر اے بہارِ بیخزاں!

"تیری فطرت پر فدا میں اور سارا گلستاں"
"ایک "سیلابِ ترنم" گو مرا مسکن سہی"
"ایک طوفانِ تبسم" گو مرا مامن سہی"
"گلشنِ رنگ و لعطر گو مرا کاشانہ ہے"
"ماہِ تاباں کی کرن، میرا "چراغِ خانہ" ہے"
"میں "لسانیئت" پہ تیرے ہوں فدا اے نازنیں"
"ذرہ بن جاؤں سراپا، تو جو ہو جائے حزیں

"دشمنوں کو تیرے اتنا سوگ ہوا ہے مہ لقا"

"تو نہ اتنا رنج کر تجھ پر مرا دل ہو فدا"

"ہے اگر تاثیر کچھ بھی "سحرِ گل" میں مغتنم"

"طرۂ گل" دیکھتے ہی لیں گے وہ تیرے قدم"

"سُن کے یہ سارے بدن پر اک "نمی سی آگئی"   اک "شباب، آسودہ" رنگینی نگہ میں چھا گئی"

"کامیابیِ تمنا کے مزے آنے لگے   خندہ زا آنکھوں سے اُسکی پھول شرمانے لگے"

گو بظاہر ہو گئی خاموش سی وہ فتنہ گر   "ترجمانِ قلب" لیکن یوں ہوئی اُس کی نظر"

"ابتدا میں" ان کی "جب مجھ پر پڑی چشمِ کرم"

"اور" اُن کی "گفتگو نے جان ڈالی دمبدم"

"ہر نظر تھی، کیف ساماں، ہر ادا مستانہ تھی"

"وائے معصومی مری، ہر شے سے میں بیگانہ تھی"

"دل نے کی فوراً پذیرائی مگر اس شوق سے"

"ابتدا ہی" سے تھا واقف جیسے وہ اس ذوق سے"

"مجھکو یہ تسلیم ہے اُلفت نہیں ہے اور کی"

"عادتیں کیوں آگئیں پھر اُن میں ظلم و جور کی"

"کون کہتا ہے مری حسرت نکلنی چاہیئے"

"جس میں راحت ہو "اُنھیں" وہ راہ چلنی چاہیئے"

"ہے نشاطِ دل کا باعث "تشنہ آغوشی مری"

"سلسبیلِ گوش" ہے، ہر طرز خاموشی مری"

"مجھکو آسائش ہے اسمیں جسمیں راحت ہو اُنھیں"

"اور" اُس سے ہی محبت جس سے ہو اُلفت اُنھیں"

"ہر ادا میرے لئے "اُنکی" "جہانِ عشق ہے!"

"شیوۂ اُلفت میں پنہاں، میری جانِ عشق ہے!"

سنتے ہی یہ نغمۂ سوز و گداز آرزو   ہو گئیں حافظ فضائیں دلنواز آرزو!"

حافظ غازیپوری

ہارون رشید کی مجلسِ داستان سرائی

نیرنگ (رامپور) کی کسی گذشتہ اشاعت میں عنوان مذکور کے تحت ایک تصویر شائع ہوئی تھی۔ میں نے اُس پر یہ فسانہ نظم کیا تھا، جو مقررہ وقت تک مکمل نہ ہو سکنے کے باعث شائع نہیں کیا جا سکا۔

فسانہ فرضی ہے اور جدت سے کوسوں دور۔ اس میں بھی وہی رونا رویا گیا ہے، جس کو مصلحین کی زبان اور آنکھیں بار بار دُہرا چکی ہیں۔ اسی لئے بے مزہ ہونا غیر یقینی نہیں۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اس میں گریہ و بکا کا پہلو اس قدر روشن نہیں ہے کہ سامع پر یاس و ناامیدی کا پورا تسلط ہو جائے۔

تمہید کی دلکشی میں جمالیاتی نقوش کے ابھار سے مدد لی ہے، آغاز داستان میں اس کا لحاظ رکھا ہے کہ یکایک قصہ کے متعلقات کا سراغ نہ لگنے پائے، اس طرح ابہام اور کنایہ قصہ کو بامزہ رکھنے کے کفیل ہو جاتے ہیں، جس سرزمین سے یہ داستان متعلق ہے، اس کی جغرافیاتی اور معاشرتی تشکیل کے بعد، ایک "انسان کامل" کے ظہور کا بیان ہے، جس نے اپنی "مثالی اخلاقی تعلیم" سے دنیا کے ہزار ہا سالہ نظامِ حکومت و معاشرت کو یکسر بدل دیا تھا۔ چونکہ سامع کے واسطے اسی حصہ میں سامانِ رشد و ہدایت پنہاں ہے، اس لئے حدیثِ شوق کی طرح اس کو بھی بے حد طویل کر دیا ہے، خاتمہ نہایت سادہ مختصر اور پر معنے الفاظ پر ہوا ہے، جس میں خاص طور پر اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ شاعرانہ زبان میں تاریخی حقیقت و مسلمہ کو بیان کیا جائے۔

اردو میں اس قسم کی تمثیلی نظمیں بہت کم ہیں۔ ممکن ہے میں بعض ضروری نقوش کو چھوڑ کر، غیر ضروری کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں، اور اس لئے نظم کے تمثیلی پہلو میں نقص رہ گیا ہو، لیکن چونکہ یہ میری پہلی کوشش ہے، اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ تعاونِ فن کی صحیح تنقید کے بعد اس سے بہتر نقش پیش کر سکوں گا۔

امتیاز علی عرشی

(۱)

تھے امیر المومنین ہارون پریشاں ایک شب ... کارہائے سلطنت نے کر دیا تھا خستہ جاں،
خوابگاہِ خاص پر چھایا ہوا تھا پُر ہیبت سکوں ... لرزہ بر اندام استادہ تھیں رومی باندیاں،

بہرِ تسکینِ دماغ و دل ہوا فرمانِ شاہ، آئیں خلوت گاہ میں داستاں سرا کچھ لونڈیاں"
حکمِ شاہی یوں بجالائے غلامانِ حرم بس اُسی دم دو کنیزیں آگئیں لبستہ میاں

(۲)

مہرخِ حسن و جانِ خوبی، کانِ تمکین و حیا جن کے ہر ادا پہ قرباں شانِ صد طغرل طغاں
شوخیاں جن کی نگاہوں سے ٹپکتیں برملا، جن کی مستانہ نگاہوں سے برستیں مستیاں،
دیوتائے عشق[1] گھائل جن کے تیرِ عشق سے دین و دل کو لوٹنے والی تھیں جن کی شوخیاں،
قندِ مصری باہمہ شیرینی ہونٹوں پہ نثار گفتگو پر، باہمہ موسیقی قرباں طوطیاں،

(۳)

پا کے ایما ایک فتنہ در جلو نے عرض کی "آپ بیتی ہو، کہ جگ بیتی ہو میری داستاں؟"
شاہ ایران و عرب مست مئے پندار تھا بول اٹھا "بس آپ بیتی، آپ بیتی، آپ۔ ہاں!"

(۴)

تھا کسی اقلیم میں اک خطہ بے آب و گیاہ وسعتِ صحرا میں جسکی کچھ نہ تھا جز آسماں
ریگِ جوشندہ کا جاری بحرِ ناپیدا کنار آتشِ خورشید سے بھنتی تھیں جس میں ہرنیاں
نغمۂ راحت نہ گونجا تھا فضاؤں میں کبھی، شکلِ سبزہ تک نہ دیکھی تھی پہاڑوں نے جہاں
اطعمہ[2] میں شیر و خرما، البسہ میں شعر و صوف مشغلہ دن بھر چرانا جنگلوں میں بکریاں،
سرکشی و جہل سے تکوینِ ذراتِ جبال البتی و جو سے تخمیرِ بہیمہ و جواں،
جو بعید از عقل وہ اون کے عقائد کے قریں جو قریب از فہم وہ اُن کے تخیل سے نہاں
ایک مدت تک یہی حالت رہی، پر تا کجا؟ حق کی راہیں کھل گئیں، اک مردِ حق پر نا گہاں
قوم نے دیکھا تو پہلے کچھ جھجک کر رہ گئی، پر صداقت کی کشش نے کھینچ لی آخر عناں
تھا حدیٔ آسمانی سے رسیلا بحر و بر چل پڑا حقانیت کے راستہ پر کارواں
راہ میں جو کچھ ہوا حائل، کیا اوس کو عبور، لوگ کہتے ہیں کہ اوس کا راستہ ہے کہکشاں
ایک عالم کر لیا زیرِ نگیں اخلاق سے، ایک دنیا ہو گئی تسخیر بے تیغ و سناں
حق و عرفاں کا سمندر آسماں تک چڑھ گیا مادرِ فطرت نے دے ڈالیں انھیں سب خوبیاں

---

[1] نقادانِ فن اس ترکیب کی غلطی کو معاف فرمائیں۔ عرشی

[2] اطعمہ جمع طعام۔ البسہ جمع لباس۔

جان کی پاؤں اماں، تو آتی میری عرض ہے　　جانشینوں نے بھلا دی اون کی ساری داستاں
شہر کی راہوں پہ ہوٹے، بیباک نگر، گامزن　　رہ گئیں منہ دیکھتی کی دیکھتی سب نیکیاں
کاٹ پھینکا خون سے سینچے ہوئے اشجار کو　　اب نہیں کچھ یاد اُن کو راہ و رسم باغباں

(۵)

شاہ از خود رفتہ سا لیٹا ہوا تھا تخت پر　　چونک کر بولا "مرا معذور دار، اے سروجاں"
چشمۂ اندر حدود خود بود آب حیات
چوں قدم بیروں نہد، برباد سازد یک جہاں"

امتیاز علی عرشی

غزل

فرق پروانوں میں اور ہم میں نمایاں ہونگے　　وہ جلیں آگ میں ہم آپ پہ قرباں ہونگے
وہ اگر اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہوں گے　　حشر میں میرے لئے حشر کے ساماں ہونگے
ایک طوفانِ تغیر ہیں خیالاتِ وفا　　یہی ارمان بنینگے یہی حرماں ہوں گے
کثرتِ جرم ہے آئینۂ حیرت افزا　　توبہ کرلیں گے تو بیکار پشیماں ہوں گے
موت ہر حال میں یکساں ہی وہ تم ہو کہ اجل　　صرف اتنا ہے کہ شرمندۂ احساں ہونگے
تم سلامت رہو وعدوں کو بھلانے والے　　سینکڑوں مرتبہ یہ عہد یہ پیماں ہونگے
آج پیتے ہیں گھٹا آئی ہے گھر کر زاہد　　کل کسی وقت کھلے گا تو مسلماں ہونگے
فصل گل ساتھ لئے آئیگی وحشت کی بہار　　ہم جہاں ہونگے وہاں چاک گریباں ہونگے
ہائے بت پہ نظر آتی ہے جبین اقدس
ہمکو دھوکا تھا کہ شوکت بھی مسلماں ہونگے

شوکت تھانوی

صدائے بزم

وقتِ بیتابی ہے بحرِ بیکرانِ زندگی — اضطرابِ جاوداں ہی سے ہے شانِ زندگی
زندگی ہے شعلۂ جاویدِ طورِ کائنات — آفتابِ زندگی سے ہے ظہورِ کائنات
گو معمہ ہیں سراپا ممکناتِ زندگی — شاخِ آہو پر نہیں لیکن براتِ زندگی
برق پارہ وار ہے جس کو غمِ منزل نہیں — سیلِ بے پروا ہے جو شرمندۂ ساحل نہیں

ابتدا ہے زندگی یا انتہا ہے زندگی
کاش اتنا ہی کہیں کہا جائے کیا ہے زندگی؟

زندگی جب روشناسِ قالبِ انساں ہوئی — نور کے سانچے میں ڈھل کر دیدۂ حیراں ہوئی
دیدۂ حیران نے قلبِ مضطرب پیدا کیا — اضطرابِ قلب نے ہنگامہ وہ برپا کیا،
جس کو عرفِ عام میں کہتے ہیں ذوقِ جستجو — جس کی تھی مہر و مہ و انجم تلک کو آرزو،
حسن کی ہنگامہ آرائی نے چمکایا اسے — عشق کے سوزِ جنوں ساماں نے گرمایا اسے

زندگی انساں میں آکر ہو گئی عالی صفات
ناتواں جانِ بشر اور صدرِ بزمِ کائنات

مسندِ تقویمِ احسن کیا ملی؟ غم مل گیا! — آگہی کیا آ گئی؟ عہدِ سکونِ دل گیا؟
آسمان جانِ حزیں کا دشمنِ دیرینہ ہے — یہ تو یہ اہلِ فلک تک کے دلوں میں کینہ ہے!
چین لینے دے زمانہ یہ کبھی ممکن نہیں — چھوڑ دے ظالم ستانا یہ کبھی ممکن نہیں
شاہبازانِ حوادث بھی ہیں پر تولے ہوئے — موت ہر ہر گام پر بیٹھی ہے مونھ کھولے ہوئے

دیدہ و نادیدہ دشمن درپئے آزار ہیں
ایک جانِ ناتواں سے برسرِ پیکار ہیں

ابنِ آدم! ماسوا کو رام کرنا ہے تجھے — تو ہے مسجودِ ملائک نام کرنا ہے تجھے،
جاوداں جوہر ترا آنی نہیں فانی نہیں — تو نے اپنی قدر اب تک آپ پہچانی نہیں،
ہفتخوانِ این و آں ہیں آزمائش کے لئے — قوتِ بازوئے آدم کی نمائش کے لئے،
یہ تمنا میں نہی سراپا کن فکاں کا راز ہے — نازِ زیبا ہے جسے اُس حسن کا تو ناز ہے،

جس کا بجھ جانا مقدر ہو تو وہ اخگر نہیں
ٹوٹ جانے کا جسے ڈر ہو تو وہ گوہر نہیں

امین حزیں

تخیلاتِ عدم

"کمالِ دردِ ملا، دردآشنا نہ ملا!!" ستم ظریفیٔ فطرت کا مدعا نہ ملا!
جنوں سوار تھا سر پہ کہ پاؤں توڑ آئے کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتہ نہ ملا!
حریصِ ظلم ہوئے جب اسیرِ لذتِ غم فلک کو اور کوئی شیوۂ جفا نہ ملا!

طغیانیٔ غم دل میں اور ضبطِ فغاں، توبہ! خاموش زباں سے کیا شعلہ نہ اُٹھا ہوگا
او سنگدلو! جاؤ خنجر بھی اُٹھا لاؤ چبھتی ہوئی باتوں سے دل تو نہ بھرا ہوگا

بندۂ تدبیر ہوں، راحت کہاں تیرے لئے دہر ہے اک خارزار امتحاں تیرے لئے،
کونسی راحت پہ ہو آپ بقا کی آرزو موت ہو جائیگی عمرِ جاوداں تیرے لئے،

عدم

(ایسے ... میں اسی قسم کی بیجا تنگ نظری کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں، بلکہ) ... شستادہیں، جبکہ مسلم افراد بھی ہندوؤں کے دوش بدوش جیل میں جا رہے تھے یکساں صبر و تحمل کے ساتھ حکومت کی سختی کو برداشت کر رہے تھے، یہیں لکھنؤ سے جہاں ہر ہندو اُردو لکھنے پڑھنے کا عادی ہے، کانگریس کے دفتر سے جو لٹریچر شائع ہوتا ہے، جو اطلاعات آویزاں کیجاتی ہیں، ان میں غالب حصہ ہندی کا ہوتا ہے اور جو نیچ تیار کئے جاتے ہیں، ان میں ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں ہوتا، اور ہندی میں بھی جو عبارت درج ہوتی ہے وہ یکسر ثقیل سنسکرت ہوتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشانہ عصبیت کوئی اور ہو سکتی ہے، کیا اس سے زیادہ ناموزوں و نامناسب محل اس جذبۂ نفرت کے اظہار کے لئے کوئی اور ہو سکتا تھا۔ پھر یہ منظر صرف لکھنؤ اور دفتر کانگرس کی فضا میں محدود نہیں رہتا، بلکہ زبان کے مسئلہ میں گاندھی آشرم اور آنند بھون کے اندر بھی وہی ایک آواز گونجتی ہوئی نظر آئیگی۔ اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے لیکر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اُس ابتدائی اسکول تک جہاں ایک صاحب اقتدار ہندو بھی سانس لے رہا ہے، یہی کوشش کام کرتی ہوئی دیکھی جائے گی کہ اُردو تعلیم، اُردو رسم الخط، اُردو تصانیف سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے، ڈاک خانے جائیے تو وہاں کا ہندو کلرک منی آرڈر فارم ہندی زبان ہی کا دیگا اور اگر اُردو فارم کی خواہش کیجائے گی تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اردو فارم نہیں ہیں، حالانکہ ایک غیر تقسیم شدہ انبار اُردو فارم کا دیمک کی نذر ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں جائیے، دفاتر کی سیر کیجئے، دوکانوں سے معاملہ کیجئے، الغرض ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں کہیں کوئی ہندو کی ذات کام کر رہی ہے، اُردو کے ساتھ بغض و عناد کا جذبہ یکساں طور پر کام کر رہا ہے، اور ایک عام نفرت ہندوؤں میں اس کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے؟

اس لئے اگر ارباب اکاڈیمی، جن میں غالب حصہ ہندوؤں کا ہے، اردو کا حق تلف کرنے میں جسارت سے کام لے رہے ہیں، اگر وہ اردو کے تراجم کا کام بھی ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں اس خیال سے کہ وہ زیادہ بہتر طریق پر اردو کو برباد کر سکیں گے، اگر ہندوؤں کی اشاعت گاہوں سے اُردو کی ریڈریں مسخ شدہ صورت میں نکل رہی ہیں تو جائے حیرت نہیں کیونکہ یہ سب اسی ایک مقصد کے تکمیل کی مختلف تدابیر ہیں، جس کے ذریعہ سے پھر ہندوستان کے اس دور کو از سر نو پیدا کیا جانیوالا ہے۔ جسے عہد آخر میں مرہٹوں نے زندہ کرنا چاہا تھا، لیکن بدقسمتی سے "دولت مستعجل" ثابت ہوا۔

کس قدر عجیب و غریب جسارت ہے، کتنی حیرتناک جرأت ہے کہ ہندوستان کی ایک عام مشترک زبان بنانے کے بہانہ سے اُردو میں تو ہندی و سنسکرت الفاظ داخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے۔ ایک اردو رسالہ پر بجائے سہ ماہی کے ترماہی لکھنے کے لئے اکاڈیمی اپنی پوری قوت صرف کر دے، لیکن جس وقت ہندی لٹریچر کا سوال سامنے ہو تو ترماہی کے بجائے "تری ماسی پترکا" ہی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو، اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر جب کوئی پرسس لکھے، تو اکاڈیمی اس کو ایک نعمت و برکت سمجھ کر بغیر کسی تنقید و اعتراض کے شائع کرنے پر آمادہ ہو جائے، خواہ اسکے ثقیل و نامانوس الفاظ خود ہندو جماعت ہی کے لئے ناقابل فہم معمہ کیوں نہ ہوں؟

یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس قسم کی الٹہ فریبی ہے، یہ کس نوع کی کورانہ ذہنیت ہے۔ اگر ہندوؤں کی عام جماعت اس کو نہیں سمجھ سکتی تو خواص کے پاس اس کا کیا جواب ہے اور خواص کو بھی جانے دیجئے، کم از کم اکاڈیمی کے ممبروں کو تو غور کرنا چاہیئے کہ حکومت سے جو رقم اُردو کی ترقی کے لئے ملتی ہے، اس کے صرف صحیح میں بخل و عصبیت سے کام لینے کا اگر انھیں کیا حق حاصل ہے؟

آخر یہ کیسی دستبرد ہے، یہ کس طرح کی قزاقی ہے، یہ کس نوع کا دماغی افلاس ہے، جو ایسی رکیک و سخیف ایسی دنی و ذلیل حرکات پر ہندوؤں کو آمادہ کئے ہوئے ہے۔ اگر مسلمانوں یا ہی خواہان اردو نے اس طرف توجہ نہ کی اور قوت مظاہرہ سے کام نہ لیا تو یہ طوفان کسی طرح نہیں رُک سکتا اور وہ وقت دور نہیں جب مسلمانوں کو پورے حقوق ہمسائگی نہ دینے کے اسباب میں ایک قوی سبب یہ بھی بتایا جائے گا کہ اُن کی زبان میں اُردو فارسی کے الفاظ شامل ہیں، ان کا سواد خط غیر ملکی ہے اور ان کی تحریر بجائے بائیں طرف کے داہنی طرف سے شروع کیجاتی ہے، جس کو ہندو قوم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

مجھے معلوم ہے کہ ہندو جماعت اس اظہار خیال پر بہت برہم ہوگی اور مجھے خود تکلیف ہے کہ میں کیوں ایسا لکھنے پر مجبور ہوا، لیکن اس باب میں اپنی طرف سے میں ایک عذر یہ ضرور پیش کر سکتا ہوں کہ

ازنالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمع خموشم و ز سرم دُود میرود

اخیر میں، نہایت ادب کے ساتھ میں اکاڈیمی کے ارباب کار کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے مسئلہ پر بالکل "غیر ہندو" ہو کر نگاہ ڈالیں اور اگر اُن کو اردو کے سمجھنے میں کسی قسم کی زحمت ہوتی ہے تو اس دلیل سے اس کے ناقص و ثقیل ہونے پر حکم نہ لگائیں، کیونکہ "جہل" کو علم کے جانچنے کا معیار مقرر کرنا قرین انصاف نہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے اڈیٹران رسالہ کی جماعت میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے یہ دریافت کرنا ہے کہ اُنھوں نے اس عقدۂ دشوار کے لئے "مشکلکشائی" کی کیا تدبیر سوچی ہے، یا وہ بھی اپنے دوسرے شریک ادارت پروفیسر صدیقی کی طرح (جن کی طرف سے تسمیۂ رسالہ کے سلسلہ میں تاہی کی تجویز پیش ہوئی تھی) اُسی لا تحزن ان اللہ معنا" کا قائل ہونا پسند کرتے ہیں۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اکاڈیمی کی مجلس عاملہ کی دو نشستوں (۲۰ اگست سنہ ۴۳ء اور ۴ ستمبر سنہ ۴۳ء) کی کارروائی مجھے ملی اور اس کے ملاحظہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی ایک مستقل گفتگو کی محتاج ہے، لیکن چونکہ اس ماہ کے ملاحظات میں اب گنجائش باقی ہے، نہ رسالہ میں کسی اور جگہ، اسلئے اس افسانہ کا دوسرا ٹکڑا ماہ آئندہ پر ملتوی کرتا ہوں۔

ماہ آیندہ دسمبر سال کا آخری پرچہ ہوگا اور حسب معمول زیادہ ضخامت لئے ہوئے نکلیگا۔ منیجر نے جو اعلان صفحہ ... پر اس کے متعلق کیا ہے، اس میں مجھے صرف اسقدر اضافہ اور کرنا ہے کہ ممکن ہے مضامین کچھ اور بڑھ جائیں، اور اسطرح اسکی دلچسپی و افادہ کچھ اور زیادہ ہو جائے۔

احباب و ناظرین سے استدعا ہے کہ اگر وہ واقعی سال آیندہ نگار کی خریداری جاری رکھنا چاہتے ہیں تو مناسب صورت یہی ہے کہ وہ منی آرڈر کے ذریعہ سے چندہ روانہ فرمائیں اور نہ صرف اپنا بلکہ اپنے حلقۂ احباب میں سے کم از کم دو حضرات کا اور۔ کیا گذشتہ نو سال کی صحبت دیرینہ کا اسقدر حق بھی آپ پر نہیں ہے کہ نگار آپ سے یہ مطالبہ کرے اور آپ اس کو پورا کریں۔

نیاز

...مرحوم

شوق قدوائی

- نیکی کا پھل عہ
- ترانۂ شوق ۸ر
- قاسم و زہرہ ۱۲ر و عہ
- نیرنگ جمال ۴ر
- بندگی ۶ار

میر ولی اللہ بی اے

- کاس الکرام ۳ر
- لسان الغیب جلد اول ۳ر
- " دوم ۶ار
- " سوم ۶ار
- " چہارم ۶ار
- نمکدان فصاحت ۸ر
- بادۂ ناب عہ

ظفر عمر بی۔ اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری ۴ر
- بہرام کی گرفتاری عہ

مولانا نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن ۶ار
- نگارستان ۶ار
- صحابیات ۶ار
- تاریخ الدولتین ۸ر

سید سجاد حیدر بی اے

- زہرا ۱۲ر
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
- خیالستان ۸ر
- ثالث بخیر ۸ر

تاریخی و جاسوسی ناول

- حکایات و احتساسات ۴ر
- سراب فیشن ۸ر
- بالشوک شہزادی ۸ر
- شہید وفا ۸ر
- ممتاز بیگم ۱۲ر
- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس عہ
- شیخ چلی عہ
- بہادر ترک ۸ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس ۸ر
- حسن بنارس ۸ر
- قطرتی جاسوس ۸ر
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چہ ۸ر
- زر پرست ۴ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبد الرحمن ناصر ۶ار
- عروس مصر ۶ار
- سلاب خون ۸ر
- کرشمہ ۸ر
- وفادار دلہن ۸ر
- صواف زمین عہ

- سیاحت زمین ۴ر
- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۸ر
- اسرار بالشویزم ۴ر
- روح لیلی ۳ر
- امین بگ عہ
- حجاج بن یوسف ۴ر
- یوسف پاشا ۸ر
- انقلاب عثمانی ۴ر
- بہرام کی رہائی ۴ر
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگزشت ۴ر
- لال کنھور ۸ر
- پراسرار قتل ۶ار

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال عہ
- مشاطۂ سخن عہ
- انشاء نسواں ۶ر
- مکاتیب محسن الملک ۸ر
- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر ۶ار
- مراثی انیس للعہ
- مراثی صفیہ عہ

- مراثی مونس ۱۲ر
- مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعرا

- تذکرۂ عینی ۱۱ر
- گلشن ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی ۶ار

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز ۱۲ر
- کلیات عراقی ۱۲ر
- دیوان حافظ ۸ر
- دیوان نعمت خان عالی عہ
- کلیات انوری ۶ار
- دیوان بے دل ۸ر
- دیوان عرفی ۱۲ر
- کلیات جامی ۸ر
- کلیات غالب ۸ر
- کلیات صائب ۱۲ر
- کلیات حزیں ۱۲ر
- دیوان عنصری ۱۴ر
- دیوان ظہیر فاریابی ۶ر
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ناصر علی ۶ر
- دیوان ہلالی ۶ر
- کلیات جلال اسیر ۴ر
- کلیات سعدی ۸ر

دواوین اردو

- دیوان حسن دہلوی ۸ر
- کلیات ظفر ۱۲ر
- کلیات مومن عہ

- دیوان ناسخ عہ
- کلیات میر ۸ر
- کلیات سودا ۸ر
- کلیات انشا ۸ر
- کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
- گلزار داغ ۴ر
- دیوان رند ۹ر
- دیوان ذوق ۱۲ر
- کلیات اسمٰعیل ۶ار
- مراۃ الغیب عہ
- صحیفۂ عشق ۶ار
- فریاد داغ ۴ر
- دیوان قائل ۸ر
- دیوان شہیدی ۴ر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات تصویر رنگین عہ
- " باتصویر سادہ للعہ
- مجمع الفنون ۸ر
- طلسم فرنگ ۶ار
- کارخانۂ عالم عہ

رنالڈ کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین پنیا ۱۲ر
- فریب حسن ۶ار
- سوزن عشق ۸ر
- روز امیمرٹ للعہ
- ناول اسرار ۶ار
- شام جوانی ۴ر
- طلسمی فانوس ۱۲ر

نگار بک ایجنسی

نظیر آباد لکھنؤ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سوال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت علاوہ محصول عمر

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات یکجا کردیے گئے ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں اسقدر جوش و قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ مسئلہ نسائیت کے بہت سے نکات اس سے حل ہوجاتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ؏

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں پاکیزگی بیان اسلوب ادا ندرت خیال اور جدت اظہار کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ کسی ادبی تصنیف میں نہیں مل سکتے حسن و عشق کی تمام فتنہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔

قیمت علاوہ محصول دس آنے ۱۰/

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص ... ادنی سی ... شخص کے متعلق سیرت ... موت و حیات، صحت و بیماری ... دنکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح طور پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت عہ

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصر کے مشہور مورخ کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بحث کی گئی ہے۔ ترجمہ مولانا نیاز نے کیا ہے اور اسقدر سادگی و تسلسل کے ساتھ کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔

قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری کی حلاوت و شیرینی تمام شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی نظیر و تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے

قیمت علاوہ محصول بارہ آنے (۱۲/)

تذکرہ خن...

مولفہ مولوی عبدالباری ... ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و انتخابات کلام ... اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے۔

حجم ۵۰۰ صفحات

قیمت مع محصول چار روپیہ (للعہ)

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا سے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے

قیمت علاوہ محصول ؏

نگارستان

(دوسرا اڈیشن) زیر طبع ہے جس میں حضرت نیاز کے ادبی مقالات و مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت ... ہوگی

مینیجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ